

واضح البیان فی تفسیر اسم القرآن

www.KitaboSunnat.com



تالیف
امام العصر مولانا
محمد ابراہیم میر سیالکوٹی

ناشر

مرکزی جمعیت اہل حدیث پاکستان



معزز قارئین توجہ فرمائیں

- کتاب و سنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب... عام قاری کے مطالعے کیلئے ہیں۔
- مَجْلِسُ التَّحْقِيقِ الْإِسْلَامِيِّ کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق و اجازت کے بعد (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کیلئے ان کتب کو ڈاؤن لوڈ (Download) کرنے کی اجازت ہے۔

تنبیہ

ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کیلئے استعمال کرنے کی ممانعت ہے
کیونکہ یہ شرعی، اخلاقی اور قانونی جرم ہے۔

اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی
کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں

PDF کتب کی ڈاؤن لوڈنگ، آن لائن مطالعہ اور دیگر شکایات کے لیے
درج ذیل ای میل ایڈریس پر رابطہ فرمائیں۔

✉ KitaboSunnat@gmail.com

🌐 www.KitaboSunnat.com

واضح البیان فی تفسیر اسم القرآن

www.KitaboSunnat.com

تالیف

امام العصر مولانا محمد ابراہیم میرسیالکوٹیؒ

ناشر

مرکزی جمعیت اہلحدیث پاکستان

جملہ حقوق محفوظ ہیں

238.6

۴۱-۶

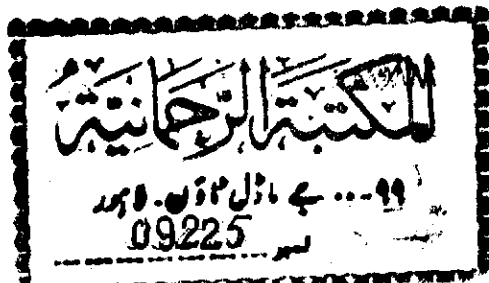
نام کتاب : واضح البیان فی تفسیرام القرآن

تالیف : حضرت العلام مولانا حافظ محمد ابراہیم میرسیالکوٹی (رحمۃ اللہ علیہ)

میں اشاعت : (بار چہارم) ۱۲ صفر ۱۴۱۹ھ بمطابق ۷ جون ۱۹۹۸ء

مالی تعاون : جناب رائے ریاض احمد صاحب (اسٹیٹ سپورٹس سیکوٹ)

یکے از مطبوعات : مرکزی جمعیت اہل حدیث پاکستان





مَالِذٍ دِيدَارِ زُيْنِغَامِ گُزِیْتِم (غیب) مُشْتَاقِ تُووِیْدِنِ بُشْتِیْنِکِنِ شُشْمِ

تَفْسِیْرُوتِ فَاتِحَہ

وَاضِحُ الْبَيَانِ تَفْسِیْرُ اُمِّ الْقُرْآنِ

اقتضای مطالعہ وافتح
حکایت حافظ محمد ابراہیم قسیمی

شعبان سنہ ۱۳۵۲ھ مطابق نومبر سنہ ۱۹۳۳ء

برقی شانی پریس لاہور میں

بازار سہ ماہیور ضلع لاہور میں طبع ہوئی، اور مصنف نے پروفیسر الہادی سیکوت شانی

ایک سابق ایڈیٹر کے ٹائٹل کا عکس

فہرست مضامین

صفحہ نمبر	مضمون	صفحہ نمبر	مضمون
57	اسمائے سورۃ فاتحہ	13	الخطبہ الجلیلۃ العربیۃ
58	امام بخاریؒ کی طرف سے جواب	17	اما بعد فی تحریر التفسیر
64	جلئے نزول	21	مقدمہ فی اصول التفسیر
64	بحث اولیت نزول	28	دیباچہ تفسیر (اردو)
64	فضائل سورۃ فاتحہ	30	شکایت زمانہ حال
66	سورۃ فاتحہ کا دم موجب شفاء	31	خوش اعتقاد احباب کا تقاضا
67	تفسیر بسم اللہ شریف	34	ضروری التماس
68	بسم	37	معذرت و عرض حال
68	بسم اللہ کا رسم الخط	38	علم اسرار دین
69	اللہ تعالیٰ کا اسم بھی بابرکت ہے	42	طرز تحریر و طریق بیان
70	فہرست اسمائے حسنی	43	ذکر لطائف کا نمونہ
71	اسم اعظم	46	اصول تفسیر ہذا
72	دعا مانگنے کا طریق	48	تفسیر قرآن بزمیان قرآن
73	آنحضرت ﷺ کی بعض دعائیں	52	روحانیات
73	بے جوابی کی دعا	52	تفسیر بالایات
73	ہر معیبت کی دعا اور اسم اعظم	53	تفسیر بالاحادیث
74	حضرت ایوبؑ کی دعا	54	تفسیر یا قوال الصلوٰۃ
74	غم و اندوہ کی دعا	55	جمع منقول و معقول

93	سواری کے وقت بسم اللہ	75	آگ جلنے کے لیے دعا
93	گھر سے باہر نکلنے کی دعا	75	بیمار کے لیے حضرت علیؓ سے منقول دعا
	سورۃ توبہ کے سوا سب سورتوں کی ابتداء	75	حضرت نوحؑ کی دعا
94	بسم اللہ سے ہے	76	ازالہ شبہ
96	جری نماز میں بسم اللہ بھی باجمہر پڑھے	76	اللہ
99	صحابہ قائلین جبر بسم اللہ	77	رسم الخط
99	تابعین و تبع تابعین	77	معانی لمجاہد اشتقاق
100	امام ابو حنیفہؒ اور بسم اللہ	81	حکمت
	ترک و اخلائے بسم اللہ کی روایات	81	الرحمن الرحیم
105	اور فضیلہ	81	رحمت کا اطلاق بنی آدم کے لیے
115	تفسیر الحمد للہ		اور ذات باری کے لیے
116	الحمد	84	اسم الرحمن کی خصوصیت
116	حمد، مدح اور شکر میں فرق	85	تنبیہ
119	للہ	85	وجہ تقدیم الرحمن
119	نکتہ اربعہ وقائدہ	85	تمتہ اسم الرحمن
120	قرآن میں الحمد للہ کی تعداد	86	نکتہ عجیبہ
121	قرآن میں مواقع حمد	87	مسائل و سنن نبویہ متعلق بسم اللہ
127	فضائل الحمد للہ از احادیث	87	ہر اہم کام کے ابتداء میں بسم اللہ
	آنحضور ﷺ احمد اور آپ کی		میاں بیوی کے خاص تعلق کے وقت
128	امت مملوک	87	بسم اللہ
129	بائیبیل کا حوالہ	88	وضو کے ابتداء میں بسم اللہ
129	نیند سے بیداری پر حمد	91	جانے ضرور میں جانے پر بسم اللہ
130	نئے لباس پر الحمد للہ	92	کھانے پینے کے وقت بسم اللہ
130	نئے چاند پر الحمد للہ	93	سونے کے وقت بسم اللہ

154	اسم رب سے اثبات نبوت	131	سفر سے واپس آنے پر الحمد للہ
159	اسم رب سے اثبات معاد	131	قبولیت دعا اور شفا پر حمد
159	مضمون جزا و سزا کے عنوانات	131	چھینک آنے پر الحمد للہ
159	ان سب عنوانوں میں اسم رب	132	جٹائے مصیبت کو ویکھ کر الحمد للہ کہنا
167	حمد و ربوبیت کا باہم یکجا ذکر	132	فرزند کی موت پر الحمد للہ
167	نکتہ معرفت	132	بچے کی زبان کھلنے پر پہلا سبق
169	نعمہ تفسیر الحمد للہ رب العالمین	133	سواری پر بیٹھے تو الحمد للہ
171	<u>الرحمن الرحیم</u>	133	خوش خبری پہنچانے پر حمد
171	ربوبیت و رحمت میں مناسبت	133	دشمن کے بھاگ جانے پر حمد
175	رحمت عالمہ و خاصہ	133	روز قیامت اور لوائے حمد
176	اسم رحمن اور رحیم باہم یکجا	134	مقام محمود اور حمد
177	قرآن کا نزول رحمت ہے	134	<u>رب العالمین</u>
	اسلمائے رحمن و رحیم	134	ترکیب نحوی و حل لغات
179	لکھنؤ و محرم و مسنون دعا	137	نکتہ وار پہلا عجیب
180	رحمت و محبت میں فرق	137	لطائف ثلثہ
181	رحمانیت و رحیمیت کا تعلق	139	قرآن میں اسم رب کتنی دفعہ آیا ہے
	آیت سابقہ و لاحقہ سے	142	توحید خالقیت و ربوبیت کی آیات
184	<u>مالک یوم الدین</u>	145	انبیاء کی دعائیں اور اسم رب
184	مالکیت جزا کی مناسبت حمد سے	149	ان مواقع سے اسم رب کی مناسبت
184	مطیع اور عاصی میں امتیاز	150	اسم رب سے خدا کی ہستی کا ثبوت
186	ذات حق ہر دو جہان میں لائق حمد ہے	150	فرعون انار یکم الاطی کہتا تھا
187	لطیفہ عجیبہ متعلق تفسیر مرزائے قادیانی		اس کے مقابلے میں حضرت موسیٰؑ
188	ملکیت اور حمد		نے خدا کو رب العالمین کہا
488	الرحمن الرحیم اور مالک یوم الدین	151	حضرت موسیٰؑ اور فرعون کا مکالمہ

218	عالم برزخ میں بھی جزوی عذاب و ثواب	189	میں ربط
219	غیر مدفون کو عذاب (ازالہ شبہ)	192	نکتہ در اضافت مالک یوم الدین
221	روح اور بدن کا تعلق پانچ طرح پر ہے	193	فاتحہ اور خاتمہ قرآن میں مالکیت (حاشیہ)
221	عالم برزخ کی راحت و تکلیف کی	193	یوم الدین کی تخصیص
	تفہیم تین طرح پر ہے	193	قرات مالک و ملک
222	اول عالم مثل و خواب	193	رسم الخط عثمانی میں کمال
	تجسّد معانی کی رویت بعض کا ملین	193	ملک اور مالک کے معنی
223	کو عیناً "بھی ہو جاتی ہے	194	تنبیہ متعلق مولوی محمد علی صاحب
224	مولف تفسیر کا اپنا واقعہ	194	لاہوری
225	دوسری صورت	195	یوم کے معنی
226	تیسری صورت	195	دین کے مختلف معانی
226	امام غزالی اور عذاب قبر	196	مرکب یوم الدین سے مراد یوم قیامت
227	تمہ بحث عالم برزخ	197	روز قیامت کے مختلف نام
228	کلی فیصلہ قیامت کو ہوگا		اور ان کی وجوہات
229	فیصلہ کے لیے تقرر تاریخ	197	تنبیہ متعلق حکیم نور الدین صاحب
230	اس کی وجوہات		قادیانی اور مولوی محمد علی صاحب لاہوری
231	قیامت کے یوم الجمع ہونے کی آیات	199	اعمال پر جزا سزا کا ترتیب
232	میعاد کا تقرر خدا کے اختیار میں ہے	203	برے اعمال پر بری جزا
232	عمل دخل کے تین مرتبے	204	ختم، طبع وغیرہ امور سے مراد
234	فنائے عالم کی بعض آیات	206	دنیا میں جزوی اور عاقبت میں کلی جزا
235	وزن اعمال	212	فائدہ عجیبہ در ہلاکت امم سابقہ
236	غیر جسمانی امر اور وزن	213	قومی تقلب و ملکی انقلاب
239	حافظ ابن حزمؒ اور وزن اعمال	214	ایرانیوں، رومیوں کا زوال
240	تردد و شک کی دو صورتیں	216	سکرات کے وقت جزوی جزا سزا

283	ان چار صفات کی ترتیب	241	امام غزالی اور وزن
284	ہدایت و بارہ نکتہ معرفت	242	امام رازی اور وزن
287	<u>تفسیر ایاک نعبد</u>	242	قرآن اور اعمال نامہ
287	ارتباط بماتل	243	دو پیارے کلمے، ہلکے اور بھاری
287	صنعت التفات میں نکتہ	245	حساب کے بعد جنت یا دوزخ
288	شرک کی ابتداء تو ہم پرستی سے ہے	245	قرآن کا مذہب جسمانی
288	قرآن نے وہم پرستی دور کی	246	جنت و دوزخ کا ہے
289	نماز کی ہیئات ترکیبی	246	نعمائے جنت
289	آم محصور ﷺ کا سب سے بڑا کمال	248	تکالیف دوزخ
289	ایاک نعبد میں کف ضمیر کو کیوں	249	رو شہادت و اعتراضات
289	مقدم کیا	250	ایک منکر اسلام اور ایک قائل اسلام
290	لفظ ایاک مختلف لغات	251	کے اقوال کا مقابلہ اور جوابات
291	عبودت صرف خدا کا حق ہے		و تحقیقی جواب
292	آدمی کے حالات تین زمانوں میں	255	امور جنت و دوزخ اور رجعت استقرائی
292	لفظ عبودت کے معنی	256	شیخ بوعلی سینا کی نصیحت
293	اقسام عبودت	259	یہ دنیا اور اس کی نعمتیں
293	<u>وایاک نستعین</u>	260	آریہ اور جنت پر اعتراض
293	میں خطب کا مکرر لانا	261	امکان حشر اجلہ
294	عبودت کے بعد استعانت کا ذکر	266	رو تناخ
294	دعا بھی ایک قسم کی عبودت ہے	270	دلائل تناخ کے جواب
295	تبذل الی اللہ	272	کشف حقیقت
295	رسوم شرکیہ اور مذہب خفیہ	274	تمہ بحث تناخ
296	اڑالہ شہادت		سورۃ فاتحہ اور مسئلہ ذات و صفات
297	نکتہ غریبہ متعلق واسطہ و وسیلہ	275	باری تعالیٰ

319	اس کی توضیح	298	انبیاء و صلحا کی قبروں کو مساجد بنانے کی ممانعت
322	ضروری ہدایت متعلق	299	عناصر پرستی اور شرک میں ترقی
	خرچ مال و برداشت قرض	300	سب کا ملین کے کمال خدا کی داد ہیں
327	صر اطا الذین انعمت علیہم	303	نماز کے سب اذکار اور حرکات
327	ترکیب نحوی		شرک کی تردید کرتے ہیں
327	ارتباط و لطائف ادبیہ	303	فائدہ بممتعلق درود شریف
329	توضیح اقسام انعامات	304	تقرر درود شریف میں شرک کی تردید
331	صراط مستقیم اور انعام والے چار گروہ ہیں	304	عبدہ و رسولہ کی تعلیم سے شرک کی تردید
332	توضیح مقالت اربعہ۔ نبوت	305	خرید کردہ غلام کو بھی عہدی نہ کہو
334	سب انبیاء و رسول پر ایمان واجب ہے	306	دلغ کو روشن کرنے والا لکھتے
335	توضیح متعلق اقسام کفر	306	آیت ایاک نعبد
339	مسلمان ہونے میں ایملی ترقی		اشن الوہیت اور مقام عبودیت کی جامع ہے
341	تفہیم متعلق اہل قرآن	307	ایاک نعبد کے شرح معنی
342	مسئلہ سیادت آنحضرت ﷺ	308	اسلام کا امتیازی کمال توحید خالص ہے
343	سب انبیاء کے اسم پر لفظ یا اور	311	اھدنا الصراط المستقیم
	آنحضرت ﷺ کے عمدے پر یا	311	ارتباط بماتل
345	منادی معرف بالام کی خصوصیت	311	حل لغات ہدایت
345	رجوع۔ مطلب	312	صراط مستقیم
345	نتیجہ تفصیل	312	تفسیر شہادت آیات
347	ہرود آیات عسی ان یبعثک اور	312	اقسام ہدایت
	لوسوف۔ حلیک میں مرتبہ شفاعت کا وعدہ ہے	315	استقامت کیا ہے؟
348	آیت ورفضنا لک ذکرک	318	اصحاب استقامت کی قدر
349	تنبیہ و رجوع۔ مطلب	319	صراط مستقیم کیا ہے؟
352	ازالہ شبہ و بارہ تعیین مذہب		

415	ایمان شہودی استدلالی و تقلیدی میں فرق	353	آیت ان الذین امنوا والذین حادوا اور
417	مرتبہ صالحیت		بعض لوگوں کے شبہات
417	صالحیت کے دو مقام	355	قرآن اور ایجاز و اظہار
417	پہلا مقام ولایت	356	یہودی، نصرانی، صابی سب نبوت کا
419	دوسرا مقام نبوت		اقرار کرتے ہیں
422	نکتہ۔ آفتاب ظاہری و باطنی	357	شبہات پر دیگر آیات
423	محدثین اور خلافت معنوی	358	تنبیہات
426	غیر المغضوب علیہم ولا الضالین	359	سورہ بقرہ کے پہلے اور دوسرے رکوع
			کی بعض آیات
426	ارتباط بامقابل	365	چوتھا قرینہ، ذکر قیامت سے ثبوت نبوت
426	ترکیب نحوی	366	پانچواں قرینہ، اعمال سے ثبوت نبوت
427	تنبیہات و نکات	367	صحبۃ اللہ کے لیے نبی کی ضرورت
430	حقیقت غضب	368	چھٹا قرینہ، وعدہ اجر سے ثبوت نبوت
430	اسباب غضب	370	پیغمبر خدا کی اطاعت و ادب
431	حقیقت ضلالت	375	مولانا آزاد صاحب اور صراط مستقیم
434	بدعت ضلالت ہے	379	مولانا کی خدمت میں اس عاجز کا خط
434	نکات	385	تمتہ بحث اور مولانا کی بعض تصریحات
437	طریق اعتدال		آیت ولقد کتبنا فی الزبور اور
438	تنبیہات خلاشہ		حوالہ جات بائیل
441	الاجمل بعد التفصیل	395	مرتبہ صدیقیت
442	ساقیوں آیتوں میں باہمی ربط	401	حضرت صدیق اکبر کا مرتبہ
	آیات فاتحہ اور آنحضرت ﷺ کی	402	سینے کو ٹھنڈا کرنے والا نکتہ
446	نبوت کا ثبوت	405	خلافت راشدہ
445	التماس مکرر	407	مرتبہ شہادت
447	خاتمہ تفسیر	411	

500	حدیث دان حنفی علماء	447	فصل اول: در ختم نبوت
506	صوفیائے کرام قائلین بالبحر	452	دوسری وجہ ہر قوم میں الگ نبی
508	آمین بالبحر کی حکمت	454	لطیفہ متعلق مرزائے قادیانی
512	فصل سوم: نماز میں سورۃ فاتحہ کا حکم	454	تیسری وجہ
512	نماز کی صورت اور حقیقت	459	ختم نبوت کے خاص دلائل
512	نماز اور سورۃ فاتحہ میں مناسبت	459	آیت ختم نبوت کا شان نزول
	حدیث قدسی میں فاتحہ کا نام	461	خاتم کے معنی
512	الصلوة کیوں رکھا؟	463	احادیث ختم نبوت
513	قرات قرآن اور نماز		آنحضرت ﷺ کے بعد ہر مدعی
514	مطلق قرات سب کو مسلم ہے	466	نبوت کذاب ہے
514	مقدمہ در شناخت ارکان	468	تصریحات مرزائے قادیانی
518	رکعت فاتحہ کے مفصل دلائل	473	بحث چارم۔ رد شبہات
518	پہلی دلیل: لا صلوة		شبہ اول۔ آیت صراط الذین
521	دوسری دلیل۔ قسمت الصلوة	475	انعت علیکم کے متعلق
527	تیسری دلیل: بعامن الثانی	477	شبہ دوم۔ ختم کے معنی میں تبدیلی
527	بعامن الثانی (حاشیہ)	479	شبہ سوم
530	قرات فاتحہ خلف الامام کے خاص دلائل	487	فصل دوم: آمین بالبحر
	امام المغازی محمد بن اسحاق کی	486	لفظ آمین کا اصل اور معنی
541	روایت فاتحہ خلف الامام	486	آمین کا رواج
543	قرات فاتحہ اور حضرات حنفیہ	487	سورۃ فاتحہ اور آمین
543	عذر اول آیت فاقرءوا ما تیسر من القرآن	488	اسرار و فضائل آمین
546	تنبیہ: اس کا پہلا جواب	490	امام مقتدی اور منفرد ہر ایک آمین کے
548	اس کا دوسرا جواب	491	اونچی قرات میں اونچی آمین
556	حضرات حنفیہ کی دوسری دلیل		اسائے صحابہ و تابعین و ائمہ مجتہدین
556	حدیث مسی الصلوة مع جواب	499	وعلماء و شرح حدیث قائلین آمین بالبحر

- 587 اجمالی طور پر سب روایات کا جواب
حضرت امام ابو حنیفہؒ اور بعض
محققین حنفیہؒ
- 587 حضرت صوفیاء قائلین قرأت خلف الامام
595 مسئلہ اور اک رکوع
597 نماز جنازہ اور سورہ فاتحہ
608 قرآن کی تفسیر کے پانچ طریقے
613 شکر و عابد رگلا خدا
615
- 558 زیادت فصحاءؒ اور اس کا جواب
565 حضرات حنفیہ کی تیسری دلیل
آیت اذا قرئی القرآن
اس کا جواب
تحقیقی جواب
امام بخاریؒ اور آیت فاستمعوا
577 حضرات حنفیہ کی چوتھی دلیل
580 من کان له امام
حضرت امام ابو حنیفہؒ اور حدیث من
کان له امام
- 582



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الْخُطْبَةُ الْجَلِيلَةُ

عَلَى وَجْهِ بَرَكَاتِهِ الْإِسْتِغْلَالِ فِي عَمَائِدِ اللَّهِ ذِي الْجَلَالِ وَمَدَاحِ كَلَامِهِ
الْمُعْجَزِ فِي الْأَنْبُضِ وَالْعُتُوتِ بَيْنَهُ وَصَفِيهِ مَسَاحِبِ الْجَمَلِ وَمَنَاقِبِ الْإِلَهِ قَاصِدِ الْفَيْزِ الْكَمَلِ
الْخُطْبَةُ الْأُولَى الْغِيَا الْمَقْصُودَةُ فِي مَحَامِدِ اللَّهِ تَعَالَى
لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ

أَوَّلُ الْأَمْرِ وَالْأَوَّلِ مُحَمَّدٌ اللَّهُ الْأَوَّلُ الْأَحَدُ، الْوَاحِدُ الْمَلِكُ الْعَدْلُ الضَّمِيرُ
الْحَكِيمُ الْوَاسِعُ الْوَدُودُ، الْمَصُورُ السَّلَامُ الْمُحْمَدُ، هُوَ اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ، وَلَا مِلْكَ وَلَا
مَوْلَى لَهُ سِوَاهُ، سَامِعُ الْعَوْدِ وَالْهُدُودِ وَالذِّعَاءِ، وَسَامِعُ الْكُفَرِ وَالْآلَاءِ، عَلِمَ
أَدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا، وَمَحَلَّ الْأَوْدَةِ سَهْلًا وَطَوْدًا وَمَاءً، أَغْلَى تَمَكَّ النَّهْرُ، وَسَطَرَ الْهَادِ
وَسَرَّ الْمَاءَ، لَهُ الْحَوْلُ وَالْعِلَاءُ، وَلَهُ الطُّفُولُ وَالْعِطَاءُ، مُصْغَمُ الدَّاءِ وَمُحَوَّلُ الْهُمُومِ
وَاللَّوَاءِ، أَزْجَمُ التَّرَجُّمِ، وَأَكْرَمُ الْكُرْمِ، عَلَامَةُ الْأَسْرَارِ وَخَتَامُ الْبُعَاثِ وَالْأَمَارِ
مُطَهِّرُ الْأَنْطَارِ وَمُسَوِّدُ الْأَوْطَارِ مَكِيدُ الدُّهُورِ، وَمُضِلُّ الْأُمُورِ ذِكْرُ الْهَادِ وَ

وَطَوَّدَ الْأَطْوَادَ أَتَمَّحَدٌ لَا تَحَدَّ الْأَحَدَ وَلَا أَمَدَ لَهُ، وَأَمَدَ حُهُ مَدَّ حَالًا عَدَلَهُ
 وَلَا كَدَمَعَهُ، حَامِدٌ كُلِّ مَا سُوِيَهِ، وَسَائِلُهُ كُلِّ عَاسُوٍّ، وَالسَّلَامُ الْأَكْمَلُ الْأَكْمَلُ
 عَلَى رَسُولِهِ الْأَكْرَمِ وَمُرْسَلِهِ الْمَكْرَمِ (مُحَمَّدٍ) مُؤَدِّ ذَوِّلِ صَلَاحٍ وَمُخَسِّدِ كُلِّ
 طَالِحٍ، أَرْسَلَهُ اللَّهُ الْعَلَامَ، مَسْنَدَ الْعَمَائِدِ الْإِسْلَامِ، وَمُتَّقِدِ الْمَسَالِكِ مَوَالِحِ
 الْأَحْكَامِ، وَمُحَمَّدٌ دَاخِلُ الْحُدُودِ وَالْحَلَالِ وَالْحَرَامِ، وَمُهَيِّدُ الْإِعْدَاءِ الْإِسْلَامِ، أَعْظَمُ أَهْلِهِ
 صَرْفَعُ الْأَلَاءِ وَأَصْعَدُ الْمَصَاعِدِ الشَّمَا، حَصَلَ لَهُ الْمُرَامُ وَكَمَلَ عِلَالُهُ
 الْإِضْرَامُ، وَعُدَّةُ اللَّهِ الْوُدُودُ، الْمَوْرِدُ الْأَطْهَرُ، وَالْحَلُّ الْعَمُودُ، وَلَوَاءَ الْحَمْدُ
 وَالْعِظَاءُ الْمَوْعُودُ الْمُعْهُودُ، وَعَلَى أَعْرَاسِهِ إِمَامُ أَهْلِ الْإِسْلَامِ، وَأَوْلَادِهِ الْأَطْفَالُ
 الْكِرَامُ وَرَهْطُهُ الْأَخْرَاءُ، أُولَى الْخَلَائِمِ وَسَائِرُ رُسُلِ اللَّهِ وَأَمْلَاكِهِ أُولَى الْخَلَائِمِ وَالْأَكْرَامِ

الْخُطْبَةُ الثَّانِيَّةُ فِي أَوْصَافِ الْقُرْآنِ الْمَجِيدِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

أَتَمَّحَدُ لِلَّهِ الْعَلِيِّ الْأَكْرَمِ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ، عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ، أَمْسَلَ
 رَسُولَهُ بِالْهُدَى وَدِينِ الْحَقِّ إِلَى النَّاسِ كُلِّهِمْ عَرَبِيَهُمْ وَعَجَبِيَهُمْ وَأَوْحَى لِلْبَيِّنِ رُوحًا
 مِنْ أَمْرِهِ فَجَعَلَهُ نُوْرًا يَنْتَفَعُ بِهِ فِي الظُّلُمِ، وَدَوَاءً يَشْفِي بِهِ مِنَ السَّقَمِ، وَ
 خَطَابًا مُنْجِزًا أَعْجَزَ فَضَحَاءَ الْأَدْبَاءِ وَبُلْغَاءَ الْخُطْبَاءِ وَغُجْبَاءَ الشُّعْرَاءِ مِنَ الْعَرَبِ

الْعَرَبَاءُ، عَنِ الْإِنْيَانِ بِمِثْلِهِمْ فَانْخَمَ وَأَبْكَمَ وَلَمْ يَهْضُ نَاهِضٌ مِنْ زُعَمَائِهِمْ
لِلْإِنْيَانِ بِمَا يُمَاثِلُهُ أَوْ يَسَاوِيهِ، وَلَمْ يَهْضُ لِأَحَدٍ مِنْ عُلَمَائِهِمْ عِرْقُ
الْعَصِيَّةِ لِمُعَانَصَتِهِ بِمَا يُوَارِيهِ أَوْ يَدَانِيهِ فِي الْهِدَايَةِ وَجَمْعِ الْكَلِمِ
مَعَ اسْتِهَارِهِمْ وَتَفَاخُرِهِمْ فِي الصَّنَاعَةِ وَالرَّشَقِ قَرَأْنَا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِي عِلْمٍ
بِالْظُّهْرِ بِنَاتٍ وَابْهَرَتْ بِحُجْرٍ لِإِظْهَارِ الْحَقِّ الْحَقِيقِيِّ وَإِثْقَالِ الْبَاطِلِ فِي مَكَانٍ يَبْقَى
وَأُدْحَاضِ الْمَيُُونِ الْعَوَاطِلِ فِي قَعْرِ عَمِيْقٍ، أَمْرِيهِ وَأَزْجَرَتْ بَشَرًا شَدِيدًا
وَوَعَطَ وَذَكَرَ، فَضَّ عَنْ الْأَمْرِ السَّالِفَةِ لِمَنْ اِغْتَبَرَتْ وَتَذَكَّرَتْ وَضَرَبَ الْأَمْثَالَ
لِمَنْ أَلْعَطَ وَتَفَكَّرَ، شَهِيدَ الظَّاهِرِ بِوُجُودِهِ، وَاعْتَرَفَتْ الْقُلُوبُ بِتَوَالِيهِ وَجُودِهِ
نَصَبَ دَلَائِلَ تَوْحِيدِهِ لِمَنْ نَظَرَ فِي عَجَائِبِ مَصْنُوعَاتِهِ وَيَكُنْ بَرَاهِينَ صَادِقِ
رَسُولِهِ لِمَنْ تَفَكَّرَ فِي مُحْكَمِ آيَاتِهِ، فَأَوْضَعَ الْحُجَّةَ وَلَمْ يَدَعْ لِأَحَدٍ مِنَ الْحُجَّةِ، جَمَعَ
فِيهِ أَنْوَاعَ الْعُلُومِ مَا يَفْصُرُ عَنْ الْإِحَاطَةِ بِهَا الْفُهُومُ، لَا تَنْتَهِي عَجَائِبُهُ بِانْتِهَاءِ
الذُّهُورِ، وَلَا تَنْقُصِي غَرَائِبُهُ بِانْقِصَاءِ الْعُصُورِ، جَعَلَهُ دُونَ كُلِّ مُعْجَزَةٍ بِاقِيَا
عَلَى الْأَعْصَارِ وَدَائِرَاتٍ بَيْنَ الْكُتُبِ فِي الْأَمْصَارِ لَا يَغْلِبُهُ حُجَّةٌ وَلَا يَلْحَقُهُ عَارٌ
بَلْ يَكَادُرِيهِ بِضِيئِهِ وَلَوْلَمْ تَنْسَنَهُ نَارُ مُصَدِّقِ الْقَائِمِ سَلَمَ مِنَ الْكُتُبِ
الْكَافَةِ مِنَ التَّعْرِيفِ وَمُهَيِّمًا عَلَيْهِ مِنَ التَّزْيِينِ، مُخْبِرًا عَنِ الْوَقَائِعِ الْأَمِيَّةِ

وَالْأَمْوَرِ الْغَائِبَةِ، وَمُطْلِعًا عَلَى الْغَيْبِ الْهَائِلَةِ وَالْحَوَادِثِ النَّاسِبَةِ،
 فَوَاللَّهِ الَّذِي بَأْسُهُ قَامَتْ الْأَرْضُ وَالْتَمَوْتُ، وَتَكُونَتْ مِنْ رَشَحَاتِ فِيضِهِ
 الْخَضِرَاءُ، وَوُضِعَتْ دُونَ سُدَّةِ حَضْرَتِهِ تَوَاصِي الدُّلَى قَالِئُهُالِ، وَ
 وَبُطِطَ إِلَى بَابِ رَحْمَتِهِ أَيْدِي الْقَضَرِ وَالسُّوَالِ إِنَّهُ لَكِتَابٌ عَزِيزٌ لَا يَأْتِيهِ
 الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ، تَنْزِيلٌ مِنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ، وَصَلَّى اللَّهُ
 عَلَى نَبِيِّهِ الْأَمِيِّ سَيِّدِ الْكَائِنَاتِ تَامِيحِ الْإِنْجِيلِ وَالْقُرْآنِ، الْمَأْدُونِ
 بِالشَّفَاعَةِ الْكُبْرَى فِي الْعَرَمَاتِ، وَعَلَى آلِهِ وَأَصْحَابِهِ أَذْيَابَ الْفَضْلِ وَالْتَعَادَا
 مَا تَدُومُ الْأَرْضُ وَتَقُومُ السَّمَوْتُ،

الخطبة الثالثة

نُعُوْتُ إِلَهِي عَلَيْهِ السَّلَامُ وَمَنَاقِبِ اللَّهِ وَأَصْحَابِ الْكِرَامِ

بِسْمِ اللَّهِ الشَّهِيدِ الْحَسَنِ

الْحَمْدُ لِلَّهِ الْحَمْدُ وَكُلُّ لُغَى، الْمَعْبُودِ وَالْحَقِّ مِنْ طَاعٍ أَوْ طَغَى لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ
 لَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَى، أَنْزَلَ الْقُرْآنَ بِأَفْضَلِ اللُّغَى وَأَبْلَغِ النُّجَى، هَدَى النَّاسَ
 وَبَيَّنَّاتٍ مِنَ الْهُدَى، وَجَعَلَهُ قُرْآنًا تَنْصِبِي بِهِ فِي الدُّعَا مَنْ سَلَكَ سَلَكَ
 التَّقَى وَتَجَنَّبَ مَحَالِكَ الزُّدَى، فَتَيَّدَ مَبَانِيهِ غَايَةَ التَّوْفِيدِ وَأَتَمَّنَى، وَاللَّهُ

مَعَانِيهِ نِهَآيَةِ التَّكْلِيفِ مَا أَجَلَى دَمَا أَجَلَى، وَقَضَلَهُ عَلَى عِلْمِهِ وَلَمْ يَجْعَلْ لَهُ
عَوْجًا خِلَافَ مَا نَحَى لِمَا أَمَرَ وَلَا نَاقِضَ لِمَا قَضَى، وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلَى رَسُوْلِهِ
الْمُحْتَبَةِ وَرَبِّهِ الْمُرْقَضَى وَآمِنْ بِهِ الْمُضْطَلَّ مُحَمَّدٌ وَالمُبْعُوْثُ بِالحُجْرِ بَعْدَ
الْحُطَى، صَاحِبِ الدَّوَاءِ يَوْمَ الْقِيَمَةِ وَالشَّفَاعَةِ الْكُبْرَى، سَيِّدِ مَنْ وَطَأَ الْأَرْضَ
وَالْحَصَى، وَنَسَدِ مَنْ اسْتَدْبَلَ لِأَمْرِ دُنَاكَ، نَصَبَ مَعَالِمَ الْوَقَائِنِ لِلْوَرَى، بَعْدَ
مَا كَانَتْ أَبْعَدَ مِنَ الثَّرَيَّا بَلَّ أَقْلَ مِنْ لَا، وَأَعْطَى لِلَّهِ عَلَى الْقَدَى، وَأَمَّا ط
الَّذِي عَنِ الطَّرِيقَةِ الْمُشْتَلَى، وَعَلَى إِلَهٍ وَتَحْفَايَاهُ أُولَى الْمَكَارِمِ وَالنُّهَى، الْغَايِضِ
بِالْحَقِّ لِمَنْ تَصَدَّى بِمُحْمَدٍ وَأَوْطَى، ائْتَمَرُوا مِنْ رَكِبَ الْفَرَسَ، وَمَطَى يَوْمَ الْوَعَى
وَسَادَ لَا مَنْ سَارَ فِي نَصْرَةِ الَّذِينَ وَسَعَى قِيَا بُشْرَى لِمَنْ اخْتَدَى حَدَّ وَهَمِ
وَأَقْتَدَى، وَطَوَّلَى لِمَنْ اهْتَدَى بِهَدْيِهِمْ وَأَقْتَلَى، صَلَوةً وَسَلَامًا عَدَدَ مَا لَا يَحْصَى

أَمَّا بَعْدُ

فَيَقُولُ الْعَبْدُ الضَّعِيفُ بَنِي خَلِيلِ اللَّهِ الْخَنِيفِ مُحَمَّدٌ إِبْرَاهِيمُ مُبَارَكُ
الْكَاشِمِيرِيِّ أَضْلًا وَخَيْرًا وَأَلَمَّا الْكُوْنِي وَطَنًا وَمَوْلِدًا طَالَمَا كَانَ الْأَجَبَةُ
يَلْحُقُونَ عَلَى وَيُطْهَرُونَ الْفَقْرَ لَدَى ذِي الْإِلَهِ أَنْ أَفْتَرَهُمْ الْقُرْآنَ الْعَظِيمَ
بِلِسَانِهِمُ الْهِنْدِي، وَأَوْتَرَجَهُ وَأَعْلَقَ عَلَيْهِ الْحَوَاشِي تَكْشِفُ عَنْ وَجْهِهِ

لَهَا فِيهِ الْعَوَاشِي، فَلَنْتُ أَطْوَى عَنْ ذَلِكَ كَتَحْتَهَا وَأَضْرِبُ صَفْحًا، وَأَعْتَدُهَا
 لِلَّهِمْ قَوْلَةً بِضَاعَتِي وَضَعَفَ صِنَاعَتِي، وَفَقَدَانِ مَنْ أُنْزِجُ إِلَيْهِ فِي حِلِّ الشَّكَلَاتِ
 وَكُشِفِ الْمُعْضَلَاتِ، وَأَنْتَهَى إِلَيْهِ فِي فَتْحِ الْمُغْلَقَاتِ، وَفَهِمَ حَقَائِقَ الْإِشَارَاتِ، وَ
 أَخَذَ حَقَائِقَ الْعِبَارَاتِ، وَعُدَّ مَوْجِدًا لِي مَنْ أَثْبَتَ بِهِ فِي مَزَالِ الْأَقْدَامِ وَأَعْتَدَ
 عَلَيْهِ فِي تَقْرِيرِ الْمَرَامِ لِأَنَّ الْعِلْمَ قَدْ ضَعُفَ نَمَاءُهُ، وَذَهَبَ رَوْادُهُ وَبَهَاءُهُ
 وَتَضَاعَدَ مَاءُهُ وَرَتَّقَ أَنْزَمُهُ وَسَمَاءُهُ كَيْفَ لَا وَقَدْ أَخْبَلَا الصَّادِقُ الْمَصْدُوقُ
 بِأَنَّهُ يَفْعَلُ الْعِلْمَ وَيَكْتُمُ الْجَهْلَ (بِمَارِي) وَقَالَ أَيْضًا إِنَّ اللَّهَ لَا يَقْبِضُ الْعِلْمَ
 إِلَّا زَاْعًا يَنْتَزِعُهُ مِنَ الْعِبَادِ وَلَكِنْ يَقْبِضُ الْعِلْمَ بِقَبْضِ الْعُلَمَاءِ (بِمَارِي) فَالْعُلَمَاءُ
 الْحَدَّاقُ قَدْ أَرَحَلُوا إِلَى الْقُبُورِ وَمَنْ خَلَفَهُمْ اقْتَصَرُوا دُونَ الدُّبُوبِ عَلَى النُّشُورِ
 فَوَقَعَ مَا قَالَ النَّبِيُّ الْمَعْصُومُ سَخَى إِذَا الْمُهَيِّقُ عَالِمًا أَخَذَ النَّاسَ رُؤُسَاءَ
 بَحْمَلًا لَا فَا تَوَالِغُوا فِي عِلْمِهِمْ فَصَلُّوا وَأَصْلُوا (بِمَارِي) فَيَا نَيْتِي مِتْ قَبْلَ هَذَا
 وَلَمْ أَسْرِ هَذَا الزَّمَانَ الشُّؤْمَ وَعَلَى ذَلِكَ كَانَ يَمْنَعُنِي كَثْرَةُ الْأَشْغَالِ
 وَيَعْوِفُنِي تَقَلُّبُ الْأَحْوَالِ، فَأَعْتَدْتُ رِثًا إِلَى الْأَحْبَةِ ثَلَاثًا عَدَمَ مَقْدَرِي فَلَمْ
 يَسْمَعُوا مَعْدِي رَقِي بَلْ شَرَعُوا لِي مَعْتَبَتِي وَسَلَفُونِي بِالنَّسَبِ حِدَادٍ وَأَنْدَرُونِي
 بِالْجَمَّةِ الْوُفَادَ، فَلَمَّا وَفَّيْتُهُمْ أَنِّي لَا أَمْنَحُ عَلَيْهِمْ مَا فَتَحَ اللَّهُ عَلَيَّ مِنَ الرَّشَادِ

تَخَفَّتْ عَنْقِي بِجَدَالِ الْكَبِيرِ الْمُتَعَالِ وَتَذَكَّرْتُ قِيَامِي فِي حُضُورِهِ لِحِسَابِ الْهَمَلِ
فَكَرْتُ اشْغَالِي وَشَتَرْتُ لِانْجَاحِ التَّاسِهِمْ أَذِيلِي، فَهَرَبْتُ مِنَ الْحَضَارَةِ إِلَى الْجَمَلِ
الْعَلِيِّ، كَيْ أَهْلَ فِي الْجَزْرِ امْسَالِي، وَاحْتَرْتُ الزَّوَايَةَ فِي الْبَوَادِي وَتَجَنَّبْتُ الْحَاثِلِ
وَالْبَوَادِي، فَأَقْبَلْتُ هُنَا شَهْرًا أَلْيَوْمًا أَوْ يَوْمَيْنِ، فَشَرَعْتُ فِي تَحْرِيرِ مَسُودَةٍ
تَفْهِيماً لِلْفَائِخَةِ وَجَمَعْتُ فِيهَا أَشْيَاءَ كَثِيرَةً مِنْ فَوَائِدِ الْهَيْفَةِ وَبَلَّغْتُ عَجَبِي
فِي اسْتَوْعِينِ بِفَضْلِ اللَّهِ رَبِّ الْخَافِقِينَ؛

ثُمَّ حَظَرْتُ بِإِلَى الْفَاتِرِ أَنَّ اللَّهَ سَمَى الْفَائِخَةَ بِالْقُرْآنِ الْعَظِيمِ وَقَالَ النَّبِيُّ
لَكَرِيمِ صَلَّعَ إِنَّهَا أُمُّ الْقُرْآنِ وَأَسَاسُهُ فَوَاجِبٌ أَنْ أَقْرِهَا عَلَى نَبْطِ بَدَنِجِ
حَيْثُ أَجَزْتُ فِي ذَلِيلِ كَلِمَاتِهَا آيَاتِ الْقُرْآنِ مُرَاعِيًا وَخَدَّةَ الْمَرَامِي فِي كُلِّ مَقَامٍ
لِيَكُنَّ عَلَى أَتْهَامَتْنِ مَسْتَبِينٌ وَالْقُرْآنُ كُلُّهُ شَرْحُهَا الْمَبِينُ، كَيْفَ لَا يَقُولُ
مُنْزِلُهُ الرَّاقِدُ كِتَابُ أَحْكَمَتِ آيَاتِهِ ثُمَّ فَصَّلْتُ مِنْ لَدُنْ حَكِيمِ خَيْرِيهِ
فَأَمَرْتُ أَنْ أَجْعَلَ تَفْسِيرَهَا جُزْءًا مُفْرَدًا مِنْ تَفْسِيرِ الْكَبِيرِ الْمُسَكَّنِ
بِتَبْصِيرِ الرَّحْمَنِ الَّذِي قَسَمْتُ تَحْرِيرَهُ وَتَوَيْتُ تَحْذِيرَهُ بِحَوْلِ اللَّهِ
الْقَدِيرِ وَأُسَمِّيَهُ وَأَضَعُ الْبَيَانَ فِي تَفْسِيرِ أُمِّ الْقُرْآنِ فَكَرَرْتُ النَّظَرَ فِي
الْبَيَاضِ وَأَخَذْتُ أَتَسَيِّصُ الْأَوَائِدَ مِنَ الْغِيَاضِ، وَأَجْمَعُ مُتَفَرِّقَاتِ الْفَضَائِضِ

وَتَوَحُّدِ الْمُعَاوِدِ لِلْمُتِمَّاحِضِ نَجَاءً بِحَمْدِ اللَّهِ كَمَا سَأَرَاهُ مَا يَرْوَقُ التَّوَاطُّرُ وَيَسْرُ الْوَلُ
وَيُزِيحُ وَسَاوِسَ الضُّدِّ وَرَدَّ يَزِيلُ دَسَائِشَ أَهْلِ الْفُتُورِ فَوَاللَّهِ الَّذِي خَضَعَ
لِحِلَالِ عِزَّتِهِ وَجُودَ الْبَطَالِ، وَحَجَّرَتْ عَنْ إِذْرَافِ حِكْمَتِهِ عَقُولَ أَهْلِ الْكَمَالِ
إِنَّ الْفَاحِشَةَ لَشَا مِلَّةٌ عَلَى جَمِيعِ مَقَامِدِ الْقُرْآنِ، حَافِلَةٌ بِمُهْمَاتِ أَنْكَارِ الْإِثْمِ
وَمَذَاهِبِ التَّفْسِيرِ الْمُسْتَمْتَرِ بِوَاضِحِ الْبَيَانِ فِيهِ حُلٌّ دُمُوزِيهَا الْمَجُودَةُ، وَكُشْفُ كُنُودِ
السُّتُورَةِ، لَمْ يَأْتِ مِنَ الْاِخْتِرَانِ (فِيهَا أَغْلَمُ أَحَدٌ بِمِثَالِهِ وَلَمْ يَنْسُجْ نَاسِجٌ عَلَى مِثَالِهَا
فَهُوَ حَرِيٌّ بِأَنْ يَرْغَبَ فِيهِ الْعَوَامُّ وَالْخَافِضُ وَيَضُرَّ فَوَاقِفَائِشِ أَوْ قَاتِلِهِمْ فِي
مَطَالَعَتِهِمْ كَأَجْطَافِشِ وَيَسْبُدُ لَوْ أَلْزَمْتُهُمْ أَمُورِي فِي تَحْقِيقِهَا بِكَمَالِ الْإِخْلَاصِ مِنْ قَبْلِ
أَنْ يَأْتِيَ أَمْرٌ لَا يَحِيصُ عَنْهُ وَلَا مَنَاصُ

هَذَا وَلَا أَفْتَحِرُ بِهِ لِأَنَّ الْفَتْرَةَ عِنْدَ اللَّهِ مَكْرُوهَةٌ مَذْمُومَةٌ، وَالْمُفْتَحِرُ مِنْ فَضْلِ
اللَّهِ مَحْرُومٌ. وَلَمْ أَفْعَلْ فِي ذَلِكَ شَيْئًا غَيْرَ الَّذِي أَرَدْتُ إِلَى الْفَاحِشَةِ مَا كَانَ فِي الْقُرْآنِ
مُسْتَفْرَقًا فِي بَابِهَا، وَأَهْرَدْتُ مَا كَانَ كَامِنًا فِي خُطَابِهَا، فَتَحَصَّنْتُ بِمَحْضِ الْقُرْآنِ
أَوْنًا وَآخَرَدْتُ كُلَّ الْإِخْلَافِ إِنْ أُنْخِرَ مِنْ دَائِرَتِهِ بَاطِنًا، وَمَهْدَا سَهْلَ عَلَى مَنْ
رَزَقَهُ اللَّهُ حِفْظَ كِتَابِهِ وَمَسَحَ عَلَيْهِمْ فَهْمَ خُطَابِهِ وَكُلُّ مَيْسَرٍ لِمَا خَلَقَ لَهُ وَلَمْ
أَقُلْ فِيهِ شَيْئًا يَنْتَقِزُ نَفْسِي حَذَرًا أَنْ يَمْتَلِكُنِي نَارُ الدُّمُوسِ لِأَنَّ التَّفْسِيرَ بِالرَّأْيِ
مِنْ غَيْرِ مُسْتَكْبَحٍ حَرَامٌ وَصَاحِبُهُ فِي الدَّائِرَتَيْنِ مَلَامٌ وَهَذَا أَنَا أَبْرَأُ إِلَى اللَّهِ
لَوْ كَانَ قَبِيحًا بَارِعًا مَوْلَعًا بِمَطَالَعَةِ الْكُتُبِ مَا تَرَجَّحَ اللَّهُ عَلَيْهِ ١٢ مَرَّةً

تَكْفُرُهُ مِنْ كُلِّ كَلِمَةٍ تُخَالِفُ مَرَادَ اللَّهِ أَفَلَا تَطَاقِبُ بَيَانَ رَسُولِ اللَّهِ أَفَ
 يَرْقُ لَتَفْسِيرِ جَمَاعَةِ الصَّحَابَةِ أَوْ لَاتَوَافِقِ آسَانِيبِ الْفَصَاحَةِ وَابْلَاغَةِ فَيَا لِلَّهِ
 إِنِّي أَدِينُ وَعَلَيْهِ اعْتَمَدْتُ فِي هَذِهِ دُرُومِ الشَّادِي،

مُقَدِّمَةٌ

فِي أُصُولِ التَّفْسِيرِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي اثْبَتَ أُصُولَ دِينِهِ وَبَيَّنَّ فُرُوعَهُ فِي السَّمَاءِ وَتَبَيَّنَ مَبَانِيهِ بِالْأَخْسَنِ خَلْقِهِ
 وَأَخْلَمَ آيَاتِهِ بِصُحُفِ كِتَابِهِ فَمَا اتَّقَنَ الْإِسْمَاءَ وَالصَّلَاةَ وَالسَّلَامَ عَلَى مَنْ يُعِشَ
 بِالْحَنِيفِيَّةِ الْبَيْضَاءِ وَأُرْسِلَ بِأَنْجَحِ الْقَوَائِمِ وَالْحُكْمِ الْبَوَالِغِ فَاجْعَلْ بِهَا عَرَبَ الْعَرَبِ
 وَأَقْوَى رَجْوِ مَعَ الْكَلِمَةِ فَأَبْلَكُمْ مَصَاقِعَ الْخُطْبَاءِ وَصَلَّى إِلَهُهُ وَأَصْحَابَهُ الَّذِينَ شَعَرُوا بِالتَّبْلِغِ دِينَهُ
 فِي الْقُرْآنِ وَالْبَيِّنَاتِ وَسَعَوْا فِي إِخْيَاءِ آثَارِهِ عَلَى رُغْمِ أَنْوَافِ الْأَعْدَاءِ وَعَلَى تَأْيِيدِهِمْ

له قال الزمخشري في المغاني المقدمة الجماعة التي تتقدم ما لم يشر من قدم بمعنى تقدم موقداً استعملت لأول كل شيء
 فتقبل منه مقدمة الكتاب ومقدمة الكلام وتقبل الدليل خلفه (وهو) وتبعه التفتا الذي في المطول حيث اقتصر على
 الكسر وقال المقدمة من قدم بمعنى تقدم موقداً

۱۵ ابن کثیر جلد ۹ ص ۱۷ ۱۲ منہ ۵ مجمع البحار ۲ ص ۲۳۰ ۱۲ منہ

حَيْثُ قَالَ تَعْلَمُ أَنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ (الغنية ٢٩) وَقَالَ أَيْضًا وَمَا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ إِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوا فِيهِ (النحل ١٠٤) فَهُوَ مَكَلِّ اللَّهُ عَلَيْهِ وَإِلَيْهِ وَكَلَّمَ كُلَّ مِمَّا
ذَكَرَ آمِينَهُ فِي خَطَايَاهُ وَمُسَبِّحِينَ مُسَرِّدِينَ مِنْ كِتَابِهِ

ثُمَّ التَّفْسِيرُ بِلِسَانِ الْقُرْآنِ مُرَاعِيًا أَسَالِيبَ الْعَرَبِ وَتَرَائِبَ الْأَدَبِ مِنْ غَيْرِ تَحْرِيفٍ
وَتَوِيلٍ مِنْ قَلْبٍ زَلَّيْجٍ وَلَا عَادٍ وَلَا تَأْوِيلٍ غَيْرِ سَائِلٍ رُكَمَا قَالَ اللَّهُ تَعَالَى، إِنَّا جَعَلْنَاهُ قُرْآنًا
عَرَبِيًّا لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ (يوسف ١) وَقَالَ، فَإِنَّمَا يَتَذَكَّرُ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ (الزمر ١٢)
وَقَالَ، قُرْآنًا عَرَبِيًّا غَيْرِ ذِي عِوَجٍ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ (سجدة ٢) فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْجٌ
فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ (المرن ٣) وَتِلْكَ الْأُمُورُ
الَّتِي كُنْتَ كَانَتْ مَدَامَ السَّلَفِ مِنَ الصَّابِقَةِ الَّذِينَ أَخَذُوا الْقُرْآنَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
مُشَافَهَةً مِنْ غَيْرِ وَاسِطَةٍ أَنْظُرْ فِي تَفْسِيرِ حَبْرِ الْأُمَّةِ وَقَدْ ذَكَرَ الْأُمَّةَ عَبْدُ اللَّهِ بْنِ
عَبَّاسٍ يَحْدُثُ مَبْنِيًّا عَلَى هَذَا الْأَسَاسِ قَالَ الْحَافِظُ عِمَادُ الدِّينِ وَالدَّوْنِيُّ ابْنُ كَثِيرٍ مَا نَفَقَهُ
فَإِنْ قَالَ قَائِلٌ فَمَا أَحْسَنَ طَرِيقِ التَّفْسِيرِ فَالْجَوَابُ أَنَّ أَحْسَنَ الطَّرِيقِ فِي ذَلِكَ أَنْ يُفَسَّرَ
الْقُرْآنُ بِالْقُرْآنِ فَمَا أُجْمِلَ فِي مَكَانٍ فَإِنَّهُ قَدْ بَسِطَ فِي مَوْضِعِ الْخُرُوفِ أَنْعِيَاكَ ذَلِكَ
فَعَلَيْكَ بِالسَّنَةِ فَإِنَّهَا شَارِحَةٌ لِلْقُرْآنِ مُوَضِّعَةٌ لَهُ - وَوَيْضًا قَالَ -

وَالْفَرَضُ أَنَّكَ تَطْلُبُ تَفْسِيرَ الْقُرْآنِ مِنْهُ فَإِنْ لَمْ تَجِدْ فَمِنْ السَّنَةِ كَمَا قَالَ رَحَلُ

۱۵ ابن کثیر ملبا۔ ص ۱۷۱

مَعْنَى الْكَلَامِ وَالْمُقْتَضِبِ مِنْ قُوَّةِ الشَّرْحِ وَهَذَا هُوَ الَّذِي دَعَا بِهِ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِابْنِ عَبَّاسٍ حَيْثُ قَالَ اللَّهُمَّ فَتِّهْهُ فِي الدِّينِ وَعَلِّمَهُ التَّأْوِيلَ وَالَّذِي عَنْهُ عَلَى أَنْ يَقُولَ إِلَّا فَهْمًا يُؤْتَاهُ الرَّجُلُ فِي الْقُرْآنِ وَمِنْ هَذَا اخْتَلَفَ الصَّحَابَةُ فِي مَعْنَى آيَةِ فَاتَّخَذَ كُلُّ بَرَاءِيهِ عَلَى مَذْهَبِهِ نَظَرًا وَلَا يَجُوزُ تَفْسِيرُ الْقُرْآنِ بِعَجْرَةِ الرَّأْيِ وَالْإِجْتِهَادِ مِنْ غَيْرِ أَصْلِ قَالَ اللَّهُ وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ وَقَالَ أَنْ تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ كَلِمَاتٌ لَا تَعْلَمُ بِهَا الشَّيْءَ (فَإِنْ قُلْتُمْ) إِذَا كَانَ الْقُرْآنُ بِفَقْهِمُ كِتَابًا مُفَضَّلًا قَبِيحًا نَادِضًا وَلَمْ يَحْتَلِ اللَّهُ بِهِ رَيْبًا وَلَا عِوَجًا وَعَلَى ذَلِكَ يُفَسِّرُ بَعْضُهُ بَعْضًا، وَأَيْضًا يَبَيِّنُهُ لِبَنِي مَبْلَعَهُ بِعَمَلِهِ وَامْرَاضِهِ هَذَا شَأْنٌ، فَمَا الْحَاجَةُ إِلَى تَفْسِيرِهِ ثَانِيًا وَكَيْفَ وَقَعَ الْخِلَافُ فِيهِ مَطَاوِي تَفْسِيرِهِ وَمَخَاوِي التَّغْيِيرِ

(قُلْتُمْ) الْقُرْآنُ كَلَامٌ مُبْدِئُ النَّظْمِ لِيُفَهِمُ جَمْعَ الْمَعَانِي الرَّشِيقَةِ وَالْأَسْرَادِ الدَّرِيقَةِ فِي الْإِنْفَاقِ وَالْعَوِيدِ، وَطَوَاوِي لِيَكُنَّ الْأَطْنَقَةُ، فِي مَطَاوِي الْعِبَارَاتِ الْوَجِيزَةِ وَحَوِي لِمَطَالِبِ الْعَالِيَةِ وَالْمَقَامِيَةِ الْبَاسِقَةِ الَّتِي لَا يَجْرِي عَلَى الْغُرْهَا إِلَّا الْجَهَابَةُ وَلَا يَبْلُغُ عَلَى أَوْفَرِهَا إِلَّا الْمَهْرَةُ الْكَمَلَةُ فَكَاسَبَ بَلْ وَجَبَ أَنْ يُبَرِّزَ اسْتِرَادُهُ وَيُكْشَفَ اسْتَارُهُ لِأَنَّ التَّغْيِيرَ تَغْيِيلٌ مِنَ الْفَسْرِ هُوَ الْبَيَانُ وَالْكَشْفُ وَيُقَالُ هُوَ تَلَوَّبُ السَّفَرِ تَقُولُ اسْفَرَّ الصَّبْرُ إِذَا اضْمَأَزَمَ، وَقِيلَ مَا خُذْ مِنَ التَّفْسِيرَةِ وَهِيَ اسْمٌ لِمَا يَعْرِفُ بِهِ الطَّبِيبُ الْمَرَضَ وَأَمَّا الْاِخْتِلَافُ فَلَمْ يَكُنْ فِي الصَّحَابَةِ إِلَّا قَلِيلٌ لَاحِدًا وَكَذَلِكَ فِي تَلَامِيذِهِمْ أَيْ التَّالِعِينَ

له تفسيران جلد ثانی صفحہ ۱۲ منہ سے لقمان السیوطی جلد ۲ صفحہ ۱۲ منہ

لَهُمْ بِالْإِحْسَانِ الَّذِينَ أَخَذُوا الْقُرْآنَ عَنْهُمْ بِالْإِتْقَانِ وَأَمَّا مَنْ بَعْدَ هُمْ مِنْ أَوْتَمَّةِ
السُّنَّةِ فَغَالِبُ اخْتِلَافِهِمْ فِي الْإِسْتِنْبَاطَاتِ وَالْمُصَادِقَاتِ وَالْمَحَاطِلِ وَهَذَا هُوَ اخْتِلَافُ
التَّنَوُّعِ لَا اخْتِلَافُ الشَّعَادَةِ وَذَلِكَ لِأَسْبَابٍ مِنْهَا سِقَةُ كَلَامِ الْعَرَبِ، قَالَ الشَّافِعِيُّ
لِسَانَ الْعَرَبِ أَوْسَعُ الْلِسَانِ مَذْهَبُ الْكَلَامِ أَلْفَاظُ الْأَعْلَامِ يُحْصِي بِمَجْمُوعِ عِلْمِهِ
إِنْسَانٌ غَيْرُ مَبْنِيٍّ رَوْنِهَا شَيْعُ عُلُومِ الْحِكْمَةِ الْيُونَانِيَّةِ (وَمِنْهَا) تَنَوُّعُ أَذْوَاقِ
الطَّيَارِعِ وَتَفَنُّنِ الْمَنَاجِحِ وَالْمَسَالِكِ وَمِنْهَا تَفَاوُتُ مَذَاهِبِ الْعُلَمَاءِ وَتَفَادُّشُ
مَعَارِجِ الْفَهْمِ وَالْقُرْآنِ جَامِعٌ لِلْجُمَّةِ حَادٍ عَلَى جُمْلَةِ الْمَسَالِكِ الْمُهِمَّةِ ط
أَصُولُهُ لَا تَتَنَاقَضُ وَفُرُوعُهُ لَا تَتَعَارَضُ (فَالْفَقِيهِ) مَثَلًا يَنْظُرُ فِي آيَةٍ وَاسْتَبَاطِ
الْأَحْكَامِ الْعَمَلِيَّةِ، أَوْ يَحْمِلُ الظُّهْرَ عَلَى الظُّهْرِ لِطَبَاقِ بَيْنِ الْجُزْئِيَّاتِ الْفَقْهِيَّةِ
وَالْمُسْتَكْلَمِ يَلَاخِظُ فِيهَا تَطَابُقَ الْعَقُولِ وَالنُّقُولِ وَاقَامَةَ الْحُجَّةِ وَالزَّامِ الْمَضْمُونِ
(وَالْأَدَبِ) يَتَخَوَّصُ فِي بَحْثِ الْأَدَبِ مَرَاغِيًا أَسَالِيبَ الْعَرَبِ (وَالزَّاهِدِ)
يَرَى لِحَقِّ سُبْحَانَهُ بَاقِيًا أَوْ مَاسِوَالَهُ فَغَايَةً فِي تَفْسِيرِ حَقَائِقِ الْعِبَادَاتِ بِدَقَائِقِ
الْإِشَارَاتِ (وَالْفُكْلِ) يُفَسِّرُ بِحَسَبِ رُجْحَانِ قَلْبِهِ وَمِثَالَانِ لِمَبْنِيِّهِ، وَأَنْتَ خَبِيرٌ
بِأَنَّ هَذَا لَيْسَ بِاخْتِلَافٍ مَعِينٍ فِي الْحَقِيقَةِ بَلْ مَنَاشَأُ اخْتِلَافٍ لِمَبَانِعِ الْخَلِيقَةِ
وَمَا لَوْ فَاتِهِمُ الْإِنْفِقَةُ، فَالْعَيْنُ وَاحِدَةٌ وَالْمَشَارِبُ مُتَشَعِّبَةٌ، وَالْقِبْلَةُ
وَاحِدَةٌ وَالْجِهَاتُ مُتَفَرِّقَةٌ، فَاخْذُ كُلُّ مَشْرَبَةٍ، وَذَهَبَ مَذْهَبُهُ، وَهَذَا

له الرسالة الاصولية من المضمومة بكتاب الاصول ١٢٠٠

أَمْرٌ لَا يَتَجَبَّبُ مِنْهُ الْعُقُولُ، وَلَا يَرْتَابُ فِيهِ أَرْبَابُ الْعُقُولِ، لِأَنَّ الْكَلَامَ الَّذِي
لَيْسَ لَهُ مَعْنَى ثَانٍ فَهُوَ بِمَنْزِلَةِ السَّاقِطِ عَنْ دَرَجَةِ الْإِعْتِبَارِ عِنْدَ الْبَلَّغَاءِ بَلْ هُوَ
حَرِيٌّ بِأَن يُعَدَّ مِنْ أَضْوَاتِ الْبَهَائِمِ الْعَجَمَاءِ وَأَمَّا اخْتِلَافُ أَهْلِ الزِّيْعِ وَالْإِخْلَافِ
فَلَا يَعْجَبُ بِهِ عَاقِلٌ فَضْلًا عَنْ عَالِمٍ حَافِلٍ أَفْوَافِلِ نَافِلٍ فَهَذَا أَنَا أَشْرَعُ فِي
الْمَقْصُودِ بِجَوَلِ اللَّهِ الْمَعْبُودِ، وَالْإِلْتِمَاسُ مِنَ الْكَمَلِ أَنْ يَغْفُوا الزَّلَّ وَيَسُدُّوا الْخَلَلَ
لِأَنَّ جُهْدَ الْمُقِلِّ مَشْكُورٌ وَبَازِلُ الْوُسْعِ مَعْدُودٌ فَإِنْ أَصَبْتُ فَمِنَ اللَّهِ الْكَلِيمِ
وَإِنْ أَخْطَأْتُ فَمِنَ نَفْسِي اللَّئِيمِ وَاللَّهُ أَسْأَلُ أَنْ يَعْصِمَنِي مِنَ الْخَطَلِ
وَيَحْفَظَنِي مِنَ الْخَبَلِ

وَأَنَا عَبْدُ النَّاسُوتِيِّ مُحَمَّدُ إِبْرَاهِيمُ مِيرَاثِي الْكَلْبِيِّ

له مطول بحث تنقيده ۱۲۸

دیباچہ تفسیر واضح البیان فی تفسیر ام القرآن

بسم اللہ الرحمن الرحیم

لحمد لله منزل القرآن، هدى للناس و بينات من الهدى والفرقان،
والصلوة والسلام على رسوله محمد المبعوث بواضح البيان و اوضح
لبرهان، و على آله و اصحابه المبلغين عنه برسوخ العلم و وثوق الاذعان،
ما دام القمران و دار الدوران

ما بعدہ بندہ حقیر محمد ابراہیم میریا لکوٹی نکتہ رس اور دقیقہ شناس اصحاب کی خدمت
میں عرض پرداز ہے کہ قرآن مجید ایک بحر ناپید انکار ہے کیوں کہ وہ کلام خالق جبار ہے۔
ہزار برس سے زائد عرصہ گزر گیا کہ بڑے بڑے نامی علماء جو اپنے اپنے زمانے میں آسمان
علم و فضل کے آفتاب و ماہتاب ہوئے ہیں۔ کیا محدثین مثلاً "امام ابو جعفر طبری" اور حافظ
عماد الدین ابن کثیر اور کیا متکلمین مثلاً "امام فخر الدین رازی" اور قاضی بیضاوی" اور کیا
زبان عرب کے کامل استاد و ادیب مثلاً "جار اللہ زعفری" اور کیا اصحاب اشارات و دقیقہ
مثلاً "محمی الدین ابن عربی" سب نے اپنے اپنے مذاق کے مطابق قرآن شریف کی تفسیریں

لکھیں اور اپنے علم و فہم کی رسائی بھر حل مطالب، استنباط مسائل، کشف لطائف اور بیان نکات میں پوری کوشش کی۔ (خدا تعالیٰ ان سب کو جزائے خیر عطا کرے) لیکن قرآن مجید ابھی تک اسی طرح ہے کہ اس کو کسی نے چھو تک نہیں۔ کیوں نہ ہو، عالم الغیب حکیم و خیر کا کلام ہے، جس کے کام یعنی خلق کے اسرار ابھی تک محصور نہیں ہو سکے۔ یہاں تک کہ بڑے بڑے علمائے مادیات گھبرا کر پکار اٹھے۔ NATURE UNSUBDUED

یعنی ”قدرت کے کام کسی کے احاطہ میں نہیں آسکتے۔“
تو اس کے امر و کلام کے اسرار و حکم کس طرح ختم ہو سکیں۔ چنانچہ اسی معنی میں فرمایا۔ قل لو كان البحر مدادا لكلمت ربى لنفد البحر قبل ان تنفد كلمت ربى ولو جئنا بمثلہ مددا (کہف، پ ۱۶)
”اے پیغمبر! ان سے کہہ دیجئے کہ اگر میرے رب کے کلمات کے لیے سمندر سیاہی بن جائے تو سمندر ختم ہو جائے گا، پھر اس کے کہ میرے رب کے کلمات ختم ہوں، اگرچہ ہم اس کی مثل اور مدد لائیں۔“

انسانی حوائج و تعلقات اور اپنے زمانے کی ضروریات پر نظر رکھنے والے علماء نے قرآن مجید میں سے صراحہ ”یا مرزا“ و اشارۃ ”ضروریات کو پورا کیا لیکن انقلاب زمانہ میں سے یہ بھی ہے کہ لوگوں کی ذہنیت ہر زمانہ میں بدلتی رہتی ہے اور اسی کی متابعت میں ان کی طبیعتیں اثر پذیر ہوتی ہیں۔ بعض امور ایک زمانہ میں بطور مسلمات و مبادی کے تسلیم کئے جاتے ہیں اور ان پر کسی دلیل کی حاجت نہیں ہوتی بلکہ دلیل کا مطالبہ قابل ملامت و موجب تحقیر سمجھا جاتا ہے لیکن دوسرے زمانے میں وہی امور محتاج دلیل بلکہ محل انکار ہو جاتے ہیں۔ بلکہ قرآن مجید کے نصوص متعلقہ اور شواہد قدرت سے اعراض کرنا موجب فخر و علم و دانش سمجھا جاتا ہے۔ اللہم ارنا الاشیاء کماہی

دیگر یہ کہ کسی دعویٰ کے بیان کرنے یا دعویٰ اور دلیل میں مطابقت کے واضح کرنے یا اس کی تائید میں نظائر کے پیش کرنے یا کسی حکم کی علت کے قرار دینے اور اسے اس کے نظائر میں دائر کرنے اور مخالفین کے شبہات و اعتراضات کے جواب دینے میں ہر ایک عالم کا مذاق طبع، طرز استدلال اور طریق بیان جدا ہوتا ہے اور ہر ایک کے علم کی وسعت، انتقال ذہن اور دماغ کی رسائی کے مدارج بھی مختلف ہوتے ہیں۔ اس لیے ہر عالم

کا فرض ہے کہ اپنی تحریر و تقریر اور تدریس میں اپنے مذاق طبع اور ذوق علمی کے ساتھ اپنے زمانے کی ذہنیت اور روش کا بھی لحاظ رکھے تاکہ ابنائے زماں اس سے فائدہ حاصل کر سکیں۔

تحدیثاً "بنعمة اللہ کہتا ہوں نہ کہ فخرًا"۔ خدائے ذوالجلال کا احسان ہے کہ اس نے اس ہیچمدان کو مذاق جامع کے ساتھ اپنے زمانے کی ذہنیت و روش کی سمجھ بھی بخشی اور تحریر و تقریر و تدریس میں اس کو ملحوظ رکھنا بھی سمجھایا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ احسان ہے کہ سب مذاقات و مراعات کو قرآن و حدیث کی تصریحات اور خدا و رسولؐ کی منشا کے ماتحت رکھنے کی توفیق بخشی ہے اور معقول و منقول کی موافقت و مطابقت میں سردار کو سردار اور خادم کو خادم رکھنے کی قوت بھی عطا کی ہے۔ ان ہر دو طریق کی جامعیت ہر زمانے میں نہایت کم رہی ہے اور ایسے علماء ہر زمانے میں خال خال رہے ہیں۔

در کفے جام شریعت در دگر سندان عشق
ہر ہوساکے نداند جام و سنداں باخشن

شکایت زمانہ حال

پہلے زمانوں میں اتنی خیر تھی کہ مخالفین سے مناظرہ کرنے والے، مسائل دینیہ میں تصنیف کرنے والے، قرآن شریف کا درس دینے والے اور اس کا ترجمہ و تفسیر لکھنے والے علماء اہل کمال ہوا کرتے تھے اور کمال علمی کے علاوہ جمال علمی سے بھی مزین ہوتے تھے۔ وہ اپنی ذمہ داری کو محسوس کرتے تھے لیکن اس زمانے میں تو یہ آفت ہے کہ یہ سب کام یعنی مناظرہ، وعظ گوئی، تصنیف و تالیف، درس قرآن اور تفسیر نویسی پیشہ ہو گئے ہیں کہ ان کو وجہ معاش کے طور پر اختیار کیا جا رہا ہے اور ہر کس و نا کس نہایت جرات و دلیری سے ان میں قدم انداز ہو رہا ہے۔

بعض اردو یا انگریزی خوان جن کی قابلیت کا مدار محض اردو یا انگریزی تراجم ہیں یا کسی عالم کی صحبت کی وجہ سے مذہبی مذاق رکھتے ہیں اور خود براہ راست علوم متعلقہ قرآن و حدیث اور دیگر فنون عقیدہ سے ناواقف ہیں۔ اور اس تہی دستی اور کم مائیگی کے

بعد کج فہمی، فساد اعتقاد اور زلیغ قلبی کے آفت زدہ بھی ہیں اور ان سب کے باوجود تمام اسباب علم و فہم سے خالی ہونے کے ان کے دماغ پر ہمہ دانی کا جن بھی سوار ہے۔ وہ بھی علامہ تفتازانی بن کر قرآن شریف کا درس دینے بیٹھ جاتے ہیں یا مخالفین کے مقابلے میں ڈٹ جاتے ہیں بلکہ ان میں سے بعض نہایت جرات کر کے قرآن شریف کی تفسیر بھی لکھ ڈالتے ہیں۔ وہ درس میں، مناظرہ میں، عام تصنیف میں تفسیر قرآن میں (اجتہادی امور میں نہیں بلکہ اعتقادی اور بنیادی اصول میں) نصوص قرآن و حدیث کی بھی پرواہ نہیں کرتے اور بالکل بے فکر ہو کر سلف صالحین اور قواعد علمیہ اور بڑے بڑے آئمہ کی تصریحات کے خلاف بے جا و باطل تاویلیں بلکہ تحریفیں کرتے جاتے ہیں۔ ایسے مدرس، ایسے مناظر اور ایسے مفسر بجائے اس کے کہ قرآن کے مطالب بیان کریں اور اس کی تفسیر بتائیں۔ اگر اعتقاداً اور قولاً "نہیں تو عملاً" ضرور قرآن مجید کی ترمیم کرنا چاہتے ہیں۔ پھر غضب یہ کہ شرک و بدعت، کفر و ضلالت، تاویل باطل و تحریف کا نام حقائق و معارف اور نکات و لطائف رکھا جاتا ہے اور اس پر لوگوں کی بدذوقی کا یہ عالم ہے کہ ان اباطیل کو جھوم جھوم کر اور سبحان اللہ، سبحان اللہ کہہ کر ماننے کے لیے تیار ہیں۔ فالی اللہ المشتکی۔ یہ سب کچھ قلت علم اور ذمہ داری کو نہ سمجھنے کی آفت سے ہے۔

والعیاذ باللہ

خوش اعتقاد احباب کا تقاضا

زمانے کے حالات سے متاثر ہو کر اور اس کی ضرورت کو سمجھ کر بعض خوش اعتقاد احباب محض اپنے حسن ظن سے سالہا سال سے میرے گرد ہو رہے تھے اور باوجود میرے انکار پر انکار کرنے کے وہ لگاتار اصرار پر اصرار کر رہے تھے۔ (اور بعض تو بارہا ناراضگی کا اظہار بھی کر چکے ہیں) کہ میں اردو زبان میں قرآن شریف کی ایک تفسیر لکھوں، جس میں قرآن و حدیث کی تصریحات کی ماتحتی میں مذاق و ضروریات زمانہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے قرآن مجید کے لطائف اور تعلیم قرآن کے اسرار و حکم ظاہر کروں یا کم از کم اردو ترجمہ اور حاشیہ پر فوائد مفیدہ متضمن لطائف و نکات لکھوں۔ جن میں منکرین کے شبہات و اعتراضات کے جواب اور ملحدین کے الحاد کی تردید اور بعض کم علم و کج

اعتقاد مترجمین و مفسرین زمانہ کی غلط فہمی و مغالطہ دہی اور کج روی کو بھی طشت از بام کر دوں۔

ہر چند کہ ان دوستوں کا سوال و اصرار ضرورت کے لحاظ سے بالکل بجا تھا اور ان کی یہ خواہش و آرزو نہایت نیک اور مقصد بہت پاک تھا، لیکن میں اس خدمت کے پورا کرنے سے بچند وجوہ قاصر رہا۔

اول:- اس وجہ سے کہ تفسیر قرآن کے لیے جو علمی و عملی قابلیت درکار ہے، وہ مجھ میں نہیں ہے اور جو صاحب مجھے اس قابل جانتے ہیں وہ حسن ظن سے کہتے ہیں، ورنہ من آنم کہ من وانم۔

دوم:- یہ کہ خدائی توفیق کے بعد اس عظیم الشان خدمت کے انجام دینے کے لیے جن اسباب و آلات کی ضرورت ہے، وہ مجھے میسر نہیں اور جو کچھ کتب خانہ لوگوں کی نظر میں میرے پاس موجود ہے، وہ اس خدمت کے لیے میرے نزدیک کافی نہیں۔ کسی کام کے با حسن صورت انجام دینے کے لیے جن اسباب کی ضرورت کاریگر کے ذہن میں ہوتی ہے، دوسرے لوگ اسے نہیں سمجھ سکتے۔

سوم:- یہ کہ زمانہ قلت علم اور قحط الرجال کا ہے۔ حل مشکلات کے لیے میرے نزدیک جیسے علماء کی طرف رجوع ضروری ہے۔ وہ زمانہ حال میں (حضرات علمائے عصر معاف رکھیں۔) بفحوائے ان الکرام قلیل بہت کم ہیں اور اگر شامت اعمال سے کسی سے کچھ دریافت کرنے کی بیوقوفی کر بھی لی جائے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ فضیلت و رسوائی کا ٹیکا اپنے ہاتھوں سے اپنی پیشانی پر لگا لیا۔ اعاذنا اللہ منہا

چہارم:- یہ کہ اگر ان سب مراتب سہ گانہ سے تجاوز بھی کر لیا جائے اور جو کچھ بھی خدا نے سمجھ بخشی ہے اور جو اسباب و آلات اس نے اپنے فضل سے عطا کئے ہیں۔ بغیر کسی کی طرف رجوع کرنے کے صرف انہی سے کام لیا بھی جائے تو ان دنیوی اشغال و فرائض کو بجالاتے ہوئے جو میرے گلے پڑ چکے تھے، روزانہ ایک آیت بھی نہیں لکھ سکتا تھا۔ با اوقات احباب کے تقاضے سے متاثر ہو کر کچھ لکھنا شروع بھی کیا تو دو چار روز کے بعد پھر رہ گیا، کیوں کہ جملہ امور جو کسی آیت کے متعلق خدا تعالیٰ نے محض اپنے کرم سے مجھے

سمجھائے ہیں یا دیگر بزرگوں کی تفاسیر سے حاصل ہوئے ہیں۔ ان سب کے بیان کرنے میں خوف طوالت دامن گیر ہو جاتا اور اختصار و انتخاب سے اپنی طبیعت نہ بھرتی۔ بلکہ انتخاب میں تردد واقع ہو جاتا کہ کس بات کو چھوڑوں اور کس کو لکھوں۔ پھر اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ طبیعت اکتا کر چھوٹ جاتی اور تفسیر و نحشیہ کا کام ترک کر دیتا پڑتا۔

دنیوی اشغال (انتظام زمینداری اور تعلقات میونسپلٹی نے میرے اوقات کو ایسا گھیرا کہ عملاً علمی خدمت تو درکنار ذہناً دماغی توجہ میں بھی کمی ہو گئی۔ اسی ادھیڑ بن میں کئی سال گزر گئے اور میں بنی اسرائیل کی طرح اسی حیرت و تردد کے بیابان میں ڈوبیں رہ گیا۔ آخر دنیوی اشغال و تفکرات دن بدن بڑھتے گئے۔ بدنی و دماغی قوی مضلل ہونے لگے اور قلبی حظوظ میں بھی کمی آنے لگی تو مجھے اپنی حالت پر تاسف ہوا اور میں نے اپنی اس نئی افتاد میں تبدیلی اور انقلاب ضروری سمجھا، لیکن پیش افتادہ معاملات و تعلقات کو چھوڑنا اور شہر اور ملک کے لوگوں سے منہ موڑنا آسان نہیں تھا۔ ادھر اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں افسوس پیدا کیا اور ادھر ایک عزیز بٹنے جسے مجھ سے واقفیت سے زیادہ حسن ظن ہے۔ مجھے اس مضمون کا خط لکھا کہ

”آپ کی عمر کا گرانمایہ حصہ رائگاں جا رہا ہے۔ صحت دن بدن خراب اور قوت روز بروز کم ہو رہی ہے۔ جب قوی بالکل مضلل ہو جائیں گے اور دل میں خدمت قرآن کا ولولہ جوش مارے گا، لیکن ضعف و ناتوانی کے مجبب کچھ نہ ہو سکے گا تو جو حسرت و افسوس اس وقت ہوگا، اس کا تصور اس وقت کر کے ترجمہ یا تفسیر قرآن کا کام شروع کر دیجئے اور فہم قرآن کی جو نعمت اللہ تبارک و تعالیٰ نے آپ کو عطا کی ہے اس سے لطائف و نکات قرآنیہ کے تشنہ لبوں کو سیراب و خوش کام کیجئے۔“ (وہذا)

میں عزیز مذکور کی اس تحریر سے بہت متاثر ہوا۔ دو رکعت نماز توبہ کی نیت پڑھی۔ گناہوں کی معافی اور اس نیک کام یعنی تفسیر قرآن کے لیے اللہ رب العزت سے مدد طلب کی۔ اللھم انت عضدی و نصیری بک احوال و بک اصول، اللھم انی اعوذ بک من وساوس الصدر و شتات الامر

۱۔ عزیزم مولوی ظفر اقبال صاحب سلمہ اللہ، ایم اے۔ بی ٹی، لیکچرار ٹریننگ کالج، لاہور۔

نماز اور دعا سے فارغ ہو کر قلم دوات پکڑ کر لکھنے بیٹھ گیا۔ کچھ مدت بعد خدا کی قدرت کا ظہور یوں ہونے لگا کہ میرے بدنی اور دماغی قوی دن بدن مضائل ہونے لگے اور اب میں اپنی گزشتہ غفلت و کوتاہی اور موجودہ ضعف و ناتوانی پر کمال تاسف کرتا ہوں کہ اب نئے پیشتر جو محنت آسانی و خوشی سے برداشت کر لیتا تھا، اب بمشکل بھی اس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

صرفت العمر فی لغو و لہو
فہاھا! ثم ہاھا!! ثم ہاھا

گزشتہ رانگاں گئے وقت کی تلاشی تو نہیں ہو سکتی لیکن موجودہ حالت کو بھی غنیمت نہ سمجھوں اور خدا کی دی ہوئی بخشش کو اس کے بندوں میں تقسیم نہ کروں تو بھج سے زیادہ نادان کون ہو گا؟۔

لہذا اب سب طرف سے منہ موڑ کر اور خدا کی کتاب کو ہاتھ میں لے کر بیٹھ گیا ہوں اور اللہ کا کام ہے کہ اسے پورا کرائے۔ صحت و فراغت نصیب کرے اور جملہ مسائل اپنی منشاء کے مطابق اور اپنے رسول مقبول ﷺ کی سنت کے موافق سمجھائے۔ میرے قصوروں اور میری لغزشوں سے درگزر کرے اور میری اس ناچیز خدمت کو اپنے فضل عیم سے قبول فرمائے اور اسے دین و دنیا میں میرے بھی اور دیگر مسلمانوں کے لیے بھی نافع و مفید بنائے۔ آمین یا رب العالمین

ضروری التماس

انسان ہو کر میں نہیں کہہ سکتا کہ غلطی سے پاک ہوں اور فوق کل ذی علم علیم ○ (پ ۱۳، یوسف) قرآن شریف میں پڑھ کر دعویٰ نہیں کر سکتا کہ دیگر علمائے عصر سے بڑھ کر ہوں۔

لہذا ان علماء کی خدمت میں جو علم کو ایک خدا واد اور اجتہادی قوت سمجھتے ہیں اور اس نعت عظمیٰ سے بہرہ اندوز ہیں اور تفاسیر محققین پر نظریات رکھتے ہیں۔ میں ان کی علمی قابلیت اور دینی خلوص کا دل و جان سے قائل و معترف ہوں۔ التماس ہے کہ میں نے خدا کے فضل سے ان اسباب علم سے جو تفسیر قرآن کے لیے درکار ہیں، حتی المقدور میں نے پورے غور و خوض سے کام لیا ہے۔ جیسا کہ مطالعہ سے آپ پر روشن ہو جائے

گا۔ پھر بھی مانتا ہوں کہ میرے کام میں (نہ کہ خدا کے کلام میں) آپ کو کئی ایک خامیاں نظر آئیں گی۔ تو بفحوائس حدیث نبویؐ الدین النصح (مسلم) امید ہے کہ آپ بجائے اس کے کہ دوسروں کے پاس زبان شکایت و ملامت سکھولیں، مجھے اطلاع دے کر ممنون فرمائیں گے۔ کیوں کہ مجھے اطلاع دینے میں تو اصلاح کی امید ہو سکتی ہے اور دوسروں کے پاس شکایت کرنے میں در فتنہ کھلنے کا اندیشہ ہے جو آپ کو بھی پسند نہیں ہو گا۔ میں خدا کے فضل سے اس پر اپنے فہم کی رسائی بھر غور کروں گا اور سمجھ آجانے پر شکرِیے کے ساتھ قبول کروں گا اور اگر کوئی معمولی لغزش یا اختلاف رائے ہو تو امید ہے کہ اس سے آپ بھی درگزر کریں گے۔

عام ناظرین سے گزارش ہے کہ شاید آپ کو تفسیر میں کوئی ایسی بات بھی نظر آئے جو آپ کے ذاتی خیال یا اختیار کردہ مذہب یا عوام کی روش و رواج کے خلاف ہو۔ تو آپ اسے صرف اسی خیال سے درجہ قبولیت سے نہ گرا دیں کہ وہ ان چیزوں سے موافق نہیں ہے۔ کیوں کہ میں قرآن شریف کی تفسیر کر رہا ہوں نہ کہ اس سے باہر کسی کے خیال یا مذہب یا لوگوں کے رسم و رواج کی ترجمانی۔ نزول قرآن کے وقت نہ آپ تھے، نہ میں تھا، نہ یہ مذاہب متفرقہ تھے۔ باقی رہے لوگوں کے رسم و رواج تو قرآن حکیم نے ان کی اصلاح کر کے اللہ تبارک و تعالیٰ کی شریعت قائم کر دی۔ لہذا ان باتوں کو تفسیر قرآن کی صحت کا معیار قرار دینا درست نہیں۔

جب کوئی بات اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پاک ﷺ سے ثابت ہو جائے تو ایک مومن کی شان یہ ہے کہ اس کے سامنے سر جھکا دے اور کسی حیل و حجت کی گنجائش نہ رکھے۔ چنانچہ فرمایا۔ وما کان لمومن ولا مومنة اذا قضی اللہ ورسولہ امران ان یکون لہم الخیرۃ من امرہم و من یعص اللہ ورسولہ فقد ضلّ ضللاً مبیناً ○ (احزاب، پ ۲۲)

”اور کسی ایمان دار مرد یا عورت کے شایاں نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی بات کا فیصلہ دے تو اس میں ان کا کوئی اختیار (باقی) رہے اور جو اللہ اور اس کے رسول کے حکم سے سر تابی کرے گا تو وہ صریح گمراہی میں پڑ چکا۔“

اللہ تبارک و تعالیٰ کے فضل و کرم سے اس تفسیر میں یہ نہیں ہو گا کہ میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ اور جماعت صحابہ کرامؓ کی تصریحات کے خلاف پہلے ایک بات کو

اپنے ذہن میں قرار دے لوں اور پھر اس کی تائید کے لیے آیات قرآنیہ کو توڑ مروڑ کر اپنے ناقص ذہن کے سانچے میں ڈھالوں اور اسے بیان القرآن قرار دے کر اپنا اعتبار جماؤں۔ میں اس بات کو سراسر حرام مطلق جانتا ہوں۔ میرا ذہن، سمجھ، علم، عقیدہ اور خیال غرض سب کچھ قرآن و حدیث کے تابع ہے اور ہونا چاہیے۔ پس مجھے ان کے سانچے میں ڈھلنا چاہیے نہ یہ کہ الٹا قرآن و حدیث کو اپنے ذہن، سمجھ اور اپنے عقیدے کے تابع کروں کہ یہ عکس موضوع ہے۔

رشتہ در گردنم اگنہ دوست
ی برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

حضرت شیخ علی مائمیؒ نے اپنی تفسیر کے مقدمہ میں تفسیر بالرای کی کئی صورتیں لکھی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے۔

وقیل المذموم جعل الرائی معیاراً لما جاء به القرآن فیفسر علی وفقہ
تقریراً له و یتبرک ظاہر القرآن و المحمود جعل الرائی تابعاً لدلالة
القرآن (مقدمہ تفسیر رحمانی، ص ۶)

”بعض نے کہا مذموم یہ ہے کہ جو کچھ قرآن لے کر آیا، اس کے لیے اپنی رائے کو معیار بنائے۔ پس اپنی رائے کو ثابت کرنے کے لیے اس کے موافق تفسیر کرے اور ظاہر قرآن کو چھوڑ دے اور محمود یہ ہے کہ اپنی رائے کو ہدایت قرآنی کے تابع کرے۔“
میں خود ایسا کس طرح کر سکتا ہوں، جب اس تفسیر کے لکھنے سے میری ایک غرض یہ بھی ہے کہ جو لوگ ایسا کر رہے ہیں۔ ان کی غلط فہمی، مغالطہ دہی اور کج روی کو بھی طشت از بام کر دوں۔

بس آپ مضبوطی سے گرہ دے لیجئے کہ میں جس امر کو اختیار کروں گا، اس میں میری مفردانہ رائے نہیں ہوگی۔ بلکہ صاف صاف آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ میرے سامنے ہوں گی اور ایسے پاک نفوس کی ایک جماعت میرے ساتھ ہوگی، جو فرقہ بندیوں سے پشتر تھے۔

(هذا والله العادی)

آپ کا صادق!

محمد ابراہیم میر سیالکوٹی

نزہیل جموں، مورخہ ۲۵ ذی الحجہ ۱۴۳۵ھ، ۲۱ اپریل ۱۹۳۳ء

معذرت و عرض حال

”عربی زبان“ میری مادری زبان نہیں بلکہ تعلیمی زبان ہے۔ تعلیمی زبان کو اس زبان کے قواعد و محاورات سے سمجھا جاتا ہے اور یہ درجہ اصلیت کے برابر نہیں ہوتا۔ تاہم خدا کا شکر ہے کہ اس نے مجھے قرآن شریف کی محبت عطا کی ہے اور اسی محبت کی وجہ سے میں نے شروع جوانی ہی میں اپنے خاندانی حالات کو نظر انداز کر کے بجائے کرسی نشینی کے پوریا نشینی اختیار کر لی تھی۔ الحمد للہ! میں اس حالت پر خوش ہوں اور مجھے اس بات کا ہرگز افسوس نہیں ہے کہ میں نے اس تبدیلی وضع میں کچھ نقصان اٹھایا بلکہ سراسر فائدہ پایا ہے۔ ایسا فائدہ جسے دنیا دار نہیں پاسکتے بلکہ میں اللہ تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر کرتا ہوں کہ اس نے مجھے انگریزی کالج سے نکال کر اپنے دین کی خدمت میں لگا دیا۔

منت منہ کہ خدمت سلطان ہی کئی
منت بدال ازو کہ بخدمت گذاشت

اسی محبت قرآنی کی وجہ سے اور قواعد زبان و اسلوب فصحاء کی رعایت سے (کہ یہ بھی میری ذہنیت بلکہ طبیعت ہو گئی ہے) کوئی کوئی کار آمد بات سمجھ میں آ جاتی ہے۔
(والحمد للہ علی ذلک) آمین

۲۔ استاذنا حضرت مولانا سیالکوٹی مصنف تفسیر مذا زید مجہد کے والد ماجد جناب حاجی قادر بخش صاحب میر مرحوم اپنے وقت میں شریالکوٹ کے نامی رئیس اور امیر کبیر بزرگ تھے۔ سادگی اور تواضع کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ اہل علم کی بغایت عزت کرتے تھے۔ مجھ عاجز سے بھی کمال خلق سے پیش آتے تھے باوجود اس قدر تمول اور وسیع دنیا داری کے شب زندہ دار تھے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے نماز تہجد کبھی بھی فوت نہیں ہوئی ہوگی۔ قوی و مضبوط تھے، بیمار کم ہوتے تھے۔ ۹ محرم الحرام ۱۳۳۲ھ کو چھپای سال کی عمر میں وفات پائی۔ (خاکسار محمد الدین کاتب سیالکوٹی)

۳۔ استاد پنجاب محدث کامل حضرت مولانا حافظ عبدالنناب صاحب مرحوم وزیر آبادی اپنے اس اجازت نامہ میں جو انہوں نے اس عاجز کو تدریس حدیث کے متعلق عنایت کیا تھا، فرماتے ہیں ان الاخ المکرم المفخم اعنی ابراہیم بن حاج الحرمین الناصر لسنة سید

علم اسرار دین و لطائف قرآن مجید

اس فن شریف کی قدر و منزلت اور اس کی ضرورت و حاجت کی نسبت خاکسار اپنی طرف سے کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ صرف ان بزرگوں کے الفاظ پر اکتفا کرنا چاہتا ہے، جن کے فیوض سے یہ ناچیز اور عاجز فیض یاب ہوا ہے۔

المولین الخادم لخدام سنة سيد الثقلين، اعنى مسترى قادر بخش السیالکونى الکاشمیری متعه الله بعمله و عمل اولاده فى العقبى وفى هذه قد قرء على ترجمة القرآن فى مواضع متعددة و صحیحى البخارى و مسلم مثل ذالک و اشیاء من جامع الترمذی و سنن ابی داؤد و شرح النخبة و غیرها من دولین السنة و استفاد منی بفوائد عجیبة و مسائل غریبة فى ازمنة متفرقة من علوم مختلفة اصولاً و فروعاً فقطلب منی الاجازة فاجزت له بجميع ما قرء على و بجميع ما یشتمل علیه فهرسى فعليه ان یروى عنی جمیع ما اجزت له لانه فوفهم ثاقب و صاحب فکر صائب ریما یتغوص فى بحار العلوم فیخرج منها اللؤلؤ والمرجان زاده الله علماً و عملاً و وفقه و عامله بالرحمة والرضوان فى سنة سید الانس و الجان (۱۳۱۶ھ)

☆ اسی طرح شیخ الککل حضرت میاں صاحب مرحوم سید نذیر حسین صاحب محدث دہلویؒ اپنے

اجازت نامہ میں تحریر فرماتے ہیں۔ ان المولوی ابراہیم بن قادر بخش السیالکونى الکشمیری قد قرء على طرفاً طرفاً من الصحاح الستة والمشکو المصابیح و مؤطا مالک فعليه ان یشتغل باقراء هذه الكتب المذكورة و تدریسها لانه احق بها و اهلها بسبب الاستعداد (۱۳۱۶ھ)

☆ اسی طرح حضرت الاستاذ حامل لواء السنن مولانا عبید اللہ غلام حسن صاحب سیالکوٹیؒ جن کے فیض محبت نے اس گناہ گار کے ظاہر و باطن پر توجہ ڈالا اور شریعت و طریقت کے حقائق و معارف کا دروازہ کھولا اور ان کی وفات کے بعد وہ لطف کہیں نہ پایا، تحریر فرماتے ہیں:-

اما بعد علامہ فہیم مولوی، حافظ محمد ابراہیم بارک اللہ فی عمرہ امین از اعزہ اصحاب و اخص احباب و ارشاد ارباب ارادت کاتب الحروف استد و در علوم عقلیہ و نقلیہ و مہارت کما ینبغی بہم رسانیدہ و در اکثرے لزل بل ہمہ آن نسبت تلمذ با این

۱۔ استاد الہند حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلویؒ جن کی دقیقہ شناسی اور نکتہ رسی مسلم کل ہے۔ اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں:-

”باید دانست کہ علم لطائف و نکات قرآن علمیت کہ نہایت ندارد و ہر روز در تزیید و ترقیت، زیرا کہ ہر صاحب فن بقدر حوصلہ و استعداد خود آنچہ متعلق بہ خود است ازین کلام مجید برمی آرد، پس استیفائے اس علم در دنیا ممکن نیست۔“ (تفسیر عزیزی، جلد اول، ص ۱۳)

۲۔ اور ان کے والد ماجد حجتہ الہند حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ حجتہ اللہ میں علم حدیث کے متعلق فرماتے ہیں:-

اس فن کے کئی طبقے ہیں اور پھر ان سب کا ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔ میرے نزدیک علوم حدیثیہ میں سے سب سے دقیق، عمیق اور سب سے اعلیٰ و اولیٰ اور ارفع و اعظم علم اسرار دین ہے، جس میں احکام الہیہ کی حکمتوں اور ان کی لمیات سے بحث ہوتی ہے اور خواص اعمال کے اسرار و نکات مذکور ہوتے ہیں۔

اس کے بعد حضرت شاہ صاحب مزید فرماتے ہیں۔ ”خدا کی قسم! یہ علم اس بات کا سب سے زیادہ حق دار ہے کہ جو شخص اس کی طاقت رکھے، وہ اپنے عمدہ اوقات اس میں خرچ کرے اور فرض عبادت کے بعد اسے اپنی عاقبت کا ذخیرہ اور توشہ بنائے۔“

اس کے بعد حضرت شاہ صاحب اس علم کی قدرو منزلت کی وجہ سمجھاتے ہیں کہ ”انسان اس سے امور شرعیہ کا علی وجہ البصیرت عالم ہو جاتا ہے۔“

اس کے بعد اس فن کا مزید فائدہ مزید بتاتے ہوئے لکھتے ہیں۔ وہ یامین ان یکون کحاطب لیل او کغائص سیل او یخبط خبط العشواء او یرکب متن

بیچمیرز درست داشته و در زمان قصیر استفادہ فنون کثیرہ نمودہ

معنا لک کمال فہم است و بمطالعہ صحیح و فہم سلیم مناسبت متین پیدا کردہ طبع نکتہ رس دارد و دل بیہوس، و یا این ہمہ بریاضات و مجاہدات و خلوص نیت و حسن طوبت موصوف است و از سعادت در شد و اہلیت و شرم و حیا نصیبہ واقعی و بہرہ کافی نصیب اوست۔

ہنا ما اعلم واللہ حسیبہ

العمیاء (حجة اللہ ص ۳)

”اور اس علم سے (انسان) اس بات سے بے خوف ہو جاتا ہے کہ رات کے وقت ایدھن اکٹھا کرنے والے کی طرح یا سیلاب میں غوطہ زنی کرنے والے کی طرح ہو یا یہ کہ شب کو رے والے کی طرح ٹانگ ٹوئیاں مارے یا یہ کہ اندھے جانور کی پشت پر سوار ہو۔“

اس کے بعد فرماتے ہیں۔ ”اگرچہ ان سب (علوم مذکورہ بالا) کے متعلق علماء نے بہت کچھ لکھا ہے لیکن اس فن یعنی علم اسرار دین میں تصنیف بہت کم ہے۔“
بعد ازاں اپنی ذات گرامی کی نسبت ذکر کرتے ہیں۔ وان من اعظم نعم اللہ علی ان اتانی منہ حظا وجعل لی منہ نصیبا (حجۃ اللہ ص ۳)
”مجھ پر خدا تعالیٰ کی ایک بڑی نعمت یہ ہے کہ اس نے مجھے اس علم سے (کافی) حصہ عطا کیا ہے۔“

حضرت شاہ صاحب تواضع و انکساری کے طور پر کہتے ہیں۔ وما انفک اعترف بتقصیری وابوء وما ابرئنی نفسی ان النفس لا مارة بالسوء (حجۃ اللہ ص ۳)
”اور میں ہمیشہ اپنی قصور واری کا اعتراف کرتا رہتا ہوں اور اپنے نفس کو پاک نہیں کرتا۔ بے شک نفس (مارہ) برائی کا حکم زیادہ کرتا ہے۔“

اس کے بعد اپنا ایک مراقبہ ذکر کرتے ہیں، جس میں ان پر روح مقدس آنحضرت ﷺ کا ظہور ہوا اور آپ کو اس علم (اسرار دین) کے بیان کالقاء ہوا۔

مزید فرماتے ہیں کہ جب میں (بتقریب حج ۱۱۴۳ھ میں) مکہ شریف میں مقیم تھا تو میں نے حضرات حسنین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو خواب میں دیکھا گویا کہ انہوں نے مجھے ایک قلم دیا اور فرمایا۔ ہذا قلم جدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ”یعنی یہ ہمارے جد امجد (حضرت محمد ﷺ) کا قلم ہے۔“

پھر حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنے قلم صاوق مولانا محمد عاشقؒ صاحب کا ذکر کیا ہے، جنہوں نے نہایت الحاح و اصرار سے حضرت شاہ صاحبؒ سے درخواست کی کہ آپ اسرار دین میں کوئی کتاب لکھیں۔ حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ ان کے اصرار سے مجھے یقین ہو گیا کہ یہ وہ صورت ہے جو مجھے الہام کی گئی تھی تو میں نے اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ کی اور استخارہ کیا اور اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کی۔

خاکسار گناہ گار بھی محض تحدیثاً "بنعمة اللہ (نہ فحراً)" کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس عاجز کو بھی اس فن (اسرار دین و لطائف قرآن مجید) سے کچھ حصہ عطا کیا ہے اور یہ سب کچھ اپنے مشفق استادوں کی کفش برداری اور سابق علماء کی خوشہ چینی خصوصاً اپنے برادر مکرم مولانا احمد دین پال صاحب (مصنف الحکمتہ الیمانیہ وغیرہ) کے فیض و برکت سے ہے، جنہوں نے یہ فن یکٹائے زمانہ جناب مولانا ابوسعید محمد حسین صاحب مرحوم بٹالوی سے حاصل کیا۔

اعلیٰ اللہ مقاماتہم

حضرت شاہ صاحبؒ جیسے پاک نفس نے اپنے مجرد تقصیر میں ایسے الفاظ تحریر کئے ہیں تو یہ عاجز اس اقرار کا زیادہ حق دار ہے، کیوں کہ میں تو سچ گناہ گار بلکہ گناہوں میں تھڑا ہوا شرمسار ہوں۔

اللہم اغفر لی ذنبی کلہ دقہ و جلہ اولہ و اخرہ و علانیہ و سرہ
مراقبہ کی حالت میں فیضان الہی کا نازل ہونا تو بہت اونچا مقام ہے اور میں کہہ چکا ہوں کہ میں واقعی گناہ گار ہوں اس لیے وہ مقام مجھے کہاں حاصل ہو سکتا ہے۔ ہاں فیضان الہی کی دیگر صورتیں بھی ہیں۔ ان میں سے ایک سچا خواب ہے۔ خدا کا احسان ہے کہ وہ اپنے فضل سے بعض اوقات اس دروازے سے مجھ عاجز پر بھی کچھ فیضان نازل کر دیتا ہے۔ چنانچہ ان میں سے صرف دو خواب جن کو اس تحریر (تفسیر القرآن) سے مناسبت ہے۔ عرض کر دیتا ہوں۔

۱۔ پہلی عمر میں جب میں انگریزی سکول میں پڑھتا تھا۔ خواب میں مولانا عبدالحکیم صاحب مرحوم فاضل سیالکوٹیؒ کی زیارت سے مشرف ہوا۔ مولانا مرحوم نے سامنے کے ایک کھیت کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے اس میں جا کر انباروں کے انبار کتابوں کے پائے۔ میں نے چادر بچھا کر وہ سب کتابیں اس میں باندھ لیں۔ کتابوں کا گٹھا بہت بڑا اور اتنا وزنی ہو گیا کہ میں اکیلا اس کے اٹھانے سے عاجز رہ گیا۔ خدا کی قدرت سے میرے دادا مرحوم (میاں حیات محمد میر) جو بڑے عابد و پرہیز گار تھے اور کئی سال سے فوت شدہ تھے، وہاں پر نمودار ہو گئے۔ انہوں نے کتابوں کا وہ گٹھا مجھے اٹھوایا اور میں گھر کو روانہ ہوا۔ اتنے میں آنکھ کھل گئی۔ جاگنے کے ساتھ ہی بغیر تامل کے اللہ تبارک و تعالیٰ نے یہ تعبیر سمجھائی کہ

خداے ذوالجلال اس عاجز کو مولانا عبدالحکیم سیالکوٹیؒ کا علم عطا کرے گا۔
سو خدا کا شکر ہے کہ اس نے مجھے انگریزی تعلیم میں کمال حاصل کرنے کی بجائے
اپنے دین کے علم کی تحصیل میں لگا دیا۔

۲۔ اس کے کچھ عرصہ بعد جب میں امتحان انٹرنس سے فارغ ہو کر کالج میں پڑھتا تھا۔
خواب میں دیکھتا ہوں کہ جس جگہ میں سویا ہوں۔ وہاں آسمان سے میری چارپائی تک ایک
مضبوط رسہ لٹکتا چلا آیا ہے۔ میں نے اس رسے کو خوب مضبوطی سے پکڑ لیا اور وہ رسہ
میرے سمیت اوپر کو چڑھتا گیا۔ میں اس کے ساتھ دور تک اوپر کو چڑھ گیا اور میری آنکھ
کھل گئی۔ فوراً ”اللہ تعالیٰ نے دل میں ڈالا کہ وہ مجھے قرآن کریم سے تمسک کرنے کی
نعت عطا کرے گا۔

اللہ رب العزت کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اس نے محض اپنے فضل سے باوجود
میری گناہ گاری کے اسرار وین خاص کر قرآن شریف کے لطائف کا دروازہ کھول دیا اور
اس کے ساتھ ظاہراً یہ انعام بخشا کہ ایک مہینے کی قلیل مدت میں ایک پارہ روزانہ کے
حساب سے تمام قرآن شریف حفظ کروا دیا۔

وہنامن نوادر نعم اللہ علی هذا العبد الضعیف

طرز تحریر و طریق بیان

میرے ایک محترم دوستؒ نے تحریر فرمایا تھا کہ ”تفسیر ایسی آسان اور مختصر ہو“
جسے میں بھی سمجھ سکوں اور مطالعہ کی فرصت بھی پاسکوں۔“ تو اس کی نسبت کیا عرض
کروں؟۔ مجھے خود خیال ہے کہ یہ دونوں باتیں ضروری ہیں۔ لیکن مشکل ہے ان دونوں
کا نبھانا۔ تسہیل میں طوالت ہو جاتی ہے اور اختصار میں کئی ایک مطالب الفاظ کی تہ میں
اور اسلوب بیان کی پلیٹ میں آجاتے ہیں، جس کی وجہ سے دقت نظر کی ضرورت پڑتی ہے
اور میرے لیے ایک تیسری مشکل بھی ہے کہ قرآن شریف نے ادائے مقاصد کے لیے
جن الفاظ کو منتخب کیا ہے اور ان کے ہم معنی الفاظ کو (اگرچہ وہ بھی مروج و عام فہم ہیں)
نہیں لیا یا قرآنی الفاظ ہی میں سے مترادف الفاظ میں سے بعض جگہ ایک کو اور دوسری

۳۔ جناب خاں صاحب چودھری محمد امین صاحب بی۔ اے پبلک پرائیویٹ، شیخوپورہ۔

جگہ دوسرے کو اختیار کیا ہے، تو اس موقع پر بلحاظ عمدگی تلفظ، ترنم، ورستی و مناسبت معنی وہی موزوں ہے، جسے اختیار کیا ہے۔ مثلاً "تقویٰ اور خشیت، فواد اور قلب اور صدر، نیز کسی جگہ خاتمہ آیت پر یتفکرون فرمایا اور کہیں یعقلون اور کسی جگہ لاوولی الابصار اور کہیں لاوولی النہی اور کہیں لاوولی الالباب نیز کسی جگہ یسمعون تسمعون فرمایا اور کسی جگہ یبصرون تبصرون فرمایا۔ وہ کبنا گو ظاہر میں سب کا حاصل ایک ہی معلوم ہوتا ہے لیکن باریک بین نگاہ میں ان میں نہایت باریک فرق ہے جو ان شاء اللہ ان کے اپنے اپنے موقع پر آپ بڑی تفسیر تبصیر الرحمنؑ میں ملاحظہ فرمائیں گے۔

پھر ان الفاظ کو جس ترتیب میں رکھا ہے اور جو طریق بیان اختیار کیا ہے۔ وہ نفس مضمون (مسائل و مقاصد) کے مقبول ہونے کے علاوہ اتنا دلچسپ ہے کہ میرے سینے سے اس کے متعلق تقریباً ہر آیت پر فوارے اچلتے ہیں اور اتنا ہجوم ہو جاتا ہے کہ کوئی بھی بات چھوڑ دینے کو جی نہیں چاہتا اور طوالت کا اندیشہ بھی ساتھ ہی لگا رہتا ہے۔ آخر اسی ادھیڑ بن میں رہ جاتا ہوں کہ کیا لکھوں اور کیا نہ لکھوں۔ مثلاً "سورۃ الحمد ہی میں دیکھئے کہ چھوٹی چھوٹی کل سات آیتیں ہیں۔ لیکن سبحان اللہ! کس اعجازی قوت سے کوزے میں دریا نہیں بلکہ سمندر بند کیا ہوا ہے۔ اس کی تفسیر میں اختصار کروں تو کیا کروں؟ پڑھتے جاتیے:-

ذکر لطائف کا نمونہ

- ۱- بسم اللہ میں لفظ اسم کیوں ذکر کیا اور پھر یہ کہ باللہ کیوں نہیں کہا؟
- ۲- پھر یہ کہ اس جگہ متعلق بہ (فعل یا مصدر) کو کیوں ترک کر دیا اور آیت اقرء باسم ربک میں کیوں نہیں کیا؟
- ۳- رحمٰن و رحیم ہر دو مصدر رحمة سے ماخوذ ہیں۔ دونوں کو اکٹھا کیوں ذکر کیا؟
- ۴- رحمٰن کو پہلے اور رحیم کو پیچھے کیوں ذکر کیا؟

۵- جو کہ موجود اور مطبوع ہے۔ (ب-ج)

- ۵۔ الحمد میں مدح، شکر اور ثناء ایسے تعریفی الفاظ کو ترک کر کے حمد کو کیوں منتخب کیا؟
- ۶۔ نیز یہ کہ اس جگہ الحمد کو اللہ خبر پر مقدم کیوں کیا اور فللہ الحمد (جافیہ) میں خبر کو الحمد پر کیوں مقدم کیا؟
- ۷۔ للہ میں لام جارہ نے کیا فائدہ دیا؟
- ۸۔ حمد کے ساتھ دیگر اسمائے ایہ کو چھوڑ کر اسم اللہ کو کیوں منتخب کیا؟
- ۹۔ جملہ اسمیہ کیوں اختیار کیا اور احمد اللہ بصورت جملہ فعلیہ کیوں نہیں کہا؟
- ۱۰۔ اسم اللہ کے بعد صفات رب العالمین، الرحمن الرحیم اور مالک یوم الدین کیوں ذکر کیں؟
- ۱۱۔ ان کو اس ترتیب میں کیوں رکھا؟
- ۱۲۔ بسم اللہ میں بھی الرحمن ورحیم مذکور ہو چکے تھے۔ ایک ہی آیت کے فصل سے پھر دوبارہ ان کا کیوں ذکر کیا؟
- ۱۳۔ مالکیت کو یوم الدین کے متعلق کیوں کیا؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ ہر شے کا ہر وقت مالک ہے۔
- ۱۴۔ ملک اور مالک میں کیا فرق ہے؟ اور قرآن مجید میں ان کے متعلقہ آیات کا ذکر۔
- ۱۵۔ ان صفات کے بعد ایک نعبد میں عبادت کا ذکر کیوں کیا؟
- ۱۶۔ اس میں غائبانہ ذکر سے التفات کر کے خطاب کا صیغہ کیوں اختیار کیا؟
- ۱۷۔ عبادت کے بعد استعانت کے ذکر میں کیا نکتہ ہے؟
- ۱۸۔ ایک کو اس کے عامل نعبد پر کیوں مقدم کیا؟
- ۱۹۔ ایک نستعین میں ایک کو مکرر کیوں لائے؟
- ۲۰۔ عبادت و استعانت کے بعد استقامت کی دعا کیوں سکھائی؟
- ۲۱۔ صراط کو استقامت سے کیوں موصوف کیا؟
- ۲۲۔ صراط کو مکرر کیوں ذکر کیا؟

۲۳- یہاں صراط کو الذین انعمت علیہم کی طرف اور آیات و ہذا صراط ربک مستقیما وغیرہ میں اپنی ذات کی طرف مضاف کیا، اس کی کیا وجہ ہے؟

۲۴- انعمت میں صورت معروف رکھی اور المغضوب علیہم میں مجہول، اس کی کیا وجہ ہے؟

۲۵- منعم علیہم کون لوگ ہیں؟

۲۶- منعم علیہم غیر مغضوب علیہم اور غیر ضالین ایک ہی ہیں؟

۲۷- ان اوصاف کے ذکر میں کیا خوبی ہے؟

۲۸- انعمت کو بصیغہ ماضی کیوں ذکر کیا؟

۲۹- مغضوب علیہم اور ضالین کون کون ہیں؟

۳۰- کسی خاص مذہب اور فرقے کا خاص نام نہیں لیا بلکہ صرف اوصاف ذکر کر دیئے ہیں۔ اس میں کیا خوبی ہے؟

اب میں ان باتوں کو کیسے نظر انداز کر دوں اور ان میں کیا کیا اختصار کروں؟

ان سب باتوں کو سمجھ لینے سے واضح ہو جاتا ہے کہ متکلم نے یہ الفاظ اور یہ ترتیب اور یہ اسلوب بیان خاص ارادے سے اختیار کیا ہے۔ یونہی بلا ارادہ و بے حکمت نہیں نکل پڑے۔ چونکہ ان کے بیان سے قرآن مجید کے محاسن و لطائف کھلتے ہیں اس لیے اس عاجز کے نزدیک ان کو چھوڑ دینا تفسیر میں کوتاہی کرنا ہے۔

میں تو ایسی باتوں سے اپنے اندر ہی اندر لوٹ پوٹ ہو جاتا ہوں بلکہ بعض اوقات از خود رفتہ ہو جاتا ہوں۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ زمانے میں عربی زبان کا ذوق تو کیا شوق بھی نہیں رہا۔ مذہب کی قدر و منزلت عقلی و قلبی ہے جو نظر سے پوشیدہ ہے اور معیشت کی ضرورت بمنزلہ محسوسات کے ہے۔ بلکہ طبعی و اضطراری ہے۔ معیشت کے لیے عربی کی ضرورت نہ رہی تو ذہنوں سے اس کی قدر بھی جاتی گئی۔ علماء کو نہیں رہی تو

۶- آہ! ہندوستان سے مسلمانوں کی سلطنت اٹھ گئی تو ان کی مذہبی زبان کی قدر بھی جاتی رہی۔ جب یہ زبان تحصیل زر و مال کا ذریعہ نہیں بن سکتی تو کوئی اس کے سیکھنے کی زحمت

عوام بے چارے کون؟۔ پس اندیشہ ہے کہ دوسرے لوگ میری اس طرز کو بوجہ اپنی بدذوقی یا بے ذوقی کے شاید پسند نہ کریں۔ مجھے نہ تو طبع سازی کی باتیں آتی ہیں اور نہ تکلف سے چکنی چپڑی باتیں بنا کر اور کچھ ادھر کی اور کچھ ہانک کر لوگوں کو پرچانا اور خوش کرنا آتا ہے۔ جو کچھ ہے طبیعت کی سادگی اور بے تکلف روانی سے حقیقت آگاہی ہے اور بس۔ نفس الامری میں کسی کو پسند آئے یا نہ آئے، یہ میرا فرض نہیں ہے۔

میں نہیں چاہتا کہ قرآن کریم کو لوگوں کی بدذوقی کے تابع کر کے (معاذ اللہ) اس کو ہر بے ہما کو غبار آلود کر دوں۔ بلکہ چاہتا ہوں کہ لوگوں کا مذاق اس کے موافق کر کے ان کو اس کی حلاوت سے خوش کام کروں۔ اگر ان کے مذاق درست نہ ہوں گے تو قرآن مجید تو درست رہے گا۔ مشکل یہ ہے کہ پہلی بات یعنی قرآن کریم کو بگاڑنا گناہ عظیم ہے اور دوسری بات یعنی لوگوں کے مذاق کو سنوارنا اور درست کرنا میرے اختیار میں نہیں۔

خدا نہ کرے کہ اس کا نتیجہ یہ ہو کہ میرے اپنے افکار اور تفاسیر متقدمین سے میرے انتخابات جو میرے نزدیک دنیا جہان کے جواہرات ابدار سے بھی بیش قیمت ہیں، میرے ساتھ ہی قبر میں چلے جائیں۔

اس اندیشہ کا بوجھ بھی طبیعت پر بہت پڑ رہا ہے اور اسی کو ہلکا کرنے کے لیے میں نے اب یہ صورت اختیار کی ہے کہ جو کچھ اور جس طرح پر ہو سکے، وہ ناناخانہ دل سے نکال کر فراز قرطاس پر رکھ دوں۔ مطالعہ کرنے والے اصحاب اپنے اپنے مذاق کے مطابق خود انتخاب کر لیں گے۔ اور کچھ نہ ہو گا تو عمر کا باقی حصہ جو قریب بیستین گزشتہ سے بہت کم باقی رہ گیا ہے۔ اس نیک شغل یعنی خدمت قرآن میں تو گزرے گا۔ وماتو فیقی

ابالہ علیہ توکلت والیہ السبب اصول تفسیر ہذا

کسی فصیح کلام کی توضیح کے دو ہی اصول ہیں۔ اول اس کی زبان و صورت واقعی

کیوں اٹھائے اور اس میں کمال حاصل کر کے کیا کرے؟۔ باقی رہا عاقبت، سو اس کی فکر اس کو ہے، جسے عاقبت نبی کی نظر ملی ہو۔ ظاہر بین اسباب پرست عاقبت کو کیا جانیں؟۔ یعلمون

ظاہر ۱ من الحيوة النباهم عن الاخرة هم غافلون (روم، پ ۲۱)

کی رعایت۔ دوم اس کے متکلم کی تصریح یا تفویض۔

زبان و صورت حال سے ہماری یہ مراد ہے کہ جس زبان میں وہ کلام ہے۔ اس کے قواعد و محاورات کی رعایت رکھی جائے اور متکلم نے اپنی مراد و مقصود کی تعیین یا تنہیم کے لیے اپنے کلمات کو جس ترتیب و وضع پر رکھا ہے۔ اس کے وصل و فصل کو اسلوب فصحاء پر سمجھا جائے۔

بعض اوقات ایک لفظ کے کئی معانی ہوتے ہیں یا اس کا مفہوم عام ہوتا ہے اور اس کے ضمن میں کئی ایک انواع ہوتی ہیں یا وہ حقیقت و مجاز ہر دو میں مستعمل ہوتا ہے۔ لیکن خاص خاص الفاظ سے مل کر آنے کی صورت میں اور سلسلہ کلام کے ربط کی وجہ سے اس میں خصوصیت ہو جاتی ہے۔ اگر سلسلہ کلام کے ربط کو یا اس لفظ کے ساتھ کے جوڑ کو نظر انداز کر دیا جائے تو مفہوم کلام بالکل بدل جائے گا اور ہم متکلم کی مراد سے بہت دور جا پڑیں گے۔ لہذا ضروری ہے کہ مفروقات زبان کے جان لینے کے بعد اس زبان کے محاورات اور اسلوب بیان میں بھی مہارت تامہ حاصل ہو اور پھر اس کے بعد ذوق سلیم اور فہم صحیح کی نعمت سے بھی حصہ ملا ہو۔

متکلم کی اپنی تصریح سے یہ مراد ہے کہ اگر اس نے اپنے کلام کی توضیح کسی دوسرے موقع پر کر دی ہے تو اس کی پیروی واجب ہے۔ متکلم کی تفویض سے ہماری یہ مراد ہے کہ اگر اس نے اپنے کلام کے لیے کوئی درمیانی واسطہ بنایا ہے اور وہ کلام اس کے ذریعے سے پہنچایا ہے تو وہ بعض اوقات کسی خاص امر کی مزید توضیح کے لیے یہ بھی کہہ دیتا ہے کہ اس کی تفصیل قاصد یا حامل ہذا سنا سمجھا دے گا۔ یہ قاصد صاحب ہمارے بڑے اعتباری اور امین ہیں۔ کوائف سے واقف اور ہمارے اشاروں کے سمجھنے والے ہیں۔ ہمارے ہاں ان کی خاص عزت ہے۔ ان کی زبان کو ہمارا فرمان سمجھنا۔

پس اس سفیر کی ذاتی قابلیت و امانت داری، متکلم کے نزدیک اس کی قدر و منزلت اور سب کے بعد خود متکلم کی تفویض و سپرد کاری اس بات کی کافی ضمانت ہیں کہ اس کی توضیح و تشریح، تفصیل و تنہیم کا اعتبار دیگر سب سے بڑھ کر کیا جائے اور اس سے سرمو بھی تجاوز نہ کیا جائے۔

اس اصولی تمہید کو زیر نظر رکھتے ہوئے بیان لاحق کا مطالعہ فرمائیے:-

تفسیر قرآن، بزبان قرآن

یہ ایک واقعی اور ثابت شدہ حقیقت ہے کہ قرآن شریف فصیح عربی زبان میں ہے۔ اس کے الفاظ کی عمدگی اور موقع و محل پر ان کے معانی کی درستی، اس کے کلام کی نشست اور مقصود سے اس کے محاورات کی مناسبت، عربی زبان کا ذوق اور اس میں مہارت رکھنے والے کے نزدیک محتاج ثبوت نہیں۔

قرآن مجید خود کہتا ہے۔ بلسان عربی مبین۔ (شعراء پ ۱۹) یعنی ”یہ قرآن واضح و فصیح عربی زبان میں اتارا گیا ہے۔“

نیز وہ کہتا ہے۔ قرآنا ”عربیاً“ غیر ذی عوج لعلہم یتقون ○ (زمر پ ۲۳) ”قرآن عربی زبان میں ہے، جس میں کوئی کجی نہیں تاکہ ان کو تقویٰ حاصل ہو۔“

یعنی چونکہ تحصیل تقویٰ اس کتاب کے اہم مقاصد سے ہے۔ اس لیے اس کے مطالب صاف اور واضح زبان میں بیان کئے گئے ہیں تاکہ لوگ کج فہمی سے فہم مراد سے دور نہ جا پڑیں۔ اسی لیے اس موقع پر اس کی صفت میں غیر ذی عوج فرمایا گیا کہ اس کے بیان میں کوئی کجی نہیں ہے۔ جب بیان میں کجی نہیں تو فہم میں کیوں ہو۔

اس کے علاوہ قرأت و سماعت میں اس کی تلاوت و دل نشینی، صاحب ذوق کے وجدان میں جو کیفیت پیدا کرتی ہے، وہ لفظی بیان سے بالا ہے۔ یہ سب امور قرآن مجید کی زبان کی خوبی اور اس کے مرتبے کی بلندی کے دلائل میں داخل ہیں۔ قرآنا ”عربیاً“ کے معنی یہ بھی ہیں کہ قرآن شریف فصیح و واضح زبان میں ہے کیوں کہ لفظ عربی کے معنی فصیح بھی ہیں۔ چنانچہ لسان العرب میں ہے۔

تقول رجل عربی اللسان اذا کان فصيحاً یعنی ”جب کوئی شخص فصیح اللسان ہو تو اس کے وصف میں کہے گا۔ رجل عربی اللسان یعنی ”فصیح زبان والا آدمی۔“ اور اسی کے یہ حوالے بھی ہیں:-

(۱) روی عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انه قال: الشیب تعرب عن نفسها ای تفصح۔ ”آنحضرت ﷺ سے مروی ہے کہ شوہر دیدہ عورت (دوسرے نکاح کے

وقت) اپنی مرضی خود اپنی زبان سے کھول کر بیان کرے۔“

(۲) یقال اعرب عنہ لسانہ و عرب ای ابان و افصح۔

”مخاورہ (اعرب عنہ لسانہ و عرب) میں ہر دو کے معنی ہیں۔ اس نے خوب کھول کر اور وضاحت سے بیان کیا۔

(۳) و انما سمي الاعراب اعراباً لتبيينه و ايضاحه ”اعراب کو اسی لیے اعراب کہتے ہیں کہ اس سے معنی کا بیان اور وضاحت ہو جاتی ہے۔“

(۴) و منه الحديث الآخر فانما كان يعرب عما في قلبه لسانه ”اسی (لفظ اعرب) سے ایک اور حدیث ہے کہ جو کچھ اس کے دل میں ہے، اسے اس کی زبان صاف بیان کرتی ہے۔“

(۵) و منه حديث التيمي كانوا يستحبون ان يلقنوا الصبي حين يعرب ان يقول لا اله الا الله سبع مرات اي حين ينطق ويتكلم

”اور (عرب بالتشديد کی مثال) تیمی کی حدیث ہے کہ صحابہ کرامؓ اس بات کو مستحب جانتے تھے کہ جب بچہ کی زبان کھلے یعنی وہ کلام کرنا سیکھے تو اسے سات دفعہ لا اله الا الله کی تلقین کی جائے یعنی اس کی زبان سے کہلوا جائے۔“

۱۔ و في حديث السقيفة اعربهم احساباً اي ابيينهم و اوضحهم ”اور حدیث سقیفہ بنی ساعدہ میں ہے کہ (قریشی) حسب نسب میں سب سے بلند اور روشن ہیں۔“
۲۔ و يقال اعرب عما في ضميرك اي ابن و من هذا يقال للرجل الذي فصيح بالكلام اعرب۔ (ص ۷۸) ”اور مخاورہ میں کہا جاتا ہے ”اعرب“ یعنی جو کچھ تیرے جی میں ہے اسے کھول کر بیان کر اور اسی سے اس شخص کو جو فصاحت سے کلام کرے، کہتے ہیں اعرب یعنی اس نے فصاحت سے بیان کیا۔“

نیز ”لسان العرب“ میں حضرت ابو بکر صدیقؓ کا یہ قول منقول ہے۔

قریش ہم او سط العرب فی العرب دارا و احسنه جوارا“ و اعربہ السنق ”قریشی عربوں میں سب سے اچھے گھرانے کے لوگ ہیں اور ہمسائیگی و پناہ دینے میں بھی سب سے اچھے ہیں اور زبان میں سب سے زیادہ فصیح ہیں۔“

ان حوالہ جات سے صاف ظاہر ہے کہ لفظ ”عربی“ معنی فصیح کثیر الاستعمال

ہے۔ لہذا جہاں پر قرآن کو عربی مبین کہا گیا ہے وہاں اس کے عربی زبان میں ہونے کے علاوہ اس کا فصیح ہونا بھی ملحوظ رکھنا ہوگا۔ پس میں نے اپنے اوپر لازم کر رکھا ہے کہ جہاں تک میری علمی رسائی ہے قرآنی الفاظ کا مفہوم عربی زبان کے قواعد صرف (ہیات لفظی) قواعد نحو (ہیات ترکیبی) اور قواعد بلاغت (اسلوب فصحاء) کے مطابق بیان کروں بشرطیکہ موقع و محل کے بھی مناسب ہو محض اپنے خیال کی کھجڑی نہ ہو۔

بس متکلم کا منشا اور مقصود انہی امور کی رعایت سے سمجھا جاتا ہے کیوں کہ وہ اپنا مقصود و منشا الفاظ ہی میں بتاتا ہے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ پہلے ایک بات اپنے جی میں ٹھان لیں اور پھر قرآنی الفاظ کو توڑ مروڑ کر اس کے پیچھے کھینچ کر لے جائیں۔ کلام کے وصل و فصل کے علم کا دوسرا نام علم بلاغت ہے اور بلاغت کی جان مقتضائے حال کی رعایت ہے۔ (مطلوب و غیرہ)

لغوی معنی ہر چند کہ لغت میں متعارف ہوں لیکن موقع و محل کے مناسب نہ ہوں تو سب غلط و بے کار ہوتے ہیں۔ مضمون کی صحت کا ذمہ دار خود متکلم ہے۔ جس نے ہم سے ان الفاظ میں اور اس طریق پر خطاب کیا ہے۔ چونکہ قرآن کا متکلم نہایت سچا اور لطیف و خبیر اور علیم کل ہے۔ لہذا اس کا ان الفاظ میں بیان کردہ مضمون غلط و قابل اعتراض نہیں ہو سکتا۔ وہ خود فرماتا ہے:-

۱۔ ذالک الکتاب لا ریب فیہ (بقرہ، پ ۱) ”یہ ایسی (کامل صفت) کتاب ہے کہ اس میں کوئی شک (کی بات) نہیں ہے۔“

۲۔ الحمد للہ الذی انزل علی عبدہ الکتاب و لم یجعل لہ عوجا (کہف، پ ۱۵) ”سب تعریف کا مالک وہ اللہ ہے، جس نے اپنے بندے (محمد ﷺ) پر یہ کتاب اتاری اور اس میں کوئی کجی نہیں رکھی۔“

۳۔ الر ○ کتاب احکمت آیاتہ ثم فصلت من لدن حکیم خبیر ○ (ہود، پ ۱۱) ”(یہ وہ) کتاب (ہے) جس کی آیات محکم ہیں پھر (یہ کہ) مفصل ہیں، حکیم خبیر (خدا) کی طرف سے (اتری ہے)۔“

۴۔ انہ لقول فصل ○ وما ہو بالہزل ○ (طارق، پ ۳۰) ”بے شک یہ قرآن فیصلے کی بات ہے، کوئی ہنسی مذاق نہیں۔“

۵۵ وانہ لکتاب عزیز لایاتیہ الباطل من بین یدیه ولا من خلفہ تنزیل من حکیم حمید (م مجہد، پ ۲۴) ”بے شک یہ (قرآن) بڑی زبردست کتاب ہے۔ اس میں باطل کو دخل نہیں ہے، نہ اس کے سامنے سے اور نہ ہی اس کے پیچھے سے، حکیم وحید (اللہ) کی اتاری ہوئی ہے۔“

لہذا اگر کوئی بات کسی کو درست نظر نہ لگے تو اس کی اپنی سمجھ کا تصور ہے نہ کہ کلام خدا کا، کہ ہم کھینچ تان کر اپنی غلط فہمی کو درست رکھنے کے لیے اسی کی اصلاح و ترمیم شروع کر دیں اور عکس موضوع کے مرتکب بنیں۔ یہی تفسیر بالرائی ہے۔ (ابوداؤد، ترمذی) جس سے آنحضرت ﷺ نے ڈرایا ہے کہ پہلے اپنے جی میں ایک بات ٹھان لی اور اسے جمالت یا زلیغ قبئی سے صحیح سمجھ لیا پھر اس کے لیے قرآن و حدیث کی نصوص کو توڑ مروڑ کر اس کے تابع کرنے کی کوشش کی اور جو جی میں آیا کہہ دیا۔ نہ قرآن کی نصوص کی پرواہ کی، نہ احادیث نبویہ کا کچھ لحاظ کیا، نہ علمائے صحابہ کرامؓ کی تصریحات کو خاطر میں لائے اور زبان عرب سے نااہل ہونے پر بھی اجتہاد کے مدعی بن بیٹھے بلکہ ان سب وسائل علم و ہدایت کو اپنی رائے کے سانچے میں ڈھالنے لگ پڑے۔ ایسے مفسر پہلے بھی ہوئے ہیں، جنہوں نے اپنی بدعات و ضلالت کی ترویج میں نصوص شرعیہ کو نظر انداز کر دیا اور اب اس زمانے میں تو برساتی مینڈکوں کی طرح ہر طرف سے ٹرا رہے ہیں۔ جن کے بارے میں یہ کہنا نہایت موزوں ہے کہ ”لکھے نہ پڑھے، نام محمد فاضل۔“

مجھے نہ تو بناوٹی تواضع آتی ہے اور نہ میں اجتہاد کا مدعی بن کر ہمہ دانی کی جھوٹی شئی بگھارنا جانتا ہوں۔ مجھلا ”اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اس تفسیر میں اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ہر اس امر سے پرہیز کیا ہے، جس سے آئمہ سنت نے اجتناب کرنا لکھا ہے اور جہاں تک میری رسائی ہے وہاں تک وہی کچھ لکھا ہے جو میں نے اللہ پاک کے کلام پاک میں صراحت ”یا اشارتا“ مذکور پایا، یا اس کے رسول پاک ﷺ نے فرمایا، یا زبان عرب اور صحابہ کرامؓ کی پاک جماعت نے اس کی شہادت دی۔

باقی رہے دیگر علماء سومیں نے اس سچکول کو ان کی دریوزہ گری سے بھی بھرا ہے لیکن اس شرط سے کہ ان کی تائید قول خداوندی یا سنت رسول اللہ ﷺ یا کم از کم شہادت صحابہ کرامؓ اور قواعد علمیہ سے میری سمجھ میں آگئی ہے۔ (ہذا واللہ والی الہدیۃ)

رد مخالفین

مخالفین کے شبہات کے متعلق جو طریق اختیار کیا ہے۔ اس کی بابت اصولاً معروض ہے کہ صحیح مراد تک پہنچنے کے لیے رستے میں کئی ایک رکاوٹیں آ جاتی ہیں اور ہر رکاوٹ کے دفعے کے لیے ایک ہی ہتھیار نہیں ہوتا بلکہ اس کی نوعیت کے لحاظ سے الگ الگ ہتھیار ہوتے ہیں۔ پس میں نے ہر ٹھوکر کو اس کے مناسب ہتھیار سے دور کرنے کی کوشش کی ہے اور اس میں قرآن شریف کے اپنے بیان اور اللہ کے رسول ﷺ کی حدیث اور قواعد علیہ کو پیش نظر رکھا ہے۔ واللہ ولی التوفیق

تفسیر بالآیات

قرآن شریف کے محکم و استوار اسلوب بیان کی بابت ہم جو کچھ سابقاً بیان کر آئے ہیں، اس کے علاوہ قرآن مجید نے اپنے اجمال کی تفصیل اور اپنے اشارات کی توضیح و تصریح خود بھی کی ہے اور مکررین کے جوابات بھی دیئے ہیں۔ چنانچہ یہ امر قرآن مجید میں کثرت سے موجود ہے، علاہ اس کے صراحہً بھی فرما دیا۔ ولا یاتونک بمثل الا جئناک بالحق واحسن تفسیراً ○ (الفرقان، پ ۱۹) ”اور نہیں لاتے یہ (مکر) تیرے پاس کوئی بات مگر ہم تیرے پاس بالکل حق اور نہایت درست مشرح (جواب) بھیج دیتے ہیں۔“

اسی معنی میں دوسری جگہ یوں فرمایا۔ شہر رمضان الذی انزل فیہ القرآن ہدی للناس و بینت من الہدی والفرقان (بقرہ، پ ۲) ”رمضان کا مہینہ (روزوں کے لیے مقرر ہے) جس میں قرآن کا نزول (شروع) ہوا۔ سب لوگوں کے لیے ہدایت اور ہدایت کے روشن دلائل اور (حق و باطل) میں فرق کرنے والا۔“

اس آیت میں قرآن پاک کو ہدایت کے دلائل بینہ اور حق و باطل میں فرق کرنے والا کہا ہے۔

تفسیر بالا حدیث

پھر دیکھتا ہوں کہ اس باریک بین متکلم نے اپنا پاک کلام اوپر سے اینٹ پتھر کی طرح نہیں پھینک دیا۔ اسے کسی معمولی انسان کے منہ میں بھی نہیں دیا بلکہ اپنی جملہ مخلوقات کے خلاصہ اور بہترین ہستی کے قلب پاک پر اتار کر اس کی پاک زبان سے نکلوایا ہے جس کی ضمانت میں خود ہی فرما دیا۔

☆ وما ينطق عن الهوى ان هو الا وحى يوحى ○ (پ ۲۷) ”یعنی (ہمارا رسول ﷺ) خواہش سے نہیں بولتا۔ (جو بولتا ہے) سو وحی ہوتی ہے، جو اس کی طرف کی جاتی ہے۔“

پھر یہ کہ اس کے دل و دماغ کو اپنی رضا کے کاموں کے لیے مخصوص کر لیا ہے اور تبلیغ الفاظ کے علاوہ عملی کوائف کی تعلیم و تفہیم بھی اسی کے متعلق رکھی ہے۔ چنانچہ فرمایا:

☆ وما انزلنا عليك الكتاب الا لتبين لهم الذى اختلفوا فيه (نحل، پ ۱۳) ”(اے پیغمبر! ہم نے یہ کتاب تم پر اس لیے نازل فرمائی ہے کہ تم لوگوں کو وہ (سب کچھ) بالوضاحت بتا دو، جن میں وہ اختلاف کرتے ہیں۔“

☆ وانزلنا اليك الذكر لتبين للناس ما نزل اليهم (نحل، پ ۱۳) ”(اے پیغمبر!) ہم نے یہ نصیحت نامہ تمہاری طرف اس لیے نازل کیا ہے کہ تم لوگوں کو سب کچھ بالوضاحت بتا دو جو ان کی طرف اترا یعنی جس بات کا ان کو حکم ہوا۔“

☆ ثم ان علينا بيانہ (قیامۃ، پ ۲۹) ”پھر یہ بھی کہ تم کو اس کا بیان و وضاحت بھی سمجھا دینا ہمارے ذمے ہے۔“

علاوہ بریں یہ کہ خدائے حکیم نے اپنے دستور کے مطابق اپنا کلام پاک اس برگزیدہ ہستی کی زبان میں اتارا ہے اور وہ اپنی زبان کا ایسا ماہر کامل ہے اور اس کی زبان اتنی شستہ اور صاف ہے کہ تمام عمر میں ایک بار بھی کوئی لفظ بیست لفظی یا بیست ترکیبی میں یا اسلوب بیان میں غلط تو کجا کمزور اور خلاف روز مرہ بھی نہیں نکلا اور اس کے دماغ نے فہم کلام میں کبھی بھی خطا نہیں کی۔

پس میں عاجز آنحضرت ﷺ کی سیرت و طرز عمل سے بھی سرمو نہیں سرک سکتا بلکہ ہر کیف اور ہر حال میں اپنے فہم اور جملہ جہان کے عطاء کے فہم کو اس ہستی پاک ﷺ کے ماتحت رکھتا ہوں۔

آنحضرت ﷺ جمعہ وغیرہ کے خطبوں میں پڑھا کرتے تھے:-

ان خیر الحدیث کتاب اللہ و خیر الہدی ہدی محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ”تحقیق سب کلاموں سے بہتر اللہ کی کتاب (قرآن شریف) ہے اور سب طریقوں سے بہتر محمد (ﷺ) کا طریقہ ہے۔

حدی کے معنی ہیں سیرت یعنی روش اور دستور العمل حدی، حدی سے اور سیرت میرے ماخوذ ہے۔ دونوں کے معنی ہیں روش اور طریق۔

تفسیر باقوال صحابہ کرامؓ

باقی رہی صحابہ کرامؓ کی مقدس جماعت سوان کے علماء عربی زبان کی سند ہیں اور وہ سب حضرت پیغمبر ﷺ کی سیرت کے بہترین شاہد ہیں، حضرت پیغمبر عربی ﷺ اور بعد کی امت کے درمیان وہی واسطہ ہیں۔ قرآن مجید ان کے سامنے اترا۔ اس میں ان کے واقعات مذکور ہیں۔ وہ اپنی زبان اور اپنے واقعات کو دوسروں کی نسبت اچھا جانتے ہیں پس ان کے اجماع یا ان کے جمہور علماء کے اقوال سے سر نہیں پھیر سکتے۔

ہاں ان کے غیر اجماعی اجتہادات، مجتہدین کے نزدیک محل نظر رہے ہیں کیوں کہ معصوم سوائے پیغمبر برحق کے کوئی نہیں اور حدیث من فسر القرآن براہیہ کے لفظ من کے افراد میں وہ بھی شامل و داخل ہیں اور آنحضرت ﷺ کے اس فرمان کے وقت وہی آپ کے سامنے تھے۔ پس وہ اصالتاً مخاطب ہیں اور بعد کی امت تبعاً۔ اگر ایسا نہ ہو تو حضرت صدیق اکبرؓ کیوں فرمائیں:-

ای سماء نظلمنی و ای ارض تقلبنی ان قلت فی کتاب اللہ ما لا اعلم یعنی ”اگر میں خدا کی کتاب میں ایسی بات کہہ دوں جس کا مجھے علم نہیں تو کون سا آسمان مجھے سایہ

جسے گا اور کون سی زمین مجھے قرار دے گی۔“

بس میرے پاس اللہ تعالیٰ کے خطاب کو سمجھنے کے لیے یہی چار ذریعے ہیں۔

دلیل:- وہ جو اللہ جل شانہ نے خود قرآن ہی میں دوسرے موقع پر واضح کر دیا۔

دوم:- اس بزرگ ہستی، محمد عربی ﷺ کی سیرت و طریق عمل، جس کی معرفت اس نے ہم سے خطاب کیا۔

سوم:- وہ زبان جس میں اس نے اپنا کلام بھیجا اور اپنے رسولؐ کو پیغام دیا۔

چهارم:- ان پاک نفوس کی شہادت جن کے سامنے قرآن حکیم اترا اور قرآن مجید نے ان کو براہ راست خطاب کیا اور قرآن پاک میں ان کے واقعات جا بجا مذکور ہیں۔ باقی رہی میری اپنی یا کسی اور کی ذاتی رائے تو وہ نہ قابل ذکر ہے اور نہ لائق اتباع۔

جمع منقول و معقول

اس زمانے میں نہایت مشکل کام منقول و معقول کو جمع کرنا اور ان میں مطابقت و موافقت پیدا کرنا ہے۔ گویا بظاہر آگ پانی کو یکجا کرنا ہے۔ بعض علماء منقولات کو ایسے طریق پر بیان کرتے ہیں کہ باوجود ان کے صحیح اور درست ہونے کے ان کی حقیقت و حقانیت معقولی مذاق والوں کے دماغ میں نہیں اترتی اور بعض واعظ و مصنف روایات کا دریا کچھ ایسی بے تمیزی سے بہاتے ہیں کہ صحیح و سقیم، قوی و ضعیف، ثابت و غیر ثابت، اصلی و جعلی میں مطلقاً تمیز نہیں کرتے اور جو کچھ جی میں آتا ہے یا ان کو یاد ہوتا ہے۔ بے ٹکی، بلا تحقیق دھر دباتے ہیں۔ ان کے نزدیک تحریر و تقریر کا حق اسی سے پورا ہو جاتا ہے اور معیار منقولات یہی ہے کہ جو کچھ ان کو یاد ہو اور ان کی بے قابو زبان پر چڑھ جائے یا جو کچھ ان کا بے لگام قلم لکھ سکے۔ اسے بیان کر دیں یا تحریر میں لے آئیں۔ اس روش کی وجہ سے کئی لوگ تو منقولات سے بدظن ہو گئے اور کئی بلا امتیاز ہر قسم کی وہابی جہاں باتوں پر گرہ باندھ کر دین سے گمراہ ہو گئے، بلکہ لوگوں کی جہالت و ریف قلبی کے ساتھ اس روش نے نئے نئے فرقے بنانے اور بدعات کے دواج دینے میں جلتی پر تیل کا کام کیا ہے اور بعض وہابی و خیالی منقولات کی دلدل میں ایسے پھنس جاتے ہیں کہ ثابت شدہ صحیح

منقولات، متواترات بلکہ آیات قرآنیہ کی صاف صاف تصریحات کو صریحا "نظر انداز کر دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض قلت علم یا فساد عقیدہ کی وجہ سے ان کا انکار بھی کر دیتے ہیں۔ بڑے بڑے مدعیان اصلاح و تجدید اس ظلمت میں ٹامک ٹوئیاں مار مار کر رہ گئے اور اس سیلاب ضلالت میں خس و خاشاک کی طرح بہہ گئے۔

ضرورت سے انکار نہیں لیکن اس کا پورا کرنا از بس مشکل اور خطرے سے خالی نہیں۔ اس عاجز نے خدا کے فضل و توفیق سے اس ضرورت کو اس طرح پورا کیا کہ قرآن مجید اور حدیث صحیح کو تو رکھا ہے بطور سردار اور دیگر سب علوم و علما کو رکھا ہے ان کے خدمت گار، خدمت گاروں کو سردار کی خدمت پر لگا دیا جاتا ہے نہ کہ ان کو سر پر چڑھا کر سردار کو بے قدر و سبک کیا جاتا ہے۔ اسی اصول کے مطابق میں نے اس تفسیر میں معقولات سے بھی کام لیا ہے، لیکن اثبات مسئلہ کے لیے نہیں بلکہ تفہیم مسئلہ کے لیے۔ بس میری تعمیر کا سالہ (مصلح) قرآن و حدیث سے ہے اور کارگزاری کے لیے بہتر کار گزاروں اور خدمت گاروں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر لایا ہوں۔

واللہ ولی الہدایۃ

خاکسار: محمد ابراہیم سیالکوٹی

سورة الفاتحة مکیة وہی سبع آیات

”سورة فاتحہ مکہ مکرمہ میں نازل اور اس کی سات آیات ہیں“

۱۔ اس سورت کا سب سے زیادہ مشہور نام فاتحة الكتاب یا الفاتحہ ہے۔ فاتحہ ابتداء اور شروع کو کہتے ہیں۔ چونکہ یہ سورت ترتیب خطی میں جو اللہ رب العزت کے علم میں پہلے ہی مقدر تھی۔ قرآن مجید کی ابتداء میں ہے اس لیے اس کا نام فاتحہ رکھا گیا۔ چنانچہ مفردات راغب میں ہے:-

وفاتحة كل شئ مبدء الذي يفتح به ما بعده وبه سمى فاتحة الكتاب وقيل افتتح فلان كذا اذا ابتداء به وفتح عليه (زیر لفظ فتح، ص ۷۶) ”ہر شے کی فاتحہ اس کے شروع کے مقام کو کہتے ہیں۔ جس سے اس کے مابعد کا دروازہ کھلتا ہے اور اسی وجہ سے سورت فاتحة الكتاب کا یہ نام رکھا گیا اور محاورہ (فلاں شخص نے اس طرح افتتاح کیا) اس وقت بولتے ہیں جب وہ اس سے ابتداء کرے۔“ نیز اس لیے کہ یہ سورت قرآنی علوم کی مفتاح (چابی) ہے۔ (رحمانی)

اس سورت کا یہ نام احادیث میں آنحضرت ﷺ اور صحابہ کرامؓ کی زبانی بکثرت مذکور ہے۔ اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس سورت کی جگہ خود مقرر کر دی تھی کہ یہ شروع قرآن پاک میں رکھی جائے۔ نیز یہ کہ آنحضرت ﷺ قرآن شریف کو ایک خاص ترتیب سے (جو اب موجود ہے) یاد رکھتے تھے اور صحابہ کرامؓ کو بھی یاد کرواتے اور لکھواتے تھے۔ پس سورتوں کی ترتیب خود آپ ﷺ کی مقرر کردہ ہے نہ کہ صحابہ کرامؓ کی۔ وللتفصیل مقام آخر

اس سورت کے اور بھی کئی ایک نام ہیں اور نیک القاب کی کثرت فضیلت کی دلیل ہوتی ہے۔ ۲۔ ام الكتاب اور ۳۔ ام القرآن (جامع ترمذی) اس لیے کہ یہ ابتدائے قرآن میں ہے۔ صحیح بخاری میں ہے۔

۲۔ ۳۔ ام الكتاب وام القرآن:-

سمیت ام الكتاب لانہ یبدء بکتابتها فی المصاحف و یبدء بقراءتها فی الصلوة (بخاری کتاب التفسیر) ۵۸

۵۔ علامہ ابو السعودؒ نے امام بخاریؒ کی اس وجہ تسمیہ کی نسبت لکھا ہے:-

و مناط التسمية ما ذكر في ام القرآن لا ما اوردہ الامام البخاری فی صحيحه من انه یبدء بقراءتها فی الصلوة فانه مما لا تعلق له بالتسمية كما الشیر الیه (بر حاشیہ تفسیر کبیر، ص ۵۲)

اور ام الكتاب نام رکھنے کا مدار وہ ہے جو ام القرآن میں بیان ہو چکا۔ نہ وہ جو امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں بیان کیا ہے کہ نماز میں اسی کی قرات پہلے ہوتی ہے، کیوں کہ اس وجہ کو نام رکھنے سے کوئی تعلق نہیں۔ جیسا کہ اشارہ کیا گیا ہے۔

شیخ شیخ حضرت نواب صاحبؒ نے فتح البیان میں علامہ ابو السعودؒ کی وجہ تسمیہ جو ہم نے متن میں امام راغبؒ کی عبارت کے بعد نقل کی ہے، ذکر کر کے امام بخاریؒ کی مذکورہ بالا وجہ تسمیہ بھی نقل کی ہے۔ اس کے بعد علامہ ابو السعودؒ کی مذکورہ انکاری عبارت نقل کی ہے لیکن اس کی تائید یا تردید کچھ بھی نہیں کی۔

خاکسار کہتا ہے کہ علامہ ابو السعودؒ کی دقیقہ شناسی مسلم ہے لیکن امام بخاریؒ کی نکتہ رسی میں بھی کلام نہیں۔ علامہ ابو السعودؒ نے جو وجہ تسمیہ بیان کی ہے، وہ بجا اور درست ہے اس لیے ہم نے اسے بھی نقل کر دیا ہے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کے سواء کوئی دیگر خصوصاً امام بخاریؒ کی بیان کردہ وہ وجہ تسمیہ نہ ہو، کیوں کہ ایک امر کی متعدد وجوہ ہو سکتی ہیں۔

امام بخاریؒ نے سورۃ فاتحہ کے ام الكتاب ہونے کی دو وجہیں لکھی ہیں۔ اول کتابت قرآن کے وقت اس کا ابتدائے قرآن میں آنا۔ دوم نماز میں قرات قرآن کی ابتداء اس سے ہونا۔ نظریہ واقعیت یہ دونوں باتیں درست ہیں اور ان دونوں کی بناء ایک ہی جامع امر پر ہے یعنی ابتداء اور یہی فاتحہ کے معنی ہیں اور جس طرح ام اپنی اس اولاد کا اصل، مبدء اور نشاء ہوتی ہے، جو اس سے پیدا ہوتی ہے اسی طرح اس کا وجود بھی ان سے پہلے ہوتا ہے لان المبدءية تستلزم الابتداء یعنی مبدء ہونا اس بات کو لازم پکڑتا ہے کہ وہ ابتداء میں ہو۔ پس ایک وجہ کو علامہ ابو السعودؒ نے لیا اور دوسری کو امام بخاریؒ نے اور دونوں درست ہیں بلکہ جمع بھی ہو سکتی ہیں۔ لہذا علامہ ابو السعودؒ کی جرح بجا نہیں۔

”سورۃ فاتحہ کا نام ام الکتاب اس لیے رکھا گیا کہ قرآن شریف کی کتابت کی ابتداء اسی سے ہوتی ہے اور نماز میں قرات بھی اسی سے شروع ہوتی ہے۔“
نیز مفردات امام راغب میں ہے۔ و قيل لفاتحة الكتاب ام الكتاب

علامہ ابوالسعودؒ نے ایک وجہ پر تو جرح کر دی یعنی نماز پر اور دوسری سے مطلقاً ”تعرض نہیں کیا حالانکہ دونوں میں جامع امر ایک ہی ہے یعنی ابتداء۔“

امام بخاریؒ محدث ہیں۔ انہوں نے قرآن شریف کی کتابت اور نماز میں قرات قرآن کے متعلق آنحضرت ﷺ کی سنت مستمرہ پر نظر کی کہ دونوں کا افتتاح سورۃ فاتحہ سے ہے۔

اگرچہ قرات نماز کا سورۃ فاتحہ سے افتتاح ساری دنیا کے مسلمانوں کے تعامل کے بعد کسی دیگر دلیل کا محتاج نہیں لیکن پھر بھی ہم اس تعامل کی سند کی شہادت بھی بتا دیتے ہیں کہ لفظ افتتاح جس سے فاتحہ کو لفظاً و معناً مناجت ہے۔ صحیح بخاری، جامع ترمذی، سنن نسائی، مسند دارمی وغیرہ کتب حدیث میں حضرت انسؓ اور حضرت عائشہؓ کی روایات میں بالقرآن وارد ہے۔ وہ سب روایات امام بخاریؒ کی نظر میں تھیں جس سے انہوں نے سورۃ فاتحہ کی نسبت لکھا و یبدء بقراءتها فی الصلوة یعنی نماز کی قرات بھی اسی سے شروع ہوتی ہے۔

ان منقولی دلائل کے بعد لغوی دلیل بھی ملاحظہ فرمائیے اور امام بخاریؒ کی وقت نظر اور وسعت معلومات کی داد دیجئے۔ وہ یہ کہ لفظ ام جس طرح جامعیت و شمول پر دلالت کرتا ہے۔ اس طرح تقدم پر بھی دلالت کرتا ہے۔ عام اس سے کہ وہ تقدم رتبہ میں ہو یا جگہ میں۔ عربی زبان میں اس لفظ کا استعمال بہت وسیع ہے اور تقریباً ہر اس موقع پر جس میں جامعیت یا تقدم پایا جائے، اسے استعمال کرتے ہیں۔

چنانچہ محدث ابن جریرؒ، امام بخاریؒ کی موافقت کرتے ہوئے فاتحۃ الکتاب اور ام القرآن کی وجہ تسمیہ میں فرماتے ہیں:-

وسمیت فاتحة الكتاب لانها يفتتح بكتابتها المصحف وبقراءتها في الصلوة فهي فواتح لما ينلوه من سور القرآن في الكتابة والقراءة وسميت ام القرآن لتقدمها على سائر سور القرآن غير هاوتنا خرمنا سواها خلفها في القراءة والكتابة و ذلك من معناها شبيه بمعنى فاتحة الكتاب واما قيل لها لكونها كذلك ام القرآن تسمية العرب كل جامع امرا

لکونہا مبدء الكتاب (ص ۲۱) ”اور سورۃ فاتحہ کو ام الكتاب اس لیے کہا گیا کہ یہ قرآن کا مبدء ہے۔“ یعنی قرآن شریف اس سے نکلتا یا شروع ہوتا ہے۔ شروع ہونے کا ذکر اوپر صحیح بخاری سے نقل ہو چکا۔ اب قرآن کے اس سے نکلنے اور پیدا ہونے کی بابت

اور مقملاً لامراً اذا كانت نوابغ تتبعه هولها امام جامع اما (جلد اول، ص ۳۵)

اس کا نام فاتحۃ الكتاب اس لیے رکھا گیا کہ اس سے قرآن کی کتابت شروع ہوتی ہے اور نماز کی قرات میں بھی (پہلے) یہی پڑھی جاتی ہے۔ پس کتابت اور قرات میں یہ قرآن کی باقی سب سورتوں پر مقدم ہے اور اس کا نام ام القرآن بھی اسی تقدم کی وجہ سے ہے کہ یہ قرآن کی باقی سب سورتوں سے پہلے ہے اور دیگر سب قرات اور کتابت میں اس کے پیچھے ہیں اور اس کے یہ معنی فاتحۃ الكتاب کے معنی سے مشابہ ہیں اور اسے ایسا ہونے کی وجہ سے ام القرآن اس لیے کہا گیا کہ عرب ہر اس کو جو کئی امر کا جامع ہو یا ایسے شخص کو جو کسی امر میں مقدم ہو اور دیگر اس کے پیچھے لگنے والے ہوں۔ جن کا وہ جامع امام ہو، ام کہتے ہیں۔

اس کے بعد محدث طبریؒ نے چند مثالیں لفظ ام کے استعمال کی بیان کی ہیں۔ جن میں جامعیت و تقدم کے معنی پائے جاتے ہیں لیکن ہم ان کو بخوف طوالت نقل نہیں کر سکتے۔

☆ اسی طرح علامہ ابن منظور افریقیؒ ”لسان العرب“ میں فرماتے ہیں:-

وام الكتاب فاتحۃ لانه يبتدئ بها في كل صلاة

وجاء في الحديث ان ام الكتاب هي فاتحۃ الكتاب لانها هي المقدمة امام كل سورة في

جميع الصلوات وابتدئ بها في المصحف فقدمت (زیر لفظ ام)

اور ام الكتاب قرآن کا شروع ہے کہ اسے ہر نماز میں ابتداء میں پڑھا جاتا ہے۔

اور حدیث میں وارد ہے کہ ام الكتاب ہی فاتحۃ الكتاب ہے۔ کیوں کہ سب نمازوں

میں ہر سورت سے پہلے وہی پڑھی جاتی ہے اور قرآن شریف میں اسے ہی پہلے لکھا جاتا ہے۔

اس کے بعد اس کتاب ”لسان العرب“ میں بھی اس لفظ کے استعمالات کی ایک لمبی

فہرست موجود ہے۔ جسے ہم نظر برکفایت نقل کرنا ضروری نہیں جانتے۔

☆ علامہ بدر الدین عینیؒ ”شرح صحیح بخاری میں امام بخاریؒ کی اسی زیر بحث وجہ تسمیہ کی تائید

میں فرماتے ہیں:- وقيل سميت ام القرآن لانها تؤم غيرها كالرجل يؤم غيره فيتقدم

ملاحظہ فرمائیے۔ علامہ ابوالعودؒ فرماتے ہیں:-

و تسمى ام القرآن لكونها اصلا و منشأ له اما المبدء يتها له و اما لاشتمالها على مافيه (بر حاشیہ تفسیر کبیر، ص ۵۰)

”اے ام القرآن اس لیے کہتے ہیں کہ یہ قرآن کی اصل اور اس کی پیدائش کی جگہ ہے یا تو اس لحاظ سے کہ وہ اس سے شروع ہوتا ہے اور یا اس نظر سے کہ یہ سورت جملہ مقاصد قرآن پر مشتمل ہے۔“

وجہ مناسبت یہ ہے کہ ام (ماں) کا وجود اولاد کے وجود سے پہلے ہوتا ہے بلکہ وہ ساری اولاد کا مبدء یعنی پیدا ہونے کی جگہ ہے اور ماں کا شکم بالا جمال اس ساری اولاد پر مشتمل ہوتا ہے جو اس سے پیدا ہو۔ اسی طرح قرآن کریم کے جملہ مقاصد اسی سے پیدا ہوتے ہیں اور یہ سورت ان سب پر حاوی و مشتمل ہے۔ یا یوں کہیں کہ یہ سارے قرآن مجید کا خلاصہ ہے یا یوں کہ سارا قرآن اس کی تفسیر ہے۔

اسی لیے اس عاجز نے یہ قصد کیا ہے کہ اپنی اس تفسیر واضح البیان میں سارے قرآن مجید کو بالاختصار سمیٹ کر اور اس سورت کے ذیل میں لا کر واضح کر دوں کہ واقعی یہ سورت ام القرآن ہے اور اصولاً ”قرآن شریف کے جملہ مضامین اور مقاصد کی جامع ہے۔ واللہ الموفق۔“

علامہ ابوالعودؒ نے عبارت مذکورہ بالا کے بعد بالا جمال وہ سب امور ذکر کر دیئے ہیں جو اس سورت میں مذکور ہیں اور وہی امور قرآن شریف میں متفرق طور پر جا بجا بالتفصیل مسطور ہیں۔ چنانچہ وہ یہ ہیں:-

من الثناء على الله عز وجل والتعبد بامرہ ونهيہ و بيان وعده وو عيده او

عليه (عمدة القاری، جلد ۸، ص ۴۵۸) بعض کا قول ہے کہ ام القرآن اس لیے نام رکھا گیا کہ وہ دوسری سورتوں سے مقدم ہے۔ جس طرح کہ کوئی شخص دوسروں کا امام ہو تو وہ ان سب کے آگے ہوتا ہے۔

بیان بالا سے واضح ہو گیا کہ امام بخاریؒ کی توجیہ ازروئے احادیث نبویہؐ اور بلحاظ تحقیقات لغویہ بالکل بجا اور درست ہے۔ (بدا والحمد لله لملم الحقائق و منضم الدقائق)

على جملة معانيه من الحكم النظرية و الاحكام العملية التى هى سلوك الصراط المستقيم والاطلاع على معارج السعداء و منازل الاشقياء (ابو السعود ص ۵۰ - ۱۵ بر حاشیہ تفسیر کبیر)

یعنی اللہ تعالیٰ کی ثناء اور امر و نہی میں اسی کا بندہ بن کر رہنا اور اللہ کے وعدے اور وعید (عذاب) کا ذکر یا اس وجہ سے کہ سورہ فاتحہ قرآن کریم کے جملہ اہم مقاصد پر مشتمل ہے۔ یعنی حکمت نظری اور احکام عملیہ جن پر کاربند ہونا صراط مستقیم پر چلنا ہے۔ نیز سعادت مندوں کے بلند درجوں اور بد بختوں کی ٹھلی منزلوں کی اطلاع (پر بھی مشتمل ہے)

۴۔ السبع المثانی:- (حجر، پ ۱۳ و صحیح البخاری)

یعنی ایسی سات آیات جو بار بار دہرائی جائیں۔ چونکہ سورہ فاتحہ کی سات آیات ہیں اور اسے نماز کی ہر رکعت میں دہرایا جاتا ہے اس لیے اسے یہ نام دیا گیا ہے۔ (مزید توضیح الصلوٰۃ نام کے ضمن میں دیکھئے) امام رازی نے اس سورت سے دس ہزار مسائل کا نکل سکنا ذکر کیا ہے۔ (کبیر، ص ۲)

۵۔ القرآن العظیم:- (حجر، پ ۱۳ و صحیح البخاری)

اس لیے کہ یہ سورت قرآن شریف کے جملہ مضامین پر شامل ہونے کے علاوہ عظمت و ثواب میں بھی سارے قرآن پاک کے برابر ہے۔ جس طرح سورہ اخلاص (قل هو اللہ احد، الایہ) ثلث قرآن پاک کے برابر ہے۔ (موطا و بخاری) کیوں کہ اسلام کے اعتقادی ارکان تین ہیں۔ توحید، نبوت اور آخرت اور سورہ اخلاص میں ان میں سے صرف ایک یعنی توحید خالص کا بیان ہے، لیکن سورہ فاتحہ میں ان تینوں کا ذکر ہے۔

بسم اللہ سے ملک یوم الدین تک توحید و صفات الہیہ کا بیان ہے اور ملک یوم الدین میں روز جزا یعنی آخرت کا ذکر ہے اور الذین انعمت علیہم کے ضمن میں انبیاء علیہم السلام بھی داخل ہیں۔ لقولہ تعالیٰ فالولک مع الذین انعم اللہ علیہم من النبیین (الایہ پ ۵، النساء) نیز اس لیے کہ قرآن شریف مجموعہ ہے۔ اعمال صالحہ اور صحیح اعتقادات کا۔ باقی تمام امور انہی دو کے فروغ اور اظہار ہیں جن کی پابندی

چاہیے یا انہی کی اشداد ہیں، جن سے پرہیز لازم ہے۔ قرآن میں انہی کی تفصیل ہے اور سورۃ فاتحہ میں یہ ہر دو (صحیح اعتقاد و اعمال صالحہ) بالا جمال موجود ہیں۔ اس لیے اس کا نام القرآن العظیم بھی رکھا گیا۔

۶۔ الصلوۃ:- (صحیح مسلم)

اس لیے کہ اس کی قرأت نماز کا ایک ضروری رکن ہے۔ حضرت سید عبدالقادر جیلانیؒ غنیۃ الطالبین میں فرماتے ہیں۔ فان قراءتھا فریضة وھی رکن تبطل الصلوۃ بترکھا (ص ۸۵۳) ”(نماز میں) اس کی قرأت فرض ہے اور یہ (اس کا) ایک (ضروری) رکن ہے۔ جس کے ترک سے نماز باطل ہو جاتی ہے۔“

تمام قرآن میں سے صرف اسی کو نماز میں بطور رکن مقرر کیا گیا اور باقی قرأت کے لیے اختیار دیا گیا کہ جہاں سے چاہو یا پڑھ سکو، پڑھ لو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ پڑھنے میں آسان، مضمون میں جامع اور سارے قرآن کا خلاصہ اور ثواب میں سارے قرآن مجید کے ختم کے برابر ہے۔ اتنے اوصاف والی کوئی دوسری سورت نہیں ہے۔ ۹۔

۸۔ الحمد اور الحمد للہ رب العالمین (بخاری و دار قطنی)

اس لیے کہ اس میں اصولی طور پر خدا تعالیٰ کی جملہ محامد مذکور ہیں جیسا کہ آپ ان شاء اللہ اس تفسیر میں آیت ملک یوم الدین کی تفسیر کے بعد صفات الہیہ کی تقسیم میں مطالعہ فرمائیں گے۔

۹۔ ۱۰۔ الشفاء والرقیۃ:-

اس لیے کہ آنحضرت ﷺ کے عہد میں ایک صحابی نے ایک سانپ ڈسے شخص پر اس سورت سے دم کیا تھا تو اسے شفاء ہو گئی تھی۔ (بخاری) اور سنن دارمی میں ہے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ سورۃ فاتحہ میں ہر بیماری کی شفاء ہے۔ (ص ۴۳۰)

ان مذکورہ بالا ناموں کے علاوہ اور نام بھی ہیں۔ مثلاً ”الکنز“، ”الاساس“، ”الکافیۃ“، ”الشافیۃ“، ”الوافیۃ“، ”الکفر“، ”الدعائے“، ”تعلیم المسئلہ“، ”المناجاة“، ”التفویض“،

۹۔ مسئلہ قرأت فاتحہ خلف الامام کی توضیح و تشریح بقدر ضرورت خاتمہ فاتحہ پر کی جائے گی۔ (ان شاء اللہ)

(ابو اسود، فتح الباری اور رحمانی) ان میں سے بعض نام مرفوعاً ثابت ہیں، بعض موقوف ہیں اور بعض ائمہ کے اقوال سے ہیں۔ غرض یہ کہ یہ سورت بڑی شان والی ہے۔

جائے نزول

یہ سورت مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی۔ کیوں کہ اس کی قرأت نماز میں مقرر ہے اور نماز بالاتفاق مکہ مکرمہ میں فرض ہوئی۔ نیز اس لیے کہ سورہ حجر (پ ۱۳) جس میں اسے سبع مثانی کہا گیا ہے، وہ مکی ہے۔ اس کی بالاتفاق سات آیات ہیں۔ پہلی آیت بسم اللہ الرحمن الرحیم ہے، ان شاء اللہ تعالیٰ بسم اللہ کی تفسیر میں اس کا مدلل بیان ہوگا۔

بحث اولیت نزول

بعض روایتوں میں یہ وارد ہے کہ سب سے پہلے سورہ فاتحہ نازل ہوئی لیکن یہ روایت مرسل ہے۔ (اقتان) اور مرسل روایت جمہور محدثین کے نزدیک قابل حجت نہیں، بالخصوص جب کہ وہ صحیح بخاری کی روایت کے معارض ہو، جس میں غار حرا کے واقعہ کے ضمن میں منقول ہے کہ اس وقت آنحضرت ﷺ کو حضرت جبرائیلؑ نے سورہ ملق (پ ۳۰) کی بسم اللہ الرحمن الرحیم کے بعد کی پانچ آیتیں سکھائی تھیں۔ یہی عطاء نبوت کا وقت تھا اور یہی سب سے پہلی وحی تھی۔ اس میں کسی کو اختلاف نہیں اور اگر اس مرسل روایت کا اعتبار بھی کیا جائے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ سب سے پہلے ایک دفعہ مکمل سورت یہی نازل ہوئی۔ اس سے پہلے جو سورتیں نازل ہوئیں وہ نجما، نجما اترتی رہیں۔

فضائل

اول تو اس کی فضیلت اس کے اسماء سے ظاہر ہے۔ جیسا کہ اوپر گزر چکا۔ دیگر یہ کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:-

مرسل اس روایت کو کہتے ہیں جسے تابعی بغیر ذکر صحابی کے خود رسول اللہ ﷺ کی طرف نسبت کرے۔

لفاتحة اعظم سورة من القرآن وهى السبع المثانى والقرآن العظيم۔ (خ)
 دس، ق، الحن) ”فاتحہ قرآن میں سے سب سے زیادہ عظمت والی سورت ہے اور یہی
 ساتھی اور قرآن عظیم بھی ہے۔“

طیحة فاتحة الكتاب من تحت العرش (الحن) ”مجھے سورۃ فاتحہ عرش الہی کے
 سے ملی ہے۔“

ما نزلت فی التوراة ولا فی الانجیل والزبور والقرآن مثلها یعنی ام القرآن
 وانما سبع من المثانى والقرآن العظيم الذى اعطيت (داری ص ۴۳۰) ”کوئی
 سورت مثل ام القرآن کے نہ توریت میں اتری، نہ انجیل میں، نہ زبور میں اور نہ قرآن
 میں، یہی سبع مثانی بھی ہے اور قرآن عظیم بھی ہے، جو مجھے عطا ہوئی۔“

الحمد لله ام القرآن و ام الكتاب والسبع المثانى (داری ص ۴۳۰) ”سورۃ
 الحمد ہی ام القرآن، ام الکتاب اور سبع مثانی ہے۔“

سورۃ حجر، پ ۱۳ میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کو خطاب کر کے
 فرمایا۔ ولقد اتینک سبعاً من المثانى والقرآن العظيم ○

”(اے پیغمبر!) بے شک ہم نے تم کو سات آیتیں عطا کی ہیں، جو بار بار پڑھی جاتی ہیں
 اور وہ القرآن العظیم بھی ہیں۔“

سبع مثانی اور القرآن العظیم سے صرف یہی سورۃ فاتحہ مراوے۔ ان ناموں سے
 کوئی دوسری سورت موسوم نہیں ہے۔ جیسا کہ احادیث مذکورہ بالا میں گزر چکا۔ ان کے
 صحیح بخاری کی ایک خاص حدیث ہے جو اس کی خاص فضیلت کی بھی دلیل ہے اور
 اس کی مناسبت سے ہم اسے عنوان ”فضائل“ کے ذیل میں لکھا ہے۔

عن ابی سعید بن المعلى قال مر بى النبى صلى الله عليه وسلم وانا اصلى
 فدعانى فلم اته حتى صليت ثم اتيت فقال ما منعك ان تاتي فقلت كنت
 اصلى فقال الم يقل الله تعالى: يا ايها الذين امنوا استجبوا لله وللرسول
 ثم قال لا اعلمك اعظم سورة فى القرآن قبل ان اخرج من المسجد فذهب
 لنبى صلى الله عليه وسلم فذكرته فقال الحمد لله رب العالمين هى
 السبع المثانى والقرآن العظيم الذى اوتيتهم (بخاری کتاب التفسیر، سورۃ

ج

”حضرت ابو سعید بن معلیٰ سے مروی ہے کہ (ایک دفعہ) نبی کریم ﷺ میرے پاس سے گزرے۔ میں اس وقت نماز پڑھ رہا تھا۔ آپ نے مجھے یاد فرمایا لیکن میں نماز پڑھ کر ہی حاضر ہوا تو آنحضور ﷺ نے فرمایا میرے پاس آنے سے تجھے کس چیز نے روکا؟ میں نے عرض کیا کہ میں نماز پڑھ رہا تھا۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا کیا اللہ تعالیٰ نے نہیں فرمایا کہ اے ایمان والو! جب تمہیں اللہ اور اس کا رسول بلائے تو اس کے حکم کو (فورا) قبول کیا کرو۔ پھر آپ نے فرمایا کیا میں تجھ کو مسجد سے نکلنے سے پیشتر وہ سورت نہ سکھاؤں جو قرآن میں سب سے بزرگ ہے۔ اس کے بعد جب آپ ﷺ مسجد سے نکلنے لگے تو میں نے آپ کو یاد دلایا تو آپ نے فرمایا الحمد للہ رب العالمین ہی السبع المثانی اور القرآن العظیم ہے جو مجھے عطا ہوئی ہے۔“

اس حدیث سے صاف معلوم ہو گیا کہ آیت سورہ حجر میں من الشانی کا من بیان یہ ہے اور القرآن العظیم کا الشانی پر عطف من باب عطف الصفة علی الصفة ہے۔

سنن ابن ماجہ، مسند احمد اور مستدرک حاکم میں حضرت ابی بن کعبؓ سے مروی ہے کہ ایک اعرابی نے آنحضرت ﷺ سے عرض کی کہ حضرت میرے بیٹے کو تکلیف ہے۔ آپ نے فرمایا کیا ہے؟ اس نے عرض کی کہ اسے آسیب ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا اسے میرے پاس لے آؤ۔ وہ لے آیا تو آپ نے اسے اپنے سامنے بٹھایا اور اسے سورہ فاتحہ اور دیگر آیات سے دم کیا تو وہ لڑکا اٹھ کھڑا ہوا۔ گویا کہ اس کو کوئی بھی تکلیف نہیں تھی۔ (حسن حصین، ص ۱۷۱-۱۷۲، حاشیہ نمبر ۲)

الجزء الاول

وهو

الكهف والرقيم

فی اسرار

بسم الله الرحمن الرحيم ○

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بسم (شروع) ساتھ نام

۱۔ ب۔ سورتوں کے شروع میں جو بھی بسم اللہ ہے۔ اس کی ترکیب نحوی کی نسبت کہ ب جارہ کس کے متعلق ہے۔ مفسرین و ائمہ نحاۃ کے کئی اقوال ہیں۔ انسب یہی ہے کہ الشروع یا الابتداء مبتدا محذوف کے متعلق ہے کیوں کہ قول بسم اللہ جب ذات باری کی طرف منسوب ہو تو ابتدائی یا اشروع بصیغہ تکلم موزوں نہیں ہے اور جب غیر خدا کی طرف منسوب ہو تو یہ بھی اور استعین و مستعینا وغیرہ بھی سب جائز ہیں۔ حضرت سلیمانؑ کے خط میں جو بسم اللہ ہے اور آنحضور ﷺ کے مکاتیب میں جو لکھی جاتی تھیں۔ وہ سب اسی جنس سے ہیں اور بعض کا یہ کہنا کہ ہر کام کے مناسب صیغہ تکلم کو محذوف ماننا چاہیے۔ یعنی پڑھنے کا موقع ہے تو اقرء اور لکھنے کا موقع ہے تو اکتب اور کام کرنے کا ہے تو اصنع یا افعل سمجھنا چاہیے۔ یہ بھی اسی کی تفصیل و تطویل ہے جو قول مخلوق ہونے کے وقت سب درست ہو سکتے ہیں اور بعض نے اقرء (بصیغہ امر) محذوف مانا ہے کیوں کہ سورۃ ملق میں آیا ہے۔ اقرء باسم ربک (زبئی زاوہ) لیکن پھر سورۃ ملق میں تکرار لازم آئے گا۔ وھو کما تدری

۲۔ اسم۔ لفظ اسم کے اصل کی نسبت بھی ائمہ صرف کے مختلف اقوال ہیں۔ بعض کے نزدیک اصل میں سو تھا معنی بلندی۔ کیوں کہ یہ اپنے مسمیٰ کے لیے موجب رفعت و بلندی ہوتا ہے۔ واؤ اخیر سے کثرت استعمال سے گر گئی اور حمزہ وصل شروع میں بڑھا دیا گیا۔ اسی لیے اس کی جمع اسماء اور اسماء اور فعل مزید فیہ مسمیٰ اور سمیت آتے ہیں۔ امام زعفرانیؒ اور قاضی بیضاویؒ نے اسی کی تائید کی ہے۔

۳۔ رسم الخط۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم کی کتابت میں اسم کا الف نہیں لکھا جاتا اور ب جارہ اور اسم کے سین کو ملا کر اور سین کے دندانے نکال کر یوں بسم لکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ جس جگہ باسم لکھا جائے گا الف کے ساتھ لکھا جائے گا۔ جیسے

اقرء باسم ربك الذی خلق (ملک، پ ۳۰) اور فسبح باسم ربك العظيم (واقعه و حاقه)

۴۔ باللہ نہیں کہا۔ بسم اللہ کہا ہے اور باللہ نہیں کہا تاکہ معلوم ہو کہ جس ذات کا نام برکت والا ہے، خود اس ذات کی عظمت کس قدر ہوگی۔ اللہ اکبر من کل کبیر!!!

۵۔ نیز اس لیے کہ محاورہ عرب میں باللہ، یمن (قسم) کے لیے اور بسم اللہ الخ تین (تبرک) کے لیے بولا جاتا ہے۔ پس اس امتیاز کو قائم رکھا گیا۔

۶۔ اللہ تعالیٰ کا اسم بھی بابرکت ہے۔ چنانچہ سورۃ الرحمن میں فرمایا۔ تبارک اسم ربك ذی الجلال والاكرام ○ (الرحمن، پ ۲۷)
”اے پیغمبر!“ تیرا پروردگار جو بہت بزرگی والا اور جلال والا ہے۔ اس کا نام بہت برکت والا ہے۔“

اسی طرح اللہ جل جلالہ کی ذات بھی بہت برکت والی ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔
تبارک الذی بیدہ الملک و هو علی کل شئی قذیر ○ (سورۃ الملک، پ ۲۹)
”بہت برکت والی ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں (تمام) بادشاہی ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔“

پس جس طرح اس ذات کی برکت و عظمت سے منزه ہے۔ فسبحان الذی بیدہ ملکوت کل شئی (یس، پ ۲۳) ”پاک ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں ہر چیز کی حکومت ہے۔“

اسی طرح اس کے اسماء حسنی بھی معانی کی برائی اور بے ادبی سے منزه ہیں۔ کیوں کہ جس کی ذات پاک اس کے اسماء اور صفات بھی پاک۔ چنانچہ تسبیح اسم کے لیے فرمایا۔ سبح اسم ربك الاعلیٰ (پ ۳۰) یعنی پاکیزگی بیان کر اپنے رب کے نام کی، جو سب سے اعلیٰ (اوپر) ہے۔ نیز فرمایا فسبح باسم ربك العظيم (الواقعه و الحاقه) یعنی پاکیزگی بیان کر اپنے رب کے نام کی جو بڑی عظمت و بزرگی والا ہے۔

آنحضرت ﷺ اس حکم کی تعمیل میں رکوع میں سبحان ربی العظیم اور سجدہ میں سبحان ربی الاعلیٰ پڑھا کرتے تھے۔ (ترمذی وغیرہ)

اور تسبیح ذات کی نسبت فرمایا:- سُبْحَ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ (صف، پ ۲۸) ”جو چیز بھی آسمانوں اور زمینوں میں ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی پاکیزگی بیان کرتی ہیں۔“

اس طرح کی آیات قرآن مجید میں بکثرت ہیں۔ چونکہ ذات برحق اور اس کی جملہ صفات کمال اور اس کے تمام اسمائے حسنیٰ منورہ اور بابرکت ہیں۔ اس لیے جس طرح ذات کے ذکر کا حکم کیا۔ فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَادْكُرُوا اللّٰہَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلٰی جُنُوبِكُمْ (النساء، پ ۵) ”پھر جب تم نماز ادا کر چکو تو یاد کرو اللہ کو کھڑے اور بیٹھے اور پہلوئیں لیٹے ہوئے۔“

اور دوسری جگہ فرمایا۔ وَاذْكُرُوا اللّٰہَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تَفْلَحُوْنَ (انفال، پ ۱۰ و جمع، پ ۲۸) ”اللہ کو کثرت سے یاد کرتے رہو تاکہ تم (فلاح و کامیابی) حاصل کرو۔“

اسی طرح اپنے اسم کے ذکر کی نسبت بھی فرمایا۔ وَاذْكُرْ اِسْمَ رَبِّكَ وَتَبْتَئِلْ اِلَيْهِ تَبْتٰیْلًا (مزل، پ ۲۹) ”(اے پیغمبر!) اپنے رب کا اسم کا ذکر کر اور ہر چیز کو چھوڑ چھاڑ کر اسی کی طرف لوٹ آؤ۔“

اسی طرح دوسری جگہ فرمایا۔ وَاذْكُرْ اِسْمَ رَبِّكَ بِكُرَّةٍ وَّاصِيْلًا (دہرپ، ۲۹) ”یاد کر نام اپنے رب کا صبح و شام۔“

اسی کے مطابق سرور کائنات، فخر موجودات ﷺ نے فرمایا:- اِنَّ لِلّٰہِ تِسْعَةَ و تِسْعِيْنَ اَسْمًا مَّائَةٌ اِلَّا وَاحِدًا مِنْ اَحْصَاہَا دَخَلَ الْجَنَّةَ (صحیح بخاری، کتاب التوحید) ”اللہ تعالیٰ کے ایک کم سو یعنی ننانوے ایسے نام ہیں کہ جو کوئی ان کو حفظ کر لے وہ جنت میں جائے۔“

ان ننانوے ناموں کی تفصیل جامع ترمذی کی روایت میں حسب ذیل ہے:-

فہرست اسماء حسنیٰ

(۷) ھُوَ اللّٰہُ الذی لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ

الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ الْمَلِكُ الْقُدُّوسُ السَّلَامُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ
محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

الغفران	الغفار	الباری	المصور	المتکبر	الخالق	الجبار	المعزیز
القابض	الباسط	العلیم	القابض	الفتاح	الرزاق	الوہاب	القہار
البصیر	الحکیم	السمیع	المذل	المعز	الرافع	اللطیف	الخافض
الغفور	الشکور	العظیم	الحلیم	الخبیر	الحفیظ	المکبیر	العلی
الجلیل	الکریم	الحسب	المقیمت	الواسع	الحکیم	المجیب	الغریب
المجید	الشہید	الودود	المنین	القوی	المنین	الوکیل	الحق
الحمید	المحصی	الولی	الممیت	المحی	المعید	المبلی	الغنی
القیوم	الواجد	المقتدر	القادر	الضمد	الواحد	الماجد	الاول
الموخر	المتعالی	الوالی	الباطن	الظاہر	الآخر	الاول	الاول
الملك	الروف	الغفور	المنتقم	المنعم	المنعم	المنعم	المنعم
المغنی	المانع	الجامع	المقسط	الاکرام	الاکرام	الاکرام	الاکرام
الباقی	الوارث	البدیع	الہادی	النور	النافع	النافع	النافع
الصبور	الرشید						

اسم اعظم

حدیث میں وارد ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا ایک اسم اعظم ہے۔ اس سے اللہ تعالیٰ کو پکارا جائے تو قبول فرماتا ہے اور کچھ مانگا جائے تو عطا کرتا ہے۔ (الحسن الحسین)۔
 نامہ روایات، تجربہ و بقول اکثر صلحاء وہ اسم اعظم یا حی یا قیوم ہے۔

جامع ترمذی میں حضرت معاذؓ سے مروی ہے کہ نبی مکرم ﷺ نے ایک شخص کو "یا ذا الجلال والاکرام" کہتے سنا تو اسے فرمایا۔ تیری (پکار) قبول ہو گئی۔ پس (جو کچھ تجھے مانگنا ہو وہ) مانگ لے۔ (حسن)

قل العبد الضعیف و قد جربته مراراً و هو من اورادی فی المخاوف والاهوال

حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ ایک شخص کے پاس سے گزرے

جو کہہ رہا تھا۔ یا ارحم الراحمین اس پر آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ارحم الراحمین نے تیری طرف نظر (رحمت) کی ہے۔ پس (جو مانگنا ہو) مانگ۔ (صن) قال العبد الاثیم و قد جربتہ عدد ما لا احصیہ وهو ایضا من اورادی فی هجوم الافکار والاحزان

سید المرسلین حضرت محمد ﷺ نے فرمایا کہ اللہ کا ایک فرشتہ اسی بات پر مقرر ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کو تین دفعہ اس طرح پکارے کہ یا ارحم الراحمین تو وہ فرشتہ اسے کہتا ہے کہ ارحم الراحمین نے تیری طرف توجہ فرمائی ہے پس تو (جو مانگنا چاہے) مانگ لے۔

جس طرح اللہ تعالیٰ کے اسماء الہیہ کی تسبیح و ذکر کا حکم کیا ہے۔ اس طرح اسماء الہیہ سے یعنی اس کے اسماء حسنی سے پکار کر دعا کرنے کا بھی حکم کیا ہے۔ چنانچہ فرمایا ولله الاسماء الحسنی فادعوه بها (اعراف پ ۹) یعنی اللہ ہی کے لیے ہیں اسمائے حسنی پس تم اس کو ان (ناموں) سے پکارو۔

نیز فرمایا۔ قل ادعوا اللہ او ادعوا الرحمن ایما تدعوا فله الاسماء الحسنی (بنی اسرائیل پ ۱۵) ”(اے پیغمبر!) ان سے کہو، تم اللہ (کہہ کر) پکارو، یا الرحمن (کہہ کر) پکارو کسی (نام) سے پکارو، اسی کے سب اچھے نام ہیں۔

دعائے مانگنے کا طریق

شیخ اکبر قدس سرہ اسمائے الہیہ سے دعائے مانگنے کے متعلق زیر آیت ولله الاسماء الحسنی یعنی ”اللہ ہی کے سب اچھے نام ہیں۔“ فرماتے ہیں:- قدمران کل اسم هو الذات مع صفته واللہ یدبر کل امر باسم من اسمائہ (فادعوه) عند الافتقار الی ذلک الاسم بہ اما بلسان الحال کما ان الجاهل اذا طلب العلم یدعوه باسمہ العليم والمريض اذا طلب الشفاء یدعوه باسمہ الشافی والفقير اذا طلب الغنا یدعوه باسمہ المغنی کل بتحصيل الاستعداد الذی استلزم قبولہ لتاثير ذلک الاسم و اثر تلک الصفة و اما بلسان القال کما اذا قال الاول یا رب یریدہ یا علیم لا اختصاص ربوبیتہ بذلک الاسم والثانی یریدہ بیارب

یا شافی و الثالث یا مغنی (التفسیر الصغیر للشیخ الاکبر المطبوع بمصر، جلد اول، سورۃ اعراف، ص ۱۲۳)

اس سے پیشتر گزر چکا ہے کہ ہر اسم ذات مع صفت ہے اور اللہ تعالیٰ ہر امر کی تدبیر اپنے کسی اسم سے کرتا ہے۔ (پس اسے ان ناموں سے پکارو) یعنی اس اسم کی حاجت کے وقت اللہ تعالیٰ کو اس اسم سے پکارو یا تو زبان حال سے، جیسے کوئی جاہل جب علم کا طالب ہو تو اسے اس کے اسم علیم سے پکارے اور مریض جب شفا کا خواہاں ہو تو اسے اسم شافی سے پکارے اور محتاج جب غنا کی طلب رکھے تو اسے اس کے اسم مغنی سے پکارے۔ ہر کوئی استعداد حاصل کرنے سے جو مستلزم قبولیت ہے۔ اس اسم اور صفت کی تاثیر کے لیے یا زبان قال سے۔ جس طرح کہ پہلا یعنی جاہل یا رب کہے تو اس کی مراد ہو یا علیم۔ کیوں کہ اس کی ربوبیت اس اسم سے مخصوص ہے اور دوسرا یعنی بیمار یا رب سے یا شافی اور تیسرا یعنی محتاج یا مغنی (مراد رکھے)

آنحضرت ﷺ کی بعض دعائیں

بے خوابی کی دعا:- جو کچھ حضرت شیخ اکبرؒ نے ذکر کیا۔ وہ انہوں نے قرآن و حدیث سے لیا ہے۔ آنحضرت ﷺ کی بہت سی دعائیں ایسی ہی ہیں۔ چنانچہ حضرت زید بن ثابتؓ (کاتب وحی) کو آپؐ نے اضطراب کے سبب نیند نہ آنے کے علاج میں یہ دعا سکھائی تھی۔
اللہم غارت النجوم وهدات العیون و انت حی قیوم لا تأخذک سنة ولا نوم
یا حی یا قیوم اهدی لیلی و انم عینی (الحسن الحنین، ص ۶۵)
”یا اللہ! ستارے نیچے چلے گئے اور لوگوں کی آنکھیں بھی آرام کر گئیں اور تو حی قیوم ہے۔ تجھے نہ اونگھ آتی ہے اور نہ نیند۔ اے سدا بذات خود زندہ اور قائم خدا! میری رات آسائش و آرام کی بناوے اور میری آنکھ کو سلاوے۔“

۲۔ ہر مصیبت کی دعا اور اسم اعظم:- اسی طرح آپ ﷺ واقعہ بدر میں سجدے میں پڑھا کرتے تھے۔ یا حی یا قیوم برحمتک استغیث مسی و یکرر و هو ساجد یا حی یا قیوم س مس (الحسن الحنین یوسفی، ص ۱۳۹)

اے سدا بذات خود زندہ و قائم اللہ! میں تیری رحمت کا واسطہ دے کر فریاد کرتا ہوں۔ نیز آنحضور ﷺ سجدے میں پڑ کر بار بار کہتے تھے یا حی یا قیوم۔

۳۔ اسی طرح یہ ہے کہ ایک شخص کو آپؐ نے یہ کہتے سنا۔ یا ذا الجلال والاكرام تو آپؐ نے فرمایا قد استجيب لك فسل (الحسن، ص ۳۹) یعنی تیری دعا قبول ہو گئی۔ پس (جو مانگنا ہو) مانگ لے۔

۴۔ اسی طرح یہ ہے کہ آنحضور ﷺ ایک شخص کے پاس سے گزرے اور وہ کہہ رہا تھا۔ یا رحم الراحمین تو آپؐ نے فرمایا سل فقد نظر الله اليك (الحسن ۳۹) یعنی مانگ اللہ (ارحم الراحمین) نے تیری طرف نظر عنایت کی ہے۔ اسم ارحم الراحمین کی نسبت آپؐ نے یہ بھی فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک فرشتہ اسم ارحم الراحمین کے متعلق مقرر کر رکھا ہے جو شخص اسے اس اسم سے پکارے، وہ فرشتہ اس شخص سے کہتا ہے کہ ارحم الراحمین نے تیری طرف عنایت فرمائی ہے پس (جو مانگنا ہو سو) مانگ لے۔ (حسن حصین یوسفی، ص ۳۹)

حضرت ایوبؑ کی دعا:- حضرت ایوبؑ کی دعا جو قرآن مجید میں وارد ہے جو انہوں نے اپنی رفع تکلیف کے لیے مانگی تھی۔ وہ اسی اسم ارحم الراحمین سے تھی اور وہ قبول ہوئی۔ چنانچہ فرمایا۔ وایوب اذ نادى ربه انى مسنى الضر و انت لرحم الراحمین فاستجبنا له فكشفنا ما به من ضر الاية (انبیاء، پ ۱۷)

”اور جب حضرت ایوبؑ نے اپنے رب کو پکارا۔ مجھے نہایت درجے کی تکلیف پہنچی ہے اور تو سب رحم والوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔ پس ہم نے اس کی دعا قبول فرما کر اس کی تکلیف دور کر دی۔“

۵۔ غم و اندوہ کی دعا:- اسی طرح آنحضرت ﷺ نے فکر و اندوہ کے دور کرنے کے لیے سکھایا۔ لا اله الا الله الحليم الكريم لا اله الا الله رب العرش العظيم لا اله الا الله رب السموات ورب الارض ورب العرش الكريم (الحسن، ص ۱۳۳)

”اللہ کے سوا کوئی بھی لائق عبادت نہیں ہے۔ وہ حلیم و کریم ہے۔ اللہ کے سوا کوئی بھی لائق پرستش نہیں ہے۔ وہ عرش عظیم کا مالک ہے۔ اللہ کے سوا کوئی بھی لائق بندگی نہیں ہے۔ وہ آسمانوں کا اور زمین کا اور عرش کریم کا مالک ہے۔“

۶۔ آگ جلے کے لیے دعا:۔ آگ سے جلے ہوئے بیمار کی شفا کے لیے سکھایا کہ اس پر پڑھا جائے۔ اذهب الباس رب الناس واشف انت الشافی لا شافی الا انت (الحسن، ص ۱۷۳)

”اے تمام لوگوں کے پروردگار اور مالک اس تکلیف کو دور کر دے اور شفا دے۔ تو ہی شافی ہے۔ تیرے سوا کوئی بھی شفا دینے والا نہیں۔“

۷۔ بیمار کے لیے دعا:۔ حضرت علیؓ کے پاس ایک شخص آیا اور کہنے لگا کہ فلاں شخص بیمار ہے۔ آپؐ نے فرمایا کیا تجھے خوش لگتا ہے کہ وہ شفا پا جائے۔ اس نے کہا جی ہاں۔ آپؐ نے فرمایا (یہ کلمات) کہ یا حلیم یا کریم اشف فلانا (لفظ فلانا کی بجائے بیمار کا نام لے) توہ شفا پائے گا۔ (الحسن، ص ۱۷۷)

حضرت نوحؑ کی دعا:۔ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے بیٹے کی نسبت اس طرح عرض کی۔ رب ان ابنی من اہلی وان وعدک الحق وانت احکم الحاکمین ○ (مرد پ ۱۲) ”اے میرے پروردگار! میرا بیٹا میرے اہل میں سے ہے اور بے شک تیرا وعدہ سچا ہے اور تو احکم الحاکمین ہے۔“

حضرت نوحؑ کے خیال میں آپ کا بیٹا اللہ تعالیٰ کے وعدے میں داخل تھا۔ اس لیے اپنی حاجت کے مناسب اللہ تعالیٰ کو اسم احکم الحاکمین سے یاد کیا تھا۔ کیوں کہ حاکم کی بات پختہ اور اس کا وعدہ سچا ہونا چاہیے۔

۸۔ کیا اپنی بیماری اور کیا دوسروں کی بیماری کے لیے مصنف خاکسار کا ہمیشہ ان کلمات سے دعا کرنے کا معمول ہے اور عموماً خدا کے فضل سے بیمار جلد شفا یاب ہو جاتے ہیں۔ صد بار تجربہ کیا گیا۔ (واللہ الحمد)

قرآن مجید میں جو مختلف مقامات پر اللہ تعالیٰ کے مختلف اسماء مذکور ہیں۔ وہ سب مناسبت موقع کے لحاظ سے ہیں۔ چنانچہ آپ ان شاء اللہ بڑی تفسیر ”تبصیر الرحمن“ میں ہر موقع پر دیکھتے رہیں گے۔

ازالہ شبہ:- صحیح بخاری کی ننانوے ناموں والی روایت اور جامع ترمذی سے ان کی فرست جو اوپر لکھی گئی ہے۔ اس میں ستائیس نام جو قرآن حکیم میں وارد ہیں۔ مذکور نہیں۔ مثلاً ”رب“ ”نذیر“ ”نصیر“ ”شاکر“ ”غالب“ وغیرہ پس کس طرح کہا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہی ننانوے نام ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حدیث کا فضا یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے صرف یہی ننانوے نام ہیں بلکہ نشان یہ ہے کہ ان مخصوص ننانوے ناموں کا وظیفہ منجملہ ان اعمال و اذکار کے ہے جو موجب جنت ہیں۔ (فتح الباری)

اللہ

لفظ ”اللہ“ جو ذات برحق کا علم اور اسم ذات ہے۔ زبان کی رو سے اصل میں الالہ تھا، ہمزہ الہ کا حذف کیا گیا اور الف لام اس کے عوض لڑوا ”شامل رکھا گیا۔ گویا کہ یہ جزو کلمہ ہے۔ اسی لیے ندا کے وقت یا اللہ الگ الگ بولتے ہیں اور اکثر ندا کے وقت یا کلمہ ندا کو حذف کر کے اس کے عوض اخیر میں میم مشدود لگا کر کہتے ہیں۔ اللهم (لسان) اور الہ اصل میں ولہ تھا۔ واؤ کو ہمزہ سے بدلا۔ اس کی مثالیں عربی زبان میں بہت ہیں۔ جیسے وقتت سے اقتت (مرسلات، پ ۲۹) اور وشاح سے اشاح بمعنی عورتوں کے

سید شریف ”حاشیہ کشاف“ میں فرماتے ہیں۔ اعلم ان العقلاء کما تاهوا فی ذات اللہ و صفاته لاحتجابها بانوار العظمة واستار الجبروت کذا لک تحیروا فی لفظ اللہ کانه انعکس الیه من مسماه اشعة من تلک الانوار قہرت اعین المستبصرین عن ادراکہ فاختلّفوا اسریانی ہوام عربی اسم اوصفة مشتق و مم اشتقاقہ وما اصلہ او غیر مشتق علم او غیر علم واختار العلامة انه عربی وانه کان فی الاصل اسم جنس ثم صار علما لذات المعبود بالحق واصلہ الالہ وانه مشتق من الہ بمعنی تحیر۔ (ص ۲۰)

پننے کا ہار اور وجوہ سے اجوہ اور وجاح سے اجاح معنی پردہ (لسان مع الزیادۃ)

رسم الخط :- یہ لفظ ”اللہ“ کیا لحاظ رسم الخط ہو یا لحاظ اشتقاق و معنی عجیب عجیب خصوصیتیں رکھتا ہے۔ رسم الخط کی رو سے اس طرح کہ اس کی تحریر کا طریق یوں ہے۔ ”اللہ“ اگر ہمزہ کو ابتداء سے گرا دیں تو باقی صورت اللہ کی رہ جاتی ہے اور یہ لام جارہ داخل کرنے سے اللہ کی صورت ہے۔ پھر اگر اس کے پہلے لام کو بھی گرا دیں تو صورت لہ کی رہ جاتی ہے یعنی لام جارہ اور ضمیر غائب سے مرکب اور اگر لام ثانی کو بھی گرا دیں تو صرف ہ صورت ضمیر غائب کی رہ جاتی ہے اور یہ سب یعنی اللہ لہ اور ہ ذات برحق کے لیے وارد ہیں۔ چنانچہ یہ تینوں ایک ہی آیت میں موجود ہیں۔

الحمد لله الذي له ما في السموات وما في الارض وله الحمد في الآخرة و هو الحكيم الخبير ○ (سبا، پ ۲۲) ”سب خوبیاں اللہ ہی کے لیے خاص ہیں۔ جس کی ملک میں ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے اور اسی کی تعریف ہے آخرت میں بھی اور وہ بڑا پاکست (اور) ہر چیز سے خبردار ہے۔“

لفظ ہو جو اس آیت میں اسم ضمیر ہے۔ اصل میں صرف ہ ہی تھا۔ واؤ تلفظ میں سہولت پیدا کرنے کے لیے زیادہ کی گئی ہے۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ اس کی جمع و تشبیہ ہما اور ہم ہے۔ اگر واؤ اصلی ہوتی تو تشبیہ اور جمع میں قائم رہتی۔ سبحان اللہ! یہ کیسا مبارک لفظ ہے کہ اس کے حروف مجموعی اور انفرادی ہر دو طرح پر اسی ذات پاک پر دلالت کر سکتے ہیں۔

عباراتنا شنی و حسنک واحد

و کل الی ذاک الجمال یشیر

”ہماری عبارتیں مختلف ہیں اور تیرا حسن ایک ہی ہے۔ ہر کوئی اسی جمال (بے مثال) کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔“

لفظ اللہ لحاظ اشتقاق و معنی کے لحاظ سے اس طرح کہ بنا بر اشتقاق اس کے معنی ایک معنی ہیں:-

الہ (بفتح اللام) الہة والوہة والوہیة (مصادر) معنی عبد، اسی سے ہے۔
الہ تعبد، استعالہ، استعبد۔ پس الہ کے معنی ہوئے ”عبادت کے لائق“ الہ (بکر

اللام) معنی تحیر (لسان) پس الہ کے معنی ہیں۔ ایسی ذات جس کے اور اک و معرفت میں عقل حیران ہو۔ کما قال الشہرستانی المتکلم:

لعمری لقد طفت المعاهد کلها

و سیرت طرفی بین تلک المعالم

فلم ار الا واضعا کف حائر

علی ذقن او قارعا سن نادم

”اپنی زندگی کی قسم کہ میں نے سب بڑے بڑے امور کے گرد چکر کاٹے اور ان سب نشانوں میں خوب نظریں دوڑائیں۔ پس میں نے سوائے اس کے نہ دیکھا کہ کوئی تو حیران ہو کر اپنی ہتھیلی ٹھوڑی پر رکھے ہوئے ہے اور کوئی ندامت کے دانت بجا رہا ہے۔“

الہ بکسر اللام معنی فزع اور اس کے مزید میں الہ غیرہ یعنی کسی دوسرے نے اسے پناہ دی۔ پس الہ سے مراد وہ ذات ہے کہ شہائد کے وقت اس کے پاس گزر گزائیں اور وہ پناہ دے اور ظاہر ہے کہ مصائب و شہائد میں اللہ کی طرف التجا کی جاتی ہے اور وہ اس شدت کے وقت پناہ دیتا ہے۔ چنانچہ فرمایا۔ قل من بیدہ ملکوت کل شیء و هو یجیر ولا یجار علیہ (مومنون، پ ۱۸)

(اے پیغمبر!) ان سے کہو کہ (اللہ کے سوا) وہ کون ہے جس کے ہاتھ میں ہر چیز کی حکومت ہے اور وہ پناہ دیتا ہے اور اس کی گرفت پر کوئی پناہ نہیں دے سکتا۔“

وقال الامام الشافعی:-

یا من الیہ المشتکی والمفزع

انت المعد لكل ما یتوقع

”اے وہ ذات کہ شکوہ شکایت اور رونے چلانے کی جگہ وہی ہے۔ تو ہی ہر اس چیز کا مہیا کر دینے والا ہے جس کی طلب ہو۔ الہت الی فلان ای سکنت الیہ یعنی اس کے معنی میں سکون و اطمینان بھی ہے۔ پس الہ وہ ذات ہے جس سے قلوب کو تسکین اور ارواح کو راحت و اطمینان حاصل ہو۔ چنانچہ فرمایا۔ لا بذكر الله تطمئن القلوب (رعد پ ۱۳) ”یعنی سن رکھو! دلوں کی تسلی (صرف) اللہ ہی کے ذکر سے ہے۔“ الہ کے معنی یہ بھی ہیں۔ ”ایسی ذات جس کی طرف نہایت پیار اور شغلی سے رجوع کیا جائے۔“

اور یہ ماخوذ ہے۔ محاورہ الہ الفصیل الی امہ سے ”یعنی رجوع کیا (اونٹنی کے) بچے نے اپنی ماں کی طرف۔“ اور ظاہر ہے کہ ذات برحق کی طرف ہر ایک کا رجوع نہایت فریفتگی سے ہوتا ہے۔ چنانچہ لسان العرب میں ہے۔ و معنی وله ان الخلق یولہون الیہ فی حوائجہم و یضرعون الیہ فیما یصیبہم و یفزعون الیہ فی کل ما ینوبہم کما یولہ کل طفل الی امہ (ص ۲۶۰ جلد ۱۷)

”ولہ کے معنی یہ ہیں کہ خلقت اپنی حاجات میں اس کی طرف مضطرب ہوتی ہے اور اپنے مصائب میں اس کے سامنے گڑگڑاتی ہے اور اپنے حوادث میں چلاتی ہے۔ جس طرح کہ بچہ اپنی ماں کی طرف شوق سے رجوع کرتا ہے۔“

اسی کے موافق مفردات راغب میں ہے۔ و قیل اصلہ و لاہ فابدل من الوا و ہمزة و تسمیتہ بذالک لکون کل مخلوق و الہانحوہ (ص ۲۰)

”بعض کا قول ہے کہ الہ کا اصل ولہ تھا۔ واؤ کو ہمزہ سے بدلا اور ذات حق کو اس نام سے اس لیے موسوم کیا گیا کہ ہر مخلوق اس کی طرف فریفتگی سے رجوع کرتی ہے۔“

بعض کہتے ہیں کہ اس کا اصل لہ تھا جو کہ مصدر ہے۔ چنانچہ اس کا باب مجرد باع بیع کے وزن پر یوں ہے۔ لہ یلیہ لاہا“ ولیہا“۔ قاضی بیضاویؒ نے اس کی شہادت میں یہ شعر لکھا ہے:-

کحلقة من ابی رباح
یشہدا لاہہ الکبار

لہ اور لیہ کے معنی ہیں۔ احتجاب و ارتقاء۔ چنانچہ قاموس میں ہے۔ لہ یلیہ لیہا“۔ تسترو جوز سیبویہ اشتقاق الجلالة منها و علا و ارتفع و سمیت الشمس الہة لارتفاعها (زیر لفظ لہ)

”لہ کے معنی ہیں پوشیدہ ہوا اور امام سیبویہ نے اس سے اسم اللہ کا اشتقاق جائز قرار دیا ہے۔ نیز اس کے معنی ہیں بلند ہوا اور آفتاب کو اس کی بلندی کی وجہ سے الہہ کہتے ہیں۔ چونکہ ذات برحق آنکھوں سے پوشیدہ ہے اور سب سے اوپر ہے ^{۱۱۳} ذات حق کو اوپر کی طرف ماننا فطری و جبل امر ہے۔ ہر مضطربے قراری کے وقت اوپر کو

اور ہر اس نسبت سے جو اس کی شان کے لائق نہیں بلند ہے اس لیے اسے الہ کہتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا۔ لا تدرکہ الابصار و هو یدرک الابصار و هو اللطیف الخبیر ○ (انعام، پ ۷) ”یہ آنکھیں اس کا ادراک نہیں کر سکتیں اور اسے ان سب آنکھوں کا ادراک ہے۔ اور وہ بہت باریک بین اور خبردار ہے۔“

اسی معنی میں خواجہ حافظ شیرازیؒ نے کیا خوب کہا ہے:-

ز جبر و وصل تو بحیر تم چہ چارہ کنم
نہ در برابر چشمی نہ غائب از نظری

”یعنی ذات برحق چشم ظاہر سے تو پوشیدہ ہے لیکن اس کی قدرت کے مظاہر اس کثرت سے ہیں کہ اسے عیاں سے عیاں کہہ سکتے ہیں۔“

اور حدیث میں ایک دعا ہے، جس کا شروع اس طرح ہے۔ یا من لا تراہ العیون ولا تخالطہ الظنون (الحسن، ص ۲۳۸) یعنی ”اے اللہ! تو وہ ذات ہے جسے یہ آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں اور وہم و گمان اس تک نہیں پہنچ سکتے۔“

حکمت:- اللہ تعالیٰ کے انسانی حواس سے پوشیدہ ہونے میں یہ حکمت ہے کہ جب نظر کسی شے کو محدود کر لیتی ہے اور عقل اس کی حقیقت کو پالیتی ہے تو اکثر اس کی ہیبت و عظمت ویسی باقی نہیں رہتی، جو اس کے دیکھنے سے پہلے ہوتی ہے۔ ہم اوپر بیان کر آئے کہ لفظ الہ کے معنی بلحاظ اشتقاق یہ بھی ہیں کہ عقل اس کے ادراک سے عاجز ہے اور یہ بھی کہ وہ نہایت بلند شان والا ہے۔ پس اس کی ذات کے پوشیدہ رہنے اور آثار قدرت کے نمایاں ہونے سے اس کی جلالت و عظمت دل و دماغ میں بہت پیٹھتی ہے۔

عطا کی عقل جس نے، بھلا وہ عقل میں کس طرح آئے؟

سمجھ بخشی ہے جس نے، وہ سمجھ میں کس طرح آئے؟

ہاتھ پھیلا کر طالب قبولیت ہوتا ہے۔ ہر دعا کرنے والا خدا کی رحمت کی آس میں بلا تامل اوپر کو دیکھتا ہے۔ آیت قد نری نقلاً و جھک فی السماء (پ ۲) میں اسی کا اظہار ہے۔ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ نے منہاج السنہ، جلد اول، ص ۲۶۳ میں اسے مفصل ذکر کیا ہے اور نقل کیا ہے کہ قرآن شریف میں کوئی تین سو مقامات پر اس علو کا ذکر ہے۔

یہ کہ دو فلسفے والے سے، سر پتھر سے ٹکرائے
حدیث علت وہ معلول سے، نافع نہ سر کھائے
یہاں جو آگے بڑھتا ہے، وہ منہ کی کھا کے ہٹتا ہے
جگر فم و خرد کا، عالم حیرت میں پھٹتا ہے

الرحمن، الرحیم

نہایت رحمت والے، نہایت مہربان

رحمن اور رحیم دونوں اسم ہیں اور مصدر رحمت سے مشتق ہیں۔
رحیم اور راحم کے ایک ہی معنی ہیں۔ مثل علیم اور عالم کے (بخاری) ہر دو
مبالغے کے صیغے ہیں۔ معنی کثیر الرحمت، "رحمة" لغت میں تعطف کو کہتے ہیں۔ لسان
العرب میں ہے۔ الرحمة الرقة والتعطف اور اساس البلاغة میں علامہ زعزریؒ لکھتے
ہیں۔ استرحمته واستعطفته وتراحموا تعاطفوا
اسی معنی کی رو سے بچہ دان کا نام رحم ہے کہ وہ بھی اپنے اندر کے بچے پر منعطف ہوتا
ہے۔

چونکہ بنی آدم میں یہ تعطف و مہربانی، رقت قلب (دل کی نرمی) کے سبب
ہوتی ہے اور یہ تاثر (اثر قبول کرنے) کا درجہ ہے اور ذات برحق تاثر و انفعال سے پاک
اور برتر ہے۔ اس لیے اہل لغت نے تو یہ فرق بتایا ہے کہ اگر اس کی نسبت بنی آدم کی
طرف ہو تو رقت قلب ہی مراد ہے۔ کیوں کہ بنی آدم کے دل اسی طرح مجبول و مخلوق
ہیں اور اگر ذات بیچوں کی طرف ہو تو محض تفضل و احسان مراد ہوتا ہے۔ چنانچہ لسان
العرب میں ہے۔ والرحمة فی بنی آدم عند العرب رقة القلب وعطفه ورحمة
للہ عطفه واحسانه ورزقه (جلد ۱۵، ص ۱۲۲)

”عربوں کے نزدیک بنی آدم کی رحمت کے معنی ہیں۔ دل کی نرمی اور عطوفت
و اللہ کی رحمت کے معنی ہیں۔ اس کی مہربانی، احسان اور روزی رسانی۔“
امام راغبؒ نے مفردات القرآن میں اس سے بھی زیادہ صاف لکھا ہے:-

والرحمة رقة تقتضى الاحسان الى المرحوم وقد تستعمل تارة فى الرقة المجردة و تارة فى الاحسان المجرد عن الرقة نحو رحم الله فلانا و اذا وصف به البارى فليس يراد به الا الاحسان المجرد دون الرقة و على هذا روى ان الرحمة من الله انعام و افضال و من الادمين رقة و تعطف و على هذا قول النبى صلى الله عليه و آله وسلم ذاكراً عن ربه انه لما خلق الرحم قال له انا الرحمن و انت الرحم شققت اسمك من اسمى فمن و صلك و صلته و من قطعك بنته فذلك اشارة الى ما تقدم وهو ان الرحمة منطوية على معنيين الرقة و الاحسان فركز تعالى فى طبائع الناس الرقة و تفرد بالاحسان فصار كما ان لفظ الرحم من الرحمة فمعناه الموجود فى الناس من الموجود لله تعالى فتناسب معناهما تناسب لفظيها (مفردات) ص (۱۹۰)

”رحمت“ رقت و نرمی کو کہتے ہیں، جس کا تقاضا یہ ہے کہ جس پر رحمت کی جائے، اس پر احسان کیا جائے اور کبھی تو یہ لفظ محض رقت کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے اور کبھی محض احسان کے معنی میں۔ خواہ وہ رقت سے خالی ہو مثلاً ”فلاں شخص پر اللہ رحم کرے اور جب اسے خدا کی صفت میں بیان کریں تو اس سے سوائے احسان کے جو رقت کے بغیر ہو اور کچھ مراد نہیں ہوتا اور اسی بنا پر مروی ہے کہ اللہ پاک کی رحمت سے مراد انعام و افضال ہے اور آدمیوں کی رحمت رقت اور تعطف ہے اور اسی پر مبنی ہے آنحضرت ﷺ کا وہ قول جو اپنے رب کے ذکر میں فرماتے ہیں کہ جس وقت خدا نے رحم پیدا کیا تو اسے فرمایا میں رحمن ہوں اور تو رحم ہے۔ میں نے تیرا نام اپنے نام سے مشتق کیا ہے۔ پس جو کوئی تیرا ملاپ کرے گا یعنی صلہ رحمی کرے گا۔ میں بھی اس سے ملاپ کروں گا اور جو کوئی تجھ سے قطع کرے گا، میں بھی اس سے قطع کروں گا۔ پس یہ بانہ اسی کی طرف اشارہ ہے، جس کا ذکر آگے ہو چکا اور وہ یہ ہے کہ رحمت کے ضمن میں معافی ہیں رقت اور احسان۔ پس اللہ جل جلالہ نے رقت لوگوں کی طبائع میں پیدا کئی طوطی پر جمادی اور احسان صرف اپنے لیے رکھا تو اس طرح ہو گیا کہ لفظ رحم رحمت سے ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ جو رحمت لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ وہ اس میں سے ہے جو ذات

یہ کہہ دو فلسفے والے 'سر پتھر سے ٹکرائے
حدیث علت وہ معطل ہے' ناحق نہ سر کھائے
یہاں جو آگے بڑھتا ہے' وہ منہ کی کھا کے ہٹتا ہے
جگر فم و خرد کا' عالم حیرت میں پھٹتا ہے

الرحمن، الرحیم

نہایت رحمت والے، نہایت مہربان

رحمن اور رحیم دونوں اسم ہیں اور مصدر رحمت سے مشتق ہیں۔
رحیم اور راحم کے ایک ہی معنی ہیں۔ مثل علیم اور عالم کے (بخاری) ہر دو
مبالغے کے صنف ہیں۔ معنی کثیر الرحمتہ 'رحمة' لغت میں تعطف کو کہتے ہیں۔ لسان
العرب میں ہے۔ الرحمة الرقة والتعطف اور اساس البلاغة میں علامہ زعزریؒ لکھتے
ہیں۔ استرحمته واستعطفته وتراحموا وتعاطفوا
اسی معنی کی رو سے بچہ دان کا نام رحم ہے کہ وہ بھی اپنے اندر کے بچے پر منعطف ہوتا
ہے۔

چونکہ بنی آدم میں یہ تعطف و مہربانی، رقت قلب (دل کی نرمی) کے سبب
ہوتی ہے اور یہ تاثر (اثر قبول کرنے) کا درجہ ہے اور ذات برحق تاثر و انفعال سے پاک
اور برتر ہے۔ اس لیے اہل لغت نے تو یہ فرق بتایا ہے کہ اگر اس کی نسبت بنی آدم کی
طرف ہو تو رقت قلب ہی مراد ہے۔ کیوں کہ بنی آدم کے دل اسی طرح مجبول و مخلوق
ہیں اور اگر ذات بیہیون کی طرف ہو تو محض تفضل و احسان مراد ہوتا ہے۔ چنانچہ لسان
العرب میں ہے۔ والرحمة فی بنی آدم عند العرب رقة القلب وعطفه ورحمة
الله عطفه واحسانه ورزقه (جلد ۱۵، ص ۱۲۲)

”عربوں کے نزدیک بنی آدم کی رحمت کے معنی ہیں۔ دل کی نرمی اور عطوفت
اور اللہ کی رحمت کے معنی ہیں۔ اس کی مہربانی، احسان اور روزی رسانی۔“
امام راغبؒ نے مفردات القرآن میں اس سے بھی زیادہ صاف لکھا ہے:-

والرحمة رقة تقتضى الاحسان الى المرحوم وقد تستعمل تارة فى الرقة المجردة و تارة فى الاحسان المجرد عن الرقة نحو رحم الله فلانا و اذا وصف به البارى فليس يراد به الا الاحسان المجرد دون الرقة و على هذا روى ان الرحمة من الله انعام و افضال و من الادمين رقة و تعطف و على هذا قول النبى صلى الله عليه و آله وسلم ذاكرًا عن ربه انه لما خلق الرحم قال لانا الرحم و انت الرحم شققت اسمك من اسمى فمن و صلك و صلته من قطعك بنته فذلك اشارة الى ما تقدم وهو ان الرحمة منظومة على معنيين الرقة والاحسان فركز تعالى فى طبائع الناس الرقة و تفرق بالاحسان فصار كما ان لفظ الرحم من الرحمة فمعناه الموجود فى الناس من الموجود لله تعالى فتناسب معناه تناسب لفظيهما (مفردات) (۱۹۰)

”رحمت‘ رقت و نرمی کو کہتے ہیں‘ جس کا تقاضا یہ ہے کہ جس پر رحمت جائے‘ اس پر احسان کیا جائے اور کبھی تو یہ لفظ محض رقت کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے اور کبھی محض احسان کے معنی میں۔ خواہ وہ رقت سے خالی ہو مثلاً ”فلاں شخص پر اللہ کرے اور جب اسے خدا کی صفت میں بیان کریں تو اس سے سوائے احسان کے جو رحمت کے بغیر ہو اور کچھ مراد نہیں ہوتا اور اسی بنا پر مروی ہے کہ اللہ پاک کی رحمت سے انعام و افضال ہے اور آدمیوں کی رحمت رقت اور تعطف ہے اور اسی پر نبی آنحضرت ﷺ کا وہ قول جو اپنے رب کے ذکر میں فرماتے ہیں کہ جس وقت خدا نے رحم پیدا کیا تو اسے فرمایا میں رحمٰن ہوں اور تو رحم ہے۔ میں نے تیرا نام اپنے نام سے رکھا کیا ہے۔ پس جو کوئی تیرا ملاپ کرے گا یعنی صلہ رحمی کرے گا۔ میں بھی اس سے قطع کروں گا اور جو کوئی تجھ سے قطع کرے گا‘ میں بھی اس سے قطع کروں گا۔ پس یہ رقت اسی کی طرف اشارہ ہے‘ جس کا ذکر آگے ہو چکا اور وہ یہ ہے کہ رحمت کے ضمن میں معافی ہیں رقت اور احسان۔ پس اللہ جل جلالہ نے رقت لوگوں کی طبائع میں پیدا کئی پر جمادی اور احسان صرف اپنے لیے رکھا تو اس طرح ہو گیا کہ لفظ رحم رحمت سے اس کے معنی یہ ہیں کہ جو رحمت لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ وہ اس میں سے ہے جو رحمت

حق میں موجود ہے۔ تو ان دونوں کے معنی ان دونوں کے الفاظ کی طرح مناسب ہو گئے۔

لیکن متکلمین اس عقدہ کو یوں حل کرتے ہیں کہ رحمت، غضب وغیرہ ہجو قسم امور جب ذات برحق کی طرف منسوب ہوں تو ان سے ان کی ابتداء جو انفعال و تاثر کا درجہ ہے، مراد نہیں ہوتی بلکہ ان کی غایت مراد ہوتی ہے جو درجہ فعل ہے۔ (بیضاوی) حاصل یہ کہ رحمت اور غضب وغیرہ امور کی پیدائش و ابتداء تو بے شک قلب پر کسی چیز کا اثر پڑنے سے ہوتی ہے لیکن ان کی غایت وہ ہے جو مفعول پر واقع ہوتی ہے۔ مثلاً "رحمت کی غایت مرحوم پر احسان ہے اور غضب کی غایت انتقام ہے۔ پس ذات باری تعالیٰ کی نسبت ان امور سے ان کی ابتداء سے قطع نظر کر کے محض ان کی غایت مراد ہوتی ہے اور یہ مفہوم امام راغبؒ کے کلام بالا سے بھی معلوم ہو سکتا ہے۔ اسی کے مطابق حضرت حجتہ النہد شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں:-

واعلم ان الحق تعالیٰ اجل من ان يقاس بمعقول او محسوس او يحل فيه صفات كحللول الاعراض في محالها او تعالجه العقول العامية او تتناولها الالفاظ العرفية ولا بد من تعريفه الى الناس ليكملوا كما لهم الممكن لهم فوجب ان تستعمل الصفات بمعنى وجود غاياتها لا بمعنى وجود مباديها فمعنى الرحمة افاضة النعم لا انعطاف القلب والرقه وان تستعار الفاظ تدل على تسخير الملك لمدينة تسخير له لجميع الموجودات اذ لا عبارة في هذا المعنى افسح من هذه وان تستعمل تشبيهات بشرط ان لا يقصد الى انفسها بل الى معان مناسبة لها في العرف فيراد ببسط اليد الجود مثلاً و بشرط ان لا يوهم المخاطبين ايها ما صريحا في الواث البهيمه (حجتہ اللہ صری، جلد ۱، ص ۶۲)

”خوب سمجھ لے کہ ذات برحق اس سے بہت بلند ہے کہ اسے کسی معقول یا محسوس شے پر قیاس کیا جائے یا اس میں صفات اس طرح طول کر سکیں۔ جس طرح اعراض اپنے محل میں طول کرتے ہیں یا عام محمول اس تک پہنچ سکیں یا الفاظ عرفیہ اس کا پورا بیان کر سکیں۔ لیکن لوگوں کو اس سے واقف کرنا بھی ضروری ہے تاکہ وہ اس کمال

”رحمن“ اللہ پاک کے ناموں میں سے ایک نام ہے جو پہلی کتابوں میں بھی مذکور ہے اور (عرب کے) لوگ اسے اللہ پاک کے ناموں میں سے نہیں جانتے تھے۔“
 کفر و جہالت بھی بری بلا ہے کہ اوہر تو خالق و مالک، رازق و رب العالمین خداوند تعالیٰ کو رخصن کر کے نہیں پکارتے تھے اور اوہر دنیا جہان کے جھوٹے مکار اور عیاش میلہ کذاب کو رخصن محامہ کہتے تھے۔ چنانچہ لسان العرب میں ہے:-
 وکان مسیلمۃ الکذاب یقال لہ رخصن الیمامۃ (جلد ۱۵، ص ۱۲۲)
 نکتہ:- بسم اللہ الرحمن الرحیم میں ان تینوں ناموں کے اختیار کرنے کی یہ وجہ ہے کہ سب کام تین امور پر موقوف ہیں۔

اول: اسباب ضروریہ کا جمع کرنا، تو یہ بات اسم اللہ سے حاصل ہے، جو ذات باری تعالیٰ کا ذاتی نام ہے اور جمیع صفات کمال پر دلالت کرتا ہے۔
 دوم: ان اسباب کا ابتداء سے انتہا تک باقی رکھنا۔ تو یہ اسم رخصن سے ہے کہ سارے عالم کی بقا اسی سے وابستہ ہے۔

سوم: ان اسباب کو باثمر و پائیدار بنانا، ثابت کرنا، تو یہ اسم رحیم سے ہے۔ کیوں کہ شان رحیمی یہ ہے کہ اپنے عاجز بندوں کی سعی کو رائیگاں نہ گوائے۔ (تفسیر عزیزی)
 حاصل مطلب پوری بسم اللہ شریف سے یہ ہوا کہ اللہ کے نام سے شروع جو جامع جلال و جمال اور مستجمع جمیع صفات کمال، مقام الوہیت میں متفرد، وجود عالم کی علت حقیقی، نہایت ہی وسیع الرحمت، بقائے عالم کا موجب اصلی، بغیر غرض کے احسان کرنے والا اور اپنے عاجز بندوں پر نہایت شفقت والا ہے۔

مسائل و سنن نبویہ متعلق بسم اللہ

بسم اللہ کے فضائل میں بعض مفسرین نے بہت سی ایسی روایات بھی لکھی ہیں۔ جن میں سے اکثر موضوع و بے اصل ہیں اور بعض ضعیف ہیں اور صحیح تو بہت کم ہیں۔ ہم اس مقام پر محض صحاح و حسان پر اکتفا کریں گے۔

کنوز الحقائق میں امام بیہقیؒ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:-
کل امر ذی بال لم یبدء ببسم اللہ الرحمن الرحیم فہو اقطع (کنوز الحقائق مطبوعہ مصر)

”کوئی اہم کام جو بغیر بسم اللہ الرحمن الرحیم کے شروع کیا جائے، وہ بے برکت ہوتا ہے۔“

اگرچہ اس حدیث کی اسناد میں محدثین کو کلام ہے۔ لیکن آنحضرت ﷺ کی عادت مبارک میں پایا گیا ہے کہ آپ عموماً ”جملہ امور کے شروع میں بسم اللہ یا الحمد للہ کی رعایت رکھتے تھے۔ پس اس کی عارضی کمی آنحضرت ﷺ کے فعل سے پوری ہو سکتی ہے، جو دیگر صحیح احادیث سے ثابت ہے۔ چنانچہ ہم نمبر وار وہ سب مواقع جو ثابت ہو چکے ہیں۔ لکھتے ہیں:-

۱۔ صحیح بخاری و صحیح مسلم میں حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔ قال لو ان احدکم اذا اتى اہله قال بسم اللہ اللہم جنبنا الشیطان و جنب الشیطان ما رزقنا فقضى بینہما ولد لم یضرہ (صحیح بخاری کتاب الوضوء جلد اول)

”کہ جب تم میں سے کوئی اپنی بیوی کے پاس جائے اور کہے بسم اللہ یعنی اللہ (جل جلالہ) کے اسم (مبارک) سے۔ اے اللہ ہم (میاں بیوی) سے بھی شیطان کو دور رکھ اور اس سے بھی جو تو ہم کو عطا کرے۔ پس اگر اللہ کے حکم سے کوئی بچہ ہوگا تو شیطان اس کو ضرر نہیں پہنچا سکے گا۔“

نکتہ:- بیہت کے ایسے انماک کے وقت اللہ تعالیٰ کا اسم پاک یاد کرنا نہایت مناسب

ہے۔ گویا ہیبت کو روحانیت کے سائے میں لیتا ہے تاکہ مولود (بچے) میں اس کا اثر ہو۔ اس کی تاثیر خود آنحضرت ﷺ نے اپنے الفاظ میں فرمادی ہے۔ لم یضرہ الشیطان ابداً (بخاری کتاب الدعوات و مسلم) یعنی ”شیطان اس بچے کو کبھی بھی ضرر نہیں پہنچا سکے گا“

اس سے روحانی برکات کا افاضہ ظاہر ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت زکریا کو حضرت یحییٰ کی ولادت کی بشارت کے ساتھ یہ بھی فرما دیا تھا:-

واذکر ربک کثیراً و سبّح بالعشی والابکار (آل عمران، پ ۳)

”اور یاد کر اپنے رب کو بہت بہت اور تسبیح پڑھ (اس کی) صبح اور شام۔“

ہم اپنی زبان میں نہایت ہی نیک اور مجسمہ شرافت کی نسبت کہتے ہیں کہ وہ بسم اللہ کا تحم ہے۔ اس سے یہی مراد ہوتی ہے کہ اس کی ماں کے پیٹ میں پڑنے کے وقت بسم اللہ پڑھی گئی تھی۔

۲۔ وضو کے ابتداء میں بسم اللہ پڑھنے کے متعلق امام ترمذیؒ حضرت عمرؓ کے بہنوئی حضرت سعید بن زیدؓ سے روایت کرتے ہیں:-

قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یقول لا وضوء لمن لم يذكر اسم اللہ علیہ وفی الباب عن عائشة وابی ہریرۃ وابی سعید الخدری وسہل بن سعد و انس رضی اللہ تعالیٰ عنہم قال ابو عیسیٰ قال احمد لا اعلم فی ہذا الباب حدیثا لہ اسناد جید وقال اسحق ان ترک التسمیۃ عامدا عادا للوضوء و ان کان ناسیا او متاؤلاً اجزاء قال محمد بن اسماعیل احسن شئی فی ہذا الباب حدیث رباح بن عبد الرحمنؓ

حضرت سعید بن زیدؓ کہتے ہیں۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا کہ اس شخص کا وضو نہیں ہوا۔ جس نے اس پر اللہ تعالیٰ کا اسم ذکر نہیں کیا اور اس بارے میں حضرت عائشہؓ، حضرت ابو ہریرہؓ، ابو سعید خدریؓ، سہل بن سعدؓ اور حضرت انسؓ سے بھی روایت ہے۔ ابو عیسیٰ (امام ترمذیؒ) کہتے ہیں کہ امام احمدؒ نے کہا کہ میرے علم میں اس

بارے میں کوئی ایسی حدیث نہیں ہے جس کی اسناد جید (عمدہ) ہو اور امام اسحاقؒ نے کہا ہے کہ اگر کسی نے عمداً "بسم اللہ چھوڑ دی تو وہ دوبارہ وضو کرے اور اگر نسیان سے یا تاویل سے (بسم اللہ کی بجائے الحمد للہ کہہ کر) چھوڑی ہے تو کافی ہو گا۔ امام بخاریؒ نے کہا ہے کہ اس بارے میں سب سے بہتر حدیث ربیع بن عبد الرحمنؒ کی ہے یعنی جو امام ترمذیؒ نے روایت کی۔

اسی طرح حسن حصین میں ہے۔ واذا توضأ فليسم الله (د۔ ت۔ ق) یعنی جس وقت وضو کرنے لگے تو بسم اللہ پڑھے۔

امام شوکانیؒ نے بعض دیگر اکابر محدثین کی تحقیقات کا خلاصہ یوں نقل کیا ہے۔ و الظاهر ان مجموع الاحادیث يحدث منها قوة على ان له اصلاً وقال ابو بكر بن ابي شيبة ثبت لنا ان النبي صلى الله عليه وآله وسلم قاله وقال ابن سيد الناس في شرح الترمذی ولا يخلو هذا الباب من حسن صريح و صريح غير صحيح (نیل الاوطار، جلد اول، ص ۱۳۱)

"حافظ ابن حجرؒ نے کہا (اس بارے کی) تمام احادیث کی مجموعی قوت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اس (حدیث) کا کچھ اصل ضرور ہے اور ابو بکر بن ابی شیبہؒ (استاد بخاریؒ) نے کہا، ہمیں ثابت ہو گیا ہے کہ نبی ﷺ نے یہ بات ضرور کہی ہے۔"

اور ابن سید الناس نے شرح ترمذی میں کہا ہے کہ یہ باب (بسم اللہ وضو کے ابتداء میں پڑھنے کا) خالی نہیں ہے۔ حسن صریح سے (یعنی جو صریح ہے وہ حسن ہے) اور صریح غیر صحیح سے (یعنی جو صحیح ہے اور اس میں صریح ذکر نہیں ہے)

اور حافظ ابن القیمؒ زاد المعاد میں فرماتے ہیں۔ ولم يحفظ عنه انه كان يقول على وضوءه شيئاً غير التسمية (ج ۱، ص ۵۱)

"آنحضرت ﷺ سے یہ بات محفوظ نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وضو کے وقت بسم اللہ کے سوا کچھ اور بھی پڑھا کرتے تھے۔"

اسی وجہ سے امام شافعیؒ "الام" میں فرماتے ہیں:-

واحب للرجل ان يسمي الله عز وجل في ابتداء وضوءه فان سهي سمي متي ذكر وان كان قبل ان يكمل الوضوء وان ترك التسمية ناسيا او عامدا لم

يفسد وضوءه ان شاء الله تعالى (الام، جلد اول، ص ۲۷)
 ”میں آدمی کے لیے اس امر کو مستحب جانتا ہوں کہ وضو کے شروع میں بسم اللہ پڑھے۔ پس اگر سہواً ترک کر دے تو جب اسے یاد آئے بسم اللہ پڑھ لے۔ اگرچہ تکمیل وضو سے پیشتر ہو اور اگر سہواً ”یا عذر“ بسم اللہ ترک کی تو اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہے تو اس کا وضو فاسد نہیں ہوگا۔“

ہدایہ متن ہدایہ جو حنفی مذہب کی معتبر کتاب ہے۔ اس میں سنن البہارۃ کے ضمن میں کہا ہے۔ و تسمیۃ اللہ تعالیٰ فی ابتداء الوضوء۔ یعنی منیۃ وضو کی سنتوں کے وضو کے ابتداء میں بسم اللہ پڑھنا بھی ہے اور ہدایہ شرح ہدایہ میں کہا ہے۔ والاصح انها مستحبة وان سمعھا فی الكتاب سنة یعنی زیادہ صحیح یہی ہے کہ (وضو کے شروع میں) بسم اللہ پڑھنی مستحب ہے اگرچہ کتاب میں (امام قدوری نے) اسے سنت کہا ہے۔“
 ہماری غرض اس تفصیل سے یہ ہے کہ ائمہ حدیث و فقہ نے بالاتفاق وضو کے ابتداء میں بسم اللہ پڑھنے کو تسلیم کیا ہے۔ کسی نے فرض کہا، کسی نے سنت اور کسی نے مستحب، لیکن انکار کسی نے نہیں کیا۔

نکتہ:- وضو کے ابتداء میں بسم اللہ پڑھنے کے متعلق جس قدر احادیث مروی ہیں۔ چونکہ ان میں سے کوئی بھی امام بخاریؒ کی اس شرط کے مطابق جس کا التزام انہوں نے اپنی الجامع الصغیر میں کیا ہے، صحیح نہیں ہے۔ اس لیے انہوں نے اپنی صحیح میں وضو کے وقت بسم اللہ پڑھنے کے متعلق اس طرح باب باندھا ہے:-

باب التسمیۃ علی کل حال وعند الوقاع ”یعنی ہر حال میں خصوصاً“ (اپنی بیوی سے) جماع کرنے کے وقت بسم اللہ پڑھنے کے بیان میں۔ ”پھر اس کے نیچے وہ حدیث ذکر کی ہے۔ جو جماع کے وقت بسم اللہ پڑھنے کے بارے میں ہم نے نمبر اول میں درج کی ہے۔“

اس باب کی سرفنی اور حدیث مندرجہ میں چند باتیں قابل لحاظ ہیں۔

اول:- یہ کہ کتاب الوضو میں ایسا باب لائے ہیں، جس میں وضو وغیرہ امور متعلقہ کا مطلقاً ذکر نہیں اور اسے بظاہر وضو سے کوئی تعلق بھی نہیں۔

دوم:- پھر اس باب کے ذیل میں جو حدیث ذکر کی ہے۔ اسے باب کے صرف دوسرے جزو سے تعلق ہے لیکن اس دوسرے جزو کو کتاب الوضو سے بظاہر کوئی بھی تعلق نہیں۔ سوم:- یہ کہ حدیث مذکور میں باب کے پہلے جزو کے متعلق مطلقاً کوئی ذکر نہیں۔

پہلی بات کا جواب یہ ہے کہ جب باب کے الفاظ میں علی کل حال ہے تو وضو بھی اس کل میں داخل ہے اور علی کل حال امام ممدوح نے رسول اللہ ﷺ کی عادات پر نظر کرنے سے لیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم عام حالات میں بسم اللہ پڑھا کرتے تھے اور وضو بھی ایک متم بالشان شرعی امر ہے تو ہو نہیں سکتا کہ آنحضرت ﷺ اس وقت بسم اللہ نہ پڑھتے ہوں۔ گو وہ روایات جو بالخصوص اس بارے میں وارد ہیں، اس درجہ کی صحیح نہیں ہیں جو ان کی صحیح میں مندرج ہیں۔ لیکن سب کی سب اس درجہ کی بھی نہیں ہیں کہ قطعاً ناقابل اعتبار ہوں۔ چنانچہ امام بخاریؒ کی یہ بات امام ترمذی کی عبارت سے ظاہر ہے جو ان کے بلا واسطہ شاگرد خاص ہیں کہ امام بخاریؒ کہتے ہیں۔ احسن شئی فی هذا الباب حدیث رباح بن عبد الرحمن یعنی اس بارے میں جس قدر روایات مروی ہیں۔ ان میں سے نسبتاً سب سے بہتر وہ حدیث ہے جس کے راوی رباح بن عبد الرحمن ہیں جو ہم نے سابقاً بروایت امام ترمذیؒ نقل کر دی ہے۔

دوسری بات کا جواب یہ ہے کہ امر جماع کو کتاب الوضو سے بظاہر مناسبت نہیں لیکن مصنف کے طریق استدلال کی رو سے بہت لطیف مناسبت ہے۔ وہ یہ کہ جماع نہایت درجہ کی بہیشت کا کام ہے۔ پس جب آنحضرت ﷺ نے بسم اللہ کی تعلیم سے ایسے کام کو روحانیت میں رنگ دیا، تو وضو تو پہلے ہی روحانی امر ہے۔ اس میں اسے کیسے فراموش کر سکتے تھے۔ پس وضو کے وقت بطریق اولیٰ بسم اللہ پڑھنی چاہیے۔

اور تیسری بات کا جواب پہلی بات کے جواب کے ضمن میں آ گیا ہے۔ جہاں علی کل حال کا ماخذ بتایا گیا ہے۔ ولله درالامام الہمام البخاریؒ ما دق اجتہادہ و ما لطف فکرہ۔

۳۔ جائے ضرور میں جانے کے وقت کی نسبت حضرت علیؓ سے رفعاً مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ ستر ما بین الجن و عورات بنی آدم اذا دخل الکنیف ان یقول بسم اللہ (ابن ماجہ، کتاب الدارۃ، ص ۲۶)

”جنوں سے بنی آدم کی شرمگاہوں کا پرودہ یہ ہے کہ جب بیت الخلاء میں داخل ہو، کہے بسم اللہ۔“
 نیز حسن حصین میں ہے۔ واذاقام لیتہجد فان دخل الخلاء فليقل بسم اللہ (حسن حصین، ص ۶۷) ”جب کوئی تہجد کی نماز کے لیے اٹھے تو اگر بیت الخلاء میں جائے تو چاہیے کہ کہے بسم اللہ۔“

۴۔ کھانے پینے کے وقت:- کھانے پینے کے وقت بسم اللہ پڑھنے کی احادیث کثرت سے ہیں۔ ہم ان میں سے بعض نقل کرتے ہیں:-

عن عمرو بن ابی سلمة رضى الله تعالى عنه قال كنت غلاما فى حجر رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم وكانت يدى تطيش فى الصحيفة فقال لى رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم كل بسم الله وكل بيمينك وكل مما يليك (مشکوٰۃ)

”حضرت عمرو بن ابی سلمہؓ کہتے ہیں کہ میں چھوٹا لڑکا تھا اور رسول اللہ ﷺ کی پرورش میں تھا۔ کھانے کے وقت میرا ہاتھ رکابی میں بے تحاشہ پڑتا تھا۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے مجھے فرمایا۔ بسم اللہ پڑھا کر اپنے دائیں ہاتھ سے اور اپنے آگے سے کھایا کر۔“
 وعن ابن عباس رضى الله تعالى عنه قال قال رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم لا تشربوا واحدا أكشرب البعير ولكن اشربوا مشنى وثلاث وسموا اذا انتم شربتم واحمدوا والذارفعتم (رواه الترمذی)

”حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اونٹ کی طرح ایک ہی دم میں نہ پیا کرو بلکہ دو یا تین سانسوں میں پیا کرو اور جب پینے لگو تو اللہ کا نام لیا کرو یعنی بسم اللہ پڑھا کرو اور جب (پی کر منہ) ہٹا لو تو اللہ تعالیٰ کی حمد کیا کر یعنی الحمد للہ پڑھا کرو۔“

و عن عائشة قالت قال رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم اذا اكل احدكم فنسى ان يذكر الله على طعامه فليقل بسم الله اوله وآخره (مشکوٰۃ)
 حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے جب کوئی کھانے لگے اور اللہ کا نام یاد کرنا بھول جائے تو چاہئے کہ بعد ازاں یوں کہے۔ بسم اللہ اولہ و

آخرہ یعنی میں نے اول میں بھی اور آخر میں بھی اللہ کے نام سے کھایا۔

۵۔ سونے کے وقت:- سونے کے وقت بسم اللہ پڑنے کی احادیث بھی بہت ہیں۔
عن حذیفۃ قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اذا اخذ مضجعه من الیل وضع یدہ تحت خدہ ثم یقولہ اللہم باسمک اموت واحی
(الحدیث رواہ البخاری، مشکوٰۃ)

”حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ رات کے وقت اپنے بستر پر
لیٹے تو اپنا (دایاں) ہاتھ اپنے رخسار کے نیچے رکھتے پھر کہتے اللہم باسمک اموت واحی
یعنی اے اللہ! میں تیرے ہی نام سے مرتا ہوں اور (تیرے ہی نام سے) جیوں گا۔“
اس بارے میں ایک اور دعا بھی ہے جو سرور کائنات، فخر موجودات ﷺ کی تعلیم
کر رہے ہیں اور بحمدہ تعالیٰ اس پر فقیر کا دائمی عمل ہے اور وہ یہ ہے:-

باسمک ربی وضعت جنبی وبک ارفعه ان امسکت نفسی فارحمها وان
ارسلتها فاحفظها بما تحفظ به عبادک الصالحین (متفق علیہ، مشکوٰۃ)

”اے میرے مالک پروردگار! تیرے ہی نام سے میں نے اپنا پہلو رکھا اور تیرے
ہی نام سے اسے (صبح) اٹھاؤں گا۔ اگر تو میری جان (نیند میں) قبض کر لے تو اس پر
رحمت کرنا اور اگر (صبح کہ) واپس بھیجے تو اس کی ان اسباب سے حفاظت کرنا، جن سے تو
اپنے صالحین بندوں کی حفاظت کیا کرتا ہے۔“

۶۔ سواری کے وقت:- سواری کے وقت جب آپ ﷺ اپنا قدم مبارک رکاب
میں رکھتے تو کہتے بسم اللہ اور جب برابر بیٹھ جاتے تو کہتے الحمد للہ (مشکوٰۃ، ص ۲۰۶،
بروایت احمد و ترمذی و ابی داؤد عن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

۷۔ گھر سے باہر نکلتے وقت:- ام المؤمنین حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ
ﷺ جب گھر سے باہر نکلتے تو کہتے۔ بسم اللہ تو کللت علی اللہ یعنی میں اللہ کے نام سے
گھر سے باہر جاتا ہوں اور میرا بھروسہ صرف اللہ پر ہی ہے۔ (مشکوٰۃ، ص ۲۰۷)

۸۔ بازار میں خریداری کے وقت:- آنحضور ﷺ بازار میں (کچھ خریدنے کے
لیے) جاتے تو کہتے بسم اللہ اللہم انی اسئلك خیر هذه السوق وخیر ما فیہا۔

الحديث (مكثوة) یعنی اللہ کے نام سے بازار میں آیا ہوں۔ اے اللہ! میں تجھ سے اس بازار کی اور جو کچھ اس میں ہے اس کی بھلائی مانگتا ہوں۔
ان تفصیلات سے صاف واضح ہو گیا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی عام عادت مبارک تھی کہ ہر کام کو اللہ تعالیٰ کے اسم پاک سے شروع کرتے تھے۔ کیوں کہ انسان حرکت نفس اور عزم قوی سے کام کے شروع کرنے اور اختتام تک اس پر قائم رہنے نیز جملہ اسباب کے حاصل کرنے اور انجام کار مراد کے مطابق کامیاب ہونے میں اللہ تعالیٰ کی مدد توفیق کا ہر دم محتاج ہے۔

یہ ہے مقام عبودیت اور شان الوہیت کی معرفت، جو نبی مکرم ﷺ کے جملہ حالات میں نمایاں ہے لیکن ظاہر بین بے دین اور اسباب پرست دنیا دار اس سے ناواقف و بے خبر ہیں۔ اللہم صل علی محمد اعراف الخلائق بک

سورۃ توبہ کے سوا سب سورتیں بسم اللہ سے شروع ہوتی ہیں

ہمارے نزدیک اس کی سب سے زبردست دلیل وہ ہے جو قاضی بیضاویؒ نے دیگر دلائل کے ضمن میں بیان کی ہے:-

والاجماع ان ما بین دفتین کلام اللہ سبحانه و تعالیٰ والوفاق علی اثباتہا فی المصاحف مع المبالغة فی تجرید القرآن حتی لم تکتب امین۔
(بیضاوی مصری، ص ۹)

”اس بات پر سب کا اجماع ہے کہ دو مقووں کے درمیان جو کچھ بھی مکتوب ہے۔ وہ سب اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا کلام ہے۔ نیز اس پر (بھی) سب کا اتفاق ہے کہ بسم اللہ جملہ مصاحف میں برابر مکتوب چلی آئی ہے۔ حالانکہ محض الفاظ قرآن کے لکھنے میں یہاں تک مبالغہ کیا جاتا تھا کہ آمین بھی نہ لکھی گئی۔“
اسی طرح امام نوویؒ شرح صحیح مسلم میں فرماتے ہیں:-

واعتمد اصحابنا و من قال بانها اية من الفاتحة انها كتبت فی المصحف بخط المصحف و كان هذا باتفاق الصحابة و اجماعهم علی ان لا یثبتوا فیہ بخط القران غیر القرآن و اجمع بعدهم المسلمون کلهم فی کل الاعصار

الی یومنا واجمعوا انہا لیست فی اول برائۃ وانہا لا تکتب فیہا و ہذا یؤکد ما قلناہ (جلد ۱ ص ۱۷۲)

”اور ہمارے اصحاب نے اور اس نے جس کا یہ قول ہے کہ بسم اللہ فاتحہ کا جزو ہے۔ اس پر اجماع کیا کہ وہ نسخہ قرآن میں باقی قرآن کے خط میں لکھی گئی اور یہ بات صحابہ کرامؓ کے اتفاق سے تھی اور ان کا اس بات پر اجماع تھا کہ مصحف میں قرآن کے خط میں سوائے قرآن کے اور کچھ نہ لکھیں اور ان کے بعد تمام زبانوں میں اس وقت تک تمام مسلمانوں کا اجماع ہے کہ بسم اللہ سورۃ برات (سورۃ توبہ) میں نہیں ہے۔ نیز یہ کہ وہ اس میں نہ لکھی جائے۔ پس یہ دلیل ہماری اس بات کو پختہ کرتی ہے جو ہم نے کی۔ (کہ فاتحہ کی جزو ہے۔)

اس کی توضیح یوں ہے کہ اس میں کسی کو کلام نہیں کہ آنحضرت ﷺ نے اپنی حیات طیبہ میں ہی تمام قرآن مجید لکھوا دیا تھا۔ لیکن وہ مختلف اشیاء پر مکتوب تھا۔ ایک جگہ جلد نہیں ہو سکتا تھا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہد میں انہی اجزاء سے ایک جگہ کاغذ پر نقل کیا گیا۔ پھر عہد عثمانیؓ میں اسی کی نقلیں کروا کر ممالک اسلامیہ میں اس کی اشاعت کی گئی۔ دنیا جہان کی روایتوں کی پڑتال سے ایک روایت بھی نہیں ملے گی کہ ان تین زمانوں میں سے کوئی بھی زمانہ تھا جس میں سورتوں کے ابتداء میں سورۃ توبہ کی طرح بسم اللہ مکتوب نہیں تھی۔ یا یہ کہ آنحضور ﷺ کے بعد فلاں زمانے میں اس کا رواج شروع ہوا اور ان تین زمانوں میں قرآن مجید کو مجرد و خالص رکھنے کے لیے یہاں تک التزام کیا گیا تھا کہ ابتداء میں نہ تو سورتوں کے نام لکھے گئے اور نہ فاتحہ کے خاتمے پر آمین ہی لکھی گئی۔ حالانکہ آمین وہ کلمہ ہے کہ سرور کائنات ﷺ اونچی قرأت کے وقت فاتحہ کے خاتمے پر باواز بلند پکارا کرتے تھے اور آپ ﷺ کے ساتھ صدہا نفوس قدسیہ بھی اسی طرح بلند آمین پکارتے تھے۔ (ترمذی و بخاری) اس اہتمام و حفاظت سے صاف ثابت ہے کہ یہ ہر سورت کی ابتدائی آیت ہے۔ بجز سورۃ توبہ کے کہ آنحضرت ﷺ نے اس میں نہیں لکھوائی تو صحابہ کرامؓ نے بھی نہیں لکھی۔ یعنی نہ اصل میں حضور اکرم ﷺ نے لکھوائی اور نہ اس کی نقل کے وقت صحابہ کرامؓ نے اسے وہاں لکھا۔

الغرض اس میں کچھ بھی شک نہیں کہ جو قرآن ہم سینوں میں محفوظ رکھتے ہیں۔

وہ وہی ہے جو آنحضرت ﷺ لکھوا گئے تھے اور جو آپ ﷺ کے اوپر دیگر حفاظ کے سینوں میں محفوظ تھا اور زبانوں سے پڑھا جاتا تھا۔ حضرت محمد مصطفیٰ، احمد مجتبیٰ ﷺ کے وقت سے اس وقت تک جتنے نسخے لکھے گئے، سب میں ہر سورت کے ابتداء میں بجز سورہ توبہ کے بسم اللہ مکتوب تھی اور ہے۔ پس بجز سورہ توبہ کے یہ ہر سورت کی پہلی آیت ہے۔ جیسا کہ حضرت امام شافعیؒ کا مذہب ہے۔ چنانچہ سنن ابی داؤد میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے:-

عن ابن عباسؓ قال کان النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لا یعرف فصل السورۃ حتی تنزل علیہ بسم اللہ الرحمن الرحیم (سنن ابی داؤد، باب من جهر بسم اللہ الرحمن الرحیم) ”کہ رسول اللہ ﷺ ایک سورت سے دوسری سورت کی جدائی کو نہ پہچانتے تھے۔ یہاں تک کہ آپ ﷺ پر بسم اللہ الرحمن الرحیم اترتی۔“
نیز یہ کہ صحیح مسلم میں سورہ کوثر کے نزول کی نسبت حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ انزلت علی انفا سورۃ فقرء بسم اللہ الرحمن الرحیم ○ انا اعطینک الکوثر ○ فصل لربک وانحر ○ ان شائک ہو الابتر ○ (مسلم کتاب السلوة)

”مجھ پر ابھی ایک سورت اتری ہے پھر آپ ﷺ نے سورہ کوثر پڑھی۔ یعنی شروع اللہ الرحمن و رحیم کے نام سے۔ (اے پیغمبر!) ہم نے تجھے (حوض) کوثر عطا کیا ہے۔ پس تو اپنے رب کے لیے نماز پڑھا کر اور قربانی (بھی) کیا کر، بے شک تیرا دشمن ہی ہر طرح کی بھلائی سے محروم و بد نصیب رہے گا۔“

ان روایتوں میں صریحاً ”سورت کے ساتھ بسم اللہ کا نزول بھی مذکور ہے۔ اس کے علاوہ آنحضور ﷺ کے عمل سے بھی اس کا ثبوت ہو سکتا ہے کہ بسم اللہ پہلی آیت ہے، سورہ الحمد وغیرہ کی۔ چنانچہ صحیح روایتوں سے ثابت ہے کہ آنحضرت ﷺ سورہ فاتحہ اونچی پڑھنے کے وقت بسم اللہ بھی اونچی آواز سے پڑھتے تھے۔ چنانچہ روایات ذیل اس پر شاہد ہیں:-

(۱) عن قتادہ قال سئل انسؓ کیف کانت قرأۃ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فقال کانت ملأ ثم قرء بسم اللہ الرحمن الرحیم یمد بسم اللہ و یمد

بالرحمن و بسم بالرحيم (رواہ البخاری)

”حضرت قتادہ تابعیؒ کہتے ہیں کہ حضرت انسؓ صحابی سے پوچھا گیا کہ نبی کریم ﷺ کی قرات کس طرح ہوتی تھی تو انہوں نے کہا کہ کھینچ کر (مد سے) ہوتی تھی۔ پھر انہوں نے پڑھا بسم اللہ الرحمن الرحیم، بسم اللہ کو اور الرحمن کو اور الرحیم کو کھینچ کھینچ کر (مد سے) پڑھا۔“

۲- وروی ابن جریج عن عبد اللہ بن ابی ملیکۃ عن ام سلمۃ انہا سئلت عن قراءۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فقالت کان یقطع قراتہ آیۃ آیۃ بسم اللہ الرحمن الرحیم الحمد للہ رب العالمین الرحمن الرحیم ملک یوم الدین۔ (رواہ احمد و ابو داؤد منتقی، ص ۵۸)

”عبد اللہ بن ابی ملیکۃ تابعیؒ کہتے ہیں کہ ام المؤمنین حضرت ام سلمہؓ سے حضور پاک ﷺ کی قرات کی بابت دریافت ہوا تو انہوں نے فرمایا کہ آپ ہر آیت کو الگ الگ کر کے پڑھتے تھے۔ (پھر پڑھ کر سنایا۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم، الحمد للہ رب العالمین، الرحمن الرحیم، مالک یوم الدین۔“

ان کے علاوہ دیگر روایات بھی ہیں۔ جو حافظ دار قطنیؒ نے اپنی سنن میں بیان کی ہیں۔ مصنف علام نے ان میں سے بعض کی اسناد کی تصحیح اور ان کے راویوں کی توثیق کی ہے۔ جن سے اصل مسئلہ بخوبی ثابت ہو سکتا ہے کہ بسم اللہ کا جری نماز میں بلند پڑھنا ثابت ہے۔ چنانچہ سنن نسائی میں ہے:-

عن نعیم المجرم قال صلیت وراء ابی ہریرۃ فقرء بسم اللہ الرحمن الرحیم ثم قرء بام القرآن حتی اذا بلغ غیر المغضوب علیہم ولا الضالین فقال امین فقال الناس امین و یقول كلما سجد اللہ اکبر و انا قام من جلوس الاثنین قال اللہ اکبر و انا سلم قال والذی نفسی بیدہ انی لا شبہکم صلوۃ برسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (نسائی ص ۱۵۱)

”نعیم مجرمؒ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت ابو ہریرہؓ کے پیچھے نماز پڑھی۔ انہوں نے بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھی پھر (باقی) سورہ فاتحہ پڑھی۔ حتیٰ کہ جب آپ غیر المغضوب علیہم ولا الضالین پڑھ چکے تو آمین کہا اور (مقتدی) لوگوں نے بھی کہا

آمین اور جب سجدے میں جاتے تو کہتے اللہ اکبر اور جب دو رکعتوں کے بعد جلسہ و تشہد سے اٹھے تو بھی کہا اللہ اکبر اور جب سلام پھیرا تو کہا مجھے قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ تم سب میں سے میری نماز رسول اللہ ﷺ کی نماز سے زیادہ مشابہ ہے۔“

اس حدیث کو امام دار قطنیؒ نے باب وجوب قرآۃ بسم اللہ الرحمن الرحیم فی الصلوۃ والجہر بہا میں اسی سند کے ساتھ روایت کیا ہے اور پھر کہا ہے ہذا صحیح و رواۃ کلمہ ثقات (دار قطنیؒ ص ۱۱۵) یعنی یہ حدیث صحیح اور اس کے راوی سب کے سب ثقہ (اور معتبر) ہیں۔

اسی طرح سنن دار قطنیؒ میں حضرت انسؓ سے بھی مروی ہے:-

عن انس بن مالک قال صلی معاویۃ بالمدينة صلوۃ فجہر فیہا بالقرآۃ فلم یقرء بسم اللہ الرحمن الرحیم لام القرآن ولم یقرہا للسرۃ الّتی بعدہا ولم یکبر حین یہوی حتی قضی تلک الصلوۃ فلما اسلم ناداه من سمع ذلک من المهاجرین والانصار من کل مکان یا معاویۃ اسرقت الصلوۃ ام نسیت قال فلم یصل بعد ذلک الاقرء بسم اللہ الرحمن الرحیم لام القرآن و للسرۃ الّتی بعدہا و کبر حین یہوی ساجداً۔ کلہم ثقات (دار قطنیؒ ص ۱۱۷)

حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ حضرت امیر معاویہؓ نے مدینہ طیبہ میں ایک جہری نماز پڑھائی اور اس میں سورہ فاتحہ والی بسم اللہ اور اس کے بعد کی سورت کی بسم اللہ اونچی نہ پڑھی اور سجدے میں جاتے وقت تکبیر بھی نہ کہی۔ حتیٰ کہ نماز ختم کی اور جب سلام پھیرا تو مہاجرین و انصار میں سے ہر طرف سے جس جس نے یہ امر سنا، اس نے آواز دی کہ اے معاویہؓ تم نے نماز میں (جان بوجھ کر) چوری کی یا تم بھول گئے۔ راوی حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ اس کے بعد امیر معاویہؓ نے جو نماز پڑھائی۔ اس میں سورہ فاتحہ نیز اس کے بعد کی سورت کی بسم اللہ برابر (اونچی) پڑھتے رہے اور سجدے میں جاتے وقت اللہ اکبر بھی کہتے رہے۔ (امام دار قطنیؒ کہتے ہیں کہ اس کے راوی) سب ثقہ (معتبر و پختہ) ہیں۔

حضرت امیر معاویہؓ امیر المومنین اور خلیفہ وقت تھے۔ امیر کی فروگزاشت پر

ایسی جرات سے سب مہاجرین و انصار جو نماز میں حاضر تھے۔ بالاتفاق معترض نہیں ہو سکتے۔ جب تک کہ ان کے پاس بسم اللہ کے اونچی پڑھنے کی قوی دلیل اور خاص کر آنحضرت ﷺ کی عملی سنت نہ ہو۔ پھر یہ کہ حضرت معاویہؓ نے ان کی بات تسلیم بھی کر لی اور آئندہ کے لیے بسم اللہ اونچی پڑھنی شروع کر دی۔

امام شوکانیؒ نے نیل الاوطار میں ذکر کیا کہ اس حدیث کو امام شافعیؒ نے بھی اپنی اسناد سے اور امام حاکم نے بھی اپنی مستدرک میں روایت کیا ہے اور کہا ہے۔ صحیح علی شرط مسلم یعنی یہ روایت امام مسلم کی شرط پر صحیح ہے۔
ناظرین کی سہولت کے لیے ذیل میں ہم نقشہ میں ان صحابہؓ، تابعین اور ان کے بعد کے بزرگان دین کے اسماء ذکر کرتے ہیں جو بسم اللہ کے اونچی پڑھنے کے قائل ہیں۔

صحابہ کرامؓ

ابو بکر صدیقؓ	عثمان غنیؓ	علی المرتضیٰؓ	عبد اللہ بن عمرؓ
عبد اللہ بن عباسؓ	عبد اللہ بن زبیرؓ	سمرہ بن جندبؓ	بریدہ بن حبیبؓ
ابو ہریرہؓ	ابی بن کعبؓ	ابو قتادہؓ	ابو سعیدؓ
انس بن مالکؓ	عبد اللہ بن ابی اوفیؓ	عمار بن یاسرؓ	جابرؓ
شداد بن اوسؓ	عبد اللہ بن جعفرؓ	حسین بن علیؓ	امیر معاویہؓ
ام سلمہؓ	نعمان بن بشیرؓ	حکم بن عیمرؓ	طلحہؓ
علاء بن ثورؓ	بشر بن معاویہؓ	حسین بن عرظہؓ	ابو موسیٰ اشعریؓ

تابعین اور ان کے بعد کے بزرگ

ان کی بابت امام شوکانیؒ، امام خطیبؒ سے نقل کرتے ہیں کہ:-

لما التابعون و من بعدهم ممن قال بالجمهور بها فهم أكثر من ان يذكروا واسمع لن يحصروا (نیل الاوطار، جلد ۲، ص ۹۱) ”تابعین اور ان کے بعد کے بزرگ جو بسم

اللہ اونچی پڑھنے کے قائل ہیں۔ ان کی تعداد ذکر سے زیادہ اور حصر سے باہر ہے۔
اس کے بعد تابعین کے اسماء کی حسب ذیل فہرست دی ہے:-

تابعین رحمہم اللہ

سعد بن مسیب	طاؤس	عطاء	مجاہد
ابو وائل	سعد بن جبیر	محمد بن سیرین	مکرمہ
زین العابدین	امام باقر	سالم بن عبد اللہ	محمد بن سکندر
ابو بکر بن حزم	محمد بن کعب قرظی	نافع بن عمر	ابو شعثاء
عمر بن عبد العزیز	مکحول	حبیب بن ابی ثابت	امام زہری
ابو قلابہ	علی بن عبد اللہ	ابن علی بن عبد اللہ	ارزق بن قیس
عبد اللہ بن معقل	عبد اللہ بن صفوان	محمد بن حنفیہ	سلیمان تیمی

تابع تابعین وغیرہم

عبید اللہ العری	حسن بن زید	زید بن زین العابدین	محمد بن عمر بن علی
ابن ابی ذئب	یرث بن سعد	اسحق بن راہویہ	معتز بن سلیمان

اس کے بعد امام شوکانیؒ نے امام بیہقیؒ کے حوالے سے لکھا ہے کہ:-

اجتمع آل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم علی الجھر بسم اللہ
الرحمن الرحیم (ص ۹۱) ”آئمہ اہل بیت کا بسم اللہ اونچی پڑھنے پر اجتماع ہے۔“

حضرت امام ابو حنیفہؒ اور مسئلہ بسم اللہ

باقی رہا حضرت امام ابو حنیفہؒ کا مذہب تو اسے ہم کسی قدر تفصیل سے بیان کرنا

چاہتے ہیں:-

ہدایہ میں باب مفتہ الصلوۃ میں کہا ہے۔ ویقرء بسم اللہ الرحمن الرحیم

۱۹
ہکذا نقل فی المشاہیر اس کے تھوڑا آگے کہا ہے:-
ثم عن ابی حنیفہؒ انه لا یاتی بها فی اول کل رکعة کالتعوذ و عنه انه یاتی بها احتیاطاً و هو قولہما ولا یاتی بها بین السورتین والفاطحة الاعند محمدؒ

۲۰ مولانا عبدالحی مرحوم لکھنویؒ ”ہکذا نقل“ پر حاشیہ نمبر ۲۴ میں فرماتے ہیں:-

قلت فیہ احادیث منها حدیث نعیم المجمر قال صلیت خلف ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ فقرء بسم اللہ الرحمن الرحیم ثم قرء بام القرآن فلما سلم قال والذی نفسی بیدہ انی لا شبہکم صلوۃ برسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فتح القدیر شرح ہدایہ میں اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد کہا ہے:-

قال ابن خزمۃ لا لرتباب فی صحیحہ عند اہل المعرفۃ یعنی ابن خزمۃؒ نے کہا ہے کہ حدیث کی پہچان والوں کے نزدیک اس حدیث کی صحت میں کوئی شک نہیں۔

۲۱ مولانا عبدالحی صاحب نے ”فی المشاہیر“ پر حاشیہ نمبر ۲۵ میں لکھا ہے:-

ورواہ ابن خزمۃ و ابن حبان فی صحیحہیہما والحاکم فی المستدرک و قال صحیح علی شرط الشیخین ولم یخرجاہ

اس حدیث کو امام ابن خزمۃؒ اور امام ابن حبانؒ نے بھی اپنی اپنی صحیح میں روایت کیا ہے اور امام حاکمؒ نے مستدرک میں روایت کر کے کہا ہے کہ یہ (حدیث) امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ کی شرط پر صحیح ہے۔ گو ان دونوں نے اسے اپنی اپنی کتاب میں نقل نہیں کیا۔

۲۲ حضرت مولانا ممدوح لایانیؒ بھا پر بین السورتین لکھتے ہیں ہو رواۃ الحسن عنہ یعنی یہ بات امام ابو حنیفہؒ سے آپ کے شاگرد حسن بن زیادؒ تولوی نے روایت کی ہے اور حسن بن زیاد کی نسبت دوبارہ روایت حدیث محدثین کی شہادت اچھی نہیں، حافظ ذہبیؒ نے میزان میں منروک لا یحتج وغیرہ الفاظ نقل کئے ہیں اور مولانا عبدالحیؒ نے فوائد بحیہ میں حسن بن زیاد کے ترجمہ میں امام سماعیؒ سے نقل کیا ہے۔ لیس بشی فی الحلیث یعنی حدیث میں بالکل لاشی ہے، کسی کام کا نہیں۔

۲۳ یاتی بھا پر فتح القدیر میں کہا ہے۔ وہی رواۃ ابی یوسفؒ انه یاتی بھا و هو قولہما یعنی امام ابو حنیفہؒ سے اس بات کی روایت کہ بسم اللہ فاتحہ کے شروع میں پڑھنی چاہئے۔ امام ابو

فانہ یاتی بہافی صلوة المخافتة (جلد اول یوسفی، ص ۹۷)
 ”پھر یہ کہ امام ابو حنیفہؒ سے مروی ہے کہ اسے (بسم اللہ کو) ہر رکعت کے اول

یوسفؑ کی روایت ہے اور یہی صاحبینؒ کا قول ہے اور امام ابو یوسفؒ جیسا کہ فقہاء کے نزدیک علم و حفظ میں پختہ ہیں، ویسے ہی محدثین کے نزدیک بھی مجتہد ہیں۔ چنانچہ امام نسائی نے کتاب الضعفاء والمتروکیں میں جہاں حسن بن زیاد و مذکور کو کذاب غبیث لکھا ہے وہاں امام ابو یوسف کو ثقہ لکھا ہے۔

۲۰ مولانا عبدالحی لفظ ”احتیاطاً“ پر حاشیہ نمبر ۸ میں لکھتے ہیں۔ قوله احتیاطاً لان العلماء اختلفوا فی التسمیة هل هی من الفاتحة ام لا وعلیہ قرأۃ الفاتحة فی کل رکعة فکان علیہ قراءۃ تہافی کل رکعة لیكون ابعده عن الاختلاف“ (ص ۹۷)

احتیاطاً اس لیے کہا گیا ہے کہ علماء میں اختلاف ہے کہ بسم اللہ شریف سورۃ فاتحہ کی جزو ہے یا نہیں۔ جب نماز میں ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ کا پڑھنا ضروری ہے تو اسے بسم اللہ بھی ہر رکعت میں ضرور پڑھنی چاہئے تاکہ اختلاف سے دور رہے۔

اسی طرح علامہ نسفیؒ نے کنز میں سنن نماز میں بسم اللہ کے پڑھنے کو بھی شمار کیا ہے اور اس کی شرح میں ہے۔ ثم هل یاتی بہافی اول الفاتحة فی الركعات الاخری عن ابی حنیفہؒ روایتان و عنہما یاتی و هو اولی کذا فی البدائع (حاشیہ کنز نو کثوری، ص ۲۳)
 پھر یہ کہ دیگر رکعات میں بھی فاتحہ کے شروع میں پڑھے، اس کی بابت امام ابو حنیفہؒ سے دو روایتیں ہیں اور صاحبینؒ سے مروی ہے کہ پڑھے اور یہی اولی ہے۔ کتاب بدائع میں بھی اسی طرح ہے۔ اور کنز ہی میں فصل ترتیب امور نماز میں کہا ہے وسمی سرافی کل رکعة (کثوری، ص ۲۵) یعنی بسم اللہ پڑھے، آہستہ آہستہ ہر رکعت میں۔

اور منیۃ المصلی کے متن میں کہا ہے ثم یسمی فیاتی بہافی کل رکعة لان اکثر المشائخ علی ہذا (باب مفتۃ الصلوة، ص ۹۷) یعنی پھر (ثناء کے بعد) بسم اللہ پڑھے اور اسے ہر رکعت میں پڑھے، کیوں کہ (ہمارے) اکثر مشائخ اسی پر ہیں اور اس کی شرح کبیری میں بسم اللہ کی سنیت اور وجوب کے متعلق بہت تفصیل سے مدلل بحث کر کے وجوب کو اصح اور احوط لکھا ہے۔

چنانچہ اس کے الفاظ حسب ذیل ہیں۔ (الاول) فمیل الشیخ حافظ الدین النسفیؒ محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

میں نہ پڑھے جس طرح کہ اعوذ نہیں پڑھی جاتی اور آپ سے یہ جی مروی ہے کہ احتیاطاً "بسم اللہ پڑھ لیا کرے اور یہی مذہب ہے صاحبین کا اور سورۃ فاتحہ اور کسی

ف کتبہ وقاضیخان وصاحب الخلاصة وکثیر الی انہا سنة وکذا ما تقدم عن النوادر و یفید ذالک و ذکر الزیلعی فی شرح الكنز ان الاصح انہا واجبة وکذا ذکر الزاہدی عن الحسن الصحیح انہا واجبة فی کل رکعة و مرادہ فی کل رکعة یجب فیہا القراءة وقال ابن وہبان فی منظومة ولولم یسمل ساهیا فی کل رکعة فیسجد لانا بایجابہا قال اکثر ای یسجد للسهو لانا ترکہا ساهیا اول کل رکعة یجب فیہا القراءة لان اکثر المشائخ قال بوجوبہا و ہذا هو الاحوط فان الاحادیث الصحیحة تدل علی مواظبتہ علیہ الصلوۃ والسلام علیہا وما ورد فیہا من الافتتاح بالحمد لله فلیس بنص علی ترکہا فکان الایجاب هو الاحوط (ص ۲۷۲)

علامہ حافظ الدین نسفی قاضی خان صاحب خلاصہ اور صاحب نوادر کا میلان اس طرف ہے کہ بسم اللہ پڑھنی سنت ہے اور امام زیلعی نے شرح کتز میں کہا ہے کہ اصح یہ ہے کہ وہ واجب ہے۔ اسی طرح زاہدی نے حسن سے نقل کیا کہ وہ ہر رکعت میں واجب ہے۔ اور اس سے اس کی مراد ہے۔ ہر وہ رکعت جس میں قرات واجب ہے اور ابن وہبان نے منظومہ میں کہا کہ اگر ہر رکعت میں سوا "بسم اللہ ترک کر دے تو سجدہ (سو) کرے کیوں کہ اکثر ائمہ نے اس کا واجب ہونا لکھا ہے اور یہی احوط ہے کیوں کہ صحیح احادیث اس پر دلالت کرتی ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے اس پر پھٹکی کی ہے اور جو الحمد للہ سے شروع کرنے کے بارے میں وارد ہے۔ وہ اس کے ترک پر نص نہیں ہے۔ (یعنی ہو سکتا ہے کہ سرا پڑھ لیا ہو) پس واجب ہونا ہی احوط ہے۔ (کبیری ص ۲۷۲)

پھر اس کے بعد موضع ثالث میں محل قرات کے متعلق کہا ہے:-

فقہی روایۃ عن ابی حنیفۃ ان محلہا اول الصلوۃ والصحیح ان محلہا اول کل رکعة احتیاطاً لان اکثر المشائخ علی ہذا نقل فی الکفاۃ عن الحسن انہ قال حسن انہ یسمی اول کل رکعة اصحابنا جمیعاً لا خلاف فیہ ومن زعم انہ یسمی مرۃ فی الاول فحسب فقد غلط علی اصحابنا فاحشا عرفہ من نامل کتب اصحابنا والروایات عنہم

دوسری سورت کے درمیان نہ پڑھے مگر امام محمدؒ کے نزدیک خفیہ نماز میں یہ بھی جائز ہے۔“

حاصل کلام یہ کہ حضرت امام ابو حنیفہؒ کا محقق مذہب یہی ہے کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ کی باقی آیتوں کی طرح واجب ہے اور اکثر مشائخ حنیفہ کا یہی قول ہے۔ اور جو روایت پہلی رکعت کے بعد دیگر رکعات میں نہ پڑھنے یا واجب نہ

لکن الخلاف فی الوجوب فعندہما فی روایۃ المعلى عن ابی حنیفۃ انہ نجب التسمیۃ فی الثانیۃ کو جو بیہا فی الاولی روایتہا و روایۃ الحسن عن ابی حنیفۃ لا نجب الا عند الافتتاح وان قرءہا فی غیرہ فحسن ثم قال الحسن والصحیح انہ نجب التسمیۃ فی کل رکعۃ انتہی واستدلوا علی الاحتیاط باختلاف العلماء فی انہایۃ من الفاتحۃ اولاً، فكان الاحتیاط الاتیان بہا للخروج من الخلاف (کبیری، ص ۲۷۲)

امام ابو حنیفہؒ سے ایک روایت میں ہے کہ اس کا (بسم اللہ پڑھنے کا) محل نماز کے شروع میں ہے اور صحیح یہ ہے کہ اس کا محل ہر رکعت کا شروع ہے۔ از روئے احتیاط۔ کیوں کہ اکثر مشائخ اسی پر ہیں۔ کفایہ میں حسن سے نقل کیا کہ ہمارے سب اصحاب نے بلا اختلاف اس امر کو مستحسن جانا ہے کہ ہر رکعت کے شروع میں بسم اللہ پڑھے اور جس نے یہ گمان کیا کہ صرف پہلی دفعہ ایک بار ہی پڑھے، اس نے ہمارے اصحاب کا مذہب کھلم کھلا غلط سمجھا۔ جو شخص ہمارے اصحاب کی کتابوں میں اور ان کی روایات میں تامل کرے گا۔ وہ اسے بخوبی سمجھ لے گا۔ ہاں وجوب (اور سنیت میں) بے شک اختلاف ہے۔ محل کی روایت میں امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک امام ابو حنیفہؒ سے یہ روایت ہے کہ بسم اللہ دوسری رکعت میں بھی پہلی رکعت کی طرح واجب ہے اور حسن (نولوی) کی روایت میں ان دونوں کے نزدیک امام ابو حنیفہؒ سے یہ روایت ہے کہ وہ واجب نہیں ہے مگر شروع میں اور اگر دیگر رکعات میں بھی پڑھ لے تو اچھا ہے۔ پھر حسن نے کہا کہ بسم اللہ ہر رکعت میں واجب ہے۔ (انتہی مترجماً) اور علماء نے احتیاط کی دلیل یہاں سے لی ہے کہ علماء میں اس امر میں اختلاف ہے کہ بسم اللہ فاتحہ کی آیت ہے یا نہیں۔ پس احتیاط اسی میں ہے کہ اختلاف سے نکلنے کے لیے اسے پڑھ ہی لے۔

نے کی ہے، وہ حسن بن زیاد کی ہے جو محدثین کے نزدیک معتبر نہیں ہے۔ جیسا کہ اشی میں گزر چکا۔ باوجود اس کے حسن بن زیاد خود وجوب کے قائل ہیں جیسا کہ کبیری رحمہ اللہ سے منقول ہو چکا اور حضرت امام صاحبؒ سے جو روایت بسم اللہ ہر رکعت میں پڑھنے کی ہے۔ وہ امام ابو یوسفؒ کی ہے۔ جو محدثین کے نزدیک ثقہ اور معتبر ہیں اور خود بھی اس کے قائل ہیں نیز اس روایت اور اس قول میں امام محمدؒ بھی ان کے ساتھ ہیں بلکہ وہ فاتحہ اور دوسری سورت کے درمیان میں بھی پڑھنے کے قائل ہیں۔ اگرچہ یہی نمازوں میں کہتے ہیں۔ پس جب حضرت امام ابو حنیفہؒ سے اور ان کے دو لائق شاگردوں امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ سے پڑھنے کی روایتیں ثابت ہیں جن پر فقہ حنفی کا دعوہ دار ہے اور حسن بن زیاد جن کی روایت سے بعض لوگ غلطی میں پڑ گئے۔ وہ وجوب کے قائل ہیں تو اب حضرات حنفیہ کو اس پر عمل کرنے میں کوئی حجاب نہیں ہوتا چاہیے۔ رواج عام دیگر امر ہے اور تحقیق مسئلہ دیگر شے ہے۔ والحق احق ان یتبع یعنی حق زیادہ لائق ہے کہ اس کی پیروی کی جائے۔ ہذا والحمد للہ ملہم الحقائق و مفہم الدقائق

ترک و اخفائے بسم اللہ کی روایات اور فیصلہ

باقی رہیں وہ روایات جو بسم اللہ کے ترک و اخفا کی ہیں۔ سب سے محکم صحیحین کی یہ روایت ہے۔ عن انسؓ ان النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم و ابا بکر و عمر کانوا یفتحون الصلوۃ بالحمد للہ رب العالمین (بخاری باب ما یقول بعد التکبیر)

”حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ نبی ﷺ اور حضرات ابو بکر و عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہم (تراۃ) نماز الحمد للہ رب العالمین سے شروع کرتے تھے۔“

اس کا جواب اولاً ”تو یہ ہے کہ بعض علماء نے دونوں قسم کی روایات کو یوں جمع کیا ہے کہ جہر و اخفا ہر دو طریق جائز ہیں۔ کیوں کہ روایات ہر دو طرف موجود ہیں۔ کسی نے جہر کو اختیار کر لیا اور کسی نے اخفاء کو۔ چنانچہ سبل السلام شرح بلوغ المرام میں اسی

حدیث کے ذیل میں ہے:-

والا قرب انه صلى الله عليه وآله وسلم كان يقرء بها تارة جهرا او تارة
يخفيها وقد استوفينا البحث في حواشي شرح العمدة بما لا زيادة عليه و
اختار جماعة من المحققين انها مثل سائر آيات القرآن يجهر بها فيما
يجهر فيه ويسر بها فيما يسر فيه (ج ۱، ص ۱۰۷)

”اور زیادہ قریب یہی ہے کہ آنحضرت ﷺ بسم اللہ کبھی اونچی پڑھتے تھے اور
کبھی خفیہ اور ہم نے یہ بحث شرح عمدۃ الاحکام کے حواشی میں مکمل طور پر بیان کر دی
ہے۔ جس پر زیادتی کا درجہ باقی نہیں اور محققین کی ایک جماعت کا مختار یہ ہے کہ بسم اللہ
حش دیگر آیات قرآن کے ہے۔ جبری میں اسے بھی بالجر پڑھا جائے اور سری میں اسے
بھی سرا“ پڑھا جائے۔“

آنحضرت ﷺ اور حضرات شیخین قرات کے وقت سورۃ فاتحہ دوسری سورت
سے پہلے پڑھتے تھے۔ کیوں کہ جب سورۃ فاتحہ اور کوئی دیگر مقام بھی قرآن کریم میں سے
پڑھنا ہے تو کسی کو شبہ پڑ سکتا ہے کہ خواہ سورۃ فاتحہ باقی قرات سے پہلے پڑھیں، خواہ پیچھے
پڑھیں، تعمیل حکم بہر دو صورت ہو سکتی ہے تو حضرت انسؓ اس شبہ کو دور کرنے کے لیے
آنحضرت ﷺ اور آپ کے خلفاء کا طریق عمل ذکر کرتے ہیں کہ آپ ﷺ اور حضرات
شیخین سورۃ فاتحہ پہلے پڑھتے تھے اور دیگر سورت پیچھے۔ اس کے یہ معنی ہرگز ہرگز نہیں
ہیں کہ آنحضور ﷺ اور حضرات شیخین بسم اللہ ترک کر کے قرات آیت الحمد للہ سے
شروع کرتے تھے۔ چنانچہ امام نسائیؒ نے اپنی سنن میں حضرت انسؓ کی اسی روایت کے
متعلق یہ باب باندھا ہے۔ باب البدایۃ بفاتحة الكتاب قبل السورة یعنی دیگر سورۃ
سے قبل سورۃ فاتحہ سے قرات شروع کرنے کا باب، پھر اس باب کے ضمن میں حضرت
انسؓ کی یہی روایت دو طریق سے روایت کی ہے۔“

امام نسائیؒ کے علاوہ امام ترمذیؒ نے بھی اس حدیث کو اپنی جامع میں نقل کر کے
اس کے معنی کی نسبت امام شافعیؒ کا قول نقل کیا ہے۔ آپ نے فرمایا:-

وقال الشافعیؒ انما معنی هذا الحديث ان النبي صلى الله عليه وآله وسلم
ابا بكر و عمر و عثمان كانوا يفتتحون القراءة بالحمد لله رب العالمين

معناہ انہم کانوا یبدلون بقرۃ فاتحۃ الكتاب قبل السورۃ و لیس معناہ انہم کانوا لا یقرؤن بسم اللہ الرحمن الرحیم (ترمذی، جلد ۱، ص ۳۴)

”اس حدیث کے یہ معنی ہیں کہ آنحضرت ﷺ اور حضرات ابوبکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ قرأت کسی دیگر سورت سے پہلے سورۃ فاتحہ سے شروع کرتے تھے اور اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم نہیں پڑھا کرتے تھے۔“

امام نسائیؒ اور امام شافعیؒ نے اس حدیث کے جو معنی کئے ہیں، وہ بالکل درست ہیں۔ چنانچہ ان کی تائید حضرت انسؓ ہی کی دوسری روایت سے ہوتی ہے کہ۔ عن انسؓ قال کنا نصلی خلف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم و ابی بکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ فکانوا یستفتحون بام القرآن (دار قطنی، ص ۱۴۰)

”ہم آنحضرت ﷺ اور حضرات ابوبکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ کے پیچھے نماز پڑھتے تھے تو آپ جہری نمازوں میں ام القرآن سے قرأت شروع کرتے تھے۔“

اس روایت میں الحمد للہ رب العالمین کی بجائے ام القرآن وارد ہے اور یہ دونوں روایتیں حضرت انسؓ سے مروی ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت انسؓ نے کبھی سورۃ فاتحہ کو ام القرآن کے نام سے بیان کیا اور کبھی الحمد للہ رب العالمین سے اور یہ دونوں اسی کے نام ہیں۔ نیز ابو داؤد کی روایت مرفوعاً مروی ہے۔ الحمد للہ رب العلمین، ام القرآن و ام الكتاب و السبع المثانی (حاشیہ عمدۃ الاحکام، جلد اول، ص ۶۳) جیسی آنحضرت ﷺ نے فرمایا الحمد للہ رب العالمین، ام القرآن بھی ہے اور ام الكتاب بھی اور السبع المثانی بھی۔ پھر اس کے بعد اسی حاشیہ میں کہا ہے کہ اس سورت کا نام الحمد للہ رب العالمین امام بخاریؒ، امام دارمیؒ، امام ترمذیؒ، ابن منذرؒ، ابن ابی حاتمؒ، ابن مردودہؒ، امام احمدؒ، نسائیؒ، ابن خزیمہؒ اور ابن حبانؒ وغیرہم (آئمہ محدثین) نے بھی روایت کیا ہے۔ (افقی مترجماً) چنانچہ امام بخاریؒ کی روایت حسب ذیل ہے:-

عن ابی سعید بن المعلى قال مر بی النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم و انا اصلی فدعا نى فلم اته حتى صلیت ثم اتیت فقال ما منعک ان تاتینى فقلت کنت اصلی فقال الم یقل اللہ تعالیٰ یا ایہا الذین امنوا استجیبوا للہ و للہ رسول اذا دعاکم ثم قال الا اعلمک اعظم سورۃ فی القرآن قبل ان اخرج

من المسجد فذهب النبي صلى الله عليه وآله وسلم فذكرته فقال الحمد لله رب العلمين هي السبع المثاني والقرآن العظيم الذي أوتيته (بخاری، کتاب التفسیر)

نبی ﷺ میرے پاس سے گزرے درآں حال کہ میں نماز پڑھ رہا تھا۔ آپ ﷺ نے مجھے بلایا تو میں آپ کی خدمت میں نماز پڑھ کر ہی حاضر ہوا۔ آپ نے فرمایا تجھے میرے پاس آنے سے کس امر نے روکا۔ میں نے عرض کی کہ میں نماز پڑھ رہا تھا۔ اس پر آپ نے فرمایا! کیا اللہ نے یہ نہیں فرمایا کہ اے مسلمانو! جب تم کو اللہ اور اس کا رسول بلائے تو اس کے حکم کی تعمیل فوراً کیا کرو۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا! کیا میں تجھے مسجد سے نکلنے سے پہلے قرآن شریف کی سب سے بزرگ سورت نہ بتاؤں؟۔ اس کے بعد جب آپ مسجد سے جانے لگے تو میں نے آنحضور ﷺ کو یاد کرایا تو نبی پاک ﷺ نے فرمایا الحمد لله رب العلمین یہی السبع المثانی ہے اور یہی القرآن العظیم ہے جو مجھے عطا ہوئی ہے۔

یعنی قرآن شریف میں جو اللہ جل شانہ نے فرمایا ولقد اتینک سبعاً من المثانی والقرآن العظیم (حجر پ ۱۳) تو اس سے مراد یہی سورت الحمد لله رب العلمین ہے۔

حافظ ابن حجرؒ اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں۔ قال ابن التین فیہ دلیل علی ان بسم اللہ الرحمن الرحیم لیست اية من القرآن کذا قال و عکس غیرہ لانہ اراد السورة و یؤیدہ انہ لو اراد الحمد لله رب العلمین الاية لم یقل هي السبع المثاني لان الاية الواحدة لا یقال لها سبع فدل علی انہ اراد بها السورة و الحمد لله رب العلمین من اسمائها و فیہ قوة لتأویل الشافعی فی حدیث انسؓ حیث قال كانوا یفتتحون الصلوة بالحمد لله رب العلمین قال الشافعی: اراد السورة و تعقب بن ہنہ السورة تسمى سورة الحمد لله ولا تسمى الحمد لله رب العلمین و هذا الحدیث یرد هذا التعقب (بخاری دہلوی، کتاب تفسیر، ص ۱۱۳)

”ابن التین نے کہا کہ اس میں دلیل ہے کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم قرآن کی آیت نہیں ہے۔ اس نے تو یہی کہا لیکن دیگروں نے اس کے برعکس، کہا کہ اس سے

آنحضور ﷺ کی مراد سورت ہے اور اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ اگر آپ کی مراد صرف آیت الحمد للہ رب العالمین ہوتی تو آپ اسے السجہ الثانی نہ کہتے۔ کیوں کہ اہل آیت کو سبج (سات) نہیں کہہ سکتے۔ پس یہ اس کی دلیل ہے کہ اس سے آپ کی مراد سورت ہے اور الحمد للہ رب العالمین بھی اس سورت کے ناموں میں سے ہے اور حضرت انسؓ کی حدیث کے جو معنی امام شافعیؒ نے کئے ہیں اس سے اس بات کو تقویت مل جاتی ہے کہ الحمد للہ رب العالمین سے آپ کی مراد سورت ہے اور کسی نے اس پر یہ اعتراض کیا ہے کہ اس سورت کا نام الحمد للہ ہے نہ کہ الحمد للہ رب العالمین اور یہ حدیث (ذیر شرح یعنی حضرت ابو سعیدؓ والی) اس اعتراض کو رد کرتی ہے۔“

پس حضرت انسؓ کے الفاظ سے یہ غلطی ہرگز نہیں کھانی چاہیے کہ ان کا یہ مطلب ہے کہ آنحضرت ﷺ اور آپ کے خلفاء قرأت کے وقت بسم اللہ ترک کر دیتے تھے۔ جس کسی نے اس روایت کے یہ معنی سمجھے ہیں۔ اسے سورہ فاتحہ کے نام الحمد للہ رب العالمین اور آیت الحمد للہ رب العالمین میں اشتباہ پڑ گیا ہے۔

اسی غلط فہمی کی بناء پر صحیح مسلم کی مندرجہ ذیل دو روایتیں بالمعنی روایت کی گئی ہیں۔ یعنی نمندہ راویان کے کسی راوی نے حضرت انسؓ کے الفاظ کانوا یفتتحون القرۃ بالحمد للہ رب العلمین کے معنی یہ سمجھے کہ سورہ فاتحہ کو آیت الحمد للہ رب العالمین سے شروع کرتے تھے تو اس نے ایسا ہی ذکر کیا۔ جس سے یہ لازم آتا کہ بسم اللہ بالہر نہیں پڑھتے تھے۔ خواہ بالکل ترک کر دیتے ہوں اور خواہ سرا پڑھتے ہوں۔ چنانچہ بعض نے پہلا مطلب یعنی ترک سمجھا اور بعض نے دوسرا یعنی سرا پڑھا۔ جیسا کہ انہی روایات سے ظاہر ہو جائے گا۔ وہ روایات یہ ہیں:-

(۱) عن قتادہ یحدث عن انس بن مالک قال صلیت مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وابی بکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ فلم اسمع احد امنہم یقرء بسم اللہ الرحمن الرحیم

حضرت قتادہؓ تابعی روایت کرتے ہیں کہ حضرت انسؓ نے کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ و عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے ساتھ نماز پڑھی۔ پس میں نے کسی کو بھی بسم اللہ پڑھتے نہیں سنا۔“

(۲) عن قتادہ انہ کتب الیہ ینخبرہ عن انس بن مالک انہ حدثہ قال صلیت خلف النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وابی بکر و عمرو و عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہم فکانوا یستفتحون بالحمد للہ رب العلمین لا ینکرون بسم اللہ الرحمن الرحیم فی اول قرأۃ ولا فی اخرها (صحیح مسلم، جلد اول)

حضرت قتادہؓ نے امام اوزاعیؒ کو حضرت انسؓ کی روایت سے لکھا کہ انہوں نے مجھ سے بیان کیا کہ میں نے نبی کریم ﷺ اور حضرت ابو بکر و عمرو و عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے پیچھے نماز پڑھی۔ پس وہ الحمد للہ رب العلمین سے شروع کرتے تھے۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم نہ اول سورت میں اور نہ آخر سورت میں پڑھتے تھے۔

یہ دونوں روایتیں بالمعنی ہیں کیوں کہ صحیح بخاریؒ والی روایت کے الفاظ جو حضرت انسؓ سے مروی ہیں، وہ بھی قتادہ ہی کے واسطے سے ہیں اور قتادہ تابعیؒ حضرت انسؓ کے الفاظ کو اس صورت میں روایت نہیں کر سکتے جیسا کہ آئندہ ظاہر ہو جائے گا۔ (ان شاء اللہ)

ان ہر دو روایات کو خاکسار نے از خود بالمعنی قرار نہیں دیا بلکہ بڑے بڑے نقاد محدثین نے اس کی تصریح کی ہے۔ چنانچہ حافظ عراقیؒ جو حافظ ابن حجرؒ کے استاد ہیں، اپنے الفیہ میں مطل حدیث کی مثال میں جو از قسم ضعیف ہے۔ اسی روایت صحیح مسلم کو یوں بیان کرتے ہیں۔ و علة المنن کنفی البسملة لاذن رلو نفيه فنقله (ص ۳۴)

”بکمی علت متن میں ہوتی ہے۔ جس کی مثال بسم اللہ کی نفی والی روایت ہے کہ کسی راوی نے اس کی نفی سمجھی تو اسے نفی کے الفاظ میں نقل کر دیا۔“

اور علامہ سخاویؒ (حافظ ابن حجرؒ کے شاگرد) اس کی شرح ”فتح المغیث“ میں فرماتے ہیں۔ فنقله مصرحاً بما ظنہ فقال لا ینکرون بسم اللہ الرحمن الرحیم فی اول قرأۃ ولا فی اخرها و فی لفظ فلم یکنوا یفتتحون ببسم اللہ و صار بمقتضی ذلک حدیثاً مرفوعاً والروای لذلک منخطی فی ظنہ (فتح المغیث، ص ۹۵)

”پس اس راوی نے اپنے ظن سے بالتصریح نقل کر دیا کہ بسم اللہ نہ اول سورت میں پڑھتے تھے اور نہ آخر میں اور بعض روایات میں ایسا بھی ہے بسم اللہ سے

شروع نہ کرتے تھے تو اس وجہ سے یہ روایت مرفوع بھی گئی۔ حالانکہ اس کے راوی سے ایسا ظن کرنے میں خطا ہو گئی ہے۔“

اس تفصیل سے صاف معلوم ہو گیا کہ حضرت انسؓ کے الفاظ وہی محفوظ ہیں جو صحیح بخاریؒ میں مروی ہیں اور صحیح مسلم کے الفاظ روایت بالمعنی ہیں۔ جس راوی نے اس کے یہ معنی سمجھے ہیں۔ اس نے غلطی کھائی ہے۔ حضرت انسؓ کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ آنحضرت ﷺ آیت الحمد للہ رب العالمین سے قرات شروع کیا کرتے تھے بلکہ ان کا مقصود صرف یہ بتانا ہے کہ آنحضرت ﷺ پہلے سورۃ الحمد للہ رب العالمین پڑھا کرتے تھے اور پھر کوئی اور سورت۔ جیسا کہ جامع ترمذی سے اس حدیث کی شرح میں امام شافعیؒ کا قول سابقاً نقل ہو چکا ہے اور امام نسائیؒ کی تویب بھی ذکر ہو چکی ہے۔^۱

اس کے لیے ایک اور بھی قرینہ ہے کہ حضرت انسؓ بسم اللہ الرحمن الرحیم کے آیت ابتدائی ہونے سے انکار نہیں کر سکتے۔ کیوں کہ سورۃ کوثر کے نزول کی حدیث جو صحیح مسلم میں مروی ہے۔ وہ بھی حضرت انسؓ کی روایت سے ہے اور اس میں ابتداء میں بسم اللہ الرحمن الرحیم کا پڑھنا صاف مذکور ہے۔ نیز یہ کہ صحیح بخاری کی حدیث جو بحوالہ منتقی پر گزر چکی ہے۔ اس میں مذکور ہے کہ قنادہؓ نے حضرت انسؓ سے آنحضور ﷺ کی قرات کی کیفیت دریافت کی تو آپ نے بسم اللہ الرحمن الرحیم کے الفاظ اللہ اور الرحمن اور الرحیم کے حروف مدہ کھینچ کر پڑھے اور بتایا کہ آپ ﷺ اس طرح پڑھا کرتے تھے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت انسؓ آنحضور ﷺ کو بسم اللہ اوپھی پڑھتے سنا کرتے تھے ورنہ اسے طرز قرات میں پیش نہ کرتے۔ لطف یہ کہ صحیح مسلم کی روایات بھی اور صحیح بخاری کی یہ روایت بھی یعنی طرز قرات والی ہر دو روایات حضرت انسؓ سے قنادہؓ ہی کرتے ہیں۔ فافہم ولا تکن من القاصرین۔

دوسری روایت حضرت عبداللہ بن مغفلؓ کی ہے۔ امام ترمذیؒ فرماتے ہیں۔ عن ابن عبداللہ بن مغفلؓ قال سمعنی ابی وانا فی الصلوۃ اقول بسم اللہ الرحمن الرحیم فقال لی یابنی محدث ایاک والحدث قال ولم ار احدا من اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کان ابغض الیہ الحدث فی الاسلام یعنی منہ وقال وقد صلیت مع النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ومع ابی

بکر و عمر و مع عثمان فلم اسمع احداً منهم يقولها فلا تقلها اذا انت صليت فقل الحمد لله رب العلمين (ج ۱ ص ۳۳)

حضرت عبداللہ بن مغفلؓ کا بیٹا (یزید) کہتا ہے کہ میرے باپ نے مجھے نماز میں بسم اللہ الرحمن الرحیم (جرا) کہتے سنا تو کہا بیٹا (یہ) بدعت، بدعت سے بچتا رہ، نیز یہ کہ میں نے اصحاب رسول اللہ ﷺ میں سے کسی کو بھی اسلام میں بدعت نکالنے سے بڑھ کر کسی شے کو برا جانتے نہیں دیکھا۔ نیز یہ کہا کہ میں نبی پاک ﷺ اور حضرات ابو بکرؓ، عمرؓ اور عثمانؓ کے ساتھ نماز پڑھتا رہا۔ میں نے ان میں سے کسی کو بسم اللہ اونچی پڑھتے نہیں سنا۔ پس اسے اس طرح نہ پڑھا کرو بلکہ جب تو نماز پڑھے تو کہا کر الحمد للہ رب العالمین۔

بے شک امام ترمذیؒ نے اس حدیث کو حسن کہا ہے لیکن محدثین کے نزدیک صرف امام ترمذیؒ کا حسن کہہ دینا کافی نہیں۔ محدث ابن خزیمہؒ، حافظ ابن عبدالبر مغربیؒ، امام بیہقیؒ اور امام خطیب بغدادیؒ اسے ضعیف کہتے ہیں۔ (یعنی علی البخاری، جلد ۳ ص ۲۰) کیوں کہ اس روایت کا مدار یزید بن عبداللہ بن مغفل پر ہے اور وہ محدثین کے نزدیک قابل احتجاج نہیں۔ چنانچہ امام شوکانیؒ نیل الاوطار میں اس حدیث کے ذیل میں فرماتے ہیں۔ یزید بن عبداللہ بن مغفلؓ مجھول لا یعرف (جلد ۲ ص ۹۶) پس ایسے اہم امر میں ایسے اکیلے شخص کی شہادت کافی نہیں۔ امام شوکانیؒ نے اس کے بعد یہ بھی لکھا ہے۔ قال ابن خزیمہؒ ہذا الحدیث غیر صحیح و قال الخطیب وغیرہ ضعیف قال النوویؒ ولا یرد علی ہولاء الحفاظ قول الترمذیؒ انہ حسن انتہی۔ (جلد ۲ ص ۹۷) یعنی محدث ابن خزیمہؒ کہتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح نہیں اور امام خطیب بغدادیؒ وغیرہ نے کہا کہ (یہ) ضعیف ہے اور امام نوویؒ نے کہا کہ ان حفاظ پر امام ترمذیؒ کا یہ قول کہ یہ روایت حسن ہے، وارد نہیں ہو سکتا۔ دیگر یہ کہ اس حدیث کو قابل احتجاج تسلیم کرنے سے ماننا پڑے گا کہ صحابہ کرامؓ کی ایک خاصی تعداد اور آئمہ سنت (تابعین وغیرہم) کی ایک کثیر جماعت جن کی فرست سابقاً درج ہو چکی ہے (معاذ اللہ) بدعت پر عمل پیرا رہی اور ان سب کو تمام عمر میں طریق سنت معلوم نہ ہو گا۔ اس کے بعد ہم دوسری قسم کی روایتیں لکھتے ہیں۔ جن سے بعض کو یہ خیال پیدا ہو

گیا کہ جو بسم اللہ الرحمن الرحیم سورہ نمل، پ ۱۹ کے درمیان میں مکتوب ہے۔ بے شک قرآنی آیت اور سورہ نمل کا جزو ہے لیکن جو بسم اللہ سورتوں کے شروع میں مکتوب ہے، وہ جزو سورت اور قرآنی آیت کی حیثیت نہیں رکھتی۔ اس قسم میں معرکہ کی دو حدیثیں ہیں۔ پہلی حدیث یہ ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:-

پہلی حدیث:- عن عباس الجشمی عن ابی ہریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قال ان سورة من القران ثلاثون اية شفعت لرجل حتی غفر له و هی تبارک الذی بیدہ الملک (ترمذی، جلد ۲، ص ۱۱۳)

قرآن کی ایک سورت تیس آیات کی ہے۔ جس نے ایک شخص کی شفاعت کی حتیٰ کہ وہ بخشا گیا اور وہ تبارک الذی بیدہ الملک ہے۔

صورت استدلال یوں ہے کہ اس حدیث میں اول تو بتایا گیا ہے کہ سورت ملک کی تیس آیات ہیں اور شمار آیات سے معلوم ہو سکتا ہے کہ پوری تیس بسم اللہ چھوڑ کر ہوتی ہیں۔ دوم یہ کہ اس کا شروع تبارک الذی بیدہ الملک بتایا گیا ہے نہ کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم تو اس کا جواب امام شوکانیؒ نے نقل کیا ہے کہ عباس جشمی کو بقول امام بخاریؒ، حضرت ابو ہریرہؓ سے ملاقات ہی نہیں۔ دوم یہ کہ واجیب عن ذالک بان المراد عدد ما هو خاصة السورة لان البسملة كالشئ المشترك فيه (نیل الاوطار جلد ۲، ص ۱۰۰) یعنی ”اس سورت کی وہ تیس آیات مراد ہیں جو خاص اس امر شفاعت میں امتیازی حیثیت رکھتی ہیں اور بسم اللہ تو ایک جزو مشترک ہے۔“ اور آنحضرت ﷺ کی یہ عادت بھی پائی گئی کہ آپ کبھی سورت کا حوالہ دیتے وقت اس کے شروع سے امتیازی آیت پڑھ دیتے تھے جیسا کہ سورت اذالزلزلت الارض زلزالها اور سورت اذا جاء نصر اللہ اور سورت قل هو اللہ احد کے متعلق وارد ہے۔ (ص ۲۱۷-۲۱۸)

دوسری حدیث:- دوسری روایت بھی حضرت ابو ہریرہؓ ہی کی ہے، صحیح مسلم میں ہے آنحضور ﷺ نے فرمایا اللہ جل شانہ نے فرمایا ”میں نے نماز کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان نصف نصف تقسیم کیا ہے۔ پس جب بندہ کہتا ہے الحمد للہ رب العالمین تو اللہ

تبارک و تعالیٰ (جواب میں) فرماتے ہیں۔ میرے بندے نے میری حمد بیان کی اور جب کہتا ہے الرحمن الرحیم تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ میرے بندے نے میری ثناء کی۔ (صحیح مسلم، جلد ۱، ص ۱۷۰) اس حدیث میں بسم اللہ کا ذکر نہیں ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بسم اللہ فاتحہ کا جزو نہیں ہے۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ اس حدیث کے بعض طرق میں بسم اللہ کا بھی ذکر وارد ہے۔ (سنن دار قطنی) اور شاہ عبدالعزیزؒ نے اپنی تفسیر میں دار قطنی والی اسی روایت کا ذکر کیا ہے۔ (تفسیر عزیزی) اس روایت کی صحت میں اگرچہ محدثین کو کلام ہے لیکن اس کلام کا اثر اس وقت ہو سکتا ہے۔ جب مسئلہ بسم اللہ کی صحت و کتابت کا مدار یہی روایت ہو، لیکن جب حفاظت قرآن منصوص ہے اور بسم اللہ قرآن پاک میں برابر مکتوب چلی آئی ہے اور خصوصاً ”صحابہ کرامؓ“ کے زمانے میں اس میں کوئی بھی اختلاف نہیں ہوا تو یہ روایت ثابت شدہ امر کی تائید میں پیش ہو سکتی ہے اور یہ تو کبھی نہیں ہو سکتا کہ صحیح مسلم والی روایت کو اصل قرار دے کر حفاظت قرآن پاک کو مشکوک کر دیں۔ کیوں کہ صحابہ کرامؓ نے بسم اللہ مصحف میں بلا جماع بخط قرآنی لکھی اور انہوں نے خود آنحضور ﷺ کے لکھوائے ہوئے مصحف مکرمہ کی نقل کی تھی۔ جس کی شہادت خود اللہ نے دے دی تھی۔ فی صحف مکرمۃ ○ مرفوعة مطهرة ○ (عس، پ ۳۰)

چنانچہ علامہ عینیؒ حنفی لکھتے ہیں۔ والصحيح منہب اصحابنا انہا من القرآن لان الامة اجمعت علی ان ما كان مکتوباً بین الدفتین بقلم الوحی فهو من القرآن والتسمية كذلك (یعنی علی البخاری، جلد ۲، ص ۳۰)

”صحیح مذہب ہمارے اصحاب کا یہ ہے کہ بسم اللہ قرآن پاک میں سے ہے کیوں کہ تمام امت کا اس بات پر اجماع ہے کہ جو کچھ دفتین (دو مقووں) کے درمیان خط قرآنی سے لکھا ہوا ہے، وہ قرآن پاک ہے اور بسم اللہ بھی اسی طرح (لکھی ہوئی) ہے۔ پس اس روایت کو ایسے طور پر سمجھنا چاہیے جس سے یہ روایت صحابہ کرامؓ کی کتابت و جمع قرآن کے ماتحت رہے اور وہ یہ صورت ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے بعض وقت اس کلمہ کا ذکر کیا اور بعض وقت نہیں کیا کیوں کہ بسم اللہ میں اللہ تعالیٰ کے تین نام وارد ہیں۔ اللہ، الرحمن اور الرحیم۔ یہ تینوں اس کے بعد آیت الحمد للہ میں اور الرحمن الرحیم میں آ جاتے ہیں۔ پس اس کا الگ جواب ذکر کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ (واللہ

(علم)

دیگر یہ کہ اگر اس حدیث سے ترک بسم اللہ کا نتیجہ نکل سکے تو خود حضرت ابوہریرہؓ بسم اللہ اونچی کیوں پڑھیں، چنانچہ ان کا قول امام نسائیؒ کی روایت سے پچھلے صفحات میں گزر چکا ہے۔

الجزء الثانی

من تفسیر الفاتحة

الكشف والتبيين

عن لطائف

الحمد لله رب العالمين

الحمد

ہر طرح کی تعریف

ارتباط:- جب بسم اللہ کی ترکیب نحوی کی نسبت معلوم ہو چکا کہ اس کی الابداء مخذوف کے متعلق ہے تو اس کے بعد الحمد للہ کہنے کے یہ معنی ہیں کہ اس کتاب کے مضامین میں سب سے پہلے حمد الہی کا رتبہ ہے کیوں کہ اس کتاب کا اہم مقصد معرفت الہی ہے اور اس راستے میں سب سے پہلی منزل حمد الہی کی ہے۔ (میر)

حل لغات:- حمد اس تعریف کو کہتے ہیں جو محمود کی تعظیم کے ارادے سے اس کے کسی ایسے اچھے وصف پر کی جائے جو اس کے اختیار میں ہو۔

تعظیم کے ارادے کی قید اس لیے ہے کہ تعریف کے کلمات کبھی بغیر ارادہ تعظیم کے تعبیراً (عار دلانے کے لیے) بھی کہہ دیئے جاتے ہیں۔ مثلاً "آیت ذق انک انت العزیز الکریم" (دخان، پ ۲۵) میں دوزخی کو عزیز و کریم اس کی تعظیم کے ارادے سے نہیں کہا جائے گا بلکہ ابو جہل اور اس کی مثل دیگر منکبر منکرین کو عار دلانے کے لیے کہا جائے گا کہ وہ اپنے خیال میں ایسے بنتے تھے اور اختیاری کی قید اس لیے ہے کہ تعریف و ثناء کبھی ایسے امر پر بھی کی جاتی ہے جو ممدوح کا اختیاری نہیں ہوتا بلکہ پیدائشی اور خلقی ہوتا ہے۔ مثلاً "حسن صورت" ایسے امر پر تعریف کرنے کو مدح کہتے ہیں۔ حمد نہیں کہتے اور لفظ مدح اختیاری و غیر اختیاری ہر دو پر بولا جاتا ہے۔ پس مدح اپنے متعلق کے لحاظ سے حمد کی نسبت عام ہے۔ بعض ائمہ نے کہا ہے کہ مدح لفظ حمد ہی کا مقلوب ہے یعنی حمد کے حروف کی ترتیب بدلی ہوئی ہے اور یہ دونوں خوان و مترادف ہیں اور ان دونوں کی ضد ذم ہے۔ (کشاف مع الزیادة)

اور حمد کے لیے یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ کسی نعمت کے مقابلے میں کہی جائے۔ بلکہ وہ عام ہے یعنی محمود اپنی ذات کے لحاظ سے اس قابل ہوتا ہے کہ اس کی حمد کی جائے۔ چاہے اس کی نعمت کا اثر حامد پر پڑے یا نہ پڑے، خاص کر نعمت کے مقابلے میں جو

ثناء اور تعریف کی جائے، اسے شکر کہتے ہیں۔ پس حمد اپنے متعلق کے لحاظ سے شکر سے عام ہے۔ چنانچہ فرمایا:-

واشکر وانعمة الله (پ ۱۳، محل) ”اللہ تعالیٰ کی ہر نعمت کا شکر ادا کرو۔“
 نیز حضرت ابراہیمؑ کی نسبت فرمایا۔ شاکر^۱ لانعمہ (پ ۱۳، محل)
 ”وہ اللہ کی نعمتوں کا شکر گزار تھا۔“

شکر تین چیزوں سے ادا ہوتا ہے۔ دل سے یا زبان سے یا اعضاء سے۔ دل کا شکر یہ ہے کہ منعم کی نعمت و احسان کا اعتراف ہو اور دل میں اس کی قدر و منزلت اور عزت و عظمت جاگزیں ہو۔ زبان کا شکر یہ ہے کہ منعم کی تعریف و توصیف اور حمد و ثناء کی جائے اور زبان سے اس کا اظہار کیا جائے اور اس کے نام کا ورد کیا جائے۔ چنانچہ فرمایا۔ واما بنعمة ربك فحدث ”اے پیغمبر اپنے رب کی نعمتوں کا ذکر کیا کر۔“
 اعضاء کا شکر منعم کے احکام کا بجالانا اور اعضاء کو اس کی خوشی کے کاموں میں اور اس کے احکام کی تعمیل میں لگانا ہے۔ چنانچہ فرمایا:-

بل الله فاعبد وكن من الشاكرين (زمر پ ۲۴) ”(اے پیغمبر!) بلکہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کی عبادت کر اور (اس کے) شکر گزاروں میں شامل ہو۔“

شکر بلحاظ مورد کے حمد کی نسبت عام^۲ ہے کیوں کہ حمد صرف زبان سے ہوتی ہے اور یہ شکر کی ایک شاخ ہے۔ اسی لیے آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔

الحمد لله كلمة الشكر (مشکوۃ) ”الحمد للہ شکر کا کلمہ ہے۔“

بلکہ فرمایا۔ الحمد لله راس الشكر وما شكر الله عبد لم يحمده (مشکوۃ)

۱ علامہ تفتازانی ”مختصر المعانی“ میں فرماتے ہیں:-

الحمد هو الثناء باللسان على قصد التعظيم سواء تعلق بالنعمة او بغيرها والشكر فعل ينبئ عن تعظيم المنعم لكونه منعما باللسان او بالجنان او بالاركان فمورد الحمد لا يكون الا اللسان، ومتعلقه يكون النعمة وغيرها ومتعلق الشكر لا يكون الا النعمة ومورده يكون اللسان وغيره فالحمد اعم من الشكر باعتبار المتعلق وانحصر باعتبار المورد والشكر بالعكس۔

”الحمد لله شکر کا سرچشمہ ہے اور جس شخص نے اللہ تعالیٰ کی حمد نہیں کی اس نے اس کا شکر بھی نہیں کیا۔“

اسی معنی میں حضرت غلیل اللہؑ بڑھاپے میں اولاد کی نعمت ملنے پر کہتے ہیں۔
الحمد لله الذي وهب لي على الكبر اسمعيل واسحق (ابراہیم پ ۱۳)
”سب تعریف کا مالک اللہ ہے اور وہ ہر طرح کے شکر کا مستحق ہے۔ جس نے مجھے میرے بڑھاپے میں اسمعیل اور اسحاق (دو فرزند) عطا کیے۔“

فائدہ:- حمد کی ضد ذم اور مذمت ہے اور مدح کی جہو۔ چنانچہ حضرت حسانؑ کہتے ہیں:-

فنن منجو رسول اللہ منکم
نہمدہ و ینصرہ سواہ ۲۳

یعنی تم (کفار) میں سے کوئی رسول اللہ ﷺ کی جہو کرے۔ (تو کوئی پرواہ نہیں کیوں کہ) اس کے سوا دیگر آپ کے مداح اور مددگار (موجود) ہیں۔
اور شکر کی ضد کفران ہے۔ چنانچہ فرمایا۔ واشکروا لی ولا تکفروں (پ ۲ البقرة) ”میرا شکر کرو اور کفر نہ کرو۔“

نیز فرمایا۔ یعرفون نعمۃ اللہ ثم ینکرونها و اکثرہم الکفروں (نحل ۱۳)
”یعنی اللہ کی نعمت کو دل سے پہچانتے ہیں پھر (زبان سے) انکار کر جاتے ہیں اور اکثر ان کے کافر (احسان فراموش) ہیں۔“
اور الحمد للہ پر جو الف لام ہے وہ تعریف جنس کے لیے ہے ۲۴ یعنی ہر قسم کا مفہوم

سید شریف حاشیہ کشاف میں اس کی وجہ میں فرماتے ہیں:-

کما ان الراس اظهر الاعضاء واعلاها وهو اصل لها وعملة لبقائها و كذا لك الحمد
اظهر انواع الشكر واشهرها واشملها على حقيقة الشكر والابانة عن النعمة حتى لو
فقد لكان ما عنده بمنزلة العدم (جلد ۱ ص ۳۸)

۲۳ دیوان حسانؑ، مطبوعہ بمبئی ص ۸۔

۲۴ علامہ زمخشری نے اس مقام پر استغراق کے مقابلے میں تعریف جنس کو ہی ترجیح دی ہے اور سید شریف نے حاشیہ کشاف میں اور علامہ تفتازانی نے مطول میں اسی کی تائید کی ہے۔

کلی جسے حمد کہہ سکیں اور ہر نوع جو اس کے ماتحت ہے وہ۔

للہ

صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے

یہ خبر ہے الحمد مبتدا کی اور اس میں لام جارہ اختصاص کے لیے ہے یا استحقاق کے لیے تو الحمد للہ کے معنی ہوئے۔ ”ہر قسم کی حمد اللہ تعالیٰ ہی کے لیے خاص ہے“ یا ہر قسم کی حمد کا مستحق صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ چنانچہ سورہ جاہیہ میں اللہ کو مقدم کر کے حمد کو اللہ ہی کے لیے محصور کر دیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:-

فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَرَبِّ الْاَرْضِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (پ ۲۵)

”اللہ ہی کے لیے ہر قسم کی حمد ہے جو آسمانوں کا بھی رب ہے اور زمین کا بھی رب ہے۔ (غرض) تمام جہان کا رب ہے۔“

نکتہ:- جس طرح سورہ فاتحہ کی آیت میں الحمد للہ کے بعد رب العالمین کہہ کر تمام جہان اور جہان والوں کی مالکیت و پرورش کا نقشہ سامنے رکھ کر ہر قسم کی حمد کا مستحق خاص اللہ تعالیٰ ہی کو بتایا ہے۔ اسی طرح سورہ جاہیہ کی مذکورہ بالا آیت میں اللہ خبر کو مقدم کر کے حمد کے اختصاص کی وضاحت میں زمین و آسمان اور تمام عالمین کی ربوبیت (مالکیت و پرورش) کو ذکر کیا ہے۔ (سبحان اللہ)

نکتہ:- سورہ فاتحہ میں الحمد کو مقدم کیا اس لیے کہ یہاں مقصود اثبات حمد ہے نیز اس لیے کہ اللہ موصوف کے بعد اس کی صفات الرحمن الرحیم مالک یوم الدین میں تاسق و اتصال قائم رہے۔ تاکہ کلام کی خوبی لفظاً و معنی بہر دو صورت بڑھ جائے اور سورہ جاہیہ میں اللہ خبر کو مقدم اور الحمد مبتدا کو موخر کیا اس لیے کہ وہاں پر مقصود شان الوہیت کا اظہار ہے اور تخصیص کا فائدہ مزید ہے۔ پس ہر مقام پر مقصود پر نظر رکھ کر تقدیم و تاخیر کی گئی ہے اور یہی بلاغت کی شان ہے کہ الفاظ کی ترتیب میں مقصود کا لحاظ

رہے۔

نکتہ:- اور حمد کے اختصاص کے لیے اسم اللہ ذکر کیا کہ دعویٰ مع بینہ (دلیل) ثابت ہو کیوں کہ اسم اللہ علم ہے، ذات برحق کا جو مستمع ہے جمیع صفات کمال کی، جیسا کہ بسم اللہ کی تفسیر میں مطول سے اور کشاف سے نقل ہو چکا ہے۔ پس اس کے لیے کسی دیگر دلیل کی ضرورت نہ رہی۔ خود کلمہ الحمد للہ ہی اس دعویٰ کی دلیل ہے کہ ہر قسم کی حمد صرف اللہ رب العزت ہی کو سزاوار ہے کیوں کہ وہ جمیع صفات کمال کا مالک ہے پس کلمہ الحمد للہ کے مخرج معنی یہ ہوئے کہ ہر قسم کی حمد کا صاحب اور مستحق صرف اللہ تعالیٰ ہے اور وہ اسی کی ذات پاک سے مختص ہے۔

نکتہ:- اسی واسطے الحمد للہ بصورت جملہ اسمیہ ذکر کیا اور بصورت جملہ فعلیہ یعنی بصیغہ امر احمد واللہ یا بصیغہ متکلم احمد اللہ ذکر نہیں کیا۔ کیوں کہ جملہ اسمیہ میں ثبوت و دوام ہوتا ہے اور جملہ فعلیہ میں حدوث و تجدد اور ذات حق دانما "مستحق و لائق حمد ہے نہ کہ کسی خاص وقت و حالت پر۔

فائدہ:- قرآن شریف کی پانچ سورتیں بسم اللہ کے بعد الحمد للہ سے شروع ہوتی ہیں۔ سورۃ فاتحہ پ، انعام، پ، کھف پ، سبا ۲۲ اور فاطر پ ۲۲۔

اور کلمہ الحمد للہ (بشمول ان آیتوں کے جن میں رب العالمین بھی ساتھ ہے۔) تمام قرآن شریف میں پائیس دفعہ آیا ہے اور فللہ الحمد صرف ایک بار اور ضمیر مجبور مقدم کے ساتھ یعنی لہ الحمد چار بار اور ان صورتوں کے علاوہ دیگر صیغوں میں حمد الہی کا ذکر بیش از بیش ہے۔ جن میں سے کوئی تیرہ مقامات پر تسبیح اور حمد کا اٹھا ذکر ہے اور اس

۲۵ تسبیح و تقدیس سے یہ مراد ہے کہ ذات برحق جملہ قسم کے عیوب و نقائص سے پاک ہے بلکہ بعض ان باتوں سے بھی منزہ ہے جو مخلوق کے حق میں اچھی گنی جاتی ہیں۔ لیکن اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے لیے وہ بھی عیب و نقص ہے۔ مثلاً "اولاد کا ہونا" اپنی اولاد نہ ہو تو کسی کو شبہی بنا لینا، امور میں اعوان و انصار کا ہونا۔ ان سب سے قرآن شریف میں ذات حق کو پاک کیا گیا ہے مثلاً "اولاد سے منزہ ہونے کی بابت فرمایا سبحانہ ان یکون لہ ولد (نساء، پ ۵) وہ اس

جگہ سورہ فاتحہ میں صرف حمد پر اس لیے کہ کفایت کی کمال حمد یہی ہے کہ محمود میں کسی طرح کا نقص و عیب نہ ہو۔ پس تسبیح حمد کے ضمن میں داخل ہے فافهم (عزیزی)
اب ہم اصولی طور پر وہ مواقع ذکر کرتے ہیں۔ جن میں اللہ تعالیٰ کی حمد وارد ہے۔ اس سے ہمارا مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ یہ امور اللہ تعالیٰ کے لائق حمد ہونے کے وجوہات میں سے ہیں۔

اول: ہر شے کا خالق و مالک اور پروردگار اور ہر شے کا مدبر و ناظم اور ہر طرح کے حل و عقد اور قبض و بسط کا مالک و مختار ہونے کی وجہ سے لائق حمد ہونا۔ مثلاً "سورہ جاثیہ میں فرمایا:-

فلله الحمد رب السموات و رب الارض رب العالمین و له الکبریاء فی السموات و الارض و هو العزیز الحکیم (پ ۲۵ جاثیہ)

یعنی "ہر طرح کی حمد و ستائش کا مالک صرف اللہ ہی ہے۔ جو آسمانوں کا بھی رب ہے اور زمین کا بھی رب ہے۔ (غرض) تمام جہانوں کا رب ہے اور آسمانوں میں اور زمین

بات سے پاک ہے کہ کوئی اس کا فرزند ہو۔ اور متبنی بنانے سے پاک ہونے کی نسبت فرمایا:-
قالوا اتخذنا للہ ولداً سبحنہ ہوالغنی (یونس پ ۱۱) یعنی کہتے ہیں کہ خدا نے کسی کو متبنی بنایا، وہ اس سے پاک ہے، وہ تو بے نیاز ہے۔ اعوان و انصار سے پاک و بے نیاز ہونے کی بابت فرمایا و مالہ من ظہیر (سبا پ ۲۲) یعنی ان میں سے کوئی بھی اس کا مددگار نہیں ہے۔
تسبیح کی پوری تشریح اس کے اپنے موقع پر آیت و نحن نسبح بحمدک و نفس لک (پا) میں کی جائے گی۔ یہاں صرف تحمید اور تسبیح میں فرق اور ان کا تعلق بتانا مقصود ہے۔
سو سمجھ تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو سب کمالات و خوبیوں سے موصوف جائیں اور بیان کریں اور تسبیح یہ ہے کہ اسے جملہ عیوب و نقائص سے مبرا و منزہ اعتقاد کریں اور اس کی ذات پاک کے لیے ایسے الفاظ و معانی سے پرہیز کریں جو اس کی شان کے لائق نہ ہوں۔ یہ اتم درجہ کی تعریف و توصیف ہے۔ قرآن شریف میں خالص تسبیح، خالص تحمید اور تسبیح و تحمید ہر دو کا یکجا ذکر بکثرت ہے۔

میں بڑائی کا مالک بھی وہی ہے اور وہ بڑا زبردست اور بڑا حکمت والا ہے۔

نیز سورۃ سبا کے شروع میں فرمایا۔ الحمد لله الذی له ما فی السموات وما

فی الارض وله الحمد فی الآخرة وهو الحکیم الخبیر ○ (پ ۲۲)

یعنی ”سب تعزیر کا مالک خدا ہے“ جو مالک ہے ہر شے کا جو آسمانوں میں ہے اور

زمین ہے اور آخرت میں بھی حمد کا مالک وہی ہے اور وہ بڑا با حکمت اور خبردار ہے۔“

نیز سورۃ فاطر کے شروع میں فرمایا۔ الحمد لله فاطر السموات والارض

جاعل الملكة رسلاً اولی اجنحة مثنی وثلث وربع یزید فی الخلق ما

یشاء ان الله علی کل شی قدید ○ ما یفتح الله للناس من رحمة فلا

ممسک لها“ وما یمسک فلا یرسل له من بعده وهو العزیز الحکیم ○ (پ

۲۲)

”سب تعزیر اللہ کے لیے ہے جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا۔ فرشتوں

کو پیغام رساں بنانے والا جو دو دو اور تین تین اور چار چار پروں والے ہیں۔ پیدائش

میں جو کچھ چاہے زیادہ کرے۔ بے شک اللہ ہر ایک امر پر قادر ہے۔ (اگر) اللہ آدمیوں

پر کوئی رحمت بھیجے تو کوئی اس (رحمت) کو روکنے والا نہیں اور جو وہ بند کرے تو اس کے

بعد کوئی اس (رحمت) کو بھیجنے والا نہیں اور وہ سب کچھ کر سکنے والا (اور) بڑا با حکمت

ہے۔“

اور سورۃ انعام میں فرمایا۔ الحمد لله الذی خلق السموات والارض و

جعل الظلمت والنور ثم الذین کفروا برہم یعدلون (انعام پ ۷)

”سب طرح کی حمد کا مالک صرف اللہ تعالیٰ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو

پیدا کیا اور اندھیرے بنائے اور روشنی (بھی) اس پر بھی کافر لوگ اپنے رب سے شریک

مقرر کرتے ہیں۔ یا (یوں کہ) اس پر بھی وہ لوگ جو اپنے رب کے کافر (احسان فراموش)

ہیں۔ (اس سے) روگردانی کرتے ہیں۔“

دوم: دنیا اور آخرت ہر دو جہان میں لائق حمد وہی ہے۔ مثلاً ”سورۃ قصص میں فرمایا۔ و

هو الله لا اله الا هو“ له الحمد فی الاولی و الآخرة و له الحکم و الیہ

ترجعون (پ ۲۰)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

اور وہ اللہ ہے اس کے سوائے تو کوئی (دوسرا معبود ہی) نہیں ہے۔ دنیا اور آخرت میں وہی لائق حمد ہے اور حکم (بھی) اسی کا ہے اور تم سب اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

سوم: نقائص سے بری ہونے پر لائق حمد ہے۔ وقل الحمد لله الذی لم يتخذ ولداً ولم یکن له شریک فی الملک ولم یکن له ولی من الذل وکبره تکبیراً (بنی اسرائیل، پ ۱۵)

”اور (اے پیغمبر!) تو کہہ سب تعریف اللہ تعالیٰ کو سزاوار ہے جس نے نہ تو کوئی متبنی بنایا اور نہ بادشاہی میں اس کا کوئی شریک ہے اور نہ کمزوری کی وجہ سے کوئی اس کا مددگار ہے اور اس کی بہت بہت بڑائی بیان کیا کر۔“

چہارم: قیامت کے روز جب اس کی عظمت و جلالت کا ظہور کامل طور پر ہوگا تو ملائکہ مقررین اس کی تسبیح و تحمید کے گیت گائیں گے۔ وترى الملائكة حافين من حول العرش يسبحون بحمد ربهم وقضى بينهم بالحق وقيل الحمد لله رب العالمين (زمر پ ۲۳)

”(اے پیغمبر!) تو دیکھے گا کہ فرشتے عرش کے گرد گھیرا ڈال کر اپنے رب کی تسبیح و تحمید کریں گے اور ان میں حق کے ساتھ فیصلہ کیا جائے گا اور کہا جائے گا کہ سب تعریف کا مالک اللہ رب العالمین ہے۔“

فرشتے عام طور پر بھی اللہ کی تسبیح و تحمید کرتے رہتے ہیں۔ جیسا کہ حدیث میں موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کے لیے کلمات سبحان اللہ و بحمدہ کو چن لیا ہے۔ (رواہ مسلم، مشکوٰۃ، ص ۱۹۲)

فرشتوں کی دائمی تسبیح و تحمید کی بابت ان کی زبانی ذکر کیا۔

ونحن نسبح بحمدک ونقدس لک (بقرہ، پ ۱) ”(فرشتوں نے عرض کیا) ہم

۱۲۴ حدیث میں اس آیت کا نام آیۃ العز آیا ہے اور بعض آثار میں وارد ہے کہ جس گھر میں یہ آیت رات کے وقت پڑھی جائے۔ اس میں چوری یا دیگر کوئی آفت نہیں پڑتی۔

تیری حمد کے ساتھ تیری ذات کی تسبیح و تقدیس پکارتے رہتے ہیں۔“
 اس قسم کی آیات بہت ہیں لیکن ہم بنظر اختصار انہی پر اکتفا کرتے ہیں۔ یہ وہ مقامات ہیں جن میں حمد الہی کا ذکر اس بناء پر ہے کہ ذات خداوندی ذاتی طور پر جمیع صفات کمال و نعوت جلال و جمال ہے۔
 چونکہ حمد کا تعلق نعمت سے بھی ہے۔ اس لیے اب وہ مقامات ذکر کئے جاتے ہیں۔ جن میں عنایات و انعامات کی بناء پر حمد الہی کا ذکر ہے۔

اول:- حضرت ابراہیمؑ کو بڑھاپے میں صالح اولاد بخشی تو انہوں نے کہا:-
 الحمد لله الذی وهب لی علی الکبر اسمعیل واسحق ان ربی لسمیع الدعاء (ابراہیم پ ۱۳) ”ہر طرح کی تعریف کے لائق اللہ تعالیٰ ہے۔ جس نے مجھے بڑھاپے میں اسمعیل اور اسحاق (دو فرزند) عطا کئے۔ بے شک میرا رب دعا کا سننے والا ہے۔“

دوم:- حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ کو علم و حکم عطا کیا تو اس پر انہوں نے کہا:-
 لقد اتینا داؤد و سلیمان علماً و قالوا الحمد لله الذی فضلنا علی کثیر من عباده المومنین (نمل پ ۱۹)
 ”اور البتہ ہم نے دیا تھا داؤد اور سلیمان کو علم وہ دونوں بولے سب تعریف اللہ کو سزاوار ہے۔ جس نے ہم کو اپنے بہت سے مومن بندوں پر بزرگی بخشی۔“

سوم:- مصیبت سے نجات پانے اور طوفان سے محفوظ رہنے پر حضرت نوحؑ کو حکم دیا کہ جب تم کشتی پر درست ہو کر بیٹھ جاؤ تو یوں کہنا۔ الحمد لله الذی نحنا من القوم الظالمین (مومنون پ ۱۸)
 ”ہر طرح کی حمد اللہ ہی کو سزاوار ہے۔ جس نے ہمیں ان ظالم لوگوں (کی آفت) سے نجات دی۔“

چہارم:- جنتیوں کے بارے میں فرمایا۔ دعواہم فیہا سبحنک اللہم و نحیتہم فیہا سلام و آخر دعواہم ان الحمد لله رب العلمین (یونس پ ۱۱)
 ”جنت میں ان کی پکار ہوگی۔ سبحنک اللہم یعنی اے اللہ! تو پاک ذات ہے

اور اس میں ان کا تحفہ ملاقات ہوگا۔ ”سلام“ اور ان کی آخری بات یہ ہوگی کہ وہ کہیں گے الحمد للہ رب العالمین یعنی ہر طرح کی تعریف اللہ تعالیٰ ہی کو سزاوار ہے جو جہانوں کا پروردگار ہے۔

پہلے: قرآن شریف کی نعمت جو سب نعمتوں سے بالا نعمت کے متعلق فرمایا:۔

الحمد لله الذي انزل على عبده الكتب ولم يجعل له عوجا (کف، پ ۱۵) ”سب طرح کی تعریف کے لائق اللہ ہی ہے، جس نے اپنے (کامل) بندے (محمد ﷺ) پر (یہ) کتاب نازل کی اور اس میں کسی طرح کی کجی نہیں رکھی۔“

ششم:۔ حجت الیہ کے مقابلے میں منکرین کے قائل معقول ہو جانے پر بھی حمد الہی کا حکم کیا۔ ولئن سالتهم من نزل من السماء ماء فاحيا به الارض من بعد موتها ليقولن الله قل الحمد لله بل اكثرهم لا يعقلون (عنکبوت پ ۲۱)

”اے پیغمبر!“ اگر تو ان سے پوچھے کہ آسمان کی طرف سے کون پانی اتارتا ہے۔ پھر زمین کو اس کے مرنے کے بعد زندہ کر دیتا ہے تو یہ لوگ ضرور کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ ہی (ایسا کرتا ہے۔) تو کہہ الحمد للہ یعنی اللہ تعالیٰ ہی ہر طرح کی تعریف کا سزاوار ہے بلکہ اکثر ان میں سے عقل نہیں کرتے۔“

☆ ومن سالتهم من خلق السموات والارض ليقولن الله قل الحمد لله بل اكثرهم لا يعلمون (لقمان پ ۲۱)

”اے پیغمبر!“ اگر تو ان سے پوچھے کہ آسمانوں اور زمینوں کو کس نے پیدا کیا تو ضرور کہیں گے کہ اللہ نے تو کہہ ہر طرح کی حمد اللہ ہی کو سزاوار ہے بلکہ اکثر ان میں سے علم نہیں رکھتے۔“

ہفتم:۔ منکروں کی ہلاکت سے جہان کو پاک کرنے پر حمد الہی کا ذکر۔

فقطع دابر القوم الذين ظلموا والحمد لله رب العلمين (انعام پ ۷) یعنی ”ظالم لوگوں کی جڑ کٹ گئی اور ہر طرح کی تعریف کے لائق اللہ ہی ہے جو سارے جہان کا مالک و پروردگار ہے۔“

یہ سب مواقع حمد انعامات کے متعلق ہیں اور پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ جو کلمات حمد

انعام کے مقابلے میں کہے جائیں، وہ کلمات شکر کہلاتے ہیں۔

فائدہ:- بیان بالا سے یہ تو ظاہر ہو گیا کہ ذات حق ہر جہت سے لائق حمد ہے۔ اپنی ذات کے لحاظ سے بھی اور انعامات کے رو سے بھی۔ اس کے علاوہ اسی سے توحید الوہیت، توحید عبادت اور توحید ربوبیت بھی ثابت ہو سکتی ہے اور اسی سے ہر طرح کے شرک و کفر کی تردید بھی ہو سکتی ہے کیوں کہ جب ذاتی طور پر بھی سب طرح کے کمال کا مالک وہی ہے اور انعامات کا فیض بھی اسی کی طرف سے ہے تو کسی دوسرے کی کسی طرح بھی شراکت نہیں ہو سکتی۔ نہ ذات میں، نہ صفات میں اور نہ عنایات میں۔ پس وہی مستحق حمد ہے اور وہی مستحق عبادت ہے اور وہی مالک و پروردگار ہے اور اس کا کفر و کفران سراسر نازیبا ہے۔

کہ ہے ذات واحد عبادت کے لائق
زباں اور دل کی شہادت کے لائق

اسی کے ہیں فرماں اطاعت کے لائق
اسی کی ہے سرکار خدمت کے لائق
لگاؤ تو لو اس سے اپنی لگاؤ
جھکاؤ تو سر اس کے آگے جھکاؤ

اولاد کا بخشا، علم و حکم کا عطا کرنا، مصائب کا ٹالنا، آفتوں سے بچانا، دشمنوں سے محفوظ رکھنا، خدمات کو شرف قبولیت بخش کر جنت میں داخل کرنا اور جہلم قسم کے غم و فکر کو دور کرنا اور کمال رحمت سے چشمہ ہدایت (قرآن پاک) کا نازل کرنا اور اسے قبول کرنے کی توفیق بخشا اور مخالفین کو حجت میں طزم کر دینا اور ظالموں کو ہلاک کر کے دنیا جہان کو ان کی نجاست سے پاک کر دینا، یہ سب کام اسی ذات برحق کے متعلق ہیں اور انہی کے متعلق اکثر لوگ شرک کرتے ہیں تو اب الحمد للہ کی حقیقت سمجھ لینے اور اس کے محل و مورد کو پہچان لینے کے بعد شرک و کفر کے وہم کی گنجائش نہیں رہ سکتی۔

تفصیل بالا سے واضح ہو گیا کہ کلمہ الحمد للہ بہت متبرک اور نہایت زوردار ہے۔ اسی لیے حدیث میں وارد ہے۔ افضل الذکر لا الہ الا اللہ و افضل الدعاء الحمد للہ

(مکھوۃ، ص ۱۹۳)

”سب سے افضل ذکر لا الہ الا اللہ ہے (اس میں ذات حق کو الوہیت میں متفرد ذکر کیا گیا ہے۔) اور سب سے افضل دعا الحمد للہ ہے۔ (اس میں ہر طرح کی حمد ذات خداوندی سے مخصوص کیا گیا ہے۔ اس کی ذات کے لحاظ سے بھی اور اس کے انعامات کی رو سے بھی۔)

فائدہ:- الف لام جنسی اور خود لفظ حمد (بجائے لفظ مدح و شکر کے) اور لام جارہ اختصاصی اور اسم جلالت (اللہ) اور جملہ اسمیہ ہر ایک سے الگ الگ طور پر بھی اور مجموعہ بھی اللہ تعالیٰ کی عظمت و شان ظاہر ہوتی ہے۔ اسی معنی میں کہا گیا ہے۔

حمد رابا تو نسبتے ست درست
بر در ہر کو رفت بر در تست

فضائل کلمہ الحمد للہ از روئے حدیث نبویؐ

قرآن مجید کے ساتھ اب اس ذات اقدس کے ارشادات و طریق عمل کو جاننے جس پر قرآن مجید نازل ہوا کہ آپؐ نے طہ الہی کے متعلق کیا ارشاد فرمایا اور آپؐ کس کس موقع پر حمد الہی کرتے تھے اور آپؐ کے اسماء محمدؐ اور احمدؐ کو ورد الحمد للہ سے کیا نسبت و تعلق ہے۔ حضرت محمد مجتبیٰؐ احمد مصطفیٰؐ نے الحمد للہ کو کلمہ شکر بلکہ راس الفکر یعنی شکر کا سر فرمایا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حمد کا ایک رخ نعمت کی طرف بھی ہے۔ جیسا کہ اوپر گزر چکا اور چونکہ ہر نعمت پر شمع کا شکر واجب ہے اس لیے نعمت پر الحمد للہ کہنا شکر ادا کرنا ہے۔ چنانچہ فرمایا:-

ما انعم اللہ علی عبد من نعمۃ فقال الحمد للہ الا وقد ادى شکرہا (الحدیث ص ۱۶۵) ”اللہ تعالیٰ کسی بندے کو کوئی بھی نعمت دے پھر وہ بندہ کہے الحمد للہ تو بے شک اس نے اس نعمت کا شکر ادا کر دیا۔“

یہی وجہ ہے کہ آنحضورؐ جمعہ اور عیدین کے خطبے الحمد للہ سے شروع کرتے تھے اور دیگر حالات میں بھی کثرت سے حمد الہی پکارتے تھے اور کیوں نہ پکارتے، جب اللہ

تعالیٰ نے آپؐ کا نام ہی احمدؑ (بہت حمد کرنے والا) اور آپؐ کی امت کا نام حمادون (بہت حمد کرنے والے) رکھ دیا تھا۔ چنانچہ مسند داری میں حضرت کعب احبارؓ سے مروی ہے۔
 امتہ الحمادون یحمدون اللہ فی السراء و الضراء و یحمدون اللہ فی کل منزلة و یکبرون اللہ علی کل شرف (داری ص ۴، ۵)

یعنی ”کتاب سابقہ میں آنحضور ﷺ کی امت کو حمادون کے نام سے ذکر کیا گیا ہے جو ہر خوشی اور تکلیف کے موقع پر اللہ تعالیٰ کی حمد پکاریں گے اور ہر منزل پر بھی اللہ تعالیٰ کی حمد پکاریں گے اور ہر بلندی پر اللہ تعالیٰ کی تکبیر پکاریں گے۔“

حضرت کعبؓ کی اس روایت کی تصدیق واقعات سے بھی ظاہر ہے کہ روزمرہ پنج وقتی نماز میں ہر رکعت میں یہی سورۃ فاتحہ پڑھی جاتی ہے۔ آسمان کے سائے تلے اور زمین کی پشت پر ہر روز کروڑہا مسلمان نماز گزارتے ہیں۔ اس حالت میں کہ ان کی زبانیں حمد و تسبیح الہی سے تر، ان کی کمریں اور گردنیں اس کی عظمت کے سامنے خمیدہ اور ان کی پیشانیاں اس کے جلال کے سامنے خاک پر پڑی رہتی ہیں۔ کیا یہ نقشہ عملی صورت میں سوائے امت محمدیہؑ (علی صاحبہا الصلوٰۃ و التیمات) کے کسی اور امت میں دیکھا جاسکتا ہے۔

بس جنگ نہ کر ناصح ناداں مجھے اتنا
 یا چل کے دکھا دے وہن ایسا کمر ایسی

۲۷ خاکسار کہتا ہے کہ یہ امر صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ قیامت کو جنت کا دروازہ سب سے پہلے آنحضرت ﷺ کے لیے کھولا جائے گا۔ اس سے سمجھا جاسکتا ہے کہ سب سے پہلے جو لوگ داخل جنت ہوں گے، وہ آنحضرت ﷺ کی امت کے ہوں گے اور حدیث ابن عباسؓ میں جو یہ وارد ہے۔ اول من یدعی الی الجنة یوم القیمة الذین یحمدون اللہ فی السراء و الضراء (مشکوٰۃ، ص ۱۹۳)

یعنی قیامت کے دن سب سے پہلے جو لوگ جنت کی طرف بلائے جائیں گے، وہ ہوں گے جو خوشی میں اور تکلیف میں اللہ کی حمد پکارتے ہیں۔ عجب نہیں کہ اس سے مراد آنحضرت ﷺ کی امت ہو کہ آپؐ نے اس میں نام کی بجائے ان کا ایسا وصف ذکر کر دیا جو پہلی کتابوں میں بھی مذکور ہے۔ (والحمد للہ)

اس کے علاوہ نماز سے باہر جس کثرت سے اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تحمید، امت محمدیہؐ ملتی ہے۔ تمام بساط دنیا پر دیگر امتوں کے لوگ اس کے عشرِ عشر کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔ جو لوگ شب و روز امور دنیا کی ادھیڑ بن میں مصروف اور ہر وقت کمانے میں مشغول ہیں اللہ کی پرستش میں لگے رہتے ہوں۔ وہ اکیلے اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تحمید کا موقع کیسے پا سکتے ہیں۔ دیگر یہ کہ اس کی تائید میں بعض کتب سابقہ کے حوالے اب بھی ملتے ہیں۔ چنانچہ یسعیاہ نبی کی کتاب کے باب ۴۲ میں مرقوم ہے:-

(۱۱) ”بیابان اور اس کی بستیاں، قیدار کے آباد دیہات اپنی آواز بلند کریں گے۔ سلح کے بنے والے ایک گیت گائیں گے، پہاڑوں کی چوٹیوں پر سے لکھائیں گے۔“ (۱۲) وہ خداوند کا جلال ظاہر کریں گے اور بحری ممالک میں اس کی ثناء خوانی کریں گے۔“ قیدار حضرت اسماعیلؑ کے بارہ بیٹوں میں سے دوسرا بیٹا ہے۔ (دیکھئے کتاب پیدائش باب ۲۵، آیت ۱۳) جن کی اولاد حجاز میں آباد ہوئی۔ آنحضور ﷺ انہی قیدار کی نسل سے ہیں۔ (دیکھئے آنحضور ﷺ کا نسب نامہ) اور سلح مدینہ شریف کے ایک پہاڑ کا نام ہے۔ چنانچہ قاموس میں ہے۔ ”وسلع جبل فی المدینۃ اور صراح میں ہے“ ”و نام کو ہے مدینہ“ اور صحیح بخاری میں غزوہ تبوک کے ضمن میں حدیث کعب بن مالکؓ میں ہے:-

سمعت صوت صارخ لو فی جبل سلع باعلیٰ صوتہ یا کعب بن مالک بشر (الحدیث) ”حضرت کعبؓ کہتے ہیں کہ جب ہماری توبہ کی قبولیت اتری تو کوہ سلح پر چڑھ کر کسی نے اونچی آواز سے پکارا۔ اے کعب بن مالک تجھے بشارت ہو۔“ پس کتاب یسعیاہ میں نبی مکرم ﷺ اور آپؐ کی امت سب داخل ہیں۔

جن مواقع پر آنحضور ﷺ سے الحمد للہ کہنا مقبول ہے۔ ہم مع ان کے اسرار کے ترتیب وار لکھتے ہیں۔ اس سے معلوم ہو جائے گا کہ آپ واقعی نہایت کثرت سے اللہ تعالیٰ کی حمد کرنے والے تھے اور احمد ہونے میں اسم باسی تھے۔

☆ نیند سے بیدار ہوتے تو کہتے:- الحمد لله الذی احیانا بعد ما اماتنا و الیہ النشور (تیسیر الوصول)

”اللہ تعالیٰ کی حمد ہے کہ اس نے ہمیں موت کے بعد زندگی بخشی اور ہمیں آخر کار اسی کی طرف جانا ہے۔“

سر۔ نیند کو اخالموت کہتے ہیں، بعض اوقات سوئے سوئے موت ہو جاتی ہے۔ صحیح سلامت بیدار ہونے کو زندگی سے تعبیر کیا اور اس بیداری یا نئی زندگی پر سب سے پہلا کلمہ جس سے آپ کی زبان مبارک گویا ہوتی وہ کلمہ الحمد للہ ہے۔ سبحان اللہ! توجہ الی اللہ اسے ہی کہتے ہیں۔

☆ کھانا کھا کر اور پانی پی کر کہتے:- الحمد لله الذی اطعمنا و سقانا و جعلنا مسلمین (تیسرہ الوصول)
”سب تعریف اللہ کو ہے“ جس نے ہمیں کھانا دیا اور پانی دیا اور ہمیں اپنا فرماں بردار (مسلمان) بنایا۔“

سر۔ کھانا اور پانی مدار حیات ہیں۔ اطباء کے نزدیک ستر ضروریہ میں سے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی بڑی بھاری نعمت ہیں۔ ان پر شکر کیوں نہ کیا جائے اور اللہ تعالیٰ کی حمد کیوں بیان نہ کی جائے۔

☆ نیا لباس پہنتے تو کہتے:- الحمد لله الذی کسانى ما اولرى به عورتى و اتجمل به فى حیاتی (تیسرہ الوصول)
”اللہ تعالیٰ کی حمد ہے کہ اس نے مجھے لباس عطا کیا، جس سے میں اپنے تنگ کو چھپاتا ہوں اور اپنی زندگی میں اس سے زینت پاتا ہوں۔“

سر۔ لباس انسان کے لیے بڑی بھاری نعمت ہے۔ کائنات ارضی میں سوائے انسان کے یہ نعمت کسی ویکر پر نہیں ہے۔ اس میں دو باتیں خاص طور پر مقصود ہوتی ہیں۔ پردہ پوشی اور زیبائش، انہی دونوں کا ذکر کر کے اللہ تعالیٰ کی حمد کے گیت گائے گئے ہیں۔ (سبحان اللہ)

☆ نیا چاند دیکھتے تو کہتے:- هلال خیر و رشد (ثلاث مرات) امنت بالله الذی خلقک (ثلاث مرات) ثم يقول الحمد لله الذی ذهب بشهر کنا و جاء

بشہر کذا (تیسرے الوصول)

”تین دفعہ کہتے اللہ کرے کہ یہ نیا چاند خیر اور بھلائی کا ہو۔ پھر تین دفعہ کہتے میں اللہ تعالیٰ پر ایمان لایا۔ جس نے تجھے پیدا کیا۔ پھر کہتے سب تعریفوں کا مالک اللہ ہے جس نے فلاں مہینہ (خیریت سے) گزار دیا اور نیا مہینہ چڑھایا۔“

حکمت:- اس میں پہلے تو اللہ تعالیٰ سے بھلائی کی دعا ہے۔ پھر چاند کو خطاب کر کے اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا اور چاند کا مخلوق خدا ہونا اس لیے ذکر کیا کہ ستارہ پرست لوگوں کے نزدیک چاند بھی ایک معبود (دیوتا) ہے۔ سو اس میں ان کی تردید مقصود ہے اور چاند کو باوجودیکہ وہ بے جان ہے۔ اس لیے خطاب کیا کہ بعض اوقات کسی خاص مقصد کے لیے بے جان چیزوں کو مجازاً خطاب کر لیتا۔ ہر زبان میں متعارف و مستعمل ہے۔ اسے انگریزی میں پرسونیفیکیشن (personification) کہتے ہیں۔ اس جگہ اس خطاب سے ستارہ پرست قوموں پر اثر ڈالنا مقصود ہے۔ اس میں ایک کامل مہینہ زندہ رہنے اور خیریت سے گزارنے پر شکر یہ ہے اور آئندہ مہینہ میں خیریت کی طلب اور دعا ہے۔ (بحان اللہ!)

☆ سفر سے واپس آتے تو کہتے:- اثبون ناثبون عابدون ساجدون لربنا حاملون (تیسرے الوصول)

”ہم (ظاہری) سفر سے واپس آئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں (باطنی) رجوع (توبہ) کرتے ہیں۔ اللہ کے عبادت گزار اسی کو سجدہ کرتے ہیں اور اپنے رب کی حمد پکارتے ہیں۔“

☆ نیز آپؐ نے فرمایا کہ جب کوئی اپنی دعا کی قبولیت معلوم کرے یا بیماری سے شفاء پائے یا سفر سے (بخیریت) واپس آئے تو کہے:- الحمد لله الذی بعزته و جلالہ تنم الصلحت (الحسن)

”ہر طرح کی حمد کا مستحق اللہ ہے جس کی عزت و جلال سے سب نیک مقاصد پورے ہوتے ہیں۔“

☆ چھینک:- آپؐ نے فرمایا کہ چھینک آنے پر کہا کرو:- الحمد لله علی کل

حال (تیسر) ”ہر حال میں اللہ کا شکر ہے۔“

حکمت:- چھینک سے دماغ کے غلیظ بخار خارج ہو کر قدرتی طور پر بغیر علاج کے تنقیہ دماغ کا فائدہ ہوتا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے۔ اس لیے حضور اکرم ﷺ نے اس پر بھی حمد باری تعالیٰ پکارنے کا حکم دیا۔

دیگر یہ کہ حضرت آدمؑ کے قالب میں جب روح پھونکی گئی تو ان کو چھینک آئی۔ اس وقت فرشتوں نے ان کو الحمد للہ کہنے کی تلقین کی۔ پس یہ اس شکر یہ کی یادگار ہے۔ (حجتہ اللہ)

☆ مصیبت:- آپؐ نے فرمایا کہ کسی جلائے مصیبت کو دیکھو تو یوں اللہ کا شکر ادا کرو۔ الحمد لله الذی عافانی مما ابتلاک به وفضلنی علی کثیر ممن خلق تفضیلاً (تیسر)

”سب تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے مجھے اس بلا سے عافیت دے رکھی ہے“ جس میں تجھے جلا کیا ہے اور مجھے اپنی بہت سی مخلوق پر بزرگی بخشی ہے۔ اس کی حکمت ظاہر ہے۔“

☆ نیز فرمایا کہ جس شخص کا فرزند فوت ہو جائے اور وہ اس پر اللہ تعالیٰ کی حمد پکارے تو اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرماتا ہے کہ میرے بندے کے لیے جنت میں ایک محل تیار کرو اور اسے بیت الحمد کے نام سے پکارو۔ (صن ص ۱۸۰) اس میں یحملون فی الضرہ کی شان ظاہر ہے۔

☆ بنی عبد المطلب کے فرزندوں میں سے جب کوئی بچہ بات کرنے لگتا تو آپؐ سب سے پہلے اسے یہ آیت سکھاتے۔ الحمد لله الذی لم یتخذوللاً ولم یکن له شریک فی الملک ولم یکن له ولی من الدن و کبرہ تکبیراً ○ (بنی اسرائیل پ ۱۵)

”ہر طرح کی حمد اللہ ہی کو سزاوار ہے۔ جس نے کوئی متبنی نہیں بنایا اور نہ باوشاہت میں اس کا کوئی شریک ہے اور نہ کمزوری کی وجہ سے اس کا کوئی مددگار ہے اور تو اس کی بہت زیادہ بڑائی بیان کیا کر۔“

حکمت :- سبحان اللہ! زبان کھلتے ہی اللہ تبارک و تعالیٰ کی حمد اور کبریائی سکھائی ہے کہ اس نعمت گویائی کا شکریہ ادا ہو۔

☆ سواری کی پشت پر جب بیٹھتے تو کہتے :- الحمد للہ سبحان الذی سخر لنا هذا وما کناله مقرنین ○ وانا الی ربنا المنقلبون ○ الحمد للہ (ثلث مرات) اللہ اکبر (ثلث مرات) ولا الہ الا اللہ (ثلث مرات)

”ہر طرح کی تعریف اللہ کے لیے ہے۔ پاک ہے وہ ذات جس نے اس سواری کو ہمارے تابع کیا اور ہم (خود بخود) ایسے (طاقت ور) نہ تھے کہ اس کو اپنے قابو میں لے آتے اور یہ بھی ضرور ہے کہ ہم اپنے رب کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔ اس کے بعد آپ تین دفعہ الحمد للہ، تین دفعہ اللہ اکبر اور تین دفعہ لا الہ الا اللہ کہتے۔

حکمت :- سواری اسباب آسائش میں ایک بڑی نعمت ہے۔ اس کے منافع ظاہر ہیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر کرنا نہایت موزوں ہے۔“

☆ آپؐ نے فرمایا کہ کسی کو کوئی خوش خبری ملے تو اللہ کی حمد کہے اور آپؐ کی اپنی عادت بھی یہی تھی کہ خدا کی حمد کرتے اور تکبیر کہتے اور سجدہ شکر ادا کرتے۔ (صحن صحن)

☆ جب دشمن شکست کھا کر بھاگ جاتا تو کہتے۔ اللهم لک الحمد کله (صحن) یعنی خدا یا تو ہی ساری حمد کا مالک و مستحق ہے۔ (کہ میرے دشمن کو بھگا کر مجھے امن دیا۔)

یہ وہ مواقع ہیں جو اسباب و حالات سے تعلق رکھتے ہیں اور ان میں صرف حمد الہی کا ذکر ہے۔ ان کے علاوہ ورد و وظائف کے طور پر ذکر الہی کے دوسرے صیغوں مثلاً تسبیح و تکبیر وغیرہ کے ساتھ آپؐ جو حمد الہی کرتے تھے اور اپنے صحابہ کرامؓ کو فرماتے تھے۔ وہ بیش از بیش ہے۔ رات کو بستر پر لیٹنے کے وقت، صبح کے وقت، شام کے وقت، پنج وقتہ نماز کے بعد تسبیح، تحمید، تکبیر اور تجمید کے جو وظائف ہیں۔ وہ عام طور پر مشہور ہیں۔ تفصیل کی حاجت نہیں۔

اس تفصیل سے صاف ظاہر ہے کہ آنحضور ﷺ کثرت سے اللہ رب العزت کی حمد و ثنا اور اس کا شکر ادا کرتے اور یہ آپؐ کے اسم احمدؑ کی وجہ سے ہے۔ (بسمت حمد

کرنے والا) اور اسی کی برکت قیامت کو یوں ظاہر ہوگی کہ لوائے حمر یعنی حمر الہی کا جھنڈا آپ کے ہاتھ میں دیا جائے گا اور سب انبیاء و صلحا اس کے نیچے جاگزیں ہوں گے۔ چنانچہ فرمایا۔ وانا حامل لواء الحمد یوم القیمة تحتہ لام فمن دونہ نیز فرمایا۔ و بیدی لواء الحمد ولا فخر وما من نبی یومئذ لام فمن سواہ الا تحت لوائی (مشکوۃ) یعنی قیامت کے دن حمر کا جھنڈا میرے ہاتھ میں ہوگا اور میں فخر سے نہیں کہتا۔ آدم اور ان کے سوا تمام انبیاء اس روز میرے جھنڈے کے نیچے ہوں گے۔ نیز حضرت انسؓ کی حدیث شفاعت میں ہے۔ فائنی علی ربی بثناء و تحمید یعلمنیہ (مشکوۃ) یعنی میں اپنے پروردگار کی ایسی حمر و ثناء کروں گا جو مجھے اللہ تعالیٰ (اسی وقت) سکھائے گا جو میں سجدے میں کروں گا۔

فلقہ ساجدا لربی ثم یفتح اللہ علی من محامدہ و حسن الثناء علیہ شیئالم یفتحہ علی احد قبلی (مشکوۃ)

”مجھ پر اللہ تعالیٰ اپنی حمر و ثناء کے ایسے منے اور عبارتیں کھولے گا کہ کسی دیگر پر مجھ سے پہلے نہیں کھولے ہوں گے۔“

○ رب العالمین

جو مالک و پروردگار ہے سب جہانوں کا

ترکیب نحوی۔ لفظ ”رب“ سے لفظ مالک تک سب صفات ہیں لفظ اللہ کی۔

حل لغات۔ لفظ ”رب“ اصل میں مصدر ہے۔ معنی پرورش کرنا لیکن بنا بر مبالغہ اسم قائل کے معنی میں مستعمل ہے اور بعض کے نزدیک خود اسم قائل کا صیغہ ہے۔ یہ ایک صفاتی نام ہے، ذات باری کا۔ بایں معنی کہ وہ ہر حالت کے مناسب اسباب مہیا کر کے ہر شے کی پرورش کرتا اور اسے حد کمال تک پہنچاتا ہے اور مالک و صاحب کو بھی کہتے ہیں۔ مثلاً ”رب المنزل“ رب البیت وغیرہ تو پہلے معنی کی رو سے رب العالمین کے معنی ہیں تمام جہانوں کا پروردگار۔ اور دوسرے معنی کی رو سے تمام جہانوں کا مالک و صاحب۔

رب:- اگر مطلق بغیر اضافت کے مذکور ہو تو صرف ذات باری مراد ہوتی ہے۔ جیسے آیت بللۃ طیبۃ ورب غفور (سپا پ ۲۲) میں اور آیت سلام قولاً من رب رحیم (سپا پ ۲۳) میں ہے اور اگر اضافت سے ذکر کیا جائے تو برعایت قرینہ مرئی حقیقی خداوند عالم پر بھی بولا جاتا ہے اور مرئی مجازی پر بھی۔ مثلاً اسی آیت رب العلمین اور نیز آیت بل ربکم رب السموات والارض الذی فطرھن (انبیاء پ ۱۷) میں ہے۔ کہ سارے عالم و عالمیان کا پروردگار و مالک سوائے اس کے کوئی نہیں اور آیت لذكرنی عند ربک اور آیت لرجع الی ربک (یوسف پ ۱۲) میں اس سے مراد مرئی مجازی شاہ مصر ہے۔

رب العالمین:- عالمین خلاف قیاس جمع ہے عالم کی۔ قاموس میں ہے ولا یجمع فاعل بالو والنون غیرہ وغیرہ باسم یعنی جو اسم فاعل (بفتح العین) کے وزن پر ہو۔ اس کی جمع واؤ اور نون سے نہیں آتی۔ سوائے عالم اور یاسم کے (ایک پھول) علاوہ ازیں اس کی جمع عوالم بھی آتی ہے۔ صراح میں ہے۔ عالمون عوالم۔ امام راغبؒ نے واؤ، نون سے اس کی جمع آنے کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ چونکہ اس کے مفہوم میں انسان بھی داخل ہے اور جب کسی لفظ میں دوسروں کے ساتھ انسان بھی شریک ہو تو انسان کا حکم غالب ہوتا ہے۔ (لہذا اس کی جمع و ن سے کی گئی جو زبان میں انسانوں کے لیے ہے) اس لفظ کا اطلاق تمام مخلوقات پر ہے یا یوں سمجھئے کہ ذات برحق کے سوا جو کچھ بھی موجود ہے۔ خواہ اس کا وجود محض ذہنی و لفظی ہے یا اس کے ساتھ خارجی بھی ہے۔ خواہ اجسام ہیں، خواہ ارواح مجردہ، خواہ فرشی ہیں، خواہ فلکی و عرشی، خواہ مرئی ہیں جو نظر آتے ہیں، خواہ غیر مرئی جو نظر نہیں آتے۔ کما فی قولہ تعالیٰ فلا قسم بما تبصرون وما لا تبصرون (الحاقہ ۲۹) ”قسم ہے اس کی جسے تم دیکھتے ہو اور اس کی جسے تم نہیں دیکھتے۔“

ان سب کو عالم کہتے ہیں۔ قاموس میں ہے۔ العالم الخلق کلہ لو ما حوالہ بطن الفلک اور مفردات راغب میں ہے۔ العالم اسم للفلک وما ینحویہ من الجواهر والاعراض۔

چونکہ عالم کا ذرہ ذرہ اجتماعاً اپنی پیدائش، اپنی ترکیب، اپنی وضع قطع، اپنے افعال و خواص اور دیگر اشیاء سے اپنے نظام و ابھل سے اپنے خالق و پروردگار اور اپنے مالک و مدبر کے وجود ہستی اور اس کی قدرت و حکمت کی علامت و دلیل ہے۔ اس لیے اسے عالم کہتے ہیں۔ مفردات میں ہے:- والعالم آلة في الدلالة على صانعه ولهذا احلنا تعالى عليه في معرفة وحدانية فقل لولم ينظروا في ملكوت السموات والارض وما خلق الله من شئ الا يدعوا لعن عالم آله ہے اپنے صانع پر ولالت کرنے میں اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی وحدانیت کی معرفت میں ہمیں اس کا حوالہ دیا ہے اور فرمایا ہے۔ کیا ان لوگوں نے آسمان و زمین کی بادشاہت میں اور ہر شے میں جو اللہ تعالیٰ نے پیدا کی نظر نہیں کی؟

چونکہ انواع عالم بکثرت ہیں، جن کی صحیح تعداد ان کا خالق و پروردگار ہی جان سکتا ہے اس لیے اسے بسمتہ جمع ذکر کیا۔ چنانچہ مفردات میں ہے:- واما جمعه فلان من كل نوع من هذه قد يسمى عالما فيقل عالم الانسان و عالم الماء و عالم النهار اور صراح میں بھی اسی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ چنانچہ کہا ہے عالم بفتح یک گونه خلق

بلر ز دیگر اسے یوں سمجھئے کہ عالم کے تین طبقے ہیں۔ بالا، زیریں اور متوسط یعنی آسمان و آسمانی (ستارگان و فرشتگان اور زمینی (حیوانات، نباتات و جمادات) اور زمین و آسمان کے درمیان کی اشیاء جو ان کے اثر سے پیدا ہوتی ہیں۔ مثلاً 'ہوا'، 'بادل'، 'رعد'، 'برق' وغیرہ سب الگ الگ عالم ہیں۔

بطریق دیگر یوں سمجھئے کہ اشیاء عالم دو طرح کی ہیں۔ ارواح و اجسام، یا یوں کہ بعض جواہر ہیں، مثلاً 'آفتاب و ماہتاب اور زمین و آسمان اور پھل پھول وغیرہ اور بعض عوارض ہیں، مثلاً 'دن رات اور خوشبو۔

غرض جتنے اعتباروں سے تقسیم کرو۔ ان سب پر عالم کا لفظ اطلاق پائے گا اور نہایت مختصر طور پر یوں سمجھئے کہ ماسوا اللہ کو عالم کہتے ہیں۔ تو اب رب العالمین کے معنی ہوئے، جملہ عوالم کا مالک و صاحب، سب کا پروردگار و تدریجی پرورش علی التواتر مناسب اسباب اور مسلسل حفاظت سے حد کمال تک پہنچانے والا۔

نکتہ:- رب العالمین اس لیے کہا کہ حمد و ثناء مختص بذات باری ثابت ہو۔ گویا یہ اسم اللہ کے بعد اختصاص کی دوسری دلیل ہے۔ کیوں کہ تمام عالمین کی تربیت خاصہ خداوندی ہے اور اس کے سوا جو کوئی بھی مربی اور ولی نعمت ہے۔ مثلاً اولاد کے حق میں ماں باپ، یا غلاموں اور خدمت گاروں اور ملازموں کے حق میں آقا، اول تو ان سب کی تربیت جزوی و انفرادی ہوتی ہے۔ دیگر یہ کہ وہ بھی خداوند تعالیٰ کے پیدا کردہ اسباب سے پرورش کرتے ہیں۔ پس اس کا رجوع بھی اسی ذات کی طرف ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ کو مربی حقیقی اور دوسروں کو مربی مجازی کہتے ہیں۔ بلکہ یوں سمجھئے کہ اس مربی مجازی کو مربی بنانا بھی اس مربی حقیقی کی تربیت میں داخل ہے کیوں کہ وہ ایک سبب ہے اور سلسلہ اسباب اس سبب الاسباب کے ہاتھ میں ہے۔ چنانچہ فرمایا:- وما بکم من نعمۃ فعمن اللہ (نحل، پ ۱۳) یعنی تم کو جو بھی نعمت حاصل ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ پس دیگر سبب بمنزلہ خدمت گاروں اور حاملوں کے وسائل اور ذرائع ہیں۔ جن کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ منعم حقیقی اپنے بندوں کو نعمتیں پہنچاتا اور ان کی تربیت کرتا ہے۔ (عزیزی)

نکتہ غریب و ارتباط عجیب:- حمد کے بیان میں ہم کہہ آئے ہیں کہ وہ کسی ذاتی وصف کے لحاظ سے ہوتی ہے۔ عام اس سے کہ اس کا اثر کسی دوسرے پر پڑے یا نہ پڑے۔ پس جب حمد اللہ کے لیے ثابت ہے یا خاص ہے تو اس جگہ اسم جلالت یعنی اسم اللہ کے اختیار کرنے میں یہ نکتہ ہوا کہ ذات برحق اس لیے قائل حمد ہے کہ وہ اللہ ہے۔ یعنی ذاتی طور پر جامع جمیع صفات کمال ہے پھر اس کے بعد رب العالمین کہہ کر یہ بتایا کہ وہ اپنی ذات میں لائق حمد ہونے کے علاوہ فیاض و منعم بھی ہے کہ سارے جہان والوں کا پروردگار ہے۔ پس آیت الحمد للہ رب العلمین برود صورت خدا کی حمد میں کامل ہوئی (میر)

لظائف نادہ، نمبر:- ہر چند کہ یہ سورت اور سارا قرآن شریف تعلیم و ہدایت بندگان کے لیے ہے۔ ان کو سمجھانے کے لیے صرف ان کی تربیت کا ذکر کافی تھا لیکن پھر بھی جملہ عالمین کا ذکر کیا اور خاص انسانوں سے متعلق نہیں رکھا۔ اول اس لیے کہ نوع انسانی کی تربیت جملہ عالم کی تربیت سے وابستہ ہے اور سارے عالم کی تربیت ایک ہی نظام و تدبیر میں منسلک ہے۔ جب تک جملہ عالم کی تربیت و انتظام درست نہ ہو، نوع انسانی کی تربیت

اور اس کے بقا و زندگی اور آسائش و آرام کی صورت ممکن نہیں۔ لہذا اس جگہ رب الناس کی بجائے رب العالمین کہہ کر مضمون کو بلند پایہ کیا ہے۔ (عزیزی ملخصاً)

دیگر اس لیے کہ رب العالمین تخصیص حمد بذات باری تعالیٰ کے دلائل و وجوہات میں واقع ہوا ہے، جیسا کہ اوپر مذکور ہو چکا۔ پس مقصود کی مناسبت کے لحاظ سے لیل جس قدر بھی ابلغ ہو، اس کی خوبی و استحکام زیادہ ہوگا اور ظاہر ہے کہ نوع انسانی انواع عالم میں سے ایک ہے۔ لہذا عالمین کی تربیت کے ذکر میں مضمون تخصیص حمد کے متعلق قوت زیادہ ہے اور بلاغت کی جان بھی ہے کہ مقتضائے حال موقع و محل، الفاظ بیان اور مقصود کی مناسبت کی رعایت رہے۔ (میر)

لطیفہ نمبر ۲:- قرآن شریف میں لفظ رب کی اضافت کبھی عالمین کی طرف کی گئی ہے۔ جیسے کہ اس آیت میں ہے اور کبھی اشیائے عالم کی طرف۔ یعنی جو چیزیں لفظ عالم کے مفہوم میں داخل ہیں۔ مثلاً زمین و آسمان اور ان کی درمیانی اشیاء اور عرش الہی ان کی طرف اور کبھی عوارض و اوضاع غیر متناہیہ کی طرف مثلاً مشرق و مغرب، مشرقین و مغربین اور مشارق و مغارب اور کبھی عام لوگوں کی طرف مثلاً قل اعوذ برب الناس اور کبھی خاصین کی طرف مثلاً ربکم ورب لہائکم الاولین اور کبھی مذکورین کی طرف مثلاً اولئک علی ہدی من ربہم اور کبھی خاص آنحضرت ﷺ کی طرف مزید عنایت جتانے کی خاطر مثلاً فلا وربک (پ ۵) اسی طرح دیگر اضافیں بھی ہیں۔ جس مقام پر جس چیز کی طرف اس اسم رب کو مضاف کیا گیا ہے۔ وہاں اسی کی ضرورت تھی۔ (میر) ان شاء اللہ ان سب کے نکتے ان کی متعلقہ آیات میں بڑی تفسیر تبصیر الرحمن بتفسیر القرآن میں بیان ہوں گے۔ (واللہ ولی التوفیق)

لطیفہ نمبر ۳:- اسم اللہ کو اول ذکر کیا اور باقی کو پیچھے اس لیے کہ اسم اللہ ذاتی نام ہے اور یہ ہمیشہ موصوف ہوتا ہے، صفت کبھی نہیں ہوتا۔ اس لیے اسے پہلے ذکر کیا اور اس کے بعد رب العالمین وغیرہ صفات بیان کیں۔ (میر)

لطیفہ نمبر ۴:- ذات برحق کی معرفت اول تو فطرت سے ہے۔ دوم اس کے افعال و منافع قدرت سے ہیں الحمد للہ میں اسم ذکر کر کے فطری رجوع و اثابت کی طرف اشارہ

کہا جیسا کہ بسم اللہ کی تفسیر میں گزر چکا اور رب العالمین کہہ کر دوسرے طریق سے سمجھایا اور معرفت الہی کے یہی دو ذریعے ہیں۔ پس الحمد للہ کے بعد رب العالمین کا جوڑ نہایت موزوں و مناسب ہے کیوں کہ اس سے ہر دو طریق جمع ہو جاتے ہیں۔ (میر)

قرآن شریف میں اسم رب خاص کر صفت رب العالمین کو خاص اہمیت سے ذکر کیا ہے۔ چنانچہ اسم رب قرآن شریف میں سب اسموں سے زیادہ دفعہ یعنی تقریباً ۱۷۰۰ (۹۲۵) دفعہ آیا ہے۔ اس تعداد میں صفت رب العالمین چالیس (۴۰) دفعہ ہے اور پورا الحمد للہ رب العالمین چھ (۶) دفعہ آیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے الہ یعنی مستحق عبادت ہونے کا مدار دو امر ہیں۔ خالقیت اور ربوبیت۔ چنانچہ فرمایا:۔ یا ایہا الناس اعبدوا ربکم الذی خلقکم (پ ۱) یعنی اے لوگو! عبادت کرو اپنے رب کی جس نے تم کو پیدا کیا اور حضرت عیسیٰؑ کی زبانی ذکر کیا۔ ان اللہ ربی وربکم فاعبدوه (آل عمران، پ ۳) اللہ ہی میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے پس تم اسی کی عبادت کرو۔

نیز تمام رسولوں کو خطاب کر کے حکم سنانے کا ذکر کیا۔ ان ہذا امتکم لمة واحدة وانا ربکم فاعبدون (انبیاء، پ ۱۷) یعنی ”بے شک تم سب (رسولوں) کا یہی ایک گروہ ہے اور میں (اکیلا) تم سب کا رب ہوں“ پس میری ہی عبادت کرو۔“

اور یہ سلسلہ ربوبیت اتنا وسیع ہے کہ نظر اٹھا کر دیکھتے تو پتہ چلتا ہے کہ ساری کائنات ارضی و سماوی کی تخلیق انسان کی تربیت کے لیے ہے اور کائنات کا ذرہ ذرہ اس کی پرورش میں مصروف ہے اور اس مشینری کا پرزہ پرزہ اسی کے لیے حرکت کر رہا ہے۔

ابر و باد و سہ و خورشید و فلک در کار اند
تا تو نانے بخت آری و بغفلت نہ خوری
ایں ہمہ از بہر تو سر گشتہ و فرمانبردار
حیف باشد کہ تو خود فرماں نہ بری

زمین ہے تو اسی کے قرار و معیشت کے لیے اور پہاڑ ہیں تو اسی کے قاعدے کے لیے اگر سورج زمین کو تھامے ہوئے ہے تو اسی کے لیے کہ وہ اس کی قرار گاہ ہے اور اگر وہ دنیا جہان پر ضو فشان کرتا ہے تو اس لیے کہ انسان اپنی بصارت سے کام لے سکے اور اگر

اس کی روشنی تیز دھوپ کی صورت میں گرم ہے تو اس لیے کہ اس کی خوراک و انواع اقسام کے میوہ جات پختہ ہو کر اس کی بقاء و حیات کا قوام بن سکیں اور مضر صحت عفونتیں دور ہو کر اس کی زندگی کے دن صحت و سلامتی سے گزر سکیں اور سمندر کا پانی بخارات کی صورت میں اڑ کر اور پہاڑوں سے ٹکرا کر ٹھنڈی ہوا سے بارش کی صورت میں زمین پر گرے اور اس کے ویرانوں کو سبزہ زار بنائے۔ جس سے اس کی اور اس کے بہائم کی ضروریات اکل و شرب کا تپید اکثار سلسلہ قائم ہو۔ اسی طرح ہوا ہے تو اس کے دم لینے کو اور دیگر فوائد کو، آگ ہے تو اسی کا کھانا پکانے کو، پانی ہے تو اسی کے پینے کو، مٹی ہے تو اسی کی رہائش و ضروریات اور پیدائش روزی کے لیے غرض جو کچھ بھی ہے اسی کی تربیت کے لیے ہے۔

چنانچہ فرمایا۔ **هو الذی خلق لکم مافی الارض جمیعاً** (پ ۱)

”اللہ وہ پاک ذات ہے جس نے سب کچھ جو زمین میں ہے، تمہارے ہی (فائدے کے) لیے پیدا کیا۔“ نیز فرمایا۔

و سخر لکم مافی السموت و مافی الارض جمیعاً منہ ان فی ذلک لایات لقوم یتفکرون ○ (جاثیہ، پ ۲۵)

”جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سب کو تمہارے ہی کام میں لگا رکھا ہے۔ یہ سب کچھ اسی (کی عنایت) سے ہے۔ بے شک اس میں نشانیاں ہیں، ان لوگوں کے لیے جو سوچ رکھتے ہیں۔“

اسی طرح سورۃ غافر (مومن) میں سارے سلسلہ کائنات کو اپنی ربوبیت کا کرشمہ جتانے کے لیے فرمایا۔

اللہ الذی جعل لکم الارض قراراً و السماء بناء و صورکم فاحسن صورکم و رزقکم من الطیب ذلکم اللہ ربکم فتبارک اللہ رب العلمین ○ هو الحی لا الہ الا هو فادعوه مخلصین له الدین الحمد للہ رب العلمین ○ قل انی نہیت ان اعبد الذین ندعون من دون اللہ لما جاءنی البینت من ربی و امرت ان اسلم لرب العلمین ○ (مومن پ ۲۳)

”اللہ وہ ذات ہے جس نے زمین کو تمہارے لیے قرار گاہ اور آسمان کو عمارت

بنایا اور تمہاری صورت بنائی۔ پس اچھی بنائی صورتیں تمہاری اور روزی دی تم کو ستھری چیزوں سے، یہی اللہ تمہارا رب ہے۔ پس بہت بابرکت ہے اللہ سب جہانوں کا پروردگار، وحی الہی (سدا زندہ ہے۔) اس کے سوائے کوئی بھی لائق پرستش نہیں۔ پس تم خالصتاً اسی کی اطاعت کی نیت رکھ کر صرف اسی کو پکارو۔ سب تعریف کا سزاوار اللہ ہی ہے جو سب جہانوں کا پروردگار ہے۔ (اے پیغمبر! ان سے) کہو جب میرے پروردگار کی طرف سے واضح و لیلیں آچکی ہیں تو مجھے اس سے منع کیا گیا ہے کہ میں ان کی عبادت کروں، جن کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو اور مجھے حکم یہ ہوا ہے کہ (بس ایک) اللہ کا فرمانبردار ہو کر رہوں، جو تمام جہانوں کا پروردگار و مالک ہے۔“

اس مقام پر انسان کو خوب صورت وضع میں پیدا کرنے اور سارے کارخانہ زمین و آسمان کو اس کے فائدے اور تربیت کے لیے بنانے کا احسان جتا کر اسے خالصاً خدا کی عبادت کرنے، صرف اسی کو پروردگار و کارساز سمجھنے اور صرف اسی سے دعائیں مانگنے اور اسی کے سامنے اپنی جملہ حاجات کے پیش کرنے کا حکم کیا ہے اور اوپر تلے علی التواتر تین دفعہ صفت رب العالمین ذکر کی ہے۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ صفت رب العالمین ایک خاص شان رکھتی ہے۔ پہلی دفعہ اسباب تربیت کے مہیا کرنے میں خصوصیت بنانے کے لیے دوسری دفعہ خصوصیت محمودیت جتانے کے لیے اور تیسری دفعہ خصوصیت معبودیت کا حکم سننے کے لیے، غرض یہ تینوں امر ذات حق سے مخصوص ہیں اور ان سب کی جامع وجہ یہ ہے کہ وہ رب العالمین ہے۔

وہ رب العالمین ہونے میں فیض عام رکھتا ہے

اور یہ صفت سوائے اس کے کسی اور میں نہیں ہے۔ پس مذکورہ بالا ہر سہ امور کے لائق بھی اس کے سوائے دیگر کوئی نہیں ہے۔ اسی طرح تمام عالم علوی و سفلی کی پیدائش اور ان میں صرف اسی کا حکم جاری ہونے اور جملہ کائنات کی تدبیر صرف اسی کے ہاتھ میں ہونے کی بابت فرمایا۔

اِنْ رِکَمَ اللّٰہِ الذی خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِی سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلٰی الْعَرْشِ یَغْشٰی الْبَیْلَ النَّهَارَ یَطْلُبْہٗ حَیْثَآ وِ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنَّجْمُ مَسْخَرَاتٌ بِاَمْرِہٖ اِلَّا لَہُ الْخَلْقِ وَالْاَمْرِ تَبَارَکَ اللّٰہُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ○ (اعراف)

(پ ۸)

”اس میں کچھ شک نہیں کہ تمہارا رب تو (بس ایک) اللہ ہے۔ جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن (وقعات) میں پیدا کیا، پھر (یہ کہ سلسلہ پیدائش) عرش پر جا ختم ہوا۔ دن کو رات سے ڈھانک دیتا ہے کہ وہ (رات) اس (دن) کو جلد جلد طلب کرتی ہے اور سورج اور چاند اور دیگر سب ستاروں کو پیدا کیا کہ وہ سب اس کے حکم سے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ سن رکھو! اسی کی ہے خلق اور اسی کا ہے حکم، بہت بابرکت ہے اللہ تمام جہانوں کا پروردگار۔“

غرض یہ کہ دل میں محسن کی عظمت و وقعت بٹھانے، اس کی عزت و وقار کا سکہ جمانے اس کے سامنے گردنوں کے جھکا دینے، اس کی خوشنودی کے کام کرنے اور شکر گزاری میں اس کی تعریف و ثناء کے گیت گانے کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے، اور احسان فراموشی و کفران نعمت اور اس کے مقابلے میں کسی غیر کی فرمانبرداری کی کمرہ برائی سے بچانے کے لیے اس کے احسانات و انعامات جمانے کے برابر کوئی بھی طریقہ موثر نہیں ہے۔ اسی لیے قرآن شریف میں ان مقاصد کے لیے ربوبیت الہی کا ذکر بیش از بیش ہے۔ ۱۔ چنانچہ خاص اللہ تبارک و تعالیٰ کی عبادت کرنے اور اس کے ساتھ کسی کو بھی شریک نہ گرداننے کے متعلق خود انسان کے پیدا کرنے اور اس کے لیے تمام قسم کے اسباب تربیت مہیا کرنے ہی کو پیش کیا ہے۔ چنانچہ فرمایا:-

يا ايها الناس اعبدوا ربكم الذي خلقكم والذين من قبلكم لعلكم تتقون ○
الذي جعل لكم الارض فراشا والسماء بناء وانزل من السماء ماء فاخرج به
من الثمرات رزقا لكم فلا تجعلوا لله اندلا و انتم تعلمون ○ (پ ۵)
”غافل لوگو! اپنے پروردگار کی عبادت کرو، جس نے تم کو بھی اور تم سے پہلوں کو بھی پیدا کیا۔ تاکہ تم (عذاب سے) بچ جاؤ۔ (وہ خدا) جس نے تمہارے لیے زمین کو (تو) فرش (قرار گاہ) بنایا اور آسمان کو چھت، اور آسمان (کی طرف سے) پانی اتارا، پھر اس سے (کئی قسم) کے پھل اور اناج تمہاری روزی کے لیے پیدا کئے تو تم اللہ کے ساتھ (کسی کو بھی) شریک نہ بناؤ اور تم کو یہ سب کچھ معلوم ہے۔“

۲۔ اسی طرح صرف اللہ تعالیٰ ہی کو کار ساز و قاتح روزگار، خالق اور رازق جاننے کے

لے فرمایا:-

ما يفتح الله للناس من رحمة فلا ممسك لها وما يمسك فلا مرسل له من بعده، وهو العزيز الحكيم ○ يا ايها الناس اذكروا نعمة الله عليكم هل من خالق غير الله يرزقكم من السماء والارض، لا اله الا هو، فاني نوفكون ○ (فاطر، پ ۲۲)

”اللہ تعالیٰ لوگوں کے لیے اپنی رحمت (کا دروازہ) کھولے تو کوئی اس کے بند کرنے والا نہیں اور جو بند کر دے تو اس کے بعد کوئی اس کو جاری کرنے والا نہیں اور وہ بلا زبردست (اور) باحکمت ہے۔ اے لوگو! اللہ کی جو نعمت تم پر ہے، وہ یاد کرو۔ کیا اللہ کے سوا کوئی اور خالق ہے؟۔ جو تمہیں آسمان اور زمین سے روزی دے۔ اس کے سوا کوئی معبود (برحق) نہیں ہے۔ پس تم لوگ کدھر کو بیکے ہوئے جا رہے ہو۔“

۳۔ اسی طرح شرک سے روکنے اور مشرکین کی بے عقلی ظاہر کرنے کے لیے فرمایا:- و يعبدون من دون الله مالا يملك لهم رزقا من السموات والارض شيئا ولا يستطيعون ○ (نحل پ ۱۳)

”اور یہ مشرکین اللہ کے سوا ایسی چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جو ان کے آسمان و زمین سے کسی قدر روزی کے بھی مالک نہیں اور نہ ان میں اس امر کی استطاعت ہی ہے۔“

۴۔ جد انبیاء حضرت ابراہیمؑ کے ذکر میں فرمایا۔ لذل قال له ربه اسلم قال اسلمت لرب العالمين ○ (پ ۱) ”جب اسے اس کے پروردگار نے فرمایا۔ (اطاعت میں) گردن رکھو تو اس نے کہا کہ میں نے رب العالمین کے سامنے گردن جھکا دی۔“

۵۔ اسی طرح اپنی مشرک قوم سے ان کا خطاب یوں ذکر کیا۔ و ابراهيم لقومه اعبدوا الله واتقوه، ذلكم خير لكم ان كنتم تعلمون ○ انما تعبدون من دون الله لو نانا و تخلقون افكاً ان الذين تعبدون من دون الله لا يملكون لكم رزقا فابتغوا عند الله الرزق و اعبدوه واشكروا له، اليه ترجعون ○ (مکھوت، پ ۲۱)

”اور (بھیم، نے) ابراہیمؑ کو جب کہا اس نے اپنی قوم سے، بندگی کرو اللہ کی

اور اس سے ڈرتے رہو، یہ بہتر ہے تمہارے لیے اگر تم سمجھو۔ تم تو پوجتے ہو اللہ کے سوا یہی بتوں کے تھان اور بتاتے ہو جھوٹ، بے شک جن کو تم پوجتے ہو سوا اللہ کے، وہ نہیں مالک ہیں تمہاری روزی کے پس تم ڈھونڈو اللہ کے ہاں روزی اور بندگی کرو اس کی اور شکر کرو اس کا، تم کو اسی کی طرف جانا ہے۔“

۶۔ اسی طرح ذکر کیا کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے باپ اور اپنی قوم کو بت پرستی کی جمالت و گمراہی سمجھانے اور بتوں کا بے اختیار محض ہونا بتانے کے بعد صرف اللہ تعالیٰ کو معبود گرداننے کی وجوہات یوں بیان کیں:-

فانهم عدولى الا رب العلمين ○ الذى خلقنى فهو يهدين ○ والذى هو يطعمنى و يسقين ○ ولذا مرضت فهو يشفين ○ والذى يمينتى ثم يحيين ○ والذى اطمع لن يغفر لى خطيئتى يوم الدين ○ (شعراء پ ۱۹)

”پس سوائے رب العالمین کے وہ سب میرے دشمن ہیں۔ (وہ اللہ) جس نے مجھے پیدا کیا۔ پس وہی میرا ہادی ہے اور جو مجھے کھانا کھانے کو اور پانی پینے کو دیتا ہے اور جو مجھ پر موت وارد کرے گا پھر مجھے زندہ کرے گا اور جس سے میں امید رکھتا ہوں کہ جزا کے دن وہ میری خطاؤں سے درگزر کرے گا۔“

اس مقام پر اسم رب العالمین ذکر کر کے اس کے جملہ فیوض جسانی و روحانی، دنیوی و اخروی، حاصلہ و متوقعہ کی فہرست بیان کر دی ہے۔ چونکہ یہ سب کچھ اسی کی ربوبیت کا کرشمہ ہے اس لیے معبود بھی وہی ہو سکتا ہے۔ لافیروہ (سبحان اللہ)

۷۔ بقیہ ملکہ سبا جو سورج کی پرستش کرتی تھی۔ اس کے دماغ سے توہمات شرکیہ دور ہوئے اور صرف اکیلے خدا کے مستحق عبادت ہونے کا نور اس پر جلوہ گر ہوا تو وہ بھی اسی صفت رب العالمین ہی کا اقرار کر کے مسلمان ہوئی اور نظام نبیؐ کو اسی کی ربوبیت کا کرشمہ سمجھ کر سورج پرستی سے تائب ہوئی اور اسے ظلم قرار دے کر اپنی گزشتہ روش پر افسوس کرنے لگی۔ چنانچہ اس کا قول اس طرح نقل کیا ہے:-

قالت رب انى ظلمت نفسى واسلمت مع سليمان لله رب العلمين ○ (نمل پ ۱۹)

”کہنے لگی اے میرے مالک و پروردگار! بے شک میں اپنی جان پر ظلم کرتی رہی

اور اب میں حضرت سلیمانؑ کے ساتھ ہو کر اللہ رب العالمین کی فرماں بردار ہو گئی ہوں۔

۸۔ اسی طرح حضرت الیاسؑ کی زبانی ذکر کیا کہ انہوں نے اپنی مشرک قوم سے کہا۔
اتدعون بعلا و تذرون احسن الخالقین ○ اللہ ربکم و رب ابائکم الاولین ○
(صافات پ ۲۳)

”کیا تم پکارتے ہو بعل بت کو اور چھوڑتے ہو احسن الخالقین خدا کو جو تمہارا
بھی اور تمہارے پہلے باپ دادوں کا بھی رب ہے۔“

(۹) خاص کر دعاؤں کے لیے تو اسی اسم ”رب“ کو مخصوص کیا گیا ہے۔ تقریباً تمام
انبیاء کرامؑ کی دعائیں جو قرآن حکیم میں حکایتاً وارد ہیں یا تعلیمات فرمائی گئی ہیں۔ ان
سب میں یہی اسم ”رب“ مذکور ہے۔

(الف) حضرت آدمؑ کی دعا ہے۔ ربنا ظلمنا انفسنا و ان لم تغفر لنا و ترحمنا
لنکونن من الخاسرین ○ (اعراف پ ۸) ”ہمارے پروردگار! ہم نے اپنی جانوں
پر ظلم کیا اور اگر تو نے ہمیں نہ بخشا اور ہم پر رحم نہ کیا تو ہم یقیناً زیاں کاروں میں سے
ہو جائیں گے۔“

(ب) اسی طرح حضرت نوحؑ کی دعا ہے کہ انہوں نے موذی قوم کی ایذا سے بچنے کے
لیے دعا کی۔ فدعا ربہ انی مغلوب فانتصر ○ (قمر پ ۲۷)

”پس اس نے اپنے رب کو پکارا کہ میں بے بس ہوں پس تو میری مدد فرما۔“

(ج) نیز کہا۔ رب انصرنی بما کذبون ○ (مومنون پ ۱۸)
”پروردگار! میری مدد کر کہ انہوں نے مجھے جھوٹا جانا۔“

(د) نیز ان کو یہ دعا سکھائی کہ و قل رب انزلنی منزلاً مبارکاً و انت خیر
المنزلین ○ (مومنون پ ۱۸)

”کشتی سے سلامت اترنے کے لیے یوں دعا کرنا کہ اے میرے پروردگار! اتار مجھ کو اتارنا
برکت کا اور تو بہتر اتارنے والا ہے۔“

(ه) اور اسی طرح حضرت ابراہیمؑ کے اولاد مانگنے کی دعا یوں ذکر کی:-

رب هب لی من الصالحین ○ (صافات پ ۲۳)

”اے میرے رب! مجھے صالح لڑکا عطا کر۔“

(د) حضرت لوطؑ نے شریروں کے مقابلے میں یوں دعا کی:-

رب انصرنی علی القوم المفسدین ○ (عنکبوت، پ ۲۰)

”میرے پروردگار! شریر و فسادی لوگوں پر میری مدد کر۔“

(ز) حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام نے خانہ کعبہ بنایا تو یہ دعا مانگی:-

ربنا تقبل منا انک انت السميع العليم ○ (پ ۱)

”اے ہمارے پروردگار! ہم سے (یہ عمل) قبول فرما۔ بے شک تو دعاؤں کا سننے والا (اور)

نیقوں اور کیفیتوں کا) جاننے والا ہے۔“

(ح) حضرت یوسفؑ کے سب مقاصد بر آچکے تو خاتمہ بالخیر کے لیے یوں دعا کی:-

رب قد اتيتنی من الملك و علمتني من تاويل الاحاديث فاطر السموات

والارض انت ولي في الدنيا والاخرة توفني مسلماً والحقني بالصلحين

○ (یوسف، پ ۱۳)

”اے میرے مالک و پروردگار! تو نے مجھے کسی قدر حکومت بھی بخشی ہے اور تو

نے مجھے خوابوں کی تعبیر کا علم بھی بخشا ہے۔ اے آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے

تو ہی میرا مددگار ہے، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، مجھے مسلمانی کی حالت میں مارنا اور

زمرہ صالحین سے ملا دینا۔“

اس سے پہلے نفسانی ابتلاء سے بچنے کے لیے یوں دعا کی:- رب السجن احب

الی مما يدعوننی الیه (یوسف، پ ۱۲)

”اے میرے پروردگار! مجھے قید بہت پسند ہے۔ اس (برائی) سے جس کی طرف

مجھے یہ عورتیں بلاتی ہیں۔“

(ط) جب بنی اسرائیل، فرعون کے مظالم سے تنگ آ گئے تو حضرت موسیٰؑ نے ان کو

صرف خدا پر بھروسہ کرنے کا حکم دیا، جس پر انہوں نے یہ دعا مانگی:-

ربنا لا تجعلنا فتنة للقوم الظلمين، و نجنا برحمتك من القوم الكافرين

○ (یونس، پ ۱۱)

”اے ہمارے مالک و پروردگار! ہم کو ظالم لوگوں کا تختہ مشق نہ بنا اور ہمیں اپنی رحمت سے ان کافر لوگوں سے نجات دے۔“

(۱) حضرت داؤدؑ کی بابت ذکر کیا۔ فاستغفر ربہ و خیر راکعاً و اناب ○ (ص) ۲۲
”اس نے استغفار کیا اپنے رب سے اور گرجا جھک کر اور رجوع کیا۔“

(۲) حضرت سلیمانؑ کی دعایوں بیان فرمائی۔ رب اغفر لی و ہب لی ملکاً لا یغنی لاحد من بعدی انتک انت الوہاب ○ (ص) پ ۲۳

”اے میرے رب! مجھے بخش دے اور مجھے عطا کر ایسی بادشاہی کہ نہ لائق ہو کسی کو میرے بعد بے شک تو بڑا بخش کرنے والا ہے۔“

(۳) حضرت ایوبؑ کی سخت مصیبت و بیماری کے وقت کی دعایوں بیان فرمائی۔
وایوب اذ نادى ربہ انی مسنی الضر و انت ارحم الراحمین ○ (انبیاء) پ ۱۴

”اور ایوبؑ جب پکارا اس نے اپنے رب کو کہ مجھے سخت تکلیف پہنچی ہے اور تو سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔“

(۴) حضرت یونسؑ کی دعا کی قبولیت کے متعلق فرمایا۔ لو لا ان تدارکہ نعمۃ من ربہ لیلبد بالعرء و هو منعموم فاجتبہ ربہ فجعلہ من الصالحین ○ (ن) پ ۲۹

”اگر نہ سنبھالنا اسے احسان تیرے رب کا تو پھینکا رہتا پھیل میدان میں برے حال میں پس قبول کیا اسے اس کے رب نے اور بنا دیا اسے نیکوں سے۔“

(۵) حضرت زکریاؑ کی بیٹے کی طلب کے لیے دعایوں ہے۔ رب لا تذرنی فرداً و انت خیر الوارثین ○ (انبیاء) پ ۱۷

”اے میرے رب! نہ چھوڑ مجھے اکیلا اور تو بہتر وارث ہے۔“

(۶) حضرت عیسیٰؑ نے نزول ماندہ کے لیے یوں دعا کی۔
اللہم ربنا انزل علینا مائدہ من السماء تکون لنا عیداً لا ولنا و اخرنا وایۃ منک و ارزقنا و انت خیر الرازقین ○ (ماندہ) پ ۷

”اے اللہ ہمارے رب! اتار ہم پر ایک خوان آسمان سے جو ہمارے پہلے اور پچھلوں کے لیے عید ہو اور تیری طرف سے نشانی ہو اور روزی دے ہم کو اور تو بہتر روزی دینے والا ہے۔“

یہ وہ دعائیں ہیں۔ جو قرآن شریف میں انبیاء سابقین کی مذکور ہیں اور یہ مندرجہ ذیل حاجات کے متعلق ہیں۔ ”گناہ کی معافی کے لیے“ دشمنوں کے شر سے بچنے کے لیے“ اولاد کی طلب کے لیے“ عمل کی قبولیت کے لیے“ بیماری سے شفا پانے کے لیے“ مصیبت سے نجات پانے کے لیے“ کشتی سے سلامت پار اترنے کے لیے“ خاتمہ بالخیر کے لیے“ حصول ملک کے لیے اور طلب رزق کے لیے۔“

انہی میں سے اکثر وہ امر ہیں جن میں لوگ عموماً ”شرک کرتے ہیں“ غیر اللہ کو پکارتے ہیں“ غیروں کی نذریں مانتے ہیں“ ان کے نام کے ورد کرتے“ ان کو حاضر ناظر جان کر ان سے فریاد کرتے“ ان کے نام کے چڑھاوے چڑھاتے“ ان کی جگہوں اور مزاروں کے لیے سفر کی صعوبتیں اٹھاتے اور وہم کے پتلے بننے ہیں۔ ان سب میں اس امر کے التزام میں کہ سب انبیاءؑ نے اپنی حاجت کے وقت صرف اللہ تعالیٰ سے دعا کی۔ اس بات کی دلیل ہے کہ امت کے لوگوں کو بھی یہ حاجتیں پیش آئیں تو وہ بھی صرف اللہ تبارک و تعالیٰ کو پکاریں“ کیوں کہ وہ رب العلمین ہے۔ پس جو اللہ کو اپنا رب سمجھے گا“ وہ شرک کبھی نہیں کرے گا۔“

اسی طرح حضور اکرم ﷺ کو جن دعاؤں کی تعلیم دی۔ وہ بھی لفظ ”رب“ سے شروع ہوتی ہیں۔ مثلاً ”فرمایا:-

(۱) و قل رب اعوذ بک من همزات الشیطین و اعوذ بک رب ان یحضرین ○ (پ ۱۸)

”اور کہہ اے میرے مالک و پروردگار! میں تیری پناہ لیتا ہوں“ شیطانوں کی چھیڑوں سے اور اے میرے پروردگار! میں اس سے بھی تیری پناہ چاہتا ہوں کہ وہ میرے پاس بھی چمک سکیں۔“

(۲) و قل رب اغفر وارحم و انت خیر الراحمین ○ (مومنون پ ۱۸)

”اور کہہ اے میرے مالک و پروردگار! بخش دے اور رحمت فرما اور تو سب سے بہتر رحم کرنے والا ہے۔“

(۳) قل اعوذ برب الفلق ○ (پ ۳۰) ”کہ پناہ لیتا ہوں میں (انقلاب) صبح کے مالک کی۔“

(۴) جنگ بدر میں نبی مکرم ﷺ اپنے تین سو تیرہ جان نثاروں کی جو حوصلہ افزائی فرمائی۔ اس کی بابت فرمایا:-

لَا تَقُولُ لِلْمُؤْمِنِينَ اِنْ يَكْفِيَكُمْ اِنْ يَمْدَكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلَاثَةِ اَلْفٍ مِنَ الْمَلٰئِكَةِ مُنْزَلِينَ ○ (آل عمران، پ ۴)

”(اے پیغمبر ﷺ! وہ وقت بھی یاد کرو) جب تم مومنوں سے فرماتے تھے کہ کیا تم کو کافی نہیں کہ تمہارا پروردگار تین ہزار فرشتے نازل کر کے تمہاری مدد کرے۔“

اور مومن نزولِ امداد کے لیے اپنے پروردگار سے جو التجائیں کرتے تھے۔ اس کا نقشہ یوں کھینچا ہے۔ اِذْ تَسْتَغِيثُونَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابْ لَكُمْ ○ (افعال، پ ۹) ”یاد کرو جب تم اپنے رب سے فریاد کرتے تھے تو وہ تمہاری فریاد کو پہنچا۔“

غرض قرآن شریف میں جملہ قسم کی دعاؤں میں اللہ تعالیٰ کو اسم ”رب“ سے پکارنا مذکور ہے اور ان دعاؤں اور التجاؤں سے اسم ”رب“ کو یہ مناسبت ہے کہ گناہوں کی معافی کے معنی یہ ہیں کہ غضب سے امان دی اور یہ نوازش ہے۔ اولاد کا دینا اور شر سے محفوظ رکھنا، ملک و دولت کا عطا کرنا، اِیذاء و مصائب سے نجات دینا، کشتی سے سلامت پار اتارنا، رزق میں کشائش کرنا، جنگ میں فتح دینا وغیرہ وغیرہ سب امور مذکورہ بالا اسی سلسلہ تربیت کی کڑیاں ہیں اور یہ سب امور رب العالمین کے ہاتھ میں ہیں۔ ان کی بندش و کشائش اسی کے قبضے میں ہے۔ ان سب میں اسی کو پکارنا اور اسی پر جھے رہنا توحید الہیت ہے۔ جس کی بنا توحید ربوبیت ہے۔ چنانچہ اسی معنی میں فرمایا:-

۱۔ اِنِ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ○ (احقاف، پ ۲۶) ”جن لوگوں نے کہا رب ہمارا اللہ ہے پھر وہ مستقیم رہے، یعنی جھے رہے اور قائم رہے۔ ان کو نہ تو کسی قسم کا خوف ہو گا اور نہ وہ غم کھائیں گے۔“

۲۔ اِنِ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَنْزِلُ عَلَیْهِمُ الْمَلٰئِكَةُ اِنْ لَا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشُرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِیْ كُنْتُمْ تُوعَدُوْنَ ○ (حم سجدہ، پ ۲۴)

”بے شک جن لوگوں نے کہا رب ہمارا اللہ ہے پھر وہ مستقیم رہے۔ ان پر پے درپے فرشتے نازل ہوتے رہیں گے کہ تم نہ تو کوئی خوف کرو اور نہ کچھ غم کھاؤ بلکہ اس جنت سے خوش ہو جاؤ، جس کا تم کو دنیا میں وعدہ دیا جاتا تھا۔“

غرض اس ساری طویل تحریر سے یہ ہے کہ اللہ وہ ہو سکتا ہے جو رب العالمین ہو، تاکہ اس کی ربوبیت کے آگے پرستش کی گردنیں جھک جائیں یا جھک سکیں اور چونکہ رب العالمین ذات برحق کے سوا دیکر کوئی نہیں، اس لیے کوئی دوسرا الہ بھی نہیں ہو سکتا۔ پس رب العالمین توحید الوہیت یا توحید عبادت کی بڑی بھاری دلیل ہے۔ تم والحمد للہ (میر)

توحید الوہیت سے پہلے خدا تعالیٰ کی ہستی کی بحث ہے اور یہ اس سے بھی نازک تر ہے کیوں کہ جب ”خدا کی ہستی“ مان لی جائے تو پھر اس کی وحدانیت زیر سوال نہیں رہتی۔ جہاں تک ہمارا مطالعہ ہے جتنی کتابوں کو آسانی اور الہامی سمجھا جاتا ہے۔ ان میں قرآن شریف ہی ایک ایسی کتاب ہے جس میں ہستی باری تعالیٰ کا مسئلہ مستقل طور پر نہایت کثرت سے اور نہایت واضح و زبردست دلائل سے بیان کیا گیا ہے۔ دیگر کتابوں میں یا تو اس کو چھوا ہی نہیں ہے یا ان سے استنباط ”یا ضمننا“ نکال لیں تو دوسری بات ہے۔ پھر یہ کہ قرآن شریف نے اس کی ہر شق پر سیر حاصل بحث کی ہے اور منکرین کے اوہام و شبہات کے دندان شکن جواب بھی دیئے ہیں۔ غرض اس مسئلے کو ہر طرح سے تمام و کمال بیان کیا ہے۔ اس کی مفصل بحث ہم نے دوسرے پارے کی آیت ان فی خلق السموات والارض-----الآیۃ میں کر دی ہے۔ اس جگہ صرف یہ مقصود ہے کہ قرآن شریف نے ملحدین (دہریوں اور مادہ پرستوں) کے مقابلہ میں اسی صفت رب العالمین سے ”خدا کی ہستی“ کا استدلال کیا ہے۔

اس کی توضیح اس طرح ہے کہ فرعون محض بے رحم، ظالم و سفاک ہی نہیں تھا بلکہ وہ نہایت درجے کا چالاک دہریہ بھی تھا۔ ایک تھوڑے سے علاقے یعنی سرزمین مصر کی حکومت پر غرہ ہو کر خود خدائی کا مدعی بن بیٹھا تھا۔ انا ربکم الاعلیٰ (نازعات) پ (۳۰) ”میں تمہارا سب سے اعلیٰ رب ہوں۔“ کی ہوائیاں چھوڑتا اور لوگوں کو اپنی عبادت پر مجبور کرتا تھا۔ چنانچہ اس نے لوگوں سے کہا۔ ما علمت لکم من الہ غیری (قصص) پ (۲۰) ”لوگو! مجھے تو اپنے سوا تمہارا کوئی معبود معلوم نہیں۔“ موسیٰ کہاں سے کہتا ہے کہ کوئی رب العالمین بھی ہے۔ خوش آمدی درباری ماننے کو تیار تھے، جس سے فرعون کا دماغ ایک بانس اور چڑھ گیا۔

اللہ تعالیٰ نے فرعون کے دماغ سے یہ ہوا نکالنے کے لیے اور اس پر حجت پوری کرنے کے لیے حضرات موسیٰ و ہارون علیہما السلام کو فرمایا۔ فاتیا فرعون فقولانا رسول رب العلمین (شعراء پ ۱۹) ”تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ اور اس سے کہو کہ ہم رب العالمین کے رسول ہیں۔“

حضرت موسیٰؑ نے اس حکم کی تعمیل میں فرعون سے کہا۔ یا فرعون انی رسول من رب العلمین ”اے فرعون! بے شک میں رب العالمین کا رسول ہوں۔“ چلاک فرعون نے بھولا بن کر کہا۔ ومارب العلمین (شعراء پ ۱۹) ”رب العالمین کیا شے ہے؟“ یہ سوال ایسا تھا کہ گویا اس کے ضمیر میں رب العالمین کے اقرار کی آواز ہے ہی نہیں۔ نہ تو اسے اپنی پیدائش و پرورش نظر میں ہے اور نہ اس طرف توجہ ہے کہ اتنے بڑے عالم بالا و زیریں، آسمان و زمین، خشکی و تری اور عالم جو کی مخلوقات کا کوئی خالق، کوئی مالک، کوئی مدبر و محافظ اور کوئی پروردگار بھی ہے اور ہونا چاہیے۔ آخر اتنا بڑا کارخانہ بغیر کسی مدبر و ناظم کی تدبیر و انتظام کے کس طرح قائم و جاری ہے۔ حضرت موسیٰؑ کے صرف رب العالمین کہنے میں یہ باتیں آگئی تھیں اور اس میں فرعون کے لیے کافی سوجھ تھی لیکن بجائے اس کے کہ فرعون قابل بحث امر یعنی رسالت موسیٰؑ کو بحث میں لائے، انا ہو کر چلا اور ذات برحق رب العالمین کی ہستی کو جو زیر سوال نہیں ہو سکتی تھی، مشتبہ کرنے بلکہ اس کی نفی کرنے کے لیے ”ما؟“ سے سوال کر دیا جو اس کی نسبت ہو نہیں سکتا کیوں کہ کلمہ ”ما“ سے اس شے کی نسبت سوال ہوتا ہے۔ جس کی حقیقت میں شمول و فصل ہو یعنی اس کی حقیقت میں ایک جز ایسا ہو جو دیگر کئی ایک میں پایا جائے اور ایک جز ایسا ہو جو اسے دوسروں سے متمیز کر دے۔ مثلاً ”اگر انسان کی ماہیت کے متعلق سوال کریں کہ الانسان ماہو؟ یعنی انسان کیا شے ہے؟۔ یا یہ کہ انسان کی ماہیت کیا ہے؟۔ تو جواب ہو گا۔ ہو حیوان ناطق یعنی وہ مدبرک جزئیات و کلیات زندہ ہستی ہے، اس کا ایک جزو حیوان میں بھیڑ، بکری وغیرہ دیگر جانور بھی شامل ہیں لیکن دوسرا جزو ناطق اسے ان سب سے متمیز کر دیتا ہے اور ظاہر ہے کہ ذات برحق ترکیب و شمول سے پاک ہے کیوں کہ اگر وہ بھی ترکیب و شمول کے ماتحت ہو تو وہ بھی منجملہ عالم کے ایک ہوگی اور اس کے لیے بھی کسی ترکیب دینے والے اور پرورش کرنے والے کی ضرورت

ہوگی۔ وہلم جرح^۱ اور یہ بالکل باطل ہے۔

۲۸ چنانچہ حکیم بہمن یار مابعد الطبیعہ میں فرماتے ہیں۔ فالواجب الوجود بذاتہ لاعلۃ لہ ”ذات حق جو بذات خود واجب الوجود ہے“ اس کی کوئی علت نہیں۔“ اس لیے حضرت موسیٰؑ نے فرعون کے سوال کو کاٹ دیا کہ ذات رب العالمین کی بابت ما؟ سے سوال نہیں ہو سکتا بلکہ اس کا اقرار ہر فطرت میں مرکوز ہے اور اگر وہ آواز حجابات کے بوجھ سے دب گئی ہو تو اسے خواص لازمہ اور آثار افعال قدرت سے پہچان سکتے ہیں۔ کیوں کہ فعل بغیر فاعل کے نہیں ہو سکتا اور اس کائنات کو عالم اسی لیے کہتے ہیں کہ اس سے اس کے خالق و مدبر کی ہستی کا علم حاصل ہوتا ہے اور یہ عالم بلکہ اس کا ذرہ ذرہ اس کی ہستی کی کافی علامت ہے۔ لان العالم ما یعلم بہ کالحاتم ما یختم بہ کما مر اور اسی نظر سے اس ذات برحق کو میں (موسیٰؑ) نے رب العالمین کہہ کر پکارا ہے کہ وہ سارے عالم کا رب ہے، جس کا ہونا ضروری ہے۔ غرض حضرت موسیٰؑ نے ان سب باتوں کو ملحوظ رکھ کر زمین و آسمان اور ان کی درمیانی کائنات کی ربوبیت اور ان کے باقاعدہ انتظام و تدبیر سے استدلال کر کے کہا۔ رب السموات والارض وما بینہما (شعراء) پ ۱۹) ”وہ جو آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے“ ان سب کا رب ہے۔“ فرعون نے اس پر جرح کی تو آپؑ نے جواب دیا۔ ربکم ورب ابائکم الاولین ”تمہارا بھی رب اور تمہارے پہلے باپ دادوں کا بھی رب ہے۔“ فرعون نے پھر جرح کی تو آپؑ نے جواب میں فرمایا۔ رب المشرق والمغرب وما بینہما ان کنتم تعقلون ”وہ مشرق و مغرب اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے“ ان سب کا رب ہے۔ اگر تم عقل کرو تو سمجھ سکتے ہو۔“

ان آیتوں کی پوری تفسیر و توضیح اور حضرت موسیٰؑ کے جواب کی تنقیح انشاء

۲۸ حکیم ارسطو کے شاگرد حکیم زیون کبیر، معلم ثانی ابو نصر فارابی اور حکیم بہمن یار کے رسائل میں اس قسم کی عبارتیں بہت ہیں کہ ذات حق بذات خود موجود و قائم ہے اور اس کی کوئی علت نہیں اور دیگر سب کا وجود و بقاء اس کے حکم و سارے سے ہے اور اس کی نسبت مابیت کا سوال نہیں ہو سکتا۔

اللہ سورہ شعراء پ ۱۹ میں ان آیتوں کے موقع پر کی جائے گی۔ لیکن اس وقت ہم صرف یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ موسیٰؑ نے دھریہ کے جواب میں خدا کی ہستی کے ثبوت میں مصنوعات قدرت میں شان ربوبیت ہی کا جلوہ دکھایا ہے۔ پہلے جواب میں یہ بتایا ہے کہ اس کی ربوبیت زمین و آسمان اور ان دونوں کے درمیان یعنی ہر مکان علوی و سفلی اور درمیانی میں جلوہ گر ہے۔ دوسرے میں یہ بتایا ہے کہ اس کی ربوبیت ہر زمانے میں بھی ہے۔ پہلے زمانے میں بھی اور موجودہ میں بھی اور تیسرے میں سمجھایا ہے کہ اس کی ربوبیت جس طرح ہر مکان و ہر زمان میں ہے۔ اسی طرح اوضاع غیر متناہیہ میں بھی ہے کیوں کہ مشرق و مغرب اوضاع غیر متناہیہ ہیں۔ (عزیزی)

اس پر فرعون بند ہو جاتا ہے اور منجھوٹے۔

چو حجت نمائد جفا جوئے را

پہر خاش درہم کشد روئے را

کھیاٹا ہو کر کہتا ہے۔ لئن اتخذت الہا غیرى لا جعلنک من المسجونین (شعراء پ ۱۹) ”(اے موسیٰؑ) اگر تو نے میرے سوا کسی اور کو معبود گردانا تو میں ضرور ضرور تجھے قیدیوں میں (داخل) کر دوں گا۔“ حضرت موسیٰؑ بقاعدہ ”آہن را باہن باید کوفت“ اس کے جواب میں لاشی دکھاتے ہیں۔ جو ایک خونخوار اژدھا کی صورت میں نمودار ہو کر فرعون کا سار زور توڑ دیتی ہے۔ فرعون اسے جادو اور طلسم قرار دیتا ہے اور اپنے ملک کے تمام علم والے تجربہ کار جادوگروں کو مقابلہ کے لیے جمع کرتا ہے۔ جادوگر مغلوب ہو کر پکار اٹھتے ہیں۔ امنا رب العالمین رب موسیٰ و ہرون ”ہم رب العالمین پر ایمان لے آئے“ وہ رب العالمین جس کا پتہ موسیٰؑ اور ہارون

”دیتے ہیں۔“ اس وقت جادوگروں نے بھی رب العالمین ہی کہہ کر پکارا۔ (مستفاد از فصوص الحکم و تفسیر رحمانی)

الغرض شہادت فطرت کے بعد، صفت رب العالمین خدا کی ہستی اور توحید کی سب سے بڑی اور سب سے زبردست دلیل ہے کہ اسی کے فیض سے جملہ کائنات قائم ہے اور اسی کے کرم سے یہ سارا سلسلہ چل رہا ہے۔ کافر کو شاکر بنانے، بھولے ہوئے

منکر کو اس کا خالق و رازق منوانے اور اس کے دل میں جذبہ عقیدت و محبت پیدا کرنے کے لیے سب سے بڑھ کر موثر یہی شان ربوبیت ہے۔ شان رحمانی و رحیمی (جس کا ذکر اس کے بعد آتا ہے) کا آئینہ بھی یہی ہے۔

پھر اپنے نفس سے گزر کر دیگر کائنات کے ذرے ذرے میں نظر کریں تو اسی کے جمال کا مشاہدہ ہوگا۔ چنانچہ فرمایا:-

وفی الارض ایت للموقنین، وفی انفسکم افلا تبصرون ○ (ذاریات، پ ۲۶) ”یقین والوں کے لیے زمین میں بھی کئی نشان ہیں بلکہ تمہارے اپنے نفوس میں بھی ہیں۔ تو کیا تم دیکھتے نہیں ہو؟“

ربوبیت عامہ کے یہ وہ احسانات ہیں جو براہ راست خدا تعالیٰ سے بارش کی طرح برس رہے ہیں اور ان میں کسی دیگر کا خیال و وہم تک نہیں آسکتا۔ پس ان احسانات کی یاد اس محسن کے سامنے اہل دل کی گردنیں بھی جھکا دیتی ہے اور شرک کے نزدیک بھی پھٹکنے نہیں دیتی۔ (میر)

دین حق کا دوسرا اعتقادی رکن نبوت ہے۔ اس کے لیے بھی اسی ربوبیت عامہ سے استدلال کیا ہے۔ حضرت آدمؑ کے دیر بعد جب گمراہی پھیل گئی اور لوگوں نے صالحین کے بت بنا کر ان کی پوجا شروع کر دی، راحتوں کے حاصل کرنے اور مصائب سے نجات پانے کے لیے ان کو پکارنے لگے تو اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلا رسول جو مبعوث کیا۔ وہ حضرت نوحؑ ہیں۔ ان کی قوم نے اس خیال سے کہ ہمارا موجودہ طریقہ پرانا چلا آیا ہے، النّا حضرت نوحؑ کو گمراہ قرار دیا۔

چنانچہ فرمایا:- و قال الملا من قومہ انا لشرك فی ضلل مبین ○ قال یقوم لیس بی ضلالة و لکنی رسول من رب العالمین ابلغکم رسالت ربی و انصح لکم و اعلم من اللہ ما لا تعلمون، او عجبتم ان جاءکم ذکر من ربکم علی رجل منکم لینذرکم و لتتقوا و لعلکم ترحمون ○ (اعراف، پ ۸)

”اس کی قوم میں سے سرداروں نے کہا کہ ہم تو تجھ کو صریح گمراہی میں دیکھتے ہیں۔ (نوحؑ نے) کہا۔ اے میری قوم مجھ میں تو گمراہی (کی کوئی بات) نہیں۔ بلکہ میں تو پروردگار عالم کا رسول ہوں۔ تم کو اپنے پروردگار کے پیغامات پہنچاتا ہوں اور تمہاری خیر

خواہی کرتا ہوں اور میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ کیا تم کو تعجب ہوا کہ تم کو تمہارے رب کی طرف سے تم ہی میں سے ایک شخص کے ہاتھ پر نصیحت آئی تاکہ وہ تم کو خطرات سے آگاہ کرے اور تم تقویٰ اختیار کرو اور خدا کی رحمت میں آ جاؤ۔“

اس مختصری تقریر میں تین دفعہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت مذکور ہے اور اظہار دعویٰ میں صفت ”رب العالمین“ کا ذکر ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت نوحؑ نے رب العالمین کی تربیت جتا کر ان کی گردنوں کو جھکانا چاہا ہے لیکن وہ لوگ سرکشی میں بڑھ گئے اور کفر و شرک پر اڑ بیٹھے تو ان پر ایک عالمگیر عذاب آیا۔ جس سے سوائے معدودے چند مومنین کے تمام ہلاک ہو گئے۔

حضرت نوحؑ کے بعد بہت لمبا زمانہ گزر گیا اور لوگ پھر گمراہ ہو کر شرک کرنے لگے تو اللہ تعالیٰ نے قوم عاد میں حضرت ہودؑ کو مبعوث کیا۔ لوگوں نے کہا تم کو کچھ عقل ہی نہیں۔ کیوں کہ لوگ ذہنیت کی کجی سے شرک کو نہایت معقول بات سمجھے ہوئے تھے۔ اس پر نبی اللہ نے اسی صفت رب العالمین کو پیش کر کے ظاہری تربیت سے باطنی تربیت پر استدلال کیا۔ چنانچہ ارشاد ہے:-

قال يقوم ليس بى سفاهة ولكنى رسول من رب العالمين ابلغكم رسلى ربي وانا لكم ناصح امين او عجبتم ان جاءكم ذكر من ربكم على رجل منكم لينذركم واذكروا اذ جعلكم خلفاء من بعد قوم نوح وزادكم فى الخلق بصطة فاذكروا الله لعلكم تفلحون ○ (اعراف، پ ۸)

”حضرت ہودؑ نے کہا، اے میرے بھائیو! مجھ میں تو کسی قسم کی نادانی نہیں ہے بلکہ میں تو رب العالمین کا فرستادہ ہوں۔ تم کو اپنے پروردگار کے پیغامات پہنچاتا ہوں اور میں تمہارے لیے امانت دار، خیر خواہ ہوں۔ کیا تم کو تعجب ہوا کہ آئی تم کو نصیحت تمہارے رب کی طرف سے تم میں سے ایک شخص کے ہاتھ پر کہ تم کو خطرات پر آگاہ کرے اور تم وہ وقت بھی یاد کرو، جب تم کو نوحؑ کی قوم کے بعد (زمین میں) مختار کیا اور زیادہ کیا تم کو بدن کے پھیلاؤ میں۔ پس تم خدا کی نعمتیں یاد کرو تاکہ تم نجات پاؤ۔“

یہ لوگ بھی اپنی ضد پر اڑے رہے اور عذاب الہی سے تباہ ہوئے۔ مگر جو ایمان

لائے تھے، بچا لے گئے۔ بہت مدت بعد پھر شرک پھیل گیا تو اللہ تبارک و تعالیٰ نے قوم ثمود میں سے حضرت صالحؑ کو مبعوث کیا۔ انہوں نے لوگوں سے یوں خطاب کیا:-
 اَعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِنْ اِلٰهِ غَيْرِهٖ ۚ قَدْ جَاءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ (اعراف، پ ۸)
 ”اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو کیوں کہ اس کے سوا کوئی بھی تمہارا (سچا) معبود نہیں ہے۔ بے شک تم کو پہنچ چکی ہے تمہارے رب کی طرف سے روشن دلیل۔“
 اور جب یہ لوگ بھی کفر پر مصر رہے اور ان پر بھی عذاب آیا تو حضرت صالحؑ از روئے تحسر کہنے لگے:-

يَقُومُ لَقَدْ اَبْلَغْتُمْ رِسَالَاتِ رَبِّیْ وَ نَصَحْتُ لَكُمْ وَلٰكِنْ لَا تُحِبُّونَ النَّاصِحِيْنَ
 (اعراف، پ ۸)

”اے میری قوم! میں تو تم کو اپنے رب کا پیغام پہنچا چکا اور تمہاری خیر خواہی بھی کر چکا لیکن تم تو نصیحت کرنے والوں کو پسند ہی نہیں کرتے۔“
 ان ہر دو آیات میں بینہ اور رسالت کو اسم ”رب“ کی طرف مضاف کیا ہے۔
 پھر حضرت شعیبؑ کے ذکر میں فرمایا کہ انہوں نے اپنی قوم سے کہا:-
 يَقُومُ اَعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِنْ اِلٰهِ غَيْرِهٖ ۚ قَدْ جَاءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ (اعراف، پ ۸)

”اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو۔ اس کے سوا تمہارا کوئی بھی (سچا) معبود نہیں ہے۔ بے شک تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے رشن دلیل آچکی ہے۔“

فَتَوَلّٰی عَنْهُمْ وَقَالَ يٰۤاَقْرَبُ مَوْضِعَ سَعٰدٍ لِّمَنْ اٰتٰی اللّٰهَ رِضًا ۚ وَقَالَ اَقْرَبُ مَوْضِعَ سَعٰدٍ لِّمَنْ اٰتٰی اللّٰهَ رِضًا ۚ وَقَالَ اَقْرَبُ مَوْضِعَ سَعٰدٍ لِّمَنْ اٰتٰی اللّٰهَ رِضًا ۚ
 اِسْمٰی عَلٰی قَوْمٍ کٰفِرِيْنَ ۝ (اعراف، پ ۹)

”پس (حضرت شعیبؑ) ان سے پرے ہٹ گئے اور کہنے لگے۔ اے میری قوم! میں نے تمہیں اپنے رب کے پیغامات پہنچا دیئے ہیں اور تمہاری خیر خواہی کی ہے۔ پس (اب) میں منکر لوگوں پر کیسے افسوس کروں۔“
 انہوں نے بھی دلیل میں ربوبیت کو ہی پیش کیا ہے۔ اسی طرح سورہ شعراء میں مسلسل طور پر حضرت موسیٰؑ، ابراہیمؑ، نوحؑ، ہودؑ، صالحؑ، لوطؑ اور شعیبؑ میں سے ہر ایک

کے بیان میں اسم ”رب العالمین“ صریحاً مذکور ہے اور اسی سورت میں ضمنی طور پر بسلسلہ ذکر قیامت مذکور ہے کہ مشرکین دوزخ میں پڑے ہوئے اپنے باطل معبودوں سے کہیں گے۔ **ثَلَاثَةٌ اِنْ كُنَّا لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ اِذْ نَسُوْكُمْ رَبَّ الْعَالَمِيْنَ (شعراء، پ ۱۹)** ”خدا کی قسم ہم صریح گمراہی میں تھے کہ تم کو رب العالمین کے برابر سمجھتے تھے۔“ پھر سب کے بعد خاتمہ سورت کے قریب آنحضور ﷺ کی نبوت کے متعلق جو اصل مقصود ہے۔ قرآن شریف کی بابت فرمایا۔ **وَ اِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ** ”بے شک یہ قرآن شریف رب العالمین کا اتارا ہوا ہے۔“

اب اس سورت کے شروع کو بھی دیکھئے کہ اس میں فرمایا:۔ **اولم یروا الی الارض کم ابنتنا فیہا من کل زوج کریم ان فی ذلک لایۃ و ما کان اکثرہم مومنین** ○ (شعراء، رکوع اول)

”کیا ان لوگوں نے زمین کی طرف نظر نہیں کی کہ ہم نے اس میں کتنی عمدہ عمدہ اجناس پیدا کی ہیں۔ بے شک (ان کے لیے) اس میں (بڑا بھاری) نشان ہے لیکن اکثر ان میں سے ایماندار نہیں ہیں۔“

دیکھئے شروع میں زمین کی عمدہ عمدہ پیدائشیں ذکر کی ہیں، جو خدا کی ربوبیت عامہ کی ایک صورت ہے اور توجہ دلائی ہے کہ مکررین نبوت کے لیے اس میں بھاری نشان ہے پھر اس کے بعد مسلسل طور پر کئی ایک پیغمبروں کا ذکر کیا ہے اور ہر ایک کے ذکر میں اپنے رب العالمین ہونے کا ذکر کیا اور خاتمہ پر اصل مقصود یعنی نبوت محمدیہ کا ذکر بھی اسی صفت رب العالمین کو یاد دلا کر کیا ہے۔ (سبحان اللہ) اور اس کے علاوہ دوسرے مواقع پر بھی اسے نہیں بھلایا۔ چنانچہ سورۃ الم سجدہ میں فرمایا۔ **تَنْزِیْلُ الْکِتَابِ لَا رَبَّ فِیْہِ مِنْ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ** ○ یعنی ”اس کتاب کا اتارنا جس میں شک کی کوئی بات نہیں ہے۔ رب

۲۹؎ گو بظاہر دینیوی روزی کی کفالت مراد ہے لیکن چونکہ دوسرے مقامات پر انہی انبیاء کے ذکر میں ربوبیت کو مقام نبوت میں پیش کیا ہے۔ جیسا کہ پہلے نقل ہو چکا ہے اس لیے یہاں بھی اس کا لحاظ ہے۔

العالمین کی طرف سے ہے۔“

نیز سورۃ واقعہ پارہ ۲۷ اور سورۃ حاقہ پارہ ۲۹ میں فرمایا:۔ تنزیل من رب العالمین یعنی ”یہ قرآن کریم رب العالمین کا اتارا ہوا ہے۔“

اسی طرح سورۃ یونس میں فرمایا:۔ و تفصیل الکتاب لا رب فیہ من رب العالمین (پ ۱۱) ”(یہ قرآن) کتاب اللہ کی تفصیل ہے۔ جس میں کوئی شک (کی بات) نہیں ہے۔ رب العالمین کی طرف سے نازل ہوا ہے۔“

نیز فرمایا:۔ یا ایہا الناس قد جاءکم برہان من ربکم وانزلنا الیکم نوراً مبیناً (النساء، پ ۶) ”اے لوگو! تم کو تمہارے پروردگار کی طرف سے برہان یعنی واضح دلیل آچکی اور ہم نے تمہاری طرف نور مبین (قرآن کریم) بھی نازل کیا ہے۔“

نیز فرمایا:۔ یا ایہا الناس قد جاءکم الرسول بالحق من ربکم فامنوا خیر الکم (النساء، پ ۶) ”اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کا پیغمبر آچکا ہے۔ پس (اس پر) ایمان لے آؤ، تمہارے لیے بہتر ہوگا۔“

اسی طرح اور آیات بھی بکثرت ہیں۔ جن میں تنزیل قرآن اور رسالت محمدیہ کے ذکر میں صفت ربوبیت مذکور ہے۔ تو اس سارے سلسلے سے ایک ہوش مند آدمی بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ متکلم قرآن (اللہ تبارک و تعالیٰ) کو اپنی عالمگیر ربوبیت اور بعثت انبیاء میں کمال درجے کی مناسبت ملحوظ ہے اور وہ یہ ہے کہ جس خداوند جل و علانے تمہاری جسمانی تربیت کے لیے اتنا بڑا نظام قائم کر رکھا ہے۔ اسی نے تمہاری روحانی و اخلاقی تربیت کے لیے یہ نظام نبوت بھی قائم کیا ہے بلکہ نظام روحانی اصل مقصود ہے اور جسمانی اس کے تابع۔ کیوں کہ اگر روحانی تربیت کا انکار کیا جائے تو شرعی امر و نہی، عقلی حسن و قبح اور نیکی و بدی سب بے اثر اور حیات دنیوی بالکل بے ثمر سمجھی جائے گی اور سارا کارخانہ دنیا عبث و بے کار ہو جائے گا اور یہ بالکل باطل ہے۔

نیز یہ کہ فضائل کا اکتساب اور زائل سے اجتناب ایک بے حقیقت تخیل سمجھا جائے گا اور انسان کو اپنی شرافت سے گر کر بہائم کی قطار میں شامل ہونا پڑے گا پھر انسان اور بہائم میں کوئی تمیز باقی نہیں رہے گی۔ انسان کو محض اس کے بدن کی سیدھی قامت، متناسب اعضاء اور خوب صورت پیکل کی وجہ سے بہائم پر شرف و فضیلت نہیں ہے بلکہ

اصل وجہ شرافت اس کی روحانی قابلیت ہے۔ جس کی وجہ سے وہ اللہ تعالیٰ کے امر و نہی کا حامل قرار دیا گیا۔ جس کا سر آیت انا عرضنا الامانة على السموات والارض والجبال----- الآیة (احزاب، پ ۲۲) میں مستور ہے۔ پس اس کے جسم کی تربیت کے لیے جو بمقابلہ روح کے عارضی ہے۔ اتنا بڑا نظام عالم قائم کرنا اور روح کی پرورش کو جو ہر اصلی ہے، نظر انداز کر دینا بے معنی ہو جائے گا۔ ایحسب الانسان ان یترک سدی ”کیا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ اسے مہمل و بے کار چھوڑ دیا جائے۔“

اسلام کا تیسرا اعتقادی رکن معاد ہے۔ یعنی یہ کہ ہمیں اس زندگی کے بعد اپنے اعمال کی جواب دہی اور جزا و سزا کے لیے اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے ایک دن مقرر کر رکھا ہے۔ جس کے نام یوم القیمہ، یوم الحساب، یوم الدین اور یوم الفصل وغیرہ ہیں۔ نیک لوگ نیک جزا پا کر جنت میں جائیں گے۔ (اللهم ارزقنا) اور برے برائی کا بدلہ دوزخ میں بھگتیں گے۔ (اعاذنا اللہ منھا)

اس مضمون کو اصلانہ تو (انشاء اللہ) آیت مالک یوم الدین کی تفسیر میں بیان کیا جائے گا لیکن یہاں صرف رب العالمین کے ماتحت اتنا بیان کیا جاتا ہے کہ قرآن شریف نے جزا و سزا کے مسئلے میں بھی اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا کثرت سے ذکر کیا ہے۔ اس مضمون جزا و سزا کے عنوانات (ہیڈنگ یا لیڈنگ فیچرز) یہ ہو سکتے ہیں:-

- ۱- اللہ تعالیٰ نے اس کارخانہ دنیا کو عبث نہیں بنایا۔
 - ۲- انسان کے اعمال کا نتیجہ ضروری ہے۔
 - ۳- مالک کا حق ہے کہ اعمال کی باز پرس کرے۔
 - ۴- شاکر و کافر، مطیع و عاصی، محسن و مبینی (نیکو کار و بدکار) میں امتیاز ضروری ہے۔
 - ۵- دنیا میں حق و باطل ملا جلا ہے۔ قطعی فیصلہ سوائے خدائے خلاق کے اور کوئی نہیں کر سکتا۔
 - ۶- حشر اجماع ممکن ہے۔
 - ۷- منکرین کے شبہات اور ان کے جوابات۔
- قرآن شریف میں ان سب عناوین کے بیان میں اسم ”رب“ کا ذکر کثرت سے

ہے۔ چنانچہ ہم ہر ایک کے متعلق بلا رعایت ترتیب بعض آیات نقل کرتے ہیں۔ جن میں اسم ”رب“ خاص طور پر مذکور ہے۔

(۱) سورۃ مومنون، پ ۱۸ میں قیامت کے حساب کتاب کے ذکر کے بعد فرمایا:۔
 افحسبم انما خلقنکم عبثاً و انکم الینا لا ترجعون، فتعالی اللہ الملک الحق، لا الہ الا ہو رب العرش الکرم، و من یدع مع اللہ الہاً اخر لا برہان لہ بہ فانما حسابہ عند ربہ، انہ لا یفلح الکفرون ○

”کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہم نے تم کو بے کار پیدا کیا ہے اور یہ کہ تم ہماری طرف پھر نہ آؤ گے۔ پس اللہ جو سچا بادشاہ ہے۔ (اس سے) بت بلند ہے۔ اس کے سوا کوئی بھی معبود (برحق) نہیں۔ (وہ) عرش بزرگ کا مالک ہے اور جو کوئی خدا کے ساتھ کسی اور معبود کو پکارے گا، جس کی اس کے پاس کوئی دلیل نہیں تو بس اس کا حساب اس کے پروردگار کے پاس ہے۔ بے شک کافر فلاح نہیں پائیں گے۔“

اس میں انسان کو عبث پیدا نہ کرنے اور حساب اعمال کے لیے لفظ رب ذکر کیا

ہے۔

(۲) سورۃ فجر میں قوم عاد و ثمود اور فرعون کے طغیان و سرکشی اور دنیا میں ان کے فساد کا ذکر کر کے فرمایا۔ فصب علیہم ربک سوط عذاب ○ ان ربک لبالمرصاد ○ (فجر، پ ۳۰) ”پس ان پر تیرے رب نے کوڑا عذاب کا پھینکا“ بے شک تیرا رب (نافرمانوں کی) ناک میں ہے۔“

اسی طرح سورۃ حاقہ میں بھی قوم لوطؑ وغیرہ اور انہی کفار کا ذکر کر کے فرمایا۔ فعصوا رسول ربہم فاخذنہم اخذہ رابیۃ ○ (حاقہ، پ ۲۹) ”پس نافرمانی کی ان سب نے اپنے رب کے رسول کی۔ پس پکڑی ان کو پکڑ دم چڑھتی۔“

اسی طرح سورۃ طلاق میں مجملہ ”کئی ایک گزشتہ قوموں کے بد اعمال کے برے نتیجے کی بابت فرمایا۔ و کاین من قریۃ عنت عن امر ربہا و رسلہ فحاسبنا حساباً شدیداً و عذبنا عذاباً“ نکرا فلنقت و بال امرہا و کان عاقبہ امرہا خسراً ○ (پ ۲۸) ”اور بت بستیاں ہو گزریں جنہوں نے اپنے پروردگار اور اس کے رسولوں کے حکم سے سرکشی کی۔ پس ہم نے ان کا بڑی سختی سے حساب لیا

اور ان کو بہت بڑی سزا دی۔ پس چکھا انہوں نے اپنے اعمال کا وبال اور انجام کار ان کو گھانا ہی گھانا ہوا۔“

(۳) انسان پر جب اسباب رفاہیت کی فراوانی ہوتی ہے تو یہ سرکش ہو جاتا ہے۔ مالک حقیقی کے احکام کی پرواہ نہیں کرتا۔ ایسے انسان کو ان لفظوں میں سمجھایا:۔

کَلَا اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهِۦٓ لَکٰذِبٌ ۝ اِنَّ رَآهٖٓ اَسْتَغْنٰی ۝ اِنَّ الٰہِی رِبْکَ الرَّجْعِی ۝ (ملک، پ ۳۰) ”مگر انسان سرکشی کرتا ہے کہ دیکھتا ہے اپنے آپ کو بے نیاز، بے شک تیرے پروردگار کی طرف (ضرور) لوٹ کر آتا ہے۔“

یا ایہا الانسان انک کادح الی ربک کدحا“ فملقیہ ۝ (انشقاق، پ ۳۰) ”اے آدم زاول! تو گھٹ گھٹ کر (آہستہ آہستہ) اپنے رب کی طرف چلا آ جا رہا ہے پھر تو اس سے جا ملے گا۔“

یا ایہا الانسان ما غرک بربک الکریم ۝ الذی خلقک فسواک فعدلک ۝ فی ای صورۃ ماشاء رکبک ۝ کلابل نکنبون بالدین ۝ (انفطار، پ ۳۰) ”اے آدم زاول! تجھ کو کس چیز نے تیرے صاحب کرم مالک سے بھلا دیا۔ جس نے تجھے بنایا تو درست بنایا۔ پھر تیرے جوڑ بند مناسب بنائے۔ (اور) جس وضع قطع پر چاہا، جوڑا مگر بات یہ ہے کہ تم جزا و سزا کو نہیں مانتے۔“

(۴) جان کنی کی بے بسی کا نقشہ کھینچ کر اپنے مالک و صاحب اور پروردگار کی طرف چلنا اس طرح سمجھایا۔

کَلَا اِذَا بَلَغْتَ التَّرَاقِیْ وَ قِیلَ مِنْ رَاقٍ وَ ظُنَّ اِنَّهٗ الْفِرَاقُ ۝ وَ التَّفْتَ السَّاقِ بِالسَّاقِ ۝ الٰہِی رِبْکَ یَوْمُئِذٍ الْمَسَاقُ ۝ (القیامۃ، پ ۲۹)

”سنو جی! جب جان ہنسی تک آپہنچے گی اور لوگ کہنے لگیں گے کوئی جھاڑنے والا ہے؟ اور (بیمار خود) گمان کرے گا کہ بس اب مفارقت (کا وقت) ہے اور پنڈلی۔ پنڈلی سے لپٹ جائے گی۔ اس دن (تجھے) اپنے پروردگار کی طرف چلنا ہو گا۔“

(۵) مومنوں کو جو محاسبہ اعمال اور اپنے رب کے سامنے پیش ہونے کا کھٹکا لگا رہتا ہے۔

اس کی بابت فرمایا۔ الذین یظنون انہم ملقورہم و انہم الیہ راجعون ۝ (پ ۱)

”جن کو کھٹکا لگا رہتا ہے کہ وہ ضرور اپنے پروردگار سے ملنے والے ہیں اور وہ

ضرور اس کی طرف لوٹنے والے ہیں۔“

وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَيَخَافُونَ سُوءَ الْحِسَابِ ○ (رعد، پ ۱۳)

”اور وہ ڈرتے ہیں اپنے رب سے اور خوف رکھتے ہیں برے حساب کا۔“

ان الذين هم من خشية ربهم مشفقون ○ والذين هم بآيات ربهم يومنون ○
والذين هم بربهم لا يشركون ○ والذين يؤتون ما اتوا وقلوبهم وجلة انهم الى
ربهم راجعون ○ (مومن، پ ۱۸)

”تحقیق وہ جو اپنے رب کے جلال سے ڈرتے ہیں اور جو اپنے رب کے احکام پر
ایمان رکھتے ہیں اور وہ جو اپنے رب سے شریک مقرر نہیں کرتے اور وہ جو دیتے ہیں جو
کچھ کہ دے سکتے ہیں اور (اس پر بھی) ان کے دلوں میں جو ڈر لگا رہتا ہے کہ وہ اپنے
پروردگار کی طرف لوٹنے والے ہیں۔“

اننا خاف من ربنا يوما عبوسا قمطريرا ○ (دھر، پ ۲۹)

”ہم کو اپنے رب سے اس دن کا ڈر لگا رہتا ہے۔ جس میں منہ بنانا اور تیوری

چڑھانی پڑے گی۔“

(۶) دنیا میں مذہبی اختلافات بھی موجود ہیں۔ جھوٹے بھی خدای کا نام لے کر ٹھٹھتے ہیں۔
کیس حقوق کا بھگڑا ہے، کیس ظلم و بیداری کا اوپلا ہے، سچ جھوٹ ملا جلا ہے۔ آخر اس
کافیصلہ و انصاف بھی تو ضروری ہے سو اس کی بابت فرمایا:-

ان ربك هو يفصل بينهم يوم القيمة فيما كانوا فيه يختلفون ○ (سجده، پ
۲۱) ”بے شک تیرا رب ہی قیامت کے دن ان میں ان امور کا فیصلہ کرے گا۔ جن میں وہ
اختلاف کرتے رہے۔“

ولا تزروا ردة و زرا اخرى ○ ثم الى ربكم مرجعكم فينبئكم بما كنتم
تعملون ○ (زمر، پ ۲۳)

”اور کوئی جان دوسری جان کا بوجھ نہیں اٹھائے گی۔ پھر تمہارا رجوع تمہارے

رب کی طرف ہوگا۔ پس وہ تم کو سب اعمال بتا دے گا جو تم کرتے رہے۔“

انك ميت و انهم ميتون ○ ثم انكم يوم القيمة عند ربكم تختصمون ○
(زمر، پ ۲۳)

”اے پیغمبر بے شک تجھے بھی مرنا ہے اور ان کو بھی مرنا ہے۔ پھر تم سب قیامت کے دن اپنے رب کے سامنے جھکرو گے۔“

وَبَلِّغِ لِلْمُطَفِّفِينَ ○ الَّذِينَ إِذَا أَكْتَالُوا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُونَ ○ وَإِذَا كَالُوا لَهُمْ أَوْ وَزَنُوا لَهُمْ يَخْسِرُونَ ○ لَا يُظُنُّ أُولَئِكَ أَنَّهُمْ مَبْعُوثُونَ ○ لِيَوْمٍ عَظِيمٍ ○ يَوْمَ يَقُومُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ ○ (پ ۳۰)

”تباہی ہے کم تولنے والوں کی کہ جب لوگوں سے ماپ کر لیتے تو پورا لیتے ہیں اور جب ان کو ماپ کر یا تول کر دیتے ہیں تو کم دیتے ہیں۔ کیا ان کو اس بات کا خیال نہیں کہ وہ اس بڑے دن میں اٹھائے جائیں گے، جس دن تمام لوگ رب العالمین کے سامنے کھڑے ہوں گے۔“

(۷) نیکوں اور بدوں کے انجام اور ان کی جزا و سزا کے متعلق فرمایا:-

إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّةٍ وَنَعِيمٍ ○ فَكَهَيْنَ بِمَا أَتَاهُمْ رَبُّهُمْ ○ وَقَهُمُ رَبُّهُمْ عَذَابَ الْجَحِيمِ ○ (طور، پ ۲۷) ”بے شک پرہیزگار باغوں میں ہوں گے اور نعمتوں میں مزے اٹھائیں گے۔ ان (نعمتوں) سے جو دے گا ان کو پروردگار ان کا اور بچائے گا ان کو ان کا پروردگار عذاب و دوزخ سے۔“

مَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ أَعْمَالُهُمْ كَرَمَادٍ اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيحُ فِي يَوْمٍ عَاصِفٍ ○ لَا يَقْدِرُونَ مِمَّا كَسَبُوا عَلَى شَيْءٍ ○ ذَٰلِكَ هُوَ الضَّلَالُ الْبَعِيدُ ○ (ابراہیم، پ ۱۳) ”مثال ان لوگوں کی جو اپنے پروردگار سے منکر ہوئے۔ یہ ہے کہ ان کے اعمال مثل راکھ ہیں کہ آندھی کے دن اس پر سخت ہوا چلی (تو وہ برباد ہو گئی)۔ نہیں قدرت پائیں گے اپنی کمائی میں سے کسی شے پر یہی تو دور کی گراہی ہے۔“

وَادْخُلِ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جَنَّةً تَجْرَى مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ○ خَالِدِينَ فِيهَا ○ بِإِذْنِ رَبِّهِمْ تَحِيَّتُهُمْ فِيهَا سَلَامٌ ○ (ابراہیم، پ ۱۳)

”اور وہ جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل بھی کئے۔ جنتوں میں داخل کیے جائیں گے، جن کے نیچے سے نہریں چلتی ہیں۔ وہ ان میں اپنے رب کے حکم سے ہمیشہ رہیں گے۔ ان میں ان کا تحفہ سلام ہو گا۔“

لِلَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ يَهْدِيهِمْ رَبُّهُمْ بِإِيمَانِهِمْ ○ تَجْرَى مِنْ تَحْتِهِمُ

الانهار فی جنت النعیم ○ دعواہم فیہا سبحنک اللہم و تحیتہم فیہا سلام و آخر دعواہم ان الحمد للہ رب العالمین ○ (یونس پ ۱۱)
 ”بے شک وہ جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل بھی کیے۔ ان کو ان کا رب ان کے ایمان کی وجہ سے (نجات کا) راستہ دکھائے گا۔ نعمتوں کے باغوں میں ان کے نیچے سے نریں چلتی ہوں گی۔ ان میں ان کی پکار ہوگی۔ سبحانک اللہم اے اللہ! تو پاک ہے اور ان کا تحفہ سلام ہوگا اور ان کی آخری پکار یہ ہوگی، ہر طرح کی تعریف کا مستحق اللہ رب العالمین ہے۔“

و نادى اصحاب الجنة اصحاب النار ان قد وجدنا ما وعدنا ربنا حقا فهل وجدتم ما وعد ربکم حقا“ قالوا نعم“ فانن مؤمنن بینہم ان لعنة اللہ علی الظالمین ○ (اعراف پ ۸)

”اور جنت والے دوزخ والوں کو پکار کر کہیں گے کہ ہم نے تو اس وعدے کو جو ہم سے ہمارے رب نے کیا تھا، سچا پایا۔ تو کیا تم نے بھی اس وعدے کو جو (تم سے) تمہارے رب نے کیا تھا، سچا پایا۔ وہ (جواب میں کہیں گے، ہاں پالیا۔) پس ان کے درمیان سے ایک پکارنے والا (فرشتہ) پکارے گا کہ ظالموں پر خدا کی مار ہو۔“

ومن اظلم ممن افترى على الله كذبا“ اولئك يعرضون على ربهم ويقول الاشهاد هؤلاء الذين كذبوا على ربهم“ الا لعنة الله على الظالمین ○ (هود پ ۱۲)
 ”اور کون بڑا ظالم ہے اس سے جو خدا پر جھوٹ باندھے۔ ایسے لوگ اپنے رب کے سامنے پیش ہوں گے اور گواہی دیں گے کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے جھوٹ کہا تھا اپنے پروردگار پر۔ خبردار! ایسے ظالموں پر خدا کی پھٹکار ہے۔“

(۸) اسی طرح حشر اجساد کے ممکن ہونے اور منکرین کے شبہات کے جواب میں فرمایا:-
 وقالوا اذا ضللتنا فی الارض انا لفی خلق جدید بل ہم بلقاء ربهم كفرون
 قل یتوفکم ملک الموت الذی وکل بکم ثم الی ربکم ترجعون ○ (تہجد پ ۲۱)
 ”اور (یہ منکر) کہتے ہیں کہ آیا جب ہم مٹی میں گھل مل جائیں گے تو کیا ہم (پھر) نئی پیدائش میں آئیں گے۔ بلکہ یہ لوگ اپنے رب کی ملاقات کے منکر ہیں۔ (اے پیغمبر!) ان سے کہو قبض کرے گا، تم کو موت کا فرشتہ جو تم پر مقرر کیا گیا پھر تم اپنے رب کی

طرف لوٹائے جاؤ گے۔“

وان تعجب فعجب قولهم انا كنا ترابا ؕ انا لفي خلق جديد ؕ اولئك الذين كفروا ببرهم ؕ واولئك الاغلال في اعناقهم (رعد، پ ۱۳)
”اور اگر تعجب کرے تو تو (واقعی) ان کا یہ قول تعجب کے لائق ہے کہ آیا جب ہم (مرکر) مٹی ہو جائیں گے تو کیا ہم نئی پیدائش میں آئیں گے۔ یہ وہ ہیں جو اپنے رب کے منکر ہوئے اور ان کی گردنوں میں طوق ہوں گے۔“

سورۃ واقعہ، پارہ ۲۷ میں مسئلہ قیامت کو نہایت تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ دوزخیوں کے دوزخ میں پڑنے کی وجوہات میں بیان کیا کہ وہ آسودگی کی وجہ سے بڑے بڑے گناہوں پر اصرار کرتے تھے۔ اور قیامت کی زندگی کو بعید از عقل جانتے تھے۔ اس کے جواب میں فرمایا کہ اے پیغمبر! ان سے کہہ دو کہ سب پہلے اور پچھلے ایک مقررہ دن کو اکٹھے کیے جائیں گے۔ مگر اہوں اور مکذیب کرنے والوں کو سخت عذاب ہو گا اور مرنے کے بعد پھر جینے کے امکان میں چند نظائر کا بیان ہے کہ ہم نے تم کو پیدا کیا پانی بوند سے تمہاری صورت، شکل اور سارا ڈھانچہ تیار کیا۔ پھر تم ہمارا کھنا باور کیوں نہیں کرتے اور پہلی پیدائش سے تم کو سمجھ کیوں نہیں آتی۔ تم جو کھیتی باڑی کرتے ہو، اس میں دانہ تم اگاتے ہو یا ہم؟ اور جو پانی تم پیتے ہو، بادلوں سے تم اتارتے ہو یا ہم؟ اور آگ جو تم جلاتے ہو، اس کا درخت تم نے اگایا یا ہم نے؟ ان نظائر کے بعد فرمایا۔ فسبح باسم رب العظيم یعنی اے نبی! پس تو اپنے عظمت والے رب کی پاکیزگی بیان کر۔ اس کے بعد جزا سزا کے منکروں کو نزع کے وقت کا حال یاد کراتے ہوئے فرمایا۔

فلولا ان كنتم غير مدينين ترجعونها ان كنتم صدقين ؕ فاما ان كان من المقربين فروح وريحان وجنت نعيم ؕ واما ان كان من اصحاب اليمين فسلام لك من اصحاب اليمين ؕ واما ان كان من المكذبين الضالين فنزل من حميم ؕ و تصلية جحيم ؕ ان هذا لهو حق اليقين ؕ فسبح باسم ربك العظيم ○ (واقعہ، پ ۲۷)

”پس اگر تم کسی کے ماتحت نہیں ہو تو موت کے وقت اس (جان) کو کیوں واپس نہیں لے آتے۔ اگر تم سچے ہو۔ پس اگر وہ (مرنے والا) شخص مقرین میں سے

ہوگا تو (ہر قسم کی) راحت ہے اور (عمدہ سے عمدہ) روزی ہے اور باغ نعتوں کا اور اگر وہ داہنے ہاتھ والوں میں سے ہوگا۔ تو تجھ پر داہنے ہاتھ والوں کی طرف سے سلام ہو اور اگر وہ جھلانے والوں گمراہوں سے ہوگا۔ تو اس کی ممانی جلتے پانی سے ہوگی۔ اور (آخر) داخل کرنا دوزخ میں۔ (اے پیغمبر!) بے شک یہ بات بالکل یقینی ہے۔ پس تو پاکیزگی بیان کر اپنے عظمت والے رب کے نام کی۔"

اس مضمون کو بھی اپنے اسم "رب" پر ختم کیا ہے۔

ان سب مذکورہ بالا عنوانات کے متعلق قرآن شریف میں بہت آیات ہیں لیکن ہم نے صرف ان بعض آیات کا انتخاب کیا ہے۔ جن میں اسم "رب" خاص طور پر مذکور ہے۔ یہ بتانے کے لیے کہ محاسبہ اعمال اور جزا و سزا بتقصائے اسم "رب" ہے اور شاکر و کافر، مطیع و عاصی اور محسن و مبینی میں امتیاز، مظلوم کی داورسی، حقدار کی حق رسی، شاکر و مطیع کو نیک جزا سب کچھ ربوبیت میں داخل ہے اور کافر و نافرمان جو اپنے پروردگار کی نعمتیں کھا کھا کر اور اس کے افضال کے سائے میں پرورش پایا کر اور اس کی عطا کی ہوئی دماغی اور بدنی قوتوں کو ناشکری و نافرمانی کے کاموں اور فتنے و فساد میں لگا لگا کر آئین حق شناسی اور نظام امن میں خلل ڈالتے ہیں۔ ان کے مالک و مولیٰ اور مربی و محسن کا حق ہے کہ ان سے پرسش کرے کہ انہوں نے قدرت کے اتنے بڑے نظام ربوبیت سے پیدا و تیار کردہ قوتوں اور اعضاء کو کیوں رائگاں گنوا یا۔ بلکہ کیوں اس کی مرضی کے خلاف کاموں میں لگایا اور اس کا حق ہے کہ ان سے کہے۔ یا ایہا الانسان ما غرک بربک الکرم ○ (انفطار، پ ۳۰) یعنی "اے غافل انسان! تجھے کس چیز نے تیرے صاحب کرم پروردگار سے دھوکے میں ڈال دیا۔"

اگر اعمال کا نتیجہ اور ان پر محاسبہ نہ ہو تو یہ سارا کارخانہ دنیا عبث و بے کار سمجھا جائے گا اور یہ رب العالمین کی شان کے خلاف ہے کہ زمین و آسمان اور ان کی درمیانی اشیاء کا اتنا بڑا سلسلہ عبث و بے کار کھڑا کرے۔ جیسا کہ سابقہ مختصر اگزور چکا اور اگر مظلوم کی داورسی اور مطیع و فرمانبردار کی جزا نہ ہو تو یہ شان ربوبیت کو داغ ہے۔ جس سے رب العالمین پاک ہے۔ غرض رب العالمین ایک ایسی جامع صفت ہے کہ اسے جمع ارکان دین سے پورا پورا تعلق ہے۔ جو کچھ عالم دنیا میں دیکھتے ہو، اسی کی جلوہ افروزی

ہے اور جو کچھ عالم عاقبت میں دیکھو گے، اسی کا ظہور ہوگا۔ پس فاتحہ قرآن (شروع) میں اس کا ذکر نہایت ضروری تھا اور کلمہ الحمد للہ سے اس کا جوڑ نہایت موزوں و مناسب ہے۔

اب ہم بعض وہ آیات لکھتے ہیں۔ جن میں حمد اور ربوبیت کو اکٹھا ذکر کیا گیا ہے۔ تاکہ معلوم ہو جائے کہ قرآن شریف میں حمد اور ربوبیت کی اس مناسبت کو خصوصیت سے ملحوظ رکھا گیا ہے۔

۱۔ خود آنحضور ﷺ کو کوئی چھ مقامات پر حکم ہوا ہے۔ فسبح بحمد ربک (حجر) نصر) اور وسبح بحمد ربک (مومن، طہ، ق، طور) کسی جگہ واؤ ہے اور کسی جگہ ”ف“ سے۔

۲۔ تین جگہ فرشتوں کی بابت ذکر کیا کہ وہ بھی اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح پکارتے ہیں۔ یسبحون بحمد ربهم (زمر، مومن، شوری) یعنی تسبیح پڑھتے ہیں ساتھ اپنے رب کی حمد کے۔

۳۔ تہجد گزار عابدوں کی بابت فرمایا سبحوا بحمد ربهم (الم سجدہ) یعنی ”وہ اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح پڑھتے ہیں۔“ خود اپنی صفت میں فرمایا۔ فللہ الحمد رب السموات ورب الارض رب العالمین ○ (جاثیہ، پ ۲۵) یعنی پس ہر طرح کی تعریف اللہ ہی کو سزاوار ہے۔ جو آسمانوں کا بھی رب ہے اور زمین کا بھی رب ہے۔ (غرض) تمام جہان والوں کا رب ہے۔“

نکتہ معرفت :- اللہ تعالیٰ رب العالمین ہے۔ اپنے رسول ﷺ کو انسانوں کی ہدایت کے لیے بھیجا تو رحمتہ للعالمین کر کے بھیجا اور اس کی کتاب کو ذکر للعالمین اور اس کے قبلہ کو ہدیٰ للعالمین بنایا۔

اللہ رب العزت کے رب العالمین ہونے کی آیات بیان ہو چکیں۔ اب ہم دیگر سب کی متعلقہ آیات تحریر کرتے ہیں۔ آنحضور ﷺ کی نسبت فرمایا۔ ومارسلنک الا رحمة للعالمین ○ (انبیاء، پ ۱۷) یعنی (اے پیغمبر!) ہم نے تجھ کو سارے جہان پر رحمت کرنے کے لیے رسول ﷺ بنا کر بھیجا ہے۔

اور قرآن شریف کی بابت فرمایا ان هو الا ذکر للعالمین ○ (تکویر، پ

۳۰۔ قلم، پ ۲۹۔ یوسف، پ ۱۳۔ ص، پ ۲۳ اور سورۃ انعام میں فرمایا۔ ان ہوا
ذکری للعلمین ○ (پ ۷) یعنی قرآن شریف تو بس سارے جہان کے لیے نصیحت
ہے۔

اور قبلہ شریف کی بابت فرمایا۔ ان اول بیت وضع للناس للذی ببکۃ
مبارک و ہدی للعلمین ○ (آل عمران، پ ۴) یعنی سب سے پہلا گھر جو خدا کی
عبادت کے لیے تمام لوگوں کے لیے بنایا گیا، وہ ہے جو مکہ میں ہے۔ برکت والا اور تمام
جہان کے لیے ہدایت کا موجب۔ اسی کے مطابق مولانا الطاف حسین حالی مرحوم نے کہا
ہے۔

وہ دنیا میں گھر سب سے پہلا خدا کا
خلیلؑ ایک معمار تھا جس بنا کا
ازل سے مشیت نے تھا جس کو تاکا
کہ اس گھر سے ابلے گا چشمہ ہدیٰ کا
”سبحان اللہ!“ عجب مناسبتیں ہیں کہ اللہ تعالیٰ رب العالمین ہے۔ اس کا رسولؐ
رحمۃ للعالمین ﷺ ہے۔ اس کی کتاب ذکر للعالمین ہے اور اس کا قبلہ ہدیٰ للعالمین ہے۔
یہ مناسبتیں مصنوعی نہیں بلکہ قدرت کی اپنی کرم فرمائیاں ہیں، جن میں کسی غیر کو دخل
نہیں۔ والحمد للہ رب العلمین ○ (میر)

۳۰۔ اس جگہ کہ شریف کو بکہ کہا ہے یہ بھی اس کا نام ہے۔ ب اور میم کا تبادلہ ہے۔ (لسان
العرب) صحف سابقہ میں بھی کہ شریف کا نام بکہ آیا ہے۔ چنانچہ داؤد کی زیور نمبر ۸۴ میں
ہے۔ ”مبارک وہ ہیں جو تیرے گھر میں بستے ہیں۔ وہ سدا تیری ستائش (حمد) کریں گے۔ وہ بکا
کی واوی میں گزر کرتے ہوئے اسے ایک کنواں بناتے۔“ یعنی چاہ زمزم۔ عیسائیوں نے
نہایت چالاکی سے بکہ کا بکا بنایا اور پھر اس کے معنی آنسو بنا لیے۔ لیکن انگریزی ترجمہ میں یہ
تصرف نہ ہو سکا۔ اس میں اسے صاف صاف ”واوی بکہ“ (Valley Of Bacca)
لکھا ہے اور اسے بڑی (B) سے اسم علم کر کے لکھا ہے۔ جیسا کہ انگریزی زبان میں اسم علم
کے لکھنے کا قاعدہ ہے۔

تمہ تفسیر آیت الحمد للہ رب العالمین

خلاصہ مطلب آیت الحمد للہ رب العالمین کا یہ ہے کہ ہر قسم کی حمد و ستائش کا مستحق اللہ تعالیٰ ہے۔ جس کی ربوبیت محیط کل ہے اور کسی خاص جنس یا خاص نوع یا خاص شخص یا اشخاص سے مختص نہیں ہے اور اس تربیت میں اس کی اپنی غرض متعلق تحصیل کمال یا توقع بزمان استقبال نہیں ہے اور اگر اس سلسلہ تربیت میں کوئی جزوی تربیت کسی اور کی طرف منسوب ہے تو وہ نسبت مجازی و ظاہری ہے، حقیقی نہیں ہے۔ کیوں کہ خود ان مربیوں کی ہستی اور ان کے جملہ امور متعلقہ سلسلہ تربیت کی کڑیاں ہیں اور وہ منجملہ شرائط و وسائط پرورش کے ہیں نہ کہ پرورش کرنے والے، پس ان کی تعریف و ستائش کا رجوع بھی ذات رب العالمین کی طرف ہے۔ اسی معنی میں کہا گیا ہے۔

حمداً با تو نسبتے ست درست
بر در ہر کہ رفت بر درست

مثلاً والدین اولاد کی پیدائش میں واسطہ ہیں، نہ کہ ان کے پیدا کرنے والے، ماں اپنے دودھ سے بچے کی پرورش کرتی ہے لیکن کس دودھ سے؟ اس دودھ سے جو بچے کے خالق اللہ تعالیٰ نے اس کی پرورش کے لیے اسکی ماں کی چھاتوں میں خون کی حالت کو بدل کر پیدا کیا ہے۔ اور اسے بچے کی غذا کے لائق بنایا ہے۔ پس ماں کی چھاتیاں دودھ کا خزانہ ہیں اور ماں اس کی اٹھانے والی۔ اس کی مثال یہ ہے کہ کوئی شخص اشرفیوں کی تھیلی کسی دوسرے کے حوالے کر کے کہے کہ یہ تھیلی فلاں شخص کو پہنچا دو تو آپ معنی یا داتا اس بھیجنے والے شخص کو کہیں گے یا اس اٹھا کر پہنچانے والے کو؟ اس میں شک نہیں کہ معنی اور داتا وہ بھیجنے والا ہے۔ تھیلی محض اشرفیوں کی حفاظت کے لیے ہے کہ منتشر ہونے کی صورت میں گر نہ جائیں اور وہ اٹھانے والا پہنچانے کے لیے واسطہ ہے نہ کہ داتا۔ اسی طرح خالق و رازق صرف خدا تعالیٰ ہے اور ماں کی چھاتیاں دودھ کی پیدائش و حفاظت کے لیے خزانہ ہیں کہ دودھ رائگاں نہ گر جائے اور ماں درمیان میں واسطہ ہے۔ اللہ رب العزت نے اس کے قلب میں بچے کے حق میں جذبہ محبت و رحمت اور الفت و رقت پیدا کر کے اس کی پرورش کا حکم دے دیا۔

تنزیل من الرحمن الرحیم

الجز الثالث

من تفسیر الفاتحة

النعیم المقیم

فی عواطف

الرحمن الرحیم

○ الرحمن الرحيم

نہایت رحمت والا، بہت مہربان

یعنی اللہ تعالیٰ جو مستحق ہر حمد ہے۔ وہ رب العالمین ہونے کے ساتھ رحمن و رحیم بھی ہے۔ یہ اختصاص حمد کی تیسری دلیل ہے اور اس میں تربیت عالم کی وجہ اور سر کی طرف اشارہ ہے۔

توضیح اس کی یوں ہے کہ کسی کی تربیت یا تو اس لیے کی جاتی ہے کہ اس کا سابقہ کوئی استحقاق یا احسان ہو، کہ اس کی ادائیگی یا مکافات مقصود ہو، یا حال میں اس کے متعلق کوئی غرض و مطلب ہو، یا آئندہ اس سے کسی نفع کی توقع اور امید ہو، یا محض اس کی بے کسی پر نظر کر کے از راہ شفقت و رحمت اس کی پرورش کی جائے۔ یہاں رب العالمین کے بعد الرحمن الرحیم کہہ کر بتا دیا کہ تربیت عالم کی وجہ سوائے شفقت و رحمت کے دیگر کوئی نہیں ہے اور رحمت اسی شفقت کو کہتے ہیں، جس میں احسان کی مکافات یا نفع کی توقع کا خیال نہ ہو۔ (راغب)

اس سے اس سوال کا جواب بھی ہو سکتا ہے کہ سابقہ "الرحمن الرحیم جب بسم اللہ میں گزر چکا ہے۔ تو اب اسے دوبارہ کیوں ذکر کیا؟۔ کیوں کہ پہلی دفعہ ابتدا میں تسبیح و تبرک کے لیے ذات برحق کی الوہیت و رحمانیت اور رحیمیت کا ذکر کیا اور اب وجوہات محمودیت کے ضمن میں بطور علت تربیت عالم و اختصاص محمودیت ذکر کیا۔ رحمن و رحیم کی لفظی و معنوی بحث سابقہ "بسم اللہ کے بیان میں گزر چکی ہے۔

قرآن شریف میں ربوبیت اور رحمت کا اکٹھا ذکر بہت مقامات پر ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ قرآن شریف میں ربوبیت و رحمت کی مناسبت و ربط کو خاص طور پر ملحوظ رکھا گیا ہے کہ سارا سلسلہ تربیت محض رحمت کے تقاضے سے ہے۔ کسی کے سابقہ استحقاق یا اس سے آئندہ کی توقع کی نظر سے نہیں۔ چنانچہ ہم بعض مقامات یہاں نقل کرتے ہیں:-

(۱) ابوالبشر حضرت آدمؑ کی قبولیت کی نسبت فرمایا:-

فتلقى ادم من ربه كلمت فتاب عليه انه هو التواب الرحيم ○ (بقرہ، پ ۱) ”پس آدمؑ نے اپنے رب سے چند کلمات حاصل کیے تو اس نے اس پر رجوع کیا۔ بے شک وہ رجوع کرنے والا مہربان ہے۔“

ربنا ظلمنا انفسنا و ان لم تغفر لنا و ترحمنا لنكونن من الخسرين ○ (اعراف، پ ۸) ”اے ہمارے پروردگار! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور اگر تو نے ہمیں نہ بخشا اور ہم پر رحم نہ کیا تو ہم ضرور زیاں کاروں سے ہو جائیں گے۔“

(۲) حضرت نوحؑ کی دعایوں ذکر کی ہے:-

رب انی اعوذ بک ان اسئلک مالیس لی بہ علم و الا تغفر لی و ترحمنی اکن من الخسرين ○ (ہود، پ ۱۲) ”اے میرے مالک و پروردگار! بے شک میں اس بات سے تیری پناہ چاہتا ہوں کہ تجھ سے ایسی چیز کا سوال کروں جس کا مجھے علم نہیں۔ اگر تو نے مجھے نہ بخشا اور مجھ پر رحم نہ کیا تو میں ضرور زیاں کاروں سے ہو جاؤں گا۔“

(۳) جد انبیاءؑ حضرت ابراہیمؑ اور ان کے فرزند حضرت اسحاقؑ کی دعایوں بیان فرمائی۔ ربنا و اجعلنا مسلمین لک و من ذریتنا امة مسلمة لک و ارزنا مناسکنا و تب علینا انک انت التواب الرحيم ○ (بقرہ، پ ۱)

”اے ہمارے مالک و پروردگار! ہمیں اپنا فرماں بردار رکھنا اور ہماری نسل میں سے بھی ایک جماعت اپنی فرماں بردار (بنائے) رکھنا اور ہمیں ہمارا طریق عبادت بھی سکھانا اور ہم پر رجوع کئے رکھنا۔ بے شک تو بڑا رجوع کرنے والا (اور) نہایت مہربان ہے۔“

(۴) حضرت یعقوبؑ نے اپنے بیٹوں کے لیے دعا کرنے کا وعدہ کیا:-

قال سوف استغفر لکم ربی انه هو الغفور الرحيم ○ (یوسف، پ ۱۳) ”کہا عنقریب میں اپنے پروردگار سے تمہارے لیے بخشش مانگوں گا۔ بے شک وہ بہت بخشنار اور نہایت مہربان ہے۔“

(۵) حضرت یوسفؑ اظہار تواضع و انکساری کے لیے کہتے ہیں:-

وما ابری نفسی ان النفس لا مارة بالسوء الا ما رحم ربی ان ربی لغفور رحيم ○ (یوسف، پ ۱۳)

”اور میں اپنے نفس کو تو بڑی نہیں کہتا، کیوں کہ نفس (اپنی ذات سے) برائی کا

اکثر حکم کرتا ہے۔ مگر وہ (نفس) جس پر میرا رب رحم کرے۔ (ایسا نہیں کرتا۔) بے شک میرا رب بخشنہار (اور) مہربان ہے۔“

(۶) حضرت خضرؑ نے قیموں کی دیوار درست کر دی تو حقیقت بتائی۔ رحمۃ من ربک یعنی اے موسیٰ! یہ تیرے رب کی رحمت کی وجہ سے کیا ہے۔

(۷) بنی اسرائیل کی نافرمانیوں کی وجہ سے ان پر زوال وارد کرنے کے سلسلے میں فرمایا۔ واذ تاذن ربک لیبعثن علیہم الی یوم القیمۃ من یسومہم سوء العذاب ان ربک لسریع العقاب وانه لغفور رحیم ○ (اعراف، پ ۹)

”اور جب تیرے رب نے اطلاع دی کہ میں ضرور ضرور ان (یہود) پر روز قیامت تک ایسے لوگ مسلط رکھوں گا۔ جو ان کو (برے سے) برا عذاب پہنچاتے رہیں گے۔ بے شک تیرا رب بہت جلد سزا دینے والا ہے اور بے شک وہ بڑا بخشنہار (اور) مہربان (بھی) ہے۔“

(۸) ذوالقرنینؑ نے یاجوج ماجوج کی روک تھام کے لیے جو دیوار بنائی تو اللہ تبارک و تعالیٰ کا شکر کر کے کہا: ہذا رحمۃ من ربی (کف، پ ۱۶) ”یہ میرے رب کی رحمت ہے۔“

(۹) حضرت شعیبؑ نے اپنی قوم سے فرمایا۔ واستغفروا ربکم ثم توبوا الیہ ان ربی رحیم ودود ○ (ہود، پ ۱۲) ”اپنے پروردگار سے معافی مانگو۔ پھر اس کی طرف رجوع کرو۔ بے شک میرا رب بہت مہربان (اور) نہایت رحم کرنے والا ہے۔“

(۱۰) حضرت زکریاؑ کو ان کے بڑھاپے میں اولاد بخشنے کا ذکر ان الفاظ میں فرمایا: ذکر رحمۃ ربک عبذہ زکریا ○ (مریم، پ ۱۶) ”یہ تیرے رب کی رحمت کا ذکر ہے۔ اپنے بندے زکریا پر۔“

(۱۱) نوع انسانی کو زمین پر متصرف کرنے اور ان میں سے بعض کو بعض پر برتری دینے کا احسان جتایا:۔

وهو الذی جعلکم خلائف الارض و رفع بعضکم فوق بعض درجت لیبلوکم فیما اتاکم ان ربک سریع العقاب وانه لغفور رحیم ○ (انعام، پ ۸) ”اور اللہ تو وہ ہے، جس نے تمہیں زمین میں مختار بنایا اور تم میں سے بعض کے بعض

پر درجے بلند کیے کہ تم کو اپنی دین کے متعلق آزمائے۔ بے شک تیرا رب جلد سزا دینے والا ہے اور بے شک وہ بڑا بخشنہار (اور) مہربان بھی ہے۔“

(۱۲) بنی آدم کی آسائش کے لیے دیگر حیوانات کو پیدا کرنے کا احسان بتایا:-

(الف) و تحمل اثقالکم الی بلد لم تکنوا بالغیہ الا بشق الانفس ان ربکم لرؤف رحیم ○ (نحل، پ ۱۲) ”اور وہ (چوپائے) تمہارے بوجھ اس شہر میں اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ جہاں تم سوائے اپنی جانوں کی مشقت کے نہیں پہنچا سکتے۔ بے شک تمہارا پروردگار بہت ہی شفقت والا (اور) مہربان ہے۔“

(ب) کشتی دریا میں اور جہاز سمندریں محض خدا کی رحمت سے چلتے ہیں:-

ربکم الذی یرزجی لکم الفلک فی البحر لتبتغوا من فضلہ انہ کان بکم رحیم ○ (بنی اسرائیل، پ ۱۵) ”تمہارا رب تو وہ ہے جو تمہارے لیے دریا میں کشتی چلاتا ہے، تاکہ تم اس کا فضل تلاش کرو۔ بے شک وہ تم پر بہت مہربان ہے۔“

(ج) گناہ گاروں کی گرفت میں محض بتقاضائے ربوبیت و رحمت جلدی نہیں کرتا۔ و ربک الغفور ذوالرحمۃ لویواخذہم بما کسبوا لعجل لہم العذاب (کہف، پ ۱۵) ”(اے پیغمبر!) تیرا پروردگار بخشنہار، صاحب رحمت ہے۔ اگر ان کو ان کے اعمال پر پکڑے تو ان پر بہت جلد عذاب نازل کر دے۔“

(د) بدنیت منصوبہ بازوں کو ڈرایا، دھمکایا کہ منصوبہ بازی کے وقت اللہ تعالیٰ کے غضب سے ڈرا کرو۔ تم صرف اپنے پروردگار کی رحمت کے سبب بچے رہتے ہو ورنہ تمہارے افعال طرح طرح کے عذاب کے لائق ہیں:-

افامن الذین مکروا السیئات ان یرسل اللہ بہم الارض او یرسل الیہم العذاب من حیث لا یشعرون ○ لو یاخذہم فی تقلبہم فما ہم بمعجزین ○ لو یاخذہم علی تخوف فان ربکم لرؤف رحیم ○ (نحل، پ ۱۲)

”تو کیا وہ لوگ جو برے منصوبے بناتے رہتے ہیں۔ ان کو یہ خوف نہیں کہ اللہ ان کو زمین میں دھنساوے یا ان کو ایسی جگہ سے عذاب آجائے، جہاں سے ان کو شعور بھی نہ ہو، یا ان کو چلتے پھرتے پکڑ لے اور وہ ہرگز عاجز نہ کر سکیں گے یا پکڑے ان کو خوف کی حالت میں، بے شک تمہارا رب بڑا شفقت والا (اور) مہربان ہے۔“

جنتیوں کو جنت میں تحفہ ملے گا۔ سلام قولاً" من رب رحیم (یس) پ
(۲۳) یعنی ان کو رب رحیم کی طرف سے تحفہ ملے گا سلامتی کا۔

اس مختصر تفصیل سے معلوم ہو گیا کہ توبہ کی قبولیت، خطاؤں کی معافی اور ان سے حفاظت نافرمانیوں پر حلم کرنا، ان پر پردہ ڈالنا اور ان سے درگزر کرنا، آسائش کے اسباب مہیا کرنا، خشکی اور تری کے سفر کے اسباب دے کر ان میں کامیاب کرنا، مکرہات سے بچانا، دشمنوں کی شرارتوں سے محفوظ رکھنا، اسباب ترقی کا عطا کرنا، درجات کا بلند کرنا اور حکومت بخشنا، بے کسوں کی امداد وغیبی اسباب سے کرنا، مایوسوں کو اولاد بخشنا، قبولیت ہدایت کی توفیق عطا کرنا، عاقبت میں طرح طرح کی نعمتوں کا بخشنا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنے دیدار سے مشرف کرنا اور تحفہ سلام سے نوازنا وغیرہ وغیرہ سب امور سلسلہ ربوبیت کی کڑیاں ہیں اور یہ سب کچھ بنقصانے رحمت ہے۔ ان میں نہ تو اس بے نیاز ذات کے ذمے کسی کا حق ہے اور نہ اسے کسی سے آئندہ کی کوئی توقع ہے۔

ان امور کی جامع ایک ہی آیت من لیجئے۔ جس میں ربوبیت و رحمت کو جمع کیا ہے اور اس میں یہ ظاہر کیا ہے کہ میری رحمت بھی میرے اپنے وعدے کی وجہ سے ہے نہ کہ کسی اور سبب سے۔ چنانچہ فرمایا:۔ کتب ربکم علی نفسہ الرحمۃ (انعام) پ
(۷) تمہارے رب نے (اپنے وعدے سے) اپنی ذات پر رحمت لازم کر لی ہے۔

مذکورہ بالا سب مقامات پر ربوبیت و رحمت کو باہم ذکر کیا ہے اور اس طرح کی آیات سے قرآن مجید بھرا پڑا ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ رب العالمین کے بعد الرحمن الرحیم کا ذکر یونہی اتفاقی طور پر نہیں بلکہ ان دونوں میں کمال مناسبت کے لحاظ سے قصداً "وارادہ" کیا ہے۔

پس ایسا بے غرض رحمن و رحیم رب العالمین واقعی ہر طرح کی حمد و ستائش کے لائق ہے اور حقیقتاً وہی اس کا مالک ہے۔ قرآن شریف میں اسمائے رحمن و رحیم جدا جدا بھی بہت جگہ وارد ہیں اور اکٹھے بھی اور سب الگ الگ مقاصد کے لیے ہیں۔ ان مقاصد سے اسم رحمن کی مناسبت ظاہر کرنے کے لیے ہم لفظ "رحمت عامہ" استعمال کریں گے، جو اسم رحمن کا تقاضا ہے اور اسم رحیم کے لیے "رحمت خاصہ" جیسا کہ سابقہ "گزر چکا۔

معلوم ہوا کہ بسم اللہ میں رحمت عامہ و رحمت خاصہ کا ذکر اللہ تبارک و تعالیٰ

کے اسم پاک کے یمن و برکت کے اظہار کے لیے ہے اور یہ بات محتاج بیان نہیں۔ کیوں کہ اگر ذات الرحمن و رحیم نہ ہو تو اس کے اسم کی برکت کے کیا معنی؟۔ پس اس کا الرحمن و رحیم ہونا اس کے اسم کے بایمن و برکت ہونے کی دلیل ہے۔ چنانچہ سورۃ الرحمن پ ۲۷ میں فرمایا:۔ تبارک اسم ربک ذی الجلال والاکرام یعنی بہت بابرکت ہے نام تیرے پروردگار کا جو صاحب جلال و بزرگی ہے۔

دوسرا موقع یہی آیت الرحمن الرحیم ہے۔ جس کی تفسیر ہو رہی ہے۔ اس جگہ اس مقصد کے لیے ہے کہ اللہ رب العزت ہی مستحق حمد ہے۔ اس لیے بھی کہ وہ اللہ ہے اور اس لیے بھی کہ وہ رب العالمین ہے اور اس لیے بھی کہ جملہ عالمین کی تربیت بغیر سابقہ استحقاق کے محض اپنی رحمت سے کر رہا ہے اور اس سلسلہ تربیت کی دو شاخیں ہیں۔ اول پیدا کرنے کے بعد جملہ مناسب اسباب تربیت سے نوازا تاکہ وہ اپنے کمال کو پہنچ کر اپنے خالق کی معرفت حاصل کرنے کے بعد اس کی امانت یعنی احکام شرعیہ کے حامل ہو سکیں اور جب وہ اس کے اوامر کو اس کی فشا کے مطابق بجالائیں تو ان کی سعی و طاعت کو ضائع و رائگاں نہ گنوائے اور بے ثمر و بے نتیجہ نہ کرے۔ بلکہ اپنی خصوصی مہربانی سے قبول فرمائے اور ان پر نیک جزا عطا کرے۔ اسی لیے اس کے بعد مالک یوم الدین فرمایا اور اس میں دین یعنی جزا کا ذکر کیا اور ذکر رحمت کے بعد جزا کی مالکیت بھی اپنے لیے ہی مخصوص رکھی کہ عمل کرنے والے کو حوصلہ رہے کہ روز جزا میں جزا کا عطا کرنا کسی ظالم و غاصب کے ہاتھ میں نہیں ہوگا بلکہ الرحمن و رحیم اللہ رب العزت کے ہاتھ میں ہوگا۔ پس ایسی ذات واقعی ہر حمد کی بجا طور پر مستحق ہے۔

اور تیسرا موقع سورۃ بقرہ پ ۲ میں ہے۔ والہکم الہ واحد لا الہ الا هو الرحمن الرحیم ○ (البقرہ پ ۲) ”معبود تمہارا معبود (برحق) بس ایک ہی ہے۔ اس کے سوا کوئی بھی لائق پرستش نہیں۔ وہ الرحمن و رحیم ہے۔“

اس جگہ رحمت عامہ و رحمت خاصہ کا ذکر اثبات توحید کے لیے ہے۔ اولاً تو یہ بات کلمہ توحید کے ذکر سے ظاہر ہے۔ دوم یہ کہ اس کے بعد اس کے دلائل کے بیان میں فرمایا:۔

ان فی خلق السموت والارض واختلاف الیل والنهار والفلک التی تجری

فی البحر بما ينفع الناس وما انزل الله من السماء من ماء فاحيا به الارض بعد موتها و بث فيها من كل دابة و تصريف الرياح و السحاب المسخر بين السماء والارض لآيات لقوم يعقلون ○ (پ ۲)

”بے شک آسمان و زمین کے پیدا کرنے میں اور رات اور دن کی آمد و شد میں اور کشتیوں اور جہازوں میں جو سمندروں اور دریاؤں میں لوگوں کے فائدے کی اشیاء لے کر چلتے ہیں۔ اور بارش میں جسے اللہ تعالیٰ آسمان (کی طرف) سے برساتا ہے۔ پھر اس کے ذریعے سے زمین کو اس کے مرنے کے بعد زندہ کرتا ہے اور ہر قسم کے جانوروں میں جو اللہ رب العزت نے زمین پر پھیلا رکھے ہیں اور ہواؤں کے ادھر ادھر پھرنے میں اور بادلوں میں جو آسمان و زمین میں گھرے رہتے ہیں۔ ان لوگوں کے لیے جو عقل رکھتے ہیں،“

یہ سب وہ نشانات قدرت ہیں جو ذات برحق کے موجود ہونے، اس کے وحدہ لا شریک ہونے، تدبیر و تصرف عالم میں متفرد ہونے اور اس کے رحم و رحیم ہونے کے دلائل ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ الہ العالمین وہ ہونا چاہیے جو رحم و رحیم ہو تاکہ اس کے احسانات کے سامنے طاعت کی گرویں جھک سکیں۔ اسی بناء پر حضرت ہارونؑ نے اپنی قوم کو گوسالہ پرستی سے منع کرتے وقت یوں کہا تھا۔ وان ربکم الرحمن یعنی تحقیق تمہارا رب تو الرحمن ہے۔ (اس گوسالہ میں یہ وصف کہاں ہے؟)

اسی جنس سے سورۂ حشر، پ ۲۸ میں بسلسلہ ذکر اسمائے حسنی الوہیت میں متفرد ہونے کے ذکر میں فرمایا:۔ هو اللہ الذی لا الہ الا هو عالم الغیب و الشہادۃ ہو الرحمن الرحیم ○ (حشر، پ ۲۸) ”وہ اللہ ایسا ہے کہ اس کے سوا کوئی دوسرا الٰہ نہیں۔ (وہ) پوشیدہ اور ظاہر (ہر دو کو برابر) جاننے والا ہے (اور) وہ بڑی رحمت والا اور نہایت مہربان ہے۔“

چوتھا موقع سورۂ حم سجدہ میں ہے:۔ حم تنزیل من الرحمن الرحیم ○ کتاب فصلت ایتہ قرانا عربیۃ لقوم یعلمون ○ بشیرا و نذیرا (پ ۲۲)

”حم (خدائے) رحمٰن و رحیم کی طرف سے اتاری ہوئی کتاب ہے کہ جدا جدا کی

ہوئی ہیں اس کی آیتیں، قرآن ہے، فصیح عربی زبان کا حقیقت شناس، لوگوں کے لیے خوش خبری سنا تا اور خطرات سے آگاہ کرتا۔

اس جگہ ان اسماء کو بسلسلہ تنزیل قرآن ذکر کر کے ظاہر کیا کہ قرآن شریف کا نازل کرنا سلسلہ رحمت کی ایک مضبوط کڑی ہے کہ جس طرح جسمانی سلسلہ پیدائش میں اس کی رحمت عامہ و رحمت خاصہ جلوہ گر ہے اور اس سلسلے کی رحمت کی وابستگی آفتاب عالم تاب اور باران رحمت سے ہے۔ اسی طرح روحانی اور اخلاقی سلسلہ کی وابستگی سراجا منیرا ﷺ (فدائہ روجی) اور چشمہ ہدایت و خزانہ رحمت قرآن شریف سے ہے اور یہ اس کی کمال مہربانی ہے کہ اپنی رحمانیت و رحیمیت کے تقاضے سے دونوں نظاموں کو ساتھ ساتھ رکھا ہے۔ قرآن شریف کو بہت مقامات پر رحمت کے ممتاز لقب سے ذکر کیا ہے اور اس کے نازل کرنے اور تعلیم کرنے کو اپنی رحمانیت اور رحیمیت کا تقاضا قرار دیا ہے۔ چنانچہ بعض مقامات یہ ہیں:-

☆ ہذا بصائر من ربکم و ہدی و رحمۃ لقوم یوقنون ○ (جافیہ، پ ۲۵)
”یہ (قرآن) سوچھ کی باتیں ہے۔ تمہارے رب کی طرف سے اور ایمان دار لوگوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے۔“

☆ یا ایہا الناس قد جاء تکم موعظۃ من ربکم و شفاء لما فی الصدور و ہدی و رحمۃ للمومنین ○ (یونس، پ ۱۱)
”(اے لوگو!) تم کو تمہارے پروردگار کی طرف سے نصیحت آچکی ہے اور (وہ) شفا (بھی ہے) اس کی جو سینوں میں ہے۔ اور ایمانداروں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے۔“

☆ و نزلنا علیک الکتب تبیاناً لکل شئی و ہدی و رحمۃ و بشری للمسلمین ○ (نمل، پ ۱۲)

”اور (اے پیغمبر!) ہم نے تجھ پر یہ کتاب (دینی ضرورت کی) ہر شے کا واضح بیان سنانے کے لیے نازل کی ہے اور (وہ) فرماں برداروں کے لیے ہدایت اور رحمت و بشارت ہے۔“

☆ تلک اب الکتب الحکیم ○ ہدی و رحمۃ للمحسنین ○ (لقمان)

پ ۲۱) ”الم“ یہ حکمت والی کتاب کی آیتیں ہیں، نیکو کاروں کی ہدایت و رحمت کے لیے“

قرآن مجید، فرقان حمید کے نازل کرنے اور نبی مکرم ﷺ کو تعلیم کرنے کی نسبت فرمایا:-

۱- یس ○ والقران الحکیم ○ انک لمن المرسلین ○ علی صراط مستقیم ○ تنزیل العزیز الرحیم ○ (یس، پ ۲۲)
”یس“ حکمت والے قرآن کی قسم ہے کہ بے شک تو (اللہ کے) مرسلوں میں سے ہے (اور) سیدھی راہ پر (ہے) یہ قرآن) نہایت زبردست، بت رحمت والے (خدا) کی طرف سے نازل شدہ ہے۔“

۲- الرحمن علم القرآن ○ (الرحمن، پ ۲۷) ”رحمن نے قرآن سکھایا ہے۔“
الغرض اس عالم میں جسمانی و روحانی تربیت اور نیک اعمال پر جزائے عاقبت، سب کچھ بتقاضائے رحمانیت و رحیمیت ہے اور قرآن شریف میں ہر موقع پر اسے خصوصیت سے ملحوظ رکھا گیا ہے۔

نکتہ:- اسمائے رحمن و رحیم کو اسم اللہ کے بعد کیوں ذکر کیا؟

جواب:- ہم سابقاً ”بسم اللہ شریف“ کی تفسیر میں ذکر کر آئے ہیں کہ اسم اللہ ذات حق کا ذاتی نام ہے اور جملہ دیگر اسماء صفاتی ہیں۔ ذات موصوف ہوتی ہے، صفت نہیں ہوتی۔ اسی لیے تمام قرآن شریف میں اسم اللہ موصوف ہی واقع ہوا ہے، صفت واقع نہیں ہوا اور عربی زبان میں موصوف کو پہلے لاتے ہیں اور صفت کو بعد میں مثلاً ”رجل کریم (مرد نیک) اور کریم رجل نہیں کہیں گے۔ اسی لیے صفت (نعت) کو توابع میں شمار کرتے ہیں۔ کیوں کہ اس کا اعراب وغیرہ موصوف کے تابع ہوتا ہے۔ دیگر یہ کہ عقل کا تقاضا بھی یہی ہے کہ موصوف پہلے ہو اور اس کی صفت پیچھے کیوں کہ صفت کا قیام موصوف سے ہوتا ہے۔

اسمائے رحمن و رحیم کے متعلق ایک مجرب و مسنون دعا:-

حدیث پاک میں وارد ہے کہ جو شخص قرض سے دب جائے۔ وہ یہ دعا پڑھا

کرے:-

اللهم فارح الهم كاشف الغم مجيب دعوة المضطرين رحمن الدنيا و
رحيمها انت ترحمني فارحمني برحمة تغنيني بها عن رحمة من سواك
(جن حصین یوسفی، ص ۱۶۶)

”اے اللہ جو تو فکر کا کھولنے والا، غم کا دور کرنے والا، بے قراروں کی دعا کا
قبول کرنے والا، دنیا میں رحمن و رحیم ہے۔ تو ہی مجھ پر رحمت کر سکتا ہے۔ پس مجھ پر ایسی
رحمت کر کہ تو مجھے اس سے دوسروں کی رحمت سے مستغنی کر دے۔“

رحمت و محبت:- قرآن حکیم میں رحمت و محبت ہر دو امر اللہ رب العزت کی طرف
منسوب ہیں اور کثرت سے ہیں لیکن سورۃ فاتحہ میں صرف رحمت کو اختیار کیا ہے اور
محبت کا ذکر نہیں کیا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ رحمت و محبت میں فرق ہے۔ رحمت محض فیضان بلا عوض
اور احسان ہے اور محبت میں قابلیت محل کا لحاظ ہوتا ہے۔ مثلاً ”واللہ یحب المتقین
○ (جامیہ، پ ۲۵)“ واللہ یحب المحسنین ○ (آل عمران، پ ۴) اور ان اللہ
یحب التوابین و یحب المتطہرین ○ (پ ۲) وغیرہا من الایات، علمائے اصول
کہتے ہیں۔ تعلیق الحکم بالوصف بدل علی علیہ ذالک الوصف لذلک
الحکم یعنی جب کسی حکم کو کسی وصف کے متعلق کیا جائے تو وہ وصف اس حکم کی علت
ہوتا ہے۔

پس ان آیات اور اس قسم کی دیگر آیات میں تقویٰ، احسان، توبہ اور طہارت
وغیرہ امور جو الفاظ متقین، محسنین، توابین اور متطہرین کے ضمن میں مذکور ہیں،
سب محبت الہی کے محل ہیں۔

قرآن شریف میں نیک اعمال کی ترغیب میں یہی پیرایہ اختیار کیا گیا ہے اور یہ
انسانی فطرت میں نہایت ہی موثر طریق ہے۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ کے محبوب بننے کی خواہش
و تمنا ہر نفس میں فطری طور پر ہے اور سب ریاضتوں اور عبادات مالیہ و بدنیہ کی غرض و
غایت یہی ہے کہ انسان خدا کی بارگاہ میں مقبول ہو کر اس کا محبوب بن جائے، آمین۔

اس کے مقابلے میں برے عقائد و اعمال سے نفرت دلانے کے لیے بھی ان

اعمال اور ان کے عاملوں کی نسبت فرمایا:- واللہ لا یحب الفساد ○ (پ ۲) 'واللہ لا یحب المفسدین ○ (ماندہ 'پ ۶) فان اللہ لا یحب الکفرین ○ (آل عمران 'پ ۳) انه لا یحب المستکبرین ○ (محل 'پ ۱۳) واللہ لا یحب الظالمین ○ (آل عمران 'پ ۳) ان اللہ لا یحب من کان مختلاً فخوراً ○ (النساء 'پ ۵) ان اللہ لا یحب من کان خواناً اثیماً ○ (النساء 'پ ۵) فساد، کفر، تکبر، ظلم، فخر، خیانت اور گناہ گاری وغیرہ امور جو ان آیات کے ضمن میں مذکور ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو سخت ناپسند ہیں۔

رحمت اور محبت میں دوسرا فرق یہ ہے کہ ربط محبت 'ذات حق اور بندے ہر دو میں دونوں کی طرف منسوب ہو سکتا ہے اور واقعہ میں بھی ایسا ہی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ بھی نیکوں سے محبت کرتا ہے اور نیک لوگ بھی اللہ رب العزت سے محبت کرتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:- یحبہم ویحبونہ (ماندہ 'پ ۶) یعنی اللہ تعالیٰ ان سے اور وہ اس سے محبت کرتے ہیں لیکن رحمت صرف اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت ہو سکتی ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ بندے کی طرف منسوب ہو کر ذات حق پر اس کا اثر پڑتا ہو۔ یعنی یہ کہ بندہ اللہ تعالیٰ پر رحمت کرے۔ ان دونوں نکتوں سے معلوم ہو سکتا ہے کہ رحمت اصل اور منبع ہے اور محبت اس کی فرع ہے۔ پس اسی وجہ سے سورہ فاتحہ میں جو ام القرآن ہے۔ اسی وصف رحمت کا ذکر ہے جو اصل ہے اور محبت کے ذکر کو اس کے موقع و محل کے لیے چھوڑ دیا۔

رحمانیت و رحیمیت کا تعلق آیت سابقہ ولاحقہ سے

اللہ رب العالمین کی پرورش کے لوازم میں سے دو قسم کی رحمت ہے۔ ایک وہ جو عین حالت پرورش میں ہوتی ہے کہ اگر وہ نہ ہو تو پرورش متصور نہیں ہو سکتی اور اس کی حقیقت و صورت یہ ہے کہ پیدا کرنے کے بعد باب تربیت میں جو کچھ اس کے لیے مناسب ہے اور جو کچھ نامناسب ہے، اسے ملحوظ رکھا جائے تاکہ وہ اس کمال کو پہنچ سکے، جو اس کے خالق کے علم میں مقدر ہے۔ اس قسم کی رحمت رحمانیت کے متعلق ہے کہ اس سے ہر نیک دبدب، شاکر و کافر، مطیع و عاصی، برہ و رے۔

دیگر رحمت یہ ہے کہ کمال پر پہنچنے کے بعد اس کمال کو رانگاں نہ جانے دے

بلکہ اسے نفع بخش بنائے اور باثمر کر کے قائم رکھے۔ مثلاً ”ایک شخص باغ لگاتا ہے اور اس کی ہر طرح کی نگہداشت و پرورش کرتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ باغ اپنے کمال کو پہنچ جاتا ہے اور اپنی بہار پر خوب پھلتا اور پھولتا ہے لیکن وہ باغبان ان پھلوں کو کسی کام میں نہیں لاتا اور ان کا نفع کسی صورت میں بھی قائم نہیں رکھتا بلکہ سب پھل گل سڑ کر یا خشک ہو کر زمین پر گر کر رائیگاں جاتے ہیں تو کیا آپ اس باغبان کی دانائی کی تعریف کریں گے اور اسے قابل ستائش جانیں گے؟۔ ہرگز نہیں۔

پس اسی طرح سمجھ لیجئے کہ اللہ رب العالمین نے اپنی رحمانیت سے اس باغ کو پیدا کیا اور ہر طرح کی مناسب پرورش و نگہداشت سے اس کو کمال پر پہنچایا اور اسے اس کی بہار پر لایا۔ اس کے بعد کیسے ہو سکتا ہے کہ اسے رائیگاں گنوا دے، ہرگز نہیں۔ اسی مطلب کے لیے متعدد جگہ فرمایا:۔ کہ ہم نے زمین و آسمان اور ان کی درمیانی اشیاء کو عبث و بے کار نہیں بنایا۔ اللہ تعالیٰ کھیل و بے کاری کے شغل اور فعل عبث سے پاک اور برتر ہے۔ سورۃ آل عمران، پ ۲۔ نیز سورۃ انبیاء، پ ۷۱۔ نیز سورۃ مومنون، پ ۱۸۔ نیز ص پ ۲۳۔ بلکہ وہ مہربان خدا انسان کی نیک سعی کو باثمر کرنے کے لیے دوسرے عالم میں اس پر نیک جزا مترتب کرے گا کہ نیک سعی کرنے والے انسان کے حق میں اس کا نفع دائم قائم کرے۔ (اسی لیے عالم عاقبت دائمی ہو گا، فانی نہیں ہو گا) اور یہ قسم رحمت اسم رحیم کے متعلق ہے۔ اس لیے تربیت عالمین اور رحمانیت و رحیمیت کے ذکر کے بعد روز جزا کا ذکر کیا اور فرمایا:۔

مالک یوم الدین ○ ”(اور) روز جزا کا مالک و حاکم ہے۔“

الملك يومئذ لله

الجزء الرابع

من تفسير الفاتحة

الحق اليقين

في تفسير قوله تعالى

ملك يوم الدين ○

○ ملک یوم الدین

(اور) روز جزا کا حاکم و مالک ہے

یعنی سزاوار حمد خداوند، رب العالمین اور الرحمن الرحیم ہونے کے ساتھ جزا کے دن کا مالک بھی ہے۔ یہ چوتھی صفت ہے اللہ کی اور یہ چاروں افراد اور اجتماعاً ”بہر دو طرح“ مثبت ہیں۔ اختصاص حمد کی ذات برحق کے لیے پہلی تین کا بیان ہو چکا۔ اب اس چوتھی کا بیان یوں ہے کہ نیک اعمال پر نیک جزا دینے میں تو لائق حمد ہونا ظاہر ہے۔ جزا حاصل کنندہ، جزا دہندہ کی تعریف کے گیت گایا ہی کرتا ہے لیکن برے اعمال پر بری جزا نہ ہو تو شاکر و کافر، مطیع و عاصی، محسن و مبین (نیکو کار و بدکار) پرہیزگار و بد لگام بلکہ خود نیکی و بدی میں کوئی تمیز نہ رہے۔ اسی امتیاز کا نام انصاف ہے اور یہ قابل حمد و ستائش ہے۔ چنانچہ حضرت شیخ عبدالقادر صاحب ”اس جگہ دین کے معنی انصاف کے کر کے اس آیت کا ترجمہ یوں کرتے ہیں۔ ”انصاف کے دن کا مالک“

قرآن مجید میں اس امتیاز کی بہت سی آیات ہیں لیکن ہم چار مواقع کے ذکر پر اکتفا کرتے ہیں۔

(۱) سورۃ جاثیہ میں فرمایا:۔ ام حسب الذین اجتروا الحیات ان نجعلہم كالذین امنوا و عملوا الصلحت سواء محياہم و مماتہم ساء ما یحکمون ○ (پ ۲۵)

”کیا وہ لوگ جو کوشش سے برائیاں کرتے رہتے ہیں۔ وہ یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ ہم ان کو مثل ان لوگوں کی کر دیں گے جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال بھی کیے کہ ان کا جینا اور مرنا ایک سا (ہو جائے گا) یہ لوگ بہت بری رائے قائم کر بیٹھے ہیں۔“

(۲) اسی طرح سورۃ ن میں فرمایا:۔ افنجعل المسلمین کالمجرمین ○ مالک کیف تحکمون ○ (پ ۲۹)

”تو کیا ہم تابعداروں کو جرائم پیشہ لوگوں کی طرح کر دیں گے۔ تمہیں کیا ہو گیا“ تم کیسی رائے قائم کرتے ہو؟۔“

(۳) اسی طرح سورہ ص میں ان لوگوں کے جواب میں جو کارخانہ زمین و آسمان کو عبث، بے کار اور بے نتیجہ خیال کرتے ہیں۔ نہایت زوردار الفاظ میں فرمایا:۔

ام نجعل الذین امنوا و عملوا الصلحت کالمفسدین فی الارض، ام نجعل المتقین کالفجار ○ (ص، پ ۲۳)

”کیا ہم کر دیں گے ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے۔ مثل ان کے جو زمین میں فساد مچاتے ہیں یا ہم کر دیں گے پرہیز گاروں کو مانند بد کرداروں کے۔“ (یعنی ایسا کبھی نہیں ہوگا)

(۴) اسی طرح قیامت کے دن نیکوں اور بدوں میں جزا و سزا کا جو امتیاز ہوگا۔ اس کی تصریح میں فرمایا:۔ فالیوم لا تظلم نفس شیئاً ولا تجزون الا ما کنتم تعملون ○ ان اصحاب الجنة الیوم فی شغل فاکھون ○ ہم و ازواجہم فی ظلل علی الارائک متکئون ○ لهم فیہا فاکھة و لهم ما یدعون ○ سلام قولاً ○ من رب رحیم ○ وامتازوا الیوم ایہا المجرمون ○ الم اعہد الیکم ینی ادم ان لا تعبدوا الشیطن انه لکم عدو مبین ○ و ان اعبدونی ہذا صراط مستقیم ○ و لقد اضل منکم جبلاً ○ کثیراً ○ افلم تکنونوا تعقلون ○ ہذہ جہنم التی کنتم توعدون ○ اصلوہا الیوم بما کنتم تکفرون ○ (یس، پ ۲۳)

”پس آج کسی جان پر کچھ بھی ظلم نہیں ہوگا اور تم وہی جزا پاؤ گے جو تم کرتے رہے۔ بے شک جنتی لوگ اس روز (خوب) مزے میں جی بہلا رہے ہوں گے۔ وہ اور ان کی (نیک پاک) بیبیاں (گھنے) سایوں میں تختوں پر تکیے لگائے (بیٹھے) ہوں گے۔ بہشت میں ان کے لیے میوے (تو موجود ہی) ہوں گے اور واسطے ان کے وہ بھی ہوگا جو وہ (اس کے علاوہ) طلب کریں گے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کو رب رحیم اپنی طرف سے سلام کہلا بھیجے گا اور (مجرموں سے کہا جائے گا) کہ اے مجرمو! تم آج الگ ہو جاؤ۔ اے اولاد آدم! کیا میں نے تم کو تاکید حکم نہیں دیا تھا کہ شیطان کی پرستش نہ کرنا، کیوں کہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے اور یہ بھی کہ صرف میری ہی عبادت کرنا، سیدھی راہ یہی ہے۔ وہ تم سے پہلے اکثر لوگوں کو گمراہ کر چکا تھا۔ تو کیا تم عقل نہیں رکھتے تھے۔ یہ وہ جہنم ہے جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔ آج اپنے کفر کی وجہ سے اسی میں داخل ہو جاؤ۔“

غرض جب نیکی و بدی کے نتائج مختلف ہیں تو نیکیوں اور بدوں کے انجام بھی ایک جیسے نہیں ہو سکتے۔ پس امتیاز کو قائم کرنے کا نام انصاف ہے اور انصاف موجب ستائش ہے۔ دیگر یہ کہ ذات برحق ہر دو جان میں لائقِ حمد ہے اور حمد اسی سے مخصوص ہے۔
۱۔ جیسا کہ فرمایا۔ وهو اللہ لا الہ الا هو' لہ الحمد فی الاولی والاخرۃ ولہ الحکم والیہ ترجعون ○ (قص، پ ۲۰)

”اور وہ اللہ ہے۔ اس کے سوائے کوئی لائقِ عبادت نہیں۔ دنیا اور آخرت میں وہی حمد کا مالک ہے اور (ہر جگہ) اسی کا حکم ہے اور تم (سب) اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔“

۲۔ اور خاص آخرت کے متعلق فرمایا:۔ الحمد للہ الذی لہ ما فی السموات وما فی الارض ولہ الحمد فی الاخرۃ' وهو الحکیم الخبیر ○ (سبا، پ ۲۲)
”ہر طرح کی حمد کا مستحق اللہ ہے۔ جس کی ملک میں ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور آخرت میں بھی وہی حمد کے لائق ہے اور وہ بڑا باحکمت (اور ہر شے سے) خبردار ہے۔“

۳۔ آنحضرت ﷺ عرصات (میدانِ حشر) میں شفاعت کا اذن حاصل کرنے کے لیے مقام محمود میں اللہ رب العزت کی جو حمد پکاریں گے۔ اس کی نبت آپؐ نے فرمایا:۔
فاقع ساجداً لربی ثم یفتح اللہ علی من محامدہ و حسن الثناء علیہ شیئاً لم یفتحہ علی احد قبلی' فائنی علی ربی بثناء و تحمید یعلمنیہ
”پس میں اپنے رب کے سامنے سجدے میں گر پڑوں گا۔ پھر اللہ تعالیٰ مجھ پر اپنی حمد و ثناء کے ایسے دروازے کھولے گا۔ جو مجھ سے پیشتر کسی اور پر نہیں کھولے ہوں گے۔ پس میں اپنے رب کی وہ حمد و ثناء کہوں گا جو وہ مجھے خود سکھائے گا۔“

۴۔ حمد کا جھنڈا آپ کے دست مبارک میں دیا جائے گا اور تمام انبیاء کرامؑ اور دیگر صالحین اس جھنڈے کے نیچے ہوں گے۔ چنانچہ فرمایا:۔

وانا حامل لواء الحمد یوم القیمۃ تحته ادم فمن دونہ (مخلوۃ)
”قیامت کے دن حمد کا جھنڈا اٹھانے والا میں ہوں گا اور آدم اور اس کے سوا دیگر (انبیاء سب) اس کے نیچے ہوں گے۔“

۵۔ جنتیوں اور دوزخیوں کے فیصلے کے بعد تمام جنتی اور فرشتے حمد الہی پکاریں گے:- و قالوا الحمد لله الذي صدقنا وعده واورثنا الارض نتبوا من الجنة حيث نشاء فنعم اجر العاملين ○ و ترى الملكة حافين من حول العرش يسبحون بحمد ربهم و قضى بينهم بالحق وقيل الحمد لله رب العالمين ○ (زمر' پ ۲۳)

”اور وہ کہیں گے کہ ہر طرح کی حمد کا مستحق اللہ ہے۔ جس نے ہم سے اپنا وعدہ سچا کر دیا اور ہم کو اس زمین (جنت) کا وارث بنا دیا کہ ہم جنت میں سے جہاں پر چاہتے ہیں، ٹھکانا بنا سکتے ہیں۔ کیا خوب اجر ہے عمل کرنے والوں کا اور تو دیکھے گا فرشتوں کو کہ گھبرا ڈالے عرش کے گرد اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح پکارتے ہوں گے اور ان میں حق حق فیصلہ کیا جائے گا اور کہا جائے گا۔ ہر طرح کی حمد کے لائق اللہ ہے جو سب جانوں کا پروردگار ہے۔“

۶۔ جنتی، جنت میں حمد الہی کریں گے:- و قالوا الحمد لله الذي اذهب عنا الحزن ان ربنا لغفور شكور ○ الذي احلنا دار المقامة من فضله (فاطر' پ ۲۲)
”اور کہیں گے ہر طرح کی تعریف کے لائق اللہ ہے۔ جس نے ہمارا غم و فکر دور کر دیا۔ بے شک ہمارا رب بخشنار، قدروان ہے۔ جس نے ہم کو اپنے فضل سے اس دار الاقامت (REST HOUSE) میں اتارا۔“

دعواہم فیہا سبحنک اللہم و تحیتہم فیہا سلام و اخر دعواہم ان الحمد لله رب العالمین ○ (یونس' پ ۱۱)

”جنت میں ان کی دعا ہوگی، سبحنک اللہم یعنی اے اللہ! تو پاک ذات ہے اور ان کا تحفہ (ملاقات) سلام ہوگا اور ان کی دعا کا خاتمہ ہوگا، الحمد للہ رب العالمین یعنی ہر طرح کی تعریف کے لائق اللہ ہی ہے جو سب جانوں کا مالک و پروردگار ہے۔“

غرض روز جزا اللہ رب العزت کی حمد بیش از بیش ہوگی۔ لہذا روز جزا کی ملکیت کو بھی وجوہات اختصاص حمد میں شمار کرنا نہایت موزوں اور با موقع ہے۔ ولله الحمد علی هذه السکنة اللطيفة

لطیفہ عجیبہ:- مرزا قادیانی بھی عجب لطف کے بندے تھے۔ آیات قرآنیہ کو توڑ مروڑ کر

کسی نہ کسی طرح اپنے حق میں اتار لیتے تھے۔ چنانچہ آیت لہ الحمد فی الاولی والاخرہ (قصص، پ ۲۰) کے متعلق فرماتے ہیں کہ اس میں دو احمدوں کی طرف اشارہ ہے۔ ایک حضرت محمد مصطفیٰ، احمد مجتبیٰ علیہ السلام اور دوسرے خود بدولت مرزا غلام احمد صاحب قادیانی (مخلص اعجاز المسیح، ص ۱۳۴-۱۳۵) اول تو یہ مسخر اپن دیکھیے کہ کہاں یہ مضمون کہ دنیا و عاقبت ہر دو جہان میں مالک حمد و ثناء صرف ذات برحق ہے اور کہاں ”دو احمدوں“ کی ہستی۔ دیگر یہ کہ آقا بھی ”احمد“ اور گستاخ غلام بھی ”احمد“ گویا غلامی کی نسبت درمیان سے جاتی رہی اور آقا و غلام میں کوئی امتیاز باقی نہ رہا۔ اعاذنا اللہ من هذه الخرافات

ملکیت (بادشاہت) کے رو سے بھی اللہ رب العزت لائق حمد ہے کیوں کہ یہ اس کی خاص صفت ہے۔ جیسا کہ ابھی ان شاء اللہ مذکور ہوگا اور بادشاہ ہونے پر لائق حمد ہونا قرآن حکیم میں دوسرے موقع پر بھی مذکور ہے۔ چنانچہ فرمایا:-

(۱) لہ الملک ولہ الحمد و هو علی کل شئی قدير ○ (تہابن، پ ۲۸)

”اسی کی بادشاہی ہے اور وہی حمد کے لائق ہے اور وہ ہر شے پر قادر ہے۔“

(۲) سورہ ملک کے شروع میں فرمایا:- تبارک الذی بیدہ الملک و هو علی کل

شئی قدير ○ (ملک، پ ۲۹)

”وہ ذات جس کے قبضے میں بادشاہی ہے۔ بہت ہی بابرکت ہے اور وہ ہر شے پر قادر ہے۔“

اس آیت میں گو لفظ حمد نہیں ہے لیکن چونکہ تبارک ستائش و تعریف کا کلمہ ہے اس لیے ہم نے اس جگہ اسے بھی نقل کر دیا ہے۔ سات سورتیں کلمہ تسبیح سے شروع ہوتی ہیں اور پانچ الحمد سے اور دو تبارک سے پس ان کا مجموعہ بھی سات ہو گیا۔

(۳) سورہ بنی اسرائیل کے خاتمے پر فرمایا:- و قل الحمد لله الذی لم یتخذ ولدا ولم یکن لہ شریک فی الملک و لم یکن لہ ولی من الدن و کبرہ تکبیرا ○ (پ ۱۵)

”اور کہہ تو ہر طرح کی تعریف کے لائق اللہ ہے، جس نے کوئی تسبی نہیں بنایا اور نہ بادشاہی میں کوئی اس کا شریک ہے اور نہ کمزوری کی وجہ سے اس کا کوئی مددگار ہے

اور اسی کی بڑائی بیان کرتے رہو۔“

مالک یوم الدین کی دوسری قرأت ملک یوم الدین کی بنا پر ملکیت (بادشاہت) بھی وجوہات اختصاص حمد میں سے ہے، کیوں کہ بادشاہ ہونا بھی موجب ستائش ہے۔

اسی اختصاص کی وجہ سے کہ بادشاہی حقیقت میں اللہ رب العزت کی صفت ہے۔ اللہ تعالیٰ کو بادشاہ حقیقی کہتے ہیں اور دنیوی بادشاہوں کو بادشاہ مجازی اور اسی اختصاص نسبت کی وجہ سے قرآن مجید کی مذکورہ بالا آیات میں سے نمبر اول کی آیت میں لہ الملک، لہ کو مقدم کیا گیا اور اسی امر کو آیت نمبر ۳ میں حکم تحمید کے بعد لم یکن لہ شریک فی الملک کے الفاظ میں واضح کر دیا گیا کہ ملک (بادشاہت) میں اس کا سا بھی و شریک کوئی نہیں۔ پس اس وجہ سے بھی حمد صرف اسی سے مختص رہی۔

(۳) آیت قل اللہم ملک الملک تؤتی الملک من تشاء وتنزع الملک ممن تشاء میں ملک کو مالک کی طرف مضاف کر کے اور کسی کو عطا کرنا۔ (جیسے بچہ سقاؤ کو اور نادر خاں ایک جرنیل کو اور اسی طرح مصطفیٰ کمال پاشا کو) اور کسی سے چھین لینا۔ (جیسے شاہ امان اللہ خان سے اور سلطان عبدالحمید اور سلطان عبدالجید سے) ظاہر کر کے اسی شان تفرد و ملکیت کو نمایاں کیا ہے۔

ارتباط:- مذکورہ بالا بیان حمد اور ملک یوم الدین کے تعلق کی نسبت تھا۔ اب الرحمن الرحیم ○ ملک یوم الدین ○ کے ربط کے متعلق ملاحظہ فرمائیے۔

سابقاً ”آپ رب العالمین کے ہنرمیں پڑھ آئے ہیں کہ اللہ رب العالمین کی شان اس سے بلند ہے کہ زمین و آسمان اور ان کی درمیانی اشیاء کا اتنا بڑا سلسلہ کھڑا کرے، دن رات ان کی حفاظت و تربیت بھی کرتا رہے اور اس کا انجام یہ ہو کہ وہ عبث و بے نتیجہ ہو کر ایک بیکاری کا شغل ہو جائے۔ چنانچہ فرمایا کہ جن لوگوں نے اپنی زندگی غفلت و جہالت کفران و معصیت میں گزاری۔ قیامت کے دن اعمال کی جزا کے وقت ان سے کہا جائے گا:-

فحسبتم انما خلقنکم عبثاً و انکم الینا لا ترجعون ○ فتعالی اللہ الملک الحق (مومنون، پ ۱۸)

”تو کیا تم نے یہ گمان کر رکھا تھا کہ ہم نے تم کو عبث و بے کار پیدا کیا ہے اور نیز یہ کہ تم ہماری طرف لوٹ کر نہ آؤ گے۔ پس اللہ سچا بادشاہ اس سے بہت بلند ہے۔“
اور آپ یہ بھی پڑھ آئے ہیں کہ شاکر و کافر، مطیع و عاصی، محسن و مبینی (نیکی کار و بدکار) میں امتیاز اور مظلوم کی وادری، حقدار کی حق رسی اور شاکر و مطیع کی نیک جزا سب کچھ ربوبیت میں داخل ہے۔

نیز آپ الرحمن الرحیم کے بیان میں مطالعہ فرما چکے ہیں کہ جملہ عالمین کی تربیت و حفاظت کی وجہ اللہ کی رحمت و شفقت ہے اور یہ بھی کہ اس کی رحمت عام بھی ہے اور خاص بھی۔ عام وہ ہے جس سے اتنے بڑے عالم بالا و زیریں کو موجود کیا اور پھر اس کی تربیت کرتا ہے۔ اس رحمت سے مومن و کافر، موحد و مشرک خدا کی ہستی کے قائل اور دہریہ، مطیع و عاصی، صالح و فاسق ہر دو نوع کے انسان بلکہ ہر تنفس اور متحرک بالا و اوہ زندہ ہستی بہرہ ور ہے۔ چنانچہ فرمایا: وما من دابة فی الارض الا علی اللہ رزقها (ہود، پ ۱۲) ”اور زمین پر چلنے والا کوئی ایسا جانور نہیں، جس کا رزق اللہ کے ذمے نہ ہو۔“ اسی معنی میں کہا گیا ہے۔

اویم زمیں سفرہ عام اوست

بریں خوان یغماچہ دشمن چہ دوست

بلکہ اس سے بھی بڑھ کر فرمایا۔ ورحمتی وسعت کل شئی (اعراف، پ ۹) یعنی میری رحمت ہر شے پر چھائی ہے۔ اسی کے مناسب حدیث قدسی میں فرمایا۔ ان رحمتی سبقت غضبی (بخاری) یعنی میری رحمت میرے غضب پر سبقت رکھتی ہے۔

ایسی رحمت اسم الرحمن کا تقاضا ہے۔ اسی لیے یہ اسم مخصوص بذات باری تعالیٰ ہے اور کسی دوسرے کو اس نام سے پکارنا جائز نہیں۔ جیسا کہ بسم اللہ کے بیان میں پر گزر چکا ہے۔ خاص رحمت یہ ہے کہ کسی عامل کا نیک عمل کسی عابد کی عبادت، کسی مطیع کی اطاعت جو اس کی ہدایت کے مطابق ہو، اسے ضائع و رائگاں اور بے ثمر نہ کر دے۔ چنانچہ فرمایا: فاستجاب لهم ربهم انی لا اضيع عمل عامل منکم من ذکر او انشی (آل عمران، پ ۴)

”پس ان کے رب نے ان کی دعا قبول فرمائی کہ میں کسی عمل کرنے والے کا عمل ضائع نہیں کرتا۔ خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔“

اس مضمون کی آیات بکثرت ہیں اور یہ تقاضا ہے اسم رحیم کا۔ چنانچہ اپنے ذکر و عبادت اور تسبیح و تقدیس کا حکم دیا اور اس حکم کی تعمیل پر جو کچھ نوازشیں ہوں گی۔ ان کی بابت فرما کر آیت کو اسم رحیم پر ختم کیا:۔

یا ایہا الذین امنوا اذکروا اللہ ذکرا کثیرا ○ و سبحوه بکرة و اصیلا ○
 هو الذی یصلی علیکم و ملئکتہ لیخرجکم من الظلمت الی النور و کان بالمومنین رحیما ○ نحتیثم یوم یلقونہ سلام و اعد لهم اجر کریم ○ (احزاب، پ ۲۲)

”مسلمانو! اللہ کو بہت بہت یاد کیا کرو اور صبح و شام اس کی تسبیح پڑھا کرو۔ وہ تو وہ ذات پاک ہے کہ تم پر رحمتیں نازل کرتی ہے اور اس کے فرشتے بھی تمہارے لیے دعا مانگتے ہیں۔ تاکہ تم کو (کفر کے) اندھیروں سے (ایمان کے) نور کی طرف نکال لائے اور وہ مومنوں پر بہت ہی مہربان ہے۔ جس دن وہ اس سے ملاقات کریں گے تو ان کا تحفہ سلام ہو گا اور اس نے ان کے لیے بڑی عزت کا اجر تیار کر رکھا ہے۔“

اس مضمون کی آیات بھی بکثرت ہیں اور کچھ شک نہیں کہ تابعداروں کی محنت و سعی کو قبول کرنا اور ایسے ایسے اچھے سلوک سے ان پر نوازش کرنا اور تابعداروں اور معافی کے طلب گاروں کی لغزشوں سے درگزر کرنا سب رحمت خاصہ کا تقاضا ہے۔

پس ان ہر دو آیات یعنی رب العالمین اور الرحمن الرحیم کے ان مذکورہ بالا نکات کو ملحوظ رکھتے ہوئے جزا سزا کا مسئلہ بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ جب مطیع کی اطاعت بے ثمر نہیں مگنی تو عاصی کی معصیت و سرکشی کا وبال بھی اس پر پڑنا چاہیے، کیوں کہ مطیع و عاصی انجام میں برابر نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ اسی امر کو واضح کرنے کے لیے فرمایا۔ ا فمن کان مومنا کمن کان فاسقا ○ لایستون ○ (الم سجدہ، پ ۲۱) کیا وہ جو مومن ہو اس کی مثل ہے جو فاسق ہے۔ یہ آپس میں برابر نہیں ہو سکتے۔

اس کے بعد نیکو کار مومنوں کی جزا جنت فرمائی اور نافرمانوں کی سزا ہمیشہ کا دوزخ۔ (اعاذنا اللہ منها) اسی لیے اس آیت ملک یوم الدین میں جزا کے لیے لفظ دین

اختیار کیا گیا ہے کہ وہ عمل و سعی کے موافق و مناسب سلوک کا نام ہے۔ جیسا کہ حدیث میں وارد ہے کما تدين تدان (فتح الباری) اور یہ حدیث اپنی شہرت کی وجہ سے زبان زد عام ہو کر محاورہ زبان میں داخل ہو گئی ہے۔ پس الرحمن الرحیم (رحمت عام و خاص) کے ذکر کے بعد مسئلہ جزا و سزا کے لیے ملک یوم الدین کتنا نہایت موزوں و مناسب ہے۔

نکتہ :- اور لطف یہ ہے کہ یوم الدین کو اپنے اسم مالک یا ملک کی طرف مضاف کر کے صفت کی صورت میں فرمایا۔ جس سے معلوم ہو گیا کہ اعمال پر جزا و سزا مترتب کرنا خدا کی صفات میں داخل ہے۔ حذا و الحمد للہ (میر)

حل لغات :- مالک حقیقی صاحب اختیار کو کہتے ہیں کہ جس چیز کا وہ صاحب ہو، اس میں اپنے اختیار و استحقاق سے ہر طرح کا تصرف کر سکے۔ چنانچہ لسان العرب میں ہے۔ الملك والملک والملک (بالحرکات الثلاثة للمیم و سکون اللام فی الک) احتواء الشیئی والقدرة علی الاستبداد به (جلد ۱۲ ص ۳۸۲) یعنی کسی شے پر بالاستقلال حاوی و قادر ہونا اور قرآن شریف میں متعدد جگہ وارد ہے۔ ان میں سے بعض یہ ہیں۔

چنانچہ سورہ انفطار پ ۳۰ میں یوم الدین کی تعیین میں فرمایا۔ یوم لا تملک نفس لنفس شیئا والامر یومئذ للہ یعنی جس دن کوئی جان کسی جان کے لیے کسی چیز کی بھی مالک نہ ہوگی اور حکم اس روز اللہ ہی کا ہوگا۔ اسی طرح سورہ سبا ۲۲ میں فرمایا۔ فالیوم لا یملک بعضکم لبعض نفعا ولا ضرا یعنی پس آج تم مالک نہیں ہو ایک دوسرے کے نفع و نقصان کے۔ ان ہر دو آیات میں لا یملک، ملک (بکر المیم) سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی مالکیت کے ہیں اور سورہ مومن پ ۲۳ میں اسی روز (انصاف) کی بابت فرمایا۔ لمن الملك الیوم للہ الواحد القہار ○ یعنی (اللہ تعالیٰ پوچھے گا) آج کس کی حکومت ہے؟ (پھر فرخو فرمائے گا) اکیلے زبردست اللہ کی۔ اسی طرح سورہ فرقان پ ۱۹ میں فرمایا۔ الملك یومئذ الحق للرحمن یعنی حکومت حق و حقیقی اس روز صرف (اللہ تعالیٰ) رحمٰن کی ہوگی۔ نیز سورہ حج پ ۱۷ میں فرمایا۔ الملك یومئذ للہ یعنی راج اس دن صرف اللہ کا ہوگا۔ ان ہر سہ آیات میں

ملک بانتم مذکور ہے اور ان سب مذکورہ بالا آیات میں ایک ہی دن یوم الدین کے کوائف مذکور ہیں۔ پس ملک (بانتم) اور ملک (بالکسر) ہر دو کے متنی قدرت و اختیار اور ضبط و تصرف کے ہیں۔ اسی لیے اس جگہ یعنی سورۃ فاتحہ شریف میں مالک کی قرأت ملک بھی درست ہے۔ اسی لیے ہم اور لام کو ملا کر لکھتے ہیں کہ دونوں قرائتیں پڑھی جاسکیں۔ رسم الخط عثمانی میں یہ کمال ہے کہ اس میں عموماً سب متواتر قرائتیں جمع ہو جاتی ہیں۔

مالک اور ملک کا مفرد حاصل ایک ہی ہے لیکن دونوں کے مفہوم کی وسعت میں الگ الگ جہت سے کمی بیشی ہے۔ جب دونوں قرائتیں تواتر سے ثابت ہیں تو کسی ایک کی وجہ ترجیح کی تفصیل بے کار ہے۔ ہاں پڑھنے میں کسی ایک کو دوسری کے انکار بلکہ راجح و مرجوح قرار دینے کے بغیر اختیار کرنے کا اختیار ہے۔ قرآن مجید میں ملک اور مالک ہر دو اللہ تعالیٰ کی صفات و اسماء میں وارد ہیں۔ مثلاً "قل اللهم مالک المملک تنونی المملک من نسلہ میں مالک (بالافت) اور سورۃ قل اعوذ برب النسل ○ ملک النسل میں ملک بغیر الف کے ہے اور حدیث ترمذی میں اسمائے حسنیٰ کی جو فہرست مرفوعاً مروی ہے۔ اس میں بھی ہر دو موجود ہیں۔ دونوں کے مادی حروف م۔ ل۔ ک ہیں۔ عام خیال کے مطابق مالک، ملک (بکسر المیم) سے ماخوذ ہے اور ملک (بفتح المیم و کسر اللام یعنی بادشاہ) ملک (بنم المیم) سے۔ لیکن لسان العرب کے حوالہ مذکورہ بالا سے واضح ہے کہ ملک بالکسر اور ملک بانتم بلکہ ملک بالفتح ہر سہ کے متنی ایک ہی ہیں۔ پس تفریق و ترجیح کی تفصیل و تطویل بے سود ہے۔

حروف م۔ ل۔ ک کی ترکیب قوت، شدت، قدرت اور تصرف وغیرہ معانی کے لیے ہوتی ہے۔ مثلاً "ملک الطريق" (فتح المیم) رستے کے وسط کو کہتے ہیں اور ملک الدار (بنم المیم و اللام) چوہائے کے پانچوں کو کہتے ہیں کہ وہ ان کے سارے پر گھڑا

لے گا۔ تاکہ میں بھی اپنی رویت اور مالکیت و ملکیت کا ذکر کیا اور فاتحہ قرآن پر بھی یہی معانی ذکر کیں۔ پس ابتداء و انتهاء باہم متاسب ہو گئے؟ اور یہ امر حسن تالیف و ترتیب میں داخل ہے اور اس امر کی دلیل ہے کہ اس کلام کا مرتب و مؤلف اپنے مقاصد اور سلسلہ مضامین کو نہایت خوبی سے نگاہ رکھتے والا ہے۔ (قولی مع الزیادہ)

ہوتا ہے اور اس کے ضابطہ (کنٹرول) اور ہانگنے والے (ڈرائیور) کو بھی کہتے ہیں کہ وہ اس پر غکار و ضابطہ و تصرف ہوتا ہے۔ اسی طرح ملاک الامر اس امر کو کہتے ہیں۔ جس پر مدار کار ہو۔ چنانچہ لسان العرب میں ہے۔ و ملاک الامر الذی یعتمد علیہ و ملاک الامر و ملاکہ ما یقوم بہ و فی الحلیث ملاک الدین الورع' الملاک (بالکسر و الفتح) قوام الشئ و نظامہ و ما یعتمد علیہ (جلد ۱۲ ص ۳۸۳)

اور یہ تمام معانی جو اس ترکیب (م' ل' ک) کے ضمن میں ہیں۔ حق سبحانہ و تعالیٰ کے حق میں ثابت ہیں۔ کیوں کہ وہ ذو القوۃ التین میں بھی ہے۔ وہ حامی و قوم بھی ہے۔ ہر ایک کا سارا ہے اور ہر جان پر قابض و تصرف اور ضابطہ ہے۔ چنانچہ فرمایا۔ لی اللہ ہو الرزاق ذو القوۃ المتین ○ (ذاریات پ ۲۷) بے شک اللہ ہی ہے۔ رزاق' صاحب قوت' پختہ کار۔ نیز فرمایا۔ اقمن ہو قائم علی کل نفس بما کسبت و جعلوا اللہ شرکاء (رعد پ ۱۳) کیا وہ جو قائم و ضابط ہے ہر نفس پر۔ اس کے کسب کی وجہ سے (اس جیسا ہو سکتا ہے جو ایسا نہیں ہے) اس پر بھی ان لوگوں نے خدا کے شریک ٹھہرا لیے ہیں۔

تنبیہ:- مولوی محمد علی صاحب لاہوری نے اپنی "تفسیر بیان القرآن" میں ملک (بالفتح) اور مالک کا فرق ایسے طریق پر لکھا ہے کہ آپ قرات ملک (بغیر الف) کے قائل معلوم نہیں ہوتے۔ اگر ایسا ہی ہے تو یہ ان کی فن روایت سے ناواقف کی وجہ سے ہے۔ کیوں کہ ہر دو قراتیں متواتر ہیں۔ کسی سے بھی انکار نہیں ہو سکتا۔ (کما قد متا)

- حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں:- قرء بعض القراء ملک یوم الدین و قرء اخرون

ملک و کلاهما صحیح متواتر فی السبع (ص ۴۲)

"بعض قاریوں نے ملک (بغیر الف) کے پڑھا ہے اور بعض نے ملک (بالالف)

اور ان میں سے ہر ایک قرات بعد میں صحیح اور متواتر ہے۔"

۲۔ شیخ مشائخنا حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب" ہر ایک کے تفصیلی وجوہ بیان کرنے

کے بعد فرماتے ہیں۔ "میر حل وجوہ ترجیح از ہر جہت موجود است و تواتر در ہر طرف

متفق' پس تصویل کلام در اینجا محض فضول است۔" (ص ۲۸)

۳۔ شیخ ثینا حضرت سید صدیق حسن خاں صاحب فتح البیان میں فرماتے ہیں:-

ولقرءان مرويتان عن النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وابی بکر و عمر
ذکرهما الترمذی (صح، ص ۲۸)

”دونوں قراتیں نبی کریم ﷺ اور حضرت ابو بکر صدیقؓ و حضرت عمرؓ سے مروی
ہیں۔ دونوں کو امام ترمذیؒ نے ذکر کیا ہے۔“

فائدہ:- اللہ تعالیٰ جب رب العالمین سے تو ہر وقت اور ہر عالم میں ہر شے کا مالک ہے۔
لیکن چونکہ اس جگہ اثبات جزا اور یہ جتنا مقصود ہے کہ اس دن اللہ رب العالمین کے سوا
کسی کی ملکیت و بادشاہت نہ ہوگی۔ نہ حقیقی اور نہ عارضی۔ اس لیے مالک کو یوم الدین
کی طرف مضاف کر کے ذکر کیا۔ (فافہم)

یوم عموماً وقت کے اس حصے کو کہتے ہیں جو طلوع آفتاب سے غروب تک ہوتا ہے۔
(لسان العرب) اس کی جمع ایام ہے اور اس صورت میں مجموع دن رات پر شامل ہوتا
ہے۔ جیسے حضرت زکریاؑ کے ذکر میں سورہ آل عمران میں فرمایا۔ ثلاثۃ ایام (پ ۳) اور
سورہ مریم میں فرمایا۔ ثلاث لیل (پ ۱۶) (میر عفی عنہ) اور کبھی بغیر تحدید کے اس
سے مطلق وقت بھی مراد لیا جاتا ہے۔ (لسان العرب)

الدین: دین سے مراد ہے جزا، نیک ہو یا بد، چنانچہ صحیح بخاریؒ میں ہے۔ والدین الجزء
فی الخیر والشر کما تدین تدان یعنی دین جزا کو کہتے ہیں۔ نیکی میں بھی اور بدی میں
بھی۔ جیسے کہ وارد ہے۔ کما تدین تدان یعنی جیسا تو کرے گا ویسا بھرے گا اور حماسہ میں
ہے:-

فلما صرح الشر و امسى و هو عریان
ولم یبق سوی الحدوان دناہم کما دانوا

”جب (ہمارے مخالفین کی) شرارت کھلم کھلا ظاہر ہو گئی اور سوائے زیادتی کے
کچھ باقی نہ رہا تو ہم نے بھی ان سے ویسا ہی کیا جیسا کہ انہوں نے ہم سے کیا تھا۔“

حافظ ابن حجرؒ نے ”فتح الباری“ میں لکھا ہے کہ دین کے اور بھی بہت سے معانی
ہیں۔ مثلاً ”عادت، عمل، حکم، حال، خلق، طاعت (بندگی)، قمر (غلبہ)، ملت، شریعت،
ورع (پرہیز گاری)، اور سیاست (کتاب التفسیر، جلد ۱۸، ص ۱۱۲)

ان معانی میں سے کئی ایک کے لیے یہ لفظ قرآن شریف اور احادیث میں وارد

ہے۔ جن کی مثالوں سے طوالت کا خوف ہے۔ اسی طرح شیخ کبیر صدر الدین قنویؒ تفسیر سورہ فاتحہ میں فرماتے ہیں:-

لن للفظۃ الدین فی اللسان علة معان منها الجزاء والعلة والطاعة والشان و
دله فی اللغة الخلة واستعبده و ساسه و ملکہ و الدیان المملک و الدین الاسلام
ایضاً۔ فہنہ المعانی کلہا تتضمنہا لفظۃ الدین و ہی باسرها مقصودہ
للحق لکمل کلامہ (ص ۱۹۲)

”زبان عربی میں لفظ دین کے کئی ایک معنی ہیں۔ جزا، عادت، طاعت، شان اور
دان (ماضی) کے معنی ہیں۔ اس نے اس کو اپنا ماتحت اور غلام بنالیا اور اپنی سیاست اور
ملک میں لے لیا اور دیان مالک کو کہتے ہیں اور دین سے مراد اسلام بھی ہے۔ پس یہ سب
معانی لفظ دین کے ضمن میں محفوظ ہیں اور سب قصود حق ہیں کیوں کہ اللہ کا کلام کامل
ہے۔“

مرکب یوم الدین سے مراد یوم قیامت ہے۔ کیوں کہ پوری جزا اور حساب
کے لیے یہی دن مقرر ہے۔ دنیا اور برزخ میں جزا جزوی ہے۔ جیسا کہ آئندہ طور پر
مذکور ہوگا۔ (ان شاء اللہ) چنانچہ فرمایا:-

وانما توفون اجورکم یوم القیمۃ (آل عمران، پ ۴)
”بات یہی ہے کہ تمہارے پورے اجر تم کو قیامت ہی کے دن ملیں گے۔“

☆ و ما اجرک ما یوم الدین ○ ثم ما اجرک ما یوم الدین ○ یوم لا تملک
نفس لنفس شیئاً ○ والامر یومئذ للہ ○ (انفطار، پ ۳۰)

”اے پیغمبر! ہمیں کیا معلوم کہ یوم الدین کیا ہے۔ پھر یہ کہ ہمیں کیا معلوم ہے
کہ روز جزا کیا ہے؟۔ (وہ) وہ دن ہے جس دن کوئی جان کسی جان کے لیے کسی چیز کا مالک
بھی مالک نہیں ہوگی اور اس دن ہر امر اللہ کے اختیار میں ہوگا۔

نکتہ:- سورہ فاتحہ میں مقام حمد میں فرمایا کہ اللہ ہی روز جزا کا مالک ہے اور سورہ انفطار
میں فیر کی مالکیت کی فقی کر کے فرمایا کہ اس روز ہر امر خدا کے اختیار میں ہوگا۔
کچھ مقام حمد میں بیان کیا جائے، بلاغت کی رو سے اس میں صربایا جاتا ہے۔ پس سورہ
فاتحہ میں جو کچھ نمنا ”محفوظ ہے“ وہ سورہ انفطار میں صراحہ ”محفوظ ہے۔“

روز قیامت کے کئی ایک نام ہیں۔ ہر نام کی الگ الگ وجہ ہے۔ (جیسا کہ ان
 اللہ تعالیٰ ابھی آئے گا) چونکہ یہاں پر قصود اثبات جزا ہے اس لیے یوم الدین کہا گیا
 اس یوم الدین کی اخلافت اپنے اسم مالک کی طرف اس لیے کی کہ اس دن مالکوں کی
 ملکیت اور سب بادشاہوں کی بادشاہت چھن جائے گی اور گو آج بھی بادشاہوں کی
 بادشاہت اور مالکوں کی مالکیت حقیقی نہیں ہے، محض نمائشی و عارضی ہے لیکن اس روز یہ
 عارضی و نمائشی بھی نہ رہے گی۔ چنانچہ فرمایا۔ **لَمَّا مَلَكَ يَوْمَ يَوْمِ لَكَ الْوَاحِدُ الْقَهْلَرُ** ○
 (مومن' پ ۲۳) یعنی (اللہ تعالیٰ کی طرف سے ندا ہوگی) آج کس کی بادشاہت ہے؟۔
 ملنے کا عالم ہو گا۔ سب منہ اونٹھے کیے ہوں گے۔ جیسا کہ فرمایا۔ **وَعَسَتْ الْوُجُوهُ**
لِلْحَيِّ الْقَيُّومِ (ط' پ ۴) یعنی سب چہرے حی قیوم اللہ کے سامنے عاجز ہوں گے۔ ایسی
 حالت میں کوئی کچھ بھی جواب نہیں دے سکے گا تو خود اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔ **لِلَّهِ الْوَاحِدُ**
الْقَهْلَرُ یعنی آج صرف اکیلے اور زبردست اللہ کا راج ہے۔ سمجھیں میں وارد ہے کہ اللہ
 رب العزت پکارے گا۔ **اَيْنَ الْجَبَلُونَ** این المتکبرون؟ یعنی جو دنیا میں بڑے
 زبردست بنتے تھے، کہاں ہیں نیز جو اپنے خیال میں بڑے بنتے تھے، وہ کہاں ہیں؟۔ (ابن
 کثیر) آگے آئیں اور عزت و کبریائی کا دعویٰ کریں۔ لیکن کسی کو بھل دم زدن نہیں
 ہوگی۔)

تنبیہ:- حیرانگی ہے کہ مولوی حکیم نور دین صاحب قادری نے باوجود عالم و حافظ
 قرآن ہونے کے غضب کیا کہ قیامت سے اوپر دنیا اور قبر کو بھی یوم الدین بنا دیا۔ اس
 خیال سے کہ کچھ نہ کچھ جزا یہاں بھی ملتی ہے۔ حکیم صاحب نے دین کے معنی کو دیکھا اور
 اس کے مضاف یوم اور الف لام تفریق کو نہ دیکھا کہ اس میں تخصیص ہو گئی ہے۔ اگر
 تمام جزا مراد ہوتی تو مالک الدین کہا جاتا نہ کہ مالک یوم الدین نیز تفصیل بالا سے ظاہر ہو چکا
 ہے کہ قرآن حکیم میں یوم الدین سے مراد روز قیامت ہے۔ اس طرح کی دیگر آیات بھی
 ہیں۔ مثلاً "دوزخی اپنے دوزخ میں پڑنے کے اسباب میں کہیں گے۔ و کنا نکذب
 یوم الدین" ○ (مذثر' پ ۲۹) یعنی ہم اس لیے بھی دوزخ میں ڈالے گئے کہ ہم یوم جزا
 کے منکر تھے۔

اسی طرح سورۃ واقعہ میں دوزخیوں کی خوراک تموہر اور گرم پانی کا ذکر کر کے

فرمایا۔ ہذا نزلہم یوم الدین (واقعہ، پ ۲۷) یعنی یوم جزا میں یہ ان کی مسمانی ہوگی۔ اسی طرح سورہ صافات میں پہلے فرمایا کہ منکرین قیامت مر کر اٹھنے کو مستعد جانتے ہیں پھر اس کے جواب میں فرمایا۔ فانما ہی زجرة واحدة ○ فانہم ینظرون ○ وقالوا یا ربنا ہذا یوم الدین ○ ہذا یوم الفصل الذی کنتم بہ تکتبون ○ (صافات، پ ۲۳) یعنی وہ تو صرف ایک چنگھاڑ ہوگی کہ اچانک وہ دیکھنے لگیں گے۔ بائے ہماری خرابی یہ تو یوم الدین ہے۔ (تو ان کو کہا جائے گا) ہاں) یہ وہی فیصلے کا دن ہے۔ جس کا تم انکار کرتے تھے۔ ایک ہی سخت آواز سے سب مردوں کا جی اٹھا سورہ نازعات، پ ۳۰ میں بھی وارد ہے اور یوم الفصل بھی قیامت ہی کا ایک نام ہے۔ (جیسا کہ ان شاء اللہ تعالیٰ عنقریب آئے گا) حکیم صاحب سے حافظ قرآن ہو کر اتنی آیات قرآنیہ فراموش ہو گئیں۔ حفظت شیئاً وغابت عنک اشیاء

مولوی محمد علی لاہوری نے بھی حکیم صاحب کی تقلید میں یوم الدین کو عام بنا دیا۔ حق استادی کا خیال آیا اور قرآن شریف کی اتنی تصریحات کا لحاظ نہ آیا۔ خیر یہ تو شاید معذور ہوں کیوں کہ یہ بے چارے نہ قرآن کے حافظ نہ عربی زبان و قواعد عربی کے ماہر نہ دینیات کے عالم لیکن جو شاف ان کے ساتھ معاون و مددگار تھا اور جن کا وہ دیباچہ میں شکر یہ ادا کرتے ہیں۔ کیا ان میں سے کوئی بھی حافظ و عالم نہیں تھا، جو کہتا کہ حضرت یوم الدین کی تفسیر خود اللہ تبارک و تعالیٰ نے کر دی ہے۔ ایس منکم رجل رشید قرآن حکیم میں روز قیامت کے نام بت آئے ہیں۔ ہر ایک نام الگ اعتبار سے ہے۔ مثلاً "یوم الدین (جزا کا دن)"، "الیوم الآخر (سب سے پچھلا دن)"، "یوم النہر (مردوں کے جی اٹھنے کا دن)"، "یوم عظیم، یوم کبیر (بڑا دن)"، "یوم مشہود (حاضری کا دن)"، "یوم البعث (مردوں کے اٹھنے کا دن)"، "یوم الحمرۃ (افسوس کا دن)"، "یوم الفصل (فیصلے کا دن)"، "یوم الحساب (اعمال و حساب کا دن)"، "یوم اتفاق (اللہ رب العزت کی ملاقات کا دن)"، "یوم الازدہ (نزدیک آنے والی ساعت کا دن)"، "یوم الوعد (وعدہ عذاب کا دن)"، "یوم الخروج (قبروں سے نکلنے کا دن)"، "یوم الخلود (پیشگی کا دن)" اور "یوم التغابن (افسوس کا دن)" ان کے علاوہ اس عالم دنیا کے مقابلے میں یہ نام بھی ہیں۔ الاخرۃ، السلام الواقع (ضرور واقع ہونے والی)، الحاقۃ (حق ثابت ہو چکی)، القارۃ (کھڑکھراتی)

الغاشیہ (ذہانپ لینے والی) ان کے علاوہ دیگر صفات سے بھی اس دن کا ذکر بکثرت ایسے طریق سے آیا ہے کہ اس سے سوائے روز قیامت کے اور کچھ سمجھا نہیں جاتا۔ مثلاً "یوم یجمع اللہ الرسل (مائدہ) یعنی جس دن اللہ تمام رسولوں کو جمع کرے گا۔ ولہ الملک یوم ینفخ فی الصور (انعام) یعنی جس دن قرآن میں پھونکا جائے گا تو صرف اسی کی پوشائی ہوگی۔ و یوم نسیر الجبل (کف' پ ۱۵) یعنی جس دن چٹانیں گے ہم پھاڑوں کو۔ و یوم یعرض للذین کفرو علی النار (احقاف' پ ۲۶) یعنی جس دن کفار دوزخ کے سامنے کیے جائیں گے۔ ربنا انک جلمع الناس لیوم لا رب فیہ (آل عمران' پ ۳) یعنی اللہ تعالیٰ تو تمام لوگوں کو اس دن جمع کرنے والا ہے۔ جس میں کوئی شک نہیں۔

اعمال پر جزا و سزا کا ترتب

جملہ اعمال (نیک ہوں یا بد) روح کے امر و قصد سے سرزد ہوتے ہیں۔ اعضاء صرف صدور افعال کے آلات اور وسائط و وسائل ہیں جن سے اس کا قصد فعل میں آتا ہے۔ اعضاء پر روح کا تسلط و تصرف ایسا ہے کہ وہ اس کے امر کی ہرگز مخالفت نہیں کر سکتے لیکن روح کا قصد اور اعضاء کو امر کرنا اضطراری نہیں ہے، اختیار ہی ہے۔ جس کی دو جہتیں ہیں۔ کرنے کی بھی اور اس سے رکتے کی بھی اور ضابطہ و کنٹرول ان ہر دو پر قوت عقیدہ ہے، جس کا کام نیکی پر ابھارنا اور بدی سے منع کرنا ہے اور اس کے مقابلے میں ایک اور قوت اس کی ضد بھی ہے جو بدی پر ابھارتی ہے اور نیکی سے منع کرتی ہے اور اس قوت عقیدہ کی رہنمائی کی مقرر کردہ شریعت ہے۔ انسان ان ہر دو قوتوں کے تجاذب میں جلا ہے اور انسان کے بخار بافضل ہونے کے یہی مستحق ہیں کہ اسے یہ ہر دو قوتیں اور ان کے مناسب آلات فعل و ترک بھی عطا کیے گئے ہیں۔ مثلاً آپ کا ہاتھ ہے۔ اگر آپ اس سے کسی مسکین کی دھیری، کسی بے کس کی ادا، کسی حاجت مند کو داد و ہش بھی کر سکتے ہیں تو اس سے کسی پر باحق ظلم و ستم بھی کر سکتے ہیں اور دوسری طرف دھیری سے دنگش بھی ہو سکتے ہیں اور ظلم و ستم سے باز بھی رہ سکتے ہیں۔ یہ سب کچھ آپ کے نفس کے قصد کے ماتحت ہے۔ جس کی اہلیت اس کے خالق نے اس کی فطرت میں رکھی ہوئی

ہے۔ چنانچہ فرمایا۔ و نفس و ما سولھا ○ فلہمہا فاجورھا و تقولھا ○ قد قلعح من زکھا ○ وقد خلب من دسھا ○ (الحسن، پ ۳۰) یعنی قسم ہے جان اور اسے معتدل بنانے کی (حکمت کی) پھر الہام کی اسے برائی اس کی اور پرہیزگاری اس کی۔ بے شک نجات پائے گا، وہ جس نے پاک رکھا اس کو اور نامراد رہے گا وہ جس نے اسے خاک میں ملا دیا۔

اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ اللہ رب العزت نے نفس انسانی کو معتدل حالت پر پیدا کیا ہے اور اس میں نیکی و بدی ہر دو امر کے جذبات رکھے ہیں۔ پس نجات و کامیابی اس کی ہے جو اسے فطری پاکیزگی پر قائم رکھے اور مدراج طہارت میں ترقی پائے اور خرابی و خسران اس کے لیے جو اسے آلودہ کر دے۔

اب اس طہارت و تزکیہ اور آلودگی کی کیفیت معلوم کیجئے تو اعمال پر بڑا کا ترتب ہوتا آپ کے ذہن میں آجائے گا۔ معلوم ہو کہ جس طرح کسی عضو کو کسی فعل کا حکم کرنے کے وقت نفس کے قصد و توجہ کا اثر یہ ہوتا ہے کہ اس عضو میں اشتعال و حرکت پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح نفس کے مقصد و غرض کا اثر عمل پر پڑتا ہے بلکہ اس میں سرایت کر جاتا ہے اور بار بار کے عمل اور کثرت مشق سے نفس اس نیت میں اس طرح منصبغ ہو جاتا ہے کہ گویا اس کا قصد اور اس کی نیت اس کے عمل سے غلط راہی کے درجے میں ہو کر منطبع ہو چکا ہے۔ آیت بلی من کسب سینقوا حاطت بہ خطیئہ فلؤلک اصحب النار ہم فیہا یدخلون ○ (پ ۱) میں یہی حقیقت و حالت ملحوظ ہے یعنی جس کسی نے برائی کو اپنا کسب بنالیا اور اس کی خطاکاری نے اسے (ہر جت) سے گمیر لیا تو وہ لوگ دوزخی ہوں گے۔ وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔

دوسرے مقام پر اسی امر کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ کلابل (مسکنہ) ران علی قلوبہم ما کنوا یکسبون ○ (مطفئین، پ ۳۰) یعنی کوئی نہیں بلکہ زنگ پڑ گیا ہے ان کے دلوں پر بسبب اس کے جو وہ کسب کرتے رہتے تھے۔ اس کے مقابلہ میں یہی حال نیکوکاری کا سمجھ لیجئے۔

پس روح کو اپنے قصد و ارادے اور اپنی غرض و مقصد اور اپنے اعمال و مکتسبہ سے جو انصباغ حاصل ہوتا ہے۔ وہ اس میں بدرجہ غلط راہی ہو جانے کے

اس میں مخزون رہتا ہے اور اس کے جملہ افضل و اعمال بحسب اپنی نوعیت کے اور مطابق اس کی نیت کے عالم مثال میں صورت پکڑتے جاتے ہیں۔ لیٰ خیراً فخیبر ولن شرّاً فشر یعنی اگر اچھے ہوں تو اچھی صورت اور اگر برے ہوں تو بری صورت پکڑتے ہیں لیکن نیک عمل کی اچھی صورت کے لیے یہ شرط ہے کہ اس میں عامل کی نیت و قصد یعنی اس عمل پر اس کا محرک و باعث اور اس عمل سے اس کا مقصد و مطلب بھی پاک ہو یعنی اس عمل سے اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی مطلوب ہو اور خالصاً لوجہ اللہ کیا ہو اور اس کے بعد اس سے کوئی عمل مثلاً رضائے الٰہی سرزد نہ ہو۔ مثلاً شرک و کفر کہ یہ جملہ طاعتوں کو برباد کر دیتے ہیں اور اس نیک عمل کو اللہ تبارک و تعالیٰ کے فرمان و مشا کے مطابق شروع سے اخیر تک ادا کیا ہو تو وہ اعمال بارگاہ الٰہی میں شرف قبولیت پاتے ہیں اور اللہ رب العزت کی رضا جس کی طلب عامل کے قصد و ارادے میں ہوتی ہے۔ اس عامل کے شامل حال ہوتی ہے اور وہ انسان اللہ کی رضا کے کاموں میں بحسب استعداد ترقی کرتا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کے ان نیک اور قبول شدہ اعمال پر نیک جزا مرتب کرتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:-

☆ لقد رضى الله عن المؤمنين لذي يابعونك تحت الشجرة فعلم ما في قلوبهم فأنزل السكينة عليهم وأتاهم فتحاً قريباً ○ و مغنم كثيرة يا خذونها و كان الله عزيزاً حكيماً ○ (فتح، پ ۲۶)

”(اے پیغمبر!) اللہ تعالیٰ ان مومنوں سے اسی وقت راضی ہو گیا تھا جب وہ اس درخت کے نیچے تیری بیعت کر رہے تھے۔ پس جو کچھ ان کے دلوں میں (اخلاص) تھا۔ اسے اللہ تبارک و تعالیٰ نے (علم و افق سے) جان لیا تو ان پر اطمینان (قلب) نازل کیا اور انہیں ایک نزدیک کی فتح (خیر) ثواب میں دے دی اور بہت سے غنائم جنہیں وہ غنقریب حاصل کریں گے اور اللہ تعالیٰ سب کچھ کر سکتا، باہمت ہے۔“

☆ و من الاعراب من يؤمن بالله و اليوم الآخر و يتخذ ما ينفق قربت عند الله و صلوات الرسول الا انها قربة لهم سيدخلهم الله في رحمته ان الله غفور الرحيم ○ و السبقون الاولون من المهاجرين و الانصار و الذين اتبعوهم باحسان رضى الله عنهم و رضوا عنه و اعد لهم جنت تجري تحتها

الانهار خلدیں فیہا ابداً ذالک الفوز العظیم ○ (پ ۱۹)

”اعراب میں سے بعض وہ لوگ ہیں جو اللہ پر بھی اور روز قیامت پر بھی ایمان رکھتے ہیں اور جو کچھ خرچ کرتے ہیں۔ اسے اللہ کے قرب اور رسول ﷺ کی دعا کا موجب جانتے ہیں۔ سن رکھو! بے شک وہ (خرچ) ان کے لیے موجب قرب (خدا) ہوگا۔ (اور) ضرور ضرور ان کو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت (خاصہ) میں داخل کر لے گا۔ بے شک اللہ تعالیٰ بہت بخشنہار (اور) بہت مہربان ہے اور وہ جو مہاجرین و انصار میں سے سابقین اولین ہیں اور وہ جو اخلاص مندی سے ان کے پیچھے آئے۔ اللہ ان سب سے راضی ہو گیا اور وہ اس سے راضی ہوں گے اور اس نے ان کے لیے باغات تیار کر رکھے ہیں۔ جن کے نیچے نہریں چلتی ہیں۔ وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ بڑی کامیابی تو یہی ہے۔“

☆ اولک کتب فی قلوبہم الایمان وابدہم بروح منہ (بخارہ ۲۸)
”اللہ نے ان کے دلوں میں ایمان لکھ دیا ہے اور اپنی روح سے ان کی مدد کی ہے۔“

☆ والذین اہتدوازلہم ہدی واثہم تقولہم ○ (محمد، پ ۲۶)
”اور جو لوگ ہدایت پر آ گئے ہیں۔ ان کو ہدایت زیادہ کی اور ان کو (ان کے درجے کے مناسب) پرہیزگاری بھی بخشی۔“

☆ ویزید اللہ الذین اہتدواہدی و البقیۃ الصلحت خیر عند ربک
ثواباً و خیر مرداً ○ (مریم)

”اور ہدایت یافتہ لوگوں کو اللہ تعالیٰ ہدایت میں ترقی دے گا اور باقی رہنے والی نیکیاں تیرے رب کے نزدیک ثواب میں بھی بہتر ہیں اور انجام میں بھی اچھی سے اچھی ہیں۔“

☆ ان الذین امنو و عملوا الصلحت سیجعل لہم الرحمن وداً ○ (مریم)
(پ ۱۶)

”تحقیق جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل بھی کئے۔ خدائے رحمن ان کے لیے ضرور ضرور دوستی مقرر کرے گا۔“

☆ اولئک علیہم صنوات من ربہم ورحمة و لوئک ہم المہتدون ○ (بقرہ)

پ (۲)

”ان لوگوں پر ان کے رب کی خصوصی عنایتیں ہوں گی اور رحمت بھی“ اور یہی ہدایت یافتہ ہیں۔“

برے اعمال پر بری جزا۔ اور اگر وہ اعمال برے ہوں یا عامل کی نیت و قصد برا ہو یا خدا کی منشا کے مطابق بجا نہ لائے گئے ہوں تو خدا کی درگاہ سے رد ہو کر حسب مدارج بری جزا یعنی سزا کے مستوجب ہوتے ہیں اور عامل پر خدا کی پھٹکار ہر وقت پڑتی رہتی ہے اور وہ ایک حد تک خدا کی درگاہ سے راندہ جاتا ہے کیوں کہ اللہ رب العزت سے پاک نیت، پاک مقصد اور پاک عمل کو نسبت ہے، خبیث کو نہیں۔ اسی حقیقت کو سمجھانے کے لیے حدیث پاک میں فرمایا۔ لا یقبل اللہ الا الطیب الحدیث متفق علیہ (مکھوۃ ص ۱۵۹) یعنی اللہ تعالیٰ صرف طیب (مال یا عمل) کو قبول کرتا ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ الیہ یصعد الکلم الطیب والعمل الصالح یرفعہ (فاطر پ ۲۲) یعنی اللہ ہی کی طرف چڑھتا ہے پاک کلمہ اور جو نیک عمل ہے، خدا اسے بلند کرتا ہے۔ اور اسی کے مطابق آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص پڑھے سبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر وتبارک اللہ تو اللہ رب العزت ان کلمات کی حفاظت کے لیے ایک فرشتہ مقرر کر دیتا ہے جو ان کو اپنے پر کے نیچے جمع کر کے آسمان کو چڑھ جاتا ہے۔ وہ فرشتہ ان کلمات کو لے کر ملائکہ کی جس جماعت کے پاس سے گزرتا ہے۔ وہ جماعت ان کلمات کے پڑھنے والے کے لیے دعائے بخشش کرتی ہے۔ حتیٰ کہ یہ کلمات خدائے رحمن کے سامنے (قبولیت کے لیے) پیش کیے جاتے ہیں اور جب خدا کی درگاہ سے راندہ گیا تو اسے ملائکہ اور تمام دیگر لوگوں کی طرف سے بھی لعنت و ملامت کی بوچھاڑ پڑتی رہتی ہے کیوں کہ جب اس کے لیے درگاہ خداوندی (ہیڈ آفس) سے (Vote Of Censure) ملامت کا ووٹ پاس ہو گیا تو کسی اور ماتحت دربار میں اس کی سنائی کیسے رہ سکتی ہے۔ (اعاذنا اللہ منها) ایسے لوگوں کی نسبت فرمایا۔

☆ وَالَّذِينَ يَنْقُضُونَ عَهْدَ اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مِيثَاقِهِ وَيَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ يُوصَلَ وَيُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ لَوْ لَكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوءُ الدِّلْرِ ○ (رد، پ ۱۱۳)

”اور جو لوگ اللہ کا عہد اس کے پختہ کرنے کے بعد توڑ دیتے ہیں اور خدا نے جس کے ملانے کا حکم دیا ہے اسے قطع کر دیتے ہیں اور زمین میں فساد برپا کرتے ہیں۔ ان کے لیے (خدا کی) پٹکار ہے اور ان کے لیے برا کمر ہے۔“

☆ لَنْ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَى مِنْ بَعْدِ مَا بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ فِي الْكُتُبِ لَوْ لَكَ يَلْعَنَهُمُ اللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللَّاعِنُونَ ○ (بقرہ، پ ۲)

”بے شک وہ لوگ جو اس حقیقت کو چھپا دیتے ہیں جو خدا نے روشن دلائل اور ہدایت کی جنس سے نازل کی ہے۔ بعد اس کے کہ ہم نے اسے لوگوں (کی ہدایت) کے لیے (اپنی) کتاب میں کھول کر بیان کر دیا ہے۔ ان پر خدا بھی لعنت کرتا ہے اور دیگر لعنت کرنے والے بھی لعنت کرتے ہیں۔“

☆ لَوْ لَكَ جِزَاءُ هُمْ لَنْ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ○ (آل عمران، پ ۳)

”ان لوگوں کی جزائی ہے کہ ان پر اللہ تعالیٰ فرشتوں اور جنوں و انسانوں کی لعنت (ہوتی رہتی) ہے۔“

☆ لَوْ لَكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللَّهُ وَمَنْ يَلْعَنُ اللَّهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهُ نَصِيرًا ○ (النساء، پ ۵)

”یہ وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے ملعون قرار دیا اور جسے اللہ ملعون گردانے تو تو اس کے لیے کوئی مددگار نہیں پائے گا۔“

اس مضمون کی بہت سی آیات ہیں لیکن تفہیم کے لیے اسی قدر کافی ہیں۔

ختم، طبع وغیرہ۔ کفر و عصیان اور ترویج سرکشی کا یہ وہ شیخ ہے، جہاں پر اللہ تعالیٰ ایسے ناانجباروں کا ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ ان سے اپنی توفیق و حمایت خصوصی ہٹا لیتا ہے اور

اس کے کسی دربار میں ان کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ اسے شریعت کی زبان میں ختم، طبع وغیرہ الفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:-

☆ فہل عسیتم لن تولیتم لن تفسدوا فی الارض و تقطعوا الرحامکم
لو لک الذین لعنہم اللہ فاصہمہم و اعمی ابصارہم ○ اقلا یتدبرون القرآن لم
علی قلوب اقفالہا ○ (محمدؐ پ ۲۶)

”پھر تم سے یہ بھی توقع ہے کہ اگر تم کو حکومت مل جائے تو تم خرابی ڈالو ملک میں اور توڑو اپنے رشتے۔ ایسے لوگوں کو پھٹکار دیا اللہ نے اور ان کو بہرا کر دیا اور ان کی آنکھیں اندھی کر دیں تو کیا یہ قرآن میں دھیان نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر تالے لگ گئے ہیں۔“

☆ و منهم من یستمع الیک حتی اذا خرجوا من عندک قالوا للذین لو توالوا
العلم ما ذا قلنا لفلان لو لک الذین طبع اللہ علی قلوبہم و اتبعوا لہواءہم ○
(محمدؐ پ ۲۶)

”اور ان میں سے بعض وہ ہیں جو تیرے پاس سننے کے لیے آتے ہیں۔ حتیٰ کہ جب تیرے پاس سے نکل کر جاتے ہیں تو ان لوگوں سے جن کو علم ملا ہے۔ کہتے ہیں کہ ابھی اس (پیغمبرؐ) نے کیا کہا تھا؟۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں پر اللہ نے مہر لگا دی ہے اور وہ اپنی خواہشوں کے پیرو ہو گئے ہیں۔“

☆ لن الذین کفروا بعد ایمانہم ثم لردلوا کفرًا لن تقبل توبتہم و لو لک ہم
الضالون ○ (پ ۳)

”بلاشبہ جن لوگوں نے ایمان لانے کے بعد کفر اختیار کر لیا اور پھر کفری میں بدھتے گئے۔ ان کی توبہ ہرگز قبول نہیں ہوگی اور یہ وہی لوگ ہیں جو راستے سے ہٹ گئے۔“

☆ لن الذین امنوا ثم کفروا ثم امنوا ثم کفروا ثم لردلوا کفرًا لم یکن اللہ
لیغفر لہم و لا لیہدہم سبیلًا ○ (النساءؐ پ ۶)

”بلاشبہ جو لوگ ایمان لائے پھر انہوں نے کفر اختیار کر لیا۔ پھر وہ ایمان لے آئے پھر کفر اختیار کر لیا۔ پھر اس کفر میں ہی زیادہ ہوتے گئے۔ اللہ ایسا نہیں کرے گا کہ

ان کو بخش دے اور نہ ایسا کہ ان کو راہ پر لائے۔“

ان الذین کفروا و ظلّموا لم یکن اللّٰہ لیغفر لهم ولا لیہدیم طریقاً ○ الا طریق جہنم خنّین فیہا ابداً و کان ذالک علی اللّٰہ یسیراً ○ (النساء، پ ۶)

”بلاشبہ جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور ظلم بھی کیا۔ اللہ ایسا نہیں کرے گا کہ ان کو بخش دے اور نہ ایسا کہ ان کو جہنم کے سوا کسی اور طریق پر لے جائے۔ جس میں وہ سدا سدا رہیں گے اور یہ کام اللہ پر بالکل آسان ہے۔“

اس مضمون کی آیات بھی بکثرت ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی درگاہ سے ایسی جزا اپنے ہی اعمال کی سزا ہے اور اپنے کیے ہی کی شامت و وبال ہے ورنہ وہ تفرماتا ہے۔ ما یفعل اللّٰہ بعذابکم ان شکرتم و امنتم و کان اللّٰہ شاکراً علیماً ○ (النساء، پ ۵) یعنی اگر تم شکر گزار اور ایماندار بن جاؤ تو اللہ تعالیٰ کو تمہارے عذاب کرنے سے کیا حاصل؟۔ اللہ تعالیٰ تو (بہت) قدردان (اور) علیم (کل) ہے۔ (ہر ایک کی نیت، حیثیت اور عمل کو جانتا ہے)۔

عام ہیں اس کے تو انعام شہیدی سب پر
تجھ سے کیا ضد تھی اگر تو کسی قابل ہوتا

ہر چہ بہت از قامت نازیبائے ماست
ورنہ تشریف تو بر بالائے کس کوتاہ نیست

پس جس شدت کا کسی کا کفر و عصیان ہے۔ اسی درجے کا اس سے سلوک ہے۔
اس کا عام قانون ہے۔ جزا وفاقاً یعنی جزا موافق اعمال کے۔

دنیا میں جزوی اور عاقبت میں کلی جزا

بے شک پورا فیصلہ اور کلی جزا و سزا تو قیامت ہی کے دن ہوگی جو اللہ رب

تفسیر رحمانی میں اس آیت کی تفسیر میں کہا ہے۔ ای موافقاً لاعمالہم لانہا اوجبت الغضب الحار و هو ناشئ من اعمالہم وقد کثرت لهم تلک الاعمال (سورۃ نباء، پ ۳۰)

العت نے اس کے لیے مقرر کر رکھا ہے اور جس کا ذکر اس آیت زیر تفسیر یعنی ملک یوم الدین میں ہے۔ جیسا کہ فرمایا:-

☆ وانما توفون اجورکم یوم القیمة ○ (آل عمران، پ ۴)

”بات یہی ہے کہ تم کو تمہارے اعمال کی پوری جزا قیامت کے دن ملے گی۔“

☆ ان یوم الفصل میقاتہم اجمعین ○ (دخان، پ ۲۵)

”بے شک فیصلے کا دن ان سب کا وقت مقرر ہے۔“

لیکن بعض اوقات بتقاضائے حکمت ہمارے بعض اعمال (نیک یا بد) کے آثار و نتائج اس دنیا میں بھی ظاہر کر دیئے جاتے ہیں۔ جس سے اللہ تعالیٰ کی رضا و ناراضی معلوم کر کے انسان راہ پا سکتا ہے۔ چنانچہ جب کامل الایمان، صالح الاعمال بندہ مدارج حسنت میں ترقی کرتا کرتا درگاہ خداوندی میں مقبول ہو جاتا ہے اور اس کے اعمال وہاں قدر دانی کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں اور وہ خدا کا دوست و ولی بن جاتا ہے۔ تو اس کی نسبت فرمایا:-

الان لولیاء اللہ لا خوف علیہم ولا ہم یحزنون ○ الذین امنوا وکانوا یتقون ○ لهم البشری فی الحیوة الدنیا و فی الآخرة لا تبدل لکلمت اللہ ذلک هو الفوز العظیم ○ (یونس، پ ۱۱)

”سن رکھو! بے شک خدا کے دوست ان پر کوئی خوف نہیں ہوگا اور نہ وہ غمزدہ ہوں گے۔ وہ جو ایمان لائے اور (عمل میں) پرہیزگار رہے۔ ان کے لیے دنیوی زندگی میں بھی بشارت ہے اور آخرت میں بھی، خدا کی بات میں تبدیلی نہیں۔ یہی تو بڑی عظیم کامیابی ہے۔“

یہ قبولیت بعض افراد میں یوں ظاہر ہوتی ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ ان کو زمین میں اپنا خلیفہ و نائب مقرر کر کے دنیا کا نظم و نسق ان کے سپرد کرتا ہے تاکہ وہ اس کے شرعی نظام کو قائم کریں۔ چنانچہ فرمایا:-

وعد اللہ الذین امنوا منکم و عملوا الصلحت لیستخلفنہم فی الارض کما استخلف الذین من قبلہم و لیمکننہم دینہم الذی ارتضیٰ لہم و لیبذلنہم من بعد خوفہم امنًا، یعبدوننی لا یشرکون بی شیئاً، ومن کفر بعد

ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ○ (نور، پ ۱۸)

”تم (منہ کے مدعی اور خالص مسلمانوں) میں سے جو خالص مسلمان ہیں اور ان کے کام بھی اچھے ہیں۔ ان سے خدا کا وعدہ ہے کہ ان کو زمین میں حاکم کرے گا۔ جس طرح حاکم بنایا تھا۔ ان سے پہلے لوگوں کو اور قائم کر دے گا ان کے لیے ان کا دین جو اس نے ان کے لیے پسند کیا ہے۔ اور ان کو ان کے خوف کے بدلے میں امن دے گا۔ (وہ اس شوکت کے وقت) میری ہی عبادت کریں گے (اور) کسی چیز کو بھی میرا شریک نہیں گردانیں گے اور جو کوئی اس (نشان کے پورا ہونے) کے بعد بھی کافر رہے گا تو وہ لوگ نافرمان (شمار) ہوں گے۔“

و لورثنا القوم الذین کانوا یتستضعفون مشرق الارض و مغربھا الّتی بارکنھا فیہا و تمت کلمت ربک الحسنی علی بنی اسرائیل بما صبروا (اعراف، پ ۹)

”اور وارث بنایا ہم نے ان لوگوں کو جو ضعیف رکھے جاتے تھے۔ اس زمین کی مشرقی اطراف کا بھی اور مغربی جو اب کا بھی۔ جس میں ہم نے امت برکت دے رکھی ہے۔ (یعنی تمام علاقہ شام کا) اور اے پیغمبر! میرے رب کا نیک وعدہ بنی اسرائیل پر ان کے مبرکی وجہ سے پورا ہو گیا۔“

جد انبیاء حضرت ابراہیمؑ کو جو کئی ایک احتمالات میں لول نمبر ہی کامیاب ہوتے رہے۔ تمام دنیا کا پیشوا بنایا۔ ان کی نسبت فرمائی۔

ولقد اصطفینہ فی الدنیا و اٰتینہ فی الآخرة لمن الصّٰلِحین ○ (پ ۱)

”اور البتہ جن لیا ہم نے اس کو دنیا میں اور بے شک وہ آخرت میں بھی صالحین سے ہو گا۔“

واتینہ فی الدنیا حسنۃ و اٰتینہ فی الآخرة لمن الصّٰلِحین ○ (نمل، پ ۱۳)

”اور دی ہم نے اس کو دنیا میں بھی نیک اور بے شک وہ آخرت میں البتہ صالحین سے ہو گا۔“

ووهبنا لہ اسحق و یعقوب و جعلنا فی ذریتہ النبوة و الکتاب و اتینہ اجرہ فی الدنیا و اٰتینہ فی الآخرة لمن الصّٰلِحین ○ (محمّد، پ ۲۰)

”اور عطا کیا ہم نے اس کو اسحق (بیٹا) اور یعقوب (پوتا) مقرر کر دی ہم نے اس کی اولاد میں نبوت اور کتاب اور دیا ہم نے اس کو اجر اس کا دنیا میں بھی اور بے شک وہ آخرت میں بھی صالحین سے ہو گا۔“

فقد اتينا آل ابراهيم الكتاب والحكمة واتينهم ملكا عظيمًا ○ (انعام پ ۵) ”پس ہم (اس سے پہلے) دے چکے ہیں آل ابراہیم کو کتاب اور حکمت اور ہم نے ان کو ایک عظیم سلطنت بھی دی تھی۔“

مقام حدیبیہ پر صحابہ کرام کی مقدس جماعت نے جس جاں فثاری، وقاداری اور ہمت قدی کا اظہار کیا۔ اس پر فرمایا:-

لقد رضى الله عن المؤمنين لاذي ياعونك تحت الشجرة فعلم ما فى قلوبهم فانزل السكينة عليهم واثبهم فتحا قريبا ○ و مغنم كثيرة يا خفونها و كان الله عزيزا حكيما ○ و عدكم الله مغنم كثيرة تاخفونها فعجل لكم منه و كف ايدي الناس عنكم و لتكون اية للمؤمنين و يهديكم صراطا مستقيما ○ و اخبرني لم تقفروا عليها قد احاط الله بها و كان الله على كل شئ قديرا ○ (فتح پ ۲۹)

”اے پیغمبر! ان مومنوں سے اللہ اسی وقت راضی ہو گیا تھا جب وہ (کتنے مرنے کے لیے) اس درخت کے نیچے تیری بیعت کر رہے تھے۔ پس جو کچھ ان کے دلوں میں (اخلاص) تھا۔ اسے اللہ نے (علم واقعی سے) جان لیا تو ان پر اطمینان (قلب) نازل کیا اور ان کو نزدیک کی فتح (خیر) ثواب میں دی اور بت سے غنائم بھی جو وہ لیں گے اور اللہ تعالیٰ بڑا زبردست (اور) باحکمت ہے۔ اللہ نے تم سے (دیگر) بت سے غنائم کا وعدہ بھی کر رکھا ہے جو تم کو ملیں گے۔ پس یہ (غنیمت خیر) تم کو جلد ہی دے دی اور لوگوں کے ہاتھ تم سے ہٹائے رکھے اور تاکہ یہ مومنوں کے لیے ایک نشان (علامت ہو) اور (اللہ تعالیٰ) تم کو سیدھی راہ کی سوجھ بوجھ عطا کرے اور ایک (فتح) بھی ہے۔ (یعنی فتح مکہ) جس پر تم اس وقت قادر نہیں (لیکن) وہ اللہ تعالیٰ کے احاطہ (قدرت) میں ہے اور اللہ تعالیٰ ہر شے پر قادر ہے۔“

انبیاء سابقین کی عازی جماعت کے لیے فرمایا:-

و ما كان قولهم الا لن قلوبنا غفرتنا و اسر قلوبنا و ثبت
قلوبنا و انصرنا على القوم الكافرين ○ فاتهم الله ثواب الدنيا و حسن ثواب
الآخرة و الله يحب المحسنين ○ (آل عمران، پ ۴)

”(مقابلہ کے وقت) ان کا کلمہ صرف یہی ہوتا تھا کہ اے ہمارے پروردگار! ہمارے گناہ بخش دے اور ہماری زیادتی بھی جو ہم سے کسی امر میں ہو گئی ہو اور ہمارے قدم جمائے رکھ اور کافر لوگوں کے مقابلہ میں ہماری مدد کر۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کو دنیا کا ثواب بھی دیا اور عاقبت کا نیک ثواب بھی اور اللہ تعالیٰ نیکو کاروں کو اپنا محبوب بنا لیتا ہے۔“

اس قسم کی دیگر آیات بھی ہیں۔ جن میں ایمانداروں اور نیکو کاروں کو اس دنیا میں بھی نیک جزا دینے کا ذکر ہے۔ ان کے مقابلے میں خدا کے ساتھ شریک مقرر کرنے والوں، خدا کے پیغمبروں اور خدا کی آیات کو جھٹلانے والوں، یوم جزا سے انکار کرنے والوں، اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتوں سے بہرہ ور ہو کر فسخ و فجور میں اوقات بسر کرنے والوں، زبردستوں اور بے کسوں پر ظلم و ستم ڈھانے والوں، فرض خدا کی مرضی کے خلاف چلنے والوں، نافرمانوں کی دنیوی بری سزا کا ذکر بھی پیش از پیش ہے۔ چنانچہ فرمایا: و کاین من قرية عنت عن امر ربها و رسله فحاسبنها حساباً شديداً و عذبنا عذاباً نكراً ○ فلنقت و بل امرها و كان عقبة امرها خسراً ○ (طلاق، پ ۲۸)

”اور بہت سی بستیاں ہو گزری ہیں، جنہوں نے اپنے رب اور اس کے رسولوں کے امر سے سرکشی کی۔ تو ہم نے ان کا سختی سے محاسبہ کیا اور ان کو بہت برا عذاب کیا۔ تو انہوں نے اپنے کام کا وبال چکھ لیا اور ان کے کام کا انجام بالکل گھٹائی گھٹا تھا۔“
فارسلنا عليهم ريحا صرصراً في ايام نحسات لنذيقهم عذاب الخزي في الحياة الدنيا و لعذاب الآخرة الخزي و هم لا ينصرون ○ (تم سجدہ، پ ۲۴)

”پس ہم نے ان پر نہایت منحوس دنوں میں تہ ہوا (آندھی) چھوڑے رکھی تاکہ ان کو دنیوی زندگی میں (بھی) خواری کا عذاب چکھائیں اور آخرت کا عذاب بہت ہی

خواری کا ہے اور وہیں ان کو کسی طرح کی مدد نہیں مل سکے گی۔“

و لنذيقنهم من العذب الاذنى دون العذب الاكبر لعلهم يرجعون ○ (الم
بجہ ۲۱)

”اور ہم نے ان کو بڑے عذاب سے اور ادنیٰ عذاب بھی چکائیں گے تاکہ وہ
رجوع کر سکیں۔“

ڈاکوؤں، رہزموں، تاجروں، غارت سے دنیا جہان کے امن میں فساد ڈالنے
والوں کی نسبت فرمایا۔

”انما جزا الذين يحاربون الله ورسوله ويسعون في الارض فسادا
ان يقتلوا او يصلبوا او تقطع ايديهم وارجلهم من خلاف لو ينفوا من
الارض ذلك لهم خزي فى الدنيا ولهم فى الآخرة عذاب عظيم ○ (المائدہ ۶۴)

”بات یہی ہے کہ جو لوگ خدا اور اس کے رسولؐ سے جنگ چھیڑتے ہیں اور
زمین میں بد امنی کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی سزایہی ہے کہ (حسب حالت) یا تو ان کو
قتل کر دیا جائے یا سولی دیا جائے یا مختلف سمت سے ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے جائیں۔
یہ (سزا) ان کے لیے دنیا میں تو خواری کا (موجب) ہے اور عاقبت میں ان کو (اس سے
بڑھ کر) بہت بڑا عذاب ہو گا۔“

و لقد اخذنا ل فرعون بالسنين و نقص من الثمرات لعلهم يذكرون ○
(اعراف پ ۹) ”بے شک ہم نے آل فرعون کو خشک سالی اور پھلوں کی کمی سے کھڑا
تاکہ وہ نصیحت پائیں۔“

گذشتہ ایتوں کے عبرت ناک انجام قرآن شریف میں کثرت سے مذکور ہیں۔ یہ
سب کچھ ان کی نافرمانیوں کی وجہ سے تھا اور اسی دنیا میں تھا۔ اور عاقبت کا عذاب اس کے
علاوہ ہو گا۔ چنانچہ عادوں، ثمودیوں، فرعون اور فرعونوں، قارون اور ہامان کا ذکر کر کے
سب کی سزاؤں اور وجہ سزا کے حلق فرمایا۔

فكلا اخذنا بنبيه فمنهم من ارسلنا عليه حاصبا، و منهم من اخذتهم
الصيحة و منهم من خسفنا به الارض و منهم من اغرقناه و ما كان الله

لِيُظْلَمَهُمْ وَلَكِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ○ (صحوت، پ ۲۰)

”ہم نے ہر ایک کو اس کے گناہ کے بدلے پکڑا۔ تو ان میں سے بعض وہ ہیں جن پر ہم نے پھراؤ کیا اور بعض وہ جنہیں کڑک لے پکڑا اور بعض وہ ہیں جنہیں ہم نے زمین میں دھنسا دیا اور بعض وہ جنہیں ہم نے غرق کر دیا اور اللہ تو ایسا نہیں تھا کہ ان پر ظلم کرتا لیکن وہ خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے۔“

قوم سب کو ہر طرح کی نعمتیں بخشیں لیکن وہ تمرد و سرکشی اور ظلم و زیادتی میں بڑھتے گئے اور انہوں نے احکام خداوندی کا مطلق لحاظ نہ کیا تو آخر کار ان کو تباہ و برباد کر دیا۔ چنانچہ فرمایا:-

لَقَدْ كَانَ لِسَبَإٍ فِي مَسْكَنِهِمْ آيَةٌ جَنَّتَانِ عَنْ يَمِينٍ وَشِمَالٍ كُلُوا مِنْ رِزْقِ رَبِّكُمْ وَاشْكُرُوا لَهُ بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ وَرَبٌّ غَفُورٌ ○ فَأَعْرَضُوا فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ سَيْلَ الْعَرْمِ يَذِلُّنَّهُمْ يَخِيتِمُهُمْ فَأَتَتْهُمُ آيَةُ الْكَافِرِينَ ○ (سبا، پ ۲۲)

”قوم سبا کے لیے ان کی جائے رہائش ہی میں (بھاری) ٹٹانی تھی۔ یعنی (شر کے) دائیں اور بائیں دو باغ۔ خدا کی روزی سے کھاؤ اور اس کا شکر ادا کرو۔ شر ہے پاکیزہ اور پروردگار بخشنہار۔ پس انہوں نے (ہمارے حکم سے) روگردانی کی تو ہم نے ان پر تباہ کن سیلاب بھیج دیا اور ان کو ان باغوں کی جگہ دو اور باغ دیئے جو کڑوے پھل والے، جھاؤ والے اور تھوڑی سی ہیرلوں کے درختوں والے تھے۔ ہم نے یہ ان کو ان کے گھری جڑادی اور کیا ہم ایسی (بری) جڑامکروں کے سوا کسی اور کو بھی دیا کرتے ہیں۔“

اس قسم کی آیات سے بھی قرآن شریف بھرا پڑا ہے۔ علاوہ اس کے ہم ایسے واقعات کو اپنے اوپر اور اپنے ایمانے جس پر واقع ہوتے دیکھ بھی رہے ہیں۔ جن سے انکار نہیں ہو سکتا۔

قائدہ عجیبہ و غریبہ:- جملہ کائنات ارضی و سلاوی، ناسوتی و ملکوتی، مادی و غیر مادی، مری و غیر مری، اللہ رب العالمین کے امر نگوئی کے ماتحت ہے۔ جیسا کہ فرمایا۔ ولہ ما سکن فی السیل والنہار وهو السميع العليم ○ (انعام، پ ۷) یعنی اور اسی کا ہے جو کچھ

بتا ہے رات میں اور دن میں اور وہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔ نیز فرمایا۔ لغیر
 دین اللہ یغفون ولہ اسلم من فی السموت والارض طوعاً و کرہاً (آل عمران
 پ ۳) یعنی تو کیا یہ لوگ خدا کے دین (اسلام) کے سواء کوئی اور دین چاہتے ہیں۔
 حالانکہ جو کوئی بھی آسمانوں اور زمین میں ہے۔ خواہ نخواستہ (رغبت سے یا مجبوری
 سے) اسی کے زیر فرمان ہے۔ پس اللہ تعالیٰ اس کائنات میں سے جس چیز کو چاہتا ہے۔
 کسی کی ہلاکت و بربادی کا سبب بنا دیتا ہے۔ مثلاً زمین قرار و سکونت کی جگہ ہے لیکن خدا
 کے حکم پر ہی زمین قارون کے لیے سبب عذاب بن گئی۔ بارش کا پانی مایہ حیات اور سبب
 پیدائش روزی اور باعث رونق باغات ہے لیکن خدا کے حکم پر یہی پانی سیلاب کی صورت
 میں سب کے لیے موجب ہلاکت و بربادی اور ان کے باغات کی خرابی کا سبب بن گیا۔ ہوا
 سب سے بڑھ کر مایہ حیات ہے لیکن عادیوں کے لیے یہی سبب ہلاکت ہو گئی۔ غرض یہ
 سب چیزیں اپنے خالق و مالک کے امر میں ہیں۔ جس سے یہ کام چاہے لے سکتا ہے۔ یہ
 سب اسباب ہلاکت جو مذکور ہوئے، قدرتی ہیں۔ ان میں کسی انسان کا ہاتھ نہیں لیکن
 بعض اوقات اللہ تعالیٰ ہی کام اپنے بعض بندوں سے لیتا ہے کہ بعض کو بعض پر غالب کر
 کے ظالموں کی حکومت کا تختہ الٹ دیتا ہے۔ حکیموں کو ذلیل کر کے کیفر کردار تک پہنچاتا
 ہے۔ بعض اوقات غالب قوم نہایت تند خو اور سخت گیر ہوتی ہے۔ اس کو غالب کرنے
 میں سابق ظالموں کا ظلم قبح کرنا بھی مقصود ہوتا ہے اور رعیت کو بھی ان کی بد کرداریوں کی
 سزا چکائی منظور ہوتی ہے۔ جب اکثر ان میں سے ظالم و قاسق حکام کے رنگ میں رنگے
 ہوں۔ چنانچہ بنی اسرائیل نے حکومت و تمدن میں بہت ترقی کی اور ان کے اقبال کا ستارہ
 نہایت عروج پر ہو گیا تو حکام میں ظلم، امراء و رؤسا میں عیاشی اور مستورات میں عام طور
 پر بے حیائی شروع ہو گئی تو ان پر خدا کا قہر ٹوٹا۔ اقبال کے بدلے زوال اور حکومت کی
 بجائے ماتحتی، عزت کی جگہ ذلت نصیب ہوئی۔ چنانچہ ان کے عروج و زوال اور ان پر جاہر
 قوم کے تسلط کا نقشہ یوں بیان کیا۔

وقضینا الی بنی اسرائیل فی الکتب لتفسدن فی الارض مرتین ولتعلن
 علواً کبیراً ○ فلما جاء وعد لولہما بعثنا علیکم عباداً لنلوی باس
 شدید فجاسوا اخلال الدیار وکان وعدنا مفعولاً ○ (بنی اسرائیل، پ ۱۵)

”اور ہم نے بنی اسرائیل سے اسی کتاب (توریت) میں صاف صاف کہہ دیا تھا کہ تم ضرور زمین میں دودھ خرابی ڈالو گے اور بہت اونچے بھی ہو گے۔ پس جب ان کا پہلا وعدہ آیا تو ہم نے تم پر اپنے بڑے سخت گیر بندے مسلط کر دیے۔ تو وہ (تمہارے تمام) دیار (مملکت) میں پھیل گئے اور خدا کا وعدہ پورا ہونا ہی تھا۔ (سو ہو کر رہا)۔ اسی مضمون کو شیخ سعدیؒ نے یوں ادا کیا ہے۔

چو خواہد کہ ویراں کند عالے
نہد ملک در پنچہ خالے

اور اگر صرف حکام ظالم و فاسق ہوں اور مظلوم رعیت قابل رحم ہو تو اللہ تعالیٰ ان پر رحمت کرنے کے لیے ملک کا نظم و نسق کسی عادل و صالح قوم کے سپرد کر دیتا ہے اور اس ظالم حکومت کی بربادی کے لیے اسی صالح قوم کو سبب بناتا ہے اور اس سے وہ کام لیتا ہے۔ جو فرعونوں اور سبا والوں کے لیے پانی سے اور عادیوں کے لیے ہوا سے لیا تھا۔ مثلاً واقعات شہادت دیتے ہیں کہ ایرانیوں اور رومیوں نے اپنے اپنے عروج و ترقی کے زمانے میں قلم و تعدی اور فسق و فجور کو انتہا پر پہنچا دیا تو اللہ رب العزت نے ان میں آماج ضعف و زوال پیدا کر دیے۔ حتیٰ کہ ان کو اپنے آخری پیغمبر ﷺ کی معرفت توبہ کا پیغام پہنچایا لیکن انہوں نے اس پیغام کو ٹھکرا دیا اور اس کی کوئی پرواہ نہ کی۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنے نبی پاک ﷺ کی مقدس جماعت صحابہ کرامؓ کو مسلط کیا اور ان ملکوں سے اس ظالم قوم کو ہمیشہ کے لیے نیست و نابود کر دیا۔ قرآن شریف میں ان فتوحات کے اشارات بھی موجود ہیں لیکن چونکہ ہم کو اس وقت صرف یہی بتلانا مقصود ہے کہ بعض گناہوں پر دنیا میں بھی مواخذہ ہوتا ہے اس لیے ہم ان آیات کی تفصیلات میں نہیں پڑ سکتے۔ ہاں اتنا اشارہ کرنے سے رک نہیں سکتے کہ جو لوگ حضرت فاروق اعظمؓ کی فتوحات سے حیران ہو کر اعتراضاً کہا کرتے ہیں کہ آپ نے ایرانیوں اور رومیوں پر لشکر کشی کر کے ممالک کے نظم و نسق کو کیوں تہ و بالا کر دیا۔ وہ سمجھ لیں کہ خدا تعالیٰ ان کی بدکرداریوں کی وجہ سے ان سے ناراض ہوا اور اس نے اپنے خلیفہ کی ہمت و ارادے اور اس کے بازوؤں میں وہ قوت و جوش پیدا کر دیا اور اس سے وہ کام لیا جو اس سے پہلے دیگر قوموں کی ہلاکت کے لیے عتاصر سے لیا تھا۔ دریائے نیل نے فرعون کو مع اس کے

لشکروں کے غرق کر دیا۔ آپ کو اس کے برخلاف شکایت نہیں۔ زمین نے قارون کو اس کے خزانوں سمیت نکل لیا۔ آپ کو اس پر رنج نہیں۔ تہ ہوانے عادیوں کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا۔ آپ کو کوئی افسوس نہیں۔ اگر شکایت ہے، افسوس ہے، رنج ہے تو حضرت فاروق اعظمؓ کے برخلاف ہے کہ انہوں نے ایرانیوں اور رومیوں کے ظالم ہاتھوں کو کیوں کوتاہ کیا اور مظلوم رعیت کو کیوں امن دیا۔ حالانکہ اس انقلاب اور سابقہ انقلابوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ نور و ظلمت کا تفاوت ہے۔ دریائے نیل نے مصریوں کی کوئی فریاد رسی نہ کی۔ زمین نے قارون کے مال کے حق داروں کو کوئی فائدہ نہ پہنچایا۔ ہوانے زمین کو عادیوں کی تعدی سے تو پاک کر دیا لیکن اہل زمین کو کوئی نفع نہ دیا لیکن حضرت فاروق اعظمؓ نے اہل ایران اور اہل روم کو ان کے ظالم و قاسق حکام ہی سے نجات و آسائش نہیں دی بلکہ ان کے ظلم کے بدلے انصاف، فق و فجور کے بدلے پرہیز گاری، غارت گری کے بدلے رعیت پروری اور جہالت و عیاشی کے بدلے تہذیب کا سکہ بٹھا دیا۔ یہ انقلاب بے شک مبارک انقلاب ہے اور اس میں خدا تعالیٰ کی رحمانیت و رحیمیت ہر دو صفات جلوہ گر ہیں کہ ظالموں کو ان کے ظلم کی سزا بھی مل گئی اور صالحین سے جو وعدے ان کے ایمان و اعمال صالحہ کی بنا پر اس دنیا میں کیے تھے، وہ بھی پورے ہو گئے اور آخرت کے وعدوں کے پورا ہونے کی دلیل بھی قائم ہو گئی۔ پس آپ رومیوں اور ایرانیوں کو اس آنکھ سے دیکھیں، جس سے فرعونوں و غیر ہم کو دیکھتے ہیں اور حضرت عمر فاروقؓ کو اس عقل سے خدا کا ہاتھ تصور کریں۔ جس سے ہوا، پانی اور زمین کو خدا کا لشکر سمجھتے ہیں۔ بات ایک ہی ہے۔

لذیٰ بود حکایت دراز تر گفتم
چنانکہ حرف عصا گفت موسیٰ اندر طور

غرض جزوی جزا و سزا اس عالم میں بھی ملتی ہے۔ جلدی ملے یا بدیر یہ خدا کی مشیت پر موقوف ہے۔

ہیں ہامشو مغرور بر علم خدا
دیر گیرد سخت گیرد مرزا

سکرات کے وقت بھی جزوی جزا و سزا

اس زندگی کے چھوڑتے وقت اور یہاں سے رخصت ہوتے وقت بھی جزا و سزا ہے اور وہ بھی جزوی ہے۔ اس کے لیے بھی وہی سابقہ تحریر یاد رکھیں کہ شب و روز کے توغل و انہماک اور توجہ و اشتغال کی وجہ سے روح میں جو کیفیت خلط و رابلی کے طور پر پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ اس سے منتک نہیں ہوتی۔ موت کی بے ہوشی سے جملہ قویٰ متحمل ہو کر جسمانی تعلقات منقطع ہو جاتے ہیں اور روح اپنے حاصل کردہ اعمال کے ساتھ اکیلی رہ جاتی ہے۔ تو حسب اس کے اکتساب کے خدا کے فرستادہ (فرشتے) اس سے سلوک کرتے ہیں اور اسے ان کی ملاقات سے حسب اپنی قابلیت کے انبساط یا خوف و غم پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ جو صالحین اپنے مالک سے دل لگائے رہے، ان کو موت کے وقت کما جاتا ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّفْسُ الْمَطْمَئِنَّةُ لِرَجْعِي إِلَىٰ رَبِّكَ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۝ فَاذْخُلِي فِي عِبَادِي ۝ وَادْخُلِي جَنَّتِي ۝ (النَّبْءُ پ ۳۰)

”اے اطمینان یافتہ جان! رجوع کر اپنے پروردگار کی طرف راضی ہو کر پسندیدہ ہو کر پھر میرے بندوں میں شامل ہو اور میری ہمت میں داخل ہو۔“

اسی طرح نانبجارو بدکردار لوگوں کی جان کئی کے وقت ان کو مار پڑتی ہے اور نہایت سختی سے ان کی جان قبض کی جاتی ہے۔ چنانچہ فرمایا:-

فَكَيْفَ لَنَا تَوْفَتُهُمُ الْمَلَائِكَةُ يَضْرِبُونَ وَجُوهَهُمْ وَلِدْبَارَهُمْ ذَٰلِكَ بَانَهُمْ اتَّبِعُوا مَا اسْخَطَ اللَّهُ وَكَرِهُوا رِضْوَانَهُ فَاحْبِطْ أَعْمَالَهُمْ ۝ (مَحْمَدؐ پ ۲۶)

”پھر کیا ہو گا جب کہ فرشتے ان کی جان نکال لیں گے مارتے ہوئے ان کے چہروں پر۔ اور پیٹھوں پر یہ اس لیے ہو گا کہ انہوں نے اس (راستے) کی پیروی کی جو خدا کو ناپسند تھا اور انہوں نے اس کی خوشنودی کو ناپسند کیا تو اس نے ان کے اعمال اکارت کر دیئے۔ وَلَوْ نَرَىٰ الَّذِينَ تُوْفُوا الْمَلَائِكَةُ يَضْرِبُونَ وَجُوهَهُمْ وَلِدْبَارَهُمْ وَنُوقُوا عَذَابَ الْحَرِيقِ ۝ ذَٰلِكَ بِمَا قَدَّمْتُمْ لِأَيْدِيكُمْ وَلِئِنَّ اللَّهَ لَيْسَ بِظَلَامٍ لِلْعَبِيدِ

○ (افعال، پ ۱۰) ”اور کبھی تو دیکھے جس وقت فرشتے جان قبض کرتے ہیں مکروں کی۔ مارتے ہوئے ان کے چروں پر اور پیٹھوں پر (اور کہتے ہوئے ان سے) چکھو عذاب جلتی آگ کا“ یہ بدلہ ہے اسی کا جو بھیجا تمہارے ہاتھوں نے اور خدا تو (اپنے) بندوں پر ہرگز عظم نہیں کرتا۔“

اللہ تعالیٰ پر افترا باندھنے والوں، نبوت و الہام کا جھوٹا دعویٰ کرنے والوں اور اپنی تصانیف کو قرآن کی طرح معجز و بے مثل قرار دینے والوں کی جان کنی کا حال بیان کیا۔

ومن اظلم ممن افترى على الله كذبا لو قال لوحي الى ولم يوح اليه شئى ومن قال سائر مثل ما انزل الله ولو ترى اذ الظالمون فى غمرات الموت والملائكة باسطوا ايديهم اخرجوا انفسكم اليوم تجزون عذاب الهون بما كنتم تقولون على الله غير الحق وكنتم عن اياته تستكبرون ○ (انعام، پ ۷)

”اور اس سے بڑا ظالم کون ہے جو باندھے اللہ پر جھوٹ یا کہے مجھ پر وحی آئی۔ حالانکہ اس پر کوئی وحی نہیں کی گئی اور جو کہے میں اتارنا ہوں برابر اس کے جو اتار اللہ نے اور کبھی تو دیکھے جس وقت یہ ظالم موت کی بے ہوشی میں ہوں گے اور فرشتے ہاتھ پھیلائے ہوں گے کہ نکالو اپنی جانیں۔ آج تم کو جزا ملے گی ذلت کی مار، اس پر کہ تم کہتے تھے اللہ پر جھوٹ اور اس کی آیتوں کو (سن کر بھی ان) سے تکبر کرتے تھے۔“

جان کنی کے وقت اس بشارت و عذاب کا ذکر حدیث شریف میں بہت مفصل مذکور ہے لیکن ہم بخوف طوالت اسے نقل نہیں کر سکتے۔ (مشکوٰۃ)

جن لوگوں نے اپنے خالق و مالک کے احکام کی پروا نہ کرتے ہوئے کفر و شرک اور فسق و فجور اور عظم و تعدی میں زندگی گزاری ہوگی۔ وہ جان کنی کی سختی دیکھ کر آرزو کریں گے کہ ہم کو دنیا میں کچھ اور ویر رہنے دیا جائے تاکہ ہم صدقہ و خیرات اور دیگر نیک اعمال کر لیں اور گزشتہ کوتاہی کی تلافی کر سکیں لیکن یہ حسرت و آرزو بے سود ہوگی۔ چنانچہ فرمایا:-

حتى اذا جاء احدكم الموت قال رب ارجعوني لعلنى اعمل صالحا فيما

ترکت کلا انها کلمۃ ہو قائلہا و من ورائہم برزخ الی یوم یبعثون ○
(مومنون، پ ۱۸)

”یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کو موت آئے گی تو وہ کہے گا۔ اے میرے پروردگار! مجھے پھر (دنیا میں) لوٹائیے تاکہ میں اس میں جو چھوڑ آیا ہوں کوئی بھلا کام کر لوں۔ (جواب ملے گا۔) ہرگز نہیں۔ یہ صرف اس کے منہ کی بات ہے اور لوگوں کے (برے) پیچھے روز قیامت تک برزخ ہے۔ (دوبسی نہیں ہوگی۔) نیز فرمایا:-

وانفقوا مما رزقنکم من قبل ان یاتنی احدکم الموت فیقول رب لو لا اخرتنی الی اجل قریب فاصدق و اکن من الصالحین ○ و لن یوخر اللہ نفساً لئلا جاء اجلہا واللہ خبیر بما تعملون ○ (مناقون، پ ۲۸)

”اور خرچ کرو ہمارے دیئے میں سے پہلے اس کے کہ تم میں سے کسی کو موت آئے۔ تو کہنے لگے اے میرے پروردگار! تو نے مجھے کچھ تھوڑی مدت تک ڈھیل کیوں نہ دی کہ میں صدقہ کر لیتا اور صالحین میں سے ہو جاتا اور جب کسی کی اجل آجائے گی تو اللہ تعالیٰ ہرگز ڈھیل نہ دے گا اور اللہ کو سب خبر ہے اس کی جو تم کرتے ہو۔“

عالم برزخ میں بھی جزوی عذاب و ثواب

اوپر کے بیان میں آپ پڑھ آئے ہیں کہ مرنے کے بعد روز قیامت تک برزخ ہے۔ دو چیزوں کی درمیانی حد قاصل اور آڑ کو برزخ کہتے ہیں۔ چونکہ عالم برزخ، موت اور روز قیامت یا یوں سمجھئے کہ دارالعل (دنیا) اور دارالجزا (عاقبت) کے درمیان ہے۔ اس لیے اسے عالم برزخ کہتے ہیں۔ دنیا کی اکثر آبادی دو مذہبوں کی قائل ہے۔ قیامت کی اور تنازع کی۔ لیکن مردوں کے لیے برزخی حالت سب کے نزدیک مسلم ہے۔ ملت ابراہیمی کے قائلین (یہود، نصاریٰ اور مسلمان) جو قیامت کے قائل ہیں اور اپنے مردوں کو سپرد خاک کر کے دفن کر دیتے ہیں۔ ان کا برزخ کو ماننا تو ظاہر ہے لیکن ان کے سوا ہنود وغیرہ جو تنازع کے قائل ہیں اور اپنے مردوں کو نذر آتش کر کے جلا دیتے ہیں۔ وہ بھی

احوال برزخہ سے انکار نہیں کر سکتے ہیں کیوں کہ روحوں کی جزا و سزا کے فیصلے تک وہ کسی دیگر جنم میں جائیں یا پھر انسانی قالب میں آئیں۔ وہ بھی ایک عرصہ و زمانہ مانتے ہیں۔ اس رو سے ان کے نزدیک بھی برزخ لازم ہے۔ غرض عالم برزخ کی بابت کسی کو اختلاف نہیں۔ نزاع صرف برزخ کے بعد کی حالت میں ہے کہ کلی جزا کا فیصلہ کس طرح ہوگا۔ قیامت کے دن جنت و دوزخ کی صورت میں ہو گا یا تباخ کی صورت میں بار بار اسی دنیا میں آتے رہیں گے۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ:- بعض لوگوں کو یہ شبہ عارض ہوتا ہے کہ اگر عذاب قبر برحق ہے تو جو لوگ دفن نہیں کیے جاتے اور جلا دیئے جاتے ہیں یا ان کو کوئی درندہ کھا جاتا ہے۔ ان کو عذاب کس طرح ہوتا ہے؟ اس کا حل یوں ہے کہ عذاب و راحت قبر، عالم برزخ کی حالت ہے۔ قرآن و حدیث میں اس عالم کا ذکر قبر کے لفظ سے اس لیے آیا ہے کہ ملت ابراہیمی میں مردوں کے لیے یہی دستور تھا کہ وہ دفن کیے جاتے تھے اور ان میں یہ دستور حضرت آدمؑ کے وقت سے جب سے حضرت ہابیل قتل ہوئے متواتر چلا آتا تھا۔ ورنہ عالم برزخ کے حالات قبر ہی سے مخصوص نہیں ہیں بلکہ ہر شخص جو فوت ہو جاتا ہے۔ اس کو عالم برزخ میں اس کے اعمال کے مناسب جزوی دکھ سکھ پہنچتا ہے۔ جیسا کہ نزع کے ذکر میں بھی ہم بیان کر آئے ہیں۔ حافظ ابن قیمؒ کتاب الروح میں فرماتے ہیں:-

و مما ينبغي ان يعلم ان عذاب القبر هو عذاب البرزخ فكل من مات وهو مستحق للعذاب ناله نصيبه منه قبر لولم يقبر فلوا كلته السباع لو احرق حتى صار رمادا و نسف في الهولاء لو صلب لو غرق في البحر وصل الى

اس برزخ کا ذکر عام ہندوؤں کے لیے تو بردہ ارنیہ اوپ نشد اور خاص آریوں کے لیے ستیا رتھ پرکاش کے سمولاس نہم و یا زوہم میں صاف الفاظ میں موجود ہے کہ مرنے کے بعد جیوا تریکش میں رہتے ہیں، اسی کو پتری لوک بھی کہتے ہیں۔

یوم الدین کی تفسیر میں اصل مقصود روز قیامت کا اثبات ہے۔ اس سے پہلے جزوی جزا سزا کا بیان ابتدائی اور ضمنی مراحل ہیں۔

روحه وبلذنه من العذاب ما يصل الى القبور (ص ۹۲)

”اور یہ بھی جاننے کے لائق ہے کہ عذاب قبر ہی عذاب برزخ ہے۔ تو جو شخص مر جائے اور وہ عذاب کے لائق ہو تو اسے اسکا حصہ مل جائے گا۔ دفن کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ اگرچہ اس کو درندے کھا جائیں یا اسے جلا دیا جائے۔ حتیٰ کہ وہ خاکستر ہو جائے اور اسے ہوا میں اڑا دیا جائے یا سولی پر لٹکا دیا جائے۔ یا دریا میں غرق ہو جائے تو اس کی روح اور اس کے بدن کو وہ عذاب ضرور پہنچ کر رہے گا جو دفن کیے گئے کو پہنچتا ہے۔“

اللہ تعالیٰ جو محاسب اعمال اور جزا و سزا کا مالک و مختار ہے۔ ہر حال کے مناسب کسی کو دکھ اور کسی کو سکھ پہنچانے کے ہر طریقے سے پورا واقف اور اس پر پورا قادر ہے۔ وہ بڑا علیم و حکیم اور عزیز و قدیر ہے۔ روح جو حیثیتاً حامل راحت و عذاب ہے۔ ہر حال میں باقی ہے۔ نہ اسے مٹی کھا سکتی ہے نہ آگ جلا کر اسے فنا کر سکتی ہے اور نہ درندوں کے کھانے سے مستحیل ہو سکتی ہے۔ یہ سب امور جسم پر وارد ہوتے ہیں جو آخر قانی ہے۔ روح پر نہیں ہوتے۔ جسم کو دفن کر دیا جائے یا جلا دیا جائے یا اسے درندے کھا جائیں۔ اس کی روح خدا کی حراست میں ہوتی ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔ فیمسک النبی قضی علیہا الموت (زمر پ ۲۴) یعنی جس پر اللہ تعالیٰ موت وارد کر دیتا ہے۔ اسے اپنے پاس بند رکھتا ہے۔ روح حیوانی کا سلسلہ ٹوٹ جانے کے بعد بھی روح انسانی کا اپنے مردہ بدن کے اجزاء سے ایک گونہ تعلق باقی رہتا ہے۔ ہاں اس کی نوعیت جدا ہے۔ عالم دنیا میں جو تعلق ہے، وہ اور قسم کا ہے۔ جس کی کیفیت اس عالم میں جانے سے معلوم ہوتی ہے قبل اس کے نہیں۔ کیوں کہ کوائف کا علم قبل ان کے وارد ہونے کے نہیں ہو سکتا۔ دنیا میں روح کو جسم پر مختار کر کے اس کی باگ ڈور اس کے ہاتھ میں دے دی گئی ہے اور وہ ہر دم اس کی تدبیر و پرداخت میں مصروف رہتی ہے۔ برزخ میں یہ ڈیوٹی اس کے سپرد نہیں ہوتی۔ حافظ ابن قیم کتاب الروح میں حافظ ابن حزمؒ کے جواب میں بعض احادیث ذکر کر کے فرماتے ہیں:-

۳۸۔ نسخ مطبوعہ دائرة المعارف حیدر آباد دکن ۱۳۱۸ء میں۔ ”الی القبور“ لکھا ہے۔ شاید صحیح

”الی المتبور“ ہو۔ (میر)

والروح لم تزل متعلقة ببدنها ولن بلى و تمزق و سر ذلک ان الروح لها بالبدن خمسة انواع من التعلق متغايرة الاحکام۔ احدها: تعلقها به فى بطن الام جنينا۔ الثانی: تعلقها به بعد خروجه الى وجه الارض۔ الثالث: تعلقها به فى حل النوم فلها به تعلق من وجه و مفارقة من وجه۔ الرابع: تعلقها به فى البرزخ فانها ولن فارقة و تجردت عنه فانها لم تغارقه فرقا۔ کلیاً بحيث لا یبقى لها التفات الیه البتة و قد ذکرنا فى لول الجواب من الاحادیث و الآثار ما یدل على ردها الیه وقت سلام المسلم و هذا الردا عادة خاصة لا یوجب حیاة البدن قبل یوم القیمة۔ الخامس: تعلقها به یوم بعث الاجساد و هو اکمل انواع تعلقها بالبدن و لا نسبة لما قبله من انواع التعلق الیه لانه تعلق لا یقبل البدن معه موتا و لا نوما و لا فسادا (ص ۶۸)

”اور روح اپنے بدن سے پیش تعلق رہتی ہے۔ اگرچہ وہ جسم گل سڑ جائے یا پاش پاش ہو جائے اور اس کا بھید یہ ہے کہ روح سے بدن کے تعلقات پانچ نوع کے ہیں۔ جن کے احکام آپس میں مختلف ہیں۔ اول اس کا تعلق جب بدن ماں کے پیٹ میں جنین کی صورت میں ہوتا ہے۔ دوم پیٹ سے نکل کر زمین پر آنے اور رہنے کے وقت سوم نیند کی حالت میں اس حالت میں ایک گونہ تعلق ہوتا اور ایک گونہ مفارقت۔ چہارم عالم برزخ میں تعلق اس حالت میں اگرچہ وہ بدن کو چھوڑ کر اس سے الگ ہو گئی ہے لیکن کلی طور پر ایسا فراق نہیں کیا کہ بالکل اس کی طرف کسی قسم کی التفات باقی نہ ہو اور ہم نے جواب کے شروع میں احادیث و آثار سے بہت کچھ ذکر کیا ہے۔ جو اس بات کی دلیل ہے کہ مسلمان جب میت کو سلام کرتا ہے تو روح واپس آتی ہے اور یہ واپسی خاص ہے۔ اس سے قیامت سے پیشتر بدن کی زندگی لازم نہیں آتی۔ پانچویں قسم کا تعلق روز قیامت کو ہو گا اور یہ سب قسموں سے کمال ہے کہ اس سے دیگر قسموں کے تعلقات کو کچھ نسبت ہی نہیں ہے۔ کیوں کہ وہ ایسا تعلق ہو گا۔ جس کے ہوتے بدن پر نہ موت وارد ہوگی نہ نیند اور نہ کوئی دیگر بگاڑ۔“

عالم برزخ کی اس راحت و تکلیف کو انسانی ذہن کے قریب کرنے کی تین صورتیں ہیں:-

اول یہ کہ یہ کہا جائے کہ ہمارے باطنی اعتقادات اور ظاہری اعمال جن سے ہماری روح متکلیف ہو چکی ہے۔ عالم مثال میں ان کی صورتیں بن جاتی ہیں۔ ان خیرا فخیروا لن شرافشر یعنی اعتقاد و عمل نیک ہیں تو صورتیں بھی نیک اور اگر برے ہیں تو صورتیں بھی بری۔ جیسا کہ سابقہ ”گزر چکا۔ اعتقادات و اعمال عالم دنیا میں تو جسم اختیار نہیں کر سکتے لیکن عالم مثال میں وہ متحد ہو جاتے ہیں۔ اس کی نظیر عالم خواب ہے کہ ہم بعض اوقات خواب میں جو کچھ دیکھتے ہیں وہ بیحدہ واقع ہو جاتا ہے اور بعض اوقات وہ خواب ایسے واقعات کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ جن کو خواب میں دیکھی ہوئی صورتوں سے مناسبت ہوتی ہے۔ حالانکہ وہ واقعات عالم دنیا میں عین اس صورت میں نہیں ہوتے۔ مثلاً ”حضرت یوسفؑ نے خواب میں دیکھا کہ ان کو گیارہ ستارے مع آفتاب و مہتاب کے سجدہ کر رہے ہیں۔ لیکن واقعہ میں گیارہ بھائی ثابت ہوئے۔ کوکب اصل میں آسمانی ستارے کو کہتے ہیں لیکن محاورہ میں کسی نامی شخص کو بھی کہہ سکتے ہیں اور ستارہ ہند وغیرہ خطابات اسی لیے ملتے ہیں۔ اسی طرح شاہ مصر نے خواب میں سات دہلی گائیں دیکھیں جو سات موٹی گائیں کو کھارہی تھیں اور سات خشک خوشے اور سات سبز خوشے دیکھے۔ لیکن واقعہ میں سات سال خشک اور سات سال بارش کے ظاہر ہوئے۔ چونکہ خواب کی کیفیت کم و بیش ہر شخص پر گزرتی ہے اس لیے اس کی زیادہ مثالوں کی ضرورت نہیں۔ عالم خواب کی سب ایسی صورتیں اور ایسے اجسام مثالی ہوتے ہیں جو متحد ہو کر نظر آتے ہیں، خارجی نہیں ہوتے۔ پس عالم مثال سے انکار نہیں ہو سکتا کیوں کہ اس کی نظیر واقعات میں ظاہر ہو رہی ہے اور محال ذاتی کسی صورت میں بھی صورت پذیر نہیں ہو سکتا“ قافم۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے اپنی مایہ ناز کتاب ”حجتہ اللہ“ میں عالم مثال کے اثبات میں ایک خاص باب باندھا ہے اور اس کے ضمن میں بہت سی ایسی احادیث ذکر کی ہیں جن میں قریباً محشر میں بعض معانی و اعمال کا ذکر جسمانیات کے طور پر وارد ہے اور ان کو اسی مثال سے سمجھایا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:-

اعلم انه دلت احادیث کثیرة علی ان فی الوجود عالما غیر عنصری ینتمل فیہ المعانی باجسام مناسبة لها فی الصفة (ص ۱۳)

ہیں یا فقیر پر واردات کے طور پر وارد کیے ہیں۔ اتنے وافر ہیں کہ میں ان سے انکار نہیں کر سکتا۔ اگر میری زبان ان کے بیان سے قاصر ہے تو دل بفضل اللہ تعالیٰ مطمئن ہے کہ معافی کا متجدد ہونا حقیقت واقعی ہے لیکن یہ سب کچھ عالم خواب، عالم مثال اور عالم معشر میں ہوتا ہے اور ہو گا بلکہ یہ تو یہاں تک ہے کہ جس طرح خواب میں معافی متجدد ہو کر عیاں سامنے آ جاتے ہیں۔ اسی طرح بعض کاطین کو عالم بیداری میں بھی وہ معافی جسمانی صورت میں نظر آ جاتے ہیں۔ چنانچہ حدیث میں موجود ہے۔ نبی پاک ﷺ نے فرمایا کہ جو کچھ میں دیکھتا ہوں، کیا وہ تم کو بھی نظر آتا ہے۔ میں تو قہقروں کو تمہارے گروں میں بارش کے قطروں کی طرح گرتے دیکھتا ہوں۔ (حجتہ اللہ، ص ۲۳) حدیث میں سورہ ملک کا نام مانعہ اور منجیہ بھی آیا ہے کیوں کہ یہ سورت اپنے پڑھنے والے سے عذاب قبر کو روکتی ہے اور مروجے کو نجات دلاتی ہے۔ (مشکوٰۃ، ص ۱۸۰ بروایت ترمذی) اس کی صورت بھی یہی ہے کہ اس کا تعلق پڑھنے والے کے قلب و روح سے ایسا شدید ہو جائے کہ جب قبر میں نکیرین حساب کے لیے آئیں تو یہ سورت منمشل ہو کر روک کی صورت میں حائل ہو جائے اور اپنے پڑھنے والے کو بچالے۔

مولف تفسیر ہذا عفی عنہ کا اپنا واقعہ

خاکسار، گناہ گار نے اپنی ایک بیماری میں امرتسر میں آپریشن کروایا۔ اس کے لیے کلوروفارم کا سنگھانا ضروری تھا۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے سنگھایا اور آپریشن کیا۔ جب مجھے قدرے ہوش آنے کو ہوا تو میں نے آپریشن کنندہ ڈاکٹر دھنپت رائے صاحب، اسسٹنٹ سرجن امرتسر کو یہ کہتے سنا۔ (حالانکہ میں ابھی آنکھیں بھی نہیں کھول سکا تھا) کہ جن حالات میں کسی کی زندگی گزرتی ہے۔ اس بے ہوشی میں وہی کیفیت اس پر طاری ہو جاتی ہے اور وہ اسی قسم کی باتیں کرتا ہے۔ چونکہ مولانا صاحب (خاکسار میر سیالکوٹی) کی زندگی مذہبی امور میں گزری ہے اس لیے وہ اس حالت میں بھی قرآن پاک ہی پڑھتے رہے ہیں۔

خواجہ محمد اسماعیل صاحب خلف خواجہ حبیب اللہ صاحب مرحوم، شال مرچنٹ

ہیں یا فقیر پر واردات کے طور پر وارد کیے ہیں۔ اتنے وافر ہیں کہ میں ان سے انکار نہیں کر سکتا۔ اگر میری زبان ان کے بیان سے قاصر ہے تو دل بفضل اللہ تعالیٰ مطمئن ہے کہ معافی کا متجدد ہونا حقیقت واقعی ہے لیکن یہ سب کچھ عالم خواب، عالم مثال اور عالم معشر میں ہوتا ہے اور ہو گا بلکہ یہ تو یہاں تک ہے کہ جس طرح خواب میں معافی متجدد ہو کر عیاں سامنے آ جاتے ہیں۔ اسی طرح بعض کاطین کو عالم بیداری میں بھی وہ معافی جسمانی صورت میں نظر آ جاتے ہیں۔ چنانچہ حدیث میں موجود ہے۔ نبی پاک ﷺ نے فرمایا کہ جو کچھ میں دیکھتا ہوں، کیا وہ تم کو بھی نظر آتا ہے۔ میں تو قہقروں کو تمہارے گروں میں بارش کے قطروں کی طرح گرتے دیکھتا ہوں۔ (حجتہ اللہ، ص ۲۳) حدیث میں سورہ ملک کا نام مانعہ اور منجیہ بھی آیا ہے کیوں کہ یہ سورت اپنے پڑھنے والے سے عذاب قبر کو روکتی ہے اور مردے کو نجات دلاتی ہے۔ (مشکوٰۃ، ص ۱۸۰ بروایت ترمذی) اس کی صورت بھی یہی ہے کہ اس کا تعلق پڑھنے والے کے قلب و روح سے ایسا شدید ہو جائے کہ جب قبر میں نکیرین حساب کے لیے آئیں تو یہ سورت منمٹل ہو کر روک کی صورت میں حائل ہو جائے اور اپنے پڑھنے والے کو بچالے۔

مولف تفسیر ہذا عفی عنہ کا اپنا واقعہ

خاکسار، گناہ گار نے اپنی ایک بیماری میں امرتسر میں آپریشن کروایا۔ اس کے لیے کلوروفارم کا سنگھانا ضروری تھا۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے سنگھایا اور آپریشن کیا۔ جب مجھے قدرے ہوش آنے کو ہوا تو میں نے آپریشن کنندہ ڈاکٹر دھنپت رائے صاحب، اسسٹنٹ سرجن امرتسر کو یہ کہتے سنا۔ (حالانکہ میں ابھی آنکھیں بھی نہیں کھول سکا تھا) کہ جن حالات میں کسی کی زندگی گزرتی ہے۔ اس بے ہوشی میں وہی کیفیت اس پر طاری ہو جاتی ہے اور وہ اسی قسم کی باتیں کرتا ہے۔ چونکہ مولانا صاحب (خاکسار میر سیالکوٹی) کی زندگی مذہبی امور میں گزری ہے اس لیے وہ اس حالت میں بھی قرآن پاک ہی پڑھتے رہے ہیں۔

خواجہ محمد اسماعیل صاحب خلف خواجہ حبیب اللہ صاحب مرحوم، شال مرچنٹ

امرتے مجھے اس حالت کی بعض آیات بھی بتائیں۔ جو میں پڑھ رہا تھا۔ مثلاً "و
 هو الذي ينزل الغيث من بعد ما قنطوا وينشر رحمته" وهو الولي الحميد ○
 (شوریٰ، پ ۲۵) ڈاکٹر محمد فاضل صاحب اور ڈاکٹر اشفاق محمد صاحب امرتسری بھی شامل
 تھے اور برادر مکرم مولوی احمد الدین صاحب بھی موجود تھے۔ یہ حالت دیکھ کر سب حیران
 تھے۔ مولوی علی محمد صاحب مصمص کا بیان ہے کہ مذکورہ ڈاکٹر دھنپت رائے صاحب
 نے یہ بھی فرمایا تھا کہ میں یقیناً "کہتا ہوں کہ مولانا صاحب (خاکسار میر سیالکوٹی) قبر میں
 بھی جائیں گے تو وہاں بھی قرآن پاک ہی پڑھیں گے۔"

غرض اس قصے کو دہرانے سے یہ ہے کہ مجھ پر یہ حالت طاری ہو چکی ہے اور
 میں اسے خوب سمجھ چکا ہوں۔ اس کے بعد مجھے اس امر کے انکار کی کوئی گنجائش نہیں کہ
 اعتقاداتِ راسخہ و اعمالِ مکتسبہ سے جو کیفیت روح میں پیدا ہو جاتی ہے، وہ دائم و باقی
 رہتی ہے اور بدنی تعلقات و تدبیرات کے انقطاع و فراغت کی صورت میں وہ عیاں
 نمایاں ہو جاتی ہے۔ نبی پاک ﷺ نے اسی قبیل سے فرمایا ہے۔ جو اوپر گزر چکا ہے کہ
 جب میت قبر میں داخل کی جاتی ہے تو اسے مثالی طور پر آفتاب ڈوبنے کے قریب نظر آتا
 ہے۔ پس وہ بیٹھ جاتا ہے اور اپنی آنکھیں ملتا ہے اور کہتا ہے چھوڑو میں نماز پڑھ لوں۔
 (مسکوٰۃ بروایت ابن ماجہ) اس کی یہی وجہ ہے کہ روز مرہ کے تعامل و مشق، کثرتِ توغل
 اور شدتِ توجہ سے روح میں ایسی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے کہ اس سے جدا نہیں ہوتی اور
 اب وہ عالمِ برزخ میں بدن کی تدبیر سے بالکل فارغ ہے اور اس کا کیا ہوا سب کچھ اس کے
 سامنے ہے۔

دوسری صورت ذہن کے قریب لانے کی یہ ہے کہ جس پر وہ حالت طاری ہوتی
 ہے۔ اسے اپنی حس اور خیال میں ایسا ہی نظر آتا ہے۔ اس کی نظیر یہ ہے کہ سورہ حم
 و خان میں فرمایا۔ فار تقيب يوم تاتى السماء بدخان مبين ○ اے نبی! تو اس دن کا
 انتظار کر جب آسمان سے دھواں نمودار ہوگا۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں کہ مکہ
 شریف میں نہایت سخت قحط پڑا تو آسمان کی طرف دیکھنے سے شدتِ بھوک کی وجہ سے
 دھواں نظر آتا تھا۔ (حجۃ اللہ، ص ۱۳)

تیسری صورت یہ ہے کہ جو بھی واقعات برزخ میں پیش آنے والے ہیں۔ ان کو الفاظ میں بیان کر کے سمجھایا گیا ہے۔ کیوں کہ انسان فہم و تفہیم کے سلسلے میں انہی اشیاء سے اور اسی طریق سے مانوس ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں۔ ولست اری المقتصر علی الثالثة من اهل الحق یعنی میں اس شخص کو جو اس تیسری صورت پر بس کرے، اہل حق سے نہیں جانتا۔

پھر اس کے بعد حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے امام غزالیؒ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے عذاب قبر کے متعلق ان ہر سہ مذکورہ بالا صورتوں کا ذکر کیا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے۔ اول یہ کہ احوال برزخیہ جو صحیح احادیث میں مذکور ہیں، سب صحیح ہیں۔ اصحاب بصیرت کے لیے تو بالکل واضح ہیں لیکن اگر بے بصیرت اشخاص کی سمجھ میں نہ آئیں تو اس سے ان حقائق کا انکار نہیں ہو سکتا۔ دوم یہ کہ سوئے ہوئے شخص کی حالت کو یاد کرو کہ وہ بعض اوقات خواب میں دیکھتا ہے کہ اسے سانپ ڈس رہا ہے اور اسے درد بھی محسوس ہو رہا ہے۔ جس کی شدت سے وہ چیخ پکار بھی کرتا ہے اور اسے پینہ بھی آ جاتا ہے اور اپنے آپ میں وہ سب کچھ بیدار آدمی کی طرح محسوس کرتا ہے لیکن اس کے پاس والا شخص اسے بالکل ساکن و غیر متحرک سویا ہوا دیکھتا ہے اور اسے اس کے پاس کوئی بھی سانپ اور بچھو وغیرہ نظر نہیں آتا۔

پس جس طرح وہ سانپ اس خوابیدہ شخص کے حق میں تو موجود ہے اور اسے تکلیف بھی ہو رہی ہے لیکن اس کے پڑوسی کے حق میں موجود نہیں ہے۔ اسی طرح مردہ کو جو تکلیف و راحت ہو رہی ہے۔ وہ واقعی ہو رہی ہے گو زندوں کو محسوس و معلوم نہ ہو سکتی ہے۔

سوم یہ کہ یہ تو معلوم ہے کہ سانپ بنفسہ دردناک نہیں ہے بلکہ وہ درد اس کے زہر کا ہے۔ پھر یہ کہ وہ زہر بھی عین درد نہیں ہے بلکہ تکلیف اس اثر سے ہے جو زہر کی وجہ سے تمہارے بدن میں ہو گیا ہے۔ تو اگر یہی اثر بغیر زہر کے پیدا ہو جائے تو وہ نہایت شدید ہو گا اور اس قسم کی تکلیف کے بیان کی یہی صورت ہے کہ وہ اثر ان اسباب کی طرف منسوب کر کے سمجھایا جائے۔ جن سے انسان عادتاً "مانوس" ہے۔ پس مہلک اسباب موت کے وقت خوفناک اور المناک صورتیں بن جاتے ہیں اور ان کی تکلیف ایسی

ہوتی ہے جیسے سانپوں کے ڈسنے کی۔ گو سانپ موجود نہ ہوں۔ اتنی، (ص ۱۳)

تمہ بحث

حضرت محمد مصطفیٰ، احمد مجتبیٰ علیہ السلام نے یہ بھی فرمایا ہے کہ جب تم میں سے کوئی مر جاتا ہے تو اسے صبح و شام اس کی جگہ (جنت یا دوزخ میں) دکھائی جاتی ہے۔ اگر وہ جنتی ہے تو جنت میں جائے گا اور اگر دوزخی ہے تو دوزخ میں جھونکا جائے گا اور اسے کہا جاتا ہے کہ تیری (اصل) جگہ یہ ہے۔ (ابھی تو قبر یعنی برزخ میں رہے گا۔) حتیٰ کہ اللہ تبارک و تعالیٰ تجھے قیامت کے دن یہاں پہنچا دے۔ (مشکوٰۃ، ص ۱۸، بروایت صحیحین)

خاکسار کہتا ہے کہ اس حدیث کی تصدیق قرآن حکیم میں موجود ہے اور وہ آیت عذاب برزخ کے اثبات میں اصل الاصول ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ آل فرعون کے متعلق فرماتا ہے:-

www.KitaboSunnat.com

وَحَاقَ بِالْفِرْعَوْنَ سُوءُ الْعَذَابِ ۝ النَّارُ يُعْرَضُونَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَعَشِيًّا ۝ وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ ۝ ادْخُلُوا الْفِرْعَوْنَ أَشَدَّ الْعَذَابِ ۝ (مومن، پ ۲۳)

”اور الٹ پڑا فرعونوں پر بری طرح کا عذاب یعنی آگ، کہ صبح و شام اس کے سامنے کیے جاتے ہیں اور جس دن قیامت قائم ہوگی۔ (کہا جائے گا۔) داخل کرو آل فرعون کو سخت سے سخت عذاب میں۔“

اس آیت میں قیامت سے پہلے عذاب کا صریح ذکر ہے اور وہ اسی عالم برزخ کا عذاب ہے۔ جس طرح حدیث مذکورہ بالا میں بتایا گیا ہے کہ میت کو اس کا اصلی مقام جو اسے جنت یا دوزخ میں ملنے والا ہے۔ صبح و شام دکھایا جاتا ہے۔ چنانچہ حدیث کے الفاظ ہیں۔ عرض علیہ مقعدہ بالغدۃ والعشی (مشکوٰۃ، ص ۱۸) یعنی صبح و شام اس کا ٹھکانا اس کے سامنے کیا جاتا ہے۔

اسی طرح اس آیت مذکورہ بالا میں فرعونوں کے متعلق جو دوزخی ہیں، کہا گیا ہے۔ النَّارُ يُعْرَضُونَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَعَشِيًّا (مومن، پ ۲۳) یعنی وہ صبح و شام آتش (دوزخ) کے سامنے کیے جاتے ہیں۔ (فنعلم الواقع)

الغرض عالم برزخ کی راحت و تکلیف کے اثبات میں قرآن و حدیث یک زبان

ہیں اور عقل اس کے امکان کو اس کیفیت سے جو ہم نے اوپر بیان کی ہے، سمجھ سکتی ہے۔ اس لیے اس کی تصدیق میں کوئی بھی تردد باقی نہیں رہتا چاہیے۔ جمہور ائمہ سنت کا یہی مذہب ہے۔ صحابہ کرامؓ و تابعینؓ اور صلحائے امت اسی پر گزرے ہیں۔ حشرنا اللہ معہم آمین۔

یہ مضمون اس سے بھی مفصل بیان ہو سکتا ہے لیکن چونکہ ہمیں اصل منزل یعنی یوم الدین پر جلد پہنچنا ہے اور وہ بہت لمبی منزل ہے اس لیے اسی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔
اللہم انی اعوذ بک من وساوس الصدر و عذاب القبر۔

کلی فیصلہ قیامت کے روز ہوگا!

لای یوم اجلت لیوم الفصل (مرسلات، پ ۲۹) ان معاملات کو کس دن کے لیے اٹھا رکھا گیا ہے؟ فیصلے کے دن کے لیے۔

سابقہ کسی قدر تفصیل سے بیان ہو چکا ہے کہ دنیا، نزع اور برزخ میں جزا و سزا جزوی ہے اور کلی سزا قیامت کے دن ہوگی اور ص ۱۳۶ پر معاد کے متعلق جو سات عنوانات قائم کیے گئے تھے، ان میں سے پہلے پانچ عنوانوں کا بیان سابقہ گزر چکا ہے۔ اب صرف اخیر کے دو باقی ہیں یعنی حشر اجساد کا ممکن ہونا اور منکرین قیامت کے شبہات کے جوابات۔

سو ان کے بیان سے پیشتر اس امر کا بیان بھی ضروری ہے کہ اس کلی فیصلے کے لیے ایک خاص دن کیوں مقرر کر رکھا ہے۔ جب دنیا اور سرکرات موت اور برزخ میں بھی جزا و سزا ہوتی ہے تو انہی میں سارا معاملہ کیوں ختم نہیں کر دیا جاتا اور اسی روز قیامت کے لیے کیوں اٹھا رکھا ہے؟ یہ شبہ اکثر منکرین قیامت کو عارض ہوتا رہتا ہے بلکہ حشر اجساد یعنی بوسیدہ ہڈیوں اور جلی ہوئی خاکستر اور خاک میں طے ہوئے اجزاء میں جان پڑ جانا آج کل اس قدر مستبعد نہیں رہا، جتنا علمی طور پر اس امر کی ضرورت کو سمجھنا ضروری جانا گیا ہے کہ ایک خاص دن کی کیا ضرورت ہے؟

سو اس کے متعلق اول تو یہ گزارش ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر امر کا مالک و مختار اور ہر

امر پر قادر و توانا ہے۔ جو چاہے کر سکتا ہے۔ بدیں معنی کہ نہ تو کوئی اس کا ہاتھ پکڑ سکتا ہے اور نہ کوئی کام اس کی مشیت کے خلاف رک سکتا ہے۔ جو کچھ ہو رہا ہے، سب اس کی مشیت سے ہے اور جو نہیں ہوتا، اس کی نسبت اس کی مشیت یہی ہے کہ نہ ہو۔ اس لیے وہ نہیں ہوتا اور نہ ہوگا۔ نہ تو ہونے والی چیز بذاتہ ضروری الوجود ہے اور نہ نہ ہونے والی ممتنع۔

لیکن اس کی مشیت، اس کی قدرت، اس کا قہر و غلبہ اس کی سطوت و جبروت، اس کی رحمت و شفقت، غفور و درگزر، حقوبت و نعمت جو کچھ بھی ہے۔ سب اس کی حکمت کے ماتحت ہے۔ جس امر کا جس کیفیت سے ہونا چاہا ہے۔ اس کی بنا حکمت و مصلحت پر ہے اور جس امر کا نہ ہونا چاہا ہے، اس کی بنا بھی حکمت پر ہے۔

پس اس نے کلی فیصلے کے لیے ایک خاص دن مقرر کیا ہے تو اس میں بڑی بڑی حکمتیں اور مصلحتیں ہیں، جس طرح کہ ہم دنیا کے دیگر نظاموں میں دیکھتے ہیں۔ ہر چند کہ اللہ تعالیٰ ان نظاموں سے باہر بھی سب کچھ کر سکتا ہے لیکن پھر بھی اس نے ہر امر کے لیے ایک خاص مدت اور خاص وقت مقرر کر رکھا ہے۔ وہ کام اس وقت سے پہلے نہیں ہوتا۔ خلق کل شئی فقد رہ تقدیراً (فرقان، پ ۱۸) پیدا کیا اس نے ہر شے کو پس اس کو ایک خاص انداز پر رکھا۔ اگرچہ وہ کام اس سے پہلے بھی ممکن ہے اور اس کے بعد بھی لیکن حکمت الہی کا تقاضا یہی ہوتا ہے کہ وہ عین اسی وقت پر ہو، اس میں کسی کو کلام نہیں ہوتا اور نہ کلام کرنے کا حق ہے۔ اس میں اس کی نہایت باریک حکمتیں ہوتی ہیں۔ بعض اوقات وہ حکمتیں ہماری سمجھ سے بالا ہوتی ہیں اور ہم کو اپنے ضعف علم کا اقرار کرتے ہوئے اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اس میں حکمتیں ہیں اور بعض اوقات وہ حکمتیں واقعہ کے بعد ہماری سمجھ میں آ جاتی ہیں اور ہم اس وقت دل و جان اور زبان حال و قال سے سبحان اللہ! سبحان اللہ پکار اٹھتے ہیں۔

قرآن حکیم نے اول تو فرمایا کہ فیصلے کے لیے ایک دن مقرر ہے۔ چنانچہ فرمایا:-

☆ ان یوم الفصل میقاتہم اجمعین ○ (دخان، پ ۲۵)

☆ ان یوم الفصل کان میقاتہ ○ (نبا، پ ۳۰)

”بے شک فیصلے کا دن ان سب کے لیے مقرر وقت ہے۔“

پھر اس کی وجوہات و کمکتیں بھی خود ہی بیان کی ہیں، جن کا بیان اس وقت ہمیں خاص طور پر ملحوظ ہے۔ سو اس کی نسبت گزارش ہے کہ سکران نزع یعنی جان کنی کی بے ہوشی اور برزخ میں جو بھی جزوی جزا و سزا ہے۔ وہ پوری نہ ہونے کے علاوہ انفرادی ہے۔ جس جان پر وارد ہوتی ہے اس کا علم اسی کو ہوتا ہے۔ دوسرے اس سے بے خبر رہتے ہیں اور دنیا کے مصائب و آلام بھی فیصلہ کن نہیں ہیں کیوں کہ بعض اوقات نیکیوں کے مصائب و ابتلاء جن میں ان کے صبر و استقامت کی آزمائش اور دیگر کئی ایک مصلحتیں ہوتی ہیں۔ دیگر لوگوں کے مصائب جزا کے ہم رنگ ہو کر حجت بازوں کے نزدیک مشتبہ ہو سکتے ہیں۔

نیز دنیا کے مصائب اور سکران و برزخ کے عذاب میں ظالم کو تو سزا مل گئی لیکن اگر وہ ظلم کسی دوسرے انسان کے متعلق ہے تو اس میں اس مظلوم کی حق رسی اور ظالم سے اس کے بدلہ لینے کی کیا صورت ہے؟

نیز جو نزاعات لوگوں کے باہمی حقوق کے متعلق ہوتے ہیں۔ دنیا کے فیصلے میں بااوقات سچے محروم رہتے ہیں اور جھوٹے میدان جیت جاتے ہیں۔ ان کے فیصلے کی کیا صورت ہے؟

نیز لوگوں میں جو بھی مذہبی اختلافات ہیں اور وہ حجت و دلیل کے متعلق ہیں۔ ان میں ہر فریق اپنے آپ کو حق پر کہتا رہتا ہے اور جھوٹے کی زبان بندی کی کوئی صورت نہیں اور اس طرح عوام پر حق مشتبہ و ملتبس رہتا ہے بلکہ کبھی باطل عارضی طور پر غلبہ پا کر حق کو دبا لیتا ہے۔ پس اس کے لیے بھی کوئی خاص موقع درکار ہے۔

نیز یہ کہ جن رسولوں نے احکام خدا کی تبلیغ کی اور جن لوگوں نے ان کا انکار کیا۔ دنیا یا نزع میں یا برزخ میں ان کے آمنے سامنے ہو کر ان میں فیصلے کی کوئی صورت نہیں ہو سکتی۔

پس ضروری ہے کہ ایک دن ایسا مقرر ہو، جس میں یہ سب امور حق حق طے ہو سکیں اور فیصلے میں کسی قسم کے اشتباہ کی گنجائش نہ رہ سکے اور اس کے بعد کسی فیصلے کا انتظار باقی نہ رہے۔ جزا و سزا سب کے سامنے عام ہو۔ ظالم و مظلوم ہر دو خدا کی عدالت میں حاضر ہوں اور حق دار کو غاصب و ظالم سے حق دلایا جائے اور پیغمبران خدا اور ان کی

مکر قومیں ہر دو فریق اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہوں اور رسولوں اور ان کے تابعداروں کے اعزاز و اکرام سے ان کے مکروں پر ثابت کر دیا جائے کہ وہ پیغمبر اور ان کے تابعدار اللہ کی طرف سے حق پر تھے اور مکر ان کے انکار میں ناحق پر تھے۔ و ہذا قرآن حکیم نے ان سب امور پر بالتفصیل سیر کن بحثیں کی ہیں اور ان مضامین کو ہر جہت سے مکمل طور پر بیان کیا ہے اور ہم دعویٰ سے کہہ سکتے ہیں کہ اس امر میں قرآن حکیم متفرد ہے۔ یہ باتیں کسی دیگر مذہب کی آسمانی کتاب میں موجود نہیں ہیں۔ نہ موجودہ توریت میں نہ زبور میں نہ انجیل میں نہ وید میں نہ وساتیر میں اور نہ کسی اور میں۔ چنانچہ امراول یعنی اجتماع اولین و آخرین کی نسبت فرمایا:-

☆ قل ان الاولین والآخرین لمجموعون الی میقات یوم معلوم (واقعہ پ ۲۷) ”کہہ دو بے شک سب پہلے اور سب پچھلے ایک معلوم دن کی میقات پر جمع کیے جائیں گے۔“

☆ ذالک یوم مجموع لہ الناس و ذالک یوم مشہود (ہود پ ۱۲) ”یہ وہ دن ہے جس میں تمام لوگ جمع کیے جائیں گے اور یہ وہ دن ہے جس میں سب حاضر ہوں گے۔“

☆ قل اللہ یحییٰکم ثم یمیتکم ثم یجمعکم الی یوم القیمة لا رب فیہ و لکن اکثر الناس لا یعلمون (جامیہ پ ۲۵)

”تو کہہ اللہ ہی تم کو زندگی بخشتا ہے پھر تم کو مارے گا۔ پھر تم کو قیامت کے دن اکٹھا (کر کے حاضر) کرے گا جس میں کوئی شک نہیں لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔“

☆ یوم یجمعکم لیوم الجمع ذالک یوم التغابن (تغابن پ ۲۸) ”جس دن تم کو اکٹھا کرنے کے دن اکٹھا کرے گا وہ افسوس کا دن ہوگا۔“

☆ ربنا انک جامع الناس لیوم لا رب فیہ (آل عمران پ ۳) ”اے ہمارے پروردگار بے شک تو تمام لوگوں کو اس دن جس میں کوئی شک نہیں جمع کرنے والا ہے۔“

ہذا یوم الفصل جمعناکم والا ولین (مرسلات پ ۲۹) ”یہ ہے فیصلے کا دن ہم نے تم کو اور سب پہلوں کو جمع کیا۔“

ان سب آیات میں بالصرحت مذکور ہے کہ اللہ رب العزت نے دنیا جہان کے فیصلے کے لیے اپنے علم میں ایک خاص دن مقرر کر رکھا ہے۔

اس تقریر کی بابت ایک اور بات بھی دماغ میں بٹھانے کی ہے کہ کسی امر کا تقرر عقل اور طبع کے متعلق نہیں ہے، بلکہ تقرر ایک وضع ہے اور وضع کے لیے اختیار اور استحقاق کی ضرورت ہے۔ نہ تقاضائے عقل و طبع کی اور یہ مسلم ہے کہ دنیا جہان کا مالک اور اس کے جملہ امور جزئیہ و کلیہ کا مختار و حقدار صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ اس میں کسی دوسرے کی کسی نوع کی بھی شرکت نہیں ہے۔ چنانچہ فرمایا۔ قل ادعوا الذین زعمتم من دون اللہ لا یملکون مثقال ذرة فی السموات ولا فی الارض وما لهم فیہما من شرک وما له منهم من ظہیر ○ (سورہ سہا، پ ۲۲)

”(اے پیغمبر! ان سے) کہہ دیجئے کہ پکارو تم ان کو جن کو گمان کر رکھا ہے تم نے سوائے اللہ کے۔ نہیں وہ مالک ایک ذرہ بھر کے آسمانوں میں اور نہ زمین میں اور نہ ان دونوں میں ان کی کوئی شراکت ہے اور نہ ان میں سے کوئی اس کا مددگار ہے۔ (کہ اس کا ہاتھ بٹائے)“

۳۹۔ یہ آیت غیر اللہ کی مالکیت و استحقاق کی نفی میں بہت عمدہ ہے۔ اس کی مختصر تشریح یوں ہے کہ اول تو اس میں ذرہ بھر کا لفظ فرما کر کلی نفی کر دی ہے۔ پھر یہ کہ اس میں تین مرتبے سمجھائے ہیں کیوں کہ کسی امر میں کسی کا عمل دخل اور تصرف و اختیار تین طرح سے ہوتا ہے۔ اول مستقل مالک کی حیثیت سے، دوم مالکیت میں شریک ہونے کی حیثیت سے، سوم کام میں مددگار ہونے کی حیثیت سے۔ سو ان تینوں حیثیتوں میں نفی کر دی کہ زمین و آسمان کی مالکیت اور ان کے جملہ انتظامات و تدبیر میں کسی نوع کا حق یا عمل دخل اور تصرف و اختیار نہیں ہے۔ نہ تو اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں ایسی کوئی ذات ہے جو کسی ایک ذرہ کی بھی مالک ہو، چاہے وہ ذرہ آسمان میں ہو، چاہے زمین میں اور نہ اس عمل دخل اور تصرف و اختیار وغیرہ میں اس کا کوئی (SHARE HOLDER) حصہ دار ہے اور نہ خدا تعالیٰ اپنے ضعف کی وجہ سے مدد و یاری کا محتاج ہے کہ یہ غیر اللہ اس کا ہاتھ بٹائیں۔ سبحان اللہ! کیا انداز بیان ہے کہ ہر پہلو نظر میں ہے۔

اسی کے ساتھ ایک اور بات بھی سمجھنے کی ہے کہ جو امر وضعی ہے۔ اس کا وجود و قیام لازم و ضروری نہیں ہوتا بلکہ عارضی ہوتا ہے جو اس کے واضح کی مرضی و مصلحت کے تابع ہوتا ہے۔ جب تک وہ چاہے اسے یا اس کے سلسلے کو قائم رکھے اور جب چاہے اسے توڑ پھوڑ کر اس کے سلسلے کو درہم برہم کر دے، کیوں کہ خود وضع بھی لازم و ضروری نہیں ہے، بلکہ واضح کا اختیاری کام ہے اور یہ بھی مسلم ہے کہ اللہ تعالیٰ فاعل بالارادہ والاختیار ہے نہ کہ فاعل بالاضطرار، پس خلق و فناء عالم یا ایجاد و اعدام، یا اس کی بقا و فنا، سب کچھ اس کے مصلحت بین ارادے کے ماتحت ہے۔ ان میں سے کوئی بھی ضروری و واجب نہیں ہے۔ اسی معنی میں کہا گیا ہے۔

تیرے ہاتھ میں ہے فنا و بقا
تیری شان جل جلالہ

جب یہ دونوں باتیں اچھی طرح سے آپ کے ذہن نشین ہو گئی ہیں تو اب آپ کو سمجھ لینا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کے وجود کے لیے ایک خاص وقت اور اس کی بقا کے لیے ایک خاص میعاد مقرر کر رکھی ہے، جس میں کسی قسم کا تخلف یا ایک ساعت کا بھی تقدیم و تاخر نہیں ہو سکتا۔ اس وقت کے آنے یا اس میعاد کے پورا ہونے پر اس شے کے وجود یا فنا کا حکم وارد کر دیتا ہے۔ پس وہ اسی طرح ہو جاتی ہے۔ چنانچہ فرمایا۔ انما امرہ اذا اراد شیئاً ان یقول لہ کن فیکون ○ (نحل، پ ۱۳) یعنی اللہ کا حکم تو بس یہی ہے کہ جب کسی شے کا ارادہ کرتا ہے تو اسے (یعنی اس کی صورت علیہ کو، جو اس کے علم میں ہے) کہتا ہے ”ہو جا“ پس وہ ہو جاتی ہے۔

یہی حال بقائے عالم کا ہے کہ اللہ کے علم و ارادے میں اس کی ایک میعاد مقرر ہے۔ اس کے پورا ہو جانے پر اس پر فنا کا حکم وارد کر دے گا۔ نظام شمسی و قمری درہم برہم ہو جائیں گے اور تمام کارخانہ دنیا و بالا ہو کر فنا ہو جائے گا۔

صوبہ بہار کی تازہ بربادی دیکھ لینے یا سن لینے کے بعد آپ کو اس کے سمجھنے اور تسلیم کرنے میں کوئی بھی مشکل یا تردد پیش نہیں آنا چاہیے۔ جس ذات برتر نے کوہ ہمالیہ کے دامن سے آگرہ کے تاج روضہ کی دیواروں تک اتنے بڑے حصہ ملک کو ایک لمحہ میں صرف ہلا ہی نہیں بلکہ زمین کو شق کر کے اس کے نیچے کے پانی کو اس کی پشت پر دریا کی

طرح بہا دیا اور ایک دم ہزا ہا نفوس کا گلا اس طرح گھونٹ دیا۔ جس طرح کہ بجلی کے سوکچ کو دبا کر سارے شہر کے بلب گل کر دیئے جاتے ہیں اور اتنے شہروں کی تباہی سے قیامت صغریٰ قائم کر دی۔ وہ اگر اسی کلمہ ”کن“ کے حکم میں تمام عالم کی بربادی کا ارادہ کر کے قیامت کبریٰ قائم کر دے تو کون سی بڑی بات ہے۔

اوست سلطان ہرچہ خواہد آں کند

عالے را در دے ویراں کند

قرآن حکیم میں فنائے عالم کا مضمون بہت جگہوں پر بہت وضاحت سے مذکور

ہے۔ چنانچہ فرمایا:-

☆ اذا الشمس كورت ○ واذا النجوم انكدرت ○ واذا الجبال سيرت ○
(تکویر، پ ۳۰) ”جب سورج لپیٹ لیا جائے گا اور جب تمام ستارے بے نور ہو جائیں گے اور جب پہاڑ چلائے جائیں گے۔“

☆ اذا السماء انفطرت ○ واذا الكوَاب انتثرت ○ واذا البحار فجرت ○ واذا القبور بعثرت ○ علمت نفس ما قدمت وَاُخِرَت ○ (انفطار، پ ۳۰)
”جب آسمان پھٹ جائے گا اور جب ستارے جھڑ جائیں گے اور جب سمندر بہ چلیں گے اور جب قبریں اٹھائی جائیں گی۔ جان لے گی ہر جان جو آگے بھیجا اس نے اور جو پیچھے چھوڑا۔“

☆ اذا السماء انشقت ○ واذنت لربها وحققت ○ واذا الارض مدت ○
والقت ما فيها وتحلت ○ واذنت لربها وحققت ○ (انشقاق، پ ۳۰)
”جب آسمان پھٹ جائے گا اور سن لے وہ حکم رب اپنے کا اور اسی لائق ہے وہ کہ (حکم مان لے) اور جب زمین پھیلانی جائے اور ڈال دے جو کچھ اس کے اندر ہے اور خالی ہو جائے اور سن لے حکم رب اپنے کا اور وہ اسی لائق ہے۔ (کہ حکم مانے)“

☆ اذا زلزلت الارض زلزالها ○ واخرجت الارض اثقالها ○ (زلزال، پ ۳۰)
”جب ہلائی جائے گی زمین نہایت درجے کی اور نکال ڈالے گی زمین (تمام) بوجھ اپنے۔“

☆ يوم يكون الناس كالفرش المبثوث ○ وتكون الجبال كالعهن

المنفوش ○ (قارمہ، پ ۳۰)

”جس دن ہوں گے لوگ مثل پر آگندہ پروانوں کے اور ہو جائیں گے پھاڑ مثل دھنی ہوئی اون کے۔“

☆ و یسلونک عن الجبال فقل یسففھا ربی نسفا ○ فینرھا قاعا صفففا ○ لا تری فیھا عوجا ولا مئا ○ (ط، پ ۱۶)

”اور (اے پیغمبر!) تجھ سے پہاڑوں کی بابت سوال کرتے ہیں تو ان کو بکھیر دے گارب تیرا اور پھر کر دے گا زمین کو چٹیل میدان، نہ دیکھے تو اس میں موڑ اور نہ ٹیل۔“

☆ وتری الجبال تحسبھا جامدة وھی تمر مر السحاب (نمل، پ ۲۰) ”اور تو دیکھتا ہے پہاڑوں کو، جانتا ہے تو کہ وہ جے ہوئے ہیں اور وہ چلیں گے جیسے چلے بدلی۔“

☆ و یوم نسیر الجبال و تری الارض بارزة و حشرنھم و لم نغادر منھم احدا ○ و عرضوا علی ربک صففا ○ (کف، پ ۱۵)

”اور جس دن چلا دیں گے ہم پہاڑوں کو اور تو دیکھے گا زمین کو نکل پڑی ہوئی اور جمع کریں گے ہم ان سب کو۔ پس باقی نہ چھوڑیں گے ہم ان میں سے کسی کو اور اپنے رب کے حضور میں صفیں باندھے ہوئے پیش کیے جائیں گے۔“

غرض یہ عالم زیریں و بالا تمام فساد برباد کر دیا جائے گا اور نیا آسمان اور نئی زمین پیدا کی جائے گی اور تمام لوگ محاسبہ اعمال کے لیے اپنے پروردگار کے سامنے پیش ہوں گے۔ چنانچہ فرمایا۔ یوم تبدل الارض غیر الارض و السموات و برزوا اللہ الواحد القہار ○ (ابراہیم، پ ۱۳)

”جس دن بدلی جائے گی یہ زمین ایک اور زمین سے اور آسمان بھی اور نکل کھڑے ہوں گے، اللہ اکیلے زبردست کے سامنے۔“

وزن اعمال :- میزان اعمال رکھا جائے گا اور ذرہ ذرہ بھرنیکی و بدی کا حساب ہو گا اور اس میں ذرہ برابر بھی ظلم نہ ہو گا۔ چنانچہ فرمایا:-

☆ والوزن یومئذ الحق فمن ثقلت موازنہ فاؤلک هم المفلحون ○ ومن

خفت موازينه فاؤلک الذین خسرو انفسهم بما کانوا بایتنا یظلمون ○
(اعراف، پ ۸)

”اور اس روز وزن (اعمال) بالکل حق ہے۔ پس جس کسی کے اعمال کا وزن ہماری ہوگا، وہی نجات پائیں گے اور جس کے اعمال کا وزن سبک ہوگا۔ پس وہی ہوں گے، جنہوں نے اپنی جانوں کو گھائے میں ڈالا۔ اس لیے کہ وہ ہماری آیتوں سے بے انصافی کرتے تھے۔“

☆ ونضع الموازين القسط لیوم القيمة فلا تظلم نفس شیئاً، وان کان مثقال حبة من خردل اتینابہا، وکفی بنا حسبین ○ (انبیاء، پ ۱۷)
”اور ہم قیامت کے دن عدل والے ترازو قائم کریں گے۔ پس کسی جان پر کچھ بھی ظلم نہ ہوگا اور اگر (وہ عمل) رائی کے دانے کے بھی ہم وزن ہوگا تو ہم اسے بھی حاضر کر دیں گے اور (اتنے بڑے کام کے لیے) ہم خود ہی کافی محاسب ہیں۔“

☆ ان اللہ لا یظلم مثقال ذرۃ و ان تک حسنة یضعفها و یوت من لدنہ اجرًا عظیمًا ○ (النساء، پ ۵)
”بے شک اللہ رب العزت ایک ذرہ بھر بھی ظلم نہیں کرے گا اور اگر (وہ عمل) کوئی نیکی ہوگی تو اللہ تعالیٰ اسے بڑھا کر اضافاً مضاعفہ کر دے گا اور اپنے پاس سے اجر عظیم دے گا۔“

☆ یوم ہم بارزون لا یخفی علی اللہ منہم شیئ، لمن المملک الیوم، للہ الواحد القہار ○ الیوم تجزی کل نفس بما کسبت، لا ظلم الیوم، ان اللہ سریع الحساب ○ (مومن، پ ۲۳)

”جس دن وہ سب نکل کھڑے ہوں گے۔ چھپی نہ رہے گی اللہ پر ان کی کوئی چیز (کہا جائے گا) آج کس کا راج ہے؟۔ (اللہ تعالیٰ خود ہی فرمائے گا) اکیلے زبردست اللہ کا راج ہے۔ آج ہر جان کو اس کے کسب کے موافق جزا ملے گی۔ آج کسی طرح کا ظلم نہیں ہوگا۔ بے شک اللہ بہت جلد حساب چکانے والا ہے۔“

ازالہ شبہ:- وزن اعمال کے متعلق بعض عقل کے پتلوں کو یہ شبہ عارض ہوتا ہے کہ وزن ذی مقدار اجسام کا کیا جاتا ہے اور اعمال ذی مقدار اجسام نہیں ہیں تو ان کے وزن

کے کیا معنی؟۔

سو اولاً تو یہ معلوم ہو کہ غیر جسمانی چیزوں کو مقدار کے لفظوں میں بیان کرنا ہر زبان کا محاورہ ہے۔ آپ کہا کرتے ہیں ”ذره بھی فکر نہ کرو“ اور یہ بھی کہا کرتے ہیں۔ ”مجھ پر غموں کے پہاڑ آ پڑے ہیں۔“ حالانکہ فکر و غم جسمانی چیزیں نہیں ہیں، لیکن آپ ایسا بولتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کی بیشی ہر شے میں ہوتی ہے۔ جسمانیات میں بھی اور معانی میں بھی اور کوائف میں بھی اور ان کے بیان کرنے کے لیے وہی الفاظ بولے جاتے ہیں۔ جو محسوسات کے لیے بولے جاتے ہیں۔ پس جس طرح محسوسات کی مقدار معلوم کرنے کے لیے میزان محسوس ہے۔ اسی طرح اعمال (نیک و بد) کی مقدار معلوم کرنے کے لیے ایک میزان ہے اور یہ ضرور نہیں کہ جس نوع کا تھمارے ہاں میزان محسوس ہے، اسی نوع کا وہ بھی ہو اور آپ کو یہ شبہ پڑے کہ اعراض و معانی محسوس میزان پر کیسے تھلیں گے؟۔ کیوں کہ ہر چیز کا میزان اس کی نوع کے لحاظ سے الگ ہوتا ہے۔ آپ کے ہاں شعروں کے لیے بھی اوزان ہیں۔ صرئی صیغوں کے لیے بھی اوزان ہیں تو کیا وہ بھی اسی طرح دو پلڑوں والے ترازو ہوتے ہیں کہ ایک طرف باٹ رکھا جائے اور دوسری طرف وہ شعر یا صیغہ جس کا وزن آپ کو مطلوب ہے۔ آپ کی مکرانہ عقل قرآن و حدیث کے لیے خوب تیز ہو جاتی ہے لیکن اپنی باتوں کے وقت اسے کچھ بھی ہوش نہیں رہتی کہ میاں صاحب کیا لاپتے ہیں۔

دیگر یہ کہ جو عمل ہم کرتے ہیں۔ اللہ رب العزت کے پاس ان کے دفتروں کے دفتر لکھے ہوئے ہیں۔ وہ سب قیامت کے دن سامنے لائے جائیں گے اور وزن کیے جائیں لیکن مقابلہ کاغذوں کے بوجھ کا نہیں ہوگا بلکہ ان عملوں کی انواع اور کوائف کے رو سے اور اللہ کے نزدیک ان کی قدرد شرف یا ناراضی و خفگی کے اندازے سے ہوگا۔ ایک عمل اپنی ذات میں بہت چھوٹا ہے لیکن وہ اپنی نوع کے لحاظ سے اللہ رب العزت کے نزدیک سب سے بڑھ کر محبوب و افضل ہے یا خفگی و ناراضی میں سب سے بڑھ کر عظیم ہے۔ مثلاً ایمان اور کفر و شرک۔

ایمان (لحاظ دل کی تصدیق کے) بالکل معمولی بات نظر آتی ہے لیکن مذہبی آئین میں اصل اصول اور سب سے افضل یہی ہے۔ حدیث میں وارد ہے کہ نبی مکرم

ﷺ سے دریافت کیا گیا۔ اہی العمل افضل؟۔ کون سا عمل سب سے افضل ہے؟۔ آپؐ نے فرمایا۔ ایمان باللہ ورسولہ (صحیح بخاری) یعنی اللہ کی توحید پر ایمان رکھنا۔ اسی طرح شرک ظاہر میں چھوٹی سی چیز ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے بڑا گناہ ہے۔ چنانچہ حضرت لقمان کے وعظ کے اثناء میں فرمایا۔ ان الشرک لظلم عظیم (لقمان، پ ۲۱) نیز فرمایا۔ ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ (النساء، پ ۵) یعنی اللہ تعالیٰ اس بات کو ہرگز نہیں بخشنے گا کہ اس سے شرک کیا جائے اور حدیث میں وارد ہے کہ نبی مکرم ﷺ سے دریافت کیا گیا۔ اہی الذنب اکبر عند اللہ یعنی اللہ کے نزدیک سب سے بڑا گناہ کون سا ہے؟۔ آپؐ نے فرمایا۔ ان تجعل اللہ نداً وهو خلقک الحدیث (مکھوۃ، ص ۸) یعنی یہ کہ تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک مقرر کرے، حالانکہ اللہ ہی تیرا خالق ہے۔

پھر یہ کہ اعمال کوائف کے لحاظ سے بھی درجات میں مختلف ہو جاتے ہیں۔ نیکیاں بھی اور بدیاں بھی۔ چنانچہ ولکل درجت مما عملوا (انعام، پ ۸) نیز فرمایا۔ ہم درجت عند اللہ (آل عمران، پ ۴) یعنی سب کے اپنے اپنے اعمال کی رو سے مختلف درجات ہیں اور وہ سب خدا کے پاس مختلف مدارج پر ہوں گے۔ حدیث میں وارد ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ کی ساری نیکیاں حضرت صدیق اکبرؓ کی ایک کی نیکی میں نیچے ہیں۔ نیز فرمایا۔ لا یستوی منکم من انفق من قبل الفتح وقاتل، اولئک اعظم درجۃ من الذین انفقوا من بعد وقاتلوا وکلاً وعد اللہ الحسنی (حدید، پ ۲۷) یعنی نہیں ہیں برابر تم میں سے وہ لوگ جنہوں نے فتح مکہ سے پہلے خرچ کیا اور جہاد کیا۔ وہ لوگ ان لوگوں سے بڑے درجے والے ہیں، جنہوں نے اس کے بعد خرچ کیا اور جہاد کیا۔ اور جنت کا وعدہ تو اللہ نے ان سب سے کیا ہے۔ حافظ ابن حزم قرطبیؒ جن کی فوق الفطرت ذہانت اور جمیع علوم شرعیہ و فنون عقلیہ میں امامت و مہارت مسلم کل ہے اور موافقت معقول و منقول میں نہایت سلامت رو ہیں۔ اپنی مایہ ناز کتاب ”کتاب الفضل“

۴۰۰ شاید یہ ایک نیکی شب ہجرت کی رفاقت کی نیکی ہو، رہے سعادت اس یار غار کی رضی اللہ

عنہ

میں فرماتے ہیں:-

ونقطع على ان تلك الموازين اشياء يبين الله عز وجل بها لعباده لمقادير اعمالهم من خير او شر من مقدار الذرة التي لا تحس وزنها في موازيننا اصلا" فما زادو لا ندرى كيف تلك الموازين الا اننا ندرى انها بخلاف موازين الدنيا وان ميزان من تصدق بدنيار او بلؤلؤة اثقل ممن تصدق بكنا انة وليس هنا وزنا و ندرى ان اثم القتال اعظم من اثم اللطم وان ميزان مصلی الفريضة اعظم من ميزان التطوع بل بعض الفرائض اعظم من بعض فقد صبح عن النبي صلى الله عليه وسلم ان من صلى الصبح في جماعة فكانما قام ليلة ومن صلى العتمة في جماعة فكانما قام نصف وكلاهما فرض و هكنا -جميع الاعمال فانما يوزن عمل العبد خيره مع شره (جلد چارم) مطبوعه مصر ٦٥ - ٦٦

”اور ہم قطعی طور پر کہتے ہیں کہ یہ موازين ایسی اشیاء ہوں گی جن سے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے اعمال خیر و شر کی مقدار ظاہر کرے گا۔ ایک ذرہ کی مقدار بھی جس کا وزن ہمارے میزانوں سے معلوم نہیں ہو سکتا اور اس سے زیادہ کی بھی اور ہم نہیں جانتے کہ وہ میزان کس نوعیت کے ہوں گے۔ ہاں اتنا جانتے ہیں کہ وہ دنیا کے ترازوں کی جنس سے نہ ہوں گے اور ہم یہ بھی با قطع کہتے ہیں کہ جو شخص ایک دینار یا ایک موتی

(راہ خدا) میں صدقہ کرے۔ اس کا وزن اس شخص کے وزن سے زیادہ بھاری ہو گا جو ایک آنہ صدقہ کرتا ہے۔ حالانکہ یہ متعارف وزن نہیں ہے اور یہ بھی کہ قاتل کا گناہ تھپڑ مارنے والے کے گناہ سے بڑا ہے اور یہ بھی کہ نماز فرض ادا کرنے والے کا میزان نماز نفل کے (ادا کرنے والے) سے بڑا ہے۔ بلکہ بعض فرض دیگر فرائض سے بھی بڑے ہیں۔ نبی مکرم ﷺ سے صحیح طور پر ثابت ہو چکا ہے کہ جو شخص نماز صبح باجماعت ادا کرتا ہے۔ وہ مثل اس شخص کی ہے جو تمام رات نماز میں رہا اور جو نماز عشاء باجماعت ادا کرے گا گویا اس نے نصف رات کا قیام کیا۔ حالانکہ یہ دونوں فرض ہیں اور اسی طرح بندے کے تمام اعمال نیک و بد وزن کیے جائیں گے۔“

حافظ ابن حزمؒ کی یہ تحریر آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ نہایت وسیع علم اور نہایت گہرے فکر کا نتیجہ ہے۔ اعتقاد حق اور شان علم ہر دو کو نہایت سلامتی سے محفوظ رکھا ہے اور اس میں جس قدر مثالیں بیان کی ہیں۔ ان سب میں کمی بیشی کا حکم جسمانی ترازو سے نہیں لگایا جاسکتا بلکہ عقلی و روحانی سے۔ حالانکہ وہ سب اعمال ہیں اور اعراض ہیں۔

دیگر یہ کہ ہم جو عمل بھی کرتے ہیں۔ نیک ہوں یا بد، عالم مثال میں ان سب کی مناسب صورتیں بنتی ہیں، جیسا کہ سابقہ ”کئی دفعہ ذکر ہو چکا ہے۔ پس وہ متمثل اجسام میزان میں تولے جائیں گے۔ یہ سب امور مذکورہ ممکنات سے ہیں اور قرآن حکیم و صحیح احادیث میں اس کثرت سے وارد ہیں کہ ان سے انکار نہیں ہو سکتا اور مخبر صادق کسی ممکن امر کی خبر دے دے تو اس میں تردد و شک کی گنجائش نہیں رہتی۔ ورنہ سارا نظام شہادت اور لوگوں کا اعتبار و وقار درہم برہم ہو جائے گا اور دماغوں کی پریشانی اور نظام عالم کی خرابی اس کا نتیجہ ہوگا۔

تردد و شک کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ اول یہ کہ وہ امر فی نفسہ محال ہو لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ اسے محال قرار دینے کے لیے ہمیں کافی علم ہو۔ ایسا نہ ہو کہ اپنے ضعف اور اک یا قلت علم یا عدم بصیرت کی وجہ سے ممکنات کو بھی محال قرار دے لیں اور اس میں تردد و شک کریں یا اس سے انکار کر دیں یا اگر جمالت مرکبہ کا جن سوار ہو جائے تو مخذیب کے ٹھیکے دار بن جائیں۔ اللہ تعالیٰ ایسے منکرین اور مکذوبوں کی حالت بتاتا ہے۔ بل کنبوا بمالم یحیطوا بعلمہ ولما یتاہم تاویلہ (یونس، پ ۱۱) بلکہ جھٹلایا انہوں نے اس شے (قرآن) کو جس کے سمجھنے پر انہوں نے قابو نہ پایا اور ابھی ان کو اس کی حقیقت معلوم نہیں ہوئی تھی۔ اسی طرح قیامت کے روز ان سے فرمائے گا۔

لے مولانا شبلی مرحوم الکلام حصہ اول میں حافظ ابن حزمؒ کے حال میں فرماتے ہیں۔ ”مسلمانوں میں جن لوگوں کا فضل و کمال معمولی طاقت بشری سے بالاتر خیال کیا گیا ہے۔ ایک ان میں علامہ موصوف بھی ہیں۔ ان کی تصنیفات تقریباً ”چار سو ہیں اور اسی ہزار صفحوں میں ہیں۔“

اَلْکُتُبُ بَیِّنَتِی وَلَمْ تَحِیْطُوا بِهَا عَلِمًا لِّمَا فَاکُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (نمل، پ ۲۰) یعنی کیا تم نے میرے احکام کو جھٹلادیا تھا۔ حالانکہ تم نے از روئے علم ان کو پورا سمجھنا نہ تھا یا کو تم کیا کرتے تھے؟

دوسری صورت شک یا انکار کی یہ ہے کہ خریدنے والے کی راست گوئی میں شک ہو یا اس کی کذب بیانی کا علم ہو۔ لیکن اگر بات ہو ممکن اور خریدنے والا ہو بچوں کا چا، بلکہ اللہ تعالیٰ کا رسول ﷺ تو اس کی تصدیق و تسلیم میں ہچکچاتا یا اس میں شک و تردد کرتا یا معاذ اللہ اس سے انکار کرتا یا اس کی تکذیب کرتا؟ اس چہ؟

غرض یہ سب امور جو قرآن و حدیث صحیح میں وارد ہیں، سب سچ ہیں اور ممکن ہیں۔ ان میں شک کرنے یا انکار کرنے کی وجہ اپنی کوتاہ فہمی یا زلیخ قلبی کے سوا اور کچھ نہیں۔ ومن لم يجعل الله له نورا فماله من نور (نور، پ ۱۸) اخیر پر ہم بعض اکابر کی مختصر عبارتیں بھی لکھتے ہیں، جن کے علم و فضل کا ڈنکا چار دانگ عالم میں بچ چکا ہے۔ صرف ان کوتاہ بینوں کے لیے، جنہوں نے قصر معقولات کی ڈیوڑھی دیکھ کر اپنا دماغ خراب کر لیا ہے۔ تاکہ ان کو معلوم ہو جائے۔ دنیا جہان کے معقولوں کے استاد باوجود اتنے علم و فضل کے ان سب امور کے قائل تھے اور ان کی فلسفہ دانی ان کو قرآن و حدیث کی تصریحات کے خلاف ذرہ بھر بھی ڈگمگانی نہیں سکی۔ چنانچہ امام غزالیؒ اپنی کتاب اقتصاد فی الاعتقاد میں مگرین و زن اعمال کا اعتراض ذکر کر کے فرماتے ہیں:-

(فنقول) قد سئل النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عن هذا فقال قد نوزن صحائف الاعمال فان الکرام المکاتبین یکتبون الاعمال فی صحائف ہی اجسام فاذا وضعت فی المیزان خلق اللہ تعالیٰ فی کفها میلا بقدر رتبة الطاعات وهو علی ما یشاء قدیر (اقتصاد، ص ۹۸، مطبوع مصر)

”ہم اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ سے اس بات کا سوال ہوا تھا

کہ امام صاحب ممدوح نے یہ کتاب خاص اس مقصد کے لیے لکھی ہے کہ بے ثبوت روایتوں کے ماننے والوں کے افراط اور بے بصیرت معقولوں کی تفریط سے بچے ہوئے حق اور سچ بات ثابت کی جائے۔ اسی لیے اس کا نام اقتصاد رکھا ہے۔ چنانچہ خطبہ کتاب میں اس امر کا امام صاحب ممدوح نے خود ذکر کیا ہے، جسے ہم بخوف طوالت نقل نہیں کر سکتے۔

تو آپؐ نے فرمایا تھا کہ اعمال نامے تولے جائیں گے، کیوں کہ کراماؑ کا تئیں اعمال کو صحیفوں میں لکھتے ہیں اور وہ اجسام ہیں۔ پس جب وہ میزان میں رکھے جائیں گے تو اللہ رب العزت اس کے پلڑے میں بقدر طاعات کے رتبے کے میلان پیدا کر دے گا اور وہ جو کچھ چاہے اس پر قادر ہے۔“

اسی طرح امام رازیؒ اپنی کتاب ”تفسیر کبیر“ میں فرماتے ہیں:-

(احدھما) ان اعمال المومن تنصور بصورة حسنة و اعمال الکافر بصورة قبيحة فتوزن تلك الصورة كما ذكره ابن عباسؓ (والثانی) ان الوزن يعود الى الصحف التي تكون فيها اعمال العباد مكتوبة و سئل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عما یوزن يوم القيمة فقال الصحف (کبیر) جلد چارم ص ۱۸۷ سورۃ اعراف)

” (پہلی وجہ یہ ہے) کہ مومن کے اعمال اچھی صورت میں متمثل ہوں گے اور کافر کے بری صورت میں، پس وہ صورت وزن کی جائے گی۔ جس طرح کہ حضرت ابن عباسؓ نے ذکر کیا۔ (دوسری وجہ یہ ہے) کہ وہ صحیفے جن میں بندوں کے اعمال لکھے جاتے ہیں، تولے جائیں گے اور رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا تھا تو آپؐ نے فرمایا تھا صحیفے (تولے جائیں گے)۔“

اسی طرح علامہ سعد الدین تفتازانیؒ فرماتے ہیں:-

والاعمال توزن صحائفها او تجعل الحسنات اجساما نورانية والسيئات ظلماتية (مقامد مطبوعہ مصر جلد ثانی ص ۲۲۲)

”اور اعمال کا وزن صحیفوں کے تلتے سے ہوگا۔ یا یہ کہ نیکیاں نورانی جسموں میں اور برائیاں ظلماتی جسموں میں متمثل کی جائیں گی۔“

اعمال کا لکھا جانا اور قیامت کے دن اس اعمال نامہ کا پیش ہونا قرآن حکیم میں بکثرت مذکور ہے۔ چنانچہ بعض آیات حسب ذیل ہیں:-

☆ وکل انسان الزمئة طائرہ فی عنقہ و نخرج له يوم القيمة کتابا یلقہ منشورا ○ اقرأ کتابک کفی بنفسک اليوم علیک حسیبا ○ (اسرائیل پ ۱۵)

”اور ہم نے ہر انسان کی قیمت اس کے گلے کا ہار بنا رکھی ہے اور قیامت کے دن اس کے لیے ایک ٹوشت نکالیں گے جسے وہ کھلی ہوئی پالے گا۔ (اور اسے کھا جائے گا) اپنی کتاب (اعمال) کو پڑھ لے۔ آج تیری اپنی جان تجھ پر کافی حساب لینے والی ہے۔“

☆ ہذا کتابنا ينطق عليكم بالحق انا كنا نستنسخ ما كنتم تعملون (جامع، پ ۲۵) ”یہ ہے ہماری ٹوشت جو تم پر حق حق بولتی ہے۔ بے شک ہم لکھواتے رہتے تھے جو کچھ تم کرتے تھے۔“

☆ ولن عليكم لحفظين ○ کرلما ○ کاتبين ○ يعلمون ما تفعلون ○ (انفطار، پ ۳۰) ”اور بے شک تم پر محافظ ہیں یعنی کرلما“ کاتبین جن کو مطوم ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔“

☆ و وضع الكتاب فترى المجرمين مشفقين مما فيه و يقولون يويلتنا مال هذا الكتاب لا يغادر صغيرة ولا كبيرة الا احصاها و جدوا ما عملوا حاضرا ○ ولا يظلم ربك احدا ○ (کف، پ ۱۵)

”اور رکھی جائے گی (حساب کی) کتاب، پس تو مجرموں کو دیکھے گا کہ وہ اس سے جو اس میں (درج) ہوگا ڈرتے ہوں گے اور کہیں گے ہائے بربادی ہماری یہ کیسی کتاب ہے کہ اس نے کوئی چھوٹی نہ بڑی بات نہیں چھوڑی، مگر وہ اس میں سب کچھ درج ہے اور یہ لوگ اپنے سب اعمال اپنے سامنے موجود پائیں گے اور تیرا رب کسی پر بھی ظلم نہیں کرے گا۔“

اب ہم اس مضمون کو ایک حدیث پر ختم کرتے ہیں۔ جس پر امام بخاریؒ نے اپنی صحیح کو ختم کیا ہے۔ امام بخاریؒ اپنی صحیح کے خاتمہ پر عنوان باب یوں باندھتے ہیں:-
باب قول الله ونضع الموازين القسط ليوم القيمة ولن اعمال بنی آدم وقولهم توزن یعنی یہ باب ہے اللہ تعالیٰ کے فرمان ونضع الموازين القسط ليوم القيمة کا اور نیز اس کا کہ بنی آدم کے اعمال و اقوال (سب) تولے جائیں گے۔ پھر اس کے ذیل میں حضرت ابو ہریرہؓ کی یہ حدیث ذکر کی ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:-

كلمتان حبیبتان الی الرحمن خفیفتان علی اللسان ثقیلتان فی

المیزان، سبحان اللہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم (خاتمہ صحیح بخاری شریف) ”دو کلمے ہیں جو اللہ رحمن کو بہت پیارے ہیں۔ زبان پر بہت ہلکے ہیں۔ میزان (اعمال) میں بہت بھاری ثابت ہوں گے۔ وہ یہ ہیں۔ سبحان اللہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم۔ دیکھئے اس حدیث میں ان کلمات کی نسبت تینوں وصف مذکور ہیں۔ خفت و ہلکا پن یعنی زبان پر آسان ہونا اور ثقل (بوجھ) یعنی میزان عمل میں لحاظ ثواب کے بھاری ہونا اور محبوبیت یعنی اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کا پسندیدہ ہونا ان کی خفت اور محبوبیت میں تو آپ کو کلام نہیں ہوگا۔ باقی رہ گیا ثقل سو ان کے بعد اس کے ماننے میں کچھ بھی مشکل باقی نہیں رہتی۔ یہ کلمات جنس اعراض سے ہیں، جنس اجسام سے نہیں ہیں لیکن زبان پر ان کے ہلکا ہونے کو آپ مانتے ہیں۔ ایک چیز کو آپ ایک جہت سے ہلکا مانتے ہیں تو دوسری جہت سے اس کے بھاری ماننے میں کیوں تامل ہے؟۔ خفت اور ثقل دو متقابل اور اضافی امر ہیں۔ جب ایک ثابت ہے تو دوسرا ناممکن کیوں ہے؟۔ اور اس کی وجہ یہ ہے۔ ان کے مضمون پر نظر کر کے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی تحمید و تسبیح اور اس کی عظمت و جلال پر مشتمل ہیں۔ آپ کا دل اور دماغ ان کے پسندیدہ خدا ہونے کو سمجھتا اور مانتا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کی قدر و قیمت بہت زیادہ ہوگی اور وہ ان پر نہایت عظیم ثواب عطا کرے گا، خطائیں معاف کرے گا اور درجات بلند کرے گا۔ اللہم ارزقنا۔

فائدہ:- وزن اعمال کا فائدہ یہ ہے کہ بندے کا کیا کرایا سب کچھ اس کے سامنے کر کے اور اس کی کمی بیشی اور ارتکاب و فرو گذاشت اور نیکی بدی کا توازن و مقابلہ محسوس طور پر عیاں کر کے اپنے فیصلہ کی عدالت ظاہر کر دی جائے تاکہ اسے کہا جاسکے۔ ذالک بما قدمت یداک ولن اللہ لیس بظلام للعبید (ج، پ ۱۷) یعنی یہ فیصلہ اسی کے مطابق ہوا ہے جو تیرے ہاتھوں نے بھیجا تھا اور اللہ تعالیٰ تو (اپنے) بندوں پر ہرگز ظلم روا نہیں رکھتا۔

علامہ یعنی ”شرح صحیح بخاری میں حدیث مذکورہ صدر کے ذیل فرماتے ہیں:-
وفائدته اظهار العدل والمبالغة فى الانصاف والالزام قطعاً لا عذر العباد (جلد ۱۱ ص ۶۳۲)
”اس کا فائدہ یہ ہے کہ عدل کو ظاہر کیا جائے اور انصاف کرنے اور طہر

گردانے میں حد تک پہنچا جائے تاکہ بندوں کے تمام عذر توڑے جاسکیں۔“
تم والحمد لله

اللهم ثقل ميزاني وفكر رهائي واجعلني في السدى الاعلى آمين

حساب اعمال کے بعد جنت یا دوزخ

(قال) فريق في الجنة وفريق في السعير (شوری، پ ۲۵) ”ایک گروہ جنت میں جائے گا اور ایک دوزخ میں۔“

حسابہ اعمال کے بعد صالحین کو جن کے اعمال صالحہ کا وزن بھاری ہوگا ان کے فیصلے کے پرچے یا یوں سمجھیں کہ جنت میں داخل ہونے کی ٹکٹیں یا سندیں ان کے دائیں ہاتھ میں دے کر نہایت عزت و احترام سے جنت میں لے جانے کے لیے فرشتوں کو ساتھ کیا جائے گا۔ اور منکروں اور بدکرداروں کو ان کے فیصلے کے پرچے یا دوزخ کی ٹکٹیں ان کے بائیں ہاتھ میں دے کر گرفتاروں کی صورت میں اللہ تعالیٰ کے فرشتے آگے سے کھینچ کر اور پیچھے سے دھکیل دوزخ کو لے جائیں گے۔ یہ امور قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر مذکور ہیں۔ اختصار کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہم صرف ایک مقام کو نقل کرتے ہیں۔ سورہ حاقہ، پ ۲۹ میں فرمایا:-

فاما من اوتى كتبه بيمينه فيقول هاؤم اقرؤا كتبه ○ انى ظننت انى ملق حسابيه ○ فهو فى عيشة راضية ○ فى جنة عالية ○ قطوفها دانية ○ كلوا واشربوا هنيهة بما اسلفتم فى الايام الخالية ○ ولما من اوتى كتبه بشماله ○ فيقول يلىتنى لم اوت كتبه ○ ولم ادر ما حسابيه ○ يلىتها كانت القاضية ○ ما اغنى عنى مالى ○ هلك عنى سلطانيه ○ خذوه فغلوه ○ ثم الجحيم صلوه ○ ثم فى سلسلة ذرعها سبعون ذراعا ○ فاسلكوه ○ انه كان لا يومن بالله العظيم ○ ولا يحض على طعام المسكين ○ فليس له اليوم ههنا حميم ○ ولا طعام الا من غسلين ○ لا ياكله الا الخاطئون ○ (ماقہ، پ ۲۹)

”سو جس کو ملی اس کی نوشت دائیں ہاتھ میں تودہ تو کئے گا۔ لیجیو! پڑھیو میری

نوشت 'مجھے (دنیا میں بیش) کھانا لگا رہتا تھا کہ مجھے میرا حساب ملے گا۔ پس وہ من بھاتی گزران میں ہو گا۔ عالی (شان) جنت میں 'جس کے میوے جھک رہے ہیں' کھاؤ اور پیو رجنا پہننا اس پر جو تم نے (دنیا کے) گزشتہ ایام میں (یہاں) بھیجا تھا لیکن جس کو ملی اس کی نوشت بائیں ہاتھ میں سودہ چلائے گا۔ اے کاش! نہ دی جاتی مجھے میری نوشت اور نہ سمجھتا میں اپنا حساب' اے کاش! کسی طرح یہ حالت ختم ہو جاتی۔ نہ نفع دیا مجھے میرے مال نے 'میری حکومت اور رعب داب سب کچھ جاتا رہا۔ (حکم ہو گا) فرشتو! اسے پکڑو' پھر اسے طوق ڈالو۔ پھر اسے جہنم میں لے جا' داخل کرو پھر ایک زنجیر میں جس کا ٹاپ ستر (۷۰) گز ہے۔ اسے جکڑو' کیوں کہ یہ خدائے عظیم پر ایمان نہیں رکھتا تھا اور کسی مسکین کے کھانے کی ترغیب بھی نہیں دیتا تھا۔ سو آج یہاں اس کا کوئی بھی حمایتی نہیں اور نہ کھانا' مگر زخموں کی پیپ' کوئی نہیں کھائے گا اسے مگر ایسے ہی خطاکار۔"

جنت کی نعمتوں اور دوزخ کی تکلیفوں کا بیان قرآن شریف میں اور احادیث صحیحہ میں نہایت وضاحت اور تفصیل سے ہے۔ اگر ہم ان سب آیات و احادیث کو نقل کریں تو مضمون بہت طویل ہو جائے۔ اس لیے نظریہ اختصار ہر دو کے امور متعلقہ جو قرآن شریف میں مذکور ہیں۔ ہم ان کا تلخیص ذیل میں لکھ دیتے ہیں۔ تاکہ ترغیب و ترہیب ہر دو امر سامنے رہیں۔ (قل اللہ) انہم کانوا یسرعون فی الخیرات و یدعوننا رغبا ورہبا و کانوا لنا خشعین ○ (انبیاء" پ ۱۷) یعنی یہ (انبیاء کرام) نیکیوں میں جلدی کرتے تھے اور ہمیں شوق سے بھی اور ڈر سے بھی پکارتے تھے اور ہمارے سامنے عاجزی کرنے والے تھے۔

نعمائے جنت

(رزقنا اللہ تعالیٰ)

۱۔ کھنے اور وسیع سائے، جن میں نہ دھوپ لگے، نہ گرمی، نہ تپش، نہ لو اور نہ جاڑا۔ سرد و شادمانی سے ہشاش بشاش ہوں گے۔ خوف و ہراس اور فکر و غم

پاس نہیں پھٹے گا۔ چہرے چمکتے ہوں گے۔ ان پر نور برس رہا ہوگا۔ وہ اس محسن و خوشی میں سدا رہیں گے۔

۱۔ پینے کو (ٹھنڈے اور میٹھے) چٹھے اور نہریں (پانی کی جو بدبودار نہ ہو گانیز دودھ کی، جس کا مزہ نہ بدلے گانیز پاک شراب کی) جس سے نہ نشہ ہوگا نہ خمار نہ بکواس اور نہ خلاف تہذیب کوئی کلام کریں گے۔

۲۔ کھانے کو انواع و اقسام کے لطیف اکیئیت میوہ جات اور اڑتے جانوروں کا گوشت، جن میں غلیظ فضلہ نہیں ہوگا کہ پائخانے کی حاجت پڑے بلکہ ان کی لطافت کی وجہ سے یہ ضرورت پینے سے رفع ہو جائے گی۔ جو طبی اصول سے ہضم راجع کا فضلہ ہوتا ہے اور علاوہ بریں جس چیز کی ان کو طلب و خواہش ہوگی، وہ فوراً مہیا کی جائے گی۔

۳۔ پہننے کو باریک اور دبیز نہایت عمدہ ریشم اور سونے اور چاندی کے زیورات۔

۴۔ رہنے کو پاکیزہ اور سحرے کئی کئی منزل اونچے عالی شان محلات، جو پر تکلف فرنیچر سے سجے جائے ہیں۔ (قصر و گھرار و اندر قصر گھرار دگر)

۵۔ فرنیچر عمدہ سے عمدہ، قالین و بالین، گاؤں تکیے، مسدیں، جڑاؤ تخت، خوب صورت فرش اور چاندنیاں۔

۶۔ سونے اور چاندی کے برتن، پلیٹیں، آبخورے ایسی چاندی کے کہ سفید بلور کی طرح شفاف ہوگی۔

۷۔ خدمت کے لیے پاک صورت نو عمر لڑکے محل موتیوں کے۔

۸۔ تامل کو، نیک سیرت، خوب صورت، نیچی نگاہ والی شرم و حیاء والی، فرمایاں بردار بیویاں۔

۹۔ فرحت روح بلکہ اس کی حیات ابدی کے لیے دیدار خدا کی نعمت (رزق اللہ) جو اصل مقصود ہے اور سب نعمتوں سے اکبر و اعظم ہے نیز اس کی درگاہ بے نیاز سے سلام کا تحفہ اور یہ خوش خبری کہ میں تم سے ایسا خوش ہو گیا ہوں کہ تم سے کبھی ناراض نہ ہوں گا۔ (پس سدا جیو اور عیش و آرام میں رہو)

تکالیف دوزخ

(اعازا اللہ منھا)

- ۱- کالک بھرے سے شاخہ دھوئیں کا سایہ، جس کا سایہ نہ ہوگا اور اس میں کسی قسم کی ٹھنڈک اور آسائش نہ ہوگی بلکہ اوپر سے آگ کی بڑی بڑی چنگاڑیاں برسیں گی۔ ان کے چہروں پر غبار اور سیاہی چڑھی ہوگی۔ گویا کہ وہ کالی رات کے ٹکڑے ہیں۔ تیوڑی چڑھائے اور منہ بتائے ہوں گے۔ جو لوگ کفر و شرک کی وجہ سے دوزخ میں جائیں گے، ان کی خلاصی کبھی نہیں ہوگی بلکہ اسی عذاب و رنج میں پیشہ رہیں گے۔
- ۲- پینے کو کھولتا ہوا پانی، جس سے انتڑیاں بھی کٹ جائیں گے نیز زخموں کی پیپ۔
- ۳- کھانے کو تھوہر کا زہریلا درخت اور ضریح (ایک خاردار جھاڑی، جو خشک ہو کر زہریلی ہو جاتی ہے)۔
- ۴- پہننے کو آتشیں لباس اور رال کے کرتے، جن کو آگ لگ کر نہ بجھے۔
- ۵- رہنے کو آگ سے بھری ہوئی تنگ کوٹھریاں، جن میں زنجیروں سے جکڑ کر رکھے جائیں گے۔
- ۶- سلوک، کھولتا ہوا گرم پانی سر کی طرف سے ان کے اوپر ڈالا جائے گا۔ جس سے بدن کا چمڑا اور پیٹ کے اندر کی چیزیں بھی گل جائیں گی۔ پھر ایسے زخمی بدنوں پر لوہے کی گریزیں اور قیحاں ماری جائیں گی۔
- ۷- برقداز، سخت خو، قبر بھرے فرشتے جو بموجب حکم الہی سزا دینے میں کچھ بھی نرمی نہ کریں گے۔
- ۸- دربار خداوندی سے اور تمام فرشتوں کی طرف سے لعنت کی بوچھاڑ برستی رہے گی۔

(اعازا اللہ منھا)

رد شہادت و اعتراضات

تفصیل مذکورہ بالا پر نظر کرنے سے ہر شخص بلا شبہ اس نتیجے پر پہنچ سکتا ہے کہ یہ سب نعمتیں اور تکلیفیں جسمانی ہیں اور قرآن و حدیث میں اسی قسم کی جنت و دوزخ کا بیان ہے۔ صحابہ کرامؓ کی مقدس جماعت جو اپنی زبان کو دوسروں کی نسبت اچھا سمجھتے تھے اور اس کے مجازات و استعارات کو خوب پہچانتے تھے اور آفتاب نبوت کے سامنے بیٹھ کر اکتساب انوار کرتے تھے۔ وہ اسی طرح مانتے رہے اور ان سے لے کر آج تک تمام بزرگان شریعت اور ہادیان طریقت، جن میں سے کثرت سے اصحاب مکاشفات بھی تھے، اسی طرح مانتے چلے آئے اور اس میں کچھ بھی شک نہیں کہ اسلام جسمانی جزا و سزا کا قائل ہے کیوں کہ وہ حشر جسمانی کا قائل ہے، جس پر جزا و سزا کی نوعیت کی بنیاد ہے۔

بعض لوگوں کو ایسی جزا و سزا کی نسبت شبہات و اعتراضات پیدا ہو گئے۔ صرف اس لیے کہ جنت و دوزخ کی ایسی حقیقت ان کی عقل کے تنگ پیمانے پر ٹھیک نہیں آتی۔ یہ سمجھنا کہ ہمارا علم محدود ہے اور عقل ناقص ہے۔ ان کے لیے سخت دشوار ہے لیکن یہ کہنا کہ قرآن و حدیث کی یہ تصریحات درست نہیں اور صحابہ کرامؓ نے ان آیات کی جو تفسیر و تعبیر بتائی ہے، وہ صحیح نہیں ہے، بہت آسان ہے۔

یہ معترض دو طرح کے ہیں۔ اول منکرین اسلام جو سرے سے اسلام کی تصدیق ہی نہیں کرتے۔ دوم وہ مسلمان جو اسلام کے تو قائل ہیں مگر علم کی کمی یا فہم کی کجی کے سبب منکرین کے اعتراضات سے متاثر ہو گئے اور قرآن و حدیث کی صاف و صریح عبارات کی ایسی بے قاعدہ تاویلیں گھڑنے لگ گئے کہ اگر ان کی ایسی کاوشوں کو بجائے تفسیر و تعبیر کے قرآن کی ترمیم و تحریف کہیں تو بجا ہے۔ ان ہر دو فریقوں نے سوائے استہزاء اور تحقیر کے انکار کی کوئی دلیل و وجہ بیان نہیں کی اور حقیقت کو عمداً اپنے خیال کے سانچے میں ڈھال کر ایسی کمزور صورت میں بیان کیا ہے کہ وہ قابل اعتراض و لائق استہزاء سمجھی جائے اور یہ طریق دیانت و شرافت کے خلاف ہے۔

ہمارے ملک میں زمانہ قریب میں دو شخص ہوئے ہیں۔ ایک منکر اسلام اور

دوسرے قائل اسلام۔ وہ صاحب تو ہندومت کی شاخ تراشی میں معروف رہے اور یہ صاحب اسلام کی کتریونت اور ترمیم کی خدمت بجالاتے رہے۔ اگر ایک نے منکر اسلام ہو کر جنت کو طوائف خانہ کہا تو دوسرے نے اسلام کا اقرار کرتے ہوئے اسے خرابات سے بدتر کہا۔ لطف یہ کہ دس بیس درجے بدتر نہیں بلکہ ہزار درجہ بدتر۔ غرض استہزاء، تمسخر اور خلاف منشاء قرآن سخن سازی میں کسی نے بھی کسر نہیں رکھی۔ چنانچہ ہم ان دونوں حضرات کی بعض عبارتیں ذیل میں لکھ کر فیصلہ ناظرین پر چھوڑتے ہیں کہ وہ ان دونوں میں مقابلہ کر کے ہر ایک کو اس کی قابلیت کے لحاظ سے خود نمبر دے دیں۔

منکر اسلام

☆ بھلا اس قرآن حکیم کی بہشت میں دنیا سے بڑھ کر کون سی عمدہ شے ہے۔ جو چیزیں دنیا میں ہیں، وہی مسلمانوں کی بہشت میں ہیں اور اتنی زیادتی ہے کہ یہاں جیسے آدمی مرتے اور پیدا ہوتے اور آتے جاتے ہیں، اس طرح بہشت میں نہیں مگر یہاں عورتیں ہمیشہ نہیں رہتی اور وہاں بیسیاں ہمیشہ رہتی ہیں۔ جب تک قیامت کی رات نہ آئے گی، تب تک ان بے چاریوں کے دن کیسے گزرتے ہوں گے۔ مسلمانوں کا بہشت کو کلبے گوسائوں کے گولوک اور مندر کی طرح معلوم ہوتا ہے۔ جہاں کہ عورتوں کی تعظیم و تکریم بہت ہے، آدمیوں کی نہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے گھر میں عورتوں کی قدر بہت

۴۳۔ جب یہ سب کچھ مانتے ہو تو دنیا اور جنت کی چیزوں میں فرق کیوں نہیں سمجھ سکتے۔ سنئے! دنیا عالم کون و فساد اور عالم قائم ہے اس لیے یہاں کی چیزیں کافی اور حیر ہیں اور عالم آخرت عالم باق ہے۔ اس لیے اس کی چیزیں اعلیٰ اور دائم رہنے والی ہیں۔ قرآن شریف نے یہ سب دو حرفوں میں بخلا دیا ہے۔ والاخرۃ خیر و البقی (اعلیٰ، پ ۳۰) یعنی عالم آخرت بہتر بھی ہے اور دائم رہنے والا بھی ہے۔

۴۴۔ جس طرح نیک اور پاک دیویوں کے دن گزارا کرتے ہیں۔

۴۵۔ عورت کی عزت تو شرافت قوم کی علامت ہے۔ سوای جی! کہاں جا رہے ہیں؟

ہے اور ان سے خدا کی محبت آدمیوں کی نسبت زیادہ تر ہے۔ (ستیا رتھ اعتراض نمبر ۹)

☆ بھلا یہ بہشت ہے یا طوائف خانہ؟ (ستیا رتھ اعتراض نمبر ۴۶)

☆ کیوں کہ جب میوے کھائیں گے، گلاسوں میں پانی پئیں گے اور پیالوں میں شراب پئیں گے تو کیا ان کا سر نہ دکھے گا اور کیا کوئی بے جا نہ بولے گا؟۔۔۔۔۔۔ اور اگر شراب کباب پی کھا کر مست ہوتے ہیں تو خور و غلام بھی وہاں ضرور رہنی چاہیں۔ نہیں تو ایسے نشہ باز سر میں گرئی چڑھ جانے سے پاگل ہو جائیں گے۔ (ستیا رتھ اعتراض نمبر ۱۴۱)

قائل اسلام

- ☆ یہ سمجھنا کہ جنت محل ایک باغ کے پیدا ہوئی ہے۔ اس میں سنگ مرمر اور موتی کے
- ۴۶ خدا کی محبت جن معنوں سے سوای جی بیان کر رہے ہیں۔ وہ نہ تو قرآن کا فضاء ہے اور نہ اس میں مذکور ہے اور نہ خدا تعالیٰ کی نسبت ایسے کلمات کہنے دھرماتما لوگوں کا کام ہے۔ لیجئے! ہم سوای جی کو ان کی فصل ان کے اپنے آئینے میں دکھاتے ہیں۔
- ”بہت لوگ ایسے ضدی اور مترو ہوتے ہیں کہ وہ حکم کے خلاف فضاء تاویل کرتے ہیں۔ خصوصاً مذہب والے لوگ، کیوں کہ مذہب کے پاس خاطر سے ان کی عقل تاریکی میں پھنس کر زائل ہو جاتی ہے۔ (دیباچہ ستیا رتھ، ص ۷)
- ۴۷ ہاں جناب والا! یہ بہشت ہے طوائف خانہ نہیں ہے۔ طوائف خانے کاشی میں ہوں گے یا اس جگہ ہوں گے جہاں بیگانی عورتوں سے نیوگ کرایا جاتا ہے اپنی بیوی کو طوائف نہیں کہتے۔
- ۴۸ نہیں جناب! نہ سر دکھے گا، نہ بے جا بولے گا، نہ مست ہوں گے۔ قرآن شریف میں ان سب امور کی نفی موجود ہے۔ دیکھو فرست نعمائے جنت۔
- ۴۹ حوریں منکوحہ ہوں گی نہ غیر۔ قرآن پاک کہتا ہے وزوجنہم بحور عین (دخان، پ ۲۵) اور غلام خدمت کے لیے ہوں گے۔
- ۵۰ جناب! وہ تو نہایت پاک اور لذیذ و مفرح آب حیات ہوگا۔ اس سے نشہ کیسے آئے؟ وہ بھگ نہیں ہے جس سے سوای جی کو کبھی الفت تھی۔
- ۵۱ جناب! جنت تو خود باغ کو کہتے ہیں پھر محل کہنے کے کیا معنی؟

جڑاؤ محل ہیں، باغ میں شاداب و سرسبز درخت ہیں، دودھ اور شراب کی نهریں بہہ رہی ہیں، ہر قسم کا میوہ کھانے کو موجود ہے، ساقی اور ساقینس نہایت خوب صورت چاندی کے نکلن پنپے ہوئے جو ہمارے ہاں گھونسلیں پہنتی ہیں، شراب پلا رہی ہیں، ایک جنتی ایک کے گلے میں ہاتھ ڈالے پڑا ہے۔ ایک نے ران پر سر دھرا ہے، ایک چھاتی سے لپٹا رہا ہے۔ ایک نے لب جان بخش کا بوسہ لیا ہے۔ کوئی کسی کو نے میں کچھ کر رہا ہے، کوئی کسی کو نے میں کچھ۔ بے ہودہ ہے، جس پر تعجب ہوتا ہے۔ اگر بہشت یہی ہے تو بے مبالغہ ہے۔

۵۲۔ واہ جی! کیا خوب کہا۔ باغوں میں سرسبز درخت نہیں ہوتے تو کیا آگ کے انگار ہوتے ہیں۔

۵۳۔ قرآن شریف میں تو ایسا ہی مذکور ہے۔ دیکھو فرست نعمائے جنت، اگر آپ کو اس سے انکار ہے تو کچھ معلوم ہے کہ قرآن کی تصریحات سے انکار کرنے والا کون ہوتا ہے؟

۵۴۔ پھر آپ کے قول کے مطابق تو باغ وہ ہونا چاہیے، جس میں کھانے کو سوائے خاک کے کچھ بھی نہ ہو۔ تو پھر اجاڑ کس کا نام ہے؟

۵۵۔ یہ بات سفر لندن میں سمجھی ہوگی، کیوں کہ وہاں کی لیڈیاں گھونسوں کے سے زیورات نہیں پہنتیں۔ قرآن و حدیث کی تصریحات کی تحقیر اور پھر ایسی بری طرح؟۔ تو بے استغفر اللہ! یہ مومن کا کام نہیں۔

۵۶۔ بڑھے میاں نے اپنے تخیلات کا فوٹو کیسے دلکش پیرائے میں کھینچا ہے۔ اپنے مرجھائے ہوئے کنول کو تخیل ہی سے تازہ اور افسردہ دل کو خوش کر لیا ہے۔

۵۷۔ اسے بھی صریح الفاظ میں ظاہر کر دیجئے۔ کون مانع تھا؟۔ جو چیز مانع ہو سکتی ہے وہ تو آپ پہلی باتوں میں اٹھا چکے۔ اب اخیر پر جھجک جانے کی کیا وجہ؟

۵۸۔ جناب والا! بے ہودگی تو یہ ہے کہ صاف سیدھی بات میں بھی کئی نکالی جائے۔

۵۹۔ اس سے زیادہ تعجب تو جناب پر ہے کہ اس حیرانہ سالی میں بھی ایسے تخیلات شباب پر ہیں۔

۶۰۔ شکر ہے کہ آپ نے خرابات کو ہزار درجہ بہتر بنانے میں مبالغہ نہیں کیا ورنہ اگر مبالغہ کرتے تو خدا جانے کتنے درجے بہتر بنا ڈالتے۔

ہمارے خراباتؑ اس سے ہزار درجہ بہتر ہیں۔ (تفسیر احمدی، جلد اول، ص ۳۸)
 ان ہر دو مخصوص کے جواب میں اول تو اسی قدر کافی ہے کہ ایسے تسخّر، استہزاء
 اور خیالی نقشہ بنانے سے اتنا تو معلوم ہو گیا کہ ان کے اپنے خیالات کا میلان اور جذبات

اللہ! میں! ان کا ٹھیکہ کب لیا تھا کہ ان کو اپنی طرف نسبت کر دیا۔ آپ کا وقار نہات
 زیادہ ہے۔ آپ ایسی باتیں کرتے ہیں تو ہماری عقیدت کو ٹھیس لگتی ہے۔
 اچھا جناب! جو جگہ آپ کو بہتر نظر آئے وہاں جائے، کسی کو کیا؟۔

نظر اپنی اپنی، پسند اپنی اپنی

ہاں اتنا عرض کر دینا ضروری جانتے ہیں کہ طوائف خانوں میں اور خرابات میں بیگانی
 اور غیر منکوحہ بدکار عورتیں ہوتی ہیں اور بدکار مرد وہاں پر گرے پڑے ہوتے ہیں۔ لیکن
 جنت میں (پاک منکوحہ بیویاں) لزواج مطہرہ ہوں گی۔ قاصرات الطرف شرم و حیا والی
 ہوں گی اور وہ مملات جن میں وہ جنتی مع اپنی نیک پاک بیویوں کے آباد ہوں گے، خدا کی
 دین سے ان کے اپنے ہوں گے۔ خرابات کے کوئے نہیں ہوں گے۔ سو اپنے مکان میں اپنی
 منکوحہ بیوی سے ایسے تعلقات معیوب نہیں ہیں ورنہ ----- بے ادبی معاف -----
 اس پر بھی آپ خرابات کو جنت سے بے مبالغہ ہزار درجہ بہتر کہیں اور منکوحہ بیوی پر
 طوائفوں کو ترجیح دیں تو آپ کی مرضی۔ نیز یہ عرض کریں گے کہ جنت ایمان و اعمال صالحہ پر
 ملے گی جو مشکل کام ہے اور خرابات میں جانے کے لیے ایمان و اعمال صالحہ کی ضرورت نہیں
 بلکہ وہاں تو اس بوجھ کو اتار کر جاتے ہیں۔ غالباً اسی لیے آپ نے اسے جنت پر ترجیح دی
 ہوگی۔ اللہم غفر

معذرت! ہم نے ان حواشی میں خلاف عادت ایسا طریق جواب اختیار کیا ہے۔ ناظرین
 معاف کریں، کیوں کہ جب انہوں نے قرآن و حدیث کی تصریحات کو اور بزرگان دین کی
 مسلمات کو ایسے مکروہ چرائے میں بیان کیا اور ان کا تسخّر اڑایا تو ان کے مقابلے میں ہمیں ان
 صاحب کا لحاظ کیا رہے؟۔

نہ وہ طعنے ہمیں دیتے، نہ ہم فریادیں کرتے

اس پر بھی ہمارے دل پر بوجھ ہے اور یہاں پر پہنچ کر کئی روز تک کتابت کا کام بند رکھنا
 پڑا۔ آخر مجبوری بھی لکھنا پڑا۔

کی کشش کدھر ہے۔ تعجب تو یہ ہے کہ ان ہر دو صاحبان نے یہ کتابیں اس زمانے میں لکھیں، جب وہ اپنی عمر کا وہ حصہ، جس میں ان جذبات کی کشش بے لگام ہوتی ہے، گزار چکے تھے اور اس سٹیج پر پہنچ چکے تھے، جس پر متانت و سنجیدگی اور حجاب و حیاء بے غالب آ جاتے ہیں اور انسان کے نفسانی جذبات بے قابو نہیں رہتے لیکن ان دونوں حضرات کے دل و دماغ میں اس پیرائہ سالی میں بھی جوانی کی ہوسات موجزن ہیں، سچ ہے۔

پیرے کہ دم ز عشق زند بس غیبت است

اس کے بعد گزارش ہے کہ جو بھی برے تصورات ان ہر دو حضرات کے دماغ شریف میں سائے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی جنت ان سب سے پاک ہے اور قرآن حکیم میں بوضاحت ان کی نفی آچکی ہے۔ جیسا کہ فرست نعمائے جنت سے ظاہر ہے۔ جو نقشہ صاحبوں نے بنایا ہے۔ وہ قرآن کی منشاء کے مطابق نہیں ہے۔ ان کو اپنے ہی خیالات کا عکس نظر آگیا ہے۔ انگریزی میں مثل ہے:-

Evil is to him who evil thinks

(بلی کو بھیچھڑوں کے خواب)

باقی رہا تحقیق جواب، تو اس کی نسبت گزارش ہے کہ ان نعمتوں اور تکلیفوں کے جسمانی ہونے کی بناء حشر جسمانی پر ہے۔ اگر اسلام حشر جسمانی کا قائل ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ قرآن و حدیث کی بیان کردہ نعمتیں اور تکلیفیں جسمانی نہ ہوں۔ سو ہم اللہ تعالیٰ کے فضل سے حشر جسمانی کا امکان الگ فصل میں بیان کریں گے۔ اس مقام پر ہم صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ عقل سلیم کی رو سے یہ امور متمنع ہیں لہذا ان کا انکار عقلمندی نہیں ہے۔ تشریح اس کی یوں ہے کہ عقل استدلال کی عین سورعہ میں ہیں۔ حجت استقرائی، قیاس اور تمثیل۔ امور جنت و دوزخ کے متعلق ان میں سے صرف حجت استقرائی کو استعمال کر سکتے ہیں کہ نعمائے جنت اور تکالیف دوزخ کی جو حقیقت اور کیفیت قرآن و حدیث میں وارد ہے۔ وہ ان حقائق و کوائف سے دگرگوں ہے، جو ہمارے مشاہدے اور علم میں آتی رہتی ہیں۔ بس اس کے سوا دیگر کوئی صورت عقل کی رو سے جائز نہیں ہے۔ سو اس کے جواب میں گزارش ہے کہ دگرگوں ہونا امر دیگر ہے اور ناممکن ہونا امر دیگر ہے۔ دگرگوں کو ناممکن نہیں کہہ سکتے۔ اس کی تشریح یوں ہے کہ علمائے منطق کے نزدیک استقراء کی دو

قسمیں ہیں۔ تام اور ناقص۔ تام یہ کہ جمع ہم جنس جزئیات موجودہ کو نظر میں رکھ کر اور کمال طور پر ان کی جانچ پڑتال اور ان کے تمام جموع و فروق کو دیکھ بھال کے بعد ان سب پر ایک حکم کلی لگایا جائے۔ جو سب پر برابر طور پر حاوی ہو اور ناقص یہ کہ اکثر جزئیات پر نظر کر کے اور ان کے بعض کوائف مشترکہ کو دیکھ کر ایک حکم کلی لگادیا جائے۔ پہلی قسم یعنی استقراء تام مفید یقین ہوتا ہے اور دوسری قسم یعنی استقراء ناقص مفید یقین نہیں ہوتا۔ چنانچہ شرح مطالع میں ہے:-

الاستقراء ----- لما تام لن كان حاصرا لجميع الجزئيات -----
وهو يفيد اليقين ولما غير تام لن لم يكن حاصرا وهو لا يفيد اليقين
بجواز ان يكون حال مالم يستقراء بخلاف حال ما استقرئى (شرح مطالع،
مطبوعہ استنبول، ص ۳۳۸ ملخصاً)

”استقراء ----- یا تو تام ہوتا ہے۔ اگر جمع جزئیات کو حصر کرے
----- اور وہ مفید یقین ہوتا ہے یا غیر تام (ناقص) ہوتا ہے۔ اگر (سب جزئیات)
کو حصر نہ کرے اور وہ مفید یقین نہیں ہوتا۔ کیوں کہ ممکن ہے کہ جس چیز کا استقراء نہیں
کیا گیا۔ اس کا حال اس کے خلاف ہو“ جس کا استقراء کیا گیا ہے۔

اور یہ مسلم ہے کہ نہ تو موجودات عالم کی جزئیات خدا کے سوا کسی کے حصر و
احاطہ میں ہیں اور نہ ان کے کوائف و خواص کسی کے علم میں ہیں اور نہ اللہ تعالیٰ کی
قدرت کی کوئی حد ہے کہ اس سے پرے اس کا زور ٹوٹ جائے اور نہ اس کی حکمتوں کی
کوئی انتہا ہے کہ وہاں تک ختم ہو جائیں۔ لہذا ہم اپنے ناقص مشاہدات و تجربات و
استقراء کی بناء پر جو کچھ بھی حکم لگائیں گے۔ وہ مفید یقین نہیں ہوگا۔ لہذا ہمارا انکار کوئی
معقول بات نہ ہوگی۔ قرآن شریف اپنے منکروں کی نسبت فرماتا ہے۔ بل کنذوباً مالم
يحيطوا بعلمه ولما ياتهم تلويله (یونس، پ ۱۱) یعنی ان منکروں نے ایسی بات کی
مکذوب کی ہے، جس کے علم کا ان کو احاطہ نہیں ہوا اور ابھی ان کو اس کی حقیقت معلوم
نہیں ہوئی۔

قرآن شریف کی اس مختصر بات کو متاخر معقولوں کے پیر استاد شیخ ابو علی بینا نے
اپنی کتاب ”اشارات“ کے اخیر میں بنو ان (صحیح) کسی قدر تفصیل سے بیان کیا ہے:-

ایک وان نکون تکیسک وتبرک عن العامة هو ان تنبرء منکر الکل شئی
 فذلک طیش و عجز و لیس الخرق فی تکنیک مالم تستبن لک بعد
 جلیة دون الخرق فی تصدیقک مالم تقم بین یدیک بینة بل علیک
 الاعتصام بحبل التوقف و ان لڑ عجبک استنکار ما یوعاه سمعک مالم
 تبرهن استحالتہ لک فالصواب ان تسرح امثال ذلک الی بقعة الامکان
 مالم یندک عنه قائم البرهان و اعلم ان فی الطبیعة عجائب و للقوی العالیة
 الفعالة و القوی السافلة المنفعلة اجتماعات علی غرائب (شرح اشارات)
 مطبوعہ مصر، جلد ثانی، ص ۱۲۳

”(اے عقلمند!) تو اس امر سے پرہیز کر کہ عام لوگوں سے تیری ہوشمندی اور
 امتیاز صرف اسی بات سے ہو کہ تو ہر امر سے انکار ہی کر دے۔ کیوں کہ یہ تو طیش اور
 عاجزی ہے۔ تجھے جس امر کی حقیقت معلوم نہیں ہوئی اس کی تکذیب کر دینا، اس بات کی
 تصدیق کرنے سے کم (بے عقلی) نہیں ہے۔ جب تک کہ تیرے پاس کوئی دلیل قائم نہ ہو
 مٹی ہو۔ بلکہ تجھ پر لازم ہے کہ تو توقف کی رسی سے اپنا بچاؤ کرے۔ اگرچہ تجھے ان باتوں
 کا انکار جو تیرے کان میں پڑی ہیں، پسلا دے۔ جب تک کہ تجھ پر ان کا محال ہونا صاف
 طور پر واضح نہ ہو جائے۔ پس درست یہی ہے کہ تو ایسی باتوں کو امکان کے میدان میں
 لے جائے، جب تک کہ تجھے کوئی یقینی دلیل کا محافظ نہ روکے اور تو جان رکھ کہ طبیعت
 میں بڑے بڑے عجائبات ہیں اور علوی اثر انداز قوی اور سفلی اثر پذیر قوی کے اجتماع میں
 بڑے بڑے نادر نتائج پیدا ہوتے ہیں۔“

۱۳۳ محال دو قسم پر ہے۔ عقلی اور عادی۔ عقلی متمتع ذاتی یعنی ناممکن ہوتا ہے مثلاً اجتماع
 ضدین اور ارتقاع نفیضین اور خدا کا شریک۔ لیکن عادی ممکن بالذات ہوتا ہے۔ اگر عقل
 و اسباب موجبہ کے ساتھ رب کریم کا ارادہ منظم ہو گیا تو وہ صادر و موجود ہو گیا ورنہ نہیں۔
 مکر وہ اپنی ذات میں ممکن ہی ہوتا ہے۔ موجد اور مانع صرف خدا کا ارادہ ہوتا ہے۔ عقل و
 اسباب محض وسائل ہیں۔ فافہم فانہ دقیق و لطیف

اور مولانا شبلی مرحوم ”الکلام“ حصہ دوم“ میں فرماتے ہیں:-

۱۸۹۱ء میں جو علمی کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس کے ایک جلسے میں پروفیسر لودج نے جو بڑا ریاضی دان ہے، ایک لیکچر دیا اور روح کے متعلق تقریر کرتے وقت کہا کہ:-

”اب وہ وقت آگیا ہے کہ مادی اور روحانی عالم میں اب تک جو حد فاصل تھی، وہ ٹوٹ جائے۔ جس طرح اور بہت سی حدیں ٹوٹ گئیں۔ اس طریقہ سے ثابت ہو جائے گا کہ ممکنات کی کچھ انتہا نہیں اور یہ کہ جس قدر ہم جانتے ہیں۔ وہ بمقابلہ ان چیزوں کے جو ہم کو معلوم نہیں ہیں۔ کچھ بھی نسبت نہیں رکھتیں۔“

صد ہا باتیں جو آگے تسلیم نہیں کی جاتی تھیں بلکہ ان پر ہنسی اڑائی جاتی تھی۔ اب حقیقتاً منکشف ہو رہی ہیں اور عقل اپنے ضعف کا اقرار کرتے ہوئے اپنے پچھلے جاہلانہ انکار پر افسوس کر رہی ہے۔

غرض جب ہم ہزار ہا برس سے اب تک عالم کون و فساد کی موجودات کا اور ان کے جمیع کوائف و خواص اور اسرار و عجائبات کا جو ہمارے پیش نظر ہیں، احاطہ نہیں کر سکے تو عالم بقا کی اشیاء جو ہماری نظر سے غائب اور ہمارے فہم سے بالا ہیں۔ ان پر یہاں ہی سے اندھیرے میں بیٹھے ہوئے اندھا دھند تیر اندازی کرنا بقول شیخ بوعلی سینا عقل کے پیچھے لٹ لے کر پڑنا نہیں تو کیا ہے؟

حاصل کلام یہ کہ ایسے حقائق و کوائف جو اس عالم کے حقائق و کوائف سے دگرگوں ہوں، ممکن ہیں اور اللہ تعالیٰ جمیع ممکنات پر قادر ہے۔ کوئی چیز اس کے مقدور سے خارج نہیں اور نہ کوئی طریق کار اس کی حکمت سے بالاتر ہے۔

دیگر یہ کہ اس عالم میں ہزار ہا اجناس ہیں، جن کی حقیقتیں مختلف ہیں اور ان اجناس کے ماتحت لکھو لکھو انوع ہیں اور ہر نوع کی اتنی مختلف المذاوج اصناف ہیں کہ باوجود نوعیت میں متفق ہونے کے آپس میں ان کی نسبت قائم نہیں کر سکتے۔ ہیرا، زمرود، لعل، یاقوت، یشب، فیروزہ سب پتھر ہیں لیکن سنگ مرمر وغیرہ پتھر باوجود قیمتی ہونے کے ان کے مقابلے میں کیا ہیں؟ اور پھر معمولی پتھروں کو ان سے کیا نسبت ہے؟۔ یہی حال دیگر اجناس اور انواع و اصناف میں سمجھ لیجئے تو جس صنایع حکیم و قدیر نے اس عالم میں ایسی مختلف الحیثیت اشیاء پیدا کی ہیں کہ ان میں سوائے اسی مشارکت کے کسی اور

حسم کی شراکت نہیں ہے۔ اس سے کیا بعید ہے کہ وہ اس عالم بقا میں ایسی اشیاء پیدا کر دے۔ جن سے یہاں کی اشیاء کو سوائے اسی مشارکت کے کوئی اور مناسبت نہ ہو۔ حضرت ابن عباسؓ سے نعمائے جنت کے متعلق جو یہ روایت ہے ”جنت میں دنیا کی چیزوں میں سے سوائے ناموں کے کچھ نہیں ہے۔“

اس کے یہی معنی ہیں کہ قرآن شریف میں جو یہ وارد ہے کہ جنت میں بھجور، انگور، انار وغیرہ میوہ جات ہوں گے۔ تو دنیا کے ان میووں اور جنت کے ان میووں میں صرف اسی مشارکت ہے کہ ان کے بھی یہی نام ہوں گے۔ ورنہ ان کی حقیقت، حیثیت اور کیفیت ان دنیوی چیزوں سے اتنی مختلف اور بلند ہے کہ ان کو ان سے کوئی نسبت ہی نہیں اور یہی معنی ہیں۔ اس حدیث قدسی کے، جو بخاری و مسلم میں ہے کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ اللہ عز و جل نے فرمایا ہے۔ اعددت لعبادی الصالحین ما لا عین رأت ولا الخن سمعت ولا خطر علی قلب بشر (مشکوٰۃ، ص ۲۸۷) یعنی میں نے اپنے صالح بندوں کے لیے ایسی نعمتیں تیار کر رکھی ہیں، جو نہ کسی آنکھ نے دیکھی ہیں اور نہ کسی کان نے سنی ہیں اور نہ کسی بشر کے دل پر ان کا خیال گزرا ہے اور یہی حاصل ہے۔ سورہ سجدہ کی اس آیت فلا تعلم نفس ما اخفی لهم من قرۃ العین کا یعنی آنکھوں کی جو ٹھنڈک صالحین کے لیے پوشیدہ رکھی ہوئی ہے، وہ کسی نفس کو معلوم نہیں۔ کیوں کہ من قرۃ العین ترکیب نحوی میں ما اخفی کا بیان ہے یا اس سے مراد دیدار الہی ہے۔ جو اصل مقصود اور سب نعمتوں سے بالا نعمت ہوگی۔

غرض ایسی آیات و احادیث جو نعمائے جنت کی حقیقت و نوعیت اور کیفیت و حیثیت کے متعلق ہیں۔ ان میں قرآن و حدیث کی تصریحات کے خلاف صرف اپنے زلیغ قلبی یا قلت علم و فہم کی بناء پر تاویل کی گنجائش نہیں ہے۔ اور یہ کہہ دینا کہ بھی ہمارا جی نہیں مانتا کہ جنت میں ایسی جسمانی نعمتیں ملتی چاہئیں، کیوں کہ یہ عیاشی وہاں پر مناسب نہیں۔ اس کے جواب میں گزارش ہے کہ کسی امر کی حقانیت جی کے ماننے یا نہ ماننے پر موقوف نہیں۔ حق ایک حقیقت نفس الامری ہے۔ کسی کے جی میں اترے یا نہ اترے۔ پس آپ جی کے ماننے کا طرہ چھوڑ دیں کیونکہ عقلاء کے نزدیک یہ کوئی وجہ انکار نہیں ہو سکتی اور عیاشی کے متعلق گزارش ہے کہ اللہ کی نعمتوں کو اس کے جائز کردہ طریق سے

اس کی مرضی کے مطابق استعمال کرنا عیاشی نہیں کہلاتی بلکہ اسے قدر دانی کہتے ہیں۔ جس سے مالک خوش ہوتا ہے۔

دیگر یہ کہ دنیا میں یہی جسمانی نعمتیں ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کا احسان جتنا ہے اور اپنی ربوبیت کا نظام دکھا کر اپنی اطاعت و عبادت کا حکم کر دیتا ہے اور پھر یہ کہ انہی انعامات جسمانیہ کو آپ دنیوی جزا و سزا میں پسند بھی کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم جانتے ہیں اور ان کے زائل ہو جانے اور تباہ و برباد ہو جانے کو اس کا غضب شمار کرتے ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اگر جنت میں جسمانی نعمتیں ایسے طریق پر ملیں جو ان سے بدرجہا بہتر ہوں اور اللہ تعالیٰ انہیں اپنا فضل کہے۔ فضلا من ربک (دخان، پ ۲۵) تو آپ ان کو عیاشی قرار دیتے ہیں۔

دیگر یہ کہ وہاں محض جسمانی نعمتیں ہی نہیں ہوں گی بلکہ ان سے اوپر روحانی بھی ہوں گی۔ جس طرح کہ یہاں دنیا میں ظاہری بھی ہیں اور باطنی بھی۔ چنانچہ احسانا" و اتمانا" فرمایا:۔

الم تر و ان اللہ سخر لکم ما فی السموات وما فی الارض و اسبغ علیکم نعمه ظاہرۃ و باطنۃ و من الناس من یجادل فی اللہ بغیر علم ولا ہدی ولا کتب منیر ○ (لقمان، پ ۲۱)

”کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے کام میں لگا رکھی ہے، ہر وہ چیز جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے اور تم پر اپنی ظاہری اور باطنی نعمتیں پوری کر رکھی ہیں۔ اس پر بھی بعض لوگ ایسے ہیں کہ وہ اللہ کے بارے میں بغیر علم کے اور بغیر ہدایت کے اور بغیر کسی روشن کتاب (منزل من اللہ) کے جھگڑا کرتے رہتے ہیں۔“

پس جس طرح دنیا میں ظاہری اور باطنی ہر دو طرح کی نعمتیں ہیں اور ان میں منافات نہیں ہے اور آپ ان سے خوش ہوتے ہیں اور ان پر اللہ کا شکر بھی ادا کرتے ہیں۔ اسی طرح عاقبت میں بھی ہر دو طرح کی ظاہری و باطنی نعمتیں ہوں گی۔ ان دونوں میں منافات نہیں ہے۔ ساتھ ہی اس کے یہ بھی ہمیشہ ملحوظ رہے کہ وہاں کی ظاہری نعمتیں یہاں کی ظاہری نعمتوں سے ہر کیف میں نہایت اعلیٰ ہوں گی اور باطنی نعمت مثلاً دیدار خدا جو ہے۔ سو اس کے کیا کہنے؟۔ اور اس سے دوسری نعمتوں کو کیا نسبت؟۔ یہی تو

اصل مقصود ہے۔ باقی سب اس کے اظلال ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کی رضامندی و خوشنودی حاصل ہو گئی تو دیگر جملہ نعمتیں اس پر متفرع ہو جائیں گی۔ کیوں کہ یہ سب نعمتیں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی علامات ہیں، اصل مقصد نہیں ہیں۔ چنانچہ قرآن حکیم میں جا بجا ابتغائے مرضات اللہ اور ابتغائے وجہ اللہ کا ذکر ہے اور اس کے عقب میں نعمائے جنت کا بھی بیان ہے۔ چنانچہ سورہ دہر، پ ۲۹ میں ان ہر دو امور کا بالصراحت اور مفصل بیان ہے۔ جسے ہم بخوف طوالت نقل نہیں کر سکتے۔ اسی طرح سورہ کف کے اخیر میں فرمایا:۔
 ان الذین امنوا و عملوا الصلحت کانت لہم جنت الفردوس نزلًا ○ (کف)
 پ ۱۶ ”بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل بھی کئے۔ یہی جنت کے باغات سے ان کی مسمانی ہوگی۔“

اس مقام پر جنت الفردوس کو مسمانی کے لفظ سے یاد کیا ہے اور حدیث سے ثابت ہے کہ سب جنتوں سے اعلیٰ جنت الفردوس ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ جنت کی تمام نعمتیں سوائے دیدار الہی کے، اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی علامت میں مسمانی ہیں۔ ایمان اور اعمال صالحہ سے مومن کا اصل مقصود اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی ہے۔ کیوں کہ مالک جب خوش ہو تو وہ انعام و اکرام سے نوازا کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ سب سے زیادہ صاحب کرم ہے۔ اس کی شان کے لائق یہی ہے کہ وہ اپنے فرمانبردار بندوں کو انعام و اکرام سے نوازے۔

باقی رہا آریہ دغیرہ منکرین اسلام کی طرف سے آپ کو وعدہ کہ وہ اس پر اعتراض کرتے ہیں۔ سو اس کی بابت معلوم ہو کہ جسمانی جزا و سزا سے کوئی مذہب منکر نہیں۔ بلکہ دہریہ جو نہ خدا کے قائل ہیں، نہ کسی مذہب کے پیرو، وہ بھی اس جسمانی راحت و تکلیف کے قائل ہیں۔ گو وہ اس کا نام نتائج اعمال رکھتے ہیں۔ یہ تمام منکرین اس بات کے قائل ہیں کہ دنیا میں جس قدر بھی راحتیں ہیں، وہ نیک اعمال کا صلہ ہیں اور جس قدر بھی تکالیف ہیں، وہ برے اعمال کی سزا ہیں۔ راحتوں میں سے حکومت، غنا طرح طرح کی نعمتیں، خوش گزران، صحت و خوب صورتی، نیک اور خوب صورت دیویاں، طرح طرح کے اسباب عیش، ہر طرح کی خوشی و شادمانی ہیں اور تکالیف میں سے ماتحتی، فقر و تنگدستی، طرح طرح کی بیماریاں اور مصیبتیں، بد مزاج، نافرمان اور بدکار بیویاں وغیرہ

وغیرہ امور ہیں اور اس دنیا سے رحلت کر جانے کے بعد جب ارواح انتر یکمکش لوک میں رہتے ہیں تو بموجب قول سوامی دیانند صاحب روح کی چوبیس قوتیں برابر بحال رہتی ہیں۔ جیسا کہ وہ نویس سمولاس میں بالتصریح لکھتے ہیں۔ ان میں سے بعض یہ ہیں۔ محبت، چکھنا، سونگھنا، اور وہ اسی سمولاس میں سورگ (بہشت) اور نرگ (دوزخ) کے بھی قائل ہیں اور یہ بہت عجیب اور مضحکہ خیز امر ہے کہ اس دنیا سے پرے جنت موجود بھی ہو اور موت کے بعد آدمی کی روح میں کھانے پینے اور سونگھنے کی قوت بھی موجود ہو لیکن وہاں اس کو کھانے پینے کو کچھ بھی نہ ملے۔ اس چہ؟۔ دنیا میں نیک اور فرماں بردار خوب صورت استری اعمال کی جزا سمجھی جائے اور دیوی کلا کر قابل تعظیم و محبت قرار دے لی جائے لیکن جنت میں جا کر انہی نیک اعمال کی جزا میں نیک پاک اور خوب صورت دیوی خور کے نام سے نامزد ہو تو وہ قابل اعتراض سمجھی جائے۔ واللہ ہم اس تفریق کے سمجھنے سے قاصر ہیں۔

امکان حشر اجساد

ہر چند کہ حشر اجساد کا مسئلہ قرآن حکیم میں اور احادیث صحیحہ میں کھلے الفاظ میں موجود ہے اور صحابہ کرامؓ اور خیاری تابعینؒ اسے اسی طرح مانتے رہے۔ اور ان کے بعد جملہ اہل علم و عقل اور اہل کشف و الہام اسی طرح مانتے چلے آئے کہ قیامت کے دن جسموں سے اٹھائیں جائیں گے۔ بلکہ لفظ قیامت جسموں ہی کے اٹھنے کے لیے ہے۔ روح تو پہلے ہی قائم و زندہ ہے۔ روز قیامت کو اس کے اٹھنے کے کیا معنی؟۔ کیوں کہ اس کا اطلاق اس پر نہیں ہو سکتا۔ لیکن جب اسلام نے عرب سے باہر قدم رکھا اور مسلمانوں کا اختلاط دیگر قوموں سے ہوا اور عربی زبان میں مختلف علوم کے تراجم ہو گئے اور مسلمان ان کے پڑھنے پڑھانے میں مصروف ہوئے اور قلوب میں صحابہ کرامؓ و خیاری تابعینؒ جیسی صفائی نہ رہی تو طرح طرح کے شکوک پیدا ہونے لگے۔ تو ان شکوک کو رفع

۶۴ ستیارتھ پرکاش، ص ۳۱۳۔

۶۵ ستیارتھ پرکاش، ص ۳۳۶۔

کرنے کے لیے چند قواعد کی ضرورت پڑی، جو بمنزلہ ہتھیار کے سمجھے جائیں۔ ان میں سے ایک ہتھیار مجاز و استعارہ اور تاویل کا ہے۔ جس طرح عقلمند کسی ہتھیار کا استعمال حسب موقع درست طور پر کرتا ہے اور نادان نہ تو بجا و بے جا میں تمیز کرتا ہے اور نہ اسے درست طور پر استعمال کر سکتا ہے۔ اسی طرح علمائے راسخین نے تو ان کے استعمال میں قواعد کی رعایت رکھی اور بجا اور بے جا میں تمیز کی اور ان کو صحیح طور پر استعمال کر کے دین کو فائدہ پہنچایا۔ لیکن بعض نادانوں نے جو علم میں کمزور تھے اور اشراق ایمانی میں بھی ضعیف تھے۔ انہوں نے بجا و بے جا میں تمیز نہ کی اور ان کو درست طور پر استعمال نہ کیا۔ بلکہ مبتدعین و ملحدین نے ان کو انکار نصوص کے لیے ایک سپر بنا لیا تو انہوں نے دین میں خرابی پیدا کر کے اسے نقصان پہنچایا۔

یہی صورت انکار حشر اجسا کی ہے کہ منکرین کے نزدیک وہ جسم جو زمین میں دفن کیے جاتے ہیں۔ آخر خاک ہو جاتے ہیں۔ ہڈیاں بوسیدہ اور خشک ہو کر ریزہ ریزہ ہو جاتی ہیں اور زندگی قبول کرنے کے قابل نہیں رہتیں اور وہ مردے جو جلا دیئے جاتے ہیں۔ ان کے گوشت خاکستر اور راکھ ہو جاتے ہیں۔ وہ راکھ ہوا میں اڑ جاتی ہے اور ان کی ہڈیاں دریا (گنگا) میں بہاوی جاتی ہیں۔ وہ بھی قابل حیات نہیں رہتیں اور ان کے جمع کیے جانے کی بھی کوئی صورت سمجھ میں نہیں آتی اور بعض آدمیوں کو درندے اور مچھلیاں کھا جاتی ہیں۔ ان کے گوشت ان درندوں اور مچھلیوں کے گوشت میں مستحل ہو جاتے ہیں۔ ان سب مذکورہ بالا صورتوں میں جسموں کا اٹھایا جانا بعید از قیاس ہے۔

ان سب سوالوں کے جواب میں اور ان سب مشکلات کے حل میں اگر یہ کہہ دیا جائے کہ نہیں بھائی جسموں کا نہیں بلکہ ارواح کا حشر ہو گا تو غالباً منکرین اس کا انکار نہیں کریں گے اور اسے بعید از قیاس نہیں سمجھیں گے۔ لیکن اب دیکھنا یہ ہے کہ اسی قسم کے سوال جب نزول قرآن کے وقت کفار کی طرف سے کیے گئے تو قرآن حکیم نے کیا جواب دیا۔ یہی سہل اور ناقابل انکار جواب دیا یا اسی بات کو منوانا چاہا، جس پر ان کو اعتراض تھا اور جسے وہ بعید از عقل جانتے تھے۔ بس اس سے مسئلہ صاف ہو جائے گا اور ہمیں زیادہ کاوش کرنے کی ضرورت نہ رہے گی۔

ایسے مقامات قرآن مجید میں بہت ہیں۔ لیکن ہم ان میں سے سورہ لیس اور سورہ

ق کے دو مقام ذکر کرتے ہیں۔ جو اپنے مطلب میں بالکل صاف و واضح ہونے کے علاوہ مضمون میں جامع اور کئی قسم کے شکوک کے دور کرنے والے بھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

لَوْلَمْ يَرِ الْإِنْسَانُ أَنَا خَلَقْنَاهُ مِنْ نَظْفَةٍ فَذَا هُوَ خَصِيمٌ مُبِينٌ ○ و ضَرْبٌ لَنَا مِثْلًا ○ وَ نَسَى خَلْقَهُ قَالٌ مِنْ يَحْيَى الْعِظَامُ وَ هِيَ رَمِيمٌ ○ قُلْ يَحْيِيهَا الَّذِي أَنشَأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ وَ هُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيمٌ ○ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ مِنَ الشَّجَرِ الْأَخْضَرِ نَارًا ○ فَذَاتِئْتُمْ مِنْهُ تَوْقِدُونَ ○ أَوَلَيْسَ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ بِقَادِرٍ عَلَىٰ أَنْ يَخْلُقَ مِثْلَهُمْ بَلَىٰ وَ هُوَ الْخَلَّاقُ الْعَلِيمُ ○ إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا ○ أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ○ (یس، پ ۲۳)

”کیا دیکھتا نہیں آدمی کہ بنایا ہم نے اس کو ایک بوند سے۔ پھر وہ صریحا“ جھگڑا کرتا ہے اور ہماری مثالیں گھڑتا ہے۔ اور اپنی پیدائش کو بھول گیا ہے۔ کہتا ہے کہ کون جلائے گا ہڈیوں کو در آنحال کہ وہ کھرکری ہو گئی ہوں گی تو کہہ ان کو جلائے گا وہ، جس نے پیدا کیا تھا ان کو پہلی بار اور وہ سب طرح کا بنانا جانتا ہے۔ جس نے بنادی تمہارے لیے ہرز درخت سے آگ، پھر تم اس سے سلگاتے ہو۔ کیا وہ اللہ جس نے آسمان اور زمین (ایک کلمہ کن سے) پیدا کر دیئے۔ وہ اس بات پر قادر نہیں ہے کہ وہ ان (لوگوں) کی مثل بھی بنالے۔ کیوں نہیں؟۔ وہ ہے اصل بنانے والا سب کچھ جانتا۔ بس اس کا حکم یہی ہوتا ہے کہ جب کسی شے کو بنانا چاہتا ہے تو اسے کہتا ہے ”ہو جا“ پس وہ ہو جاتی ہے۔“

اسی طرح سورہ ق میں فرمایا:- ءَاذَا مَتْنَا وَ كُنَّا تُرَابًا“ ذالک رَجْعٌ بَعِيدٌ ○ قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْأَرْضُ مِنْهُمْ وَ عِنْدَنَا كِتَابٌ حَفِیْظٌ ○ (ق، پ ۲۶)

”(منکر کہتے ہیں کہ) کیا جب ہم مر کر خاک ہو جائیں گے؟۔ (تو پھر زندہ ہوں گے؟)۔ یہ رجوع تو بہت بعید ہے۔ (اللہ فرماتا ہے) ہم کو خوب معلوم ہے۔ وہ سب کچھ جو زمین ان سے کم کرے گی اور ہمارے پاس ہے کتاب حفاظت والی۔“

ان ہر دو مقامات سے صاف ظاہر ہے کہ منکرین قیامت بوسیدہ ہڈیوں کے زندہ ہونے کو اور خاک شدہ اجزا کے مجتمع ہو کر قابل زندگی ہونے کو بعید جانتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ہڈیوں کی زندگی کے متعلق یہ جواب دیا کہ جس ذات پاک نے ان کو پہلی دفعہ

پیدا کیا تھا یعنی جب وہ نہ تھیں تو ان کو موجود کیا تھا۔ وہی قادر و قیوم ان کو دوسری دفعہ زندہ کرے گا۔ یعنی اس زندگی کے وقت تو کسی نہ کسی حالت میں ان کی ہستی موجود ہوگی۔ پس ان کا دوبارہ زندہ کرنا کیا مشکل ہے؟

اور سورہ ق کی آیت میں جہاں منکروں کا یہ عذر مذکور ہے کہ جب ہم خاک ہو جائیں گے تو پھر زندہ ہونا بعید از عقل ہے۔ اس کے جواب میں فرمایا کہ ان کے اجزاء میں سے جو کچھ زمین میں مل کر کم ہو جاتا ہے۔ وہ سب ہمارے علم میں ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ وہ اجزاء کہاں ہیں اور کس حالت میں ہیں۔ ان کا جمع کر لینا ہم پر کچھ دشوار نہیں۔ ان مقامات سے قرآن پاک کا مذہب تو بالکل واضح ہو گیا کہ حشر اجساد کا ہے۔ اب اس کے امکان کے دلائل اور منکرین کے سوالات و اشکالات کا حل سنئے جو قرآن حکیم نے خود بیان کیا ہے۔

اول: یہ فرمایا کہ بوسیدہ ہڈیوں کو وہ ذات برحق زندہ کرے گی، جس نے ان کو پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا۔ پیدا کرنا بہ نسبت زندہ کرنے کے مشکل ہے۔ جب پیدا کر کے دکھا دیا تو زندہ کیوں نہ کر سکے گا؟۔ چنانچہ اسی مطلب کو سورہ روم میں یوں فرمایا۔ وہو لھون علیہ (پ ۲۱) یعنی دوبارہ زندہ کر لینا اس پر زیادہ آسان ہے۔

دوم: یہ کہ وہو بکل شئی علیم فرما کر سمجھایا کہ پہلی دفعہ جب پیدا کیا تھا تو وہ بھی ایک طریق تھا اور پھر دوسری دفعہ پیدا کرے گا تو وہ بھی ایک طریق پیدائش ہوگا اور اسے پیدائش کے ہر طریقے کا پورا پورا علم ہے۔ کیوں کہ وہ علیم کل ہے۔

سوم: یہ کہ سبز درخت سے آگ پیدا کرنے کے ذکر سے سمجھایا کہ آگ اور رطوبت دو ضدیں ہیں۔ لیکن تم واقعہ میں دیکھ رہے ہو بلکہ استعمال کر رہے ہو کہ تم سبز درخت سے آگ حاصل کرتے ہو۔ تو جس ذات کی قدرت تم یہ دیکھ رہے ہو کہ اس نے ضد سے ضد پیدا کر دی تو اس کے نزدیک بوسیدہ ہڈیوں میں جان ڈال دینا کون سی بڑی

۷۶ عرب میں مرغ اور عفار دو درخت ہیں۔ اہل عرب کو سفر کی حالت میں جب آگ کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ ان درختوں کی ہری ٹہنیاں کاٹ کر ایک کو دوسری پر رگڑتے ہیں تو وہ جل اٹھتی ہیں۔ یہ اس کی طرف اشارہ ہے۔

بات ہے۔ بلکہ ضد سے ضد پیدا کرنے سے آسان ہے۔

چهارم: یہ کہ زمین و آسمان کی پیدائش سے حشر اجساد پر دلیل پکڑی ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ زمین و آسمان کی پیدائش انسان کی پیدائش سے بڑی ہے۔ تو جس نے اتنا بڑا کام کر دکھایا تو وہ چھوٹا کام بطریق اولیٰ کر سکتا ہے۔ چنانچہ دوسری جگہ فرمایا۔ لخلق السموت والارض اکبر من خلق الناس ولكن اكثر الناس لا يعلمون (مومن، پ ۲۴) یعنی زمین و آسمان کی پیدائش لوگوں کی پیدائش سے بڑی ہے لیکن اکثر لوگ اسے نہیں جانتے۔

پنجم: یہ کہ وہو بکل خلق علیم کے بعد وہو الخلاق العلیم دوبارہ کہہ کر ایک زائد نکتہ کی طرف اشارہ کیا کہ جسم اجزائے متفرقہ کے اجتماع سے بنتے ہیں اور زندگی جسم میں روح پھونکنے سے ہوتی ہے۔ پس جب وہ خلاق ہے۔ یعنی اجزاء کا جمع کرنا اور ان میں جان ڈالنا اس کا کثیر الوقوع فعل ہے اور تم اس کو روز مرہ دیکھ رہے ہو تو قیامت کو بھی یہی ہو گا کہ اللہ تعالیٰ اجزائے متفرقہ کو جمع کرے گا اور پھر ان میں جان ڈالے گا۔ ہاں یہ شبہ پڑ سکتا تھا کہ اجزائے متفرقہ کہاں کہاں سے آئیں گے تو اس کی نسبت فرما دیا کہ وہ العلیم بھی ہے۔ پس جسموں کا زندہ ہونا کوئی بھی اللہ رب العزت کے نزدیک بعید و عجیب امر نہیں ہے۔

ششم: سب کے بعد اصل راز حیات کا انکشاف کیا کہ سب چیزوں کا وجود اللہ کے امر کے تابع ہے۔ جب کسی امر کی نسبت وہ ارادہ کرتا ہے کہ وہ وجود میں آئے تو اس کی اس صورت کو جو اس کے علم ازلی میں موجود ہے۔ فرماتا ہے کہ تو خارجی وجود میں آ جا تو وہ خارج میں وجود میں آ جاتی ہے۔ پس یہی اصل راز حیات و بقا ہے۔ یہی بات قیامت کے روز ہوگی کہ اللہ تعالیٰ ان سب ذرات کو فرمائیے گا کہ جمع ہو جاؤ۔ جیسا کہ حدیث میں موجود ہے تو وہ جمع ہو جائیں گے اور ان اجسام میں نفخ ارواح کا حکم دے گا تو وہ سب زندہ ہو جائیں گے۔ اسی کا نام قیامت ہے اور اسی کا نام بعث و نشور ہے۔ اس کے بعد حساب کتاب وغیرہ ہو گا۔ جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ تم والحمد للہ

ردِ تَنَاح

موت کے بعد روح ایک جسم سے نکل کر اپنے اعمالِ مکتسبہ کے مناسب جزا و سزا بھگتنے کے لیے دوسرے جنم میں جائے تو اسے تَنَاح کہتے ہیں۔ ہم سابقاً ”لکھ آئے ہیں کہ دنیا کی اکثر آبادی دوزخ میں ہوگی کی قائل ہے۔ قیامت کی اور تَنَاح کی۔

قیامت کے قائل انبیاءؑ کی امتیں ہیں اور تَنَاح کے قائل کسی نبی کی امت نہیں۔ اس سے واضح ہو گیا کہ انبیاء کرامؑ کا دین قیامت کو ماننا ہے نہ کہ تَنَاح کو، پس تَنَاح کا ماننا آسمانی وحی سے نہ ہوا بلکہ وہ انسان کے اپنے توہمات کا اختراع ہے۔ جیسا کہ انشاء اللہ العزیز آگے چل کر معلوم ہو جائے گا۔

ع چوں نہ بردند بحقیقت پے رہ افسانہ زدند

ظاہر ہے کہ ساری دنیا کے اعمال کی جزا و سزا کی نوعیت ہم اپنی شخصی عقل سے مقرر نہیں کر سکتے۔ بلکہ یہ اس کے اختیار میں ہے، جو ساری دنیا کا مالک ہے اور اس کا قانون و قاعدہ بغیر اس کے انبیاء کرامؑ کے معلوم نہیں ہو سکتا۔ پس جزا و سزا کی نوعیت کے متعلق سب عقلی فیصلے نا درست ہونے کی وجہ سے توہمات کہلائیں گے اور اندھیرے میں لاشی چلانے سے بڑھ کر نہ ہوں گے۔ کیوں کہ جس طرح خداوند عالم نے اس عالم ظاہر میں بینائی بخشی ہے کہ ہم اس سے مبصرات کو دیکھ سکیں لیکن اس بینائی سے یہ غرض حاصل کرنے کے لیے آسمانی روشنی آفتابِ عالم تاب پیدا کیا ہے کہ بغیر اس کے ہم اس بینائی سے فائدہ حاصل نہیں کر سکتے۔ اور اگر کوئی عقل کا پتلا یہ کہے کہ میں سورج کی روشنی یا اس کے قائم مقام کی روشنی کے سوا محض اپنی بینائی سے کام لے سکتا ہوں تو ہم اسے دیوانہ سمجھیں گے۔ جو عقل کے پیچھے لٹے کر پڑا ہوا ہے۔ اسی طرح عالمِ روحانی و ایمانی میں ہماری عقل کی رہبری کے لیے آسمانی وحی رکھی ہے کہ بغیر اس کے روحانی و ایمانی امور کی حقیقت معلوم نہیں کر سکتی۔ پس اگر کوئی محض روحانیات و ایمانیات اور امورِ آخرت میں محض عقل کے فتویٰ پر چلے اور یہ کہے کہ میں درست چل رہا ہوں تو ہم اس کے اس قول اور اس فعل کو اس شخص کے حال سے زیادہ نہ سمجھیں گے، جو بغیر آسمانی روشنی یا اس کے قائم مقام کے محض اپنی بینائی سے فائدہ اٹھانے اور مبصرات کی

حقیقت معلوم کر لینے کا مدعی ہے۔ اس امر کو ان شاء اللہ العزیز آیت صراط الذین انعمت علیہم کی تفسیر میں بالتفصیل بیان کریں گے۔ سر دست اس موقع کے مناسب اسی قدر اجمالی ذکر کافی ہے۔

غرضیکہ تناخ کا عقیدہ آسمانی وحی سے حاصل شدہ نہ ہوتے ہوئے قابل اعتبار نہیں ہے۔ علاوہ بریں یہ کہ قائلین تناخ نے اس کے ثبوت میں جو کچھ کہا ہے۔ وہ محض عقلی دھوکے یا توہمات ہیں۔ چنانچہ سوامی دیانند جی ”بانی آریہ سماج“ نے اپنی مایہ ناز کتاب ”ستیا رتھ پرکاش“ اور دیباچہ تفسیر رگوید یعنی ”رگوید آدی بھاشیہ بھومکا“ میں جو کچھ بیان کیا ہے۔ وہ محض قیاسی و وہمی ہے۔ ایک حرف بھی کسی صحیفہ آسمانی سے نقل نہیں کیا۔ چنانچہ انہوں نے بھومکا میں تو صرف یہ دو دلیلیں بیان کی ہیں۔
اول: مرنے کا عالمگیر خوف تناخ کی تصدیق کرتا ہے۔ (ص ۱۳۲)

دوم: دکھ سکھ کے نشیب و فراز سے تناخ ثابت ہے۔ (ص ۱۳۲)
اور ہر ذی ہوش سمجھ سکتا ہے کہ یہ ہر دو دلائل محض قیاسی ہیں۔ قطع نظر اس سے کہ یہ صحیح ہیں یا غیر صحیح اور اس میں بکروید، رگوید وغیرہ کتب کے جو حوالے لکھے ہیں۔ ان میں تھوڑا سا تامل کرنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ سب اس خیال کے پیرو لوگوں کی دعائیں ہیں۔ جو مصطفین وید نے جمع کر دی ہیں، نہ کہ وحی آسمانی کی تعلیم۔ اور اس میں ہم کو کلام نہیں کہ تناخ کا عقیدہ ہندوؤں میں بہت پرانا چلا آتا ہے۔ کسی رواج کی تاریخ قدامت امر دیگر ہے اور یہ امر کہ اس کی بنیاد وحی آسمانی پر ہے، دیگر ہے۔

سوامی دیانند جی تو ہمارے اسی ملک میں زمانہ حال ہی میں ہوئے ہیں۔ ان سے کافی پہلے اور نہایت بعید ملک سپین میں حافظ ابن حزمؒ ہوئے ہیں، جو ۳۸۴ھ میں پیدا ہوئے اور ۴۵۶ھ میں فوت ہوئے۔ وہ اپنی بے نظیر کتاب ”کتاب الفصل“ میں فلسفوں کی طرف سے ثبوت تناخ کی جو دلیل پیش کرتے ہیں۔ وہ تقریباً وہی ہے جو ہم نے سوامی جی کی بھومکا سے نمبر ۲ پر ذکر کی ہے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں:-

واذ قد تعلق هؤلاء القوم بالشريعة فحكم الشريعة ان كل قول لم يات عن نبی تلك الشريعة فهو كذب و فرية فاذا لم يات عن احد من الانبياء عليهم السلام القول بتناسخ الارواح فقد صار قولهم به خرافة و كذبا و باطلا و

باللہ التوفیق (کتاب الفضل، جلد اول، ص ۹۲)

”اور اگر یہ قوم (قائلین تناخ) کسی آسمانی شریعت کی قائل ہے تو شریعت کا حکم تو یہ ہے۔ جو بات اس شریعت کے نبی سے ثابت نہ ہو۔ وہ کذب اور افترا ہے۔ پس چونکہ کسی نبی سے تناخ ارواح کا قول ثابت نہیں ہے۔ اس لیے ان (قائلین تناخ) کا یہ قول سراسر خرافات و جھوٹ اور بالکل باطل ہے۔“

اس کے بعد ہم ان (سوامی جی اور ان کے ہم مشروں) کے دلائل (شبہات) کا جواب دینے سے پہلے ایک اصولی بات سمجھاتے ہیں، جس کے سمجھ لینے سے اللہ کے فضل سے سب توہمات دور ہو جائیں گے اور معلوم ہو جائے گا کہ ان عقل کے پتلوں نے تناخ کے ماننے میں ایسی بھاری غلطی کھائی ہے کہ حس اور عقل ہر دو کو زائل کر کے محض ظنون و توہمات کے پیرو ہو گئے ہیں۔ وہ اصولی بات یہ ہے کہ اس میں کسی معقولی کو کلام نہیں کہ جملہ نفوس بشریہ ایک نوع کے ہیں۔ جن کی حقیقت ایک ہی ہے اور ضرورت حس اور مشاہدہ سے ماننا پڑتا ہے کہ دیگر حیوانات کے ارواح دیگر نوع کے ہیں۔ کیوں کہ ہم خالق حکیم کی قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ سے ہر ایک نوع میں خاص امتیاز دیکھ رہے ہیں۔ انہی امتیازات سے ہر ایک نوع دوسری سے جدا ہوتی ہے اور اسی اختلاف نوعیت کی بناء پر ہر ایک نوع کی حقیقت و ماہیت دوسری سے مختلف ہے۔ پس تناخ کی تصدیق کرتے ہوئے ہم کو ماننا پڑے گا کہ انسان اور دیگر حیوانات کی ارواح ایک نوع کی ہیں اور ان کی حقیقت و ماہیت ایک ہے اور یہ باطل ہے۔ کیوں کہ ہم جانتے ہیں کہ انسان کی حقیقت و ماہیت یہ ہے کہ وہ حیوان ناطق ہے۔ یعنی صاحب علم اور مد رک کلیات جزئیات ہے اور دیگر حیوانات غیر ناطق ہیں اور یہ بھی کہ انسانی روح فطرتاً ناطق ہے اور دیگر حیوانات کی ارواح فطرتاً غیر ناطق ہیں۔ پس تناخ کے ماننے کی صورت میں ہم کو اول تو یہ ماننا پڑے گا کہ ان سب ناطق و غیر ناطق کی ایک ہی حقیقت ہے اور یہ سراسر باطل ہے۔ پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ غیر ناطق انسانی قالب میں آکر ناطق ہو جاتی ہے اور ناطق دوسرے قالب میں جا کر غیر ناطق بن جاتی ہے۔ یہ الٰہی نظام کیا ہوا؟۔ معاذ اللہ! مداری کا تماشا اور بچوں کا کھیل ہوا۔ پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ روح میں بذاتہ علم و ادراک کی کوئی قابلیت نہیں۔ یہ سب کاریگری انسانی ڈھانچے کی ہے کہ روح اس میں آجائے تو مد رک

کلیات و جزئیات ہو جائے اور زمین و آسمان کے علوم حاصل کر سکنے کی قابلیت حاصل کر لے اور اگر اس سے نکل جائے اور دوسرے قالب میں چلی جائے تو پھر ویسی کی ویسی لاعلم ولا عقل ہو جائے تو گویا یہ مٹی کا قالب نورانی جو ہر روح پر موثر ہے۔ حالانکہ معاملہ برعکس ہے۔ تو اب خیال فرمائیے کہ ایک بے عقل کتنی بے عقلیوں کا گھڑاٹھواتی ہے۔ کیا ایسے اباہیل کی تصدیق کرنا عقل کا کام ہے۔ توبہ استغفر اللہ! اللہ تعالیٰ اس آفت سے بچائے۔ ایسا نہ ہو کہ ہماری عقل ہی کو زائل کر دے۔ دیکھئے حافظ ابن حزم اندلسیؒ جن کو قدرت نے فوق الفطرت ذہانت دی تھی۔ کیا فرماتے ہیں:-

لن الله خلق الانواع والاجناس ورتب الانواع تحت الاجناس وفصل كل نوع من النوع الآخر بفصله الخاص له الذي لا يشاركه فيه غيره وهذه الفصول المذكورة لانواع الحيوان انما هي لانفسها التي هي ارواحها فنفس

علامہ مولانا شبلی مرحوم الکلام میں علامہ موصوف کے ترجمہ میں فرماتے ہیں:-

علامہ ابن حزم ظاہری جو ۳۸۴ھ میں قرطبہ (کارڈوا) میں پیدا ہوئے اور سلطان منصور محمد بن ابی عامر کے دربار میں وزارت کا رتبہ حاصل کیا۔ فقہ و حدیث کے امام تھے۔ محدثین عموماً ان کی جلالت شان کے معترف ہیں۔ محدث ذہبیؒ نے طبقات الحفاظ میں ان کا نہایت مفصل تذکرہ لکھا ہے اور حدیث میں ان کو امام فن تسلیم کیا ہے۔ مسلمانوں میں جن لوگوں کا فضل و کمال معمولی طاقت بشری سے بالاتر خیال کیا گیا ہے۔ ایک ان میں علامہ موصوف بھی ہیں۔ ان کی تصنیفات تقریباً چار سو (۴۰۰) ہیں اور اسی ہزار (۸۰) ہزار صفحوں میں ہیں۔ (الکلام حصہ اول، ص ۵۲-۵۳)

گویا بحساب اوسط ہر کتاب دو سو (۲۰۰) صفحات پر مشتمل ہے۔ عمدۃ وزارت کے انصرام میں مصروف ہوتے۔ تصنیفات کی یہ تعداد اور یہ ضخامت حیرت انگیز ہے جس کی وجہ یہی ہے کہ خدا تعالیٰ نے ان کو فوق الفطرت ذہانت دی تھی۔ طبیعت کیا تھی؟ ایک الما ہوا دریا تھا۔ خاکسار کے نزدیک علم کلام میں ان کا طریق نہایت سلامتی والا ہے۔ سنت سے باہر قدم نہیں رکھتے اور مقولات کو بغیر تاویل کے ایسے طریق پر بیان کرتے ہیں کہ پڑھتے پڑھتے ان کا عکس شیشہ عقل میں صاف اترتا جاتا ہے۔ علامہ موصوف ۳۵۶ھ میں فوت ہوئے۔ (تفصیل کے لیے دیکھئے عنوان دنیا میں جزوی اور عاقبت میں کلی جزا)

الانسان حية ناطقة و نفس الحيوان حية غير ناطقة هذا هو طبيعة كل نفس و جوهرها الذي لا يمكن استحالة عنه فلا سبيل الى ان يصير غير الناطق ناطقا ولا الناطق غير ناطق ولو جاز هذا لبطلت المشاهدات وما او جبه الحس و بديهة العقل و الضرورة لانقسام الاشياء على حدودها (جلد اول، ص ۹۲)

”اللہ تعالیٰ نے انواع اور اجناس پیدا کیں اور انواع کو اجناس کے نیچے ترتیب دیا اور ہر نوع کو دوسری نوع سے ایک خاص فصل (امتیاز) سے جدا کیا۔ جو اسی سے مخصوص ہے اور دوسری نوع کو اس میں قطعاً ”مشارکت نہیں ہے اور انواع حیوانات کے یہ فصول مذکورہ یعنی امتیازات خصوصی صرف ان کے نفوس کی وجہ سے ہیں، جو ان کے ارواح ہیں۔ پس نفس انسانی زندہ اور ناطق یعنی مدرک جزئیات و کلیات ہے اور دیگر حیوانات کے ارواح زندہ تو ہیں لیکن غیر ناطق ہیں۔ یہی ہر نفس کی طبیعت اور اس کا جوہر ہے۔ جو اس سے مستحیل نہیں ہو سکتا۔ پس غیر ناطق کے ناطق ہونے اور ناطق کے غیر ناطق ہونے کی کوئی صورت نہیں۔ (اور تنازع کی صورت میں ایسا ماننا پڑتا ہے۔) پس اگر یہ جائز ہو تو اشیاء کے ان کی حدود پر منقسم ہونے کی وجہ سے تمام مشاہدات اور وہ امور جن کو حس اور صریح عقل اور ضرورت واجبی واجب کرتی ہے، باطل ہو جائیں گے۔ (اور ان کا باطل ہونا بالکل باطل ہے لہذا تنازع باطل ہے)“

دلائل تنازع کے جواب

ہم اوپر بیان کر آئے ہیں کہ سوامی دیانند جی ”بانی آریہ مت“ نے ثبوت تنازع کی دو دلیلیں ذکر کی ہیں۔ اول یہ کہ مرنے کا عالمگیر خوف تنازع کی تصدیق کرتا ہے سوامی جی اسے عنوان قرار دے کر اس کی توضیح میں پانچجل یوگ شاستر سے مندرجہ ذیل عبارت نقل کرتے ہیں:-

”تمام جانداروں کو پیدا ہونے کے وقت سے ہی برابر مرنے کا خوف لگا رہتا ہے۔ جس سے اگلے اور پچھلے جنم کا ہونا ثابت ہوتا ہے۔ کیوں کہ کیرا بھی پیدا ہوتے ہی

مرنے سے خوف کھاتا ہے۔ عالموں کو بھی خوف دامن گیر ہے۔ پس ثابت ہوتا ہے کہ جیو کئی جسم پاتا ہے۔ اگر گزشتہ جسم میں مرنے کا تجربہ نہ ہوا ہوتا تو اس کا اثر یا خیال نہیں رہتا چاہیے تھا اور اثر یا خیال کے بغیر یادداشت بھی نہیں ہوتی۔ پھر پچھلی یاد کے بغیر مرنے سے کیوں خوف لگتا ہے۔ اس لیے ہر جاندار میں خوف مرگ کے دیکھنے سے اگلے اور پچھلے جنموں کا ہونا ثابت ہوتا ہے۔ (بھومکا، ص ۱۳۲)

جواب :- بے شک موت اور اس سے ادھر کی جملہ تکلیفات مثلاً ”چوٹ، زخم، پھوڑا، پھنسی، درد، دکھ، بیماری، فاقہ حتیٰ کہ غم فکر سب امور ناگوار طبع ہیں۔ لیکن اس ناگوارگی کا سبب سابقہ تجربہ قرار دینا سوامی جی اور مصنف پاتنجیل یوگ شاستری خوش خیالی ہے یا جو بات اپنے مت میں مانی ہوئی ہے، اسی کا عکس ہے۔ ورنہ اسے حقیقت واقعی سے کچھ بھی تعلق و واسطہ نہیں۔ کیوں کہ موت یا کسی تکلیف کی ناگوارگی کے وقت کسی متنفس کو بھی قطعاً اس کا تصور نہیں ہوتا کہ میں تکلیف یا موت سے اس لیے بھاگتا ہوں کہ میں سابقہ اس کا تلخ تجربہ کر چکا ہوں۔ تجرباتی علم میں سابقہ مجربہ امور کا علم ضروری ہوتا ہے کیوں کہ نفس انہی امور مجربہ میں تصرف کر کے اور ان کو ترتیب دے کر آئندہ کی احتیاط اختیار کرتا ہے۔ تفصیلی علم نہ ہو تو اجمالی ہی سہی اور انکشافی نہ ہو تو خیالی ہی سہی۔ غرض کسی نہ کسی نوع کا ہونا ضروری ہے۔ لیکن یہاں یعنی موت یا تکلیف سے بچنے کی ناگوارگی کے وقت اس کا مطلقاً احساس یا تصور یا خیال بھی نہیں ہوتا کہ اس عالم میں آنے سے پہلے کبھی ہم اس مصیبت میں گرفتار ہوئے تھے اور ہمیں یہ تکلیف پہنچی تھی اور آگے بھی ہم مرے تھے جس کی تنگی سے ہمیں بچنا چاہیے۔

اگرچہ یہ ایسی بات ہے، جس کی شہادت ہر شخص کا ضمیر دے سکتا ہے۔ کیوں کہ یہ ایک وجدانی امر ہے، جو کسی خارجی دلیل کا محتاج نہیں، لیکن پھر بھی ہم سوامی جی کی اپنی عبارت سے دکھاتے ہیں کہ وہ اپنے اس قول کے خلاف خود تسلیم کرتے ہیں کہ انسان کا دماغ ان تصورات سے بالکل خالی ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ مذکورہ بالا عنوان کے بعد ایک اور عنوان بایں الفاظ مقرر کرتے ہیں۔

”انسان کا کمزور حافظہ پچھلے جنم کی بات یاد نہیں رکھ سکتا۔“

اگرچہ اس میں سوامی جی نے علم نہ ہونے کی وجہ حافظہ کی کمزوری بتائی ہے لیکن ہمیں اس وقت وجہ سے بحث نہیں۔ وجود علم یا عدم علم سے بحث ہے۔ تو سوامی جی نے کھلے الفاظ میں تسلیم کر لیا کہ ہمیں اس کا علم نہیں۔ اس کی توضیح میں سوامی جی فرماتے ہیں:-

”اسی جسم میں پیدا ہونے کے وقت سے پانچ برس کی عمر تک جو بھی سکھ یا دکھ ہوا ہے اور جو بھی کام حالت خواب یا بیداری میں کیے ہیں، ان کی یاد نہیں رہتی۔ پھر پچھلے جنم کی بات یاد رہنے کا تو ذکر ہی کیا۔ (بھومکا، ص ۱۳۲)

اس کے جواب میں اولاً ”تو یہ گزارش ہے کہ قبل از پانچ سال بچپن کی عمر کی بعض باتیں بہت لوگوں کو یاد ہوتی ہیں۔ سوامی جی نے ”یاد نہیں رہتی“ کہاں سے کہہ دیا۔ (مجھ عاجز کو اپنی عمر کے تیسرے اور چوتھے سال کے بعض واقعات اس طرح یاد ہیں کہ گویا وہ اس وقت میری آنکھ کے سامنے واقع ہو رہے ہیں) دیگر یہ کہ اگر بالفرض کچھ بھی یاد نہ ہو تو اپنی ہستی اور بچپن کا تو علم یاد ہوتا ہے لیکن یہاں تو بالکل ندارد کا خانہ ہے۔

دیگر یہ کہ واقعات کی تفصیل کا یاد نہ ہونا امر دیگر ہے اور مطلقاً تصور و خیال کا بھی نہ ہونا امر دیگر ہے۔ بلکہ اپنی ہستی کی نسبت بھی خیال تک نہ ہو تو آپ اسے بچپن کی یادداشت کی کمزوری کی مثال نہیں بنا سکتے۔ خاص کر جب بموجب آپ کے قول کے انتریمش لوک یا چندر لوک یا سورگ سے واپس آکر انسانی قالب میں جنم لیتی ہے تو یہ حالت کمال اور نجات کی ہوتی ہے۔ اس میں آکر سورگ آسائش و راحت کیسے بھول سکتی ہے اور نجات یافتہ روح میں ضعف حافظہ کس طرح راہ پاسکتا ہے۔ فافہم غرض سوامی جی کی دلیل بے بنیاد اور خود ساختہ وہم کی پیدائش ہے، جس کی شہادت عقل اور واقعات سے نہیں ملتی اور اسی طرح حافظہ کی کمزوری کا عذر بھی بے موقع و غیر واقعی ہے۔ جو قابل پذیرائی نہیں۔

کشف حقیقت

آئیے ہم آپ کو بتائیں کہ یہ خوف اور ناگواری بتقاضائے طبع ہے کہ خالق

ہم نے جسم کی حفاظت و بقا کے لیے نفس میں اسے پیدا کر دیا ہے کہ ضرورت کے وقت اندرتی تحریک سے بغیر توجہ و ارادہ کے اس سے سرزد ہوتا رہتا ہے۔ اس کی بناء کسی سابقہ تجربہ پر نہیں ہے اور نہ اب یہاں آکر اس کے لیے کوئی درس گاہ ہے۔ بلکہ بعض اوقات یہی تقاضائے طبع دماغ کو اس درد دکھ کے دور کرنے کی تدبیر پر متنبہ کرتا ہے اور آرام کے حاصل کرنے کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ اگر آپ ایسے اوقات میں اپنے وجدان کی طرف رجوع کریں گے تو ہمارے بیان کی تصدیق کی آواز اپنے اندر ہی سے پالیں گے۔ بشرطیکہ آپ کا وجدان توہمات کی آفت سے سلامت ہو۔ اللھم ارنا الاشیاء کما ہی۔ الہی! تو ہمیں چیزوں کی حقیقت اسی طرح کی دکھا، سمجھا جس طرح کہ وہ ہیں۔

سوامی جی نے تنازع کے ثبوت میں دوسری دلیل یہ ذکر کی ہے۔ ”دکھ سکھ کے نشیب و فراز سے تنازع ثابت ہے۔“ اس کی توضیح میں سوامی جی فرماتے ہیں کہ:-

”جس طرح ایک واقف طب کو بخار ہو تو وہ اس کی علت معلوم کر لیتا ہے اور اگر ناواقف کو ہو تو وہ اس کی علت کو معلوم نہ کر سکے۔ لیکن وہ علم طب سے ناواقف شخص بھی بخار کے موجود ہونے سے اتنا ضرور جان لیتا ہے کہ میں نے کوئی بد پرہیزی کی ہے۔ کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ علت کے بغیر کوئی معلول نہیں ہوتا۔ اس لیے عادل و منفع ایثار پاپ اور پن کے بغیر کسی کو دکھ یا سکھ نہیں دیتا۔ دنیا میں سکھ اور دکھ کے نشیب و فراز کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پچھلے جنم میں ضرور پاپ اور پن کیے ہیں۔“ (بھومکا، پ ۱۳۲)

جواب:- زیر بحث امر مطلق علت و معلول نہیں ہے بلکہ سوامی جی کی معین کردہ علت ہے۔ یعنی یہ کہ دنیا کا دکھ سکھ پچھلے جنم کی نیکی یا بدی کی وجہ سے ہے۔ اس تعین کی کیا دلیل ہے؟ کیوں کہ اس عالم امکان میں اسباب و مسببات اور علت و معلول کا سلسلہ بہت وسیع ہے۔ ایک معلول کی متعدد علتیں اور ایک سبب کے مختلف اسباب ہو سکتے ہیں۔ دیگر یہ کہ ہم ہر روز اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ بلکہ ہماری جانوں پر گزر رہا ہے کہ ہماری اس زندگی کے ہزارہا اعمال کا نتیجہ دم نقد اسی زندگی میں نکلتا رہتا ہے۔ عام اس سے کہ ہماری وہ غلط کاری یا خطا شرعی نقطہ خیال سے گناہ ہو یا نہ ہو اور ہماری حسن تدبیر یا حسن کارکردگی یا محنت و خدمت از روئے شریعت موجب ثواب ہو یا نہ ہو۔

کیوں کہ تمام دنیوی دکھ سکھ احکام شریعت پر مبنی نہیں ہے، بلکہ بعض امر تو طبی اور طبعی اصول پر مبنی ہیں اور بعض تعامل پر اور بعض وقت شناسی پر اور بعض طریق کار اور تدبیر پر اور بعض ہماری اس زندگی کی نیکی و بدی پر جیسا کہ ہم سابقاً ”مفصل بیان کر چکے ہیں۔ ان میں سے بعض امور کو ہم مثالوں سے سمجھاتے ہیں:-

مثال نمبر ۱:- ایک شخص نے غلطی سے یا دیدہ دانستہ زہر کھالیا یا اپنے پاؤں پر کھاڑا مار لیا تو زہر کے اثر اور کھاڑے کے زخم کی نسبت یہ نہیں کہا جائے گا کہ چونکہ اس نے پچھلے جنم میں پاپ کیے تھے اس لیے زہر نے اثر کیا اور کھاڑے سے زخم ہو گیا۔ اگر نہ کیے ہوتے تو یہ اثر اور زخم نہ ہوتا۔

مثال نمبر ۲:- ایک شخص نے کوئی ایسی غذا کھائی جو اس کے مزاج کے موافق نہ تھی۔ اسے اس سے تکلیف ہو گئی تو یہ نہیں کہا جائے گا کہ چونکہ اس نے پچھلے جنم میں پاپ کیے تھے اس لیے اسے تکلیف پہنچی ورنہ ایسا نہ ہوتا۔

مثال نمبر ۳:- ایک شخص نے اپنی کھیتی یا باغ کی پرورش ہر مناسب تدبیر سے اچھی طرح کی۔ اس کی کھیتی یا باغ خوب بار آور ہوئے۔ دوسرے شخص نے ایسا نہ کیا بلکہ ہر مناسب تدبیر میں سستی کی اور موقع شناسی سے کام نہ لیا اور اس کی کھیتی یا باغ خشک ہو گئے اور بار آور نہ ہوئے تو پہلے شخص کی حسن تدبیر و حسن کارکردگی اور محنت کو اور دوسرے شخص کی سستی اور غلط کاری کو نظر انداز کر کے یہ نہیں کہا جائے گا کہ اگر انہوں نے پچھلے جنم میں پاپ یا پن نہ کیے ہوتے تو یہ نتائج بھی نہ نکلتے۔

حاصل یہ کہ پچھلے جنم کی تعین خلاف واقعات روز مرہ اور خلاف مشاہدات ہونے کی وجہ سے سراسر سفسطائیت اور توہم پرستی ہے۔

تمہ بحث نتائج

بعض اوقات آریہ صاحبان یہ بھی کہا کرتے ہیں کہ ہم دنیا میں لوگوں کی حیثیتوں میں اونچ نیچ دیکھتے ہیں۔ ایک حاکم ہے، دوسرا رعیت ہے۔ ایک افسر و آقا

۶۹۔ تفصیل کے لیے دیکھئے عنوان: ”دنیا میں جزوی اور عاقبت میں کلی جزا“

ہے، دوسرا ملازم و ماتحت ہے اور ایک امیر ہے، ایک غریب ہے۔ یہ سب کچھ بھی پچھلے جنم کے پاپ پن کا نتیجہ ہے۔ اس کا جواب بھی وہی ہے کہ ایسے سب خیالات تو ہم پرستی اور حقیقت ناشناسی ہیں۔ دنیا میں مدارج کا تفاوت ایک قدرتی نظام ہے۔ اس کے بغیر دنیا قائم نہیں رہ سکتی۔ سب لوگ ویدوں کے مطابق دھارمک یا ان کے خلاف ناسمک ہو جائیں اور قدرت کے ہاں جزا و سزا کا یہی دستور ہو تو اس کا لازمی نتیجہ یہی ہو گا کہ یا تو سب ایک حیثیت کے انسان ہو جائیں گے اور دیگر حیوانات جو ہمارے طرح طرح کے منافع و فوائد کے لیے پیدا کیے گئے ہیں، نابود ہو جائیں گے اور خدمت گار انسان بھی نہ ملیں گے اور یا تو انسانی ہستی صلیحہ دنیا سے نابود ہو جائے گی اور اس پر صرف بندر وغیرہ جانور ہی ٹاپتے رہیں گے۔ غرض ہر دو صورت دنیا کا انتظام بگڑ جائے گا اور یہ بالکل باطل ہے۔ دیکھئے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اس اونچ نیچ کا سچا فلسفہ بتایا ہے کہ یہ تفاوت مدارج دنیا کا انتظام درست رکھنے کے لیے ہے۔ چنانچہ فرمایا۔ ورفعنابعضہم فوق بعض درجات لیتخذ بعضہم بعضا سخریا (زخرف، پ ۲۵) یعنی ہم نے بعض کے مدارج بعض پر فائق بنائے ہیں تاکہ ایک دوسرے سے خدمت لے سکے۔ (اور دنیا کے سب امور) اس کے قیام تک با انتظام چلتے رہیں۔

قرآن شریف میں بعض قوموں پر ایسے عذاب کا بھی ذکر ہے۔ وہ سور اور بندر بنا دیئے گئے۔ اس پر یہ صاحبان کما کرتے ہیں کہ دیکھو تمہارے ہاں بھی تو ایسا لکھا ہے۔ بھرتم تناخ کیوں نہیں مانتے ہو تو اس کا جواب یہ ہے کہ تناخ نہیں ہے بلکہ مسخ صورت ہے۔ تناخ تو یہ ہے کہ مرنے کے بعد روح ایک قالب سے نکل کر دوسرے قالب میں داخل ہو۔ جیسا کہ سوامی ویانند جی نے ”ستیا رتھ پرکاش“ میں تصریح کی ہے اور یہ مسخ صورت اسی بدن میں رہنے سے فساد خون وغیرہ کی وجہ سے حلیہ کی تبدیلی ہے نہ کہ روح کا انتقال۔ فانہم ولانکن من القاصرین۔

سورہ فاتحہ اور ذات و صفات باری تعالیٰ

ذات حق کی کنہ گو ہمارے اور اک و قیاس سے بلند تر ہے، لیکن عیاں سے عیاں

ہے۔ کیوں کہ اس کی ہستی کا اقرار ہماری فطرت و جبلت میں ایسے طور پر مرکوز ہے اور اس کی قدرت و حکمت کے آثار اتنے وافر اور ظاہر ہیں کہ ہم اس کی ہستی سے انکار نہیں کر سکتے۔ اسی لیے کہا گیا ہے:-

انکار کسی سے بن نہ آیا تیرا

ہاں! بعض اوقات بعض طبائع پر کچھ حجاب غالب آ جاتے ہیں لیکن وہ سب عارضی ہوتے ہیں۔ جب وہ دور ہو جاتے ہیں تو فطرت اپنی جبلت پر ہو کر حقیقت کو دیکھنے سمجھنے لگتی ہے اور حوالحق! حوالحق پکار اٹھتی ہے۔ ان حجابات کے اٹھانے کے دو طریقے ہیں۔

اول مصنوعات عالم کی ایجاد پر نظر کرنا اور ان کی مناسب ترتیب اور ہر امر میں حکیمانہ تدبیر اور عالم بالا (آسمان) اور عالم زیریں (زمین) میں ایک با نظام ارتباط اور ان کی تاثیر و تاثر سے گونا گوں باقاعدہ و مناسب ضروریات انقلابات پر فکر کرنا۔ یہ وہ عالمگیر امور ہیں جن سے انکار نہیں ہو سکتا۔ ان کے سمجھ لینے اور تسلیم کر لینے کے بعد کسی قسم کا حجاب باقی نہیں رہ سکتا اور اگر کسی کی شہادت فطرت فرعون کی طرح مختلف حجابات کے غلیظ پردوں میں پوشیدہ ہو گئی ہو اور اس کی عقل پر پردہ پڑ گیا ہو۔ کہ وہ نہ تو مصنوعات عالم کی ایجاد پر نظر کرے اور نہ دنیا جہان کے نظام تربیت میں فکر کرے اور اس کی ذہنیت ایسی الٹی ہو چکی ہو کہ وہ بغیر صانع کی صنعت کے نمود اور پیدائش کو مانتا ہو اور بغیر موجد کے ایجاد کا قائل ہو اور بغیر صاحب قدرت و حکمت مدبر کی تدبیر کے کسی باقاعدہ نظام کو تسلیم کرتا ہو تو ایسے کج فہم غافل کو ہوشیار کرنے اور ایسے مست خواب بے ہوشی کو بیدار کرنے اور ایسے سرکش ضدی کی ضد توڑنے کے لیے قدرت اپنے قہری ہاتھ سے کام لیتی ہے۔ چنانچہ فرعون دہریہ کے سمجھانے کو اللہ تعالیٰ نے موسیٰؑ کو بھیجا۔ آپ نے خدا کی ہستی کے بارے میں نہایت مختصر و دو حریفی بات میں ایک نہایت لطیف و زبردست دلیل پیش کی۔ یعنی ربنا الذی اعطی کل شئی خلقہ ثم ہلسی (طہ، پ ۱۶) یعنی ہمارا رب وہ ہے۔ جس نے ہر شے کو پیدا کیا اور اسے مناسب وضع میں رکھا۔ پھر (ان کو جو سمجھ دار ہیں) سمجھ بخشی۔ فرعون علی طور پر تو اس دلیل سے بند پڑ گیا لیکن چونکہ اس کا حجاب بہت غلیظ تھا اور تمرد و سرکشی کا بہوت اس پر مزید سوار تھا۔ اس لیے موسیٰؑ کی اس نرم

پھونک سے نہ تو وہ حجاب دور ہوا اور نہ وہ بھوت اتر۔ آخر لشکر خدا کے ایک ادنیٰ سپاہی پانی نے اس کا گلا گھونٹا اور اس کی ٹانگ مروڑ کر اس کی ٹانگ میں خاک آلود کی تو اس کے سب حجاب چاک ہو گئے اور حکومت کا جن اتر گیا۔ حقیقت کمال وضوح سے اس کے سامنے منکشف ہو گئی اور فطرت نہایت صفائی سے گواہی دے اٹھی۔ امنت انه لا اله الا الذی امنت به بنو اسرائیل وانا من المسلمین ○ (یونس، پ ۱۱)

”میں نے (دل سے) سچ مان لیا اور (زبان سے اس کا اقرار کرتا ہوں) کہ جس ذات پر (میرے مظلوم و مظلوم) بنی اسرائیل ایمان رکھتے ہیں۔ اس کے سوا کوئی بھی معبود نہیں ہے۔ (نہ میں خود نہ کوئی دیگر) اور میں اس (ذات برحق) کے تابع فرمان بندوں میں سے (ایک) ہوں۔“

فرعون کو نہ صرف خدا کی ہستی کا اقرار کرنا پڑا، بلکہ یہ بھی تسلیم کرنا پڑا کہ میں اس کے حکم کے ماتحت ہوں اور یہ بھی کہ سب اس کے فرمان کے تابع ہیں، جن میں سے ایک میں بھی ہوں۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کی ذات کا اقرار فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے۔ اسی طرح اس میں یہ اقرار بھی مرکوز ہے کہ ہم اور دیگر سب اور تمام کائنات ارضی و سماوی اس کے حکم کے ماتحت ہیں۔ کوئی اسے سعادت مندی سے طوع و رغبت سے قبول کرتا ہے اور اس پر ایمان رکھتا ہے اور کسی کو کراہا اس کے ماتحت ہو کر اس کا اقرار کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:-

وله اسلم من فی السموت والارض طوعاً و کرہاً والیہ یرجعون ○ (آل عمران، پ ۳)

”اور اسی کے تابع فرمان ہیں۔ سب جو آسمان و زمین میں ہیں۔ (کوئی) طوع و رغبت سے اور (کوئی) مجبوری و مقہوری سے اور (آخر سب کو) اسی کی طرف لوٹنا ہے۔“

”انکار کسی سے بن نہ آیا تیرا“ کی ایک یہ بھی صورت ہے۔ غرض اللہ تعالیٰ ہستی کے اثبات میں فطرت کے سامنے سے حجاب اور عقل کے سامنے سے پردہ ہٹانے کا یہ دوسرا طریق ہے۔ کیوں کہ جب پٹھوں کی حس کمزور ہو گئی ہو تو نرم مس کفایت نہیں کرتا بلکہ سخت رگڑ کی ضرورت ہوتی ہے۔

باقی رہا مسئلہ صفاتؑ، تو ہم تو اس بات کے قائل ہیں کہ ذات برحق کے اقرار کی طرح اس کی صفات کمال اور نعوت جلال کا اقرار اور جملہ معائب و نقائص سے اس کے منزہ و مبرا ہونے کی شہادت بھی فطری ہے اور جس طرح اقرار ذات کے سامنے بعض اوقات حجاب آ جاتے ہیں اور ادراک حقیقت نہیں ہوتا۔ اسی طرح اقرار صفات کے سامنے بھی جمالت و غباوت کے بادل چھا کر حقیقت چھپ جاتی ہے اور حجابات کے اندھیروں میں انسان کا وہم پرست دماغ کچھ کا کچھ تراش لیتا ہے۔ انہی حجابات و ادھام سے شرک پیدا ہوتا ہے اور انسان غیر اللہ کو دنیا جہان کے نظام تربیت اور تدبیر عالم میں متصرف و قابض سمجھ لیتا ہے۔ تو اس حجاب کے اٹھانے کے لیے بھی قرآن حکیم نے یہی مذکورہ بالا دو نسخے استعمال کیے ہیں۔ اول یہ کہ مصنوعات عالم کی خلق و ایجاد میں نظر کرنی فرمائی اور ہر شے کو نظر کے سامنے رکھ کر سمجھا دیا کہ ان کا خالق سوائے اللہ کے اور کوئی نہیں ہے۔ چنانچہ فرمایا:-

☆ ام جعلوا للہ شرکاء خلقوا کخلقه فتشابه الخلق علیہم بل اللہ خالق کل شیء و هو الواحد القہار ○ (رعد، پ ۱۳)

”کیا ٹھہرائے ہیں انہوں نے اللہ کے شریک کہ پیدا کیا ہے انہوں نے مثل خدا کے پیدا کرنے کی، پھر مل گئی ہے پیدائش ان کی نظر میں، (اے نبی!) تو کہہ اللہ ہی ہر شے کا پیدا کرنے والا ہے اور وہ اکیلا ہے (اور) زبردست ہے۔“

☆ اللہ الذی خلقکم ثم رزقکم ثم یمینکم ثم یحییکم هل من شرکائکم من یفعل من ذالکم من شیء سبحنہ و تعالیٰ عما یشرکون ○ (روم، پ ۲۱)

”اللہ وہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا، پھر تم کو روزی دی۔ پھر تم کو مارتا ہے، پھر تم کو زندہ کرتا ہے۔ تمہارے (مقرر کردہ) شریکوں میں سے کوئی ہے جو ان کاموں میں سے ایک بھی کر دکھائے، وہ نرالا ہے اور بہت بلند ہے اس سے جن کو وہ شریک مقرر

نیکہ حافظ ابن حزم قرطبیؒ اللہ تعالیٰ کے لیے لفظ صفت کو پسند نہیں کرتے بلکہ انہوں نے اس کی بجائے لفظ نعت اختیار کیا ہے۔ (کتاب الفصل)

کرتے ہیں۔“

☆ خلق السموات بغير عمد ترونها و القى فى الارض رواسى ان تميدبكم و بث فيها من كل دابة و انزلنا من السماء ماء فانبثنا فيها من كل زوج كريم ○ هذا خلق الله فارونى ما ذا خلق الذين من دونه بل الظلمون فى ضلل مبين ○ (لقمان، پ ۲۱)

”اس نے آسمان بغیر ستونوں کے بنائے (جیسا کہ) تم ان کو دیکھتے ہو اور زمین پر پہاڑوں کا بوجھ ڈال دیا کہ وہ تم کو لے کر جھک نہ پڑیں اور بکھیرے اس میں سب طرح کے جانور اور اتارا ہم نے (آسمان کی طرف) سے پانی، پھر زمین میں ہر عمدہ جنس اگائی۔ یہ سب کچھ تو اللہ کا بنایا ہوا ہے۔ اب دکھاؤ مجھ کو کیا بنایا ہے اوروں نے جو اس کے سوا ہیں۔ کوئی نہیں بلکہ یہ (مشرک) ظالم لوگ صریح گمراہی میں ہیں۔“

اسی طرح کائنات کے انتظام و تدبیر کے متعلق فرمایا:۔

قل من يرزقكم من السماء والارض ام من يملك السمع و الابصار و من يخرج الحى من الميت و يخرج الميت من الحى و من يدبر الامر فسيقولون الله فقل لا تتقون ○ فذالكم الله ربكم الحق فما ذا بعد الحق الا الضلل فانى تصرفون ○ (يونس، پ ۱۱)

”(اے نبی! ان سے) پوچھ کون روزی دیتا ہے تم کو آسمان سے اور زمین سے، یا کون مالک ہے کانوں کا اور آنکھوں کا اور کون نکالتا ہے زندہ مردہ سے اور نکالتا ہے مردہ زندہ سے اور کون تدبیر کرتا ہے ہر کام کی۔ تو وہ کیسے گے کہ اللہ ہے تو تو کہہ، کیا تم ڈرتے نہیں؟۔ سو یہی اللہ ہے، رب تمہارا سچا پھر کیا رہا ہے بعد حق کے سوائے بھٹکنے کے، سو کہاں سے پھرے جاتے ہو۔“

دوم یہ کہ اللہ سے ادھر جن جن بزرگ ہستیوں کو لوگوں نے غلط فہمی سے کائنات کے انتظام و تدبیر میں متصرف سمجھ لیا اور ان کی پرستش شروع کر دی اور ان کی رضا حاصل کرنے اور ان کے قہر و غضب کی بلا سے بچنے کے لیے ان کی نذریں نیازیں دینے لگے۔ گویا عملاً ”ان کو شریک خدا ٹھہرایا۔ ہر چند کہ وہ بزرگ ہستیاں اس غلط علم اور نادورست فہم کی تعلیم سے پاک تھیں لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت بالغہ سے ان پر

یہ ایسے واقعات گزاریے کہ انہوں نے ان میں اپنے حقیقی مولا و مالک خداوند تعالیٰ کی طرف رجوع کیا۔ اپنی حاجت اس کے حضور پیش کی اور اپنی تکلیف کی دوری کے لیے اس سے دعا کی۔ جس سے ظاہر ہو گیا کہ وہ مقدس بزرگ نہ تو تدبیر عالم میں متصرف تھے نہ اپنے اور نہ کسی دوسرے کے نفع و نقصان کے مالک تھے نہ دیکھ کر فریاد رس تھے اور نہ مشکل کشا و کار ساز تھے۔

ان کے ایسے واقعات و مصائب اور ان کی دعائیں قرآن حکیم میں جا بجا مذکور ہیں اور ہم نے ان میں سے بعض رب العالمین کی تفسیر میں نقل بھی کر دی ہیں۔ غرض علم ظاہر میں استدلال اور تنبیہ کے یہی دو طریقے ہیں جن کا ذکر قرآن کریم میں بیش از بیش ہے۔

مسئلہ :- صفات باری تعالیٰ کو اصولی طور پر سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے ان کی تقسیم سمجھ لی جائے۔ معلوم ہو کہ اللہ تعالیٰ کی صفات دو طرح پر ہیں۔ وجودیہ اور سلبیہ۔

وجودیہ سے مراد یہ کہ ذات حق جملہ صفات کمال اور نعوت جلال و جمال سے متصف ہے۔ جسکی وجہ سے وہ لائق حمد و قابل ستائش ہے۔

سلبیہ سے یہ مراد ہے کہ ذات حق جملہ معائب و نقائص سے پاک ہے۔ پھر یہ کہ صفات وجودیہ میں سے بعض ذاتیہ و حقیقیہ ہیں۔ ان کو ازیلہ و قدیمہ (مطلقاً) بھی کہتے ہیں۔ مثلاً "حیات" علم، قدرت وغیرہ کہ ان کا انفکاک ذات حق سے نہ ہوا نہ ہو سکے اور بعض دیگر صفات افعال سے ہیں کہ ان کا ظہور بالفعل مخلوق کے ظہور وجود سے ہے۔

اچھے ایسی صفات کی دو جہتیں ہیں۔ ایک جہت ذات باری کی صفت و نعمت ہونے کی دوسری مخلوق سے متعلق ہونے کی۔ ذات خداوندی سے تو ان کا تعلق حادث نہیں۔ یعنی ایسا کوئی وقت نہیں تھا اور نہ ہوگا کہ ذات برحق ان سے عاری ہو۔ اسی معنی میں حضرت امام ابو حنیفہؒ فقہ اکبر میں فرماتے ہیں "كان الله خالقاً قبل ان يخلق" (فقہ اکبر) یعنی اللہ تبارک و تعالیٰ مخلوق کو پیدا کرنے سے پہلے بھی خالق تھا۔ یعنی اس میں قوت و قدرت موجود تھی اور وہ اس صفت سے موصوف تھا۔ امام غزالیؒ نے اقتصاد میں اسے نہایت صفائی سے بیان کیا ہے۔ باقی

مثلاً "خالقیت"، رازقیت، ربوبیت وغیرہ۔

نکتہ نمبر ۱:- اس تمہید کے بعد معلوم ہو کہ چونکہ سورت فاتحہ قرآن حکیم کا خلاصہ ہے اور اس کے جملہ مضامین مقصودہ کا ایکٹریکٹ (Extract) یعنی عطر ہے۔ اس لیے اس میں صرف صفات وجودیہ کا ذکر کیا ہے۔ کیوں کہ حقیقت میں صفات سلبیہ کا رجوع بھی وجودیہ کی طرف ہے اور وہ ان کے ضمن میں التزاماً موجود ہیں۔ کیوں کہ جب صفات وجودیہ صفات کمال ہیں اور کمال کی حقیقت یہ ہے کہ اس میں کوئی کسر، کوئی نقص اور کوئی عیب نہ ہو، کیوں کہ عیب و نقصان مانع کمال ہوتے ہیں تو صاف ظاہر ہے کہ صفات سلبیہ ضمناً صفات وجودیہ میں موجود ہیں۔

نکتہ نمبر ۲:- سورہ فاتحہ میں صفات وجودیہ میں سے بھی صرف وہی ذکر کی ہیں۔ جن کے ضمن میں دیگر سب صفات ذاتیہ و افعالیہ بھی آ جاتی ہیں اور اسی کی شرح و بسط اس وقت ہمیں مطلوب ہے۔ اس طریق بیان میں اختصار بھی رہا جو خلاصہ کی شان ہے اور احتوائے مقاصد مبہمہ بھی ہو گیا۔ جس کی وجہ سے اس کا نام القرآن العظیم اور ام القرآن رکھا گیا۔ مثلاً "رب العالمین اور الرحمن الرحیم کہ ان میں ارادہ، علم، حکمت، سمع، بصر، قدرت، رزاقیت، موبہت (بخشش و عطا)، بسط (کشائش)، رافت و رحمت، لطف و کرم، حلم و عفو، مغفرت و ہدایت، اجابت و حفاظت، ولایت و وکالت، حیات و بقا وغیرہ صفات جمالیہ، ذاتیہ و فعلیہ آ جاتی ہیں اور مالک میں عظمت و کبریائی و صمدیت وغیرہ صفات جلالیہ آ جاتی ہیں اور اسے یوم الدین کی طرف مضاف کرنے سے جبروت و سطوت،

رہی دوسری جہت یعنی مخلوق سے صفت کا تعلق سو وہ حادث ہے یعنی جب اللہ تعالیٰ نے چاہا مثلاً "کسی شے کو ہستی میں لا دے تو اپنی صفت خالقیت کو اس شے کی صورت علیہ سے متعلق کر دیا جو اس کے علم ازل میں اشیاء کی ایجاد سے پہلے موجود ہے اور اس کو موجود بالفعل کر دیا۔ پس یہ متعلق اور متعلق بہ (مخلوق) ہر دو حادث ہوئے نہ کہ صفت الہی۔ اسی نکتہ کو نہ سمجھ کر آریوں نے مسئلہ خلق و ایجاد اور حدوث و قدامت دنیا کے متعلق غلطی کھائی ہے اور اسی کے نہ سمجھنے سے مرزا قادیانی سلسلہ خلق و ایجاد کی قدامت کے قائل ہو گئے۔

قاتلہم اللہ انی یؤفکون

قروعدالت وغیرہ آ جاتی ہیں۔

نکتہ نمبر ۳:- ذات خداوندی تصور میں نہیں آ سکتی۔ نہ اس پر ماہیت کا سوال وارد ہو سکتا ہے، نہ اس کی کنہ اور اک میں آ سکتی ہے۔ اسی لیے علمائے منطق کا قول ہے۔ لا یحد ولا ینصور (سلم) بعض اوقات اس کی صفات کے بیان میں اس کی شان کو انسانی ذہن کے قریب کرنے کے لیے ایسا پیرایہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ جس سے انسانی دماغ مانوس ہوتا ہے اور اس پیرائے میں ایسے الفاظ استعمال کرنے پڑتے ہیں۔ جو مخلوق کی صفت و شان میں بھی مستعمل ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے ان آیات کو جن میں ایسا طریق بیان اور ایسے الفاظ وارد ہیں۔ مشابہت کہتے ہیں نہ کہ حقیقت کے لحاظ سے۔

ایسی صفات کے متعلق علمائے سنت کے دو مسلک ہیں۔ تفویض یعنی ان کی حقیقت سپرد خدا کرنا اور تاویل یعنی ظاہری معانی کو چھوڑ کر مجازی وغیرہ معنی مراد لینے۔ مسلک تفویض سے تو صاف ظاہر ہے کہ ان کی حقیقت اور اک انسانی سے پرے ہے اور مسلک تاویل بھی بتا رہا ہے کہ اس میں کلام کرنا علمائے راغبین کا کام ہے۔ پس ہر دو صورت ان کی حقیقت یا ان سے مراد عوام کی رسائی سے ہالا ہے۔ اس لیے سورہ فاتحہ میں جو سارے قرآن حکیم کا خلاصہ ہے اور سب کے یاد کرنے کی چیز ہے۔ ایسی صفات کا مطلقاً ذکر نہیں کیا گیا۔

دیگر اس وجہ سے کہ قرآن حکیم نے خود فیصلہ کر دیا ہے کہ مشابہات کا رجوع محکمات کی طرف ہے یعنی مشابہات کو محکمات کے ماتحت رکھ کر سمجھنا چاہیے۔ تاکہ تشبیہ کی افراط اور تعطیل محکم کی تفریط سے بچاؤ رہے۔ چنانچہ فرمایا:-

۴۲ تشبیہ یہ کہ صفات خداوندی کو حقیقتاً مخلوق کی صفات جیسا سمجھ کر اسے (معاذ اللہ)

ایک جسم قرار دیں جیسا کہ منشیہین کا مذہب ہے اور تعطیل یہ کہ تخریم کرتے کرتے اس کو صفات سے معطل کر دیں۔ یعنی ذات محض بغیر صفات کے اعتقاد کریں۔ یہ دونوں مسلک ضلالت ہیں۔ ایک میں افراط ہیں تو دوسرے میں تفریط۔ اور سلامتی اس میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کو جملہ صفات کمال اور نعوت جلال و جمال سے موصوف جانیں اور مخلوق کی مشابہت سے پرہیز کریں اور یہ کہیں کہ ان کی کیفیت اس کی ذات کی شان کے لائق ہے اور ہمارے علم و اور اک کی رسائی بس یہیں تک ہے۔ ولا یحیطون بہ علماً (طہ ۱۶)

هو الذی انزل علیک الکتاب منه آیت محکمات هن ام الکتاب و اخر منشاہات (آل عمران، پ ۳)

”(اللہ) وہی ہے جس نے اتاری تجھ پر یہ کتاب کہ اس کی بعض آیات محکمات ہیں کہ وہ جڑ ہیں کتاب کی اور بعض دیگر قشابات ہیں۔“

پس محکمات ام الاصول ہوئیں اور سورۃ فاتحہ میں بوجہ اس کے ام القرآن اور خلاصہ قرآن ہونے کے انہی م الاصول محکمات کا بیان مناسب تھا۔ اس لیے قشابات کے بیان سے استغنا کیا گیا۔

نکتہ نمبر ۴ :- ذات حق کی صفات کی ایک تقسیم یہ ہے کہ بعض ان میں سے جمالی ہیں۔ مثلاً ”ربوبیت، رحمانیت، رحیمیت اور بعض دیگر جلالی ہیں۔ پھر یہ جلالی بھی دو طرح پر ہیں۔ ایک وہ جن میں عظمت و شان اور کبریائی پائی جاتی ہے۔ دیگر وہ جن میں سطوت و جبروت، قہر و غلبہ اور مجرموں پر غضب پایا جاتا ہے۔ جمالی کا ذکر تو معلوم ہو چکا لیکن جلالی میں سے عظمت و شان والی کو تو صراحہ ”ذکر کیا اور غضب و قہر کا ذکر ضمناً کیا۔ جس طرح شرح ذکر ان شاء اللہ مالک یوم الدین اور غیر المغضوب علیہم میں آئے گا۔

ان ہر چہار صفات کی ترتیب

اسم ذات کے بعد اختصاص حمد میں چار صفات ذکر کی گئی ہیں۔ (۱) رب العالمین (۲) الرحمن (۳) الرحیم اور (۴) مالک یوم الدین۔ ان کو ترتیب میں اس لیے رکھا کہ اقرار فطرت کے بعد میدان نظر و استدلال میں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی عالمگیر ربوبیت کا نظارہ سامنے آتا ہے۔ دماغ اس کی علت و وجہ معلوم کرنی چاہتا ہے کہ یہ سلسلہ تربیت کیوں ہے تو جواب ملتا ہے کہ محض رحمت کے تقاضے سے ہے۔ پھر رحمت عام بھی ہے اور خاص بھی۔ عام وہ جس سے ایجاد و بقائے عالم ہے اور یہ تقاضا اسم الرحمن کا ہے اور خاص یہ کہ عاجز بندوں کی سعی و عمل کو رانیں نہ گنوائے بلکہ تقاضائے اولئک کان

۳۲ آیات قشابات کے متعلق مفصل ذکر ان شاء اللہ تعالیٰ سورۃ آل عمران میں اس آیت کی تفسیر میں ہو گا۔

سعیہم مشکور" ○ (بنی اسرائیل، پ ۱۵) اسے با شمر کرے اور یہ تقاضا ہے اسم رحیم کا۔ چنانچہ فرمایا۔ وکان بالمومنین رحیماً ○ (پ ۲۲) پھر اتنے انصاف پر اگر اعمال کی باز پرس اور مطیع و نافرمان میں امتیاز اور مظلوم کا انصاف نہ ہو تو یہ سارا سلسلہ عبث و بے کار سمجھا جائے۔ اس لیے دین (انصاف و جزا) کا ذکر کیا اور ”انصاف کے دن کو“ اپنے اسم مالک کی طرف مضاف کر کے اور حمد کے ماتحت رکھ کر جلال و جمال ہر دو امر ظاہر کر کے حامدین، عابدین، صالحین کو امید فضل عظیم و کرم عظیم دلائی اور جاحدین، غافلین اور فاسقین کو انذار کیا۔ لیکن لطف یہ ہے کہ ربوبیت عامہ، رحمانیت عامہ اور رحیمیت خاصہ سب صفات ظاہر الفاظ میں بیان کیں اور انذار اور ڈراوے کو لفظ دین یعنی انصاف و جزا کے پیٹ میں مخفی رکھا اور اس میں بھی ایک تصور لطف و کرم کا بھی رکھا۔ پس ساڑھے تین رحمت اور شفقت کے لیے اور صرف آدھا اظہار غضب کے لیے۔ گویا رحمتی وسعت کل شئی (اعراف، پ ۹) اور حدیث قدسی ان رحمتی وسعت غضبی (بخاری) کی شان اس میں بھی ملحوظ رکھی۔ اللھم ارحمنا آمین پس ہر چار صفات میں نہایت لطیف ترتیب ہے۔

ہدایت:- رب العالمین میں نعمت بقاء کی طرف اشارہ ہے کہ سب جہان و جہان والوں کی بقا و قیام اللہ ذوالجلال کی ربوبیت کا کرشمہ ہے اور الرحمن الرحیم (ثانی) میں جہان کی پیدائش و پرورش کا سر بتایا ہے کہ وہ محض رحمت کے تقاضے سے ہے۔ کسی سابقہ خدمت یا استحقاق سے یا مخلوق سے آئندہ نفع کی توقع پر نہیں جو محبوب ہے۔ وہ حادث و مخلوق بھی ہے۔ پس بسم اللہ میں جو الرحمن الرحیم ہے۔ وہ تین و تہمک کے لیے ہے اور یہاں وجہ و سر ربوبیت اور اختصاص محمودیت کے لیے ہے اور جب مقاصد مختلف ہوں۔ گو الفاظ ایک ہی ہوں تو تکرار ممنوع اور مغل فصاحت و بلاغت نہیں ہوتا۔ اس کے بعد مالک یوم الدین میں جزا و سزا، عدل و انصاف اور مکافات عمل کا ذکر کر کے انتہا اور رجوع کی طرف اشارہ کیا کہ آخر کار تم کو اپنے اعمال کی جو ادبی کے لیے اپنے مالک حقیقی کے سامنے کھڑا ہونا پڑے گا۔ اس دن سوائے اس کے کسی کی مالکیت، کسی کا حکم اور کسی کا

کچھ اختیار نہیں ہوگا۔ گویا یہ تینوں آیتیں منہ الابتداء و بہ البقاء والیہ الانتہاء کے بیان میں ہیں۔ صوفیائے کرام کے نزدیک معرفت کے یہی تین گرہیں اور یہی اصل توحید ہے۔ جب ان امور میں کوئی بھی اس کا شریک نہیں تو دوسروں میں جو انہی کی شاخیں ہیں۔ کوئی کیوں ہونے لگا؟

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ ان ہر سہ صفات کی ترتیب میں فرماتے ہیں:-
 ”حضرت حق تعالیٰ حمد را اول باسم ذات متعلق فرمود و بعد ازاں سہ صفت آورد۔ اول صفت ربوبیت، دوم صفت رحمت، سوم صفت جزا۔ دور آوردن ایں سہ صفت نکتہ ایست دقیق، و آں آنست کہ در عالم ہر کہ ستائش و ثنائے کسے میکند از سہ چیز بیرون نمی باشد، یا آنکہ در زمان سابق پر درود، نمک و مشمول نعمت او بودہ است، گو حالا از دے نفعے ندارد و نہ آیندہ توقع فائدہ، و یا آنکہ بالفعل از دے انتفاع وارد، گو در زمان سابق نہ داشت، و نہ آیندہ متوقع است، یا آنکہ توقع نفعے از آنکس وارد گو در زمان سابق و حال با و منتفع نشدہ است، و ایں ہر سہ چیز در عالم دنیا داری و دینداری بہ تجربہ میرسد چنانچہ پوشیدہ نیست، پس در آوردن ایں سہ صفت اشارہ بانست کہ اگر بندگاں راہ مروت روند، و حمد خدائے خود را بلا حلقہ نعمت ہائے سابقہ نمایند، تیر جائے آن وارد، کہ مرا صفت ربوبیت ثابت است، از سابق نعمت ہائے بے شمار برایشاں دارم و اگر بنعمتہائے عاجل نمایند آں نیز نقد وقت است کہ رحمان در حیم ام، و اگر آخر بینی دور اندیشی پیش گیرند، نیز شایان آنم، کہ کارخانہ جزا و ابستہ عن ست او بازگشت نقیر و قفیر بسوئے من، پس ہر صورت مستوجب حمد و ثناء ام۔“

امر الا تعبدوا الا اياه (يوسف)

الجزء الخامس

من تفسير الفاتحة

منهاج العابدين ومعراج السالكين

في منازل

اياك نعبد و اياك نستعين ○

ایک نعبد و ایک نستعین ○

”ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں“

ارتباط:- مالک یوم الدین تک صفات و محامدِ الہیہ کے جملہ اصول مذکور ہو چکے اور دین اسلام کے اعتقادی اصل الاصول (توحید مع صفات) کا بیان ختم ہوا کہ ذات حق الوہیت میں متفرد ہے۔ پس برکت اسی کے نام میں ہے اور سزاوار حمد بھی وہی ہے۔ ربوبیت میں واحد ہے۔ پس وہی مستحق عبادت ہے۔ محض شفقت و رحمت سے تم پر مہربانیوں کا سایہ کیے ہوئے ہے۔ اپنے سوا تمہیں کسی کے رحم پر نہیں چھوڑ رکھا۔ اعمال کی جزا کے لیے جس دن تم حاضر کیے جاؤ گے۔ انصاف اسی صاحب حمد و ثناء کے ہاتھ میں ہو گا۔ اس کے سوا کوئی دوسرا مالک و مختار نہیں ہو گا۔ پس اس کے دروازے سے ہٹ کر کسی اور کے دروازے پر جانا جائز نہیں۔ اس کے بعد عملی حصے کا بیان شروع کیا اور عمل میں سب سے بڑی چیز عبادتِ الہیہ ہے۔ کیونکہ ایسے مہربان مالک کی تعظیم سے بڑی نسبت اسی امر کو ہے۔ اس لیے فرمایا:- ایک نعبد و ایک نستعین یعنی (خداوند جس کی یہ شان ہے جو بیان ہو چکی) ہم تیری عبادت کرتے ہیں اور ہم تجھے ہی سے مدد چاہتے ہیں اور اس میں صیغہ غائب سے صیغہ خطاب کی طرف التفات اس لیے کی کہ اللہ تعالیٰ کی صفات مذکورہ بالا کے تصور استغراق سے خصوصاً ”قیامت کی حاضری کے خیال سے ایک حالت کشفی و حضوری طاری ہو جاتی ہے یا ہو جانی چاہئے یا ہو سکتی ہے۔ چنانچہ دوسرے مقام پر اس کا نقشہ یوں کھینچا ہے:-

الایظن اولئک انہم مبعوثون لیوم عظیم ○ یوم یقوم الناس لرب العالمین ○ (سورہ مطففین، پ ۳۰)

۱۰۰ علم معانی میں التفات یہ ہے کہ حکم، مخاطب اور غائب کے صیغوں کو کسی نکتے کے لیے ایک دوسرے کی بجائے استعمال کیا جائے۔ اس کی تفصیل و قواعد کتب بلاغت مثل مطول، مختصر معانی وغیرہ میں مذکور ہیں۔

”کیا ان لوگوں کو کھٹکتا نہیں کہ اس بڑے دن میں جب تمام لوگ اللہ رب العالمین کے حضور کھڑے ہونگے تو یہ (کم تولنے والے) بھی سامنے کھڑے کیے جائیں گے۔“

پس استغراق تصور سے کشفی حالت پیدا ہو جاتی ہے اور تجلیات الہیہ نازل ہو کر حضور کا رتبہ حاصل کراتی ہیں اور اس حضور ﷺ حالت میں صیغہ خطاب ہی مناسب ہے۔ دیگر یہ کہ جو ذات ہمارے وہم سے پرے خیال سے بالا اور جنس و مثال سے پاک ہو اور ہم اسے اپنے ان حواس سے نہیں پاسکتے۔ یا یوں کہیں کہ جب انسان کو ان دیکھے اور بے مثال خدا کی پرستش مشکل نظر آئی۔ (اور اس سے انکار کی صورت تو ممکن نہیں کیونکہ اس کا اقرار ہماری فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے) تو انسان کے وہم پرست دماغ نے وحی ربانی کی رہنمائی کے خلاف اللہ جل شانہ کی صفات کی تصویریں بنائیں، بت تراشے، مقدس انسانوں کو اسکا اوتار و مظہر و بروز قرار دیا اور کائنات ارضی و سماوی میں ان کو مختار و متصرف اعتقاد کیا اور ان کی پرستش شروع کر دی۔ پھر اس سے گذر کر طرح طرح کی عناصر پرستی جاری ہو گئی کہ دریاؤں (گنگا، جمنا)، پہاڑوں (جوالا کبھی)، درختوں (ہتھیل)، چوپایوں (گائے)، پرندوں (نیل کنٹھ)، سورج، چاند اور ستاروں بلکہ پتھروں کی بھی عبادت ہونے لگی۔ قرآن مجید نے انسانی دماغ کو ان سب توہمات سے پاک کرنا چاہا کہ خدا کے سوا ان سب اشیاء کو جن فوائد کی وجہ سے معبود گردانتے ہیں۔ ان سب کی بابت سمجھا دیا بلکہ دماغ میں اتار دیا کہ یہ سب اللہ تبارک و تعالیٰ کے انعامات ہیں۔ جن سے وہ اپنے بندوں کی تربیت کرتا ہے۔ اس نے ان کو اسی ارادے سے پیدا کیا اور ان میں یہ منافع رکھے ہیں۔ یہ سب فوائد کے پہنچانے میں خدا کے حکم کے ماتحت ہیں۔ پس ان انعاموں سے فائدہ اٹھا کر منعم سے لو لگاؤ اور اسی کے گیت گاؤ اور اسی کا احسان مانو۔

لکھ اسی مقام پر نماز میں وہ حالت ہو سکتی ہے، جس کی نسبت حدیث جبرائیلؑ میں وارد ہے ان نبیوں کا ایک تہراہ (ملکوتہ) یعنی تو اپنے رب کی عبادت ایسے طور پر کرے گویا تو اسے دیکھ رہا ہے اور اس مقام کے حاصل کرانے والی آیت یہی ایک نعبہ ہے اور یہ سب راز کاف خطاب میں مرکوز و مضمحل ہیں۔ اللہم ارزقنا

میں نے ان سب کو تمہارے قاندے کے لیے پیدا کیا۔ چنانچہ فرمایا:-

ومن آياته الليل والنهار والشمس والقمر لا تسجدوا للشمس ولا للقمر و
لسجدوا لله الذى خلقهن لن كنتم ايّاه تعبدون ○ (تم فصلت، پ ۲۳)

”اور اللہ کی نشانیوں میں سے رات بھی ہے اور دن بھی اور سورج بھی اور چاند بھی“ (تو) تم سورج اور چاند کو سجدہ نہ کرو اور (صرف) اللہ کو سجدہ کرو۔ جس نے ان کو پیدا کیا۔ اگر تم اسی کی عبادت کا دعویٰ کرتے ہو۔“

اول تو نماز کی ہیئت ترکیبی (دست بستہ قیام، رکوع اور سجود) ہی ایسی بتائی کہ تواضع و انکساری، خشوع و خضوع اور مسکنت و خشیت اس کی وضع سے ظاہر ہے۔ پھر اس میں سورہ فاتحہ کی قرأت سکھائی کہ اس میں تمام عالم میں اللہ کی ربوبیت کی جلوہ نمائی اس کی رحمانیت و رحیمیت کی کرم فرمائی سامنے آکر اس کی عظمت و کبریائی کا شہود ہونے لگتا ہے اور محاسبہ اعمال کے لیے اس کے حضور کھڑا ہونا یاد آکر اس مقام پر پہنچا دیتا ہے کہ بس ہم اس کے سامنے ہی کھڑے ہیں اور عرض و معروض کر رہے ہیں۔ حقیقی حضور قلب واقعی سکون خاطر اور خشیت کے پیدا کرنے کے لیے اس سے بڑھ کر پاک اور بے لوث موثر نہیں ہو سکتا اور یہ سب کچھ سورہ فاتحہ کی ان مختصر آیتوں میں ہے اور اس سارے مضمون کی وسعت ایسا کہ نبی کے صیغہ خطاب میں سمیٹ دی گئی ہے۔

نبی پاک ﷺ کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ آپ نے خدائے بے مثال کی معرفت و عبادت بغیر کسی خارجی صورت و نمونہ کے خود اس کے جلال و جمال اور عظمت و کمال سے سمجھائی اور پھر یہ کہ اس راہ کے سالکین کو منزل مقصود کے اعلیٰ سیج پر پہنچا بھی دیا، جس سے گوہر مقصود بھی ہاتھ آگیا اور مشرکانہ توہمات کی بلا سے بھی محفوظ رہے۔ اللہم صل وسلم علیہ قرآن مجید کے اس طریق تعلیم کا رتبہ بہت بلند ہے اور ان جملہ طریقوں سے از بس بالا ہے جو انسانی دماغ نے اختراع کیے کیوں کہ خدائے بے مثال کی صفات کی تصویریں بنا کر اور انبیاء کرامؑ فرشتوں اور صالحین کو اس کے مظہر و بروز یا اوتار قرار دے کر اور ان کے بت بنا کر اور ان کی ارواح کو حاضر ناظر سمجھ کر عبادت کرنے میں شرک تو ظاہر ہے لیکن اس کے علاوہ یہ خرابی بھی ہے کہ ان سب صورتوں میں علو سے پستی کی طرف تزلزل ہوتا ہے اور ان سب مادی چیزوں اور وہی باتوں سے بالا

ترہو کہ اللہ کی ربوبیت اور اس کی رحیمیت اور اس کی مالکیت کے دروازے سے اس کے حرم پاک یا حظیرۃ القدس میں داخل ہونا یا اس کی ان صفات کے آئینہ سے اس کے جلال و جمال اور عظمت و کمال کا مشاہدہ کرنا حقیقی معرفت ہے اور اس میں دماغ کی ترقی و بلندی ہے۔ اسی لیے نماز کے لیے کہا گیا ہے۔ الصلوۃ معراج المومنین بلکہ یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ انسانی روح کو اس کے حقیقی مرتبہ کے مناسب طائران قدس کی مجلس میں شامل کر دیا، نہ یہ کہ اسے اس کے مرتبے سے گرا کر اسفل ساقطین بنا دیا۔ چنانچہ دوسرے موقع پر اس کی حقیقت کو یوں ظاہر کیا ہے۔ لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم ○ ثم رددنا السفلى ساقطین ○ الا للذین امنوا و عملوا الصلحت (التین) پ ۳۰ یعنی ہم نے انسان کو بہتر سے بہتر ساخت میں پیدا کیا ہے۔ پھر اسے (اس کی پست خیالیوں کی پاداش میں) پست سے پست کر دیا مگر ان لوگوں کو جو (ہماری ہدایت کے مطابق) ایمان رکھتے ہیں اور نیک اعمال بجالاتے ہیں۔

قائدیت۔ حضرت شاہ عبدالغفور صاحبؒ فرماتے ہیں کہ اس سورت (فاتحہ) کو اللہ تعالیٰ نے بندوں کی زبان پر نازل فرمایا کہ وہ اس طرح کما کریں۔

لیاک نعبد میں مفصل کو یعنی کاف ضمیر کو اس کے عالِ نعبد پر مقدم کیا۔ واسطے حصر اور اختصار کے، جس کے رو سے معنی یہ ہو گئے کہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں نہ کہ کسی اور کی۔ یہ قاعدہ بلاغت کلام میں داخل ہے۔ (مختصر مطانی)

لفظ لیا کے حلق ائمہ نجات کے تین اقوال ہیں۔ اول! یہ کہ ضمیر منفصل منصوب ہے اور کاف، ی اور ہ جو اس کے ساتھ ملحق ہوتے ہیں۔ وہ تعینین خطاب و تلکم و غیبت کے لیے ہوتے ہیں۔ دوم! یہ کہ ضمیریں تو کاف، ی اور ہ ہی ہیں لیکن چونکہ یہ اپنے عال سے منفصل ہو کر اور اکیلی رہ کر لفظ میں کمزور تھیں اور ابتداء میں کمزور کلمہ مناسب نہیں۔ اس لیے ان کو پروزن اور مضبوط کرنے کے لیے لیا کا سارا دیا گیا۔ تاکہ ان کی کمزوری بھی دور ہو جائے اور اپنے عال سے منفصل و مقدم ہو کر مفید حصر بھی ہو سکیں۔ سوم! یہ کہ لیا اور ک ہر دو مل کر مجموعہ ضمیر ہے اور اسے کئی طرح پر پڑھنا جائز ہے۔ لیا (بکسر الهمزة و تشدید الیا) لیا (فتح الهمزة و تشدید الیا) یا (بایدال الهمزة و تشدید الیا) (ابو السعد بتشریح ما)

اور اس جگہ تقدیم مفعول کی وجہ یہ کہ عبادت صرف اللہ تعالیٰ کا حق ہے۔ اس لیے کہ خالق و پروردگار وہی ہے۔ نیز عبادت کی جزا کا مالک بھی وہی ہے۔ ان امور میں کسی اور کو کچھ بھی دخل نہیں۔ نہ خالقیت میں نہ ربوبیت میں اور نہ مالک جزا ہونے میں۔ چنانچہ فرمایا:-

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝
الَّذِي جَعَلَ لَكُمْ الْأَرْضَ فَرَشًا وَالسَّمَاءَ بِنَاءً وَأَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَخَرَجَ بِهِ
مِنَ الشَّجَرِ رِزْقًا لَكُمْ فَلَا تَجْعَلُوا لِلَّهِ أَندَادًا وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۝ (پ ۱)

”اے لوگو! عبادت کرو اپنے پروردگار کی جس نے تم کو (بھی) پیدا کیا اور تم سے پہلوں کو (بھی) تاکہ تم (غضب سے) بچ جاؤ۔ (اس کے بعد سلسلہ ربوبیت کی تفصیل ذکر کی اور فرمایا:-) جس (خدا) نے تمہارے لیے زمین کو فرش بنایا اور آسمان کو چھت اور آسمان (کی طرف) سے پانی اتار کر تمہاری روزی کے لیے اناج اور قسم قسم کے میوہ جات پیدا کیے۔ پس تم اللہ کے شریک نہ بناؤ اور تم (یہ سب کچھ) جانتے ہو۔“ نیز فرمایا:-

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ هَلْ مِنْ خَلْقٍ غَيْرِ اللَّهِ يَرْزُقُكُمْ مِنَ
السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبُوا اللَّهُ ۝ (فاطر پ ۲۲)

”اے لوگو! یاد کرو اللہ کی نعمت جو تم پر ہے۔ کیا سوائے اللہ کے کوئی (دوسرا) خالق ہے؟ جو تم کو آسمان سے اور زمین سے روزی پہنچائے۔ اس کے سوا کوئی بھی لائق عبادت نہیں، مگر وہی۔ پس تم کدھر بھیجے جا رہے ہو؟“ نیز فرمایا:-

قُلْ إِنِّي أَمَرْتُ أَنْ عِبُدَ اللَّهَ مُخْلِصًا لَهُ الدِّينَ وَالْعُرْتُ لَأَنْ أَكُونَ مِنَ الْمُسْلِمِينَ ۝
قُلْ إِنِّي أَخَافُ أَنْ عَصَيْتُ رِسْمَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ۝ (زمر پ ۲۲)

”اے پیغمبر! (ان سے) کہو کہ مجھے تو یہ حکم ہوا ہے کہ میں صرف اللہ کی عبادت کروں۔ خالص کرتا ہوا واسطے اسی کے دین کو اور مجھے (یہ بھی) حکم ہوا ہے کہ میں سب سے پہلا فرمانبردار ہوں۔ (اے پیغمبر! ان سے یہ بھی) کہہ دو کہ اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے بڑے دن کے عذاب سے ڈر لگتا ہے۔“

چونکہ اس جگہ ایاک نعبد سے پختہ اسی ربوبیت عالمہ اور رحمانیت و رحیمیت اور روز جزا کی خصوصی مالکیت کا ذکر ہے۔ اس لیے اس موقع پر ہر عبادت کی صورت

نہایت موزوں و مناسب ہے۔

دوسری وجہ حصر کی یہ ہے کہ آدمی کے احوال تین زمانوں کے متعلق ہیں۔ اول ماضی، دوم حال میں اور سوم استقبال میں اور ان تینوں میں وہ اللہ تعالیٰ کا محتاج ہے اور ان میں اس کا نگران حال سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی نہیں۔ اس کی تفصیل یوں ہے کہ زمانہ ماضی میں ایک وقت تھا کہ اس میں انسان بالکل موجود نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے کرم سے اسے نطفہ آب اور مغذ گوشت کی صورت میں بنایا اور اس میں جان ڈالی۔ اس وقت یہ نہایت ضعیف و ناتوان اور بالکل نادان تھا۔ اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل سے اسے توانائی اور دائمی بخشی اور نیکی بدی اور نفع و نقصان کی تمیز عطا کی اور ہر طرح کی نعمت سے نوازا۔ اب انسان زمانہ حال میں یعنی اس عالم میں اللہ تعالیٰ کی ظاہری و باطنی نعمتوں میں زندگی گزارتا ہے۔ جن میں وہ اللہ کا بے حد محتاج ہے۔ اس کے بعد اسے سفر عاقبت یعنی عالم جزا میں پیش آنے والا ہے۔ جس کی بابت ارشاد ہے کہ یہ کارخانہ دنیا درہم برہم ہو جائے گا تو انسان اپنے اعمال کی جزا کے لیے اپنے خداوند کے حضور پیش ہوگا۔ چنانچہ فرمایا:۔

يَا أَيُّهَا الْإِنْسَانُ إِنَّكَ كَادِحٌ إِلَىٰ رَبِّكَ كَدْحًا ۖ فَمَلَأْهُ ۖ (الشقاق، پ ۳۰)
”اے (عافل) انسان تجھے ضرور ضرور اپنے پروردگار کے حضور گھٹ گھٹ کر پہنچنا ہے اور پھر اس سے ملنا ہے۔“

ان ہر سہ زمانوں میں انسان اللہ کے قبضے اور اختیار میں ہے اور ان ہر سہ میں اسی کا محتاج ہے۔ پس سوائے اللہ کے کسی اور کی عبادت کی کوئی وجہ اور گنجائش نہ ہو سکی۔ لہذا عبادت کو صرف اللہ تعالیٰ کے لیے حصر کرنا ضروری ہوا۔
ان ہر سہ زمانوں کے متعلق قرآن مجید میں کثرت سے آیات ہیں۔ لیکن ہم طوالت کے خوف سے ان کو نقل نہیں کر سکتے۔

عبادت نہایت درجے کی عاجزی اور تذلل کو کہتے ہیں۔ چنانچہ اس راستے کو جو بہت پائمال ہو اور اس پر گزر زیادہ ہو۔ اسے طریق معبدی تذلل کہتے ہیں۔ چنانچہ لسان العرب میں ہے۔ المعبد المذل و التبعذ التذلل نیز کہا ہے۔ طریق معبد سلوک اور ظاہر ہے کہ نہایت درجے کی عاجزی نہایت درجے کی شان والی ذات کے

ماننے کرنی چاہیے۔ اس لیے اسلام نے یہ تذلل و عاجزی سوائے ذات حق کے کسی اور کے لیے جائز نہیں رکھی۔ پس ذات حق کے لیے حصر عبادت کی یہ بھی ایک وجہ ہے۔

اس بیان سے یہ واضح ہو سکتا ہے کہ عبادت، عبادت کنندہ کے لحاظ سے تو نہایت درجے کی عاجزی ہوتی ہے لیکن اس میں معبود کی نہایت درجے کی تعظیم ہوتی ہے۔ پس ہر امر و ہر حالت میں جس سے یہ مفہوم ظاہر ہو کہ اس میں عابد کی نہایت درجے کی ذلت اور معبود کی نہایت درجے کی عزت و تعظیم پائی جائے، وہ عبادت ہے اور یہ تین طرح پر ادا ہو سکتی ہے۔

www.KitaboSunnat.com

اول، زبان سے :- جیسے حمد و ثناء، ورد و وظیفہ اور دعا وغیرہ۔

دوم، بدن سے :- جیسے سجدہ، نماز، روزہ، حج، طواف وغیرہ۔

سوم، مال سے :- جیسے زکوٰۃ، صدقہ، خیرات، قربانی، نذر، نیاز وغیرہ۔

یہ سب اقسام صرف اللہ تعالیٰ کے لیے یعنی اس کی رضا اور قرب حاصل کرنے کے لیے ادا کرنی چاہیں۔ ان میں کسی غیر کی شرکت جائز نہیں۔ ایسا کہ نبی میں حصر کا مفاد یہی ہے۔ چنانچہ حضرت ابن عباسؓ سے اس کے یہ معنی منقول ہیں۔ نبیؐ کا معبود و لا معبود غیرہ (ابن السعد، ص ۱۵۶) یعنی ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تیرے سوا کسی اور کی نہیں کرتے۔

تشدد نماز میں جو وظیفہ آنحضور ﷺ نے سکھایا ہے۔ اس میں یہ سب اقسام اللہ تعالیٰ سے مخصوص کر دیئے ہیں۔ التیمات یعنی جملہ تحیات یعنی زبان کی حمد و ثناء اور ورد و طائف لہٰ خدا کے لیے ہیں۔ والصلوات اور سب بدنی عبادات بھی مثلاً نماز، حج اور سفر زیارت وغیرہ۔ والعیات اور سب مالی صدقات و خیرات و نذر و نیاز قربانی اور چڑھاوے بھی جو پاک مال سے دیئے جائیں۔ (سب اللہ ہی کے لیے خاص ہیں) وایاک نستعین اور ہم تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔ اس میں بھی ایسا کہ مقدم ذکر کیا کہ عبادت کی طرح استعانت بھی ذات باری سے مختص ثابت ہو اور ایسا کہ مکرر بھی ذکر کیا کہ عبادت و استعانت ہر دو مقصود بالذات ظاہر ہوں۔ نیز اس لیے کہ یہ وقت اللہ کے سامنے حاضری اور مناجات و خطاب کا ہے۔ جیسا کہ سابقاً ذکر التفات میں گزر چکا اور

مقام حضور و مناجات میں صیغہ خطاب کو کرر لانے میں حکم کو لذت حاصل ہوتی ہے اور اس کا شوق و ذوق بڑھتا ہے۔ حاصل یہ کہ اللہ کے سوا کسی کی بھی عبادت جائز نہیں اور نہ ان امور میں جو اس سے مخصوص ہیں۔ کسی اور سے استعانت و استدراودا ہے، جیسا کہ ان شاء اللہ منسل ذکر ہو گا۔

عبادت کے بعد استعانت کے ذکر کی دو وجہیں ہیں۔

اول: یہ کہ مقام عبادت و عیونیت میں قائم ہونا اور اسے کماحقہ انجام دینا، اللہ تعالیٰ کی مدد و توفیق کے سوا نہیں ہو سکتا۔ اس لیے نعبد کے بعد اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرنے کے لیے نستعین کہا۔

دوم: یہ کہ طلب مدد اور دعا بھی عبادت کی ایک قسم ہے اور امر عبادت میں نہایت متم باطن ہے۔ اس لیے اسے خصوصیت سے ذکر کیا۔ چنانچہ حدیث میں وارد ہے۔ الدعاء من العبادۃ (بلوغ) یعنی دعا عبادت کا گودہ ہے۔ نیز فرمایا۔ الدعاء هو العبادۃ (حسن) یعنی دعا ہی عبادت ہے۔ پھر آپؐ نے یہ آیت پڑھی۔

و قل ربکم لاعونى استجب لکم لن الذین یستکبرون عن عبادتى
سیدخلون جہنم طاجرین ○ (مومن، پ ۲۲)

”تمہارے رب نے فرمایا ہے کہ مجھ سے دعا کرو۔ میں قبول کروں گا۔ بے شک جو لوگ میری عبادت سے تکبر کرتے ہیں۔ وہ عنقریب نہایت خواری کی حالت میں جہنم میں پڑے ہوں گے۔“

اس آیت میں دعا کو عبادت کہا ہے۔ دعا کے عبادت ہونے کی وجہ یہ ہے کہ بندے کا تعلق قلبی اللہ کے ساتھ اسی وقت درست و مضبوط ہوتا ہے۔ جب وہ اپنی حاجات و مشکلات میں صرف اسی کی طرف رجوع کرے اور ہر نیکی کی دعوت تھی۔ یقوم اعبدوا اللہ مالکم من الہ غیرہ (ہود، پ ۱۳) یعنی میرے بھائیو! تم خدا کی عبادت کرو۔ اس کے سوا تمہارا کوئی بھی (سچا) معبود نہیں ہے۔

نیز تصریحاً فرمایا۔ و ما ارسلنا من قبلک من رسول الا نوحى الیہ لہ لا الہ الا ناعبدون ○ (انجاء، پ ۱۷)

”اے پیغمبر! تجھ سے پیشتر ہم نے جو بھی پیغمبر بھیجا۔ ہم اس کی طرف ہی وحی

کرتے رہے ہیں کہ میرے سوا کوئی بھی معبود برحق نہیں ہے۔ پس تم میری ہی عبادت کرو۔“

ولا ذکر اسم ربك وتبتل اليه تبتيلا (مزل، پ ۲۹) کا حکم اسی رابطہ کو قائم کرنے کے لیے ہے۔ یعنی اپنے پروردگار کے اسم کا ذکر کر اور سب سے توڑ کر اسی سے جوڑ لے۔ اور فلاحوا لله مخلصين له الدين (زمر، پ ۲۳) کی حقیقت یہی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ سے دعا کرو۔ خالص کرتے ہوئے واسطے اسی کے دین (اطاعت بندگی) کو۔

اسی اختصاص و حصر کے لیے کلمہ توحید میں تمام غیر اللہ کی نفی کر کے الوہیت کو صرف اللہ کے لیے ثابت رکھا ہے۔ چنانچہ فرمایا۔ فاعلم انه لا اله الا الله (محمد، پ ۳۱) یعنی اے پیغمبر! تو یقین کر کہ اللہ کے سوا کوئی بھی عبادت کے لائق نہیں ہے۔ پس جب تک انسان تمام غیر اللہ سے حلق توڑ کر مقام الوہیت کو ذات حق سے مخصوص نہ کر دے اور تمام ان امور میں جو مختص بذات باری تعالیٰ ہیں۔ استدعا و استعانت اور استعاذہ و قریاد خاص اللہ تعالیٰ سے نہ کرے۔ وہ خدا کی عطا کے مطابق خاص اس کا پرستار نہیں کہلا سکتا۔ اور آیت ایاک نعبد و ایاک نستعین کے دعوے میں سچا نہیں اتر سکتا۔

رسوم شرکیہ اور خفی مذہبیت۔ چونکہ عوام میں یہ غلطی عام طور پر پھیلی ہوئی ہے کہ حضرات انبیاء کرامؑ اور اولیائے کرامؑ اور ان کی قیور بالخصوص تعزیر حضرت حسینؑ اور ان کی نذر و نیاز کے حلق جو بھی امور (شرکیہ) اور رسوم (بدعیہ) مردج ہیں۔ وہ سب خفی مذہب میں درست ہیں۔ اس لیے ہم اس غلطی کو رفع کرنے کے لیے خفی مذہب کے بعض حوالے ذکر کرتے ہیں۔ جن میں ایسے امور کو بالکل باطل و حرام قرار دیا گیا ہے۔

حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی مابدمذہب میں فرماتے ہیں:-

”بندگان خاص الہی را در محفل واجب شریک دلشنن یا آتمار اور عبادت شریک ساتھن کمر است، چنانچہ دیگر کفار بانکار انبیاء کافر شدند، چنانچہ نصاریٰ حضرت عیسیٰؑ را پر خدا و شرکین عرب ملا کہ را دختران خدا گفتند و علم غیب بانما مسلم دلشنند کافر شدند، انبیاء و ملا کہ را در محفل الہی شریک نباید کرد، و غیر انبیاء را اور

صفات انبیاء شریک نباید کرد۔“ (کتاب الایمان، ص ۱۱-۱۲)

واعلم ان النذر الذی یقع للاموات من اکثر العوام و ما یؤخذ من الدراهم و الشمع و الزيت و نحوها الی ضرائح الاولیاء الکرام تقرباً الیهم فهو بالاجماع باطل و حرام (در مختار، ص ۹۴)

”اور جان تو کہ نذر جو اکثر عوام کی طرف سے مردوں کے لیے واقع ہوتی ہے اور جو کچھ اولیائے کرام کی قبروں پر پیسے اور موم بتی اور تیل وغیرہ کی جنس سے لے جائے جاتے ہیں۔ تاکہ ان (اولیاء) کا قرب حاصل ہو تو یہ سب بالاتفاق باطل اور حرام ہے۔“

ازالہ شبہات:- بعض لوگ جو جہالت کے باعث یا مشرک قوموں میں بود و باش رکھنے کی وجہ سے شرک کی توہمات میں مبتلا ہیں اور توحید کے متعلق اسلام کی امتیازی تعلیم سے نا آشنا ہیں۔ وہ کہا کرتے ہیں کہ ہم بزرگوں کو صرف اللہ کی درگاہ میں وسیلہ گردان کر ان سے دعائیں کرتے ہیں۔ وہ ہماری سفارش کرتے ہیں تو ان کے ذریعے سے دعا جلد قبول ہو جاتی ہے۔ نیز ان کے نام کے چڑھائے اور نذریں و نیازیں سب کچھ اللہ ہی کا قرب حاصل کرنے کے لیے دیتے ہیں۔ ورنہ یہ تو ہم بھی جانتے اور مانتے ہیں کہ سوائے اللہ کے کوئی کچھ بھی نہیں کر سکتا اور اس کا کوئی بھی شریک نہیں ہے۔

یہ ایک شبہ ہے جو ان بے چاروں کو جہالت کی وجہ سے عارض ہو گیا ہے اور اس کا ازالہ یوں ہے کہ انہوں نے دیگر مشرک قوموں کے حالات و توہمات پر تنقیدی نظر نہیں کیا اور اس بات کو کبھی نہیں سوچا کہ اگر یہ صورت پسندیدہ خدا تھی تو آنحضرت ﷺ کے مبعوث ہونے کی کیا حاجت تھی اور قرآن کریم کے نازل ہونے کی کیا ضرورت تھی اور پھر آنحضور ﷺ نے توحید کے متعلق دنیا میں کیا اصلاح کی؟۔ کیوں کہ یہ سب توہمات اور رسوم شرکیہ اسلام سے پیشتر عرب و ایران، مصر و یونان، چین و ہندوستان وغیرہ تمام ممالک میں موجود تھے اور سب مشرک قومیں اپنے من دون اللہ معبودوں کی نسبت یہی اعتقاد و خیال رکھتی ہیں اور اسی خیال سے ان کی پرستش کرتی ہیں کہ یہ اللہ کے اور ہمارے درمیان واسطہ ہیں اور اس کے ہاں ہماری سفارش کرتے ہیں۔ ان کی رضا جوئی خدا کی رضا جوئی ہے اور ان کی معرفت دعائیں جلد قبول ہوتی ہیں اور حاجات فوراً

پوری ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ مشرکین مکہ کی بابت فرمایا:-

ويعملون من دون الله مالا يضرهم ولا ينفعهم ويقولون هؤلاء شفعا عند الله قل اتنبون الله بما لا يعلم في السموات ولا في الارض سبحنه و تعالى عما يشركون ○ (يونس، پ ۱۱)

”اور پوچھتے ہیں اللہ کے سوا ان چیزوں کو جو نہیں ضرر دیتیں ان کو اور نہ نفع دیتیں اور کہتے ہیں کہ یہ ہمارے سفارشی ہیں خدا کے پاس۔ (اے پیغمبر! ان سے) کہو کیا تم بتاتے ہو اللہ کو وہ شے جسے وہ آسمانوں میں اور زمین میں نہیں جانتا۔ وہ پاک ہے اور بہت بلند ہے اس سے جو تم شریک ٹھراتے ہو۔“

اسی طرح سورہ زمر میں فرمایا:- لانا نزلنا اليك الكتاب بالحق فاعبد الله مخلصاً له الدين ○ الا لله الدين الخالص والذين اتخذوا من دونه اولياء ما نعبدهم الا ليقربونا الى الله زلفى (زمر، پ ۲۳)

”(اے پیغمبر!) ہم نے یہ کتاب تیری طرف تحقیق اتاری ہے۔ پس تو عبادت کر خدا کی، خالص کرتے ہوئے واسطے اسی کے بندگی کو۔ یاد رکھو! واسطے اللہ ہی کے ہے خالص بندگی اور جن لوگوں نے اس کے سوا حمایتی گردان لیے ہیں۔ (وہ کہتے ہیں) کہ ہم تو ان کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ وہ ہم کو قرب میں خدا کے نزدیک کر دیں۔“

ان آیتوں سے صاف ظاہر ہے کہ مکہ کے مشرک اپنے غیر اللہ معبودوں کی عبادت ان کو خدا سمجھ کر نہیں کرتے تھے بلکہ ان کو خدا اور اپنے درمیان واسطہ اور سفارشی جانتے تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اسے شرک اور توحید خالص کے خلاف قرار دیا۔ اسی خیال سے غیر اللہ کی پرستش ہوتی ہے اور اسی سے بت پرستی تک نوبت جا پہنچتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کو ایسی عبادت ہرگز منظور نہیں۔ وہ بلا شرک کے خالص عبادت چاہتا ہے۔ اسی کے لیے آنحضرت ﷺ مبعوث ہوئے اور اسی کے لیے آپ پر چشمہ ہدایت ”قرآن مجید“ اترآ۔ جیسا کہ سورہ زمر کی آیت میں خود اللہ تعالیٰ نے فرمادیا۔

نکتہ غریبہ:- واسطہ اور ذریعہ ہدایت میں ہوتا ہے نہ کہ عبادت میں۔ مشرک قوموں کو غلطی جو لگی تو اسی سے لگی کہ انہوں نے عبادت اور ہدایت میں فرق نہ کیا۔

انبیاءؑ خدا کی شریعت اور اس کی عبادت کا طریق حاصل ہونے میں واسطہ ہوتے ہیں کہ وہ اللہ کی وحی سے علم پا کر خلقت کو بتاتے ہیں۔ وہ اس لیے نہیں آتے کہ ان کی تصویر یا بت یا قبر کو سامنے رکھ کر عبادت کی جائے یا ان کی ارواح طیبہ کو حاضر تا غریبان کر ان کی درگاہ میں استعاذہ و فریاد کر کے دعا و التجا کی جائے اور ان کو خدا اور بندے کے درمیان دربارہ عبادت واسطہ قرار دے کر نفس عبادت میں ان کو ساجھی و حصہ دار ٹھہرایا جائے۔ چنانچہ نہایت تفصیل سے فرمایا:-

ما كان لبشر ان يوتيّه الله الكتاب والحكم والنبوة ثم يقول للناس كونوا عباداً لى من دون الله ولكن كونوا ربانيين بما كنتم تعلمون الكتاب وبما كنتم تدرسون ○ ولا يامركم ان تتخذوا المملكة والنبيين ارباباً، يامركم بالكفر بعد لانتم مسلمون ○ (آل عمران، پ ۳)

”کسی بشر کا کام نہیں کہ دے خدا اس کو کتاب اور دانائی اور نبوت پھر وہ لوگوں سے کہے کہ تم خدا کے علاوہ میرے بندے بن جاؤ لیکن (کہے گا) ہو جاؤ تم ربانی موافق اس کے جو تم تعلیم کرتے رہے کتاب (اللہ) کی اور مطابقی اس کے جو تم (کتاب اللہ) پڑھتے رہے اور نہ یہ کہہ سکتا ہے کہ گردانو تم فرشتوں کو اور انبیاء کو رب۔ کیا حکم کرے گا تم کو کفر کا بعد اس کے کہ تم مسلمان ہو چکے ہو۔“

یہی وہ شرک ہے۔ جسے مٹانے کے لیے آنحضور ﷺ مبعوث ہوئے اور اسی سے بچانے کے لیے آپؐ نے اپنی ذات گرامی کی پست بھی عیدہ و رسولہ کا اقرار سکھایا اور اسے کلمہ شہادت کا جزو لازم قرار دیا کہ بغیر اس کے قعدہ نماز تمام نہیں ہوتا اور قعدہ نماز کا ایک عظیم رکن ہے۔ اور یہی وہ شرک ہے جس سے آنحضور ﷺ نے پہلی گمراہ امتوں کے حالات سے متنبہ کر کے ڈرادیا۔

☆ عن عائشة قالت قال رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم فى مرضه الذى لم يقم منه لعن الله اليهود والنصارى اتخذوا قبور انبيائهم مساجد (الحديث) (بخاری، ص ۱۵۹)

”حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی اس بیماری میں جس میں آپؐ کی وفات ہوئی، فرمایا کہ یہود و نصاریٰ پر اللہ کی لعنت ہو کہ انہوں نے اپنے

انبیاء کرامؑ کی قبروں کو مسجد میں بنالیا۔“

☆ عن عائشة قالت لما ائتمت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ذکرک بعض نسائه کنیسة رابینہا بلارض الحبشة یقل لها ماریة وکانت ام سلمة وام حبیبة اتتا لارض الحبشة فذکرنا من حسنہا و تصلویر فیہا فرفع راسہ فقل لولک لئامات منهم الرجل الصالح بنو اعلی قبرہ مسجد اثم صور ولقیہ تلک الصورة لولک شرار الخلق عند اللہ (بخاری، ص ۱۵۲)

”نیز انہی سے روایت ہے کہ جب آنحضور ﷺ بیمار ہوئے تو آپؐ کی ازواج میں سے بعض نے ارض حبشہ کا گر جا ماریہ نامی جو دیکھا تھا، اس کا ذکر کیا۔ کیوں کہ حضرت ام سلمہؓ اور ام حبیبہؓ ہجرت حبشہ میں وہاں کئی تھیں اور انہوں نے اس کی خوبصورتی اور تصویروں کا ذکر کیا تھا۔ تو آپؐ نے اسی بیماری کی حالت میں اپنا سر مبارک اٹھا کر فرمایا کہ ان لوگوں کا دستور تھا کہ جب ان میں سے کوئی صالح شخص فوت ہو جاتا تو اس کی قبر پر مسجد بنالیتے، پھر اس میں تصویریں کھینچتے۔ وہ لوگ اللہ کے نزدیک بدترین مخلوق ہیں۔“

☆ عن ابن عباسؓ قل قل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لعن اللہ زائرات القبور والمتخنین علیہا المساجد والسرحد (ذکرہ السیوطی فی الجامع الصغیر وصححه)

”حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ نبی پاک ﷺ نے فرمایا۔ جو عورتیں قبروں میں جاتی ہیں۔ ان پر اور جو ان پر مسجدیں بناتے ہیں اور چراغ جلاتے ہیں۔ ان سب پر اللہ کی لعنت ہے۔“

غرض اسی غلط فہمی سے کسی نے تو اپنے انبیاء کرامؑ کو اللہ کے فرزند قرار دیا اور کسی نے سمجھا کہ خود ذات برحق نے جسم اختیار کیا اور ان کے روپ اور صورت میں ظاہر ہوا اور انہیں اللہ کے بموز، اوتار اور مظہر قرار دیا اور کسی نے ان کے بت اور تصویریں بنا کر ان کی عبادت شروع کر دی اور ان سے حاجات طلب کرنے اور مشکلات کے وقت پکارنے اور ان کے اسماء کے درود وغینہ پڑھنے اور ان کے نام کی قربانیاں اور نذریں چڑھانے اور اپنی تکالیف اور مصائب میں ان سے استعاذہ و فریاد کرنے لگے۔

پھر یہ وہم انبیاء کرامؑ سے نیچے اولیاء و صلحاء تک آپہنچا کہ ان کی بزرگی و تقدس

کے خیال سے ان کو بھی تدبیر عالم میں متصرف سمجھا گیا بلکہ بڑھتے بڑھتے بد عمل بلکہ شریعت کے منکر پیروں، فقیروں کی بھی پوجا ہونے لگی۔ بلکہ آگ، پانی (گنگا، جمن)، پہاڑوں (جوالاکھی)، حیوانوں (گائے)، درختوں (پھل)، سورج، چاند اور دیگر ستاروں، جن، بھوت، پریوں وغیرہ مادی اشیاء کی بھی پرستش ہونے لگی۔ کسی نہ کسی وجہ سے اور کسی نہ کسی صورت میں ان کو قابل تعظیم قرار دے کر اعتقاد ”یا کم از کم عملاً“ الوہیت کا مرتبہ دیا گیا۔ گویا تمام عالم کو بلکہ ہر ذرۂ عالم کو خدا بنا دیا گیا اور اللہ رب العالمین کے ساتھ عبادت کا ساجھی اور حصے دار قرار دیا گیا۔ ایسے ہی وہم پرستوں کی بابت فرمایا کہ وہ قیامت کے دن اپنے باطل معبودوں سے خطاب قرار کر کے کہیں گے:- تاللہ ان کنا لفی ضلل مبین ○ اذنسو یکم برب العلمین ○ (الشراء، پ ۱۹)

”اللہ کی قسم! ہم اس وقت صریح گمراہی میں تھے۔ جب تم کو رب العالمین کے برابر گردانتے تھے۔“

غرض ان وہم پرستوں کے دماغ یہاں تک ماؤف ہوتے گئے کہ بعض مقامات کو جن، بھوت اور چڑیلوں کا مسکن قرار دے کر اور ان کو اپنے امور میں متصرف سمجھ کر ان مقامات پر ان کے نام کی قربانیاں، بھیٹ اور نذریں چڑھانے لگے اور یہ اعتقاد رکھنے لگے کہ اگر ہم ان کے نام کی قربانیاں نہ چڑھائیں اور ان کی نیازیں نہ دیں تو ہم پر ان کا غضب ٹوٹ پڑتا ہے اور ہمارے مال مویشی، آل اولاد، فصل و زراعت، آرام و آسائش، کسب و روزگار بلکہ صحت بدن اور جان پر طرح طرح کی آفتیں آ جاتی ہیں۔

فائدہ:- قوت داہمہ سلطان القوی ہے۔ دماغ کی دیگر سب قوتیں اس کے تابع ہیں۔ جس طرح دنیوی سلطان اگر امور منوطہ اور فرائض متعلقہ کو اعتدال و قاعدے سے انجام دے تو اس کی رعیت کا انتظام درست رہتا ہے اور اگر وہ اعتدال کو چھوڑ دے اور قواعد کی پابندی سے باہر ہو جائے تو سارا انتظام بگڑ کر سلطنت کی بربادی و تباہی ہو جاتی ہے۔ اسی طرح یہ سلطان القوی اگر اعتدال پر ہے اور اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ آئین کی ہدایت کے مطابق چلے تو اس کے ماتحت قوی کا انتظام درست رہتا ہے۔ ورنہ سارا تانا بانا برباد ہو کر روح کی ہلاکت پر انجام ہوتا ہے۔ اعازنا اللہ منھا۔

اسلام نے نہایت صفائی اور سادگی سے سمجھایا کہ یہ چیزیں معبودیت کے رتبہ اور خدائی کے مرتبہ میں اللہ کے ساتھ نہیں ہیں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جو جو امور تم ان میں واقعی قابل عزت سمجھتے ہو اور جن جن وجوہات سے تم اپنے منافع و مضار کو ان سے وابستہ جانتے ہو۔ ان کا سارا سلسلہ اللہ کے ہاتھ میں ہے اور رب العالمین ہونے کے یہی معنی ہیں۔ اس نے کسی کو تو تمہاری ہدایت کے لیے مبعوث کیا۔ جیسے انبیاء کرامؑ اور کسی کو تمہاری تعلیم و ارشاد کے لیے تم پر فوٹ دی۔ جیسے ائمہ و صلحاء اور کسی کو تمہارے کسی فائدے کے لیے اور کسی کو کسی نفع کے لیے بنایا۔ پس ان کو عبادت اللہ رب العزت میں واسطہ بنا کر ان کو استحقاق عبادت میں اس کا ساجھی اور حصہ دار نہ بناؤ۔ بلکہ سب سے الگ ہو کر اس ہدایت کے مطابق جو اس نے اپنے پیغمبروں کی معرفت قائم کی۔ براہ راست خالصاً اللہ کی عبادت کرو۔ یہ ایسی بات ہے جس میں کوئی الجھن نہیں، کسی قسم کا ایچ جیج نہیں، سمجھنے میں کوئی مشکل نہیں پڑتی، دل میں بٹھانے کے لیے کوئی قلق و اضطراب پیدا نہیں ہوتا بلکہ وہموں کے بادل چھٹ کر مطلع صاف ہو جاتا ہے۔ دل کے غبار اور رنگ دور ہو کر وہ مثل آئینہ کے مجلی ہو جاتا ہے اور سینہ انوار الہیہ کا محل و خزینہ بن جاتا ہے۔ اسی حالت کے سمجھانے کے لیے فرمایا۔ لقمین شرح اللہ صدرہ للاسلام فہو علی نور من ربہ (زمر، پ ۲۳) یعنی جس کا سینہ اللہ تعالیٰ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے۔ وہ اپنے پروردگار کی طرف سے نور پر ہو جاتا ہے اور اسی حالت کے سمجھانے کے لیے مثال کے طور پر فرمایا:-

اللہ نور السموات والارض، مثل نوره کمشکوۃ فیہا مصباح، المصباح فی زجاجة الزجاجة کانہا کوکب دری یوقد من شجرة مبارکة زیتونة لا شرقیة ولا غربیة یکاد زیتہا یضیی ولو لم تمسسه نار، نور علی نور، یرہی اللہ لنوره من یشاء، و یضرب اللہ الامثال للناس، واللہ بکل شیئی علیم ○ (نور، پ ۱۸)

”اللہ نور ہے آسمانوں کا اور زمین کا۔ اس کے نور کی مثال جیسے ایک طاق ہو۔ اس میں ایک چراغ ہو۔ وہ چراغ ایک شیشے (چٹنی) میں رکھا ہو۔ وہ شیشہ ایسا ہو جیسے چمکتا ستارہ (وہ چراغ) جلایا جائے برکت والے درخت زیتون (کے تیل) سے، جو نہ سورج

نکلتے کی طرف کا ہو اور نہ ڈوبنے کی طرف کل اس کا تل اس قاتل ہے کہ سلگ اٹھے۔ اگرچہ نہ لگے اس کو آگ (وہ) ”نور علی نور“ ہے۔ راہ دیتا ہے اللہ اپنے نور کی طرف جسے چاہے اور بیان کرتا ہے اللہ مثالیں لوگوں کے (سمجھنے کے) لیے اور اللہ ہر شے سے واقف ہے۔“

اس کے بعد کفار و مشرکین کے اعمال کا حال بتایا۔ جو انہوں نے ہدایت ربانی کی روشنی کے سوا کیے کہ ان کی حقیقت کچھ بھی نہیں۔ وہ سراسر وہی اور خیالی ہونے کی وجہ سے بالکل بے سود و بے ثمر ہیں اور انہیں غصے موحدین کے نور علی نور کے مقابلے میں ظلمت بعضہا فوق بعض قرار دیا۔

والذین کفروا اعمالہم کسر لہ بقیعة یحسبہ الظمان ماء حتی اذا جاءہ لم یجدہ شیئاً ووجد اللہ عندہ فوقہ حسابہ واللہ سریع الحساب لو کظلمت فی بحر لجی یغشیہ موج من فوقہ موج من فوقہ سحاب ظلمت بعضہا فوق بعض اذا اخرج یدہ لم یکدیر لہا و من لم یجعل للہ نوراً فمالہ من نور ○ (نور، پ ۱۸)

”اور جن لوگوں نے کفر کیا۔ ان کے اعمال میدان کی ریت کی طرح ہیں۔ جسے کوئی پیاسا پانی خیال کرے۔ یہاں تک کہ جب پہنچا اس پر، کچھ نہ پایا اس کو اور پایا اللہ کو اپنے پاس، پس اس نے پورا دیا اس کو حساب اس کا اور اللہ جلد لینے والا ہے حساب، یا جیسے اندھیرے گہرے دریا میں، چڑھی آتی ہے اس پر لہر، اس پر ایک اور لہر (پھر) اس کے اوپر بادل (بھی) ہے۔ (گویا) کئی اندھیرے ہیں۔ ایک پر ایک (چڑھا ہوا) جب نکالے اپنا ہاتھ، نہیں قریب کہ دیکھ پائے اس کو اور جسے اللہ تعالیٰ نور نہ دے تو اس کے لیے کوئی نور نہیں۔“

غرض جس عمل میں شرک کی آمیزش ہو۔ اللہ تعالیٰ اس کو ہرگز قبول نہیں کرتا۔ اسی معنی میں آنحضور ﷺ نے حدیث قدسی میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:-
لَا اِغْنِی الشِّرْکَ عَنْ الشِّرْکِ مَنْ عَمِلَ عَمَلًا لِّشِرْکٍ فِیْہِ مَعِیْ غَیْرِیْ تَرْکَہُ وَشِرْکَہُ وَفِیْ رِوَاۃٍ فَاَنَامَہُ بَرِیْ ہُوَ لِلَّذِیْ عَمِلَہُ (رواہ مسلم، مشکوٰۃ، ص ۴۴۶)
”میں تمام شرکاء کی نسبت شرک سے بہت بے نیاز ہوں۔ کوئی شخص ایسا عمل

کرے جس میں وہ میرے ساتھ کسی اور کو شریک رکھے تو میں اس کو اور اس کے عمل کو ترک کر دیتا ہوں۔ اور ایک روایت میں ہے کہ میں اس سے بری ہوں اور وہ عمل اسی کے لیے ہے جس کے لیے اس نے کیا۔“

اسی طرح قرآن مجید، فرقان حمید میں بھی فرمایا ہے۔

فَمَنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَاءَ رَبِّهِ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ
لَحَدَّثَنَا (کف، پ ۱۶)

”جس کسی کو اپنے رب سے ملنے کی امید ہو تو اسے چاہیے کہ وہ عمل صالح کرے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی اور کو شریک نہ ٹھهرائے۔“

اسلام میں سب سے بڑی اور جامع اور اہم عبادت نماز ہے۔ امیر ہو، غریب ہو، بادشاہ ہو، رعیت ہو، صحیح ہو، مریض ہو، مسافر ہو، حاضر ہو، عورت ہو، مرد ہو، دیہاتی ہو، شہری ہو، زمین پر ہو، سمندر میں ہو، کوئی بھی ہو اور کسی حال میں بھی ہو۔ ہر باہوش بالغ مرد و عورت پر فرض ہے۔ اس میں نہ تو اللہ کے سوا کی صفت و ثناء کا کوئی کلمہ ہے اور نہ کسی کے نام کا ورود و عقیدہ ہے اور نہ کسی سے دعا و التجا ہے اور نہ اس کے استغاثات میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی تعظیم کا کوئی فعل و حرکت ہے۔ شروع سے اخیر تک صرف اللہ رب العالمین کی کبریائی اور بڑائی محض، اسی کی حمد و ثناء صرف اسی کی ذات پاک کی تسبیح و تقدیس اور اسی سے دعا و التجا ہے۔ اس کے جملہ استغاثات اور تمام افعال و حرکات سے خدائے قدوس کے سامنے اظہارِ محرومیت و نیاز اور تواضع و انکساری مقصود ہے۔ غرض ساری کی ساری نماز دل کے رجوع اور زبان کے کلمات اور اعضائے بدن کے افعال سے مشابہت دے رہی ہے کہ وہ اللہ کے نام سے شروع ہوتی ہے اور اللہ ہی کے نام پاک پر ختم ہوتی ہے۔ یعنی اللہ اکبر سے شروع اور السلام علیکم ورحمۃ اللہ پر ختم۔

قاعدہ۔ نماز کے خاتمے کے قریب پیغمبر ﷺ پر ورود شریف سکھایا ہے۔ تو وہ بطور شکر یہ کے آپ کے حق میں اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ جس ذات بابرکات کے ذریعے ہم کو ایسی ہدایت نصیب ہوئی کہ ہم ہر طرح کے شرک اور توہمت سے بچ کر تیری خالص عبادت کر سکیں تو اس ذات گرامی پر کوڑھار تھیں بھیج اور ظاہر ہے کہ اس میں بھی صرف اللہ تعالیٰ سے دعا ہے۔ یعنی اللہ کہہ کر اللہ تعالیٰ سے سوال کیا گیا ہے کہ خداوند! تو ایسا

فرما۔

بلکہ عین حالت نماز میں درود شریف تعلیم کر کے آنحضرت ﷺ نے اپنی امت مرحومہ کو اس گمراہی سے بچالیا۔ جس میں پہلی امتیں پڑ کر راہ حق سے ہٹ گئیں۔ اس سر کا کشف یوں ہے کہ پہلی امتوں نے اپنے ہادیوں اور پیغمبروں کو خدا کے فرزند اور اوتار قرار دے کر ان کو عبادت میں ساجھی اور حقدار بنا دیا لیکن آنحضرت ﷺ نے درود شریف تعلیم کر کے بتا دیا کہ میں عبادت کا حقدار نہیں ہوں۔ بلکہ اللہ کی درگاہ بے نیاز کا نیاز مند ہوں، تم عام طور پر اور خاص اس حالت میں بھی کہ جب تم کو نماز میں قرب حضوری کی مجلس نصیب ہو۔ میرے لیے اس کا فضل و کرم اور رحمت و برکت طلب کیا کرو اور اسی حقیقت کے ظاہر کرنے کے لیے آپؐ نے فرمایا تھا۔ **الان یتغمدنی اللہ برحمته** یعنی میرے اعمال بھی مجھے نجات نہیں دلا سکتے۔ **الا اس صورت میں کہ اللہ تعالیٰ مجھے اپنی رحمت سے ڈھانپ لے اور اس قول کو سامعین کے فہم کے زیادہ قریب کرنے کے لیے آپؐ نے اپنا دست مبارک پھیلا کر اور اپنے سر مبارک پر رکھ کر اس معنی کو محسوس طور پر سمجھا دیا تھا۔** **اللهم صل علی سیدنا و مولانا محمد الذی ہدیتنا بہ من الضلالۃ**

درود شریف کے اس لطیف نکتے کے علاوہ آپؐ نے نہایت مصرح طور پر بھی اپنی عبودیت کا اقرار جزو ایمان قرار دیا کہ کسی امتی کو اس میں کلام و تردد کی گنجائش نہ رہے۔ چنانچہ کلمات تشہد میں کلمہ شہادت کو بھی داخل کیا۔ جو یہ ہے:- **اشھدان لا الہ الا اللہ و اشھدان محمداً عبده و رسوله** (صحیح بخاری)

یعنی ”(میں صدق دل سے) گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی بھی لائق عبادت نہیں ہے اور میں (ایسے ہی اس امر کی بھی) گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔“

اس میں بھی یہی حکمت ہے کہ جن شہادت کی وجہ سے گزشتہ امتیں گمراہ ہوئیں۔ یہ امت مرحومہ ان سے بچ کر ضلالت سے محفوظ رہے اور رسالت کا اقرار اس لیے کرایا کہ یہ آپؐ کا حقیقی رتبہ ہے۔ اس کا اقرار واجبات سے ہے اور اس کا انکار کفر و ضلالت ہے۔ مثلاً ”حضرت عیسیٰؑ کے متعلق نصاریٰ اس افراط میں پڑ گئے کہ وہ ابن اللہ

اور اللہ ہیں۔ اور یہود نے سرے سے آپؐ کی نبوت کا انکار کر دیا اور تفریط میں پڑ گئے۔ پس امت محمدیہؐ اپنے پیغمبرؐ کی بابت مغضوب علیہم یہود کی تفریط اور ضالین نصاریٰ کے افراط سے سلامت رہ کر صراطِ مستقیم پر قائم رہی کہ آپؐ کو اللہ کا بندہ جانا اور اس کا رسولؐ اعتقاد کیا۔ والحمد للہ! ثم الحمد للہ!!!

نکتہ:- کلمہ شہادت میں عہدہ و رسولہ کے جمع کرنے میں یہ بھی نکتہ ہے کہ رسالت کے ساتھ عبودیت کا اجتماع ہوتا ہے۔ نہ کہ الوہیت کا کیوں کہ رسول عہد ہوتا ہے نہ کہ معبود۔ اسی نکتہ کے لحاظ سے خاص حضرت مسیحؑ کے متعلق فرمایا۔ لن یستنکف المسیح ان یکون عبد اللہ ولا الملائکۃ المقربون (النساء، پ ۶) یعنی حضرت مسیحؑ اور ملائکہ مقربین کو اللہ کا بندہ بننے سے ہرگز عار نہیں۔

تنبیہ:- بعض جاہل لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ اگر آنحضرت ﷺ کو بندہ کہیں تو اس میں آپؐ کی کسر شان ہے۔ وہ اس آیت پر غور کریں۔

اسی طرح سورہٴ مریم کے آخری رکوع میں اپنے لیے نسبت فرزندگی کی تردید میں فرمایا۔ ان کل من فی السموات والارض الا انی الرحمن عبدہ (مریم، پ ۱۶) یعنی ہر کوئی جو آسمانوں میں اور زمین میں ہے۔ خدائے رحمن کے سامنے بندہ بن کر آنے والا ہے۔ ان آیات سے صاف ثابت ہے کہ عبودیت و الوہیت جمع نہیں ہو سکتیں۔

فائدہ:- نبی پاک ﷺ نے نسبت عبدیت و عبودیت کو خاص اللہ تعالیٰ سے مخصوص کرنے میں یہاں تک اہتمام کیا کہ لفظ عبد جو زبان عرب میں ہر چند کہ وسیع معنی رکھتا ہے اور زر خرید غلام پر عام طور پر بلا روک بولا جاتا تھا اس کی بابت منع فرما دیا کہ کوئی شخص اپنے زر خرید غلام اور لونڈی کو عبد اور امہ کے الفاظ سے اپنی طرف نسبت نہ کرے۔

لا یقولن احدکم عبدی و امتی کلکم عبید اللہ و کل نسائکم اماء اللہ و لکن لیقل غلامی و جاریتی و فتای و فتاتی ولا یقل العبد ربی و لکن لیقل سیدی رواہ مسلم۔ (مشکوٰۃ، ص ۱۷۱)

”تم میں سے کوئی بھی (اپنے زر خرید غلام کو) عبدی اور امتی کے لفظ سے نہ پکارا کرے کیوں کہ تم سب مرد اللہ کے عبد ہو اور تمہاری سب عورتیں اللہ کی بندیاں

ہیں لیکن میرا لڑکا اور لڑکی کہا کرو اور کوئی زر خرید غلام اپنے خریدنے والے کو ربی (میرا مالک) کے لفظ سے نہ پکارے بلکہ میرا سردار کہا کرے۔“

دماغ کو روشن کرنے والا نکتہ:- اس حدیث میں علاوہ شریعت و طریقت کے نقطہ نگاہ کے کہ عبودیت کی نسبت سوائے ذات حق کے کسی اور کی طرف کسی صورت میں بھی پسند نہیں کی اور اپنا رب سوائے رب العالمین کے کسی اور کو کہنا گویا مجازی طور پر ہی ہو مناسب نہیں سمجھا۔ سیاسی نقطہ نگاہ سے بھی اور علم سائنس کالوجی (فلسفہ ذہنیت) کی رو سے بھی نہایت لطیف نکتہ ہے کہ نبی پاک ﷺ ہر طرح سے مشرکانہ توہمات کا سد باب کر کے اور انسانی دماغ کو غیر کی غلامی کے تصور سے بھی پاک صاف کر کے اس کی ذہنیت اور ہمت کو بلند کرنا چاہتے ہیں اور مقام حریت اور خودداری پر کھڑا کر کے صرف ایک اللہ کا غلام بنانا چاہتے ہیں اور انسان کی شرافت اور نجابت کو غیر اللہ کے سامنے گرنے کی ذلت سے بچانا چاہتے ہیں۔ انسانی دماغ پر آپ کا بڑا بھاری احسان ہے۔ جس کی نظیر دنیا میں مل نہیں سکتی۔

اسی طرح آپ ان نو مسلمانوں کے نام بدل دیا کرتے تھے۔ جن میں عبودیت و عبدیت کی نسبت غیر اللہ کی طرف ہوتی تھی۔ چنانچہ حضرت ابو ہریرہؓ کا پہلا نام عبد شمس (سورج کا بندہ یا پرستار یا پروردہ) تھا۔ جب وہ اسلام لائے تو نبی پاک ﷺ نے ان کا نام عبدالرحمن رکھا۔ (تقریب التہذیب)

غرض آنحضور ﷺ (فداہ ابی وامی) نے عبدیت و عبودیت کی کوئی بھی نسبت غیر اللہ کی طرف ہو سکنے کی گنجائش نہیں چھوڑی۔ تاکہ ایسا نہ ہو کہ ”فجوائے“ اوگتے کو ٹھیلے کا بمانہ“ وہم پرست طبیعتیں اسے ایک بمانہ بنالیں۔ چنانچہ آپ نے مشرکانہ توہمات کے متعلق فرمایا کہ وہ چوٹی کی چال چل کر انسان (کے دل و دماغ) میں اثر کر جاتے ہیں۔ اللھم صل وسلم علی نبیک و صفیک محمد الذی ھدیتنا بہ من الضلالۃ و ابصرتنا بہ من العمی

الغرض شان الوہیت اور مقام عبودیت کے سب مراتب سورہ فاتحہ کی اس آیت ایاک نعبد و ایاک نستعین میں آ جاتے ہیں اور ان سب کا مرکز و محور ایاک کی تقدیم میں ہے۔ سبحان اللہ!

یہ آیت اس سورت کا قلب ہے اور ایک کی تقدیم اس قلب کی روشنی و ضیاء ہے۔ اسی لیے حدیث قدسی میں اس آیت کے متعلق موجود ہے کہ جب بندہ (نماز میں) کہتا ہے۔ ایاک نعبد و ایاک نستعین تو اللہ تبارک و تعالیٰ فرماتا ہے۔ ہذا بینی و بین عبدی (مسلم) یعنی یہ آیت میرے اور میرے بندے کے درمیان نصفاً نصفی ہے کہ وہ میرا عابد و عبد ہے اور میں اس کا معبود ہوں۔ وہ مجھ سے طالب امداد ہے تو میں اس کا مددگار ہوں۔ عبادت کرنا اس کا فرض ہے تو اعانت کرنا میری شان۔ سبحان اللہ! کیا راز و نیاز کی باتیں ہیں اور کیا سرور و حظ کی مناجاتیں ہیں۔ یہ سب کچھ نسبت عبدیت و عبودیت کو خاص اللہ تعالیٰ سے مخصوص کرنے اور اپنی حاجات و مشکلات میں صرف اسی کی طرف رجوع کرنے اور اسی سے امداد طلب کرنے کی برکت سے ہے۔

علامہ ابو اسعود حنفیؒ اس آیت کی تفسیر میں خطاب ایک کے طائف سے سرور و معظوظ ہو کر لکھتے ہیں:-

ولعل هذا هو السرفى اختصاص السورة الكريمة بوجوب القراءة فى كل ركعة من الصلوة التى هى مناجاة العبد لمولاه و مئة للتبتل اليه بالكلية (بماش الكبير، ص ۱۵۲)

”نماز جو بندے کی اپنے مالک کے سامنے مناجات ہے اور سب سے ہٹ کر کلیتہً اسی کی طرف ہو جانے کی علامت ہے۔ اس کی ہر رکعت میں خاص اسی بزرگ سورت کی قرات کے واجب ہونے میں غالباً“ یہی سر ہے۔“

الحاصل آیت ایاک نعبد کے شرح معنی اس کے قبل کو ملحوظ رکھ کر یہ ہیں کہ (صرف ایک اللہ کا پرستار بندہ) رتبہ برہان سے طبقہ عیان پر ترقی کر کے اور عالم غیبت سے شہود میں انتقال کر کے اور اپنے آپ کو اللہ کے دربار عالی میں حاضر سمجھ کر اور صورت سوال اور تصویر عجز و مسکنت بن کر اپنے مولا کے سامنے دست بستہ یوں عرض معروض کرتا ہے کہ اے وہ ذات پاک! جو رب العالمین ہے اور رحمن و رحیم ہے اور روز جزا کا اکیلا مالک ہے۔ ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں، کسی اور کی نہیں۔

☆ نہ کسی پیغمبر کی، نہ کسی فرشتے کی، نہ حضرت مسیحؑ کی، نہ رام چند راجی کی اور نہ کرشن جی، نہ پیر کی اور نہ فقیر کی۔

- ☆ نہ کسی اوتار و بروز کی، نہ جن کی، نہ بھوت کی اور نہ پری کی۔
- ☆ نہ کسی دیوتا کی، نہ دیوی کی، نہ کسی ٹھاکر کی، نہ بت کی، نہ قبر کی اور نہ تعزیے کی۔
- ☆ نہ کسی جانور کی اور نہ کسی درخت کی۔
- ☆ نہ کسی پہاڑ کی اور نہ کسی دریا کی۔
- ☆ نہ سورج کی، نہ چاند کی اور نہ کسی اور ستارے کی۔

غرض ہم جملہ غیر اللہ سے الگ ہو کر صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور اپنی حاجات و مشکلات میں صرف تیری ہی طرف رجوع کر کے محض تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔ یہی معنی کلمہ توحید لا الہ الا اللہ میں رکھے گئے ہیں کہ غیر اللہ کی نفی کے بعد الوہیت کو یعنی معبودیت کو خاص خدا کے لیے ثابت کیا گیا ہے۔

فائدہ:- اسلام کامایہ ناز و طرہ امتیاز یہی خالص توحید ہے۔ جو ہر قسم کے شرک کی ملاوٹ سے پاک ہے ورنہ شرک کی ملاوٹ والی توحید تو اسلام سے پیشتر بھی سب قوموں میں تھی اور اب بھی ہے۔ چنانچہ فرمایا۔ و ما یومن اکثرہم باللہ الا وہم مشرکون (یوسف، پ ۱۳) یعنی اور نہیں ایمان لاتے اکثر لوگ مگر در آنحال کہ وہ شریک گردانتے ہیں۔

اور اسی خالص توحید سے کفار مکہ چڑتے تھے اور اسی کی وجہ سے آنحضور ﷺ سے عداوت رکھتے تھے اور کہتے تھے کہ آپ نے نیا دین نکالا ہے۔ ہمارے باپ دادا اس طریق پر نہ تھے۔ چنانچہ فرمایا کہ کفار مکہ نے آنحضور ﷺ کی تبلیغ پر کہا:-

اجعل الالهة الها واحدا“ ان هذا الشیئی عجاب ○ (س، پ ۲۲)
”کیا کر ڈالی اس نے ایک کی بندگی، بتوں کی بندگی کے بدلے، بے شک یہ تعجب کی بات ہے۔“

پھر اس کے ایک آیت بعد فرمایا کہ کفار نے یہ بھی کہا:-

ما سمعنا بهذا فی الملة الاخرة“ ان هذا الاختلاق ○ (س، پ ۲۲)

”نہیں سنی ہم نے یہ بات پچھلی ملت میں، نہیں یہ بات مگر بنائی ہوئی۔“

حضور اکرم ﷺ کی تبلیغ توحید کے وقت مشرکین کے دل پر جو کیفیت طاری ہوتی تھی۔ اس کے متعلق فرمایا:-

وإذا ذكر الله وحده اشمزت قلوب الذين لا يؤمنون بالآخرة وإذا ذكر الذين من دونه اذا هم يستبشرون ○ (زمر، پ ۲۴)

”جب اللہ کی توحید کا ذکر ہوتا ہے تو ان لوگوں کے دل جو عاقبت پر یقین نہیں رکھتے، بچنے لگتے ہیں اور جب ان کا ذکر ہو جو اس کے سوا ہیں تو وہ خوش ہوتے ہیں۔“
قیامت کے دن جب مشرک عذاب میں مبتلا ہوں گے تو ان سے کہا جائے گا:-

ذالکم بانہ اذا دعی اللہ وحده کفرتم وان یشرک بہ تؤمنواۗ فالحکم للہ العلیٰ الکبیر ○ (مومن، پ ۲۴)

”یہ (عذاب تم کو) اس لیے ہے کہ جب کسی نے پکارا اللہ کو اکیلا تو تم منکر ہوئے اور اگر اس کا شریک گردانا جاتا تو تم یقین لاتے تھے۔ تو (اب) عالی ذات کبیر الشان اللہ (ہی) کا حکم ہے۔“

یعنی جن کو تم خیال کرتے تھے۔ ان کا کچھ بھی اختیار نہیں۔ آج صرف اللہ کا حکم چلتا ہے۔ پس اس نے جہاں تم کو دھکیل دیا، وہیں رہنا ہو گا۔ وہاں سے نکلنے والا کوئی بھی نہیں۔ الغرض آنحضرت ﷺ کی بعثت سے اللہ تبارک و تعالیٰ کا سب سے بڑا اور ضروری مقصد یہی خالص توحید تھی اور بس !!!

قل اننى هدانى ربى الى صراط مستقيم (پ ۸)

الجزء السادس

من تفسير الفاتحة

النهج القويم

فى تفسير قوله

اهدنا الصراط المستقيم ○

○ اهدنا الصراط المستقیم

”چلائے رکھ ہم کو سیدھی (اور پختہ) راہ پر“

ارتباط :- انابت قلبی و خلوص اور عبادت و استغانت میں دل کا رجوع جس کا ذکر اوپر ہوا، تب حاصل ہوتا ہے۔ جب استقامت حاصل ہو۔ کیوں کہ استقامت یہ ہے کہ عمل کے شروع سے اس کے اخیر تک عزم قوی باقی رہے۔ (عزیزی) ورنہ انسان ادھر ادھر کی کمشوشوں سے پریشان ہو کر اللہ کی راہ سے ہٹ جاتا ہے اور بسا اوقات جتلائے توہمات ہو کر شرک میں جا گرتا ہے۔ اس لیے ایسا نعبد و ایسا نستعین کے بعد حصول استقامت کی دعا سکھائی کہ یوں کہا کرو۔ اهدنا الصراط المستقیم ○ نیز علم، عمل سے کھل و پختہ ہوتا ہے اور عملی قوت کا ستارے ترقی استقامت ہے۔ اس لیے استغانت کے ذکر کے بعد تحصیل استقامت کے لیے دعا تعلیم کی۔

حل لغات :- اهدنا، مصدر ہدایت یا ہدی سے امر حاضر کا صیغہ ہے، مع ضمیر مفعول (نا) کے لغت میں ہدایت مشترک المعنی ہے۔ اس کے معنی رستہ دکھانا بھی ہیں۔ جیسے آیت اما ثمود فھدینہم فاستحبوا العمی علی الھدنی (فصلت، پ ۲۳) میں یعنی ہم نے قوم ثمود کو (صالح پیغمبر کی تبلیغ سے) رستہ دکھادیا تھا لیکن انہوں نے اس ہدایت پر اندھے پن کو پسند کیا۔ یہاں پر ہدایت سے مراد صرف رستہ دکھانا مراد ہے۔ کیوں کہ اگر اس کے معنی منزل پر پہنچانا ہوں تو اس کے بعد اندھے پن کو پسند کرنا متصور نہیں ہو سکتا۔ اور اس کے معنی راہ پر لے آنا، رستے پر چلا دینا، اس پر قائم رکھنا اور منزل مقصود پر پہنچا دینا بھی ہیں۔ جیسے آیت انک لا تھدی من احببت و لکن اللہ یھدی من یشاء (قصص، پ ۲۰) میں، یعنی (اے نبی!) تم اسے جسے تم پسند کرو راہ پر نہیں لا سکتے لیکن اللہ جسے چاہے، اسے راہ پر لے آئے۔ ہدایت پر لے آنا، راہ پر چلا دینا اور منزل پر پہنچا دینا تمہارا کام نہیں ہمارا کام ہے۔ اس جگہ آیت انک لا تھدی میں یہی دوسرا معنی یعنی راہ پر لے آنا مراد ہیں۔ ورنہ آیت و انک لتھدی الی صراط مستقیم (شوری، پ ۲۵) یعنی (اے نبی!) تو تو سیدھے رستے کی طرف ہدایت کرتا یعنی راہ دکھاتا ہے، سے اس کا

تعارض ہو گا اور قرآن مجید اختلاف تعارض و تناقض سے پاک ہے۔ ایک جگہ ایک شے کا اثبات کیا ہو تو اسی حیثیت و حالت میں دوسری جگہ اس کی نفی قرآن پاک میں نہیں ہے۔ قرآن مجید خود اپنی شان بتاتا ہے:- افلا يتدبرون القرآن ولو كان من عند غير الله لوجدوا فيه اختلافا كثيرا ○ (النساء، پ ۵)
 ”تو کیا یہ (منکر) لوگ قرآن میں تدبر نہیں کرتے۔ اگر وہ غیر اللہ کی طرف سے ہوتا تو وہ اس میں بہت سا اختلاف پاتے۔“

پس جس جگہ آنحضور ﷺ کی نسبت ہدایت کرنے کو ثابت کیا ہے۔ اس جگہ صرف رستہ دکھانا و دعوت و ارشاد سے راہ حق بچھا دینا، تعلیم و تبلیغ سے راہ حق کی رہنمائی کرو دینا مراد ہے۔ چنانچہ دوسرے موقع پر ایک لحدی کی بجائے ایک تہ عوہم وارد ہے۔ چنانچہ فرمایا:-

و انك لتدعوهم الى صراط مستقيم ○ وان الذين لا يؤمنون بالآخرة عن الصراط لناكبون ○ (مومنون، پ ۱۸)

”اور (اے نبی!) آپ ان کو صراط مستقیم کی طرف بلاتے ہیں لیکن جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، وہ اس رستے سے ٹیڑھے جا رہے ہیں۔“

اور جس جگہ آنحضور ﷺ سے نفی کی ہے۔ وہاں پر دوسرے معنی میں ہدایت پر لے آنا اور منزل پر پہنچا دینا مراد ہے۔ کیوں کہ یہ اللہ کے اختیار کے میں ہے۔ پس ہر دو مواقع یعنی اثبات اور نفی کے مقام میں فرق معلوم ہو گیا اور تعارض و تناقض نہ رہا۔

الصراط اصل میں سراط (سین) سے تھا اور ”ر“ اور ”ط“ کی تفسیح کی موافقت کے لیے سین کو صاد سے بدل دیا۔ اس کے معنی ہیں واضح طریق یعنی شاہراہ۔ (لسان العرب وغیرہ)

المستقیم اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ مصدر استقامتہ سے جس کے معنی ہیں افراط تقریب سے بچ کر معتدل حالت پر قائم ہونا۔ چنانچہ لسان العرب میں ہے۔ والاستقامة الاعتدال۔ وقام الشيء واستقام اي اعتدل واستوى۔

تفسیر بشہادت آیات

ہدایت الہی کئی قسم پر ہے۔

اول، وہ جو بغیر اوراک و شعور کے بتقاضائے فطرت ہے۔ مثلاً ”بچ پیدا

ہوتے ہی اپنی ماں کی چھاتی چوسنے لگتا ہے اور اپنی حاجت کے لیے مناسب غذا حاصل کرتا ہے۔ اس حقیقت کے سمجھانے کے لیے فرمایا:۔ الم نجعل له عینین ○ ولساناً وشفٹین ○ وھدینہ النجدین ○ (البلد، پ ۳۰)

”کیا ہم نے انسان کی دو آنکھیں اور زبان اور دو ہونٹ نہیں بنائے اور ہم نے اسے دو بلند یوں کی رہنمائی نہیں کی؟“

دوسری ہدایت حواس و شعور اور ادراک کی ہدایت ہے۔ اس کی نسبت فرمایا:۔ انا خلقنا الانسان من نطفة امشاج نبتليه فجعلنه سمیعاً بصیراً ○ انا ھدینہ السبیل اما شاکر ○ واما کفور ○ (الدر، پ ۲۹)

”تحقیق ہم نے انسان کو طے ہوئے نطفہ سے پیدا کیا۔ پھر ہم نے اس کو سنتا دیکھتا بنایا۔ بے شک ہم نے اسے رستہ بھی بچھا دیا۔ (اب وہ دیکھ سن کر بالکل اپنی ذمہ داری پر) یا تو شاکر ہوتا ہے یا کافر۔“

ہدایت :- اس مقام پر ہدایت سے مراد قسم سوم اور چہارم کی ہدایت بھی ہو سکتی ہے۔ جن کا ذکر آگے آتا ہے۔ قسم اول اور دوم ہر دو کی ہدایت انسان اور دیگر حیوانات میں مشترک ہے۔ فرعون نے جب حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام سے کہا فمن ربکم آیا موسیٰ یعنی اے موسیٰ (میرے سوا) تم دونوں (بھائیوں) کا رب کون سا ہے؟۔ تو حضرت موسیٰ کلیم اللہ نے جواب میں کہا۔ ربنا الذی اعطی کل شئی خلقه ثم ھدینا (ط، پ ۱۶) یعنی ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر شے کو پیدا کیا۔ پھر اسے سمجھ بخشی۔ اس مقام پر ہدایت سے مراد یہی قسم دوم کی ہدایت ہے جو انسان اور دیگر حیوانات میں مشترک ہے۔

تیسری قسم کی ہدایت :- عقل کی ہدایت ہے جو انسان سے مختص ہے کہ وہ حواس سے

لے اس آیت میں مفسرین نے نجدین (دو بلند یوں) سے مراد ماں کی دو چھاتیاں بھی لی ہیں جو نہایت پاک اور مہذب استعارہ ہے اور نیکی اور بدی کی دو گھائیاں بھی مراد لی ہیں، لیکن ہم نے متن میں پہلے معنی مراد رکھ کر اس آیت کو مثال میں بیان کیا ہے اور دوسرے معنی کی رو سے یہ آیت قسم سوم و چہارم کی ہدایت کی مثال ہوگی، جن کا ذکر آگے آتا ہے۔

اوپر اپنی قوت عاقلہ سے بھی کام لیتا ہے اور یہ ہدایت پہلی دونوں ہدایتوں پر کنٹرول اور ضابطہ ہے۔ اسی کی رہنمونی میں وہ بعض اوقات حواس کی غلطی کو سمجھتا ہے اور حقیقت پر آگاہ ہوتا ہے اور اسی کی روشنی سے وہ جزئیات محسوسہ میں تصرف کر کے کلیات کا ادراک کرتا ہے اور اسی کی وجہ سے وہ خدا کی گراںجاہلیت (تحمل شریعت) کا حامل و ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے۔ اسی کے رو سے اس پر حجت الہی کی ایک شق پوری ہوتی ہے اور اسی کی وجہ سے وہ اپنے اعمال کا ذمہ قرار دیا گیا ہے اور جزا سزا کے لائق ٹھہرتا ہے۔ نیکی پر شاباش و تحسین کے قابل اور برائی پر نفرین کے لائق سمجھا جاتا ہے اور اسی سے اسے دیگر حیوانات سے امتیاز و شرف حاصل ہے اور اسی کی وجہ سے اسے قرآن شریف میں بار بار کبھی تو لعلکم تعقلون سے خطاب کیا گیا اور کبھی افلا تعقلون سے تنبیہ کی گئی ہے۔

چوتھی قسم کی ہدایت:- ارشاد و وحی نبوت کی ہدایت ہے اور یہ جملہ مذکورہ بالا اقسام سے اشرف و اعلیٰ ہے اور یہ مرتبہ نوع انسانی کے چند مخصوص افراد کے لیے ہے۔ باقی تمام نفوس کو ان مقدس ہستیوں کے ظل میں رہنے کا حکم ہے۔ چنانچہ فرمایا:-
 فاما ياتينكم منى هدى فمن تبع هداى فلا خوف عليهم ولا هم يحزنون
 ○ والذين كفروا و كذبوا بايتنا اولئك اصحب النار هم فيها خلدون ○
 (بقرہ، پ ۱)

”پس اگر پہنچے تم کو میری طرف سے ہدایت تو جس نے پیروی کی میری ہدایت کی۔ تو نہیں ہو گا ان پر کوئی خوف اور نہ وہ غم کھائیں گے اور جنہوں نے میری آیات سے کفر کیا اور ان کو جھٹلایا تو وہ دوزخی ہوں گے۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔“
 اس قسم کی آیتیں بکثرت ہیں۔ مثال کے لیے ایک مقام کافی ہے۔

پانچویں قسم کی ہدایت:- پانچویں قسم کی ہدایت، ہدایت توفیق و عنایت ہے۔ چنانچہ اس کے متعلق فرمایا:- والذين جاهلوا فينا لنهدينهم سبلنا و ان الله لمع المحسنين ○ (عنکبوت، پ ۲۱)

”جو لوگ ہماری جستجو میں اپنی ہمت بھر کر شش کریں گے۔ ہم ضرور ان کو اپنی

راہیں دکھادیں گے اور یقین جانو کہ اللہ تعالیٰ (ہر دم) مخلص نیکو کاروں کے ساتھ ہے۔“
 خاکسار کے نزدیک آیت زیر تفسیر یعنی احداثا الصراط المستقیم میں اسی مرتبہ
 ہدایت یعنی توفیق و علمیت کی استدعا ہے۔ کیوں کہ مذکورہ بالا سورہ عنکبوت میں اس مرتبہ
 کے لیے مجاہدات و ریاضیات کو بمنزلہ شرط قرار دیا ہے اور انسان مجاہدات و ریاضیات کے
 ترازو میں بغیر استقامت کے پورا نہیں اتر سکتا۔ (والحمد للہ العلیم)

☆ ویزید اللہ الذین اہتدوا ہدی (مریم، پ ۱۶)

”اور زیادہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ ہدایت یافتہ لوگوں کو ہدایت میں۔“

☆ والذین اہتدوا زادہم ہدی و انہم تقواہم ○ (محمد، پ ۲۶)

”اور جن لوگوں نے پائی ہدایت ان کو زیادہ کی ہدایت اور دی ان کو پرہیز
 گاری۔ (مناسب ان کے حال کے)“

استقامت کیا ہے؟۔ استقامت دین میں ایک بڑا درجہ ہے۔ جو حضرات انبیاء علیہم
 السلام کو عطا ہوتا ہے اور ان کے لازم حال ہوتا ہے اور ان کے حل میں ان کے کامل
 تابعداروں کو بھی اس سے بہرہ ملتا ہے اور یہ درجہ سب رکاوٹوں اور مزاحمتوں پر غالب
 آنے سے حاصل ہوتا ہے۔ بلکہ یوں سمجھئے کہ سب رکاوٹوں میں سے گزرتے ہوئے دین
 کو بچائے رکھنے یا دین پر قائم رہنے کا نام استقامت ہے۔ بعض رکاوٹیں مخالفین کی طرف
 سے ہوتی ہیں، بعض اوقات پیش آمدہ واقعات ہی رکاوٹ بن جاتے ہیں، بعض اوقات اپنا
 نفس اور اس کی خواہشیں اور زن و فرزند کی الفت اور مال و متاع کی محبت مزاحم ہوتی
 ہے، بعض اوقات کسی کا خوف یا امید سد راہ ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فرمودے پر قائم
 رہتے ہوئے ان سب امور پر غالب آئے تو کہا جاسکتا ہے کہ فلاں شخص صاحب استقامت
 یا مستقیم الحال ہے۔ چنانچہ اس معنی میں فرمایا:۔ فاستقم کما امرت و من تاب
 معک (ہود، پ ۱۲)

”(اے نبی!) بجا رہ جس طرح تجھے حکم کیا گیا اور جو (کفر سے) توبہ کر کے
 تیرے ساتھ ہوئے ہیں۔ (وہ بھی جئے رہیں)“ نیز فرمایا:۔

فاستقم کما امرت و لا تتبع اھوائہم و قل امت بما انزل اللہ من کتاب و

امرت لا عدل بئسکم (شوری، پ ۲۵)

”(اے نبی!) پس تو مجارہ جس طرح تجھے حکم کیا گیا ہے اور ان (منکر) لوگوں کی خواہشوں کی پیروی نہ کرنا اور (ان سے یہ بھی) کہہ دے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کتاب بھی نازل کی ہے۔ میرا اس پر ایمان ہے اور مجھے یہ بھی حکم ہوا ہے کہ تم عدل قائم کرو۔“

اسی استقامت کا دوسرا نام صبر و ثبات قدم ہے۔ چنانچہ میدان جنگ میں دشمن

کے مقابلے میں ڈٹے رہنے کے متعلق فرمایا: یا ایہا الذین امنوا اذا لقیتم فئۃ فاثبتوا واذکرو اللہ کثیراً لعلکم تفلحون ○ (انفال، پ ۱۰)

”مسلمانو! جب تمہارا کسی جماعت سے مقابلہ ہو جائے تو تم جے رہو اور اللہ تعالیٰ کو بہت بہت یاد کرتے رہو تاکہ تم اپنے مقصد کو پہنچ جاؤ۔“

اسی طرح غازی انبیاء کرامؑ اور ان کی مجاہد افواج کی دعا یوں بیان فرمائی ہے:-

و ما کان قولہم الا ان قالوا ربنا اغفر لنا ذنوبنا و اسرافنا فی امرنا و ثبت اقدامنا و انصرنا علی القوم الکفرین ○ (آل عمران، پ ۴)

”(دشمنوں کے مقابلے کے وقت) ان کا (ورد) یہی کلمہ ہوتا تھا۔ کہ خداوند! ہمارے گناہ اور ہماری زیادتی جو ہم سے کسی معاملے میں بھی ہو گئی ہو بخش دے اور ہمارے قدم جمائے رکھ اور ہمیں منکروں پر مدد دے۔“

اسی طرح حضرت طاہت اور ان کے مجاہد لشکریوں کی دعا ذکر کی کہ انہوں نے میدان مقابلے میں یوں کہا:- ربنا افرغ علینا صبراً و ثبت اقدامنا و انصرنا علی القوم الکافرین ○ (البقرہ، پ ۲)

”اے ہمارے پروردگار و مالک! ڈال دے ہم پر صبر (حوصلہ و برداشت) اور محکم رکھ ہمارے قدم اور ہم کو منکر لوگوں پر فتح دے۔“

اور غزوہ احزاب میں آنحضور ﷺ بنفس نفیس خندق کھودتے وقت مٹی اٹھاتے تھے اور نہایت ذوق و شوق سے یہ رجز پڑھتے تھے:- واللہ لو لا اللہ ما اہتدینا ولا

۹۸ مجموعہ بائبل میں کتاب یسعیاہ نبی کے باب ۴۲ میں جو جیگہ کوئی آنحضور ﷺ کی نسبت ہے۔ اس میں آپ کی صفت عدالت صاف مذکور ہے۔

تصدقنا ولا صلينا؟ فانزلن سكينه علينا (بخاری)

”اللہ کی قسم! اگر اللہ تعالیٰ ہم کو راہ راست پر نہ لاتا تو ہم نہ ہدایت پاسکتے اور نہ صدقہ و خیرات کر سکتے اور نہ نماز پڑھ سکتے۔ سو (اے خداوند!) ہم پر سکون (خاطر) نازل کر۔“

اس مقام پر استقامت اور ثبات قدم کو سیکھنے (سکون خاطر) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ پس استقامت ایک ایسا امر ہے جو اللہ کی توفیق و مدد کے سوا حاصل نہیں ہو سکتا۔ جیسا کہ شروع آیت میں ایسا کہنا و ایسا کہنا مستعین کے بعد احداث الصراط المستقیم کی دعا کے ربط کی نسبت اور گزر چکا ہے۔

خشکی چھانٹنے والے بے ذوق لوگ جو درجہ عبودیت و نیاز مندی اور عبد و معبود کے روابط و تعلقات اور عنایات ایزدی کے لطف سے ناواقف ہیں۔ وہ ان باتوں کی حقیقت سے بے برہ اور اس لذت سے نا آشنا ہیں۔ جس شخص کی زبان کا ذائقہ صفا کے غلبہ سے بگڑ گیا ہو۔ وہ شیرینی کی حلاوت سے کس طرح خوش کام ہو سکتا ہے۔ صدق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ذاق طعم الایمان من رضی باللہ رباً۔“
الحديث“ (مشکوٰۃ)

اس آیت پر آریوں اور عیسائیوں کا یہ اعتراض کہ مسلمانوں کو ابھی تک صراط مستقیم کا پتہ بھی نہیں ملا۔ کیوں کہ وہ اس کے لیے ابھی تک دعائیں ہی کر رہے ہیں، درست نہیں۔ کیوں کہ اس جگہ ہدایت کے دوسرے معنی یعنی ایصال الی المملوب مراد ہیں۔ جس کے لیے استقامت شرط ہے۔ اس لیے اس مقام پر صراط کو مستقیم سے موصوف کیا۔

دیگر یہ کہ استقامت کوئی ذہنی تھیوری (Theory) نہیں ہے بلکہ وہ عملی جدوجہد میں شروع سے اخیر تک عزم قوی کے قائم رہنے کا نام ہے اور اس کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا اور توفیق مانگنا، درجہ عبودیت کو سمجھنا ہے۔ پس اعتراض بے جا ہے۔
دیگر یہ کہ امام ابو جعفر طبریؒ نے نہایت وضاحت سے لکھا ہے کہ اس جگہ ہدایت سے مراد توفیق اور ثبات ہے اور حضرت ابن عباسؓ سے یہ بھی معنی روایت کیے گئے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:-

(اھدنا) قال ابو جعفر و معنى قوله اھدنا الصراط المستقیم هذا الموضع عندنا و فقلنا للثبات عليه كما روى ذالك عن ابن عباس* (تفسير ابن جریر طبری جلد اول، ص ۵۳)

”کہ اس موقع پر اھدنا الصراط المستقیم کے معنی یہ ہیں کہ خداوند! ہم کو ہدایت پر ثابت رہنے کی توفیق عنایت کر۔ جیسا کہ ابن عباسؓ سے مروی ہے۔“
پھر اس کے بعد کلام عرب میں سے یہ شعر شہادت میں لکھا ہے۔

لا تحرمنى هداك الله مسئلتى ولا اكونن كمن اودى به السفر
شاعر کا مقصود یہ ہے کہ اللہ تجھے میرا سوال پورا کرنے اور میری حاجت روائی کی توفیق دے۔ پھر کہا ہے کہ قرآن مجید میں واللہ لا یھدی القوم الظالمین وغیرہ آیات میں بھی ہدایت سے مراد توفیق ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ ایسے ضدی، ظالموں، فاسقوں اور کافروں کو قبول ہدایت کی توفیق نہیں دیتا۔ پھر بہت تفصیل سے بیان کرنے کے بعد کہا ہے کہ ربط و نظم عبارت سے بھی بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ اس سے مراد توفیق ہے کیوں کہ اس سے پہلے بندہ ایک نستعین سے اللہ تعالیٰ کی عبادت پر مدد طلب کرتا ہے۔ تو اب جتنی عمر اس کی باقی ہے۔ اس میں اھدنا سے ہدایت پر ثابت رہنے کا سوال کرتا ہے۔ واللہ الھادی

اصحاب استقامت کی قدر و منزلت

مستقیم الحال مومنوں پر قیامت کے روز پے در پے فرشتے نازل ہو کر ان کو تسلیاں دیں گے۔ چنانچہ فرمایا:-

ان الذين قالوا ربنا الله ثم استقاموا تتنزل عليهم الملائكة ان لا تخافوا ولا تحزنوا وابشروا بالجنة التي كنتم توعدون ○ (م فطمت، پ ۲۳)

”جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب (مالک و پروردگار!) اللہ ہے، پھر (اس پر) مستقیم (ہنستہ) رہے۔ ان پر پے در پے فرشتے نازل ہوں گے کہ تم کوئی خوف نہ کرو اور نہ غم کرو۔ بلکہ اس جنت (کی کامیابی) سے خوش ہو جاؤ، جس کا وعدہ تم سے (دنیا میں) کیا جاتا تھا۔“

ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا فلا خوف علیہم ولا ہم یحزنون ○
(احقاف، پ ۲۶)

”جن لوگوں نے کہا ہے کہ ہمارا رب (مالک و پروردگار!) اللہ ہے۔ پھر (اس پر) قائم رہے۔ ان پر نہ تو کسی طرح کا خوف ہوگا اور نہ وہ غم کریں گے۔“

صراط مستقیم کیا ہے؟

صراط مستقیم مجموعہ ہے عقائد حقہ اور اعمال صالحہ کا، جن کا رکن رکن صرف اللہ واحد کو اپنا رب (مالک و پروردگار) جاننا اور صرف اسی کی عبادت کرنا ہے۔ چنانچہ حضرت عیسیٰؑ کی زبانی ذکر کیا کہ انہوں نے بحکم خدا بنی اسرائیل سے کہا تھا: ان اللہ ربی و ربکم فاعبدوه ہذا صراط مستقیم ○ (پ ۳)

”پس تم سب اسی کی عبادت کرو، یہی صراط مستقیم ہے۔“

عقائد حقہ کی بنیاد یہ ہے کہ دل و جان سے خدائے واحد کی ربوبیت کا اقرار کیا جائے اور زبان سے اس کی شہادت دی جائے۔ تو اس کے متلق فرمایا۔ ان اللہ ربی و ربکم اور اعمال صالحہ کی بنیاد عبادت خدا ہے۔ سو اس کی نسبت فرمایا۔ فاعبدوه اور ان دونوں کو ملا کر بتایا۔ ہذا صراط مستقیم اس سے صاف معلوم ہو گیا کہ یہ دونوں صراط مستقیم ہیں۔ اسی طرح سورہ یس، پ ۲۳ میں مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن کفار سے کہے گا۔ وان اعدلونی ہذا صراط مستقیم یعنی (کیا میں نے تم سے یہ بھی نہ کہہ دیا تھا) کہ میری ہی عبادت کرنا، یہی صراط مستقیم ہے۔

اسی طرح توحید الہی پر جے رہنے اور شرک نہ کرنے، ماں باپ سے نکی کرنے، اولاد کو قتل نہ کرنے، ظاہری اور باطنی فواحش کے قریب تک نہ پھٹکنے، ناحق خون نہ کرنے، طاقت بھر ماپ اور قول کے پورا کرنے، یتیموں کے مال میں بے جا تصرف نہ کرنے، عدل و انصاف کی بات کہنے اور عہد کے پورا کرنے کی تاکیدات بلیغ کرنے کے بعد فرمایا۔ وان ہذا صراطی مستقیم ”فاتبعوه ولا تتبعوا السبل (انعام، پ ۸) کہ یہی میری سیدھی راہ ہے، جس کی پیروی کرنی ہوگی۔“

توضیح:- استقامت، اوجہ جہت یعنی کجی کی ضد ہے اور اس سے مراد ہے کسی چیز کا اپنی اصلی

حالت پر قائم ہونا اور اس کی ضرورت ہر امر میں ہے۔ اعتقاد میں بھی، عمل میں بھی اور قول میں بھی، تعلیم میں بھی اور تعلیم میں بھی، سیکھنے سمجھنے میں بھی اور سکھانے میں بھی، دین میں بھی، دنیا میں بھی، صنعت و دستکاری میں بھی اور دیگر کام کاج میں بھی، استدلال میں بھی اور دعوت و ارشاد میں بھی، اشتغال میں بھی اور فراغت میں بھی، معاشرت خانگی اور بال بچوں کی تربیت میں بھی اور تمدن و سیاست میں بھی حتیٰ کہ طبعی تقاضوں یعنی نیند، بیداری، کھانے پینے میں بھی اور اپنی ہر حالت یعنی اٹھنے، بیٹھنے، کھڑا ہونے اور چلنے پھرنے میں بھی غرض ہمارے لیے نہایت ضروری ہے کہ ہماری زندگی کے ہر امر اور ہر حال اور ہماری ماند و بود کے ہر طریقے اور ہر کیف میں ہمارا طریق کار درست اور باقاعدہ ہو۔ سو اسی امر کے لیے جناب خداوندی میں دعا کی جاتی ہے اور اس سے توفیق طلب کی جاتی ہے کہ الٰہی تو ہمیں ہمارے ہر کام میں جو ہمیں پیش آئے یا ہم اس میں پڑیں صراط مستقیم کی ہدایت فرما۔

اس وقت ہم بیان کر رہے ہیں کہ بغیر کجی کے اصلی حالت پر قائم ہونے کو استقامت کو کہتے ہیں۔ اسے ہم مثال سے سمجھاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی قامت سیدھی کھڑی بنائی ہے جو اس طرح ہے کہ سر اوپر کو ہے اور پاؤں زمین سے لگے رہتے ہیں۔ پس کھڑا ہونے اور چلنے کے وقت سیدھا قیام اور سیدھی چال یوں ہوگی کہ سر اوپر کو ہو اور جس طرف کو آنکھیں ہوں۔ اس طرف کو قدم اٹھائیں اور الٹی چال یہ ہوگی کہ پاؤں اوپر کو کر کے اور منہ نیچے کر کے ہاتھوں کے بل چلیں یا پشت کی طرف الٹے پاؤں چلیں۔ قرآن حکیم نے اسی مثال کو ذکر کر کے دینی صراط مستقیم سمجھایا ہے۔ چنانچہ فرمایا:-

افمن یمشی مکباً علی وجہہ اھدی ام من یمشی سویاً علی صراط مستقیم ○ (سورۃ الملک، پ ۲۹)

”تو کیا وہ شخص جو منہ کے بل گرتا ہوا چلتا ہے۔ درست کار ہے یا وہ جو سیدھا کھڑا ہو کر سیدھی راہ پر چل رہا ہے۔“

اسی طرح دوسرے امور و حالات میں سمجھ لیجئے۔ اسلام کی ہر تعلیم اور آنحضرت ﷺ کی ہر سنت مستقیم ہے۔ یعنی اصلی اور مناسبت حالت پر ہے۔ نہ اس میں افراط ہے نہ

تقریط، کیوں کہ یہی دو صورتیں اصلی حالت کو بگاڑتی ہیں۔ اسی معنی میں آنحضرت ﷺ خطبات جمعہ و عیدین میں اعلاناً فرمایا کرتے تھے۔

ان خیر الحدیث کتاب اللہ و خیر الہدی ہدی محمد (صلی اللہ علی وسلم) (صحیح مسلم، جلد اول)

”کہ سب کلاموں سے بہتر اللہ کی کتاب ہے اور سب دستوروں سے بہتر محمد ﷺ کا طریقہ کار ہے۔“

ہم اسے چند مسائل ذکر کر کے سمجھاتے ہیں:-

۱۔ حفظ بدن کے لیے خوراک کی ضرورت ہے اور تحصیل خوراک کے لیے کب روزگار کی اور بقائے نسل کے لیے بیوی کی۔

بعض لوگ ان ضرورتوں کو پورا کرنے میں منہمک ہو کر حلال و حرام کی تمیز نہیں کرتے اور بعض ان سے ایسے کنارہ کش ہو جاتے ہیں کہ راہب و درویش بن کر تارک الدنیا بن جاتے ہیں۔ پہلے لوگ افراط میں ہیں اور دوسرے تقریط میں۔

اسلام نے نکاح کو مقرر کیا اور سفاح (بدکاری) سے منع کیا اور حلال روزی کھانے کا حکم کیا اور حرام سے منع فرمایا۔ یہ اس امر میں صراط مستقیم اور حالت اعتدال ہے۔

۲۔ دن معاش کمانے کے لیے اور رات سونے اور آرام کرنے کے لیے ہے لیکن روزی کے پیدا کرنے والے اور اس کے کمانے کی قوت و قابلیت عطا کرنے والے اور رات کو آرام دینے والے کا بھی حق ہے اور بیوی کا بھی حق ہے۔ پس اگر کوئی شخص سارا دن معاش کے کمانے میں لگا رہے اور رات کو ساری رات سویا رہے یا بیہیت میں رہے تو وہ حق نفس میں افراط کرتا ہے اور جانب خدا میں تقریط اور اگر کوئی شخص دن اور رات عبادت میں مشغول رہتا ہے اور زن و فرزند کے حقوق اور اپنی جان کے حق آرام میں تغافل و تساہل کرتا ہے تو وہ ان حق داروں کی جانب میں تقریط کرتا ہے۔ اسلام توسط کی راہ بتاتا ہے کہ کماؤ بھی اور نماز بھی پڑھو۔ اسی لیے نماز فجر کے بعد سے دن ڈھلنے تک کوئی نماز فرض نہیں کی۔ اس کے بعد کچھ بعد دیگرے رات تک علی التواتر چار نمازیں مقرر کر دیں کہ دنیا کے کام کاج میں بھی حرج نہ ہو اور عبادت بھی ساتھ ساتھ ہوتی

رہے۔ تاکہ امور دنیا میں اشناک نہ ہو جائے۔ پھر رات کے وقت نماز عشاء کے بعد سو جانے اور حقوق زوجیت کی ادائیگی کو پسند فرمایا۔ پھر اس آرام و آسائش کے بعد پچھلی رات میں نماز تہجد کی ترغیب دی۔ پس رات کے وقت بھی سب کام مستقیم و درست رہے اور افراط و تفریط کی جانب بھی نہ ہوئی۔

۳۔ کھانا قیام زندگی کے لیے ضروری ہے لیکن اس میں اشناک بہیت کی ترقی ہے نہ انسانیت کی۔ ”تور شکم دم بدم تافتن“ میں افراط ہے اور اس کے مقابلے میں نفس کشی کے خیال سے ہمیشہ روزہ رکھنے میں ایک طرف سے تو افراط ہے اور دوسری جانب سے تفریط۔

اسلام نے روزہ بھی سکھایا لیکن ہمیشہ نہیں۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے حضرت عبداللہ بن عمروؓ بن عاص سے فرمایا تھا:-

صم و افطرونم فان لجسدک علیک حقاً وان لعینیک علیک حقاً وان لزوجک علیک حقاً وان لزورک علیک حقاً لا صام من صام النھر صوم ثلثة ایام من کل شھر صوم النھر کلہ صم کل شھر ثلثة ایام و اقرء القرآن فی کل شھر ”الحديث“ متفق علیہ (مشکوٰۃ ص ۱۷۱)

”تو روزہ بھی رکھ اور افطار بھی کر“ (رات کو نماز تہجد میں) قیام بھی کر اور سو بھی کیوں کہ تجھ پر تیرے جسم کا بھی حق ہے اور تیری آنکھوں کا بھی حق ہے۔ جس نے سدا روزہ رکھا اس کا کوئی روزہ نہیں۔ ہر مہینے میں تین (نفل) روزے ہمیشہ کے روزے (کی بجائے) ہیں۔ پس تو ہر مہینے میں تین دن (نفل) روزے رکھا کرے اور ہر مہینے میں قرآن کا ختم کیا کر۔“

ضروری ہدایت:- اسی ضمن ہم اخراجات میں کفایت شعاری اور میانہ روی کے متعلق اسلامی تعلیم کو الگ سرخی سے لکھنا چاہتے ہیں۔ کیوں کہ مسلمان عموماً ”اس امر میں کوتاہ اندیشی سے فضول خرچی کی وجہ سے زیر بار ہو کر اپنے آپ کو تباہ و برباد کر رہے ہیں۔ اگر ان کی زندگی کسی حالت میں بھی گزر رہی ہے تو دوسروں کی ماتحتی و محتاجی میں

گزر رہی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ مال جمع کرنے کے لیے نہیں بلکہ حاجات میں خرچ کرنے کے لیے کمایا جاتا ہے۔ بعض حاجتیں تو پیش افتادہ ہوتی ہیں اور بعض آئندہ پیش آنے والی ہوتی ہیں۔ ان میں سے بعض یقینی ہوتی ہیں اور بعض کی توقع ہوتی ہے اور بعض کا اندیشہ ہوتا ہے اور بعض ناگاہ آ پڑتی ہیں اور ایک اور ہے جو ایک کوئے میں پوشیدہ ہے اور نظر نہیں آتی اور مسلمان اس سے سخت غفلت میں ہیں اور وہ ان کو گھن کی طرح دن بدن کھا رہی ہے۔ وہ قرض اور پھر سودی قرض کی زیر باری ہے۔ اسلام یہ نہیں کہتا کہ تم حاجات میں خرچ نہ کرو۔ بلکہ اول تو یہ کہتا ہے کہ سب حاجات کو نگاہ میں رکھو۔ جو پیش افتادہ ہیں۔ ان میں تو مناسب خرچ کرو اور جو پیش آنے والی ہیں۔ ان کے لیے ابھی سے پس انداز کرو۔ دیگر یہ کہ حاجت پیش آئے تو حسب بالا اس میں خرچ تو کرو لیکن اپنی طبیعت اور بے لگام خواہش سے خود حاجتیں پیدا نہ کرو اور غیر ضروری کو ضروری کا درجہ نہ دو۔ مسلمانو! اللہ تم کو سمجھ دے۔ تم تو ضروری و غیر ضروری کی تمیز سے بالا جا رہے ہو۔ تم اپنی ناجائز خواہشوں میں ایسے تیرو ہو کہ سراسر ناجائز اور قطعی حرام اور دین و دنیا کو بجاہ بلکہ روسیہ کرنے والے اخراجات کو نہایت بے باکی و نا عاقبت اندیشی سے نہایت شوق بلکہ فخر سے اپنے سر لے رہے ہو۔ خداوند! ہمیں اس امر میں صراط مستقیم کی سمجھ دے اور اس پر چلنے کی توفیق عطا کرے۔ (آمین)

اسراف کے برے انجام سے بے پرواہ مسلمانو! سنو، اللہ تعالیٰ کیا فرماتا ہے:-
وَالَّذِينَ إِذَا أَنْفَقُوا لَمْ يَسْرِفُوا وَلَمْ يَقْتُرُوا وَكَانَ بَيْنَ ذَلِكَ قَوَامًا ○ (فرقان، پ ۱۹)

”اور (رحمن کے بندے) وہ لوگ (ہیں) کہ جس وقت وہ خرچ کرنے لگتے ہیں تو نہ تو فضول خرچی کرتے ہیں اور نہ کنجوسی کرتے ہیں بلکہ (ان کا خرچ) اس کے درمیان ایک سیدھی گزران ہوتا ہے۔“

وَأَتِذَا الْقَرَبَىٰ حَقَّهُ وَالْمَسْكِينِ وَابْنَ السَّبِيلِ وَلَا تَبْذِرْ تَبْذِيرًا ○ ان المبذرين كانوا اخوان الشیطین وکان الشیطن لربہ کفوراً ○
”اور دے تو قرابت مند کو حق اس کا اور مسکین کو بھی اور مسافر کو بھی اور مت

اڑا بکھیر کر بے شک اڑانے والے شیطانوں کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا ناشکر ہے۔“

ولا تجعل يدك مغلولة الى عنقك ولا تبسطها كل البسط فتقعد ملوماً محسوراً ○ (بنی اسرائیل، پ ۱۵)

”اور نہ رکھ اپنا ہاتھ بندھا ہوا اپنی گروں کے ساتھ یعنی کنجوسی نہ کر اور نہ کھول دے اس کو پورا کھولنا۔ پھر تو بیٹھ رہے ملامت کیا ہوا حسرت خوردہ ہو کر۔“

ان آیتوں میں جائز ضرورتوں میں کفایت شعاری اور میانہ روی سے خرچ کرنے کا حکم بھی کیا ہے اور فضول خرچی اور کنجوسی ہر دو امروں سے منع بھی کیا ہے۔ کیوں کہ فضول خرچی افراط ہے اور کنجوسی تقریب ہے اور جائز ضرورتوں میں کفایت شعاری سے خرچ کرنا جس سے اپنی حالت قائم رہے۔ میانہ روی اور اعتدال ہے جو صراط مستقیم ہے۔

مسلمانو! اگر تم ان آیات پر عمل کر کے اپنی آمدنی میں سے آئندہ پیش آنے والی ضرورتوں کے لیے بچا رکھا کرو تو اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے۔ ورنہ خلاف ورزی کی صورت میں جو کچھ تم پر گزر رہا ہے، وہ تمہارے سامنے ہے۔ واللہ الہادی۔

غرض ہمیں ہر امر میں صراط مستقیم کے لیے اللہ تعالیٰ سے ہدایت و توفیق مانگنے کی حاجت ہے اور وہ صراط مستقیم آنحضور ﷺ کی سنت پر عمل کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ و تقنا اللہ لا تبا عھا۔

امام رازیؒ نے اس جگہ صراط کو مستقیم سے موصوف کرنے کی وجہ میں لکھا ہے کہ اہل ہندسہ کے نزدیک دو لفظوں کو ملانے میں جس قدر خطوط کھینچے جائیں۔ ان میں سے جو سب سے چھوٹا خط ہوگا، وہ مستقیم ہوگا۔ باقی سب منحنی یعنی ٹیڑھے ہوں گے۔ پس بندہ اللہ تعالیٰ سے صراط مستقیم کی التجا بچند وجوہ کرتا ہے۔

اول:- اس لیے کہ چونکہ بندہ عاجز و ضعیف ہے۔ اس لیے اس کے ضعف کو مناسب یہی مختصر طریق یعنی صراط مستقیم ہی ہے۔

دوم:- اس لیے کہ خط مستقیم صرف ایک ہی خط ہوتا ہے اور منحنی یعنی ٹیڑھے کئی ایک

ہوتے ہیں۔ جو ٹیڑھا ہونے میں باہم تشابہ ہوتے ہیں اور سالک کو اس تشابہ کی وجہ سے راہ اختیار کرنے میں حیرت و تردد ہوتا ہے اور صراط مستقیم بوجہ ایک ہونے کے کسی سے تشابہ نہیں۔ اس لیے وہ خوف و آفت سے دور اور امن و امان کے قریب ہوتا ہے۔

سوم:- اس لیے کہ طریق مستقیم منزل مقصود پر یقیناً پہنچا دیتا ہے اور ٹیڑھا رستہ (یقیناً) نہیں پہنچا سکتا۔

چہارم:- اس لیے کہ مستقیم متغیر نہیں ہوتا اور ٹیڑھا متغیر ہو جاتا ہے۔

پس ان وجوہ کی بناء پر بندہ اللہ تعالیٰ سے صراط مستقیم (پر چلنے کی توفیق) طلب کرتا ہے۔ (مترجماً "بزیادة")

پھر چونکہ صراط مستقیم کی عملی نشاندہی اور تعین بھی ضروری ہے تاکہ وہ محض ذہنی ہونے کی صورت میں محل نظر و نزاع نہ ہو جائے۔ اس لیے اس کے بعد کہا۔
صراط الذین انعمت علیہم۔ کیوں کہ جس طریق پر عمل کرے سے پہلے لوگ کامیاب ہو چکے ہوں اور وہ ضلالت و غضب سے سلامت رہ کر اللہ تعالیٰ سے انعام پا چکے ہوں۔
اس طریق کے مستقیم ہونے میں کوئی شک نہیں ہو سکتا۔

وان اعدوني هذا صراط مستقيم (یس، پ ۲۳)

الجزء السابع

من تفسير الفاتحة

طريق الصالحين!

في تفسير قوله

صراط الذين انعمت عليهم

غير المغضوب عليهم ولا الضالين ○

صراط الذین انعمت علیہم ”راہ ان لوگوں کی جن پر تو نے انعام کیا“

ترکیب نحوی، ارتباط و لطائف ادبیہ:-

(۱) صراط الذین بدل ہے الصراط المستقیم سے اور فائدہ اس کا یہ ہوا کہ صراط مستقیم کی تفسیر معلوم ہو گئی اور اس بدل اور مبدل منہ ہر دو کے لانے سے کلام میں نہایت درجے کی وضاحت ہو گئی کہ استقامت و اعتدال والی اور سیدھی راہ وہ ہے۔ جس پر اللہ تعالیٰ کے انعام یافتہ صالحین عمل پیرا رہے۔ نہ وہ جو کوئی ذہنی طور پر اپنے دماغ سے تراش کر مقرر کر لے۔

(۲) صراط الذین کہا ہے۔ صراط من نہیں کہا۔ حالانکہ الذین اور من ہر دو اسم موصول ہیں۔ اس لیے کہ الذین شخص و معین کے لیے آتا ہے اور من کبھی نکرہ موصوفہ بھی آ جاتا ہے۔ چونکہ اس موقع پر صراط مستقیم کی تعین و تشخیص مطلوب ہے۔ اس لیے الذین بہت موزوں ہے اور بلاغت کی جان بھی ہے کہ امر مقصود کو ملحوظ رکھا جائے۔^{۸۱}

(۳) انعمت کو فعل معروف کی صورت میں ذکر کر کے انعام کی اسناد ذات حق کی طرف کی۔ تاکہ توجہ و عنایت ایزدی ظاہر ہو کہ سب کچھ اسی کے فضل سے حاصل ہوا ہے۔ اس کی توفیق کے سوا کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔

جو کچھ کہ ہوا، ہوا فضل سے تیرے

ہم کیا ہیں کہ کوئی ہم سے ہوگا

اور یہ بھی ایک قرینہ ہے اس بات کا کہ اس سے پہلی آیت میں احدنا سے مراد یہ ہے کہ الہی! ہمیں صراط مستقیم پر چلنے کی توفیق عنایت فرما^{۸۲} جیسا کہ دوسرے موقع پر اسی مضمون کو یوں بیان کیا ہے:-

۸۱۔ عزیزی مع الزیادۃ۔

۸۲۔ عزیزی وابن جریر ملخصاً۔

رب لوزعنی ان اشکر نعمتک الّتی انعمت علی و علی والدی و ان اعمل صالحاً ترضاه ○ (نمل، پ ۱۹- احقاف، پ ۲۶)
 ”اے میرے پروردگار! میری قسمت میں کر کہ میں تیری نعمت کا جو تو نے مجھ پر اور میرے ماں باپ پر کی ہے، شکر کروں اور یہ کہ میں ایسا نیک کام کروں جو تجھے پسند ہو۔“

(۴) ایک سے نعمت تک سب صنفے جو ذات حق کے لیے ہیں۔ سب مخاطب صورت میں ہیں۔ اس لیے کہ جب ایک میں حضوری کی وجہ سے صنفہ خطاب سے عرض کی تو اب اس کے بعد حضور سے ہٹ کر غائب ہونا تنزل کا درجہ ہے، نہ کہ ترقی کا اور بلاغت کی جان مقتضائے حال اور مقصود اصلی کی رعایت ہے۔ خذہ فانه دقیق و لطیف۔
 (۵) نعمت بصنفہ ماضی ذکر کیا نہ تنعم مضارع اس لیے کہ زمانہ مستقبل کے لوگ ابھی موجود نہیں اور زمانہ حال کے لوگ عمل ابتلاء ہیں۔ لہذا ان کے انجام ہمیں معلوم نہیں۔ ہاں زمانہ ماضی کے صالحین کی بابت اللہ اور اس کے رسولؐ کی خبر سے علم ہو چکا ہے کہ وہ فائز الرام ہو چکے ہیں۔ پس انہی کے طریق کی پیروی کی توفیق مانگنی مناسب ہے۔ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کی روایت ذیل میں یہی نکتہ ملحوظ ہے، جو آپؐ نے فرمایا۔

من کان مستنّاً فلیستن بمن قد مات فان الحی لا نومن غلیہ الفتنة اولئک اصحاب محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کانوا افضل هذه الامة ابرہا قلوبہا و اعماقہا علما و اقلہا تکلفاً اختارہم اللہ لصحبة نبیہ و لاقامة دینہ فاعرفو الہم فضلہم و اتبعوا علی اثرہم و تمسکوا بما استطعتم من اخلاقہم و سیرہم فانہم کانوا علی الہدی المستقیم (رواہ رزین مشکوٰۃ، ص ۲۳)

”جو شخص اقتدا کرنا چاہے تو اقتدا کرے ان لوگوں کی جو فوت ہو گئے۔ کیوں کہ زندہ شخص فتنہ (ابتلاء) سے امن میں نہیں ہے اور وہ محمد ﷺ کے اصحاب ہیں۔ جو اس امت میں سے سب سے افضل تھے۔ دلوں کے سب سے نیک اور علم میں سب سے گہرے اور تکلف میں سب سے کم۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے نبیؐ کی صحبت کے لیے اور اپنے دین کے قائم کرنے کے لیے منتخب فرما لیا تھا۔ پس تم ان کی فضیلت کو پہچانو اور ان

کے قدموں پر چلو اور جہاں تک تم سے ہو سکے، ان کے اخلاق اور ان کی سیرت کو مضبوطی سے پکڑو۔ کیوں کہ وہ ضرور ضرور ہدایت مستقیم پر قائم تھے۔“

اسی اصول کی بناء پر حضرت نوحؑ اور حضرت ابراہیمؑ سے لے کر حضرت عیسیٰؑ تک کئی ایک انبیاء کرامؑ کا ذکر کر کے آنحضور ﷺ کو حکم کیا۔ اولئک الذین ہدی اللہ فبہدھم اقتدہ (انعام، پ ۷) یعنی یہ وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت بخشی تھی۔ سو (اے نبی!) تو بھی انہی کی اقتداء کر یعنی ان کی راہ پر چل۔

تبصرہ:- اس مقام پر صراط ہدایت یافتہ لوگوں یعنی منعم ملیم کی طرف مضاف کیا اور آیات ذیل میں اپنی طرف مضاف کیا:-

☆ وھذا صراط ربک مستقیماً (انعام، پ ۸)

”یہ ہے تیرے رب کی راہ جو سیدھی ہے۔“

☆ وان ھذا صراطی مستقیماً (انعام، پ ۸)

”یہ ہے میری راہ جو سیدھی ہے۔“

☆ وانک لتھدی الی صراط مستقیم صراط اللہ الذی لہ ما فی السموت وما فی الارض (شوری)

”اور (اے پیغمبر!) تم تو (لوگوں کو) سیدھی راہ کی طرف رہنمائی کرتے ہو۔ وہ راہ جو اللہ کی راہ ہے۔ جس کی ملک ہے ہر شے، جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے۔“

ان ہر سہ آیات میں صراط ذات حق کی طرف مضاف ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تقرر کے لحاظ سے تو صراط مستقیم کی اضافت اللہ تعالیٰ ہی کی طرف درست ہے کہ وہ اس کا مقرر کردہ ہے لیکن عمل و روش کے رو سے کہ کون لوگ اس پر چلتے رہے۔ اسے منعم ملیم کی طرف مضاف کیا۔ پس الگ الگ اضافتیں اعتبارات کے جدا ہونے کی وجہ سے ہیں۔ اہل منطق کہتے ہیں۔ لولا الاعتبارات لبطلت الحکمة یعنی اگر اعتبارات کا لحاظ نہ ہو تو حکمت و دانائی بے کار ہو جائے۔ (میر، والحمد للہ!)

توضیح:- اللہ تعالیٰ کے انعامات دو طرح کے ہیں۔ ظاہری اور باطنی، چنانچہ فرمایا:-

الم تر ان الله سخر لكم ما فى السموات وما فى الارض واسبع عليكم نعمة ظاهرة وباطنة ومن الناس من يجادل فى الله بغير علم ولا هدى ولا كتب منير ○ (لقمان، پ ۲۱)

”کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے کام میں لگا رکھا ہے۔ جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور تم پر اپنی ظاہری اور باطنی نعمتیں کامل طور پر پوری کی ہیں۔ اس پر بھی بعض لوگ بغیر علم اور ہدایت اور کسی (آسمانی) روشن کتاب کے اللہ کے بارے میں ناحق جھگڑا کرتے ہیں۔“

اللہ تعالیٰ کے ظاہری یعنی عالم اجسام کے متعلق انعامات کی تفصیل قرآن مجید میں بیش از بیش ہے لیکن سورۃ فاتحہ کی آیت زیر تفسیر میں جس انعام کا ذکر ہے۔ اس سے باطنی اور دینی نعمت یعنی اللہ کی مرضی پر چلنے کی توفیق مراد ہے کیوں کہ جب قرآن مجید کی تصریح کے مطابق منعم علیہم سے انبیاء، صدیق، شہید اور صالحین مراد ہیں۔ تو جو خصوصی نعمت ان پر ہوئی ہے۔ یہاں پر وہی مراد ہو سکتی ہے اور صراط مستقیم سے اسی نعمت کو تعلق ہو سکتا ہے۔ ورنہ دنیوی انعامات تو کافرو مومن، فاسق و صالح سب پر عام ہیں۔ چنانچہ اپنے خلیل حضرت ابراہیمؑ کی بابت فرمایا:۔

شاکرؑ لانعمہ، اجتنبہ و ہداه الی صراط مستقیم ○ (النمل، پ ۱۳)
”اس کی نعمتوں کا شکر گزار تھا۔ اللہ نے اسے منتخب کر لیا تھا اور اسے راہ راست پر ڈال دیا تھا۔“

اس آیت میں حضرت ابراہیمؑ پر اللہ تعالیٰ کے انعامات کا بھی ذکر ہے اور ہدایت صراط مستقیم کا بھی۔ اسی طرح سورۃ انعام میں کئی انبیاء کرامؑ کا ذکر کر کے فرمایا۔ ومن ابائہم و ذریئہم و اخوانہم واجتنبینہم و ہدینہم الی صراط مستقیم ○ (انعام، پ ۷)

”ان میں سے بعض (جن کے) باپ اور اولاد اور بھائی بھی تھے۔ ان میں سے بعض کو ہم نے فضیلت بھی بخشی تھی اور منتخب بھی کیا تھا اور ان کو راہ راست پر بھی ڈال دیا تھا۔“

اسی طرح سورۃ نساء کے اخیر میں فرمایا:۔

فاما الذين امنوا بالله واعتصموا به فسيدخلهم الله في رحمة منه وفضل و
يهدىهم اليه صراطا مستقيما" ○ (النساء، پ ۶)

”لیکن جو لوگ اللہ پر ایمان لائے اور انہوں نے اسی کا سہارا پکڑا تو اللہ تعالیٰ ان کو اپنی رحمت میں اور فضل میں داخل کرے گا اور ان کو اس سیدھی سڑک پر ڈال دے گا۔ جو اس تک جا پہنچتی ہے۔“

ان آیات میں صراط مستقیم کی ہدایت کو انعامات دینیہ میں گنا ہے۔ دیگر یہ کہ دنیا میں ایسے اشخاص کثرت سے ہوئے ہیں کہ ان پر اللہ تعالیٰ کی ظاہری نعمتیں بیش از بیش ہوئیں لیکن وہ اللہ کی رضا جوئی کے رستے پر نہ چلے اور اس سے ہمک گئے تو ان پر اللہ کا غضب ٹوٹا۔ پس ان کی روش صراط مستقیم پر نہیں ہو سکتی اور ہدایت الہی کا طالب ان کی راہ اختیار نہیں کر سکتا۔ اس لیے یہاں پر صرف وہی لوگ مراد ہیں۔ جن پر اللہ تعالیٰ کی باطنی و روحانی نعمتیں ہوئیں اور وہی اس قابل ہیں کہ اللہ تک پہنچنے کے لیے ان کی راہ اختیار کی جائے اور وہی اس لائق ہیں کہ ان کی اقتداء کی جائے۔ اسی لیے اس کے بعد ان کی صفت میں غیر المغضوب علیہم ولا الضالین کہا گیا ہے کہ نہ تو ان پر اللہ کا غضب ہوا اور نہ وہ راہ مستقیم سے ہٹ کر کسی اور طرف کو گئے۔ جیسا کہ اس کے بعد ان شاء اللہ مفصلاً مذکور ہوگا۔

صراط مستقیم والے اور انعام والے کون ہیں؟

صراط مستقیم والے اور انعام والے لوگ وہ ہیں جو اللہ کے حکموں پر چلتے ہیں اور وہ چار گروہ ہیں۔ چنانچہ فرمایا:۔

ولو انهم فعلوا ما يوعدون به لكان خيرا لهم واشد تثبيتا ○ واذا لاتينهم من لدنا اجر عظيم ○ ولهدينهم صراطا مستقيما ○ ومن يطع الله ورسوله فأولئك مع الذين انعم الله عليهم من النبيين والصديقين والشهداء والصالحين وحسن أولئك رفيقا ○ (پ ۵)

”اور اگر وہ بجالاتے وہ امر جس کی ان کو نصیحت کی جاتی ہے تو ان کے لیے بہتر ہوتا اور ثابت قدمی میں بہت مضبوط اور پھر ہم ان کو اپنے پاس سے اجر عظیم عطا کرتے

اور صراط مستقیم پر بھی پہنچا دیتے اور جو کوئی فرمانبرداری کرے اللہ کی اور اس کے رسولؐ کی تودہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے، جن پر اللہ نے انعام کیا۔ یعنی انبیاء اور صدیق اور شہید اور دیگر صالحین اور یہ لوگ رفیق بننے میں بہت ہی اچھے ہیں۔“

مقامات اربعہ مذکورہ بالا

۱۔ نبوت:-

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ صراط الذین انعمت علیہم کی تفسیر کے ذیل میں حقیقت نبی کے متعلق لکھتے ہیں:-

”اس انسان (نبیؐ) کو اللہ تعالیٰ کسی بشری تعلیم و تربیت کے سوا بلا واسطہ کامل کرتا ہے۔ بدیں طور کہ نور القدس کی تاثیر اس کی قوت نظری (دماغی) میں ایسے طور پر واقع ہوتی ہے کہ اس کی معلومات میں اشتباہ و التباس کا دخل ہرگز نہیں ہو سکتا اور اس کی عملی قوت میں ایسا ملکہ (راسخہ) پیدا کرتا ہے کہ اس سے اعمال صالحہ بکمال رغبت (و سہولت) صادر ہوتے ہیں اور برے اعمال سے بکمال نفرت محفوظ (و معصوم) رہتا ہے۔ اور جب اس کے بدنی قوی کمال کو پہنچ جاتے ہیں اور اس کی تجربی عقل بھی نہایت کو پہنچ جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اسے دیگر لوگوں کی تکمیل کے لیے مبعوث کرتا ہے اور معجزات سے اس کی صداقت ظاہر کرتا ہے اور معجزہ کبھی تو جنس قول سے ہوتا ہے۔ جیسے قرآن مجید اور کبھی جنس فعل سے جیسے انگلیوں سے پانی کا جاری ہو جانا اور اس کو ان (قوی و فعلی) معجزات کے ساتھ عقلی نشانات بھی دیئے جاتے ہیں۔ جو خواص کے لیے موجب ایمان ہوتے ہیں۔ جس طرح کہ معجزات عوام کے ایمان کا باعث ہوتے ہیں۔ وہ عقلی نشانات کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ ازاں اجملہ اخلاق کریمہ ہیں اور علوم صادقہ (و حقہ) بھی ہیں۔ اور بیان شافی اور حجت واضحہ بھی، و ازاں اجملہ انوار صحبت ہیں۔ کہ جس طرح کمتر درجے والے (عام) لوگ معجزات سے (صداقت نبوت پر) استدلال کرتے ہیں۔ اسی طرح کامل لوگ ان کمالات سے استدلال کرتے ہیں خصوصاً جب کہ امراض روحانیہ کا علاج اور ناقص لوگوں کی تکمیل اور ہم صحبت لوگوں پر انوار (ایمانیہ) کی شعاعوں کا فیضان ان سے مشاہدے میں آتا ہے۔ بعض کی عقل بھی کرتی ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کی ہستی اور اس کی ذات و صفات کے (اقرار کے) متعلق بعض اوقات وہ ایسی باتیں بیان کرتے ہیں۔

جن کو عقل بالا استقلال حاصل نہیں کر سکتی۔ مثلاً "مخلوق کے متعلق اللہ تعالیٰ کے روزانہ احکام (تکوینی) اور اعمال صالحہ پر ثواب اور برے اعمال پر عذاب و سزا کی تفصیلات نیز ان افعال کا بیان کرنا جو بعض لوگوں کے نزدیک گاہے (ایک اعتبار سے) نیک شمار ہوتے ہیں اور گاہے (دوسرے اعتبار سے) برے ہوتے ہیں۔ پس اگر معجزات و نشانات عقیدہ (مذکورہ بالا) کی تصدیق ہمراہ نہ ہو تو محض عقل خصوصاً "عوام الناس کی عقل ان امور کا اعتبار نہ کرے اور ان کے مبعوث ہونے کا فائدہ مستحق نہ ہو۔" (انتہی مترجماً) ص ۱۰، تفسیر عزیزی)

حافظ ابن حزم قرطبیؒ نے "کتاب الفضل" میں، امام غزالیؒ نے مختلف کتب میں، امام رازیؒ نے "تفسیر کبیر" اور دیگر کتب میں اور شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے حجتہ اللہ میں حقیقت نبوت کے متعلق نہایت مفید بحثیں لکھی ہیں لیکن شاہ عبدالعزیزؒ کی مذکورہ بالا عبارت حقیقت و شان نبوت کے سمجھانے میں سہل اور جامع ہے۔ اس لیے ہم نے اسی کو منتخب کیا ہے۔ رحمہم اللہ اجمعین۔

تفہیم :- جیسا کہ قاعدہ ہے کہ ہر سلسلے کی ابتداء بھی ہوتی ہے اور انتہا بھی۔ اسی طرح سلسلہ نبوت کی ابتداء ابو البشر آدمؑ سے ہوئی اور اس کی انتہا فخر دو عالم محمد رسول اللہ ﷺ پر ہو گئی۔ ان ہر دو انبیاء کرامؑ کے درمیان کتنے نبی اور رسول ہوئے؟ اس کی صحیح تعداد اللہ رب العزت کو معلوم ہے۔ جن روایتوں میں تعداد مذکور ہے، وہ سداً صحیح نہیں۔ قرآن حکیم میں صاف الفاظ میں فرمایا:-

☆ ولقد بعثنا فی کل امۃ رسولاً ان اعبدوا اللہ واجتنبوا الطاغوت
 "اس میں شک نہیں کہ ہم نے ہر امت میں رسول بھیجا کہ (صرف) اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت سے الگ رہو۔" (نحل، پ ۱۳)

☆ ولقد ارسلنا رسلاً من قبلک منهم من قصصنا علیک ومنہم من لم نقصص علیک (مومن، پ ۲۳)

"اس میں بھی شک نہیں کہ ہم نے تجھ سے پہلے کئی ایک رسول بھیجے۔ ان میں سے بعض کا ذکر ہم نے تجھ پر کر دیا اور بعض کا نہیں کیا۔"

پس جس نبی کا ذکر قرآن و حدیث میں مذکور ہے۔ اس پر تفصیلی ایمان ہے اور

جس کا نام مذکور نہیں، اس پر اجمالی ایمان ہونا چاہیے کہ اگر وہ نبی تھا تو ہمارا اس پر ایمان ہے ورنہ اللہ جانے۔

سب انبیاء و رسلؑ پر ایمان رکھنا واجبات سے ہے

حضرت آدم علیہ السلام سے آنحضرت خاتم النبیین ﷺ تک جس قدر انبیاء و رسلؑ ہوئے۔ ان سب پر ایمان لانا اور ان کو منجانب اللہ جاننا واجبات سے ہے۔ ان میں سے کسی ایک سے بھی انکار کرنا ویسا ہی کفر و ضلالت ہے۔ جیسا کہ سارے سلسلے سے انکار۔ چنانچہ اللہ تبارک و تعالیٰ مسلمان قوم کو ارشاد فرماتا ہے:-

قولوا امنا باللہ و ما انزل الینا و ما انزل الی ابراہیم و اسمعیل و اسحق و یعقوب و الاسباط و ما اوتی موسیٰ و عیسیٰ و ما اوتی النبیین من ربہم لا نفرق بین احد منهم و نحن لہ مسلمون (بقرہ پ ۱)

”(مسلمانو!) تم اقرار کرو کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس پر بھی جو ہماری طرف اتارا گیا اور اس پر بھی جو ابراہیمؑ اور اسمعیلؑ اور اسحقؑ اور یعقوبؑ اور اولاد یعقوبؑ پر اتارا گیا اور اس پر بھی جو موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو دیا گیا اور (اس پر بھی) جو دیگر انبیاء کرامؑ کو ان کے رب کی طرف سے دیا گیا۔ ہم ان میں سے کسی میں بھی فرق نہیں کرتے اور ہم سب اسی (ایک خدا) کے فرماں بردار ہیں۔“

دوسرے موقع پر اپنی ذات خداوندی پر، اپنے رسول پاک (محمدؐ) پر اور آپ کی پاک کتاب (قرآن مجید) پر اور اس سے پہلی کتابوں پر اور فرشتوں پر اور روز قیامت پر ایمان لانے کا حکم کیا اور جو انکار کرے اسے گمراہ قرار دیا۔ چنانچہ ارشاد ہے:-

یا ایہا الذین امنوا امنوا باللہ و رسولہ و الکتب الذی نزل علی رسولہ و الکتب الذی انزل من قبل و من یکفر باللہ و ملککته و کتبہ و رسلہ و الیوم الآخر فقد ضل ضلالا بعیدا ○ (النساء، پ ۵)

”اے ایمان لانے والے لوگو! ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول (محمدؐ) پر اور اس کتاب پر جو اس نے اس سے پہلے نازل کی۔ اور جو شخص اللہ تعالیٰ سے اور اس کے فرشتوں سے اور اس کی کتابوں سے اور اس کے رسولوں سے اور پچھلے دن (روز قیامت

سے) کفر کرے تو (سمجھو کہ) وہ (ایمان سے) نہایت دور کی گمراہی میں پڑ گیا۔“
تیسرے موقع پر اس ضلالت (کفر) کو اختیار کرنے والے اور بعض انبیاء کرامؑ کو
ماننے اور بعض سے انکار کرنے والوں کو تحقیقی کافر قرار دیا اور ان کی نسبت خواری کے
عذاب کی خبر دی۔ چنانچہ ارشاد ہے:-

ان الذین یکفرون باللہ ورسلہ ویریدون ان یفرقوا بین اللہ ورسلہ ویقولون
نومن ببعض و نکفر ببعض و یریدون ان یتخذوا بین ذالک سبیلاً ○
اولئک ہم الکفرون حقاً، واعتدنا للکفرین عذاباً مہیناً ○ (پ ۶)
”بے شک وہ لوگ جو اللہ سے اور اس کے رسولوں سے کفر کرتے ہیں اور
چاہتے ہیں کہ (ایمان کے بارے میں) اللہ میں اور اس کے رسولوں میں تفریق کریں اور
کہتے ہیں کہ ہم بعض (انبیاء) کو ماننے ہیں اور بعض کو نہیں ماننے اور چاہتے ہیں کہ اس
کے درمیان ایک (نئی) راہ اختیار کریں۔ وہ لوگ سچ بچ کافر ہیں اور ہم نے ان کفار کے
لئے نہایت خوار کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔“

توضیح:- اس آیت میں کفر کی کئی صورتیں بیان کی گئی ہیں جو کسی اور مقام پر یکجا بیان
نہیں ہوئیں۔ ہم ان کو واضح کرنے کے لیے نمبر وار بیان کرتے ہیں۔

- ۱۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبروں ہر دو سے انکار، جو ہمارے نزدیک دہریہ لوگوں کا
مسئلہ ہے کہ وہ نہ ذات حق کے قائل ہیں اور نہ اس کے رسولوں کے معتقد۔
- ۲۔ امر ایمان میں اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبروں میں تفریق کرنا یعنی اللہ تعالیٰ پر تو
ایمان رکھنا لیکن اس کے پیغمبروں سے انکار کرنا۔ اس کی مثال ہم آریوں کو پیش کر
سکتے ہیں کہ وہ ذات حق کے تو قائل ہیں لیکن سلسلہ نبوت کے قائل نہیں۔ چنانچہ
امام رازیؒ فرماتے ہیں۔ ای یریدون ان یفرقوا بین الایمان باللہ ورسلہ یعنی
وہ یہ چاہتے ہیں کہ ایمان لانے میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں میں جدائی کریں
اور علامہ زعمریؒ کہتے ہیں۔ الذین امنوا باللہ وکفروا برسلہ یعنی جن لوگوں
نے اللہ تعالیٰ کو مانا اور اس کے پیغمبروں سے انکار کیا، وہ سب کافر ہیں۔

- ۳۔ بعض انبیاء کو ماننا اور بعض کو نہ ماننا، اس طریق پر یہود و نصاریٰ ہیں کہ وہ بعض
کو ماننے ہیں اور بعض کو نہیں ماننے۔ مثلاً ”یہود حضرت محمد ﷺ، حضرت عیسیٰ علیہ

السلام، حضرت یحییٰ علیہ السلام اور حضرت زکریا علیہ السلام کو نہیں مانتے اور نصاریٰ حضرت محمد ﷺ کو اور بعض دیگر انبیاء کو نہیں مانتے۔

۴۔ کفر اور ایمان کے درمیان ایک تیسری راہ اختیار کرنا کہ نہ صریحاً "کفر و تکذیب" پائی جائے اور نہ ایمان و تصدیق کی حقیقت کا اظہار ہو۔

اس کی صورت ہمارے ذہن میں یہ آتی ہے کہ کسی خاص نبی مثلاً "آنحضور ﷺ" یا سلسلہ نبوت کی تکذیب و تحقیر نہ کی جائے بلکہ ان کی اصلاح کو قدر دانی کی نظر سے دیکھا جائے اور ان کی تعلیم کی تحسین کرتے ہوئے ان کی شخصیت کی تعریف کی جائے اور ان کو تعظیم و تکریم سے یاد کیا جائے اور ان سے خصوصی عقیدت کے بغیر جہاں تک ہو سکے اپنی اصلاح بھی کر لی جائے۔

آنحضرت ﷺ کو یا کسی اور پیغمبر برحق کو یا سارے سلسلہ انبیاء کو اپنے اپنے وقت کے ریفاہ مر اور مصلح تو جانا جائے لیکن ان کی نسبت اس اعتقاد کو ضروری نہ جانا جائے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں اور ان کی تعلیم اللہ کی طرف سے نازل شدہ ہے۔ جس کی پیروی ہر مکلف پر واجب ہے اور ان کو اللہ تعالیٰ اور اس کے بندگان کے درمیان سفیر اور قبولیت اعمال کے لیے ضروری واسطہ و ذریعہ نہ سمجھا جائے اور سب سے الگ ہو کر ان کے صدیقین کے زمرہ میں شامل نہ ہوں اور ان پر ایمان لانے اور ان کی اطاعت کو نجات اخروی کے لیے ضروری و لازم نہ سمجھیں۔

یہ ایک ایسی راہ ہے جو نہ ظاہراً "کفر و تکذیب" ہے اور نہ اس میں ایمان و تصدیق کی حقیقت پائی جاتی ہے۔ اس کی مثال میں ہم یورپ کے اکثر مستشرقین کو اور اپنے ملک کے برہم سماجیوں کو پیش کر سکتے ہیں۔ جو آنحضور ﷺ کی بغایت تعریف کرتے ہیں اور آپ کی اصلاح کو نظر عزت سے بھی دیکھتے ہیں اور آپ کو دنیا بھر کا بزرگ ترین مصلح بھی جانتے ہیں لیکن نہ تو خود مسلمان اور آپ کے امتی کہلاتے ہیں اور نہ آپ کے دعویٰ رسالت الہی کی تصدیق کرتے ہیں۔

آیت مذکورہ بالا میں ان ہر چار اصناف کی نسبت فرمایا۔ اولئک ہم الکفرون حقا یعنی یہ سب لوگ جھج جھج کے کافر ہیں۔ یعنی ان کے کافر ہونے میں کچھ بھی شک نہیں۔ واعتدنا للکفرین عذاباً مہیناً یعنی ہم نے ان سب کفار کے لیے سخت

خوار کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔

پہلی جماعت یعنی اللہ تعالیٰ اور حضرات انبیاء کرامؑ کے منکروں (لمحدوں اور دہروں) کے کافر ہونے میں کیا کلام ہے۔ کسی موجد کے بغیر کسی ایجاد کو موجود ماننا عقل کے پیچھے لٹھ لے کر پھرنا بلکہ عقل سے بے بہرہ ہونا نہیں تو اور کیا ہے؟۔ کیوں کہ دلالت عقل کی ایک صورت یہ ہے کہ مصنوعات سے صانع کے وجود پر استدلال کیا جائے۔ چنانچہ فرمایا:۔

والهکم الہ واحد لا الہ الا هو الرحمن الرحیم ان فی خلق السموات والارض و اختلاف الیل والنهار والفلک التی تجری فی البحر بما ینفع الناس و ما انزل اللہ من السماء من ماء فاحیا بہ الارض بعد موتها و بث فیہا من کل دابة و تصریف الریاح و السحاب المسخر بین السماء والارض لایت لقوم یعقلون ○ (بقرہ، پ ۲)

”تمہارا معبود بس ایک ہی معبود ہے۔ سوائے اس رحمن و رحیم کے کوئی دوسرا لائق عبادت نہیں ہے۔ بے شک زمین و آسمان کی پیدائش میں اور رات اور دن کے اختلاف میں اور کشتیوں میں جو دریا میں لوگوں کے نفع کی اشیاء لے کر چلتی ہیں اور بارش میں جسے اللہ تعالیٰ آسمان کی طرف سے نازل کرتا ہے۔ تو اس سے زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کر دیتا ہے اور اس میں ہر قسم کے جانور بکھیر دیتا ہے اور (مختلف قسم اور اطراف کی) ہواؤں کے پھرنے میں اور بادل میں جو آسمانوں و زمین کے درمیان ٹھہرایا ہوتا ہے۔ البتہ نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔“

اس آیت میں بعض مصنوعات عالم کو پیش کر کے فرمایا ہے کہ ان میں عقل کے

۱۲ اس آیت کی پوری تفسیر مع مفصل کوائف و وجوہات کے اس کے اپنے موقع پر یعنی دوسرے پارے میں بیان کی گئی ہے۔ جس کا بیاض تیار ہے لیکن ابھی طبع کی نوبت نہیں آئی۔ وہ بیان ایسا لطیف ہے کہ خدا کے فضل سے ناظرین کے دماغ روشن اور سینے ٹھنڈے ہو جائیں گے اور وہ خود دل و جان سے قرآن کریم کے اسلوب بیان کے گرویدہ ہو جائیں گے۔ ومانوفیقی الابالہ

استعمال کرنے والوں کے لیے ذات برحق کے موجود ہونے اور اس کی توحید الوہیت اور اس کے رحمن و رحیم ہونے کے دلائل و نشانات ہیں۔ ایسی دلیل کو منطقی علماء برہان ”ان“ کہتے ہیں۔ دنیا کو مخلوق و مصنوع مان کر اس کے خالق و صانع سے انکار کرنا، اس امر کے کفر ہونے میں کیا کلام ہو سکتا ہے؟

دوسری قسم کے لوگوں کے کافر ہونے کی یہ وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو جملہ موجودات عالم کا خالق و مالک جان کر اور اس کے نظام تربیت کو مان کر سلسلہ نبوت سے انکار کرنا جس پر روحانی تربیت کا انحصار ہے۔ خدائے حکیم کے سارے کارخانہ قدرت کا بے کاری کا شغل سمجھنا ہے اور یہ صریحا ”کفر ہے۔ چنانچہ فرمایا:-

وما خلقنا السماء والارض وما بينهما باطلا“ ذالک ظن الذین کفروا (ص، پ ۲۳) ”اور ہم نے آسمان اور زمین کو باطل (بے کار) نہیں بنایا۔ یہ ان لوگوں کا گمان ہے جو کافر ہو گئے۔“

توضیح:- دنیا دار الاسباب ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے اس کی جسمانی پیدائش و پرورش کے لیے جسمانی اسباب بنائے ہیں۔ اس طرح انسانوں کی روحانی تربیت کے لیے انبیاء کرام کو تہذیب اخلاق اور ہدایت کا سبب بنایا ہے۔ اگر ان کو تسلیم نہ کیا جائے تو انسان اور بہائم میں تمیز نہ رہے۔ دنیا میں جس قدر بھی اخلاقی یا روحانی برکات پائی جاتی ہیں۔ وہ سب حضرات انبیاء کرام کی تعلیم کے اثر سے ہیں۔ اور ان کا وجود قلبی نورانیت کے لیے دیا ہی ضروری ہے۔ جیسا کہ جسمانی نورانیت کے لیے آفتاب کا، جو لوگ اللہ کی اس نعمت سے متمتع نہیں ہوتے اور انسانی پیدائش کی غرض و غایت محض تمتعات دنیویہ میں منہمک رہنا اور انہی میں ترقی حاصل کرنا سمجھتے ہیں۔ ان کی نسبت فرمایا:-

والذین کفروا یتمتعون ویاکلون کما تاكل الانعام والنار مشوی لهم ○
”اور جو لوگ کافر ہو گئے۔ وہ (اسباب دنیا سے) فائدے اٹھاتے اور کھاتے ہیں۔ جس طرح کھاتے ہیں چوپائے اور ان کا ٹھکانا جہنم ہو گا۔“ (پ ۲۹)

تذکیر:- نظام نبوت کے اثبات کے لیے نظام دنیویہ سے استدلال کرنے کی کسی قدر وضاحت ہم سابقاً ”رب العالمین کی تفسیر کے ضمن میں کر چکے ہیں۔

تیسری قسم کے لوگوں کے کافر ہونے کی وجہ یہ ہے کہ جملہ انبیاء کرامؑ اللہ کے پیغمبر ہونے میں ایک جیسے ہیں۔ ذات حق سے جو نسبت و اضافت ایک کو ہے، وہی دوسرے کو ہے۔ ان میں سے کسی ایک کی نسبت سے انکار کرنا ویسا ہی کفر ہے۔ جیسا کہ سب کی نسبت سے انکار کرنا۔ کیوں کہ سب کی نسبت ایک ہے۔ پس ان میں یہ تفریق کرنا کہ بعض کو مان لیا جائے اور بعض کو نہ مانا جائے، درست نہیں۔ اسی لیے قرآن مجید میں سورہ بقرہ اور سورہ آل عمران میں لا نفرق بین احد منهم کے بعد ونحن لہ مسلمون کہہ کر اس نکتے کی طرف اشارہ کر دیا ہے کہ چونکہ وہ سب اللہ کے رسول ہیں اور ہم اسی (اللہ) کے حکم بردار ہیں۔ اس لیے ہم ان سب کا اقرار کرتے ہیں، جن کے اسمائے گرامی معلوم ہیں۔ ان کو تو صراحتہً "ان کے اسماء سے اور جن کی شخصیت معلوم نہیں۔ ان کو ان کے وصف سے یعنی اجمالاً" یوں کہتے ہیں کہ اگر وہ اللہ کے رسول تھے تو ہمارا ایمان ہے، ورنہ خیر۔

مسلمان ہونے میں ایمانی ترقی:- یہ عقیدہ صورت واقعی کی رو سے سوائے امت محمدیہؐ (علیٰ صاحبہا السلام و التحیہ) کے دنیا کی کسی دیگر ملت میں نہیں پایا جاتا۔ باقی تمام مذاہب سلسلہ نبوت کو مانتے ہوئے بھی بعض کو مانتے ہیں اور بعض کو نہیں مانتے۔ جیسا کہ ہم اوپر یہود و نصاریٰ کو مثال میں پیش کر کے بیان کر چکے ہیں۔ پھر غضب یہ کہ جن کو انہوں نے اللہ کے رسول اعتقاد بھی کر لیا ہے۔ انہیں غیر معصوم جانتے ہیں گویا کہ اللہ کی وحی کے امین انبیاء کرامؑ اور وہ امتی جن کی اصلاح کے لیے وہ مبعوث ہوئے۔ معاذ اللہ خدا تعالیٰ کے احکام سے عموماً بے پرواہ ہو جانے میں برابر ہیں۔ قاتلہم اللہ انی یؤفکون ○

لیکن ان کے مقابلے میں ہم مسلمان (امت محمدیہؐ) شروع سلسلہ یعنی حضرت آدمؑ سے لے کر آخر سلسلہ یعنی حضرت محمد ﷺ تک سب انبیاء کرام کو برحق جانتے ہوئے سب کو ان احکام خداوندی کی خلاف ورزی سے بالکل معصوم مانتے ہیں۔ جن کی تبلیغ کے لیے وہ مبعوث ہوئے اور ان جملہ گناہوں سے پاک صاف جانتے ہیں۔ جن کی اصلاح کے لیے وہ نبی بنائے گئے۔ پس نبوت محمدیہؐ کی تصدیق میں یہ مزیت ہے کہ اس میں ہر اس نبی کی تصدیق لازم ہے جو کسی زمانے میں بھی اور کسی قوم میں بھی مبعوث ہوا

اور ہر اس تعلیم پر ایمان لانا واجب ہے۔ جو کسی نبی پر کسی زبان میں بھی نازل ہوئی اور ہمارے ہاں اس امر میں آنحضرت ﷺ پر اور قرآن مجید پر ایمان لانے میں اور آنحضور ﷺ کے ادب و تعظیم میں اور کسی دیگر نبی پر ایمان لانے اور اس کے ادب و تعظیم اور اس کی تعلیم و کتاب پر ایمان لانے میں ذرہ بھر بھی فرق نہیں ہے۔ چنانچہ فرمایا:-

والذین يؤمنون بما انزل اليك وما انزل من قبلك (بقرہ، پ ۱)

”اور جو ایمان رکھتے ہیں اس پر جو (اے پیغمبر!) تم پر اتارا گیا اور جو تم سے پہلے (دیگر انبیاء پر) اتارا گیا۔“

اس کی توضیح میں یہ بھی سمجھ لیجئے کہ اگر کوئی عیسائی مسلمان ہو جائے تو چونکہ حضرت عیسیٰؑ اللہ کے سچے رسول ہیں اور اللہ کی طرف سے ان پر کتاب انجیل اتری۔ اس لیے اسے نبوت محمدیہؐ کا اقرار کرتے ہوئے حضرت عیسیٰؑ اور انجیل سے برگشتہ ہونا نہیں پڑے گا۔

اسی طرح کوئی یہودی مسلمان ہو تو اسے حضرت موسیٰؑ اور توریت سے منحرف نہیں ہونا پڑے گا۔ بلکہ ان سب کی نبوت کی تصدیق پر بحال رہ کر مکمل سلسلہ نبوت پر اپنے ایمان کو پورا کرنا ہوگا۔ جو ترقی کا درجہ ہے اور اگر خدا نخواستہ ہم مسلمان آریہ ہو جائیں تو معاذ اللہ اللہ تعالیٰ کی بعض صفات مثلاً ”خالقیت اور جملہ پیغمبروں اور اس کے فرشتوں اور اس کی جملہ کتابوں (توریت، زبور، انجیل اور قرآن مجید) سے انکار کرنا پڑے گا اور اسی طرح یہود و نصاریٰ ہو جانے کی صورت میں بھی بعض انبیاء کرامؑ سے جن سے یہود انکار کرتے ہیں۔ خصوصاً ”سید المرسلین“ خاتم النبیین ﷺ سے جن کی خبر خود حضرت موسیٰؑ دے گئے تھے، انکار کرنا پڑے گا اور اسی طرح نصاریٰ ہو جانے کی حالت میں اصل ایمان یعنی توحید الہی کی بجائے تثلیث کا قائل ہونا پڑے گا اور ان پیغمبروں سے جن سے عیسائی انکار کرتے ہیں۔ بالخصوص خاتم النبیین ﷺ سے جن کی خوش خبری خود حضرت عیسیٰؑ دے گئے ہیں، انکار کرنا پڑے گا۔ ان ہر مذہب میں داخل ہونے سے ایمان میں ترقی کیا لانا تزل ہوگا اور یہ ایمان کیا ہوگا، ایک مجموعہ کفریات ہو جائے گا۔ ونعوذ باللہ من ذالک

پس ایمانی کمال و ترقی نبوت محمدیہؐ کی تصدیق میں ہے نہ کہ کسی اور مذہب میں

اور یہ مذہبی دنیا پر آنحضرت ﷺ کا بڑا بھاری احسان ہے اور کمال درجے کی رواداری، فراخ دلی اور حق پرستی ہے کہ کسی صداقت سے بھی جو دنیا کے کسی گوشے میں کسی زمانے میں بھی اللہ کی طرف سے نازل ہوئی انکار نہیں کیا اور اپنے پیروؤں کے دل میں تعصب و ضد کو ہرگز داخل نہیں ہونے دیا۔

اللہم صل وسلم علی سیدنا محمدؐ نبی الرحمة

تفہیم:- کم علمی اور کوتاہ فہمی بھی ایک آفت ہے کہ اس سے کسی شے کی حقیقت اس کے اپنے درجے پر نہیں سمجھی جاسکتی اور اگر نہ زلیخ قلبی بھی ساتھ شامل ہو جائے تو آفت پر آفت سوار ہو جاتی ہے اور انسان کے لیے ہدایت کا رستہ بند ہو جاتا ہے۔ یہی حال اس گروہ کا ہے جو اپنے آپ کو اہل قرآن کہتے ہیں اور آنحضرت ﷺ کو قرآن مجید سے جدا رکھ کر اس کے معانی و تفسیر کو اپنی رائے اور خواہش کے سانچے میں ڈھالنا چاہتے ہیں۔ وہ آنحضرت ﷺ کو قرآن مجید کے اللہ کی طرف سے نازل ہونے میں تو واسطہ جانتے ہیں مگر اس کے معانی و تفسیر اور مراد الہی کے تقرر کے لیے واسطہ نہیں گردانتے۔ گویا کہ آنحضرت ﷺ پر تفہیم معانی کے بغیر محض الفاظ قرآنی کی وحی ہوتی تھی اور اللہ تعالیٰ آپ کو اپنی مراد نہیں سمجھاتا تھا۔ اس کی مثال تو معاذ اللہ یہی ہوئی کہ کوئی مسجد نشین مولوی کسی بچے کو محض الفاظ قرآنی پڑھا دے یا حفظ کرا دے۔

اس خیال نے ان لوگوں کو ایسا پھسلایا کہ نصوص قرآنیہ پر بھی نہ ٹھہر سکے۔ اس کی مثال یہ دیکھئے کہ انہوں نے کہیں قرآن حکیم میں لا نفرق بین احد من رسلہ دیکھ لیا اور ادھر مسلمانوں کی زبانی سن لیا کہ وہ آنحضرت ﷺ کو تمام انبیاء کرامؑ سے افضل جانتے ہیں، جو احادیث صحیحہ سے ثابت ہے تو چونکہ یہ لوگ حدیث نبویؐ کو نہیں مانتے، اس لیے انہوں نے ان احادیث کو اور آنحضور ﷺ کی فضیلت کلی کو اس آیت لا نفرق بین احد من رسلہ کے خلاف سمجھ کر اس سے انکار کر دیا اور یہ نہ سمجھے کہ تقاضا انبیاء کا مسئلہ تو نص قرآنی میں دو جگہ مذکور ہے۔ یعنی تلک الرسل فضلنا بعضهم علی بعض (بقرہ، پ ۳) میں اور ولقد فضلنا بعض النبیین علی بعض (بنی اسرائیل، پ ۱۵) میں یعنی ہم نے بعض انبیاء کرام کو بعض پر فضیلت دی ہے۔ تو اگر تقاضا انبیاء کرام کا مسئلہ آیت لا نفرق بین احد من رسلہ کے مقتضی کے خلاف

ہے۔ تو جن آیات مذکورہ بالا میں تقاضل انبیاء کو بالعموم ذکر کیا گیا ہے۔ ان کا مطلب کیا ہوگا اور یہ آیت ان سے کس طرح جمع ہو سکے گی؟۔ پھر تو معاذ اللہ آیات قرآنیہ میں صریح اختلاف ہوگا جو اسے کلام الہی ہونے سے گرا دے گا۔ چنانچہ فرمایا:۔ افلا يتدبرون القرآن ولو كان من عند غير الله لوجدوا فيه اختلافاً كثيراً“ (النساء، پ ۵) ○

”تو کیا یہ لوگ قرآن میں سوچ نہیں کرتے۔ اگر یہ قرآن اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو یہ لوگ اس میں بہت اختلاف پاتے۔ (لیکن اس میں تو مطلقاً“ اختلاف نہیں ہے۔)“

فہم سلیم اور طبع مستقیم ہو تو اس مسئلے کا حل یوں ہے کہ سب نصوص قرآنیہ اور حدیثیہ کو اپنے اپنے محل پر رکھا جائے۔ اس کی صورت یوں ہے کہ آیت لا نفرق بین احد من رسلہ میں مسئلہ تقاضل انبیاء ملحوظ نہیں ہے۔ بلکہ اس میں جس تفریق کی نفی کی گئی ہے۔ وہ وصف ایمان کے متعلق ہے کہ بعض انبیاء کو مانا جائے اور بعض کو نہ مانا جائے۔ جیسا کہ چھٹے پارے کی آیت میں جس کی توضیح میں ہم یہ طویل تقریریں لکھ رہے ہیں۔ صاف مذکور ہے۔ ویقولون تؤمن ببعض و نکفر ببعض (پ ۶) یعنی کہتے ہیں کہ ہم بعض کو مانتے ہیں اور بعض کو نہیں مانتے۔ پس تفریق بین الرسل و دیگر امر ہے اور تقاضل انبیاء دیگر امر ہے اور اختلاف و تناقض ایک ہی امر میں نفی اثبات کے اختلاف سے ہوتا ہے۔ جیسا کہ یہ مسئلہ کتب منطق میں شرائط کے ساتھ مفصل مذکور ہے۔ پس ہر ایک آیت اور ہر ایک مسئلہ اپنے اپنے حال پر قائم ہے اور درست ہے۔ (والحمد للہ)

اور جب تقاضل انبیاء نص قرآنی سے ثابت ہو گیا تو کوئی ایک فرد ایسا بھی ماننا پڑے گا، جو سب سے افضل ہو اور وہ حضرت محمد مصطفیٰ، احمد مجتبیٰ علیہ السلام ہیں۔ جیسا کہ احادیث صحیحہ میں آچکا ہے۔ پس وہ احادیث بھی اپنے حال پر قائم ہیں اور سب درست اور صحیح ہیں۔

اس کی توضیح یوں ہے کہ فضیلت دو قسم پر ہے۔ جزوی اور کلی جزوی۔ تو افراد

۸۳ جن میں سے بعض مشکوٰۃ شریف باب فضائل سید المرسلین علیہ السلام میں ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔

انبیاء میں منتشر ہے۔ کوئی نبی کسی امر میں خاص فضیلت رکھتا ہے اور کوئی کسی دیگر میں۔ لیکن فضیلت کلی تکمیل شریعت اور کمالات علیہ اور عملیہ اور عموم و عوت اور ختم نبوت اور حفاظت قرآن اور بقائے فیض اور آپ کی سنت و شریعت کے تبدیل و تحریف سے محفوظ رہنے کی وجہ سے ذات اقدس آنحضرت ﷺ کے لیے ہے اور اس کا مجمل ذکر فاضل انبیاء والی آیت میں بھی مذکور ہے۔ چنانچہ فرمایا:-

تلك الرسل فضلنا بعضهم على بعض منهم من كلم الله ورفع بعضهم درجات و اتينا عيسى ابن مريم البیت (بقرہ، پ ۳)
 ”یہ پیغمبر (جن کا ذکر اوپر ہوا) ہم نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت بخشی۔ ان میں سے بعض سے تو اللہ نے کلام کیا اور بعض کے درجات بلند کر دیئے اور عیسیٰ ابن مریم کو ہم نے روشن نشانات دیئے۔“

اس آیت میں فاضل انبیاء کے ذکر کے بعد موسیٰ کے لیے کلام اور عیسیٰ کے لیے معجزات کا ذکر کیا یعنی حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کے لیے ایک ایک وجہ فضیلت کا ذکر کیا ہے۔ جو فضیلت جزوی پر دلالت کرتا ہے لیکن ایک فرد خاص کے لیے بغیر ذکر اسم کے فرمایا۔ رفع بعضهم درجات اس میں نہ تو کسی خاص جزوی امر کا ذکر ب و نہ درجات کی تحدید ہے اور یہ امر فرد اکمل کے لیے ہی ہو سکتا ہے اور فرد اکمل کی پہچان کے لیے اس کے اسم کی تصریح ضروری نہیں ہوتی بلکہ اس کا وصف عنوانی ایسا معروف اور طابع میں ایسا مرکوز ہوتا ہے کہ ذہن اس کے سوائے کسی اور طرف نہیں جاسکتا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے خطاب اور ندا کے متعلق نبی پاک ﷺ کی نسبت اس امر کو خصوصیت سے ملحوظ رکھا ہے۔ حضرت آدم سے حضرت عیسیٰ تک بہت سے جلیل القدر انبیاء کرام کو لفظ یا سے خطاب اور ان کا نام نامی بالہراحت ذکر کیا ہے۔

۱۔ چنانچہ حضرت آدم کی نسبت فرمایا:- و قلنا یا آدم اسکن انت و زوجک الجنة (بقرہ، پ ۱)

۲۔ حضرت نوح کی نسبت فرمایا:- یا نوح اهبط بسلام منا و برکات علیک و علی امم ممن معک (ہود، پ ۱۲)

۳۔ حضرت ابراہیم کی نسبت فرمایا:- یا ابراہیم اعرض عن هذا (ہود، پ ۱۲)

۴- حضرت موسیٰؑ کی نسبت فرمایا:- یٰمُوسٰی اِنِّیْ اصْطَفٰیْتُکَ عَلٰی النَّاسِ بِرِسَالَتِیْ وَبِکَلَامِیْ (اعراف، پ ۹)

۵- حضرت عیسیٰؑ کی نسبت فرمایا:- اِذْ قَالَ اللّٰهُ یٰعِیْسٰی اِنِّیْ مَتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلٰی (پ ۳)

ان آیات میں حرف ندا کے ساتھ اسماء کی تصریح ہے لیکن آنحضرت ﷺ کی نسبت ایک جگہ بھی یا محمد ﷺ کر کے نہیں کہا بلکہ جہاں کہیں آپؐ کے لیے حرف ندا ذکر کیا ہے تو آپؐ کے عمدہ نبی اور رسول پر ذکر کیا ہے۔

۱- چنانچہ فرمایا:- یا ایہا الرسول لا یحزنک الذین یسارعون فی الکفر (مائدہ، پ ۶)

۲- نیز فرمایا:- یا ایہا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک (مائدہ، پ ۶)

۳- نیز فرمایا:- یا ایہا النبی اتق اللہ ولا تطع الکفرین ○ (احزاب، پ ۲۱)

۴- نیز فرمایا:- یا ایہا النبی قل لا رواجک (احزاب، پ ۲۱)

۵- نیز فرمایا:- یا ایہا النبی انا ارسلنک شاهدًا و مبشرًا و نذیرًا ○ و داعيًا

الی اللہ باذنہ و سراجًا منیرًا ○ (احزاب، پ ۲۲)

۶- نیز فرمایا:- یا ایہا النبی انا احللنا لک (احزاب، پ ۲۲)

۷- نیز فرمایا:- یا ایہا النبی قل لا رواجک و بناتک (احزاب، پ ۲۲)

۸- نیز فرمایا:- یا ایہا النبی اذا جاءک المومنات (ممتد)

۹- نیز فرمایا:- یا ایہا النبی اذا طلقتم النساء (طلاق، پ ۲۸)

۱۰- نیز فرمایا:- یا ایہا النبی لم تحرم ما احل اللہ لک (تحريم، پ ۲۸)

یہ دس مقامات ہیں جن میں آنحضور ﷺ کو نبی اور رسول کے وصف سے ندا کی گئی ہے اور قرآن مجید میں ایک مقام بھی نہیں، جس میں آپ کا اسم ذکر کر کے یا محمد (یا) یا احمد کر کے پکارا ہو۔ ہم نے یہ سب مقامات اس لیے ذکر کر دیئے ہیں کہ اس میں التزام پایا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ندا کے وقت اس امر کو خصوصیت سے ملحوظ رکھا ہے۔ اگر ایک آدھ موقع پر ہوتا تو شاید کوئی کہہ دیتا کہ یہ اتفاقی بات ہے مگر اس کثرت سے ایک بات کا التزام متکلم کی نظر میں خصوصیت کے ساتھ ملحوظ ہونے کی دلیل ہے۔

منادی معرف باللام کی خصوصیت:- جب کسی ایسے اسم کو منادی بنایا جائے۔ جس پر الف لام تعریفی داخل ہو تو اس اسم اور یا حرف ندا کے درمیان ای (اسم مبہم) اور کلمہ ہا زیادہ کیا جاتا ہے۔ یہ کلمہ ہا حسب موقع خاص خاص فائدے کے لیے ہوتا ہے۔ اگر وہ اسم صفت کا صیغہ ہو اور وہ صفت کسی اچھے وصف پر دلالت کرتی ہو تو کلمہ ہا منادی کی تعظیم یا محبوبیت یا شفقت پر (جیسا کہ موقع ہو) دلالت کرتا ہے۔ جیسے یا ایہا المزممل اور یا ایہا المدثر اور توبوا الی اللہ جمیعاً ایہ المومنون (نور، پ ۱۸) اسی قبیل سے ہے۔ یا ایہا الذین امنوا۔ اور اگر وہ صفت کسی برے وصف پر دلالت کرتی ہو تو یہ

کلمہ ہا منادی کی زجر و توبخ کے لیے ہوتا ہے۔ جیسے قل افغیر اللہ تاملونی اعبدا ایہا الجہلون (زمر، پ ۲۴) یعنی (اے پیغمبر! ان لوگوں سے) کہہ دو کہ اے نادان لوگو! کیا تم مجھے یہ امر کرتے ہو کہ میں اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت کروں؟۔ نیز قل یا ایہا الکفرون اور اسی قبیل سے ہے۔ یا ایہا الذین کفرو! لا تعتذرو! الیوم (تحریم، پ ۲۸) اور اگر منادی معرف باللام غافل و بے خبر ہو تو کلمہ ہا اسے تنبیہ کرنے اور خبردار و ہوشیار کرنے کے لیے لایا جاتا ہے۔ جیسے یا ایہا الناس اعبدوا ربکم (بقرہ، پ ۱) یعنی اے غافل لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو اور قل یا ایہا الناس انی رسول اللہ الیکم جمیعاً (اعراف، پ ۹) یعنی اے نبی! ان سے کہہ دو کہ اے تمام لوگو! (تم سب کو اطلاع ہو کہ) میں تم سب کی طرف اللہ کا پیغمبر ہوں۔

رجوع مطلب:- چونکہ مقامات عشرہ مذکورہ بالا میں یعنی یا ایہا الرسول اور یا ایہا النبی کے خطاب والی آیات میں رسول اور نبی صفت کے صفحے ہیں اور رسالت الہی اور نبوت نہایت عظمت و عزت کا درجہ ہے اور کسی مخلوق کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی مرتبہ نہیں ہے۔ اس لیے حسب تشریح بالا ان آیات میں کلمہ ہا عظمت شان اور جلالت قدر کے لیے ہو گا اور ان کے معنی ہوں گے۔ اے عظیم الشان رسول! اور اے جلیل القدر نبی!

نتیجہ تفصیل:- اس تطویل و تفصیل سے غرض یہ ہے کہ آیت رفع بعضہم درجات میں منضم سے مراد بنا بر آپ کے فرد اکمل ہونے کے ذات اقدس آنحضرت ﷺ ہے۔

چنانچہ علامہ زحشریؒ نے جو علوم ادبیہ میں مسلم امام ہیں۔ اس آیت کے ذیل میں علم بلاغت کے اس نکتے کو ملحوظ رکھ کر فرد اکمل کے نام کی تصریح ضروری نہیں ہوتی۔ بہت طویل عبارت لکھی ہے۔ ہم بنظر اختصار اس میں سے بعض اقتباسات نقل کرتے ہیں۔

☆ والظاہر انہ اراد محمدا صلی اللہ علیہ وسلم لانہ هو المفضل علیہم۔

”اور ظاہر یہ ہے کہ اس جگہ آنحضرت ﷺ مراد ہیں۔ کیوں کہ آپ ﷺ سب انبیاء سے افضل ہیں۔“

☆ وفي هذا الابهام من تفخيم فضله و اعلاء قدره ما لا يخفى لمافيه من الشهادة على انه العلم الذي لا يشبهه و المتميز الذي لا يلتبس

”اور اس عدم تصریح میں آپؐ کی فضیلت کی عظمت ہے اور آپؐ کی قدر کی ایسی بلندی ہے جو پوشیدہ نہیں۔ کیوں کہ اس میں اس امر کی شہادت ہے کہ آپؐ ایسے مخصوص فرد ہیں جو مشتبہ نہیں ہو سکتا اور ایسے متمیز و ممتاز ہیں کہ التباس نہیں پڑ سکتا۔“

☆ فيكون افخم من التصريح به وانوه لصاحبه (كشاف، جلد اول، ص ۲۷۷)

”پس ایسا ذکر کرنا تصریح سے بڑھ کر شان والا ہے اور اس کے صاحب یعنی نبی پاک ﷺ کے حق میں زیادہ رفعت والا ہے۔“

اسی طرح علامہ ابو العودؒ بھی یہ ذکر کرنے کے بعد کہ اس آیت میں مضمر سے مراد رسول اللہ ﷺ کی ذات اقدس ہے، فرماتے ہیں:-

والابهام لتفخيم شأنه و للاشعار بانه العلم الفرد الغني عن التعيين (جلد دوم، ص ۲۰۲)

”اور غیر مصرح ذکر کرنا آپؐ کی عظمت شان کے لیے ہے اور یہ معلوم کرانے کے لیے کہ آپؐ ایسے خاص فرد ہیں، جسے تعین کی حاجت نہیں۔“

تائید مزید:- جو وجوہ سیادت سابقاً مذکور ہو چکے ہیں۔ یعنی تکمیل شریعت، عموم دعوت و ختم نبوت وغیرہ ان کے علاوہ یہاں پر دو امور اور بیان کیے جاتے ہیں کیوں کہ وہ بھی نہایت دلچسپ ہیں۔

اول:- یہ کہ اصل سیادت (سرکاری) یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں قرب و منزلت سب سے زیادہ ہو۔ سو یہ بات آنحضرت ﷺ کی نسبت قرآن مجید میں خصوصیت سے مذکور ہے۔ چنانچہ فرمایا:-

عسیٰ ان یبعثک ربک مقاما محمودا ○ (پ ۱۵)
 ”(اے پیغمبر!) قریب ہے کہ تم کو تمہارا پروردگار مقام محمود میں کھڑا کرے گا۔“

اس آیت میں آنحضرت ﷺ کو مقام محمود میں کھڑا کرنے کا وعدہ کیا ہے اور اس میں آپؐ کے اسم پاک محمد ﷺ اور احمد ﷺ کی مناسبت ہے اور یہ بھی ملحوظ ہے کہ قیامت کے دن آپؐ اس مقام میں اللہ تعالیٰ کی حمد بیش از بیش کریں گے اور یہ مقام صرف آپؐ کی ذات گرامی کے لیے مخصوص ہے۔ جیسا کہ صحیح بخاری وغیرہ میں وارد ہے۔ نیز فرمایا:-
 ولسوف یعطیک ربک فترضی (والنہی، پ ۳۰) یعنی (اے پیغمبر!) تم کو تمہارا رب ضرور عطا کرے گا۔ پس تم راضی ہو جاؤ گے۔

اس آیت میں آنحضرت ﷺ کو کچھ عطا کرنے کا وعدہ ہے اور اس پر آنحضرت ﷺ کے راضی ہونے کی خبر بھی ہے۔ سو اس میں اول تو یہ دیکھنا ہے کہ عطا کا مفعول ثانی مذکور نہیں۔ یعنی یہ ذکر نہیں کیا کہ کیا چیز عطا کی جائے گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسے موقع پر مفعول ثانی بدو وجہ حذف کر دیا جاتا ہے۔ اول اس وجہ سے کہ وہ شے متکلم و مخاطب ہر دو کے نزدیک معلوم و مقرر ہوتی ہے۔ پس ذکر کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اسے معہود و ذہنی کہتے ہیں۔ دوم اس وجہ سے کہ اگر مفعول ثانی کو ذکر کر دیا جائے تو وہ چیز متعین ہو جاتی ہے اور وعدہ اسی کے متعلق رہتا ہے لیکن اگر حذف کر دیا جائے تو فائدہ عموم کا دیتا ہے۔ جیسا کہ کتب بلاغت (مطلول وغیرہ) میں مذکور ہے۔

پس اگر اس آیت میں پہلی وجہ سمجھی جائے تو خود آنحضرت ﷺ کے بیان کے مطابق اس عطا سے مراد مرتبہ شفاعت ہے اور اگر حذف کی دوسری وجہ سمجھی جائے تو بے باعطایا کا ملنا ثابت ہوتا ہے۔ پس بہر دو وجہ ہمارا مقصود ثابت ہے کہ خاتم الرسل ﷺ کی قدر و منزلت اللہ تعالیٰ کے ہاں سب سے زیادہ ہے۔ اسی معنی میں سرور کائنات، فخر موجودات ﷺ فرماتے ہیں۔ انا اکرم الاولین والاخرین علی اللہ ولا فخر

(ملکوتہ، ص ۵۰۶) یعنی میری قدر و منزلت اللہ رب العزت کے نزدیک سب اولین و آخرین سے بڑھ کر ہے اور میں اس پر فخر نہیں کرتا۔ (کیوں کہ یہ اس کا فضل ہے) دیگر یہ کہ اس آیت میں فترضیٰ پر ف کا لانا اس بات کی دلیل ہے کہ ترضیٰ اس عطائے ربانی کا نتیجہ ہے۔ تو چونکہ اللہ تعالیٰ حکیم ہے اور اس کا علم قدیم اور محیط کل ہے۔ اس لیے نبی پاک ﷺ کی یہ رضامندی خدا تعالیٰ کے علم و ارادے میں خاص طور پر ملحوظ و مقصود سمجھی جائے گی۔ چنانچہ تحویل قبلہ کے حکم میں بھی اسے ملحوظ رکھا ہے۔ جیسا کہ فرمایا۔ قَدْ نَرَى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاءِ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضَاهَا (بقرہ، ۲) یعنی (اے پیغمبر!) ہم تمہارے چہرے کو دمبدم آسمان کی طرف پلٹتے ہوئے دیکھتے رہتے ہیں۔ سو ہم تم کو ضرور ضرور اس قبلہ کا ولی (حاکم) بنا دیں گے۔ جسے تم پسند کرتے وہ۔ اس وجہ سے بھی ہمارا مقصود یعنی اثبات سیادت آنحضرت ﷺ حاصل ہے۔ (والحمد للہ) اور دوسرا امر یہ کہ حضور پاک ﷺ کی شان میں فرمایا۔ وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ یعنی (اے نبی!) ہم نے تمہارا ذکر بہت بلند کیا ہے۔

اللہ تبارک و تعالیٰ نے آپؐ کا رفع ذکر ایسی صورت میں کیا کہ اس کی نظیر کسی دیگر کے لیے نہیں پائی گئی۔ دنیا کے ہر حصے میں مخلوقات کے جاگنے سے اس کے سونے تک پانچوں وقت اذان میں بلند آواز سے آپؐ کی رسالت کی شہادت پکاری جاتی ہے۔ یہ چیز کسی دیگر کو حاصل نہیں ہوئی۔ انسانوں کے جاگنے سے ان کے سونے تک کیا نماز میں اور کیا نماز سے باہر آپؐ کے نام لیوا آپؐ کے احسانات کے عوض میں آپؐ پر درود شریف پڑھتے رہتے ہیں۔ جس سے آپؐ کا ذکر خیر بھی جاری رہتا ہے اور آپؐ کے درجات بھی بلند ہوتے رہتے ہیں اور آپؐ کی امت کے مدارج بھی بڑھتے رہتے ہیں۔ کما درود فی الحدیث

چار دانگ عالم میں اصلاح عالم، تہذیب اخلاق اور اقامت عدل کا ڈنکا آپؐ کے نام پاک کا بج رہا ہے۔ ذات پاک کے بندھن توڑ کر اور کالے گورے کے امتیاز سے منہ موڑ کر سب بنی آدم میں مساوات کو قائم کرنے کی وجہ سے دنیا جہان میں آپؐ کے نام کے گیت گائے جا رہے ہیں۔ مظالم و فواحش کے دور کرنے میں جو کامیابی آپؐ کو حاصل ہوئی۔ اس کی وجہ سے سارا جہان ممنون ہو کر آپؐ کو نیکی سے یاد کر رہا ہے۔ جس سے

آپ کی شانِ رحمتہ للعالمین کی حقیقت مہرِ نیروز کی طرح جلوہ دکھا رہی ہے۔
 یہ امور کیا انفراداً اور کیا اجتماعاً کسی دیگر کو حاصل نہیں ہیں۔ رفع درجات کی صورت کدائی صرف آپؐ کی ذات گرامی سے مخصوص ہوئی اور اس میں ورفع بعضہم درجت کی حقیقت صاف صاف نمایاں ہے اور اللہ تبارک و تعالیٰ کی خبر یا وعدہ جو ورفعنا لک ذکرک میں ہے، اسے ہم واقعات کی صورت میں عیاں دیکھ رہے ہیں۔
 والحمد للہ، اللہم صل علی محمد نبی الرحمة

الغرض رسول پاک ﷺ کی سیادت کلی کے دلائل خاص قرآن مجید میں بیش از بیش ہیں اور احادیث صحیحہ میں انہی کی توضیح و تشریح نہایت کثرت سے ہے۔

تنبیہ :- رسول اکرم ﷺ کی فضیلت کلی کا مسئلہ ضمناً درمیان میں آگیا تھا۔ جس کا بیان ہم نے اصل مضمون کی مناسبت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس موقع پر ضروری سمجھا۔

لذیذ بود حکایت دراز تر کشتم

چنانکہ حرف عصا گفت موسیٰ اندر طور

اعد ذکر نعمان لنا ان ذکرہ

هو المسک کما کررہ يتضوع

رجوع مطلب :- اس کے بعد ہم اصل مطلب کی طرف رجوع کرتے ہیں کہ :-

۴۔ چوتھی قسم کے لوگ جو درمیانی روش پر ہیں کہ نہ تو وہ انبیاء کرامؑ خصوصاً حضور اکرم ﷺ کی تحقیر و تکذیب کرتے ہیں اور نہ ان کی نبوت و رسالت کا اقرار و تصدیق کرتے ہیں۔ یہ لوگ بھی تین گروہوں کی طرح دائرہ کفر سے باہر نہیں ہوئے۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک انبیاء کرامؑ خصوصاً آنحضور ﷺ کی وہ تعظیم و تکریم مشعر و مقبول اور موجب نجات ہے۔ جو ان کی رسالت و نبوت کے اقرار و تصدیق کے ساتھ ہو۔ شریعت کی زبان میں اسی کو ایمان کہتے ہیں اور اگر یہ نہ ہو تو اس کی نفیض (الایمان) لازماً مستحق ہو جائے گی۔ دوسرے الفاظ میں اسی کا نام کفر ہے۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ کی نسبت فرمایا :-

فالذین امنوا به و عزروه و نصروه و اتبعوا النور الذی انزل معہ اولئک ہم

المفلحون ○ (اعراف، پ ۹)

”پس جو اس (نبی آخر الزمان) پر ایمان لائے اور انہوں نے اس کا ادب بھی کیا اور اس کی مدد بھی کی اور اس نور کی پیروی بھی کی، جو اس کے ساتھ آتا رہا۔ وہی لوگ نجات پانے والے ہیں۔“

اس آیت میں وعدہ نجات ان چار امور پر کیا ہے۔

۱۔ رسول پاک ﷺ پر ایمان لانا یعنی ان کے دعویٰ رسالت میں ان کی تصدیق کرنا۔

۲۔ نبی پاک ﷺ کا ادب و تعظیم بجالانا۔

۳۔ حضور پاک ﷺ کے مقاصد میں آپ کی مدد کرنا۔

۴۔ احکام قرآن مجید کی عملی پیروی کرنا۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ ادب و تعظیم اور مقاصد میں امداد اور تعلیم پر عمل ان سب امور کے علاوہ نجات کے لیے رسول پاک ﷺ کی رسالت پر ایمان لانا بھی واجب و ضروری ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ رسالت پر ایمان لائے بغیر محض ادب و تعظیم پر نجات کا وعدہ نہیں ہے۔

اسی طرح سورہ تغابن میں فرمایا: فامنوا باللہ ورسولہ والنور الذی انزلنا (تغابن، پ ۲۸)

”پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول (محمد) پر اور اس نور (قرآن پاک) پر جو ہم نے (اس پر) اتارا۔“

اس آیت میں جس طرح اپنی ذات و الوہیت پر ایمان لانے کا حکم کیا ہے۔ اسی طرح آنحضور ﷺ کی ذات گرامی اور آپ کی رسالت پر اور اس کلام پر جو آپ پر اتارا گیا ہے۔ ایمان لانے کا حکم کیا ہے اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل واجب ہے۔

اسی طرح سورہ حجرات میں اس سے بھی زیادہ واضح طور پر بیان کیا:۔

قالت الاعراب امنّا قل لم تؤمنوا ولكن قولوا اسلمنا و لما يدخل الايمان في قلوبكم وان تطيعوا الله ورسوله لا يلتكم من اعمالكم شيئا ان الله

غفور رحیم ○ انما المومنون الذین امنوا باللہ ورسولہ ثم لم یرتابوا وجاهدوا باموالہم وانفسہم فی سبیل اللہ، اولئک ہم الصدقون ○ (حجرات، پ ۲۶)

”بدویوں نے کہا کہ ہم مومن ہو گئے ہیں۔ اے پیغمبر! ان سے کہو تم مومن نہیں ہوئے۔ لیکن تم کہو کہ ہم زیر فرمان ہو گئے ہیں۔ کیوں کہ ابھی ایمان تمہارے دلوں میں نہیں گیا اور اگر تم اللہ تعالیٰ کی اور اس کے رسول (محمد ﷺ) کی فرماں برداری کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہارا کوئی عمل بھی ضائع نہیں کرے گا۔ بے شک اللہ تعالیٰ غفور و رحیم ہے۔ مومن تو صرف وہ لوگ ہیں جو (دل سے) اللہ پر اور اس کے رسول (محمد ﷺ) پر ایمان لائے۔ پھر انہوں نے (اس میں) شک نہیں کیا اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے جہاد کیا۔ وہی (دعویٰ ایمان میں) سچے ہیں۔“

اس آیت میں دعویٰ ایمان کی صداقت اور اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کی قبولیت کو ان امور پر موقوف رکھا ہے۔

○ اللہ رب العزت اور اس کے رسول پاک (محمد ﷺ) پر دل و جان سے ایمان رکھنا۔

○ اس امر میں شک اور تردد ہرگز ہرگز نہ کرنا۔ (کیوں کہ شک تصدیق کے منافی ہے)

○ عملی طور پر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پاک (محمد ﷺ) کے احکام کی بجا آوری کرنا۔

○ اللہ تعالیٰ کی راہ میں یعنی اللہ تعالیٰ کے کلمہ کو بلند کرنے اور دین حق کے قائم کرنے اور اسلام و مسلمین کی آزادی اور ان سے مظالم کے دور کرنے میں بوقت ضرورت مال و جان کی قربانی تک سے دریغ نہ کرنا۔

اسی طرح سورۃ بقرہ، پ ۲ میں اس سے بھی زیادہ تفصیل سے بیان کیا:۔ لیس البر ان تولوا وجوہکم قبل المشرق و المغرب و لکن البر من امن باللہ و الیوم الآخر و الملئکہ و الکتب و النبیین، و اتی المال علی حبه ذوی القربی و الیتیمی و المسکین و ابن السبیل و السائلین و فی الرقاب، و اقام

الصلوة و اتى الزكوة والموفون بعهدهم اذا عاهدو، والصبرين فى الباساء و الضراء و حين الباس، اولئك الذين صدقو و اولئك هم المتقون ○ (بقرة) پ (۲)

”نیکى یہ نہیں ہے کہ تم اپنے منہ مشرق اور مغرب کی طرف کر لو۔ بلکہ نیکی تو یہ ہے کہ کوئی اللہ پر اور پچھلے دن پر اور فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور تمام انبیاء پر ایمان لائے۔ اور مال اللہ کی محبت پر اپنے رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں اور سانکوں اور غلاموں کے آزاد کرنے میں دے اور نماز قائم کرے اور زکوٰۃ بھی ادا کرے اور وہ جو اپنے عہد پورے کریں۔ جب عہد کریں۔ خصوصاً وہ جو مصیبتوں اور بیماریوں اور لڑائی کے وقت صبر کریں۔ وہی لوگ (دعویٰ ایمان میں) سچے ہیں اور وہی (عمل میں) متقی ہیں۔“

اس آیت میں دعویٰ ایمان کی صداقت کو ان امور پر موقوف رکھا ہے:-

☆ جملہ ایمانیات کو بالتفصیل ماننا۔ مثلاً ”اللہ تعالیٰ“ روز آخرت، اس کے جملہ فرشتوں، اس کی جملہ کتب سماویہ اور اس کے جملہ انبیاء کو۔

☆ جملہ نیک اعمال کا بجا لانا خواہ از قسم عبادات ہوں یا معاملات یا حالات و واردات۔

ان آیات سے معلوم ہوا کہ ایمان کی شرعی حقیقت یہ ہے کہ جملہ ایمانیات کی دل و جان سے تصدیق کی جائے اور زبان سے ان کی شہادت دی جائے اور عملیات میں جملہ فرائض کو بجا لایا جائے اور منہیات سے پرہیز کیا جائے۔ ان ہر دو آیات میں بھی رسالت پر ایمان لانا بال تصریح مذکور ہے۔

اس مضمون کی آیات قرآن مجید میں اس قدر بکثرت ہیں کہ ان کا بیان کرنا دوپہر کے سورج کا دکھانا ہے۔ قرآن حکیم کے پڑھنے والے کو اس میں ہرگز ہرگز تردد نہیں ہو سکتا کہ آنحضرت ﷺ پر ایمان لائے بغیر صرف ادب و تعظیم اور آپ کی اصلاح کی تحسین وغیرہ امور مذکورہ بالا نجات کے لیے کافی نہیں ہیں بلکہ آپ کی رسالت کا اقرار و تصدیق نجات اخروی اور قبولیت درگاہ ایزدی کے لیے لازمی شرط ہے۔

ازالہ شبہ:- ہم نے خود بعض لکھے پڑھے آزاد خیال لوگوں کو کہتے سنا کہ نجات اخروی

کے لیے کسی معین گروہ میں شامل ہونا ضروری نہیں۔ مسلمان ہو یا یہودی، عیسائی ہو یا صابی کسی نسل و قوم سے ہو، کسی نام سے پکارا جاتا ہو لیکن اگر وہ خدا پرست اور نیک عمل ہے تو دین الہی پر چلنے والا ہے اور اس کے لیے نجات ہے۔ ہرچند کہ ان کا یہ خیال ان کے اپنے دماغ کی تراش اور ان کے دل کی خواہش سے ہے لیکن غلط فہمی یا بکجروی سے انہوں نے ایک آیت کو سارا بھی بنا لیا ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ ہمارے اس اعتقاد کی دلیل یہ آیت ہے:-

ان الذين امنوا والذين هادوا والنصرى والصابئين من امن بالله واليوم الآخر وعمل صالحا فلهم اجرهم عند ربهم ولا خوف عليهم ولا هم يحزنون
○ (بقرہ، پ ۱)

”بے شک جو لوگ ایمان لائے اور جو یہودی ہوئے اور عیسائی اور صابی، جو کوئی بھی اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان لائے اور نیک عمل کرے۔ تو ان کے لیے ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے اور ان پر کسی طرح کا خوف نہیں ہوگا اور نہ وہ غم کھائیں گے۔“

یہ مضمون سورہ مائدہ، پ ۶ میں بھی موجود ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ ان ہر دو آیات میں اللہ تعالیٰ نے صرف اپنی الوہیت پر اور روز آخر پر ایمان رکھنے اور نیک کام کرنے پر اجر دینے اور خوف و خطر سے امن میں رکھنے کا وعدہ کیا ہے اور کسی خاص یا عام نبی پر ایمان رکھنے کو اس فرست میں شمار نہیں کیا۔ بلکہ نجات اخروی کو مسلمانوں، یہودیوں، عیسائیوں اور صابیوں میں سے کسی خاص گروہ سے مخصوص نہیں کیا۔ بلکہ اسے مشترک وراثت قرار دے کر ان سب کو اس میں برابر کا حصہ دار ٹھہرایا ہے۔ بشرطیکہ وہ اللہ تعالیٰ پر اور آخرت پر ایمان رکھیں اور نیک عمل کریں۔

اختصار در اختصار:- ان ہر دو آیات میں ایمان بالرسول مذکور نہ ہونے سے بعض خوش فہمیوں نے تو اسے فرست امور ایمان سے کاٹ دیا لیکن مولانا آزاد صاحب ان سے بھی آزادی سے کام لینا چاہتے معلوم ہوتے ہیں کہ وہ اس آیت کو نقل کرنے کے بعد بضمن لفظ یعنی اس کا حاصل جو کچھ فرماتے ہیں۔ اس میں ایمان بالاخرت کو بھی حذف کر دیتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:-

”یعنی دین سے مقصود تو خدا پرستی اور نیک عملی کی راہ تھی۔ وہ کسی خاص حلقہ بندی کا نام نہ تھا۔ کوئی انسان ہو، کسی نسل و قوم سے ہو، کسی نام سے پکارا جاتا ہو لیکن اگر خدا پرست اور نیک عمل ہے تو دین الہی پر چلنے والا ہے اور اس کے لیے نجات ہے۔ (ترجمان القرآن، ۱۳۱)

ترجمان القرآن میں اس قسم کے اقتباسات بیش از بیش ہیں۔ جن پر بعض علمائے زمانہ نے مولانا موصوف پر نقض بھی کیا ہے۔ ان شاء اللہ ہم اس موضوع پر اس سے آگے الگ عنوان سے بحث کریں گے۔ ہر دوسرے ہم یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ اس آیت مذکورہ بالا سے بعض ان پڑھ مجتہدین نے جو یہ سمجھ لیا کہ کجیات کے لیے ایمان بالرسول ضروری نہیں صرف خدا پرستی اور نیک عملی کی ضرورت ہے۔ چاہے کسی دین پر ہو کر کی جائے، یہ درست نہیں۔ انہوں نے بفحوائے حفظت شیئہ و غابت عنک اشیاء۔ قرآن شریف کی کثیر التعداد نصوص بینہ کو جو ایمان بالرسول کے متعلق ہیں، نظر انداز کر دیا ہے اور اللہ تعالیٰ سے قلبی تعلق کے پیدا کرنے اور صحیح طریق پر اس کی عبادت کرنے اور تہذیب اخلاق اور معاملات کی درستی اور صحیح قانون عدالت سے جو خود غرضی اور تغلب کے داغ سے پاک ہو اور انصاف و مساوات کے قیام اور اس سے لوگوں کی جانوں اور ان کے ناموس اور اموال و حقوق کی حفاظت کرنے اور بزرگوں کی تعظیم اور چھوٹوں پر شفقت کرنے اور امانت داری اور وفا شعاری اورضعفاء پر رحمت و شفقت وغیرہ نیک امروں کے اجراء کے لیے۔

۲۔ اور ہر قسم کی فواحش و بے حیائی، ظلم و تعدی، غصب و خیانت، سرقت و رہزنی، شراب خوری اور قمار بازی وغیرہ منکر امور جو مخرب اخلاق اور مفسد نظام عالم ہیں، ان سب کے استیصال و انسداد کے لیے۔

۳۔ خاص کر ان سب نیک امور کے عمل میں لانے اور سب برے افعال سے اجتناب و پرہیز کرنے میں اپنا عملی نمونہ پیش کر کے لوگوں کی اصلاح کرنے کے لیے۔

۴۔ مولانا ابوسعید محمد حسین صاحب بٹالوی ایسے لوگوں کو جو آلات و قواعد اجتہاد سے بے بہرہ ہونے پر خلاف نصوص اجتہاد کر کے اختراع مسائل کرتے ہیں۔ ان پڑھ مجتہد کہتے تھے۔ یعنی لکھے نہ پڑھے نام محمد فاضل۔

اللہ کے رسول و نبی کی جو ضرورت ہے۔ اسے ہرگز خیال میں نہیں رکھا اور نہایت بے باکی و دلیری اور کوتاہ فہمی سے چھوٹے منہ سے بڑی بات کہہ دی ہے۔
اس کا جواب ہم کسی قدر تفصیل سے ذکر کرنا چاہتے ہیں کیوں کہ علاوہ ان آیات کے جو متفرق طور پر جا بجا قرآن مجید میں مذکور ہیں اور بعض ان میں سے سابقاً ذکر ہو چکی ہیں۔ خاص اسی آیت کا ایک ایک امر انبیاء اللہ کی ضرورت کی شہادت دے رہا ہے لیکن دکھائی اسے دے، جس کی آنکھیں ہوں اور سمجھے وہ، جس کے دماغ میں اور اک ہو۔

اس کی تفصیل سمجھنے کے لیے ایک تمہید کی ضرورت ہے۔ وہ یہ کہ علم بلاغت میں ایجاز و اطناب دو اصطلاحیں ہیں۔ ایجاز اختصار کو کہتے ہیں کہ مقصود کو کتر عبارت میں پورا پورا ادا کر دیا جائے اور اطناب و رازنی کو کہتے ہیں کہ کسی نفاذ فائدے اور نکتے کے لیے قدر متعارف سے لمبی عبارت میں بیان کیا جائے اور قدر متعارف میں بیان کیا جائے تو اسے مساوات کہتے ہیں۔ ان ہر سہ کے قواعد کتب بلاغت میں مذکور ہیں اور قرآن مجید میں یہ ہر سہ وارد ہیں لیکن قرآن مجید کا غالب حصہ کلام موجز ہے کہ اس میں بلاغت کے جو ہر سب سے زیادہ پائے جاتے ہیں اور ایجاز کی صورتوں میں سے ایک صورت حذف کی ہے کہ اگر کسی شے کے وجود پر کوئی قرینہ عقلی یا نقلی یا حالی یا مقالی دلالت کرتا ہو تو ان قرائن پر اعتماد کر کے اسے عبارت میں ذکر کرنے کی بجائے حذف کر دیا جاتا ہے۔ کیوں کہ اس میں علاوہ اختصار کے دماغ کا حظ ہوتا ہے اور تصریح میں یہ حظ حاصل نہیں ہوتا۔ اس کی مثالیں قرآن مجید میں بیش از بیش ہیں۔

اس تمہید کو ملحوظ رکھتے ہوئے اب گنتے جائیے کہ اسی آیت ان الذین امنوا والآیۃ میں ایمان بالرسول کے لیے کتنے قرینے ہیں۔

سب سے اول یہ کہ قرآن حکیم کی اس آیت کو آپ کلام اللہ ہونے کی حیثیت میں بطور دلیل پیش کر رہے ہیں اور ظاہر ہے کہ کلام اللہ کے ظہور کا ذریعہ صرف اللہ کا رسول ہے۔ یہ نہایت درجے کی نادانی ہے کہ قرآن مجید کو کلام اللہ تسلیم کریں اور حضرت محمد ﷺ پر نازل شدہ بھی مانیں لیکن آپ کو رسول اللہ ﷺ اعتقاد نہ کریں۔
بریں عقل و دانش بناید گریست

جناب اگر آپ محمد ﷺ کی رسالت پر اعتقاد نہ رکھیں گے تو قرآن مجید کو کلام اللہ کس طرح تسلیم کریں گے اور پھر قرآن مجید سے دلیل کس طرح پکڑیں گے۔ ہوش کرو! آنکھیں کھولو! عقل سے کام لو اور اپنے ایمان کو سنبھالو۔

دوم یہ کہ اس آیت میں جن فرقوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہ سب انبیاء کرام کی امتیں ہیں۔ (علی اختلاف فی الصابین) امنوا میں مسلمان دین محمدیؐ والے ہیں۔ چنانچہ مولانا ابوالکلام آزاد صاحب اس کا ترجمہ یوں کرتے ہیں:-

○ جو لوگ (پیغمبر اسلام پر) ایمان لائے ہیں۔ (ترجمان، ص ۱۴۱)

○ جو لوگ (پیغمبر اسلام پر) ایمان لا چکے ہیں۔ (ترجمان، ص ۱۹۰)

○ جو لوگ (قرآن پر) ایمان لائے ہیں۔ (ترجمان، ص ۴۰۲)

والذین ھادوا والنصارى یسود و نصاری علی الترتیب حضرات موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کی امتیں ہیں۔ والصابین امام ابن جریر طبریؒ نے ابو العالیہ وغیرہ سے نقل کیا کہ صابین اہل کتاب میں سے ایک گروہ تھا، جو زبور کا قائل تھا۔ اور قاموس میں کہا ہے کہ وہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ ہم حضرت نوحؑ کے دین پر ہیں۔ اور حافظ ابن حزمؒ نے ”کتاب الفصل“ میں لکھا ہے کہ صابین اور مجوس بعض انبیاء کی تصدیق میں ہمارے ساتھ ہیں۔ (جلد اول، ص ۹۸)

اس تفصیل سے معلوم ہو گیا کہ مذکورہ بالا سب فرقے انبیاء کرام کی امتیں ہیں۔ خواہ کسی حال میں ہوں لیکن ان کے نام لیوا ضرور ہیں۔ پس جس امر کا اقرار ان فرقوں کے نام میں ملحوظ ہے۔ اس کا الگ ذکر کرنا ضروری نہ ہوا لہذا ایمان بالرسال فرست ایمانیات سے خارج نہیں ہو سکتا۔

سوم یہ کہ اگر متکلم کسی جگہ اختصار کرے تو سب سے پہلے اس کی تفصیل اس کے اپنے کلام و تصریح میں تلاش کرنی چاہیے۔ اس بناء پر ہم کو دیکھنا چاہیے کہ کلام اللہ یعنی قرآن حکیم اور نبی قرآن یعنی آنحضرت ﷺ نے ایمان باللہ کی تشریح کیا کی ہے؟-

سو معلوم ہوا کہ قرآن حکیم میں اس مضمون کی آیات بکثرت ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ ایمان موجب نجات ہے جو ان جملہ امور سے پاک ہو، جو منافی ایمان ہیں

اور جملہ ایمانیات پر شامل و حاوی ہو۔ مثلاً "شرک ایک ایسا امر ہے کہ اگر ایمان کے ساتھ مل جائے تو یہ تو پاک نہیں ہوگا۔ البتہ ایمان برباد ہو جائے گا۔ چنانچہ فرمایا:-

(ترجمہ مولانا ابوالکلام آزاد صاحب)

☆ الذین امنوا ولم یلبسوا ایمانہم بظلم اولئک لہم الامن و ہم مہتلون ○ (انعام، پ ۷)

"جن لوگوں نے اللہ کو مانا اور اپنے ماننے کو ظلم (یعنی شرک سے) آلودہ نہیں کیا۔ تو انہی کے لیے امن ہے اور وہی ٹھیک راستے پر ہیں۔"

☆ وما یؤمن اکثرہم باللہ الا وہم مشرکون ○ (یوسف، پ ۱۳)
"اور اکثر ان میں سے اللہ پر ایمان تو لاتے ہیں مگر اس حال میں کہ وہ شرک بھی کرتے ہیں۔"

☆ ولو اشرکوا الحبط عنہم ما کانوا یعملون ○ (انعام، پ ۷)
"اور اگر یہ لوگ (توحید کی راہ چھوڑ کر) شرک کرتے تو (یقین کرو) کبھی فلاح و سعادت کی راہ نہ پاتے اور ان کا سارا کیا و ہر ضائع ہو جاتا۔"

☆ ولقد اوحی الیک والی الذین من قبلک لئن اشرکت لیحبطن عملک ولتکونن من الخسرین ○ (زمر، پ ۲۳)

"اور (اے پیغمبر!) اس بات میں کوئی شک نہیں کہ تیری طرف بھی اور تجھے پہلے انبیاء کی طرف بھی یہی وحی ہوتی رہی ہے کہ اگر تو نے شرک کیا تو تیرے اعمال ضائع ہو جائیں گے اور تو زیاں کاروں سے ہو جائے گا۔"

اسی طرح رسالت محمدی ﷺ اور قرآن حکیم پر ایمان لانے کے متعلق فرمایا:-

☆ یا ایہا الناس قد جاءکم الرسول بالحق من ربکم فامنوا خیراً لکم ولن تکفروا فان للہ ما فی السموات والارض وکان اللہ علیما " حکیم ○ (النساء، پ ۶)

"اے (بے خبر) لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے ایک خاص رسول (محمد ﷺ) حق لے کر آچکا ہے۔ پس تم (اس پر) ایمان لے آؤ۔ یہ تمہارے لیے بہتر ہوگا اور اگر تم نے (اس سے) انکار کر دیا تو (پرواہ نہیں کیوں کہ) جو کچھ آسمانوں میں

اور زمین میں ہے۔ سب اللہ ہی کا ہے اور اللہ تعالیٰ بڑا صاحب علم اور صاحب حکمت ہے۔“

☆ بایہا الناس قد جاءکم برہان من ربکم وانزلنا الیکم نوراً مبیناً ○ فاما الذین امنوا باللہ واعتصموا بہ فسید خلہم فی رحمۃ منہ و فضل و یدہدہم الیہ صراطاً مستقیماً ○ (ہر دو سورت 'التاء' پ ۶)

”اے بے خبر! لوگو تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے برہان (روشن ولیل) آچکی ہے۔ یعنی محمد ﷺ اور ہم نے تمہاری طرف نور مبین یعنی قرآن مجید بھی نازل کر دیا ہے۔ تو جو لوگ اللہ پر ایمان لے آئیں گے اور اسی کا سہارا پکڑیں گے۔ ان کو عنقریب اللہ اپنی رحمت اور فضل میں داخل کرے گا اور اپنی طرف سیدھی راہ پر ڈال دے گا۔“

اسی طرح سورۃ تغابن میں فرمایا:۔ فامنوا باللہ ورسولہ والنور الذی انزلنا (تغابن پ ۲۸) ”پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول (محمد ﷺ) پر اور اس نور پر جو ہم نے (اس کی طرف) اتارا یعنی قرآن مجید پر۔“

اس کے بعد فرمایا:۔ ومن یؤمن باللہ و یعمل صالحاً یکفر عنہ سیئاتہ و یدخلہ جنت تجری من تحتہا الانہر خلدین فیہا ابدلاً ذالک الفوز العظیم ○ (تغابن پ ۲۸)

”اور جو کوئی (اس کے مطابق) اللہ پر ایمان لائے گا اور نیک عمل بھی کرے گا۔ اللہ تعالیٰ اس کی برائیاں دور کر دے گا اور اسے جنتوں میں داخل کر دے گا۔ جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں۔ وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ بڑی کامیابی یہی ہے۔“

تنبیہ نمبر ۱۰۔ اوپر کی آیت میں تین چیزوں پر ایمان لانے کا حکم کیا۔ اللہ تعالیٰ پر اپنے رسول مقبول حضرت محمد ﷺ پر اور اپنی کتاب قرآن مجید پر۔ اس کے بعد دوسری آیت میں ایمان باللہ اور عمل صالح پر نجات اور جنت کا وعدہ کیا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اوپر کے ایمانی امور ایمان باللہ میں شامل ہیں۔ ورنہ ایک آیت میں ایک چیز کا حکم دینا اور دوسری سطر میں اس حکم کو نظر انداز اور فراموش کر دینا لازم آئے گا اور اللہ کا کلام اس سے پاک ہے۔

تنبیہ نمبر ۲:- سورہ تغابن کے اس مقام پر ایمان کے امور صرف تین گئے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ پر ایمان، رسول اللہ ﷺ پر ایمان اور قرآن مجید پر ایمان اور اس جگہ یوم آخرت (قیامت) پر ایمان لانے کا ذکر نہیں کیا تو کیا اس عدم ذکر سے یہ لازم آتا چاہیے کہ قرآنی نقطہ نگاہ میں یوم آخرت پر ایمان لانا ضروری نہیں۔ حالانکہ اس پر ایمان لانا سورہ بقرہ اور سورہ مائدہ کی آیات زیر بحث میں امور نجات کی فہرست میں داخل ہو چکا ہے۔ تو جس طرح آپ سورہ تغابن کی آیت میں حسب تصریح سورہ بقرہ و مائدہ ایمان باللہ میں ایمان بالاخرت کو بھی داخل فہرست سمجھتے ہیں۔ اسی طرح حسب تصریح سورہ تغابن وغیرہ ایمان بالرسول کو سورہ بقرہ اور مائدہ میں بھی داخل سمجھیں۔ پس اللہ تعالیٰ پر ایمان، اس کے رسولوں پر ایمان لائے بغیر موجب نجات نہیں ہوگا۔ (واللہ العادی)

ان آیات مذکورہ بالا کے بعد ہم سورہ بقرہ کی بعض ابتدائی آیتوں پر کسی قدر تفصیل سے لکھ کر مسئلہ ایمان بالرسول کو واضح کرنا چاہتے ہیں۔ شروع میں پختہ مومن متقیوں کی صفات یہ ذکر کی ہیں:-

الذین یومنون بالغیب و یقیمون الصلوٰۃ و مما رزقنہم ینفقون ○ والذین یومنون بما انزل الیک و ما انزل من قبلک و بالآخرۃ ہم یوقنون ○ (بقرہ، پ ۱)

”وہ جو غیب پر ایمان لاتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور اس میں سے جو ہم نے ان کو دے رکھا ہے، خرچ کرتے ہیں اور جو اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ جو (اے پیغمبر!) تیری طرف اتارا گیا اور جو تجھ سے پہلے اتارا گیا اور وہ آخرت پر بھی یقین رکھتے ہیں۔“

پھر ان مومنوں کی نجات کی بابت فرمایا:-

اولئک علی ہدی من ربہم و اولئک ہم المفلحون ○ (بقرہ، پ ۱)

”وہی لوگ ہدایت پر ہیں اپنے رب کی طرف سے اور وہی نجات پانے والے ہیں۔“

اس کے بعد خالص کفار کا ذکر کیا جو نہ اللہ کی توحید کے پابند ہوں، نہ کسی رسول ﷺ اور صحیفہ آسمانی کے قائل ہوں، نہ یوم آخرت کو مانیں۔ سو ان کی نسبت فرمایا کہ ان کو بڑا عذاب ہوگا۔ چنانچہ فرمایا:-

ان الذین کفروا سواء علیہم انذرتہم ام لم تنذرہم لا یؤمنون ○ ختم اللہ علی قلوبہم و علی سمعہم و علی ابصارہم غشاوة و لہم عذاب عظیم (بقرہ، پ ۱)

”بے شک جن لوگوں نے کفر اختیار کر لیا۔ ان پر برابر ہے۔ چاہے تو ان کو ڈرائے، چاہے نہ ڈرائے۔ وہ تو ایمان نہ لائیں گے۔ اللہ نے (ان کے کفر کی وجہ سے) ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر (ایک قسم کا) پردہ پڑا ہے اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔“

اس کے بعد ان لوگوں کا ذکر کیا جو مذکورہ بالا امور ایمان میں سے صرف بعض کا اقرار کرتے ہیں اور ان کی نسبت فرمایا کہ یہ ہرگز مومن نہیں ہیں۔ جھوٹ اور فریب سے ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں۔

چنانچہ فرمایا: - ومن الناس من یقول امنا باللہ و بالیوم الآخر وما ہم بمؤمنین ○ (بقرہ، پ ۱) ”اور بعض وہ لوگ ہیں۔ جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر بھی اور یوم آخرت پر بھی ایمان لے آئے ہیں۔ باوجود اس کے یہ لوگ ہرگز مومن نہیں۔“

ان لوگوں نے مذکورہ بالا ایمان میں سے ایمان باللہ کا بھی اقرار کیا اور یوم آخرت کا بھی اقرار کیا لیکن پھر بھی اللہ تعالیٰ نے ان کی نسبت بتا کر فرمایا کہ وہ ہرگز مومن نہیں ہیں۔

اس کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں۔ اول وہ جو بہت مشہور ہے کہ وہ صرف زبان سے بغیر خلوص قلب کے ایسا کہتے تھے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو حقیقی مومن نہیں جانا۔ اس سے بھی ہمارا مدعا حاصل ہے کہ ایمان باللہ کے معنی یہ ہوئے کہ وہ ایمان جو اللہ کے ہاں قابل منظوری ہے اور یہ ایک شرط زائد ہے۔ جو آیت میں مذکور نہیں ہے۔ اسی طرح ایمان بالرسول مذکور نہیں ہے لیکن بتدریج آیات دیگر اور بلحاظ قرائن جو ذکر کیے جا رہے ہیں۔ ضروری ہے اور ان پر ایمان لائے بغیر اللہ پر ایمان لانا درست نہیں ہوتا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اللہ کے نزدیک اس ایمان کا اعتبار ہے۔ جو جمع ایمانیات پر شامل ہو۔ اگر بعض کو مانا اور بعض کو نہ مانا تو وہ ایمان معتبر نہیں اور ایسے لوگ مومن نہیں ہیں۔ چونکہ انہوں نے امور ایمان میں سے صرف وہ باتوں کا یعنی اللہ تعالیٰ کا اور

قیامت کا اقرار کیا ہے اور اللہ کے پیغمبروں اور اس کی کتابوں کا اقرار نہیں کیا۔ جن کی تعلیم و ہدایت سے اللہ پر ایمان صحیح ہوتا ہے اور اس کی عبادت درست طور پر ہو سکتی ہے اور اعمال صالحہ جو قیامت کو کام آئیں گے، معلوم ہوتے ہیں۔ اس لیے وہ اللہ کے نزدیک ہرگز مومن نہیں اور ان کا ایسا ناقص ایمان کسی کام کا نہیں۔ اس کی تائید اگلی آیت سے ہوتی ہے:-

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ امْنُوا كَمَا امْنِ النَّاسُ قَالُوا أَنُؤْمِنُ كَمَا امْنِ السُّفَهَاءُ (بقرہ، پ ۱)
 ”اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم اس طرح ایمان لاؤ۔ جس طرح دوسرے لوگ ایمان لائے تو کہتے ہیں کیا ہم اس طرح ایمان لائیں جس طرح جاہل لوگ ایمان لائے۔“

اس آیت میں بتلایا گیا ہے کہ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس طرح ایمان لاؤ۔ جس طرح دیگر مومن ایمان لائے۔ یعنی اپنے ایمانیات میں اللہ تعالیٰ کے جملہ پیغمبروں اور کتابوں خصوصاً ”محمد ﷺ اور قرآن مجید پر ایمان لانے کو بھی شامل کرو تو وہ اسے سفاہت و جمالت قرار دے کر انکار کر دیتے ہیں۔ اس آیت میں الناس سے مراد آنحضرت کے اصحاب ہیں۔ اور کما امن سے رسول اللہ پر ایمان لانا مراد ہے اور ایسا کہنے والے غالباً مدینہ شریف کے یہود و نصاریٰ تھے جو عربوں کو امی سمجھ کر جاہل کہتے تھے اور اپنے آپ کو اہل کتاب و اہل انشاء جانتے ہوئے ان سے فائق سمجھتے تھے کیوں کہ سورہ بقرہ مدنی ہے۔ چنانچہ مفسر جریر طبری اس آیت کے متعلق لکھتے ہیں:-

یعنی وَاِذَا قِيلَ لَهُمْ لَآءِ الدِّينِ وَصَفَّهُمُ اللّٰهُ وَنَعْتَهُمُ بَانْهُمْ يَقُولُونَ امْنًا بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِينَ صَدَقُوا بِمُحَمَّدٍ وَبِمَا جَاءَ بِهِ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ كَمَا صَدَقَ بِهِ النَّاسُ يَعْنِي بِالنَّاسِ الْمُؤْمِنِينَ الَّذِينَ امْنُوا بِمُحَمَّدٍ وَنُبُوْتِهِ وَمَا جَاءَ بِهِ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ (جلد اول، ص ۹۸)

”یعنی جس وقت ان لوگوں سے جن کی بابت اللہ تعالیٰ نے بیان کیا کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ پر اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، حالانکہ وہ مومن نہیں ہیں۔ یہ کہا جاتا ہے کہ محمد ﷺ اور اس کی کتاب کی جو وہ اللہ سے لے کر آئے، تصدیق کرو جس طرح دیگر لوگوں نے آپ کی تصدیق کی۔ یعنی وہ مومن جو محمد ﷺ پر اور آپ کی نبوت

پر اور اس کتاب پر ایمان لائے۔ جو آپ اللہ کے پاس سے لائے۔“

اس کے بعد مفسر ابن جریرؒ نے اس تفسیر و مراد الہی کو حضرت ابن عباسؓ سے بانسناد نقل کر کے لکھا ہے کہ آپ نے فرمایا:-

عن ابن عباسؓ فی قوله واذا قيل لهم امنوا كما امن الناس يقول اذا قيل لهم صدقوا كما صدق اصحاب محمد قالوا انه نبی و رسول وان ما انزل عليه حق و صدق (جلد اول، ص ۹۸)

”کہ قول الہی و اذا قيل لهم امنوا کے معنی یہ ہیں کہ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم بھی اس طرح تصدیق کرو، جن طرح محمد ﷺ کے اصحاب نے تصدیق کی کہ آپ اللہ کے رسول اور نبی ہیں اور نیز اس کی کہ جو کچھ آپ پر نازل ہوا، وہ سب حق اور سچ ہے۔“

سورہ بقرہ کی ان آیات اور ان کے سلسلہ بیان سے واضح ہو گیا کہ امور ایمان میں سے کسی امر کا انکار کیا جائے۔ خصوصاً ”آنحضرت ﷺ کا انکار کیا جائے تو اللہ تعالیٰ اور قیامت کا ماننا عاقبت کی نجات کے لیے کافی نہیں۔ کیوں کہ شریعت کی زبان میں کافرا سے بھی کہتے ہیں جو کسی رسول برحق کا خاص کر آنحضور ﷺ کا انکار کرے۔ چنانچہ صحیح مسلم میں حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:-

عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم والذی نفس محمد بیدہ لا یسمع بی احد من ہذہ الامۃ یہودی ولا نصرانی ثم یموت ولم یؤمن بالذی ارسلت بہ الا کان من اصحاب النار (مشکوٰۃ، کتاب الایمان، ص ۴)

”اللہ کی قسم! جس کے قبضے میں محمد ﷺ کی جان ہے کہ جس یہودی یا نصرانی نے میری پیغمبری کی آواز سن لی۔ پھر وہ مر گیا اور میری رسالت اور میری لائی ہوئی شریعت پر ایمان نہ لایا تو وہ ضرور ضرور دوزخیوں میں ہو گا۔“ (اعاز اللہ منہا)

اسی طرح صحیح بخاری و مسلم میں وفد عبد القیس والی مشہور حدیث ہے۔ جس میں نبی پاک ﷺ نے ایمان باللہ کی تفسیر میں فرمایا۔ شہادۃ ان لا الہ الا اللہ وان محمد رسول اللہ (مشکوٰۃ، ص ۵) یعنی اللہ کی توحید الوہیت کی گواہی اور محمد ﷺ کی رسالت کی

گو اہی وغیرہ امور کو ایمان باللہ میں شامل بتایا۔

اس دفعہ سوم کی تائید میں دیگر بہت سی آیات صریحہ و احادیث صحیحہ ہیں۔ جن کے ذکر سے مضمون میں طوالت ہو جاتی ہے۔ اس لیے ہم ان میں سے صرف تین آیات اور ذکر کر کے اس دفعہ کو ختم کر دیتے ہیں۔

پہلے پارے کے آخر پر یہود و نصاریٰ کے ذکر کے بعد فرمایا:-

قولوا اٰمنا باللّٰہ وما انزل الینا وما انزل الی ابراہیم واسمعیل واسحق و یعقوب والاسباط وما اوتی موسیٰ وعیسیٰ وما اوتی النبیون من ربہم لا نفرق بین احد منهم ونحن لہ مسلمون ○ (بقرہ، پ ۱)

” (مسلمانو!) تم کہو کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس شریعت پر جو ہم پر نازل ہوئی اور جو ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ اور اسحاقؑ اور یعقوبؑ اور اولاد یعقوبؑ پر نازل ہوئی اور اس پر جو موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو دیا گیا اور جو کچھ دیگر انبیاءؑ کو ان کے رب کی طرف سے دیا گیا۔ ہم ان میں سے کسی ایک میں بھی جدائی نہیں کرتے اور ہم تو اسی (خداوند تعالیٰ) کے فرماں بردار ہیں۔“

اس آیت میں سب رسولوں کی رسالت پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے اور اس کے بعد یہود و نصاریٰ کے متعلق فرمایا:-

فان امنوا بمثل ما امنتم بہ فقد اٰھتدوا وان تولوا فانما ہم فی شقاق۔ (بقرہ، پ ۱)

”پس اگر یہ (یہود و نصاریٰ) اس طرح ایمان لے آئے۔ جس طرح تم (آنحضرت ﷺ کے اصحاب) ایمان لائے ہو۔ تو (سمجھو کہ) وہ ہدایت پر آگئے اور اگر وہ (اس سے) پھر گئے تو سوائے اس کے کچھ نہیں کہ وہ صریح مخالفت پر ہیں۔“

اس میں صاف الفاظ میں بتا دیا کہ باہدایت یعنی سیدھا اور راست ایمان وہی ہے جو پیروان محمد ﷺ یعنی آپؐ کے اصحاب کا ہے اور اگر یہ یہود و نصاریٰ اس طریق ایمان کہ سب انبیاء اللہ کو مانا جائے سے انحراف کریں تو اس کی نسبت فرمایا کہ وہ شقاق میں ہیں اور شقاق کے متعلق دوسرے مواقع پر فرمایا:-

ومن یشاقق الرسول من بعد ما تبین لہ الھدٰی وینبع غیر سبیل المومنین

نولہ ما تولى ونصله جہنم وساءت مصیراً" ○ (النساء، پ ۵)
 ”اور جو کوئی اس رسول (محمد ﷺ) کی مخالفت کرے گا۔ بعد اس کے کہ اس پر ہدایت واضح ہو چکی اور مومنین (مصدقین) کی راہ کے سوائے دوسری راہ کی پیروی کرے گا تو ہم اسے اسی طرف دھکا دے دیں گے اور جہنم میں لے جا داخل کریں گے اور وہ بہت بری جگہ ہے۔“

اور دوسرے موقع پر فرمایا:۔ ذالک بانہم شاقوا اللہ و رسولہ و من یشاقق اللہ و رسولہ فان اللہ شدید العقاب ○ (انفال، پ ۹)
 ”یہ اس لیے کہ انہوں نے مخالفت کی اللہ کی اور اس کے رسول (محمد ﷺ) کی اور جو کوئی خلاف چلے گا اللہ کے اور اس کے رسول (محمد ﷺ) کے تو بے شک اللہ تعالیٰ سخت عذاب والا ہے۔“
 ذالک بانہم شاقوا اللہ و رسولہ و من یشاقق اللہ فان اللہ شدید العقاب ○ (حشر، پ ۲۸)

”یہ اس لیے کہ انہوں نے مخالفت کی اللہ کی اور اس کے رسول پاک (محمد ﷺ) کی اور جو کوئی مخالفت کرے گا اللہ کی تو بے شک اللہ سخت عذاب والا ہے۔“
 ان آیات کے مجموعہ سے واضح ہو گیا کہ جو کوئی تمام رسولوں پر خصوصاً اس کے آخری رسول محمد ﷺ پر ایمان نہ لائے۔ وہ جہنم اور سخت عذاب کا مستوجب ہے اور اس کی نجات ہرگز ہرگز نہیں ہوگی۔

امام ابو جعفر طبری ”آیت فان امنوا بمثل ما امنتم بہ میں لکھتے ہیں:۔
 فدل تعالیٰ ذکرہ بھذہ الایۃ علی انہ لم یقبل من احد عملاً الا بالایمان بھذہ المعانی التی عدھا قبلھا (جلد اول، ص ۲۳۲)

”اللہ تعالیٰ نے اس آیت سے یہ بتا دیا کہ وہ کسی شخص کا کوئی عمل قبول نہیں کرے گا مگر اس صورت میں کہ وہ ان امور پر جو ساہا ”شمار کیے گئے ہیں“ ایمان لائے۔“
 اس نئے سلسلے میں دوسری آیت یہ ہے۔ جس میں صیغہ حصر سے فرمایا:۔

انما المؤمنون الذین امنوا باللہ و رسولہ (نور، پ ۱۸)
 ”مومن تو صرف وہ لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول (محمد ﷺ) پر ایمان

لائے۔“

تیسری آیت یہ ہے۔ انما المومنون الذین امنوا باللہ ورسولہ ثم لم یرتابوا (حجرات، پ ۲۶)

”مومن تو صرف وہ لوگ ہیں جو اللہ پر اور اس کے رسول (محمد ﷺ) پر ایمان لائے۔ پھر ان کو اس بارے میں شک نہیں ہوا۔“

اس آیت میں تو تصریح کر دی کہ اگر کسی شخص کو ایمان لانے کے بعد بھی رسول اللہ ﷺ کی رسالت کے متعلق شک اور تردد بھی ہو جائے تو وہ بھی مومن نہیں رہتا۔ چہ جائیکہ سرے سے مانے ہی نہ اور مومن لائق نجات ہو سکے۔ (الامان، الامان)

رسول اللہ ﷺ پر ایمان لائے بغیر نیک اعمال بھی قبول نہیں ہوتے تو عاقبت کی نجات کیسی؟۔ چنانچہ فرمایا:۔ وما منعہم ان تقبل منهم نفقتہم الا انہم کفروا باللہ و برسولہ الآیۃ (توبہ، پ ۱۰)

”اور نہیں روکا ان کو اس بات سے کہ قبول کیے جائیں ان کے نفقات (اخراجات خیراتی) مگر اس بات نے کہ انہوں نے کفر کیا ساتھ اللہ کے اور اس کے رسول (محمد ﷺ) کے۔“

رسول اللہ ﷺ کی رسالت کے منکر کا جنازہ بھی جائز نہیں، عاقبت کی نجات کیسی؟۔ چنانچہ فرمایا:۔ ولا تصل علی احد منہم مات ابدا ولا تقم علی قبرہ انہم کفروا باللہ ورسولہ (توبہ، پ ۱۰)

”اور کبھی نہ پڑھ جنازہ ان میں سے کسی کا جو مر جائے اور نہ کھڑا ہو اس کی قبر پر (دعا مانگنے کو) کیوں کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول (محمد ﷺ) سے کفر کیا۔“

ان آیات سے ثابت ہو گیا کہ منکر رسول ﷺ کا نہ جنازہ جائز، نہ اس کی عبادت منظور، پھر اس کی نجات کیسی؟۔ پس رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانا از حد ضروری ہے۔

چوتھا قرینہ اس آیت زیر بحث یعنی ان الذین امنوا والذین ہادوا میں انبیاء اللہ علیہم السلام پر ایمان کے ضروری ہونے کا یہ ہے کہ اس میں روز قیامت پر ایمان رکھنا ایمانیات و موجبات نجات میں شمار کیا گیا ہے اور روز قیامت پر ایمان بغیر کسی رسول برحق کی تعلیم کے نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ اول تو قیامت کا واقعہ ہونا آئندہ پیش آنے والے

امور میں سے ہے اور اس کا علم اللہ تعالیٰ کے بتانے کے بغیر نہیں ہو سکتا اور اللہ تعالیٰ اپنے مغیبات سوائے انبیاء علیہم السلام کے کسی دیگر کے ذریعے ظاہر نہیں کرتا۔
 دیگر یہ کہ قیامت کا تقرر اللہ کے حکم سے ہے۔ عقل سے نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ کے تقرر کا علم بغیر کسی نبی برحق کے واسطے کے نہیں ہو سکتا۔ یہ امر ایسا ظاہر ہے کہ اس پر کچھ اور لکھنے کی حاجت نہیں۔ پس انبیاء کرامؑ پر ایمان لانے سے مستغنی نہیں ہو سکتے۔ اسی لیے قیامت پر ایمان سوائے انبیاء کرامؑ کی امتوں کے کسی کا نہیں۔

پانچواں قرینہ یہ ہے کہ امور نجات میں اعمال صالحہ کو بھی گناہ ہے اور اعمال صالحہ کا علم اور تقرر اور ان کی عملی کیفیت بغیر نبی اللہ کی تعلیم و ارشاد کے معلوم نہیں ہو سکتی اور نہ وہ طریق سنت کی موافقت کے بغیر موجب ثواب آخرت ہو سکتے ہیں۔ لہذا ان کے ضمن میں بھی ایمان بالرسالہ ملحوظ ہے۔ اس لیے رسالت پر ایمان لانے کے سوا نجات نہیں ہو سکتی۔

اس کی توضیح یوں ہے کہ اعمال صالحہ دو طرح کے ہیں۔ عبادات و معاملات اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کا طریق ہم از خود وضع نہیں کر سکتے اور نہ ایسی عبادت اللہ تعالیٰ کے ہاں موجب ثواب ہو سکتی ہے۔ بلکہ لازم ہے کہ وہ طریق خود اللہ تعالیٰ کا تعلیم کردہ ہو اور اللہ تعالیٰ کی تعلیم بغیر نبی برحق کے معلوم نہیں ہو سکتی اور یہ بات ان لوگوں کے نزدیک بھی مسلم ہے۔ جن کی تنہیم کے لیے ہم یہ زحمت گوارا کر رہے ہیں اور یہ بھی عیاں ہے کہ معاملات جن کا تعلق بظاہر مخلوق سے ہے۔ حقیقت میں ان کا رجوع بھی اللہ رب العزت کی طرف ہے۔ جس کی صورت یہ ہے کہ:-

۱۔ شریعت میں کسی نیکی کے موجب اجر ہونے کے لیے ضروری شرط یہ ہے کہ وہ خاص اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لیے کی جائے اور اس میں ریاکاری، نام آوری، فخر و مباهات، شیخی و تکبر، قرب طلبی اور غیر اللہ کی رضا جوئی نہ پائی جائے۔ پس اگر ان اعمال صالحہ کی وضع و تقرر اللہ کی طرف سے نہ ہو تو نہ تو ان میں اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی اور اخلاص نیت کی ضرورت ہے اور نہ ان پر اللہ تعالیٰ کے ہاں سے اجر و ثواب کا وعدہ ہو سکتا ہے۔ ورنہ ماننا پڑے گا کہ ہر ریاکار جو نام آوری کے لیے اور ہر مشرک و مبتدع جو غیر اللہ کی رضا جوئی کے لیے اور ہر سرکاری خوشامدی جو قرب شاہی حاصل کرنے کے لیے ہزار ہا روپے

خرچ کر ڈالتا ہے۔ سب نیکوکار اور قائل نجات ہیں اور یہ بالکل باطل ہے۔ اس کے متعلق قرآن مجید میں بہت سی آیات ہیں۔ مثلاً "يَتَغَوَّنَ فَضْلًا" من ربهم ورضواناً (ماندہ پ ۶) اور وما امرؤ الا ليعبدوا الله مخلصين له الدين ○ حنفاء و يقيموا الصلوة و يؤتوا الزكوة و ذالك دين القيمة ○ (بینہ پ ۳۰)

۲۔ دیگر یہ کہ انسانی عقل نجات اخروی کے لیے کوئی بھی نظام و آئیں نہیں بنا سکتی۔ کیوں کہ وہ عالم اس کی نظر سے پوشیدہ ہے۔

۳۔ دیگر یہ کہ اگر اعمال کو بغیر اللہ رب العزت کے مقرر کرنے کے موجب نجات سمجھا جائے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ ہم اعمال کی دستاویز و فرست از خود بنا کر اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں دیں کہ لیجئے اس کے مطابق ہمارا فیصلہ کیجئے اور ہمیں مناصب و درجات عطا کریں اور یہ نظارہ نہایت ہی بھیانک اور گستاخانہ ہوگا۔ (اعاذ اللہ منھا) جو کسی صورت میں بھی جائز نہیں ہو سکتا کیوں کہ اس میں اللہ تعالیٰ پر حکم ہوگا۔

۴۔ دیگر یہ کہ انسانی طبائع فطرتاً مختلف ہیں۔ ہر ایک کی خواہش اور مذاق طبع جدا ہے۔ پھر ہر ایک کی نیت و قصد دوسرے سے الگ ہے۔ پھر یہ کہ مقام رضا و محبت اور محل غضب و انتقام میں ان کی کیفیت جدا ہوتی ہے۔ کوئی افراط میں ہوتا ہے تو کوئی تفریط میں اور اعتدال پر تو بہت کم رہ سکتے ہیں۔ پھر یہ کہ اتباع خواہشات حیلہ باز طبائع کئی ایک بنانے بنا کر محرمات کو حلال و جائز اور واجبات کی ادائیگی میں تساہل و تغافل کی صورتیں بنا لیتی ہیں۔ ان سب امور کو با نظام رکھنے اور انسان کو مقام اعتدال پر قائم رکھنے کے لیے ایک ایسے قانون کی سخت ضرورت ہے۔ جس سے دنیا میں تہذیب اخلاق اور حفاظت حقوق زبانوں سے باہر عمل میں بھی پائی جائے۔ اسی قانون عدالت کا دوسرا نام شریعت الہی ہے۔ جو نبی برحق کے ذریعے قائم ہوتی ہے اور وہ ضرورت زمانہ کے مطابق عمل صالح اور اس کی عملی کیفیت پر حاوی ہوتی ہے۔

پھر یہ کہ سب سے آخر ان سب امور مذکورہ بالا کے لیے زبانی وعظ و تذکیر کے علاوہ کوئی نمونہ عمل بھی ضروری ہے۔ جو اپنے طریق عمل اور فیض صحبت سے "صبغۃ اللہ" کا رنگ چڑھائے اور بے لگاموں کو ناجائز خواہشات پر کنٹرول کرنا سکھائے اور ناقصین کو کمال تک پہنچائے اور یہ سوائے نبی برحق اور پھر اس کے بعد اس کے کامل

تابعداروں کے ممکن نہیں۔ اسی لیے دنیا میں جب بھی کسی نے اصلاح کا جھنڈا اٹھایا اور اخلاقی انقلاب پیدا کیا تو وہ حضرات انبیاء علیہم السلام یا ان کے کامل تابعدار ہی ہوئے۔ چنانچہ ارشاد ہے:-

فلولا كان من القرون من قبلكم اولوا بقية ينهون عن الفساد في الارض الا قليلا ممن انجينا منهم واتبع الذين ظلموا ما اترفوا فيه وكانوا مجرمين
○ (ہود، پ ۱۲)

”پس کیوں نہ ہوئے تم سے پہلے زمانوں میں صاحبانِ دانائی جو منع کرتے زمین میں فساد کرنے سے، مگر (ہوئے تو وہی) تھوڑے (لوگ ہوئے) جن کو ہم نے ان میں سے عذاب (عالمگیر) سے بچالیا تھا اور ظالموں نے تو آسودگی (میں خواہشات نفس) کی پیروی کی اور وہ مجرم ہو گئے۔“

چھٹا قرینہ یہ ہے کہ ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت اور اعمالِ صالحہ پر اجر دینے کا وعدہ کیا ہے اور یہ وعدہ نہیں ہو سکتا کہ جب تک اللہ تعالیٰ ان سب کی تعلیم اور ان کے حدود اور کوائف اور ان کے متعلق اپنی رضا کا طریق مقرر نہ کرے اور ان سب کے لیے نبی برحق کی سخت ضرورت ہے۔ جس کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے، تم والحمد للہ۔

یہ وہ قرینے ہیں جو نفسِ آیت میں ہیں اور دیگر مقامات پر ایمان بالرسول کی جو آیات ہیں۔ ان میں سے بعض جو تھی قسم کے کفار کے ضمن میں اوپر گزر چکی ہیں۔ ایک اور اس وقت بھی ذکر کر کے اس مضمون کو ختم کر دیا جاتا ہے۔ جو بالخصوص نبی پاک ﷺ کی نسبت ہے کیوں کہ آنحضرت ﷺ کی بعثت پر جملہ سابقہ کتابوں کی اصلی تعلیم قرآن مجید میں آچکی ہے اور آنحضور ﷺ پر ایمان لانے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جملہ انبیاء علیہم السلام کو برحق مانا جائے۔ جیسا کہ سابقہ ”مفصل گزر چکا ہے۔ وہ آیت یہ ہے:-

والذين امنوا وعملوا الصلحت و امنوا بما انزل على محمد وهو الحق من ربهم كفر عنهم سيئاتهم واصلح بالهم ○ (محمد، پ ۲۶)

”اور جو لوگ کہ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے اور وہ ایمان لائے اس (کتاب) پر جو محمد ﷺ پر اتاری گئی اور وہی حق ہے، ان کے رب کی طرف سے دور کرویں (اللہ تعالیٰ نے) ان کی برائیاں اور سنوار دیا ان کا حال۔“

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی وحی پاک قرآن مجید پر ایمان لانے پر گناہوں کی معافی اور دین و دنیا کی حالت سنوانے کا وعدہ کیا ہے اور یہ معنی نجات و سعادت کے ہیں۔ پس نجات و سعادت کی راہ آنحضور ﷺ کی پیروی میں ہے اور بس۔ اسی لیے اللہ رب العزت نے اسی سورت کے آخری رکوع میں فرمادیا:-

ان الذين كفروا و صدوا عن سبيل الله و شاقوا الرسول من بعد ما تبين لهم الهدى لن يضروا الله شيئا“ و سيحبط اعمالهم ○ يايها الذين امنوا اطيعوا الله واطيعوا الرسول و لا تبطلوا اعمالكم ○ (محمدؐ پ ۲۶)

”بے شک وہ لوگ جو کافر ہو گئے اور انہوں نے (دوسرے لوگوں کو) اللہ کی راہ سے روکا اور انہوں نے ہدایت ظاہر ہو جانے کے بعد اس رسول (محمد ﷺ) کی مخالفت کی۔ وہ اللہ تعالیٰ کا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکیں گے اور اللہ تعالیٰ ان کے سب اعمال ضائع کر دے گا۔ اے مسلمانو! تم فرمانبرداری کرو اللہ تعالیٰ کی اور فرمانبرداری کرو اس رسول (محمد ﷺ) کی اور اپنے اعمال کو ضائع مت کرو۔“

اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ جس طرح کفر و غیرہ امور سے اعمال ضائع ہو جاتے ہیں۔ اس طرح آنحضور ﷺ کی مخالفت سے بھی ضائع ہو جاتے ہیں اور کفار کے ذکر کے بعد اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو خطاب کر کے اپنی فرمانبرداری اور اپنے رسول محمد ﷺ کی فرمانبرداری کا حکم کیا ہے اور اس کی خلاف ورزی کی صورت میں اعمال کے ضائع کرنے سے منع کیا ہے۔ یعنی یہ کہ تم نے کفار کا طریق یعنی نافرمانی اور مخالفت رسول ﷺ اختیار کر کے اپنے اعمال برباد نہ کر لیتا، نعوذ باللہ من ذالک۔

اس سے معلوم ہوا کہ اعمال کی قبولیت کے لیے آنحضرت کی مہر کی ضرورت ہے۔ یا یوں سمجھو کہ صرف وہ اعمال قابل قبولیت ہیں جو موافق و مطابق سنت ہوں نہ وہ جو ہم اپنے خیال و قیاس سے تراش لیں۔ اسی معنی میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا:-

والذي نفس محمد بيده لو بدلكم موسى فاتبعتموه و تركتموني لظلمتكم عن سواء السبيل ولو كان حيا و ادرك نبوتي لا تبعني رواه الدرر المي (مکتوۃ ص ۲۴)

”قسم ہے اس ذات کی جس نے ہاتھ میں محمد ﷺ کی جان ہے کہ اگر تمہارے

لے حضرت موسیٰؑ بھی ظاہر ہو جائیں اور تم مجھے چھوڑ کر ان کی تابعداری اختیار کر لو تو (اللہ تعالیٰ کی) سیدھی راہ سے بھٹک جاؤ گے اور وہ (موسیٰؑ) زندہ ہوں اور میری نبوت (کا زمانہ) پائیں تو ضرور ضرور میری پیروی اختیار کریں۔“

اس مضمون کو حضرت شیخ سعدیؒ نے ”بوستان“ میں یوں بیان کیا ہے:-

دریں بحر جز مرد داعی نہ رفت
گم آں شد کہ دنبال راعی نہ رفت
کسانے کہ زیں راہ برگشتہ اند
برفتند بسیار و سرگشتہ اند

خلاف ہمیر کے راہ گزید
کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید
پندار سعدیؒ کہ راہ صفا
تو اس رفت جز بر پنے مصطفیٰ

پیغمبر خدا ﷺ کا ادب و احترام

رسول برحق پر ایمان لانا تو بڑی شے ہے اور اس کی پیروی کے سوا عمل کی قبولیت ناممکن ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے ہاں رسول اللہ کا ادب و احترام بھی یہاں تک ملحوظ ہے کہ وہ رسول کی اطاعت کو اپنی اطاعت جانتا ہے اور رسول کی نافرمانی کو دنیا و عاقبت کی زیاں کاری کا موجب گردانتا ہے اور اپنے رسول کے امر کی مخالفت کو موجب فتنہ و باعث عذاب الیم فرماتا ہے۔ چنانچہ ہر ایک کے متعلق نمبر وار آیات ملاحظہ کرتے جائیں:-

☆ من یطع الرسول فقد اطاع اللہ (النساء، پ ۵)

”جو شخص اس رسول (محمد ﷺ) کی فرمانبرداری کرے گا تو تحقیق اس نے اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کی۔“

☆ و کابن من قریة عنت عن امر ربھا و رسلہ فحاسبنھا حسابا شديدا و عذبنھا عذابا نكرا ○ فنقلت و بال امرھا و کان عاقبة امرھا

خسرًا ○ اعد الله لهم عذابًا شديدًا ○ فاتقوا الله يا اولى الابواب الذين امنوا قد انزل الله اليكم ذكرًا ○ رسولًا يتلوا عليكم آيت الله مبینت لیخرج الذين امنوا و عملوا الصلحت من الظلمت الى النور (طلاق، پ ۲۸)

”اور بہت بستیاں ہوئیں جنہوں نے اپنے رب اور اس کے رسولوں کے حکم سے سرکشی کی تو ہم نے ان کا سخت حساب لیا اور ان کو بہت برا عذاب کیا۔ پس انہوں نے اپنے اعمال کا وہاں کچھ لیا اور ان کے اعمال کا انجام نرا نقصان و زیاں ہی ہوا۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے سخت عذاب تیار کر رکھا ہے۔ پس اے عقل والے لوگو! جو ایمان لا چکے ہو۔ اللہ نے تمہارے سمجھانے کو تمہاری طرف ایک (بڑا) رسول (محمد ﷺ) بھیجا ہے جو تم پر اللہ کی روشن آیتیں پڑھتا ہے تاکہ ایمان والوں اور اعمال صالحہ والوں کو (کفر) کے اندھیروں سے (نور اسلام) کی طرف نکال لائے۔“

☆ انا ارسلنا اليكم رسولًا شاهدنا عليكم كما ارسلنا الى فرعون رسولًا ○ فعصى فرعون الرسول فاخذناه اخنا و بئلا ○ (زل، پ ۲۹)

”ہم نے تمہاری طرف ایک (عظیم الشان) رسول ﷺ بھیجا ہے، جو تم پر شاہد ہے۔ جس طرح ہم نے فرعون کی طرف ایک رسول (موسیٰ) بھیجا تھا۔ پس فرعون نے اس رسول کی نافرمانی کی تو ہم نے اس فرعون کو وبالناک گرفت میں پکڑا۔“

☆ فعصوا رسول ربهم فاخذهم اخنة رابية ○ (الحاقة، پ ۲۹)

”پس انہوں نے اپنے رب کے رسول کی نافرمانی کی تو ہم نے ان کو دم چڑھتی پکڑ میں پکڑا۔“

☆ يومئذ يود الذين كفروا و عصوا الرسول لو تسوى بهم الارض (التساء، پ ۵)

”اے روز وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اور اس رسول (محمد ﷺ) کی نافرمانی کی۔ یہ آرزو کریں گے کہ کاش ہمیں مٹی کر کے زمین کے برابر کر دیا جائے۔“

☆ فليحذر الذين يخالفون عن امره ان تصيبهم فتنة او يصيبهم عذاب اليم ○ (نور، پ ۱۸)

”پس چاہیے کہ ڈریں وہ لوگ جو اس (محمد ﷺ) کے امر کی مخالفت کرتے ہیں کہ ان کو پہنچے کوئی فتنہ یا پہنچے ان کو عذاب دردناک۔“

اسی معنی میں نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: کل امتی یدخلون الجنة الا من ابى قيل ومن ابى قال من اطاعنى فقد دخل الجنة و من عصانى فقد ابى (رواہ البخاری، مشکوٰۃ، ص ۱۹)

”میری ساری امت داخل جنت ہو جائے گی سوائے اس کے جس نے انکار کیا۔ عرض کیا گیا (امت میں سے) آپ کا منکر کون ہے؟۔ آپ نے فرمایا جس نے میری فرمانبرداری کی، وہ جنت میں داخل ہو گا اور جس نے نافرمانی کی، اس نے انکار کیا۔“

نبی پاک ﷺ کی اطاعت سے اوپر مقامِ ادب ہے کہ وہ بھی اللہ تعالیٰ کو از حد منظور ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب تک نبی برحق یا کسی دوسری قابلِ تعظیم بزرگ ہستی کی ذات سے خصوصی انس اور قلبی رغبت و محبت نہ ہو اور دماغ میں اس کی عظمت و وقار کا نقشہ نہ جما ہو۔ اس کے مرتبہ کی رعایت اور اس کے حکم کی عقیدت مندانہ اطاعت متصور نہیں ہو سکتی۔ جو لوگ اس نکتے کو نہ سمجھ کر نبی یا اس کے خلیفہ برحق کے منصب اور اس کی ذات کے ادب میں فرق کرتے ہیں۔ ان سے عموماً اقوال میں بے باکی اور قلیل ارشاد میں تساہل و ہمانہ جوئی ہوتی رہتی ہے۔ لیکن جسے پیغمبر برحق سے والمانہ عقیدت اور بے چون و چرا اطاعت کا تعلق ہو جاتا ہے۔ اس کے ایمان کی کیفیت پر فرشتے بھی رشک کھاتے ہیں۔ اسے نبی کریم ﷺ سے ایسی قلبی اور معنوی نسبت پیدا ہو جاتی ہے کہ اس کا دل انوارِ الہیہ کے اترنے کا محل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ شاہ غلام علی صاحبؒ حضرت مرزا مظہر جانجاناؒ کی زبانی ان کے شیخ حدیث حضرت حاجی محمد افضل صاحبؒ سیالکوٹی کے حلقہ درس کی نسبت فرماتے ہیں:-

”حضرت ایشاں (مرزا مظہر صاحبؒ) می فرمودند۔ اگرچہ از آنحضرت (حاجی صاحب ممدوح) اور ظاہر استفادہ کردہ نشد، لیکن در ضمن سبق حدیث فیوض از باطن شریف ایشاں فائز می شد، و در عرض نسبت قوت بہم می رسید، ایشاں را در ذکر حدیث در نسبت رسول اللہ ﷺ استغراقے دست می داد و انوار و برکات بسیار ظاہری شد، گویا

۸۶ حاجی صاحب ممدوح حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے بھی استاد حدیث ہیں۔

در معنی صحبت پیغمبر خدا ﷺ، حاصل می شد و دریں اثناء توجه و التفات بنوی ﷺ مشهودی گشت و نسبت کمالات نبوت در غایت وسعت و کثرت انوار جلوه گرمی شد و معنی حدیث العلماء ورثة الانبیاء واضح می شد، ایثاں (حضرت حاجی صاحب موصوف) شیخ الحدیث و از روئے صحبت پیر فقیر اند، فوائد بسیار در ظاہر و باطن تابست سال از خدمت ایثاں حاصل نموده ایم (مقامات منظریہ، ص ۲۲-۲۳)

یہ مقام بہت بلند ہے اور ہم جن لوگوں کی تفہیم کے درپے ہیں۔ ان کی سمجھ سے بہت بالا ہے اور کچھ عجب نہیں کہ وہ اپنی بدذوقی کی وجہ سے اس کا انکار کر دیں کیوں کہ جب تک سطح کو معاف و مجتے نہ کیا جائے۔ نقش و نگار کی زینت کاری صورت نہیں پڑ سکتی۔ اسی طرح جب تک ایمان میں وہ کیفیت نہ ہو جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں۔ دل اس حقیقت کو نہیں پاسکتا۔ ذاتہ کی لذت سے متمتع ہونے کے لیے قوت ذاتہ کی سلامتی شرط ہے۔ رنگ کی دلفریبی سے مسرت حاصل کرنے کے لیے نور بصارت ضروری ہے۔ (وہذا)

اس لیے ہم مقام کی ظاہری سطح پر اکتفا کرتے ہوئے بعض آیات و احادیث پر بس کرتے ہیں۔ حضور اکرم ﷺ کے ذاتی وقار اور ادب کی نسبت فرمایا:-

☆ والذین امنوبہ و عزروہ و نصر وہ و اتبعوا النور الذی انزل معہ اولئک ہم المفلحون ○ (اعراف، پ ۹)

”پس جو ایمان لائے اس (رسول محمد ﷺ) پر اور انہوں نے ادب کیا اور (اس کے مقاصد میں) اس کی مدد بھی کی اور اس نور کی جو اس کی طرف اتارا گیا، پیروی کی۔ وہی لوگ نجات پانے والے ہیں۔“

☆ انا ارسلنک شاہداً و مبشراً و نذیراً ○ لتؤمنوا باللہ و رسولہ و تعزروہ و توقروہ و تسبحوہ بکرة و اخیلا ○ (الفتح، پ ۲۶)

”(اے نبی) بے شک ہم نے تجھے شاہد اور مبشر اور نذیر بنا کر بھیجا ہے تاکہ تم (اے مسلمانو!) اللہ پر اور اس کے رسول (محمد ﷺ) پر ایمان لاؤ اور اس کا ادب و توقیر کرو اور صبح و شام اس اللہ کی تسبیح پکاردو۔“

نبی اللہ خدا کے بزرگ نشانوں میں سے ہے اور اللہ کے نشانوں کی تعظیم دل کے

تقویٰ کی دلیل و شہادت ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔ ذالک ومن یعظم شعائر اللہ فانہا من تقوی القلوب ○ (الحج، پ ۱۷)
 ”یہ یونہی ہے اور جو کوئی اللہ کے نشانوں کی تعظیم کرے گا۔ تو یہ بات دلوں کے تقویٰ (کی وجہ) سے ہوگی۔“

اس مضمون میں خانہ کعبہ، قرآن مجید اور دیگر کتب دینیہ اور سب مساجد جو اللہ کے ذکر کے لیے تیار کی جاتی ہیں اور سب ائمہ محدثین و مجتہدین اور دیگر بزرگان دین اور اولیائے کرام قابل ادب و لائق تعظیم ہیں کہ وہ سب شعائر اللہ ہیں۔ اسی ادب و تعظیم کا ایک اور بہت نازک درجہ ہے۔ جس کے نہ ہونے سے ساری عمر کے اعمال تباہ و برباد ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:۔ یا ایہا الذین امنوا لا ترفعوا اصواتکم فوق صوت النبی ولا تجہروا له بالقول کجہر بعضکم لبعض ان تحبط اعمالکم وانتم لا تشعرون ○ (حجرات، پ ۲۶)

”اے مسلمانو! نہ بلند کرو اپنی آوازیں اس نبی (محمد ﷺ) کی آواز سے اور اسے اس طرح پر بھی ظاہر پکار سے (نام لے کر) نہ پکارو جس طرح تم ایک دوسرے کو پکارتے ہو۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارے اعمال برباد ہو جائیں اور تم کو شعور بھی نہ ہو۔“

تنبیہ :- ایک مسلمان جس کے دل میں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی رسالت و نبوت پر ایمان ہے۔ اس کے لیے نہایت خوف کا مقام ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کا ادب یہاں تک ملحوظ ہے کہ آپ کی مجلس میں آپ کی آواز سے اونچی آواز کرنے سے اعمال ضائع ہو جاتے ہیں تو جو لوگ نبی اکرم ﷺ کی تعلیم و ارشاد اور آپ کی صحیح حدیث و سیرت ثابت کے مقابلے میں اپنے کلام یا کسی اور کے قول کو فروغ دیتے ہیں اور اس کی پیروی کرتے ہیں۔ وہ اس آیت کو سامنے رکھ کر اپنے ایمان و اعمال پر ٹھنڈے دل سے غور کریں، واللہ الہادی۔ ربنا لا تزعغ قلوبنا بعد اذ ہدیتنا۔

حضور پاک ﷺ نے اپنی محبت کے درجے کی نسبت فرمایا:۔ والذی نفسی بیدہ لا یومن احدکم حتی اکون احب الیہ من والدہ وولده (تجرید البخاری، ص

”اللہ کی قسم! جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ تم میں سے کوئی بھی مومن نہیں ہوگا۔ یہاں تک کہ مجھے اپنے والد اور اپنے فرزند سے بڑھ کر محبت دے۔“

والد بڑوں میں سے قابلِ تعظیم و جاتِ محبت ہے اور فرزند چھوٹوں میں سے زیادہ محبوب ہوتا ہے۔ اس لیے آپؐ نے فرما دیا کہ میری محبت ہر بڑے اور ہر چھوٹے سے زیادہ ہو تو ایمان ہے ورنہ خیر۔ نبی کریم ﷺ کا تو بہت اونچا مقام ہے۔ یہ محبت و اوب تو ایسا وسیع امر ہے کہ جن لوگوں کو آنحضور ﷺ سے سچی محبت و عقیدت ہو گئی۔ ان سے بھی محبت کرنا ایمان کی نشانی قرار پائی اور ان سے بغض کرنا نفاق کی علامت ٹھہری۔ چنانچہ فرمایا:-

ایۃ الایمان حب الانصار وایۃ النفاق بغض الانصار (تجرید البخاری، پ ۹)

”ایمان کی نشانی انصار کی محبت ہے اور نفاق کی نشانی انصار کا بغض ہے۔“

مولانا ابوالکلام آزاد اور صراطِ مستقیم

مولانا ابوالکلام صاحب نے ”ترجمان القرآن“ میں آیت اھدنا الصراط المستقیم ○ کی تفسیر بہت سطر سے لکھی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ زور کلام اور عبارات آرائی میں مولانا محمود کا انداز بیان ایک خاص وقعت رکھتا ہے۔ گویا بہت طویل اور اس میں تکرار بکثرت ہے لیکن پھر بھی اس میں بہت سے قیمتی جواہر بھی ہیں۔ جن کی قدردانی اہل ذوق کا کام ہے۔ (فجرۃ اللہ عنا خیر الجزاء)

ہاں اس میں بعض عبارتیں ایسی خطرناک بھی ہیں کہ اگر ان کا مفہوم وہی ہے جو بعض اصحاب نے سمجھا ہے تو یہ اس دور آزادی میں اسلام کے لیے سخت صدمے کا باعث ہے۔

ترجمان القرآن کی طباعت سے تھوڑی مدت بعد مجھے لاہور سے ایک عزیز نے بعض دیگر احباب کے مشورے سے لکھا کہ میں ”ترجمان القرآن“ کو ص ۱۲۸ سے ص ۱۶۹ تک بغور مطالعہ کر کے اس کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کروں کہ مولانا موصوف کا مقصود یہی ہے کہ کوئی ہندو یا عیسائی اپنے دین کی اصلی حقیقت (توحید الہی اور اعمالِ صالحہ)

معلوم کر کے اس پر قائم ہو جائے اور نبی پاک ﷺ کو رسول من عند اللہ قبول نہ کرتا ہو اور آپ کی بعثت کا شکریہ صرف اسی قدر ادا کر دے کہ مجھے اپنے دین کی اصل حقیقت معلوم ہو گئی ہے تو کیا ہم مسلمان اس کے بعد کسی کو اسلام کی دعوت دے سکیں گے۔ (وہذا)

میں نے ان احباب کی فرمائش کی تعمیل کی۔ لیکن اس کے متعلق احتیاطاً اپنی رائے محفوظ رکھتے ہوئے صرف اتنے الفاظ پر اکتفا کیا کہ مولانا صاحب کے اس کلام میں مرزا صاحب قادیانی کے دعویٰ نبوت کی طرح ہر دو پارٹیوں کے لیے کافی مسالہ (منصالح) ہے۔ ایک بھولا بھالا مبلغ اسلام ترجمان القرآن کو ہاتھ میں لے قرآن مجید اور نبوت محمدیؐ کے کمالات بھی پیش کر سکتا ہے اور ایک شوخ و شاطہ غیر مسلم بلکہ ایک آزاد مسلم بھی اللہ تعالیٰ کی توحید کا قائل ہوتا اور اپنی روش آزادی کو عمل صالح سمجھتا ہوا کہہ سکتا ہے کہ بے شک قرآن مجید ایک علمی کتاب ہے۔ اس کی نصائح بہت عمدہ ہیں اور آنحضرت ﷺ نے زمانہ کی بہت سی تاریکیاں دور کیں اور اخلاق کی بھی اصلاح کی۔ بس آپ کی بعثت سے یہی منشاء تھا۔ کسی خاص گروہ میں شامل ہونا آپ کی رواداری اور وسیع ظرفی کے خلاف ہے۔ بلکہ آپ نے اور قرآن مجید نے تحزب و تشیع کو اسباب فساد و تخریب میں شمار کیا ہے۔ اس لیے ہم گروہ میں شامل نہیں ہو سکتے۔ (وہذا)

لیکن میں خاکسار (میرسیا لکھنوی) یہ بدگمانی بھی نہیں کر سکتا کہ ایک مسلمان عالم قرآن (مولانا آزاد صاحب) غیر مسلم دنیا کے سامنے یہ نظریہ پیش کرے کہ تم اللہ کی رسی کے لیے محمد رسول اللہ ﷺ سے مستغنی رہ سکتے ہو۔ اس لیے میں نے اپنی رائے محفوظ رکھی اور اس میں جلدی نہیں کرنا چاہتا۔ تا آنکہ اللہ تعالیٰ حقیقت حال مجھ پر منکشف کر دے۔

زمانہ میں جن علماء کی تقریر و تحریر کا غلطہ پڑ جاتا ہے اور ان کا سیاسی یا مذہبی چرچا بہت بڑھ جاتا ہے تو لوگ ان کے متعلق تین طرح کے ہو جاتے ہیں۔

اول:- محب مفرط جو ان کی تحریر و تقریر کو اعتقادی نظر سے دیکھ کر واجب القبول جان لیتے ہیں اور ان کے خلاف کوئی بھی آواز نہیں سن سکتے۔

دوم:- دشمن و معاند جو ان کی ہر تحریر و تقریر کو بد ظنی سے دیکھ کر اس پر نکتہ چینی کرتے ہیں اور ڈٹ کر مخالفت کرتے ہیں۔

سوم:- تیسرے وہ جو ان کے غلط و صحیح کو تحقیقی نظر سے دیکھتے ہیں اور غلط کو غلط اور صحیح کو صحیح کہتے ہیں۔

مولانا آزاد صاحب نے موجودہ سیاسی تحریکوں میں جو کام کیا اور ان میں جو نام پایا۔ وہ کسی بیان کا محتاج نہیں۔ ہندوستان کی اکثر آبادی ان کی نسبت پہلی قسم کے لوگوں کی سی رائے رکھتی ہے۔ (جن اصحاب نے مجھے تحریراً و تقریراً ”ترجمان القرآن“ کے صفحات محولہ بالا کے مطالعہ کی فرمائش کی تھی۔ وہ بھی انہی محبین مفرطین میں سے تھے) دوسری قسم کے لوگ بہت کم ہیں اور تیسری قسم کے لوگ تو شاید اگلیوں پر بھی نہ گئے جا سکیں۔ ہاں اتنا عرض کر دینا ضروری ہے کہ یہ خاکسار اس قسم سوم میں سے ہے کہ نہ میں ان کا مرید ہوں اور نہ حاسد و معاند۔

مرید تو اس لیے نہیں کہ کمالات دو طرح کے ہیں۔ علمی اور عملی۔ میں اپنی علمی و عملی ہر دو طرح کی بے بضاعتی کا اقرار کرتے ہوئے اور ہر عالم سنت کی قدر و منزلت کرتے ہوئے اتنا ظاہر کر دینا چاہتا ہوں کہ میں نے حضرت میاں صاحب مرحوم دہلوی کے بعد جن علماء کو دیکھا۔ ان میں سے مولانا ابوسعید محمد حسین صاحب مرحوم پٹاوی کے برابر علمی کمال میں اور اپنے استاد محرم جناب مولانا غلام حسن صاحب ”سیالکوٹی“ کے برابر علمی کمال میں کسی کو نہیں دیکھا۔ اس لیے میں کسی کا مرید نہیں ہو سکا۔

اور حاسد و معاند اس لیے نہیں کہ میں پیشہ ور اور گروہ ساز مولوی نہیں ہوں کہ مجھے کسی سے حسد و عناد ہو سکے اور کسی دوسرے کی ناموری، شہرت اور قبولیت سے میرے مقاصد کو صدمہ پہنچنے کا اندیشہ ہو سکے۔ گھر کی سادہ روٹی کھاتا ہوں اور ٹھنڈا پانی پی کر اللہ رب العزت کا شکر ادا کرتا ہوں۔

میں اسی حالت توقف میں تھا کہ اتفاق سے ایک شخص گوجرانوالہ سے میرے پاس اپنے کسی دنیوی مطلب کے لیے آئے۔ اس شخص کی آواز اور طرز گفتگو سے میں نے معلوم کیا کہ وہ آزاد رو ہے۔ میں نے تحقیق حال کے خیال سے اسے چابی لگائی تو معلوم ہوا کہ وہ اس آزادی میں مولانا آزاد صاحب والہانہ پابند ہیں۔ میں نے اسے خوب

فٹ کر کے ذرا اور کسا تو صاف الفاظ میں کھل پڑے کہ ہاں اگر کوئی ہندو خدا پرست و نیکو کار ہو اور نیک نیتی سے نبی پاک ﷺ کی رسالت کا اقرار نہ کرے تو اس کی نجات ہو سکتی ہے۔ اس پر میں نے خاص اسی شخص پر افسوس نہ کیا کہ اسے مولوی آزاد صاحب کا زہر چڑھا ہوا ہے۔ بلکہ یہ خیال گزرا کہ اللہ جانے یہ زہر ان کے کتنے معتقدوں کے ایمان کے لیے مملک ہوا ہو گا، فانا للہ۔

اس پر بھی میں جناب مولانا صاحب کی ذات پر بدظنی کی جرات نہ کر سکا اور خیال کیا کہ چونکہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے ابھی مولانا ممدوح زندہ ہیں اور خوش قسمتی سے آج کل آزاد بھی ہیں اس لیے ان عبارات مشکوکہ کی بابت خود ان سے دریافت کر لوں کہ آپ کا مقصد کیا ہے؟۔ سو میں نے مولانا صاحب کی خدمت میں اس مضمون کا خط لکھا کہ آپ کی تفسیر فاتحہ میں آیت اهدنا الصراط المستقیم کے ضمن میں بعض عبارتیں (مثلاً "صفحہ فلاں فلاں") ایسی سمجھی گئی ہیں۔ جن سے آپ کا فشاء یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ ایسے شخص کے لیے کہ وہ -----!

۱۔ اسلام سے پیشر کے کسی مذہب کی اصلی تعلیم پر قائم ہو کر ایمان باللہ و اعمال صالحہ کا مالک ہو۔

۲۔ بشرطیکہ وہ کسی نبی خاص کر حضرت محمد ﷺ کی تکذیب نہ کرتا ہو۔ اگرچہ آپ کے رسول من عند اللہ ہونے کے اقرار کو نجات کے لیے ضروری بھی خیال نہ کرتا ہو۔

۳۔ قرآن مجید کے اوامر و نواہی کا وہ نصاب جو جملہ مذاہب میں مشترک ہے۔ اپنے دین کے رو سے اس کا پابند ہو اور اسلامی نماز، روزہ اور حج وغیرہ طرق عبادت کو منہاج شریعت سمجھتا ہو۔ جو پہلے مذہبوں سے صرف صورت مختلف ہیں نہ کہ اصل مقصد میں اور ان عبادات کا پابند نہ ہو کر ان کو بھی جائز جانتا ہو، نہ واجب۔

۴۔ قرآن مجید کی اصلاح و تعلیم کی قدر کرتا ہو لیکن اسے منزل من اللہ نہ جانتا ہو۔ آپ ایسے شخص کے لیے دین محمدیؐ میں داخل ہونا ضروری نہیں جانتے اور آپ کے نزدیک آنحضور ﷺ کی بعثت کے بعد بھی اس کی نجات اخروی اس کے اپنے مذہب کے مطابق عمل کرنے سے ہو سکتی ہے، بلکہ ہو جائے گی۔ اور آپ کے

نزدیک آنحضرت ﷺ پر ایمان لانے کے معنی بدرجہ کفایت اسی قدر ہیں کہ کوئی آپ کی تعلیم سے مذاہب سابقہ کی اصلی حالت کو سمجھ کر اس پر قائم ہو جائے اور بس۔

کیا عبارات محولہ بالا (مندرجہ ترجمان القرآن) میں آپ کا مطلب یہی ہے؟۔ میرا حسن ظن جو جناب کی ذات سے ہے۔ وہ محتاج بیان نہیں لیکن چونکہ لوگ مجھ سے دریافت کرتے ہیں اور میں اتفاق سے سورہ فاتحہ کی تفسیر لکھ رہا ہوں۔ اس لیے چاہتا ہوں کہ اس میں یہ مسئلہ صاف کر دوں۔ اگر آپ پر بد ظنی بے جا ہے تو ایک مسلمان کی بریت ہو جائے اور اگر بجا ہے تو میں اپنے طور پر اس مسئلے کو واضح طور پر بیان کر دوں۔ (د حکذا)

اس مضمون کا خط لکھ کر اور جواب کے لیے ٹکٹ بھی رکھ کر دہلی مولانا صاحب کی خدمت میں روانہ کر دیا اور باہر لفافہ پر یہ بھی لکھ دیا کہ مولانا صاحب دہلی میں تشریف نہ رکھتے ہوں تو کلکتہ میں یا جہاں کہیں ہوں، وہاں جائے، آج ۲۱ جولائی ۱۹۳۳ء تک -----!

اس قصے کو کئی مہینے گزر گئے۔ نہ میرا خط واپس آیا، نہ جواب ملا اور میرا ظن غالب یہی تھا کہ مولانا صاحب اس کا صاف جواب ہرگز نہیں دیں گے، جیسا کہ میرا خیال ہے۔ مولانا صاحب نے مسئلہ کسی مصلحت کے لیے نہایت احتیاط سے بے ضرورت طوالت اور طول کن تکرار سے پیچیدہ عبارت میں لکھا ہے۔ وہ اسے کبھی بھی واضح نہیں کریں گے۔ الا اس وقت کہ ان کو بارگاہ ایزدی سے لم قلت و من این قلت؟ سے سوال کیا جائے۔ لیکن پھر بھی اس کے متعلق کچھ لکھنے سے پہلے عند اللہ و عند الناس بری الذمہ ہونے کے لیے مولانا صاحب سے استفسار کر لینا ضروری خیال کیا۔

جو باتیں ہم نے مولانا آزاد صاحب کے خط میں لکھی ہیں۔ وہ سب آج کل بعض آزاد رو، کج فہم، بے علم و عمل انگریزی دانوں میں گشت کر رہی ہیں اور یہ سب کچھ ہندوستان کے نئے مذہب برہم سماج کی صدائے باز گشت ہے۔ جو فوٹو گراف کی طرح بعض نام کے مسلمانوں کے حلقوں سے سنائی دے رہی ہے اور مولانا آزاد صاحب کی سریلی بربط کی باریک تاروں سے بھی یہی آواز نکل رہی ہے لیکن ان کی نغمہ سرائی کے شیداؤں کو نغمہ کی شیرینی نے ایسا بے خود کر رکھا ہے کہ وہ اس کیفیت کے ہوتے مضمون

کی حقیقت کو نہیں پاسکتے اور مولانا کی شخصیت کے بوجھ نے ان کے سروں کو اتنا بوجھل کر رکھا ہے کہ ان کے دماغ سوچنے سمجھنے سے معطل ہو چکے ہیں۔ سچ ہے جبکہ الشئی یعمی ویصم یعنی افراط محبت اندھا اور بہرا کر دیتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مولانا آزاد صاحب ہندو برہم سماج سے الگ ایک اسلامی برہم سماج قائم کرنا چاہتے ہیں۔ یعنی جس طرح راجہ رام موہن رائے صاحب نے ہندو یشٹھی کو قائم رکھتے ہوئے ہندو مذہب میں ایک اصلاحی سکیم پیش کی ہے اور ہندوؤں میں سے بہت سے لوگوں نے ہندو کہلاتے ہوئے اسے منظور کر کے ایک الگ جماعت قائم کر لی ہے۔ اسی طرح حضرت مولانا آزاد صاحب اسلامی یشٹھی کو قائم رکھتے ہوئے اسی ترمیم کو بنام صراط مستقیم اور حزب اللہ (برہم سماج) ملت اسلام میں رواج دینا چاہتے ہیں۔

لیکن تھوڑا سا غور سے دیکھا جائے تو راجہ رام موہن رائے صاحب آنجمنی کے کام اور حضرت مولانا کے کام میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ترقی و تنزیل کا سوال ہے، اصلاح و فساد کا نظارہ ہے کیوں کہ راجہ صاحب نے ہندو مذہب کی بت پرستی اور بعض رسوم جاہلیت کو ناپسند کرتے ہوئے اس قوم کی اصلاح کرنی چاہی۔ جس میں وہ ایک حد تک کامیاب ہو گئے کہ آج سو سال کا عرصہ گزر گیا ہے کہ ان کی آواز کی قبولیت سے ہندوستان کے بہت سے بڑے بڑے شہروں میں اس مذہب کی سماجیں قائم ہو گئی ہیں۔ جن کو بت پرستی سے بڑی نفرت ہے لیکن قومیت الگ نہ ہونے کی وجہ سے تعلقات رشتہ ناطہ اور اکل و شرب اور زی و لباس اور ملکی نفرت شاری میں وہ ویسے کے ویسے ہندو ہیں۔

دیگر یہ کہ راجہ صاحب موصوف نے یہ اصلاح و ترمیم قرآن کریم کے مطالعہ سے متاثر ہو کر کرنی چاہی تھی۔ جیسا کہ انہوں نے خود ذکر کیا ہے اور ان کی زندگی کے واقعات اور بعض پنڈتوں اور پادریوں سے ان کی خط و کتابت اور گفتگو سے ظاہر ہے۔ لیکن مولانا ابوالکلام صاحب یہ ترمیم دین محمدیؐ کے انتہائی کمال پر پہنچ جانے اور نبوت کے ختم ہو جانے اور قرآن کریم کے من و عن محفوظ ہونے کے بعد کرنا چاہتے ہیں۔ (والعیاذ باللہ)

اگر کہا جائے کہ حضرت مولانا صاحب اسلام میں کوئی ترمیم نہیں کرنا چاہتے اور نہ وہ اسے جائز مانتے ہیں بلکہ صرف اسی حقیقت کو لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ جو

حضور اکرم ﷺ اور قرآن کریم نے تعلیم کی تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر یہ حقیقت ایسی واضح تھی۔ تو کیا سبب ہے کہ ساڑھے تیرہ سو سال تک یہ حقیقت کسی صحابی، کسی تابعی، کسی امام و مجتہد، کسی محدث، کسی فقیہ، کسی منج سنت متکلم، کسی صاحب کشف و الہام عارف و ولی اللہ پر نہ کھلی۔ اگر یہ حقیقت واضح تھی تو سب مسلمانوں کو اس کا علم ہوتا اور اسی پر سب کا اعتقاد ہوتا اور اگر کوئی ایسی باریک گرہ تھی۔ جسے صرف نہایت باریک بین اور حقیقت شناس افراد ہی کھول سکتے ہوں تو ایسے بڑے بڑے کامل بزرگوں میں سے جو آسمان علم و عمل اور ایمان و عرفان کے آفتاب و ماہتاب ہوئے ہیں۔ اسے کوئی بھی کیوں نہ کھول سکا۔ اور اگر کہا جائے کہ اس معنی کا حل قدرت نے صرف حضرت مولانا کے لیے ودیعت کر رکھا تھا۔ ان سے پہلے جملہ کاملین لکیر کے فقیر ہوتے رہے ہیں تو بلا نزاع فیصلہ کی یہی بات ہے کہ ہمیں اسی لکیر پر چلنا چاہیے جو صحابہ کرامؓ و تابعینؓ اور ائمہ مجتہدین اور صالحین امت کھینچ گئے۔ دیکھئے زیر تفسیر یہی آیت ہے صراط الذین انعمت علیہم یعنی خداوند! ہمیں اس رستے کی رہنمائی کر اور اس پر چلنے کی توفیق عنایت فرما جو تیرے منعم علیہم لوگوں کا ہے اور معلوم ہے کہ اس امت محمدیہؐ میں وہ لوگ وہی ہیں۔ جن کے علم و عمل اور ایمان و عرفان کو ہم مولانا صاحب کے مقابلے میں پیش کر رہے ہیں اور ان میں اور مولانا صاحب میں از روئے علم، عمل اور اخلاص زمین آسمان کا فرق ہے۔

خوب یاد رکھئے! قرآن شریف معمر اور چیتان نہیں ہے۔ اس کا بیان غیر واضح نہیں ہے۔ اس کی عبارت پر تہج و خمدار نہیں ہے۔ وہ اپنے مقصود کو گوگو حالت میں نہیں رکھتا۔ بلکہ وہ کتاب مبین ہے، وہ قول فصل ہے، وہ نور مبین ہے، جس میں تاریکی اور دھندلا پن نہیں ہے۔ وہ ایک ہی دو ٹوک بات کہتا ہے، جس میں شک اور تردد کی گنجائش نہیں ہوتی۔ آنحضرت ﷺ اپنے صحابہ کرامؓ کو صراط واضح اور ملت بیضاء پر قائم کرنے کے بعد اس دنیا سے رخصت ہوئے تھے۔ لہذا صحابہ کرامؓ آپؐ کے مقصد اور حقیقت دین سے نا آشنا نہیں رہ سکتے تھے۔ چنانچہ آپؐ نے اپنی اس زندگی کے آخری ایام میں ان کو خطاب کر کے بطور وصیت کے فرما دیا تھا:-

قد ترکتکم علی البیضاء لیلھا کنھارھا لا یزیغ عنھا بعدی الاھالک و من یعیش منکم فیسیری اختلافاً کثیراً فاعلیکم بما عرفتم من سنتی و

سنة الخلفاء الراشدين المهديين عضوا عليها بالنواجذ الحديث (کنز العمال)
جلد اول، ص ۴۶)

”میں تم کو روش (حالت یا طریق) پر چھوڑ چلا ہوں۔ جس کی رات بھی مثل اس کے دن کے روشن ہے۔ میرے بعد اس سے کوئی بھی سوائے ہلاک ہونے والے کے ٹیڑھا نہیں ہوگا اور جو کوئی تم میں سے میرے بعد (لمبی) عمر پائے گا۔ وہ بہت اختلاف دیکھے گا۔ پس تم نے اسے لازم پکڑے رکھنا جو تم میری سنت سے معلوم کر چکے ہو اور (اگر اس میں نہ ملے)۔ باہدایت خلفائے راشدین کے طریق کو لازم پکڑنا“ اسی (حالت و طریق) کو نہایت مضبوطی سے اپنی داڑھوں سے پکڑے رکھنا۔“

الغرض مولانا کی یہ خواہش معلوم ہوتی ہے کہ وہ ہندوؤں کے جواب میں ایک اسلامی برہم ساج قائم کریں تو یہ بالکل خام خیالی اور بے سود کوشش ہے۔ کیوں کہ اسلام کی اندرونی اور بیرونی اور علمی و عملی پالیسی وہی ہے۔ جس پر حضور پاک ﷺ صحابہ کرامؓ کو چھوڑ گئے اور وہ طریق علما و عملاً صالحین کی وساطت سے ہم تک عہد بعد متواتر چلا آیا ہے۔ اس میں کسی ترمیم کی گنجائش نہیں اور آج ساڑھے تیرہ سو سال بعد کسی شخص کی عبارت آرائی سے اس کی حقیقت نہیں بدل سکتی۔

خود مولانا صاحب نے (ترجمان القرآن) کے مقدمہ میں ضمن عنوان (اصول ترجمہ و تفسیر) متاخر مفسرین پر بڑا اعتراض کیا کہ انہوں نے اپنی تفاسیر میں سلف صالحین کے اصول کو ملحوظ نہ رکھا اور قرآن کو وضعیت و صناعت کے مصنوعی لباس میں چھپا دیا۔ چنانچہ ان کی بعض تصریحات حسب ذیل ہیں:-

۱۔ سلف صالحین کی طبیعتیں و وضعی طریقوں میں نہیں ڈھلی تھیں۔ اس لیے وہ قرآن کی سیدھی سادی حقیقت بے ساختہ پہچان لیتے تھے۔ خلف کی طبیعتوں پر یہ بات شاق گزرنے لگی کہ قرآن اپنی سیدھی سادی شکل میں نمایاں ہو۔ ان کی وضعیت پسندی اس پر قانع نہیں ہو سکتی تھی۔ (ص ۶۷)

۲۔ یہی زمانہ ہے جب امام غفر الدین رازیؒ نے تفسیر کبیر لکھی اور پوری کوشش کی کہ قرآن کا سراپا اس مصنوعی لباس و وضعیت میں سر تاپا پوشیدہ ہو جائے۔ اگر امام صاحب کی نظر اس حقیقت پر ہوتی تو ان کی پوری تفسیر نہیں تو دو تہائی حصہ یقیناً

بے کار ہو جاتا۔ (ص ۶۷)

میرسیا لکھتی:- ”مولانا آزاد صاحب نے امام رازیؒ پر نہایت کرم فرمائی کی کہ ان کی بے مثل تفسیر کی ایک تہائی کو محض اپنی مہربانی سے کسی قدر کار آمد کہہ دیا اور حضرت امام رازیؒ کی حقیقت شناسی کے متعلق جو کچھ جبہنے ہوئے پیرائے میں بیان فرمایا۔ اس کا جواب آگے آئے گا۔“

۳۔ جب کسی کتاب کی نسبت یہ سوال پیدا ہوا۔ اس کا مطلب کیا ہے؟۔ تو قدرتی طور پر ان لوگوں کے فہم کو ترجیح دی جائے گی۔ جنہوں نے خود صاحب کتاب سے مطلب سمجھا ہو۔ قرآن ۲۳ برس کے اندر بتدریج نازل ہوا۔ وہ جس قدر نازل ہوتا تھا۔ صحابہ کرامؓ سنتے تھے، نمازوں میں دہراتے تھے اور جو کچھ پوچھنا چاہتے تھے، خود پیغمبر اسلام (حضرت محمد ﷺ) سے پوچھ لیتے تھے۔ ان میں بعض افراد خصوصیت کے ساتھ فہم قرآن میں ممتاز ہوئے اور خود پیغمبر اسلام ﷺ نے اس کی شہادت

دی۔ مذہبی خوش اعتقادی کی بناء پر نہیں بلکہ قدرتی طور پر ان کے فہم کو بعد کے لوگوں کے فہم پر ترجیح ہونی چاہیے۔ لیکن بد قسمتی سے ایسا ہرگز نہیں سمجھا گیا۔ بعد کے لوگوں نے اپنے اپنے عہد کی فکری موثرات کے ماتحت نئی نئی کادشیں شروع کر دیں اور صریح سلف کی تفسیر کے خلاف ہر گوشے میں قدم اٹھادیئے گئے۔ (ص ۶۸)

مولانا آزاد صاحب کی ان تصریحات سے بغیر کسی قسم کی کھینچ تان کے صاف روشن ہے کہ آپ قرآن شریف کی تفسیر میں سلف صالحین کو نمونہ مانتے ہیں اور انہی کو حقیقت شناس سمجھتے ہیں۔ (امنا و صدقا)

اب سوال یہ ہے کہ صراط مستقیم کی تشریح و تعیین میں جناب مولانا صاحب جو کچھ فرما رہے ہیں اور خاتم النبیین ﷺ کے پیش کردہ اسلام کی حقیقت پر راجح موہن رائے بنگال کے برہم ساج کی جو رنگت چڑھا رہے ہیں۔ اس رنگ سازی میں سلف صالحین میں سے آپ کے ساتھ کون ہے؟۔

دیگر یہ کہ اہم رازیؒ وغیرہ نے باوجود حقیقت شناس ہونے کے ہم کو حضور پاک ﷺ کی دلہیز سے مستغنی نہیں کیا اور ہمارے ہاتھ سے حضور اکرم ﷺ کا دامن نہیں

چھڑوایا لیکن آپ حقیقت شناس ہو کر ہمیں یہ زہر پلانا چاہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے ماننے کی حد کفایت یہی ہے کہ اصولاً "کسی سابق مذہب کی اصلی تعلیم پر کاربند ہو کر بہر نفع یہ کہ باشد اللہ تعالیٰ کی عبادت کر لیں اور نیکو کار بن جائیں۔ مندر میں جا کر سندھیا کر لیں تو کیا! اور گرے میں جا کر پادری صاحب کا لیکچر سننے کے بعد ذرا سر جھکا کر دعا مانگ لیں تو کیا! اور مسجد میں جا کر رکوع و سجود سے بھلہ آداب نماز ادا کر لیں تو کیا! سب خدا پرستی کے وسائل ہیں، جن میں نزاع نہیں چاہیے۔ نزاع کرو گے تو تحزب و تشیع کے فقرے میں آکر بے دین بن جاؤ گے وغیرہ وغیرہ۔

بس جناب! ازراہ کرم فرمائی ہمارے دماغوں کو اس حقیقت شناسی سے معذور سمجھیں۔ جس سے ہم سلف صالحین کے طریق سے ہٹ جائیں۔ امام رازیؒ نے تو وضعیت و صناعت کے لباس میں بھی سلف صالحین کے سے ایمان کو نہیں چھوڑا۔ لیکن آپ حقیقت شناسی کے ایسے مقام پر پہنچ گئے کہ وہاں جا کر سلف صالحین کا دامن صاف صاف ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ (بیس تفاوت راہ از کجاست تا کجا)

ترسم نہ رسی بکعبہ اے اعرابی
کیں راہ کہ تو میروی بہ ترکستان است

جناب والا! ہم آپ کو کیا بتائیں؟۔ لقمان را حکمت آموختن کی مثل ہے۔ اسلام اپنی ذات میں ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ جو کفر کے کسی بھی شعبے سے مل نہیں سکتی۔ برہم سماجیوں کی طرح بین ذالک سبیلہ باریک ہو یا بت پرستوں اور صلیب پرستوں کی طرح نمایاں ہو۔

قد تبين الرشده من الغي فمن يكفر بالطاغوت ويؤمن بالله فقد استمسك بالعروة الوثقى لا انفصام لها (بقرہ، پ ۳)

”حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی آمد پر ہدایت گمراہی سے بالکل الگ ہو چکی ہے۔ پس جو شخص طاغوت سے انکار کرے اور اللہ پر ایمان لائے۔ اس نے ایسی محکم دست پناہ کو پکڑ لیا۔ جو کبھی ٹوٹے گی نہیں۔“

اس کا اعلان ہے اور:- ومن يبتغ غير الاسلام دينا فلن يقبل منه
ہو فی الاخرة من الخسرين O (بقرہ، پ ۳)

”اور جو کوئی اسلام کے سوا کوئی اور دین اختیار کرے گا تو اس سے ہرگز ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ آخرت میں خسارہ پانے والوں میں ہوگا۔“

اس کا قانون ہے۔ پس جس کو روشنی کی طلب ہے اور دارین کی نجات و سعادت کی ضرورت ہے۔ وہ ہر طرف سے منہ موڑ کر اس کے سامنے آئے اور نور سعادت پائے اور جسے راہ حق کی تڑپ ہے۔ وہ سب سے الگ ہو کر اس کی رہنمائی سے راہ پائے۔ چنانچہ وہ پکارتا ہے۔ فاقم وجهک للدين حنیفاً (روم، پ ۲۱) یعنی قائم کر تو اپنے منہ کو دین الہی کے لیے یک رخ ہو کر اور سب سے الگ ہو کر۔

تتمہ بحث

مولانا آزاد صاحب کی اس آزادی کے جواب میں ہماری اسی تفسیر ”واضح البیان“ کا وہ مقام پھر پڑھیں۔ جہاں ہم نے چوتھی قسم کے کفار کا ذکر کیا ہے۔ جو تکذیب و اقرار بالرسول کے درمیان رہ کر خدا پرستی کے مدعی ہیں۔ کیوں کہ ہم نے وہاں پر جو کچھ لکھا ہے۔ وہ اس آزاد روی یا میانہ روی کو خصوصیت سے ملحوظ رکھ کر لکھا ہے۔

اس کے بعد ہم مولانا ممدوح کے ترجمان میں سے بعض اقتباسات نقل کرتے ہیں۔ جو ان کے اور ان کے بعض عمین مغرطین کے لیے ٹھوکر کا باعث ہوئے ہیں۔ مولانا آزاد صاحب کی تصریحات (نمبر ۱) مولانا صاحب آیت اھدنا الصراط المستقیم ○ کی تفسیر کے ضمن میں سورہ مائدہ کی آیت لکل جعلنا منکم شرعاً و منہاجاً نقل کر کے فرماتے ہیں:-

۱۔ اس آیت پر سرسری نظر ڈال کر آگے نہ بڑھ جاؤ بلکہ اس کے ایک ایک لفظ پر غور کرو۔ قرآن مجید کا جب ظہور ہوا تو دنیا کا یہ حال تھا کہ تمام بیروان مذاہب، مذہب کو صرف اس کے ظواہر و رسوم ہی میں دیکھتے تھے۔ لیکن قرآن پاک کہتا ہے کہ نہیں یہ اعمال و رسوم نہ تو دین کی اصل و حقیقت ہیں۔ نہ اختلاف حق و باطل کا اختلاف ہے۔ چونکہ یہ اصل دین ہے اس لیے نہ تو اس میں تغیر ہوا اور نہ کسی طرح کا اختلاف، اعمال و رسوم فرع ہیں۔ اس لیے ہر زمانے اور ہر ملک کی حالت کے مطابق بدلتے رہے، الخ۔ (ص ۱۳)

۲۔ اگر اللہ رب العزت چاہتا تو تمام نوع انسانی کو ایک ہی قوم و جماعت بنا دیتا اور فکر و عمل کا کوئی اختلاف وجود ہی میں نہ آتا۔ لیکن معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسا نہیں چاہا۔ اس کی حکمت کا متقاضی ہوا کہ فکر و عمل کی مختلف حالتیں پیدا ہوں۔ (ترجمان القرآن، ص ۷۱۳)

عرض از جانب خاکسار:- جناب مولانا صاحب! آپ نے اس آیت محولہ کے ایک ایک لفظ پر غور کرنے کی جو تاکید فرمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے اس سے پیشتر ہی اس کا ایک ایک لفظ ہمارے ذہن میں ہے۔ لیکن اس اوعا سے جو آپ نے عنوان (اصول ترجمہ و تفسیر) کے ضمن میں کیا ہے، مثل غنچہ لب بستہ ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ باوجود کم بضاعتی کے ہمارے یقین میں شک کا کوئی بھی کاٹا کبھی نہیں چھا اور ہمارا اعتقاد انکار کی آزمائش میں کبھی جتلا نہیں ہوا۔ جیسا کہ آپ اپنے متعلق اسی عنوان کے صفحہ نمبر ۷۶ میں بتلاتے ہیں۔

آپ نے صفحہ نمبر ۷۵ پر اپنی قرآن وانی اور مطالعہ تفاسیر و کتب مطبوعہ و غیر مطبوعہ اور علوم قدیمہ و جدیدہ کے احتواء کا جو اوعا کیا ہے۔ وہ کسی صاحب علم و عمل امام نے نہیں کیا۔ یا کم از کم کسی کا ایسا دعویٰ ہماری نظر ناقص سے نہیں گزرا۔ حالانکہ ان کی جلالت شان اور وسعت علم اور تقویٰ و دیانت کا قائل ہر کوئی ہے۔

ہاں مرزا صاحب قادیانی کو بھی اپنے متعلق یہی گمان تھا اور ان کے بعد آپ کے رشحات قلم سے بھی ایسی تراوش ہوئی۔ فرق صرف یہ ہے کہ مرزا صاحب قادیانی علوم درسیہ پڑھے بغیر اپنے زعمی فضل و کمال کی تحصیل کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرتے تھے اور آپ شک و انکار کی جملہ وادیوں کی سیر کر چکنے کے بعد جس مقام پر پہنچے ہیں، اسے اپنی علمی تحقیقات کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ لیکن ہم انکار و شک میں پڑے بغیر اور ایسے باطل ادعا کے سوا جملہ آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے عرض کرتے ہیں کہ آل کرم نے شیخ و تبدیل شرائع کی صرف صورت دیکھی ہے اور (گستاخی معاف!) حقیقت نہیں سمجھی جو یہ ہے کہ کسی شریعت میں شیخ و تبدیل اللہ رب العالمین کی طرف سے ہوتی ہے اور کسی نبی برحق کی معرفت ہوتی ہے۔ نہ لوگوں کی آراء سے کہ وہ خود اس میں تنسیخ و ترمیم کر لیں۔ اور یہ جو آپ نے فرمایا ”کہ اصل دین ایک خدا کی پرستش اور نیک عملی کی زندگی ہے۔“

بالکل درست ہے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی خیال رہے کہ عبادت کا طریق اور نیک عمل کی زندگی اللہ تعالیٰ کے ہاں وہی مقبول ہے۔ جو اس کے نبی برحق کی معرفت تعلیم دی گئی ہو۔ ورنہ سلسلہ رسالت و نبوت کی کوئی ضرورت نہیں رہے گی۔ پس اگر اللہ تعالیٰ نے کسی سابق نبی کی شریعت کا کوئی طریق بتقاضائے مصلحت وقت کسی متاخر نبی کی معرفت منسوخ کر دیا۔ یا اس میں کوئی تبدیلی کر دی تو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور اس کی بارگاہ میں قبولیت اسی متاخر نبی کی پیروی سے حاصل ہوگی۔ نہ کہ منسوخ شدہ شریعت کی پیروی سے۔ لہذا آپ کے اقوال مثلاً " (قرآن مجید) ہر گروہ سے یہی مطالبہ کرتا ہے کہ اپنے مذہب کی حقیقی تعلیم پر سچائی کے ساتھ کاربند ہو جائے۔ وہ کتا ہے اگر تم نے ایسا کر لیا تو میرا کام پورا ہو گیا۔ (ترجمان، ص ۱۵۴)

اور یہ کہ اس (قرآن مجید) نے جب کبھی لوگوں کو اپنی طرف دعوت دی ہے تو یہی کہا ہے۔ اپنے اپنے مذہبوں کی حقیقی تعلیم از سر نو تازہ کرلو۔ تمہارا کرنا ہی مجھے قبول کرنا ہے۔ (ترجمان، ص ۱۶۰) وغیرہ وغیرہ سب کے سب قرآنی دعوت کے برخلاف ہیں اور چونکہ شریعت محمدیہؐ آخری شریعت اور سب شرائع سابقہ کی ناسخ ہے۔ اس لیے اس وقت اللہ تعالیٰ کی رضامندی اسی کی پیروی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ ورنہ آنحضرت ﷺ کو خاتم النبیین کرنا بے معنی ہو گا۔ (والعیاذ باللہ)

گو اس مضمون کی آیات بکثرت ہیں لیکن ہم مثال کے طور پر صرف ایک آیت ذکر کر کے اس بات کو سمجھائے دیتے ہیں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے سورۃ نور، پ ۱۸ میں فرمایا۔ **واقيموا الصلوة واتوا الزکوة واطيعوا الرسول لعلکم ترحمون** ○ یعنی "نماز اور زکوٰۃ ادا کرتے رہو اور اس رسول (محمد ﷺ) کی اطاعت کرو اور امید رکھو کہ تم پر رحم کیا جائے گا۔" اس میں شک نہیں کہ اس جگہ الرسول سے مراد نبی پاک ﷺ کی ذات اقدس ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے نماز کے قائم رکھنے، زکوٰۃ کے ادا کرنے اور رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کرنے کا حکم دیا اور ان احکام کی تعمیل پر رحمت کی امید دلائی اور یہ معلوم و مسلم ہے کہ آنحضرت ﷺ نے نماز کی ایک خاص صورت اور ہیئت اور زکوٰۃ کا ایک خاص نصاب اور طریق ادا تعلیم کیا ہے۔ اچھا اگر اب کوئی یہودی یا عیسائی نماز اور

زکوٰۃ کے متعلق اس حکم الیہوا الرسول کو نظر انداز کرتے ہوئے شیخ قبلہ صخرہ کے بعد آنحضور ﷺ کے طریق سے جدا ہو کر اور کعبۃ اللہ سے منہ موڑ کر صخرہ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھے اور آنحضرت ﷺ کے مقرر کردہ نصاب اور طریق ادا کو چھوڑ کر زکوٰۃ ادا کرے تو کیا آپ اسے حضور پاک ﷺ کا مطیع و فرماں بردار قرار دے سکیں گے؟۔ اگر نہیں دے سکیں گے تو اپنے اپنے مذہب کی حقیقی تعلیم پر سچائی سے کاربند ہو جانے کی اجازت کے کیا معنی؟۔ اور اگر دے سکیں گے تو ان امور میں آنحضرت ﷺ کی فرماں برداری کہاں ہوئی جو اللہ تعالیٰ نے بالتنصیص فرمائی ہے اور آنحضور ﷺ کو اپنے طریق خاص کی طرف دعوت دے سکتے کا حق کیسے رہا؟۔ اور اس آیت قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی (آل عمران، پ ۳) کے کیا معنی ہوئے؟۔ اور خطبات الہدیٰ ہدیٰ محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی کیا حقیقت؟۔ یعنی سب کلاموں سے بہتر کلام اللہ تعالیٰ کی کتاب (قرآن مجید ہے۔) اور سب سیرتوں سے بہتر سیرت و روش محمد ﷺ کی ہے۔ اللہم اننا نعوذ بک من وساوس الصدر

مولانا! آپ کا یہ دوسرا انہی شکوک و انکار کا اثر و بقیہ ہے۔ جن کا آپ نے ص ۷۶ پر ذکر کیا ہے۔ اچھا یہ تو بتائیے کہ خلیفہ اول جناب صدیق اکبرؓ نے مانعین زکوٰۃ سے جو جہاد کیا۔ اس میں حضرت صدیق اکبرؓ حق پر تھے یا معاذ اللہ ظالم و جابر تھے۔ کیا مانعین زکوٰۃ دین اسلام سے برگشتہ ہو گئے تھے یا زکوٰۃ کی فرضیت سے منکر ہو گئے تھے۔ نہیں ان دونوں صورتوں سے کوئی بھی نہ تھی۔

بلکہ وہ اس طریق پر جو آنحضور ﷺ کے عہد کا معمول تھا۔ آپ کے خلیفہ برحق کے ہاتھ پر زکوٰۃ ادا کرنا نہیں چاہتے تھے۔ جس پر حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ان کے برخلاف جہاد کا اعلان کر دیا اور ان کو گردنوں سے پکڑ کر ان سے اسی طریق کی تعمیل کروائی۔ جو آنحضرت ﷺ کے عہد کا معمول تھا۔ امید ہے کہ آپ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے اس کام کو ان کی خلافت کے نمایاں کارناموں میں نمایاں حیثیت میں جگہ دیتے ہوں گے۔ تو کیا آپ نے باوجود تقاضا و کتب مطبوعہ و غیر مطبوعہ کے ذخیرہ کا بیشتر حصہ نظر سے گزار دینے کے کبھی اس حقیقت پر بھی غور فرمایا کہ جب جناب رسالت پناہ ﷺ کو حق

حاصل نہیں کہ کسی یہودی یا عیسائی سے ان کی توریت و انجیل سے زائد اطاعت کرا سکیں تو آپ کے خلیفہ کو آپ کے طریق خصوصی کی حمایت میں کلمہ گو، پابند صوم و صلوة مسلمانوں کے خلاف لشکر کشی کا حق کہاں سے مل گیا؟۔

من مگوئم این مکن آں کن
حق بہ بین و کار آساں کن

اور ص ۱۳۷ کے دوسرے فقرے میں آپ نے جو لیبلوکم کے مفہوم میں فکر و عمل کی مختلف حالتیں لکھ کر لفظ فکر کو مفہوم قرآنی پر بڑھایا ہے۔ اس سے مقصود قرآنی میں بہت تغیر پیدا ہو گیا ہے اور اس آیت کا جو ترجمہ آپ نے ص ۱۳۶ پر ارقام فرمایا ہے۔ یہ تشریح اس سے بہت دور جا پڑی ہے اور آپ کی اس تحریر کے ماتحت ہو گئی ہے۔ جو آپ نے اصول ترجمہ و تفسیر کے ضمن میں ص ۷۷ پر لکھی ہے کہ تفسیر بالرای سے مقصود ایسی تفسیر ہے۔ ”جو اس لیے نہ کی جائے کہ خود قرآن کیا کہتا ہے۔ بلکہ اس لیے کی جائے کہ ہماری کوئی ٹھہرائی ہوئی رائے کیا چاہتی ہے اور کس طرح قرآن کو کھینچ تان کر اس کے مطابق کر دیا جاسکتا ہے۔“ (ص ۷۷)

قرآن شریف کا مقصود وہی ہے جو آپ نے ترجمہ میں لکھا کہ (ہر وقت و حالت کے مطابق) تمہیں جو احکام دیئے گئے ہیں۔ ان میں تمہاری آزمائش کرے۔ (ص ۱۳۶) لیکن اس کی تشریح میں لفظ فکر کو داخل مفہوم قرآنی کر کے آپ قرآن شریف کو کھینچ تان کر اپنی کانگریسی ذہنیت کے مطابق کرنا چاہتے ہیں۔ جو درست نہیں اور اسی طرح ص ۱۳۸ میں آیت سورہ یونس پ ۱۱ ولو شاء ربک لامن کے ترجمہ میں بین القوسین جو یہ بڑھایا ہے۔ (لیکن تم دیکھ رہے ہو کہ اس کی حکمت کا فیصلہ یہی ہوا کہ ہر انسان اپنی اپنی سمجھ اور اپنی اپنی راہ رکھے۔) اور اس کی تشریح میں جو آپ نے فرمایا ہے۔ پس اس کے سوا چارہ نہیں کہ اس بارہ میں رواداری اور دسعت نظر پیدا کرو۔ آپ کی ایسی سب تحریریں کتاب اللہ میں زیادتی اور قصر نبوت پر کاری ضرب ہے اور یہ سب کانگریسی ذہنیت کا اثر ہے۔ (اللهم اغفر)

مولانا صاحب کی تصریح نمبر ۲ :- مولانا صاحب اسی آیت اھلنا الصراط المستقیم کی تفسیر کے ضمن میں سورہ بقرہ کی آیت ان الذین امنوا والذین ہادوا

نقل کر کے اس کی تشریح میں فرماتے ہیں:-

”یعنی دین سے مقصود تو خدا پرستی اور نیک عملی کی راہ تھی۔ وہ کسی خاص حلقہ بندی کا نام نہ تھا۔ کوئی انسان ہو، کسی نسل و قوم سے ہو۔ کسی نام سے پکارا جاتا ہو لیکن اگر خدا پرست اور نیک عمل ہے۔ تو دین الہی پر چلنے والا ہے اور اس کے لیے نجات ہے۔“ (ص ۱۴۱)

ہماری عرض:- اس آیت کی پوری تفسیر سابقہ ہماری اسی ”تفسیر واضح البیان“ میں ملاحظہ فرمائیں۔ اس وقت ہم مولانا صاحب کے الفاظ ”کسی نام سے پکارا جاتا ہو“ کے متعلق کچھ لکھنا چاہتے ہیں۔ سو واضح ہو کہ اس نام سے مولانا کی مراد ذاتی نام زید، بکر وغیرہ نہیں، بلکہ یہودی یا نصرانی یا مسلمان مذہبی نام مراد ہیں۔ گویا مولانا صاحب کے نزدیک بتقاضائے وقال انسی من المسلمین (حم سجدہ، پ ۲۴) اسلام کا اقرار کر کے مسلمان نہ بھی کہلاتا ہو تو وہ بھی نجات پا سکتا ہے۔ گویا حضرات موسیٰ و عیسیٰ کی شریعت کے بعد برعایت مصلحت زمانہ شریعت محمدیہ میں اللہ تعالیٰ کی وحی سے جس قدر اضافے کیے گئے اور کچھلی شریعتوں کے جس قدر مسائل منسوخ ہوئے۔ جن کی تکمیل سے اس شریعت کو مکمل اور ہمیشہ کے لیے غیر مہدل کر دیا گیا۔ اور آیت الیوم اکملت لکم دینکم (مائدہ، پ ۶) نازل کر کے آنحضرت ﷺ کو خاتم النبیین کیا گیا۔ معاذ اللہ! وہ سب بے سود و لا حاصل ہیں۔ آنحضرت ﷺ کے سامنے یہودیت و نصرانیت پر قائم رہنا۔ (گو ان کی حقیقی تعلیم موجود بھی ہو۔) آفتاب عالمتاب کی موجودگی میں چراغ لے کر بیٹھنا ہے۔ حضرت عمرؓ نے آنحضور ﷺ کے سامنے توریت کے کچھ اجزا پیش کیے۔ تو آپؐ نے اس پر جو کچھ فرمایا تھا اس کا تذکرہ سابقہ ”گزر چکا ہے۔ اس سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ صاحب توریت حضرت موسیٰؑ بذات خود بھی تشریف فرما ہوں۔ تو وہ بھی نبی پاک کی

جسے مولانا مکرم! یہودی اور نصرانی نام بھی تو لوگوں کی بدعات مستندہ میں سے ہیں۔ آپ نے ان سے پکارے جانے کو کیوں گوارا کیا؟۔ حضرت نوحؑ سے لے کر آنحضور ﷺ تک تمام انبیاء کرامؑ کے حالات قرآن حکیم میں سے پڑھیں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے ہر نبی کا مذہب اسلام اور اس کی امت کا نام مسلمان بتایا ہے۔

ذات اقدس سے نہ خود بے نیاز ہو سکتے ہیں نہ دوسروں کو بے نیاز کر سکتے ہیں۔ یہی حال صاحب انجیل حضرت عیسیٰؑ کا ہے۔ کہ وہ بھی جب اخیر زمانہ میں آسمان سے نازل ہوں گے تو نبی اکرم ﷺ کی شریعت کی پیروی کریں گے۔ کیوں کہ یہ شریعت کامل و عالمگیر ہے اور تا قیام قیامت دائم و قائم رہنے والی ہے۔ اور اس سے پیشتر کی سب شریعتیں خاص خاص امتوں اور مخصوص و محدود زمانے کے لیے تھیں اور کامل بھی نہ تھیں۔ (فافہم)

اس کی ایک مثال اور بھی سن لیجئے کہ بچپن کے زمانہ میں ہر سال کے لیے پارچات پوشیدنی کا ناپ بڑھتا رہتا ہے لیکن جب انسان بالغ ہو کر طول و عرض میں پوری طرح بڑا ہو جاتا ہے تو اس حالت کا ناپ تا قیام زندگی ہمیشہ کے لیے رہتا ہے۔ اس وقت بچپن کے کپڑے پہننے خواہ وہ عین بعین موجود بھی ہوں۔ عقلمندی نہیں۔ یہ حال شریعت محمدیہؐ اور شرائع سابقہ کا ہے کہ یہ دائم قائم و کامل و مکمل ہے اور وہ صرف اس وقت کے لیے تھیں۔ وہ بلوغ و کمال سے پیشتر زمانہ کی ہیں اور یہ بلوغ و کمال کے وقت کی ہے۔ (فافہم لعلک ترشد)

لذا ہم آج محض یہودیت و نصرانیت پر یا معاذ اللہ ہندو ازم پر (خواہ وہ اصلی حالت پر ثابت بھی ہو جائیں۔) قائم ہو کر بلوغت کے وقت بچپن کے کپڑے نہیں پہن سکتے۔ اور قرآن مجید اور سیرت محمدیہؐ سے مستغنی ہو کر ان پر عمل پیرا ہو کر نجات نہیں پا سکتے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ ہمیں اپنی صراطِ مستقیم کی سمجھ عطا کرے، آمین۔

مولانا کی تصریح نمبر ۳:- مولانا صاحب نے ص ۱۳۹ پر ایک بغلی سرخی ”قرآن مجید کی دعوت“ قائم کی ہے اور اس میں بعض وہ آیتیں نقل کی ہیں۔ جن میں یہ مذکور ہے کہ ”اے نبی! ہم نے تیری طرف اسی طرح وحی کی ہے جس طرح تجھ سے پہلے انبیاء کرامؑ کی طرف کی تھی اور نیز یہ کہ اے نبی! تو بھی ان انبیاء کرامؑ کی ہدایت کی پیروی کر۔“

مولانا آزاد صاحب ان آیات سے اپنے ٹھانے ہوئے مقصود کو ذہن میں رکھ کر اور مقصود خداوندی کو ایک طرف رکھ کر رقم طراز ہیں:-

”اسی لیے اس (قرآن شریف) کی پہلی بنیاد ہی یہ ہے کہ تمام بائبان مذاہب اور تمام آسمانی کتابوں کی یکساں طور پر تصدیق کی جائے کہ سب حق پر تھے۔ سب خدا کی سچائی کے پیغامبر تھے اور ان سب کی متفقہ تعلیم پر کاربند ہونا ہی ہدایت و سعاد کی حقیقی راہ ہے۔“

”(ص ۱۵۰)

مولانا صاحب نے ”متفقہ تعلیم“ کے الفاظ اور جگہ بھی دہرائے ہیں اور اس مضمون کو حسب عادت بتکار بیان فرمایا ہے۔ ملاحظہ ہو ص ۱۵۹، سطر ۲ اور ص ۱۶۳، سطر ۲۰/۲۳ ضمن و۔

ہماری عرض یہ ہے کہ سب کی ”متفقہ تعلیم“ سے مولانا کی مراد کیا ہے؟ اگر سب کا مشترک نصاب تعلیم مراد ہے۔ یعنی دین و شریعت کا وہ حصہ جو سب میں مشترک ہے، مراد ہے تو سوال یہ ہے کہ بعض وہ امور جو ایک شریعت میں بوجہ عدم اقتضائے وقت و مصلحت تعلیم نہیں کیے گئے اور اس سے بعد کی شریعت میں کئے گئے یا کسی پہلی شریعت میں لیکن اس سے پچھلی شریعت میں بنا بر حکمت و مصلحت منسوخ کر دیئے گئے۔ جسے مولانا صاحب بھی آیت ماننسخ من آیۃ (بقرہ پ ۱) کے ترجمہ پر بغلی تشریح میں تسلیم کرتے ہیں۔ ان کی تصدیق و تعمیل واجب ہوگی یا نہیں؟ اگر واجب نہ ہوگی تو ان کے نازل کرنے سے کیا فائدہ؟ اور شریعت کی تکمیل و ارتقاء جن کا ذکر آپ ص ۲۰۴ کی بغلی تشریح میں کرتے ہیں، کس طرح متصور ہوگا؟ اور اگر واجب ہوگی (جیسا کہ فی الواقعہ ہے) تو مصدقین و مومنین کے مقابلہ میں جو لوگ اس نسخ و اضافہ کے قائل نہ ہو کر اپنی پہلی شریعت پر قائم رہیں گے۔ ان کا حکم کیا ہوگا؟ مثلاً اگر بالفرض یہودیوں اور عیسائیوں کے پاس اصل توریت و انجیل جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی تھیں۔ موجود بھی ہوں (جو واقعہ میں نہیں ہیں) اور حضرات موسیٰ اور عیسیٰؑ کی سیرت و طریق عمل پوری حفاظت سے اور معتبر وسائل سے ان کے پاس مکتوب و محفوظ بھی ہو۔ (جو واقعہ میں نہیں ہے) اس لیے کہ شریعت محمدیہؐ کامل ہے اور سب شرائع سابقہ کی ناسخ ہے۔ ان یہود و نصاریٰ کو اس شریعت پر عمل کرنا واجب ہو گا یا نہیں؟ اگر واجب نہیں تو شریعت محمدیہؐ کو کامل و ناسخ بنانے سے کیا حاصل؟ اور اگر واجب ہے تو اپنی اپنی شریعت پر قائم رہنے کی اجازت کے کیا معنی؟

مولانا صاحب! تصدیق کے معنی یہ ہیں کہ ان سب شرائع کو خواہ وہ برقرار ہوں، خواہ منسوخ۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے منزل جانا جائے اور تعمیل کے معنی یہ ہیں کہ منسوخ کو ترک کر دیا جائے اور ناسخ پر عمل کیا جائے اور پہلی غیر کامل شریعت کے بعد دوسری کامل شریعت کے خداوندی اضافات کو قبول کر کے ان پر بھی عمل کیا جائے۔ یہ صورت

آپ کے ذہن شریف میں آجائے تو آپ کے سامنے سوائے امت محمدیہ (علی صاحبہا الصلوٰۃ والتیمہ) کے کوئی جماعت بھی صحیح معنوں میں اللہ تعالیٰ کی پرستار اور اس کی شریعت کی تابعدار نظر نہ آئے۔ یہی صحیح ایمان کی صورت ہے اور یہی سعادت و نجات کی حقیقی راہ ہے اور بس۔

مولانا صاحب کی تصریح نمبر ۴:- مولانا صاحب اپنے ترجمان میں ص ۱۵۴ پر رقمطراز ہیں:-

”یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ان راست باز انسانوں کے ایمان و عمل کا پوری فراخ دلی کے ساتھ اعتراف کیا ہے جو نزول قرآن کے وقت مختلف مذاہب میں موجود تھے اور جنہوں نے اپنے مذہبوں کی حقیقی روح ضائع نہیں کی تھی۔“ (ص ۱۵۴)

اس کے بعد مولانا صاحب نے بعض وہ آیتیں لکھی ہیں۔ جو بعض اہل کتاب کی تعریف میں ہیں۔ مثلاً ”لیسوا سواء (آل عمران، پ ۴) اور منهم امة مقتصدة (مائدہ، پ ۶)

ہماری عرض یہ ہے کہ مولانا صاحب نے اس مقام پر بھی عبارت ”مختلف مذاہب میں موجود تھے اور جنہوں نے اپنے مذہبوں کی حقیقی روح ضائع نہیں کی تھی۔“ اپنے خاص مقصود یعنی اسلام پر ہم سماج قائم کرنے کے خیال کو ملحوظ رکھتے ہوئے اور واقعات کو نظر انداز کرتے ہوئے قرآن مجید کی تفسیرات کے خلاف از خود بدھاوی ہے۔ کیوں کہ ان آیتوں میں اور ان جیسی دیگر آیات میں جن میں اہل کتاب کی تعریف وارد ہے۔ ان سے وہ لوگ مراد ہیں جو آنحضرت ﷺ پر اور قرآن شریف پر ایمان لے آئے تھے۔ مثلاً حضرت عبداللہ بن سلام اور ان کے ساتھی یہود میں سے اور نجاشی اور ان کے ساتھی عیسائیوں میں سے۔ چنانچہ سورہ مائدہ میں پارہ ہفتم کے شروع میں فرمایا:-

وَإِذَا سَمِعُوا مَا أُنْزِلَ إِلَى الرَّسُولِ تَرَىٰ أَعْيُنُهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوا مِنَ الْحَقِّ يَقُولُونَ رَبَّنَا فَاصْنَبْ لَنَا أَمْثَلَ حَقِّهِمْ لَعَلَّاهُمْ يَرْجُونَ ○ وَمَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَمَا جَاءَنَا مِنَ الْحَقِّ وَنَطْمَعُ أَنْ يُدْخِلَنَا رَبَّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصَّالِحِينَ ○

”اور جب انہوں نے اس کلام کو سنا جو اس وقت (حاضر الوقت) رسول (محمد ﷺ) پر اتارا گیا ہے تو تو دیکھتا ہے کہ ان کی آنکھیں آنسو بہانے لگ گئیں۔ اس وجہ سے

کہ انہوں نے حق کو پہچان لیا اور وہ (بے اختیار) بول اٹھے۔ خداوند! ہم ایمان لے آئے ہیں۔ پس ہم کو بھی شاہدوں میں لکھ لے اور (وہ یہ بھی کہنے لگے۔) ہمیں کیا ہے؟ کہ ہم اللہ تعالیٰ پر اور اس حق پر جو ہم کو آچکا ہے، ایمان نہ لائیں اور ہم (کیوں) یہ توقع نہ رکھیں کہ ہمیں ہمارا پروردگار صالح قوم کے زمرے میں داخل کر دے۔“

یہ آیتیں بالاتفاق مفسرین حبشہ کے عیسائی نو مسلموں کے حق میں نازل ہوئیں۔ بلکہ خود مولانا آزاد صاحب بھی ان کے متعلق یہی فرماتے ہیں۔ چنانچہ آپ واذا سمعوا ما انزل الی الرسول کا ترجمہ یوں کرتے ہیں۔ ”اور جب یہ (عیسائی) وہ کلام سنتے ہیں جو اللہ کے رسول پر نازل ہوا۔“ (ترجمان ص ۴۰۵)

اور ربنا امنّا کا ترجمہ یوں کرتے ہیں۔ ”خدا یا! ہم (اس کلام) پر ایمان لائے۔“

اور ان آیتوں کے متعلق بظنی تشریحات میں فرماتے ہیں۔ ”نجاشی، حبش کا مسیحی فرماں روا، بغیر دیکھے ایمان لے آیا۔----- نجاشی کے علاوہ خود عرب میں بھی عیسائیوں کی بڑی تعداد ایمان لے آئی۔“ (ص ۴۰۵)

اس سے صاف، روشن اور واضح ہو جاتا ہے کہ مولانا صاحب کے نزدیک ان آیات کے مصداق وہ عیسائی ہیں جو قرآن مجید اور اس کے پیغمبر ﷺ پر ایمان لے آئے تھے۔ تو سورہ مائدہ کے ترجمے کی ان تشریحات کے خلاف آپ نے سورہ فاتحہ کی تفسیر میں ان جیسی دیگر آیتوں کی تشریح میں یہ الفاظ کیسے داخل کر دیئے کہ ان سے وہ لوگ مراد ہیں۔

”جو نزول قرآن کے وقت مختلف مذاہب میں موجود تھے اور جنہوں نے اپنے مذہب کی حقیقی روح ضائع نہیں کی تھی۔“

نکتہ عجیبہ:- مولانا صاحب نے سورہ آل عمران، پ ۴ کی جو آیت یعنی لیسوا سواہ اپنے مطلب کے لیے پیش کی ہے۔ اس کے اور پارہ ہفتم والی مذکورہ بالا آیات میں ایک خاص نکتہ ہے۔ جو اللہ کے فضل و کرم سے قارئین کرام کو کمال حظ و لطف دے گا اور وہ اس سے سراسر قائل ہو جائیں گے کہ وہ ان ہر دو مقامات پر اور ان جیسے دیگر مقامات پر جن اہل کتاب کی مدح و تعریف ہے۔ ان سے مراد وہ افراد ہیں جو آنحضور ﷺ پر ایمان لا

کر آپ کے صحابہ کی مقدس جماعت میں داخل ہو گئے تھے۔ ان ہر دو مقامات کو پھر دیکھئے کہ ان ہر دو میں الصالحین کا لفظ وارد ہے اور ان صالحین سے آنحضرت ﷺ کے صحابہ کرامؓ مراد ہیں۔ سورہ مائدہ پ ۷ میں بتایا کہ یہ اہل کتاب آرزو رکھتے ہیں کہ وہ قرآن مجید پر ایمان لا کر جماعت صالحین میں داخل ہو جائیں اور سورہ آل عمران پ ۴ کی آیت میں بتایا کہ وہ ان صالحین میں شامل ہو گئے اور معلوم ہے کہ اس وقت حضور اکرم ﷺ کے ساتھ صحابہ کرامؓ کی مقدس جماعت ہی تھی۔ جن میں وہ شامل ہونا چاہتے تھے اور بفضل خدا شامل ہو گئے۔

اسی طرح سورہ انبیاء پ ۱۷ کے اخیر میں بشارت فتوحات کے متعلق فرمایا:-
ولقد كتبنا في الزبور من بعد الذكر ان الارض يرثها عبادي الصالحون
(انبیاء پ ۱۷)

”اور ہم نے تو تحقیق زبور میں نصیحت کے بعد (صاف صاف) فرما دیا تھا کہ زمین کے وارث میرے صالح بندے ہوں گے۔“

اس بشارت کے مطابق صحابہ کرامؓ کی مقدس جماعت عرب و عراق، ایران و روم، شام و مصر کے فتحوں کے وارث ہو گئے۔ جس سے کسی کو بھی انکار نہیں۔ چنانچہ ہم کتب سابقہ کے بعض حوالے نقل کرتے ہیں:-

۱۔ انجیل متی باب ۲۱ - ۲۳ میں لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے قوم یہود سے خطاب کر کے فرمایا:-

”(۳۳) اس لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی بادشاہت تم سے لے لی جائے گی اور اس قوم کو جو اس کے پھل لائے، دے دی جائے گی۔ (۳۲) اور جو اس پتھر پر گرے گا، اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے مگر جس پر وہ گرے گا۔ اسے پس ڈالے گا۔“

۲۔ اسی طرح انجیل لوقا میں بھی یہ تمثیل مذکور ہے۔ (لوقا ۲۰، ۱۶ - ۱۷)

۳۔ اور دانیال نبی کی کتاب میں لکھا ہے کہ حضرت دانیالؑ نے بادشاہ بنوکد نصر کے خواب کی تعبیر میں فرمایا:-

”(۳۴) اور ان بادشاہوں کے ایام میں آسمان کا خدا ایک اور سلطنت برپا

کرے گا، جو تابعدار نیست نہ ہوگی اور وہ سلطنت دوسری قوم کے قبضے میں نہ پڑے گی۔ وہ ان سب مملکتوں کو ٹکڑے ٹکڑے اور نیست کرے گی اور وہی تابعدار قائم رہے گی۔ (باب دوم)

۳۔ اللہ تعالیٰ حضرت حزقیل نبی کی معرفت اس وقت کے شاہ یروشلم کو تنہیداً فرمایا ہے:-

”ارے تو بے دین شریر اسرائیل کے بادشاہ جس کا دن تیری بدکاری کے انجام کو پہنچنے کو آیا ہے۔ (۲۶) خداوند یہوداہ یوں فرماتا ہے کہ کلاہ اور تاج لے جا، یہ ایسا نہ رہے گا، پست کو بلند کر اور اسے جو بلند ہے پست کر (۲۷) میں ہی اسے الٹ الٹ دوں گا۔ یہ پھر نہ ہوگا اور جب کہ وہ جس کا حق ہے، آئے گا۔ میں وہ اسے دوں گا۔“ (حزقیل ۲۱، ۲۵-۲۷)

۵۔ اور حضرت داؤدؑ کی زبانی زیور میں مرقوم ہے:-

”(۱۸) یہ پچھلی پشت کے لیے لکھا جائے گا اور لوگ جو پیدا ہوں گے۔ خداوند کی ستائش کریں گے۔ (۱۹) کہ اس نے اپنے بلند اور مقدس مکان پر سے نگاہ کی۔ خداوند نے آسمان پر سے زمین پر نظر کی۔ (۲۰) تاکہ قیدی کا کراہنا سنے اور کہ انہیں جن پر قتل کا فتویٰ ہوا ہے۔ چھڑائے۔ (۲۱) تاکہ صیہون میں خداوند کا نام بیان کیا جائے اور یروشلم میں اس کی ستائش ہو۔ (۲۲) جب کہ امتیں اور مملکتیں خداوند کی عبادت کے لیے ایک ساتھ جمع ہوں۔ (زیور ۱۰۲، ۱۸-۲۲)

یہ سب باتیں حضرت عمرؓ کے عہد میں پوری ہو گئیں اور یروشلم کامل طور پر صحابہ کرامؓ کی مقدس جماعت کے زیر نگیں ہو گیا اور وہاں سب نے مل کر نماز باجماعت ادا کی۔

تفہیمات:-

(۱) قرآن کریم نے بھی الارض یعنی ارض مقدس کی وراثت کی بشارت میں زیور ہی کا حوالہ دیا ہے اور حوالہ نمبر ۵ جو ہم نے اوپر زیور ہی سے نقل کیا ہے۔ اس میں یروشلم کو فتح کرنے والی قوم کی ایک یہ علامت ذکر کی گئی ہے کہ وہ قوم خدا کی ستائش (حمد) کرنے والی ہوگی۔ اور ہم آیت الحمد للہ رب العالمین کی تفسیر میں مفصل بیان کر آئے ہیں کہ

آنحضور ﷺ کی امت کا نام کتب سابقہ میں حمادون (خدا کی ستائش کرنے والے) لکھا ہے۔ یہ حوالہ بھی اس سے پوری مطابقت رکھتا ہے۔

(۲) دیگر یہ کہ اس حوالہ میں اس فاتح قوم کی ایک نشانی یہ بھی لکھی ہے کہ وہ ایک ساتھ ہو کر اللہ رب العزت کی عبادت کریں گے۔ اس میں نماز باجماعت ادا کرنے کی طرف اشارہ ہے۔ یہ علامت بھی صرف امت محمدیہؐ میں پائی جاتی ہے۔ (والحمد للہ!)

(۳) دیگر یہ کہ اس حوالہ زبور میں اس امت مرحومہ کو پچھلی امت کہا گیا ہے اور اس میں تو کسی کو کلام نہیں کہ پچھلی امت یہی امت محمدیہؐ ہے، کیوں کہ آپ آخری نبی ﷺ ہیں اور آپؐ کی امت آخری امت ہے۔

اس امر کی نسبت ایک اور نکتہ بھی ملاحظہ فرمائیے کہ انجیل لوقا میں لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا۔ ”اور دیکھو بعض آخر ایسے ہیں جو اول ہوں گے اور اول ہیں جو آخر ہوں گے۔“ (لوقا، باب ۱۳، ۳۰)

اسی کے مطابق حدیث صحیحین میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:-

نحن الاخرون السابقون يوم القيامة بيد انهم اوتوا الكتاب من قبلنا و اوتينا من بعدهم۔ الحديث متفق عليه (مشکوٰۃ)

ہم سب سے پیچھے ہوئے ہیں (لیکن) قیامت کے دن سب سے آگے ہوں گے،

۸۸۔ یہ حدیث یوم الجمعہ اور اس امت مرحومہ کی فضیلت کے متعلق ہے۔ ہم نے اس پر اپنی کتاب صلوٰۃ النبیؐ (۹۸ - ۹۵) میں کسی قدر تفصیل سے لکھا ہے اور ایک نادر علمی تحقیق کو ظاہر کیا ہے، جس سے صاف روشن ہو جاتا ہے کہ یہود و نصاریٰ میں ہنپنے اور اتوار کے دن سبت منانے کا جو رواج ہے اس کا تقرر خدا کی وحی سے نہیں ہے۔ اس حقیقت کو نبی امی ﷺ نے ظاہر کیا اور صدہا سال کے قومی رواج کا پردہ چاک کر دیا۔ اللہم صل وسلم علیہ مولانا جابیؒ فرماتے ہیں:-

نو دش خط ولے زد خط بتعجیل
بلک فتح برتوریت و انجیل

ماسوا ان (یسود و نصاریٰ) کو ہم سے پہلے کتاب دی گئی اور ہم کو ان سے پیچھے دی گئی۔“
معذرت:-

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم
چنانکہ حرف عصا گفت موسیٰ اندر طور

رجوع مطلب:- ساتویں پارے کی مذکورہ بالا ابتدائی آیتوں کے ترجمہ کی بغلی تشریح میں مولانا آزاد صاحب عیسائیوں میں سے بڑی تعداد کے ایمان لے آنے کا ذکر کرنے کے بعد میں فرماتے ہیں:-

”لیکن یودیوں کے جمود میں جنبش نہ ہوئی۔ وہ برابر مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرتے رہے، یہاں تک کہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں خیبر سے جلا وطن کئے گئے۔“ (ص ۳۰۵)

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا صاحب یسود میں سے کسی جماعت چھوٹی یا بڑی کے مسلمان ہونے کے قائل نہیں ہیں۔ اگر یہی مطلب ہے تو یہ واقعات کے خلاف ہے، کیوں کہ حضرت عبداللہ بن سلام جو علمائے یسود میں سے ایک خاندانی عالم تھے۔ یہ خود اور ان کے ساتھ ایک جماعت یسود ایمان لے آئی تھی۔ قرآن شریف میں اسی جماعت کی مدح کے اشارات بکثرت ہیں اور تمام مفسرین بالاتفاق ان آیات کے ذیل میں حضرت عبداللہ بن سلام اور ان کے ساتھیوں کی تصریح کرتے ہیں اور اگر مولانا صاحب کی یہ مراد ہے کہ بمقابلہ عیسائیوں کے یسود میں سے کم لوگ ایمان لے آئے تو اس سے بھی ہمارا اصل مقصود حاصل ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی قوم میں سے جو لوگ ایمان لے آئے تھے۔ خواہ تھوڑے تھے، خواہ بہت تھے۔ قرآن شریف نے خاص انہی کی تعریف کی ہے نہ ان کی جو حضور پاک ﷺ پر ایمان نہ لائے ہوئے توریت کی اصل تعلیم پر عمل پیرا رہے اور اپنے مذہب پر قائم رہے۔ جیسا کہ مولانا کا خیال ہے۔ (فافہم لعلک ترشد)

مولانا کی تصریح نمبر ۵:- ”اس میں نہ تو کسی خاص نسل و قوم کی خصوصیت رکھی گئی ہے۔ نہ کسی خاص مذہب اور اس کے پیروں کی، دنیا کے تمام نبی، تمام صدیق، تمام شدائے حق، تمام صالح انسان، خواہ کسی قوم و ملک میں ہوئے ہوں۔ قرآن مجید کے

نزدیک ”انعام یافتہ“ انسان ہیں اور انہی کی راہ صراط مستقیم ہے۔“ (ص ۱۶۵)

ہماری گزارش :- جناب والا! آپ ایک خاص خیال کے پیچھے لگ کر ایک ضروری شرط کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ وہ یہ کہ کسی صاحب شریعت رسول کے بعد دوسرے صاحب شریعت کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے حسب مصلحت پہلی شریعت کا جو مسئلہ منسوخ کر دیا یا اس پر کچھ اضافہ کیا تو پہلی شریعت کے موجودہ لوگوں پر واجب ہے کہ پچھلی شریعت کے ایسے مسائل کو تعلیم کریں اور ان پر حسب تعلیم نبی برحق عمل کریں۔ ورنہ یہ نسخ و اضافہ معاذ اللہ بے معنی و بے سود ہوگا۔ جیسا کہ ہم سابقاً ذکر کر چکے ہیں۔

اس شرط کو ملحوظ رکھ کر صورت مسئلہ یوں ہوئی کہ قرآن حکیم ان سب گزشتہ صالحین کو صراط مستقیم پر جانتا ہے۔ جو ہر نبی کے عہد میں اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ شریعت پر عمل پیرا رہے۔ مثلاً ”قرآن مجید صاف الفاظ میں کہتا ہے کہ یہودیوں کی سرکشی کی وجہ سے بعض حلال اشیاء ان پر حرام کر دی گئیں۔ اس وقت ان کو ترک کر دینا ہی شریعت کی تابعداری تھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے علم و ارادہ میں یہ حرمت حضرت عیسیٰؑ کی آمد تک تھی۔ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰؑ کی معرفت ان چیزوں کو حلال کر دیا تو اب ان کو حلال جاننا شریعت کی تابعداری تھی اور ان کی حرمت پر اڑے رہنا اللہ تعالیٰ کی شریعت سے انکار تھا۔ چنانچہ حضرت عیسیٰؑ کی زبانی ذکر کیا۔ ولا حل لکم بعض الذی حرم علیکم فاتقوا اللہ واطیعوا (آل عمران، پ ۳) یعنی میں اس لیے بھی رسول ہو کر آیا ہوں کہ بعض چیزیں جو تم پر حرام کی گئی تھیں۔ تمہارے لیے حلال کر دوں۔ پس تم (ان میں) اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔“

اس سے صاف ظاہر ہے کہ جن لوگوں نے حضرت عیسیٰؑ کی اس آواز کو سن کر قبول کر لیا۔ وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک متقی و فرماں بردار ہیں اور جنہوں نے قبول نہ کیا، وہ غیر متقی و نافرمان ہیں۔ اسی طرح قرآن مجید کے نازل ہو جانے پر توریت و انجیل کے منسوخ مسائل پر اڑے رہنا اور نبی پاک ﷺ کی شریعت کے اضافات کو قبول نہ کرنا تقویٰ و فرماں برداری کے خلاف ہے۔ پس ایسے لوگ عند اللہ صالحین نہیں ہو سکتے۔ خواہ وہ توریت و انجیل پر عمل پیرا رہیں۔ ہم مولانا صاحب کی خدمت میں بادب التماس کرتے ہیں کہ یہودی یا عیسائی یا برہمویا آریہ یا گاندھی جی اور ان کے رفقاء اگر قرآن مجید سے

الگ رہ کر صالح بننا چاہیں تو آیا ان کی ایسی صالحیت عند اللہ قبول ہو جائے گی اور وہ اللہ تعالیٰ کے وعدے کے مطابق نجات کے حقدار کہلا سکیں گے؟۔ اگر وہ قرآن مجید پر عمل کئے بغیر نجات پاسکتے ہیں تو (معاذ اللہ) قرآن مجید کے لیے دعوت کا دروازہ بند ہے اور اگر نہیں پاسکتے۔ جیسا کہ امر واقعی ہے تو آج نجات کی تطویل لاطائل ہے۔ (فانہم)

افسوس! مولانا صاحب نے نہایت محنت و کاوش سے قرآن مجید کو ہندی زبان میں ترجمہ کر کے بزم خود ایسا آسان کر دیا تھا کہ گویا ہندی کی بھی چندی نکال دی تھی لیکن حاصل کیا ہوا؟۔ یہ کہ جملہ مذاہب کو کھلی اجازت دے دی گئی کہ تم اپنے اپنے نبی کے وقت کی غیر موجود و غیر محفوظ اصل شریعت معلوم کر کے اس پر عمل پیرا ہو جاؤ۔ خواہ وہ غیر مکمل تھی، خواہ اس کے بعض مسائل اب منسوخ کر دیئے گئے ہوں۔ بس تمہاری نجات ہو جائے گی۔ چنانچہ اس کی حقیقت مولانا کی تصریح نمبر ۶ سے معلوم ہوگی۔ بھلا اس اجازت کے بعد قرآن مجید کے قبول کرنے کی کیا ضرورت رہی؟۔ اللہم انانعوذ بک من وساوس الصدر۔ چاہیے تو یہ تھا کہ اس ترجمہ سے دل میں یہ نقش ہو جاتا کہ بغیر محمد ﷺ کی پیروی کے صراط مستقیم کا ملنا محال ہے لیکن اثر الٹا پڑا کہ نبی اکرم ﷺ سے خصوصی طور پر دل لگانے کی ضرورت ہی نہ سمجھی گئی۔ اللہ صد بار رحمیں نازل کرے شیخ سعدیؒ پر جو یہ فرما گئے۔

حال است سعدی کہ راہ صفا
توان رفت جز در پے مصطفیٰ

مولانا کی تصریح نمبر ۶:- ”بہر حال قرآن پاک کا پیرو وہ ہے جو دین کی سیدھی راہ پر چلنے والا ہے۔ وہ راہ نہیں جو کسی خاص گروہ، کسی خاص نسل، کسی خاص قوم کسی خاص عہد کی راہ ہے۔“ (ص ۱۶۸)

ہماری گزارش:- مولانا صاحب کی عبارت کا حاصل مطلب ہماری موٹی سمجھ میں تو یہ آتا ہے کہ اگر مسلمان یہ کہیں کہ اب اس عہد محمدیؐ میں سعادت و نجات صرف قرآن کریم اور پیغمبر قرآن ﷺ کی اتباع میں ہے تو معاذ اللہ! وہ قرآن پاک کے پیرو نہ رہیں گے اور ان پر تحزب و تشیع کا فتویٰ جڑ دیا جائے گا اور ان کو دین قیم سے منحرف سمجھا

جائے گا۔ عجب تماشا ہے کہ جو شخص یہ کہے کہ نجات صرف قرآن و غیر قرآن ﷺ کی اتباع میں ہے۔ وہ تو قرآن کریم کا پیرو نہ سمجھا جائے اور جو یہ کہے کہ اس وقت (عہد محمدیؐ میں) دید (بالفرض) اور توریت اور انجیل اور زیور یہ کتابیں (کو اصالتہً "غیر مکمل تھیں اور اب اصالتہً "موجود بھی نہیں) اور قرآن شریف (ہرچند کہ محفوظ ہے اور مکمل بھی ہے اور سب کتب سابقہ کا نسخ بھی ہے۔) امر اتباع میں سب برابر ہیں تو وہ قرآن پاک کا پیرو سمجھا جائے۔ واللہ ہم اس کے سمجھنے سے قاصر ہیں۔ یہ سمجھ مولانا صاحب عی کو مبارک ہو۔ ربنا لاترغ قلوبنا بعد اذ ہدیتنا

خاتمہ الباب:- مولانا آزاد صاحب کی ایسی بہت سی تصریحات ہیں۔ جو "ترجمان القرآن" کے مطالعہ کرنے والوں کو قرآن پاک سے آزاد کر دینے والی ہیں۔ لیکن ہم انہی پر اکتفا کرتے ہیں۔ اگر بعض لوگوں کے ہمک جانے کا اندیشہ نہ ہو تا تو اللہ ہم ان کے متعلق ہرگز قلم نہ اٹھاتے۔ عفا اللہ عنہ و ہدانا و ایاہ الی صراطہ المستقیم

۲۔ صدیقیت

نبوت کے بعد مرتبہ صدیقیت ہے۔ صدیق کو مقامات و احوال میں نبی سے کمال قضاہت ہوتی ہے اور وہ اسی کے رنگ میں رنگا ہوتا ہے اور باطنی نسبت میں نبی کے اتنا قریب ہوتا ہے۔ جیسے کسی کامل استاد سے اس کا نہایت ذہین و صاحب استعداد شاگرد یا آگ سے دیا سلائی، جو تھوڑی سی رگڑ سے جل اٹھتی ہے اسی مناسبت روحانی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے ہاں صدیق اس کی عنایات خاصہ کا مورد ہوتا ہے۔ ایسے ہی لوگوں کی نسبت فرمایا:-

☆ وبشر الذین امنوا ان لہم قدم صدق عند ربہم (یونس، پ ۱۱)
 "اور خوش خبری سنا ان کو جو ایمان لے آئے ہیں کہ ان کے لیے ان کے رب کے پاس مقام صدق ہے۔"

☆ ان المنقین فی جنت و نہر ○ فی مقعد صدق عند ملیک مقتدر ○
 (القر، پ ۲۷)

”بے شک جنہوں نے پرہیز گاری کی۔ وہ باغات اور نہروں میں ہوں گے۔ صاحب اقتدار بادشاہ کے نزدیک، صدق کی نشست گاہ میں۔“

☆ وَالَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ لَوْ لَكَ هُمُ الصَّادِقُونَ وَالشَّهَدَاءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ لَهُمْ أَجْرُهُمْ وَنُورُهُمْ (الحمد، پ ۲۷)

”اور وہ جو ایمان لائے اللہ پر اور اس کے رسولوں پر، وہی ہیں صدیق اور شہید نزدیک اپنے رب کے واسطے ان کے ہے اجر ان کا اور نور۔“

توضیح:- صدیق اپنے مقام و حال میں از سر تاپا با صدق و صفا ہوتا ہے اور اسی صفائی کی وجہ سے اس کا آئینہ قلب ایسا چلی ہوتا ہے کہ نبی کے سینے کے انوار کی شعاعوں کو بلا واسطہ حاصل کرتا ہے اور قبولیت حق میں اس کے سامنے کوئی حجاب حائل نہیں ہوتا اور چونکہ اس کا مقام نبی کے مقام سے متصل ہوتا ہے اور اس میں اور نبی میں کوئی دیگر واسطہ نہیں ہوتا۔ اس لیے جس طرح نبی اللہ تعالیٰ کے احکام کے سامنے اخلاص عمل میں اول المسلمین ہوتا ہے۔ اسی طرح مقام تصدیق رسول میں اول المصدقین ہو کر دوسرے صالحین کا پیشرو اور ان کے لیے مقام شہود و صالحیت پر پہنچنے کا وسیلہ و ذریعہ بنتا ہے۔ گویا کہ وہ اول خود مقام صدق پر قائم ہوتا ہے اور پھر دوسروں کے لیے نمونہ عمل بنتا ہے اور وہ اس کے ذریعے سے تصدیق حق کرتے ہیں۔ چنانچہ حضرت محمد ﷺ کو ارشاد ہوتا ہے:-

قُلْ لَنْ صَلَوَتِي وَنَسْكِی وَمَحْيَایَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ○ لَا شَرِیکَ لَهُ وَبِذَلِكَ أَمَرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ ○ (انعام، پ ۸)

”(اے پیغمبر!) تو کہہ بے شک میری نماز اور میرا جینا اور میرا مرنا (سب کچھ) اللہ رب العالمین کے لیے ہے۔ جس کا شریک کوئی بھی نہیں اور مجھے اسی بات کا حکم ہوا ہے اور میں اس کا سب سے پہلا فرماں بردار ہوں۔“

اور دوسری جگہ حضرت صدیقؓ کو ساتھ ملا کر فرمایا:- وَالَّذِي جَاءَ بِالصَّدَقِ وَصَدَّقَ بِهِ لَوْ لَكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ ○ (زمر، پ ۲۳) ”اور وہ جو سچ لے کر آیا (یعنی پیغمبر) اور وہ جس نے اس کی تصدیق کی۔ یہ سب متقی ہیں۔“

حضرت ابو بکر صدیقؓ کا مرتبہ:- یہی وجہ تھی کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ جو انبیاء علیہم السلام محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

السلام کے بعد سب سے افضل ہیں اور مقام صدیقیت میں سب سے اوپر ہیں۔ ان کے لیے آنحضور ﷺ پر ایمان لانے میں سوائے ان کی کمال باطنی صفائی اور کمال نور معرفت کے کوئی دیگر وسیلہ و ذریعہ نہیں ہوا۔ نہ کوئی آدمی، نہ کوئی معجزہ بلکہ جب حضور پاک ﷺ نے ان پر اسلام پیش کیا تو انہوں نے بلا تامل و تردد آپ کی تصدیق کی اور ایمان لے آئے۔ نہ تو کوئی حیل و حجت پیش کی اور نہ اس امر کو کس مزید پڑتال یا سوال پر موقوف رکھا اور اس بات کو خود آنحضور ﷺ نے بھی صحابہ کرامؓ کے سامنے بیان فرما دیا تھا۔ چنانچہ صحیح بخاری میں حضرت عمرؓ کے قصے میں حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا۔ **لن الله بعثني اليكم فقلتم كنبت وقال ابو بكر صدقت (الحديث) یعنی اللہ تعالیٰ نے مجھے تم سب کی طرف مبعوث کیا۔ تو تم نے کہا تو جھوٹ کتا ہے لیکن ابو بکرؓ نے میری تصدیق کی اور اپنی جان اور مال سے میری ہمدردی کی۔**

یہ مضمون مختلف الفاظ سے مختلف صحابہ کرامؓ سے مروی ہے۔ مثلاً امام خطیب نے ابو سعید خدریؓ سے اور دہلیؒ نے ابن مسعودؓ سے اور ابو نعیمؓ نے ابن عباسؓ سے اور طبرانی نے ابن عمرؓ سے روایت کی۔ یہ سب روایتیں کنز العمال میں جمع کر دی گئی ہیں۔ دہلی کے الفاظ یہ ہیں:۔ **ما عرضت الاسلام على احد الا كانت له نظرة غير ابى بكر فانه لم يتعلم (تفسیر کبیر)**

”میں نے جس کسی پر اسلام پیش کیا تو اس نے تامل کیا سوائے ابو بکرؓ کے کہ اس نے بالکل تردد نہ کیا۔“

اور یہ بات قبولیت و شہرت میں ایسی مسلم ہو چکی ہے کہ اب مزید کسی ثبوت کی حاجت نہیں رہی۔ جب آپ خود اسلام قبول کر چکے تو چند روز ہی میں کئی دیگر اکابر صحابہ کرامؓ کے مشرف باسلام ہونے کا ذریعہ و وسیلہ ثابت ہوئے۔ چنانچہ خلیفہ ثالث حضرت عثمان بن عفانؓ، حضرت زبیر بن عوامؓ (حضرت ابو بکرؓ کا داماد اور حضور اکرم ﷺ کا چھوٹا بھائی)، حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ (فاتح ایران)، اور حضرت عثمان بن مظعونؓ آپ ہی کی تلقین و ہدایت پر مشرف باسلام ہوئے۔ (اصابہ) یہ سب سابقین اولین میں سے ہیں۔ خاتم النبیین ﷺ اور مسلمین کی نظر میں ان کی نہایت عزت تھی۔ ہوئے حضرت عثمان بن مظعونؓ کے سب عشرہ مبشرہ میں

ہے ہیں۔

دیگر یہ کہ صدیق کے جمیع معاملات اخرویہ و دنیویہ، قولیہ و فعلیہ بلکہ اس کی ہر حرکت و سکون اور ہر سعی و عمل اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کے دین کے قائم کرنے کے لیے باخلاص ہوتا ہے اور وہ اس امر میں ایسا مستقیم الحال ہوتا ہے کہ کوئی شے اس کی مزاحم و سد راہ نہیں ہو سکتی اور چونکہ وہ بلا فصل و بلا واسطہ نبی کا نائب ہوتا ہے۔ اس لیے اس کا منہائے نظر اور طریقہ عمل وہی ہوتا ہے جو نبی کا ہوتا ہے۔ چنانچہ رحمتہ للعالمین ﷺ کی وفات شریف کے بعد جب جزیرہ عرب کے اکثر لوگوں نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ہاتھ پر زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ تو اس سے اسلام کے ضعیف ہو جانے کا خطرہ ظاہر تھا۔ کیوں کہ مصارف زکوٰۃ میں سے جماد فی سبیل اللہ بھی ہے۔ جس سے مقصود اللہ تعالیٰ کے دین کی اقامت ہے۔ اس میں روپے کی جس قدر ضرورت ہے، وہ پوشیدہ نہیں اور جب زکوٰۃ وصول نہ ہوئی تو بیت المال کا مالی ضعف ظاہر ہے۔ دیگر یہ کہ اسی فنڈ زکوٰۃ میں سے قوم کے مساکین و فقراء کی حاجت روائی اور مقروضوں کے قرض کی ادائیگی اور غلاموں کی آزادی میں خرچ کیا جاتا ہے کہ مساکین و فقراء کی حالت بہتر ہو جائے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ محتاجی کے باعث غیروں کے دست نگر ہو کر اسلام سے برگشتہ ہو جائیں اور جس قوم کے افراد قرض اور غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوں۔ وہ قوم غیر کی دست برد سے کس طرح آزاد رہ سکتی ہے اور کیسے ترقی کر سکتی ہے اور اپنی ہمسایہ قوموں میں کس طرح سربر آوردہ ہو سکتی ہے تو یہ سب محل بنس قرآنی مصارف زکوٰۃ میں داخل ہیں۔ پس اگر بیت المال خالی ہے یا اس کی حالت ضعیف ہے۔ یہ سب قومی ضرورتیں ویسی کی ویسی پڑی رہیں گی اور مسلمانوں میں ضعف آ جانے کی وجہ سے اسلام میں ضعف آ جائے گا۔ جیسا کہ آج کل انہی وجوہ سے ہو رہا ہے۔ (حفظنا اللہ منہا)

دیگر یہ کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی نظر میں ایک طرف تو اسامہ بن زیدؓ کے لشکر کے بھیجنے کی فکر تھی۔ جس کی تاکید آنحضرت ﷺ فرما گئے تھے اور دوسری طرف جھولے مدعیان نبوت میلہ اور علیہ کے مقابلہ کی فکر بھی دامن گیر تھی۔ جو بڑی بھاری جمیعت نے لے کر اسلام کے استحصال پر تلے بیٹھے تھے اور مانعین زکوٰۃ میں سے بھی کئی قباکُل ان

سے جا ملے تھے۔ تو آپ خیال کر سکتے ہیں کہ ایسے حالات میں جن لوگوں نے حضرت ابو بکر صدیقؓ کے ہاتھ پر روپیہ رکھنے میں دریغ کیا۔ وہ آپ کے سامنے اپنی جانیں کس طرح رکھ سکتے تھے۔

اب مشکل یہ تھی کہ نہ تو حضرت ابو بکر صدیقؓ قوم کو اس حالت ارتداد پر چھوڑ سکتے تھے اور نہ بغیر خزانے اور جمعیت کے میلہ کذاب وغیرہ کا مقابلہ ہو سکتا تھا اور ایسے حالات میں اسامہ بن زیدؓ کے لشکر کی تیاری جو غیر علاقے میں جا کر لڑنے والا تھا، آسان نہ تھی۔ غرض مشکل پر مشکل تھی۔ چنانچہ حضرت ابو بکر صدیقؓ کی بیٹی حضرت عائشہ صدیقہؓ ان مشکلات کو زیر نظر رکھ کر کہتی ہیں:-

قالت توفی رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم فنزل بابي ما لو نزل بالجبيل الراسيات لها ضها اشراب النفاق بالمدينة ولرندت العرب فوالله ما اختلفوا في واحدة الا طاربي بحظها وغنائها عن الاسلام (بلاذري، ص ۱۰۲)

”(جب) آنحضرت ﷺ کی وفات شریف ہوئی تو میرے باپ پر (بوجہ خلیفہ ہونے کے) ایسے امور آپڑے کہ اگر وہ محکم پہاڑوں پر بھی واقع ہوتے تو وہ ان کو بھی شکستہ کر دیتے۔ مدینہ شریف میں تو نفاق نے سر اٹھایا اور (اکثر) عرب مرتد ہو گئے۔ اللہ کی قسم! لوگوں نے جس امر میں اختلاف کیا تو میرے باپ نے اسلام کی مدافعت میں کافی سے زیادہ حصہ لیا۔“

غرض ایسے پریشان کن حالات میں حضرت ابو بکر صدیقؓ نے ہر امر میں کمال حوصلے، شجاعت اور احسن تدبیر سے ہاتھ ڈالا اور سب میں اللہ کی مدد آپ کے شامل حال رہا۔ سینے کو ٹھنڈا کر دینے والا نکتہ:- حضرت ابو بکر صدیقؓ کا مقام و رتبہ اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ہم سوچیں کہ یہ واقعات حضرت محمد ﷺ کی حیات طیبہ میں پیش آتے تو آپ ان میں کون سا پہلو اختیار کرتے۔ جو کچھ آپ حضور پاک ﷺ کی شان کے لائق خیال کریں۔ اگر وہ کچھ صدیق اکبرؓ کو بھی دیں اور پھر ان میں کامیابی حاصل کریں تو اس کے بعد آپ کو حضرت صدیق اکبرؓ کی خلافت اور صدیقیت کے ماننے میں کوئی بھی تردد نہیں چاہیے۔ لیکن نمبر وار ملاحظہ کرتے جائیے:-

۱۔ یہ تو سب کو معلوم ہو گیا کہ حضرت اسامہ کے لشکر کا جھنڈا حضور پاک ﷺ نے خود

باندھا تھا اور تیار کرایا تھا اور ان کو روانہ بھی کر دیا تھا۔ لیکن ان کی روانگی کے تھوڑی دیر بعد نبی پاک ﷺ کی وفات شریف کا حادثہ ہو گیا اور وہ لشکرِ مدینہ شریف میں لوٹ آیا۔
 ۲۔ یہ کہ اسود عنسی، میلہ اور علیہ متنبیان نے رسول پاک ﷺ کی حیات طیبہ ہی میں نبوت کا جھوٹا دعویٰ کر دیا تھا۔ ان سب کے مقابلہ و جہاد کے متعلق تاریخ ابن خلدون میں لکھا ہے:-

فبعث الی المسلمین من العرب فی کل ناحیة من نواحی هؤلاء الکذلبین
 یامرهم بجہادهم (جلد ۲، ص ۶۱)
 ”ان کذابوں کے نواح میں جس طرف میں بھی مسلمانوں کی کوئی جماعت تھی۔
 نبی پاک ﷺ نے اسے ان کذابوں کے جہاد کا حکم بھیجا۔“ اور بالخصوص علیہ کے قتال کے لیے ضرار بن اذر کو ایک دستہ فوج دے کر بھیج بھی دیا۔ (ص ۷۰)
 اس سے معلوم ہو گیا کہ نبی اکرم ﷺ کے نزدیک ان کذابوں کا مقابلہ و مقاتلہ ضروری تھا۔

۳۔ باقی رہا مرتدین کا معاملہ سو اگر یہ صورت حضور اکرم ﷺ کے سامنے پیش آتی تو آپؐ ان کے درست کرنے میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑتے۔ کیوں کہ برسوں کی محنت سے حاصل کی ہوئی چیزوں کو کوئی عقل و ہمت والا شخص ضائع نہیں ہونے دیتا۔
 بس اب یہ سب باتیں حضرت ابوبکر صدیقؓ میں ملاحظہ فرمائیں:-
 (۱) آپؐ نے آنحضرت ﷺ کی تجبیز و تکفین وغیرہ امور سے فارغ ہو کر سب سے پہلے حضرت اسامہ بن زیدؓ کے لشکر کو روانہ کیا۔ چنانچہ علامہ ابن خلدونؒ فرماتے ہیں۔ وکان من اول ما اعتمدہ انفاذ بعث اسامہؓ (ص ۶۵) یعنی سب سے پہلے حضرت اسامہؓ کے لشکر کو روانہ کیا اور حضرت عمر فاروقؓ کو امور پیش آئندہ میں مشورہ کے لیے حضرت اسامہؓ سے مانگ کر اپنے ساتھ رکھ لیا۔

(۲) اس لشکر کے کامیاب ہو کر آنے پر مرتدین اور مانعین زکوٰۃ سے جنگ کر کے ان کو زیر کیا اور اسلامی جمعیت کی کثرت کو ٹوٹنے نہیں دیا۔ چونکہ یہ فتنہ ارتداد عام تھا اس لیے کسی مقام پر تو حضرت ابوبکر صدیقؓ خود شریک جنگ ہوتے اور کسی جگہ کسی دیگر صحابی کو امیر لشکر کر کے بھیجا۔ (ابن خلدونؒ، بقیہ جز ثانی، ص ۶۹)

(۳) پھر اسی عرصے میں میلہ وغیرہ جھوٹے مدعیان نبوت کا قلع قمع کر کے اسلام کو اسی سٹیج پر لاکھڑا کیا۔ جس پر کہ آنحضور ﷺ کے عہد میں تھا۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ جو افاضل صحابہ میں سے ہیں۔ فرماتے ہیں:-
لقد قمنا بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مقاما کدنا نہلک فیہ لولان اللہ من علینا بابی بکر (تاریخ کمال، جلد دوم، ص ۱۳۰)
”ہم رسول اللہ ﷺ کے بعد ایسی سٹیج پر ہو گئے تھے کہ اگر اللہ تعالیٰ ہم پر ابوبکر صدیقؓ (کے خلیفہ کرنے) سے احسان نہ کرتا تو قریب تھا کہ ہم (سب مسلمان) ہلاک ہو جائیں۔“

اسی امر کو حضرت ابو ہریرہؓ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:- والذی لالہ الاہو لولان ابابکر استخلف ما عبد اللہ (تاریخ الخلفاء للیوطی، ص ۵۰)
”اللہ کی قسم! جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے کہ اگر رسول اللہ ﷺ کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ خلیفہ نہ بنتے تو اللہ تعالیٰ کی عبادت نہ ہوتی۔“

علامہ ابن خلدونؒ نظر پر روایات اس قدر عظیمہ پر مسلمانوں کی حالت یوں رقم کرتے ہیں:- وقد ارتدت العرب لما القبیلة مستوعبة ولما بعض منها و نجم النفاق والمسلمون كالغنم فی اللیلة الممطرة لقلنتهم وكثرة عدوهم واطلام الجویفقد نبیہم (ص ۶۵)

”اور (اکثر) عرب مرتد ہو گئے۔ کوئی تو سارے کا سارا قبیلہ اور کسی میں سے بعض لوگ اور مسلمان اپنی قلت اور اپنے دشمنوں کی کثرت اور نبی ﷺ کی وفات سے فضا کے تاریک ہو جانے کی وجہ سے اس ریوڑ کی طرح تھے جو بارش والی رات میں (ایک کونے میں دبک کر بیٹھا) ہو۔“

غرض ایسے تزلزل کے وقت حضرت ابوبکر صدیقؓ کی استقامت اور بحیثیت خلیفہ آپ کی یہ خدمات وہی ہیں جو آنحضرت ﷺ خود کرتے اور یہ آپ کی خلافت بلا فصل اور مقام صدیقیت کی کافی دلیل ہے۔ (واللہ المادی)

خلافت

ہم اوپر بیان کر آئے ہیں کہ مرتبہ صدیقیت مقام نبوت سے بالکل متصل ہے

اور یہ بھی کہ صدیق کو مقامات و احوال میں نبی ﷺ سے کمال مشابہت ہے۔ اس سے صاف معلوم ہو سکتا ہے کہ نبی ﷺ کے بعد آپ کے فوری خلیفہ بلا فصل صرف حضرت صدیق اکبرؓ چاہیے تھے۔ نہ کہ کوئی اور، اسی وجہ سے آنحضور ﷺ نے حضرت صدیق اکبرؓ کے حلق فرمادیا تھا۔

لا ینبغی لقوم فیہم ابوبکر ان یؤمہم غیرہ رواہ الترمذی (مشکوٰۃ، ص ۲۵۲)
 ”جس قوم میں ابوبکرؓ موجود ہو۔ مناسب نہیں کہ اس کے سوا کوئی دوسرا ان کا امام بنے۔“

اپنے اس فرمان کے مطابق آپؐ نے عمل کر کے بھی دکھا دیا کہ اپنی وفات کی بیماری میں بنگار حضرت ابوبکر صدیقؓ کی امامت کے لیے حکم صادر فرمایا۔ چنانچہ صحیح بخاری میں حضرت عائشہ صدیقہؓ سے مروی ہے:-

قلت لما مرض رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم مرضه الذي مات فيه فحضرت الصلوة فاذن فقال مروا ابابكر فليصل بالناس فقليل له ان ابابكر رجل اسيف لذا تام مقامك لم يستطع ان يصل بالناس واعاد فاعادوا له فاعاد لثالثة فقال اتكن صواحب يوسف مروا ابابكر فليصل بالناس'
 الحديث (تجريد الصحيح، ص ۵۶)

”کہ جب رسول اللہ ﷺ اس بیماری میں زیادہ بیمار ہو گئے۔ جس میں آپؐ فوت ہوئے تو نماز کا وقت آیا تو اذان ہوئی۔ آپؐ نے فرمایا: ابوبکرؓ کو کہو کہ لوگوں کو نماز پڑھائے۔ عرض کیا گیا کہ ابوبکرؓ غم کھانے والے آدمی ہیں۔ جب وہ آپؐ کی جگہ پر کھڑے ہوں گے تو نماز نہیں پڑھا سکیں گے۔ آپؐ نے اس پر بھی دوبارہ یہی حکم دیا۔ پھر یہی عذر عرض کیا گیا۔ پھر تیسری بار بھی آپؐ نے یہی فرمایا اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ اے میری بیویو! (تم عورت ذات ہونے میں) ان عورتوں کی جنس سے ہو جو یوسفؑ کو پھلانے والی تھیں۔ (یعنی اسی طرح تم بھی مجھ کو حکم خدا سے پھلاتی ہو) ابوبکرؓ کو کہو کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائے۔“

اپنی اس بیماری میں حضور پاک ﷺ نے حضرت عائشہ صدیقہؓ سے فرمایا تھا کہ اپنے باپ اور بھائی کو بلاؤ کہ میں ایک نوشت لکھوا جاؤں۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی تنازع کرے

کہ میں زیادہ حق دار ہوں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کو جتلا دیا کہ واقعہ یونہی ہو گا کہ امت مسلمہ سوائے ابوبکرؓ کے کسی دیگر کو قبول نہیں کرے گی۔ پس آپؐ نے نوشت کی ضرورت نہ سمجھی اور صرف اتنا کہنے پر کفایت کی۔ ویابی اللہ والمؤمنون الا ابابکر (صحیح مسلم، ج ۲، ص ۲۷۳) یعنی اللہ تعالیٰ نے عالم تقدیر میں مقرر کر رکھا ہے کہ وہ ابوبکر کی موجودگی میں سوائے ابوبکرؓ کے کسی دیگر کو خلیفہ نہیں بنے دے گا۔ اور قوم مومنین بھی سوائے اس کے کسی دیگر کو منظور نہیں کرے گی۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ نبی پاک ﷺ کی وفات پر جب مہاجرین و انصار ہر دو جماعت کے لوگ سقیفہ بنی ساعدہ میں انتخاب خلیفہ کے لیے جمع ہوئے تو سب حاضرین نے حضرت صدیق اکبرؓ ہی کو منظور کیا اور اس کے بعد دوسرے روز جب صدیق اکبرؓ نے مجمع عام میں خطبہ فرمایا تو تمام نے اسی انتخاب کو بحال رکھا اور اس کے بعد حضرت علی المرتضیٰؓ اور دیگر بنی ہاشم بھی شامل ہو گئے اور سوائے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے کسی اور پر بات نہ ٹھہر سکی۔ یہ سب کچھ اسی وعدے کے مطابق ہوا جو اللہ تعالیٰ نے آیت استخفاف میں فرمایا تھا۔

وعداللہ الذین امنوا منکم و عملوا الصلحت لیستخلفنہم فی الارض کما استخلف الذین من قبلہم ولیمکنن لہم دینہم الذی ارتضی لہم ولیبذلہم من بعد خوفہم امنایعبودونی لا یشرکون بی شیئاً (نور، پ ۱۸)

”اللہ تعالیٰ نے تم میں سے تمہارے ايمان داروں اور اعمال صالحہ والوں سے وعدہ کر رکھا ہے کہ ان کو زمین میں خلیفہ بنائے گا۔ جیسا کہ تم سے پہلے لوگوں (داؤد و سلیمانؑ

۹۱ اس آیت میں خاکسار کے نزدیک ”منکم“ کے مخاطب ہر دو گروہ مدعیان ایمان مخلصین و منافقین ہیں، جن کا ذکر اس آیت کے پیشتر سے چلا آتا ہے کہ اس جماعت مخلصین کو بشارت ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ ان کو حکومت و اقتدار بخشے گا۔ اسی مخلص جماعت کو ہم جماعت صحابہ کہتے ہیں، جن کے افراد ”خلفائے راشدین“ ہیں۔ بعض افراد کو حکومت و اقتدار ملے تو ساری قوم کو حاکم کہنا قرآن میں مذکور ہے جیسے وجعلکم ملوکاً (مائدہ، پ ۶)

(کو خلیفہ بنایا تھا اور ان کے لیے ان کے اس دین کو جسے اس نے ان کے لیے پسند کر رکھا ہے۔ (اسلام کو) اقتدار بخشے گا اور ان کے (موجود الوقت) خوف کے بدلے ان کو امن دے گا۔ وہ میری ہی عبادت کریں گے۔ کسی کو بھی میرے ساتھ شریک نہیں گردانیں گے۔“

اس آیت میں خلافت راشدہ کے وقت میں اسلامی حکومت کے قائم ہو جانے، دین اسلام کے محکم (اور سیٹھ ریلجن یعنی شاہی مذہب) ہو جانے اور مسلمانوں کے خوف کے امن سے بدل جانے اور ان خلفائے راشدین کے توحید الہی پر قائم رہنے کی صاف صاف خبر ہے۔

اگر آپ اس کے ساتھ سورہ حج کی آیت کو بھی ملا لیں تو آپ کو بہت لطف آئے گا۔ اللہ تعالیٰ مہاجرین مکہ کی مظلومی پر ان کو بشارت سنا رہا ہے:-

الذین ان مکنہم فی الارض اقاموا الصلوۃ واتوا الزکوۃ و امروا بالمعروف ونہوا عن المنکر، واللہ عاقبہ الامور ○ (حج، پ ۱۷)

”وہ مہاجر لوگ کہ اگر ہم ان کو زمین میں مقدور دیں گے تو وہ نماز قائم کریں گے اور زکوٰۃ ادا کریں گے۔ اور (لوگوں کو) نیک کاموں کا حکم کریں گے اور ان کو برے کاموں سے منع کریں گے اور اللہ کے اختیار میں ہے انجام ہر کام کا۔“

اب آپ ان ہر دو آیات مذکورہ بالا کو زیر نظر رکھ کر ہماری توضیحات کو بغور ملاحظہ فرماتے جائیں:-

۱۔ وعدہ تمکین ہر دو آیات میں ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ پہلی آیت میں تمکین کو دین سے متعلق کیا ہے اور دوسری میں مہاجرین سے، اسی طرح پہلی آیت میں خلافت کو صحابہ کرامؓ کے متعلق کیا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ خلافت تمکین دین کے لیے ہے اور اس سے یہی مقصود ہے۔ پس جس دور خلافت میں تمکین دین کا مقصود ہو۔ اس کے منجانب اللہ اور حق ہونے میں کیا کلام؟۔

۲۔ دوسری آیت سے قبل مہاجرین کا صریحاً ذکر ہے۔ پس یہ وعدہ اولاً بالذات جماعت مہاجرین سے ہے اور ان سے بعد کے لوگوں سے بالتبع ہے۔ یعنی آیت اختلاف میں بھی الذین امنوا منکم و عملوا الصلحت سے یہی مہاجرین مراد ہیں۔

اور معلوم ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ بلکہ ہر چار خلفائے راشدین مہاجر تھے بلکہ حضرت عثمان غنیؓ جس طرح ذوالنورین تھے۔ اس طرح ذوہجرتین بھی تھے۔
۳۔ دوسری آیت یعنی سورہ حج کی آیت میں تمکین مہاجرین کے وقت ان کی خدمات یہ ذکر کی ہیں:-

(الف) نماز کا قائم کرنا، جو اللہ تعالیٰ کی جناب میں سب سے بڑی عبادت ہے۔
(ب) زکوٰۃ کا ادا کرنا، جس میں اپنے مسلمان بھائیوں پر شفقت کرنا اور ان کی دنگیری کر کے ان کو غیروں کی دستبرد سے بچانا اور اسلامی خزانے کو پر رکھ کر جہاد فی سبیل اللہ کی خدمت بجالانا ہے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، جن میں خلق اللہ کی حقیقی خیر خواہی اور ان کی اخلاقی و سیاسی اصلاح اور ان میں علم و تہذیب کی ترویج و اشاعت ہے اور حصول سلطنت میں حاکم کا سب سے بڑا فرض اور رعیت کا سب سے پہلا حق یہی ہے اور اسی سے نظام سلطنت کا قیام ہے۔ ورنہ تحصیل محاصل اور ٹیکس تو ہر جابر و قاہر کر سکتا ہے۔ اس میدان میں بچہ ستابھی دیگروں سے پیچھے نہیں رہ سکتا۔

سو پہلی آیت میں صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے اور اس کے ساتھ شریک نہ گرداننے کا صریحاً ذکر ہے لیکن بالاختصار ہے اور دوسری میں اسی کی تفصیل ہے۔ کیوں کہ جب کوئی والئی حکومت فرد یا قوم حقیقتاً اللہ تعالیٰ کی پرستار ہو جائے تو اس سے ظلم و تعدی بیکر چھوٹ جاتی ہے اور رعیت پروری و عدل گستری اور فرائض شناسی اس کا شیوہ ہو جاتا ہے۔ خلفائے راشدین کا آئین مملکداری و کشور کشائی ایسا ہی تھا۔ چنانچہ بے شمار واقعات اس کی شہادت میں پیش کیے جاسکتے ہیں۔ جن کی تسلیم میں کسی کو نزاع نہیں۔

یہ وعدہ ہے کہ مہاجرین کا خوف امن سے بدل جائے گا۔ ان سب امور کو ایک ایک کر کے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہد سعادت مند میں دیکھ لیجئے اور حق کی داد دیجئے۔
جیسا کہ سابقہ ”ذکور ہو چکا۔ ہذا واللہ ولی الہدایہ

۳۔ مرتبہ شہادت

شہادت ایسے علم کے اظہار کو کہتے ہیں۔ جو ظاہری بصارت یا باطنی بصیرت سے

یعنی آپؐ نے ہجرت حبشہ بھی کی تھی اور ہجرت مدینہ بھی (ابن حشام وغیرہ)

حاصل ہو۔ چنانچہ مفردات راغب میں ہے:-

والشهادة قول صادر عن علم حصل بمشاهدة بصيرة لوبصر (ص ۲۲۹)
”شہادت ایسا قول ہے جو ایسے علم سے صادر ہو۔ جو بصیرت یا بصارت کے
مشاہدے سے حاصل ہو۔“

پھر یہ کہ بصیرت دو طرح کی ہے۔ دماغ کی اور قلب کی۔ دماغ کی بصیرت علم
استدلال سے ہے اور قلب کی بصیرت ’نور ربانی‘ سے ہے۔ جو اللہ تعالیٰ مومن کے دل
میں ڈالتا ہے۔ یہ شہادت تین طرح پر ادا ہوتی ہے۔ شہادت بالعلم، شہادت بالعمل اور
شہادت بالقلب۔

علم کی شہادت علمائے راغبین کا کام ہے۔ چنانچہ فرمایا:- شهد الله انه لا اله الا
هو، والملائكة ولولو العلم قائما بالقسط (آل عمران، پ ۳)
”شہادت دی اللہ نے کہ اس کے سوا کوئی دوسرا لائق عبادت نہیں ہے اور
فرشتوں نے بھی اور صاحبان علم نے بھی انصاف پر قائم ہو کر۔“
امام راغبؒ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:-

و شهادة اولى العلم اطلاعهم على تلك الحكم و اقرارهم بذلك و هذه
الشهادة تختص باهل العلم فاما الجاهل فمبعدون منها (ص ۲۷۰)
”اہل علم کی شہادت ان کا ان حکمتوں پر اطلاع پانا ہے اور ان کا اقرار کرنا ہے
اور یہ شہادت اہل علم سے مخصوص ہے لیکن جمال تو وہ اس سے بہت دور ہیں۔“
اسی طرح حضور پاک ﷺ کی رسالت کی شہادت میں فرمایا:-

قل كفى بالله شهيدا بيني وبينكم ومن عنده علم الكتب (رعد، پ ۱۳)
”(اے پیغمبر!) تم کو کہ میرے اور تمہارے درمیان اللہ تعالیٰ اور وہ شخص جسے
کتاب (الہی) کا علم ہے، کافی گواہ ہیں۔“

اور شہادت بالعمل اعلیٰ درجے کے مستقیم الحال راست بازوں، چوٹی کے تقویٰ
شعار دین داروں اور نفس و اندائے دین سے مجاہدہ و جہاد کرنے والوں اور فی سبیل اللہ
قتل ہو جانے والوں کے متعلق ہے کیوں کہ وہ عملی استقامت و ثبات قدم اور جان نثاری
سے طریق حق کی شہادت دیتے ہیں۔ چنانچہ شہدائے احد کی نسبت فرمایا:- و ليعلم الله

الذین امنوا ویتخذ منکم شهداء ۝ واللہ لا یحب الظلمین ○ (آل عمران، پ ۳)
 ”اور (تم کو جنگ احد میں جو مصائب پیش آئیں سو) اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کو
 مومنوں کا دیکھنا منظور تھا اور تم میں سے بعض کو شہادت کے لیے جن لینا مقصود تھا۔ ورنہ
 اللہ تعالیٰ تو ان ظالموں کا روادار نہیں ہے۔“
 علامہ ابو السعودؒ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:-

او جمع شاهد ای ویتخذ منکم شہود امعدلین بما ظہر منہم من الثبات
 علی الحق و الصبر علی الشدائد و غیر ذلک من شواہد الصدف لیشہدوا
 علی الامم یوم القیمۃ (تفسیر کبیر، جلد سوم، بر حاشیہ ص ۳۷)
 ”(لفظ شہداء یا تو شہید کی جمع ہے۔) یا شاہد کی جمع ہے۔ یعنی مراد یہ ہے کہ تم
 میں سے ایسے عادل گواہ جن لے، جن سے حق پر ثابت رہنا اور مصائب پر صابر رہنا وغیرہ
 شواہد صدق ظاہر ہوں۔ تاکہ وہ قیامت کے روز دوسری امتوں پر شہادت دیں +“
 متحول فی سبیل اللہ کو شہید کہنے کے متعلق علماء نے کئی ایک وجوہ لکھی ہیں۔ جو
 قرآن و حدیث سے ماخوذ ہیں۔ ہم ان میں سے بلحاظ مناسبت موقع خصوصیت سے دو کو
 منتخب کرتے ہیں۔

۱۔ لسان العرب میں ہے:- لقیامہ بشہادۃ الحق فی امر اللہ حتی قتل ”شہید کو
 اس لیے بھی شہید کہتے ہیں کہ اس نے اللہ کے حکم میں قائم ہو کر حق کی ایسی شہادت دی
 کہ جان دے دی۔“

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

۲۔ فتح الباری میں ہے:- لانه یشہد عند خروج روحہ ما اعدلہ من الکرامۃ
 یعنی ”شہید کو اس لیے بھی شہید کہتے ہیں کہ وہ اپنی روح کے پرواز کرنے کے وقت وہ
 سب بخششیں دیکھ لیتا ہے جو اس کے لئے تیار رکھی گئی ہیں۔“

لسان العرب، جلد ۴، ص ۲۲۹ زیر لفظ شہد۔

۹۳

فتح الباری انصاری جزء یازدہم، ص ۶۳ زیر باب اشادۃ سب۔

۹۴

والذین امنوا باللّٰہ و رسلہ اولئک ہم الصدیقون و الشہداء عند ربہم لہم اجرہم و نورہم (حدید پ ۲۷)

”اور جو لوگ اللہ پر اور اس کے جملہ پیغمبروں پر (صدق دل سے) ایمان لے آئے۔ وہ اللہ کے نزدیک صدیق اور شہید ہیں۔ ان کے لیے ان کا اجر بھی (ثابت ہے) اور ان کا نور بھی۔“

ملکوت میں صحیح بخاری کی روایت ہے کہ حضور پاک ﷺ ایک دفعہ احد پہاڑ پر چڑھے اور آپ کے ساتھ خلفائے ثلاثہ یعنی حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت عثمان غنیؓ بھی تھے۔ (اتفاق سے) پہاڑ لرزنے لگا۔ نبی پاک ﷺ نے پہاڑ کو اپنے پاؤں سے مارا اور فرمایا۔ اثبت احد یعنی اے احد ٹھہرا رہ۔ تجھ پر تو ایک نبی اور ایک صدیق اور دو شہید ہیں۔ (پھر لرزنے کی کیا صورت؟)

رسول پاک ﷺ کی نبوت مسلم ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی صدیقیت معلوم ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ ابو نوالہ نصرانی یا مجوسی کے ہاتھ سے نماز پڑھتے پڑھتے زخمی ہو کر شہید ہوئے اور حضرت عثمان غنیؓ باغیوں کے ہاتھ سے شہید ہوئے۔ (رضی اللہ عنہم اجمعین)

ف۔ جو مومن باغیوں کے ہاتھ سے مقتول ہو۔ امام نوویؒ نے اسے بھی داخل شہداء کہا ہے اور یہ حدیث اس کی تائید کے لیے کافی ہے۔ اسی لیے حضرت حسینؑ کو بھی شہید کہا جاتا ہے کہ آپ باغیوں کے ہاتھ سے مقتول ہوئے اور آپ نے اقامت دین میں اپنی جان نثار کر کے اپنے طریق عمل سے حق کی شہادت دی۔ (رضی اللہ تعالیٰ عنہ ر عن والدیہ)

۹۵۔ کیوں کہ یہ ہستیاں کوہ وقار ہیں پس جنبش کیوں اور آپ کی ڈانٹ سے جو کوہ احد ٹھہر گیا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ فلسفیوں کے نزدیک بھی عالم محاصر انبیاء کے تابع ہوتا ہے جیسا کہ ہم اپنی مشہور و مقبول کتاب شہادۃ القرآن کے مقدمہ میں بدلائل بیان کر چکے ہیں۔

۹۶۔ زر قانی علی الموطا جلد دوم، ص ۳۱۳۔

۳۔ اور شہادت قلب و باطن کا بیان یوں ہے کہ ایمان کے مدارج تین ہیں۔ ایمان تقلیدی، جو عوام کا ہوتا ہے اور ایمان استدلالی، جو علمائے راغبین کو حاصل ہوتا ہے اور ایمان شہودی، جو انبیاء کرامؑ اور اکابر اولیاء کرامؑ کو عطا ہوتا ہے۔ کہ جو کچھ عالم جزایا امور غیبیہ یا امور دور از حواس کے متعلق شرع میں وارد ہے۔ اسے وہ اللہ تعالیٰ کے دکھانے سے عیاناً دیکھ لیتے ہیں اور ایسا درجہ ہے جس میں شک منطرق نہیں ہو سکتا۔ تقلید و استدلال میں شبہ کی گنجائش ممکن ہے اور زوال ایمان کا خطرہ لگا رہتا ہے لیکن شہود میں شبہ نہیں پڑ سکتا۔ اس کی مثال ٹھیک وہی سمجھو جو اہل منطق کہا کرتے ہیں۔ کہ مشاہدات و محسوسات اور وجدانیات کا علم ضروری ہوتا ہے۔ مثلاً ”صحیح بخاری شریف میں وارد ہے کہ حضور پاک ﷺ نماز کسوف میں چند قدم آگے کو بڑھ گئے اور پھر پیچھے ہٹ آئے۔ اس کی وجہ میں آپؐ نے فرمایا کہ پہلے جنت میرے سامنے کی گئی تو میں آگے بڑھا کہ تم کو جنت کے پھل تو ذکر دوں۔ اسی اثناء میں میرے سامنے دوزخ بھی کی گئی تو میں پیچھے کو ہٹ آیا۔ (تجرید، ص ۷۵)

اسی طرح رسول پاک ﷺ نے شب معراج میں جنت و دوزخ اور دیگر آیات عظام دیکھیں۔ چنانچہ قرآن شاہد ہے۔ لقد رای من آیت ربہ الکبریٰ (النجم، پ ۲۷) یعنی اس پیغمبر (محمد ﷺ) نے اپنے رب کی کئی ایک بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں۔ اور ایسے ہی امور عظام کی نسبت اللہ تعالیٰ منکرین نبوت محمدیہؐ کو فرماتا ہے۔ افتما رونه علی ما یری (النجم، پ ۲۷) یعنی تو کیا تم اس (نبی محمد ﷺ) سے ان باتوں کی نسبت جھگڑا کرتے ہو۔ جن کو وہ (عیاناً سامنے) دیکھ رہا ہے۔ یعنی نہ دیکھنے والے کا حق نہیں کہ دیکھنے والے سے جھگڑا کرے۔ پھر تم ایسا کیوں کرتے ہو؟

مولانا روم صاحبؒ نے ”مثنوی شریف“ میں ان ہر سہ مدارج ایمان کا ذکر بہت جگہ کیا ہے اور ہر جگہ اصل حقیقت کا ادراک ایمان شہودی کے متعلق کہا ہے۔ چنانچہ صفحہ ۳۳۹ پر یوں فرماتے ہیں۔

بلکہ تقلیدست آل ایمان او
روئے ایمان راندیدہ جان او

بس خطر باشد مقلد را عظیم
از رہ و رہزن ز شیطان رحیم
چوں بہ بیند نور حق ایمن شود
ز اضطرابات شک او ساکن شود
چوں کہ چشمش باز شد و آن نقش خواند
دیورا بروئے دگرد دستے نماند

اور صفحہ ۵۵ پر یوں فرماتے ہیں۔

صد ہزاراں زائل تقلید و نشان
اگندشاں نیم و نیمے در گماں
گر نطن تقلید و استدلال شاں
قائم است و جملہ پرو بال شاں
شبہ می انگیز و آں شیطان دواں
در فتنہ آں جملہ کوراں سرنگواں
پائے استدلالیاں چو ہیں بود
پائے چو ہیں سخت بے تمکیں بود
غیر آں قطب زمان دیدہ در
کز شبائش کوہ گرد خیرہ سر
پائے نابینا عصا باشد عصا
تانیفند سرنگوں او برحوا

اور صفحہ ۱۱۱ پر مقلد و محقق کا فرق نہایت لطیف طور پر سمجھاتے ہیں۔

از مقلد تا محقق فرقت است
کایں چو داؤد است و آں دیگر صداست

حضرت اسید بن حنیفہؓ کو نماز تہجد کے وقت جو نورانی قدیلین نظر آئیں اور

مشکوٰۃ، ص ۱۷۶ بروایت محمد بن۔

۹۷

حضرت خبیبؑ کو اپنی اسیری کے وقت جب کہ ان کی مشکلیں کسی ہوئی تھیں۔ جو نبی رزق پہنچتا تھا اور حضرت عمرؓ نے فارس کی ایک لڑائی میں ساریہ بن زینم کے لشکر کو جو مدینہ طیبہ سے بحالت خطبہ دیکھ لیا تھا۔ یہ سب اسی ایمان شہودی کے انوار و برکات تھے۔

۴۔ مرتبہ صالحیت

اس مرتبہ کے دو مقام ہیں۔ اول وہ مقام جو عام اولیاء اللہ اور متقین کا ہے۔ جس سے وہ فیوض ربانیہ کے لائق گروانے جاتے ہیں۔ کیوں کہ لغت میں صلاح درستی اور خیر دینی کو کہتے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔ والصلح خیر (النساء، پ ۵) یعنی صلح سراسر نیکی ہے اور یہ ضد ہے فساد کی اور سیئۃ کی۔ چنانچہ فرمایا۔ ولا تفلسوا فی الارض بعد اصلاحها (اعراف، پ ۸) نیز فرمایا۔ خلطوا عملا صالحا و اخر سیئا اور دو مخصوص کے درمیان جو صلح کرا دی جاتی ہے۔ اس کی یہی صورت ہوتی ہے کہ ان کے درمیانی بگاڑ کو درست کر دیا جاتا ہے اور یہ لفظ مجازاً اہلیت و قابلیت کے معنی میں بھی بولا جاتا ہے۔ چنانچہ علامہ زعزریؒ ”اساس البلاغہ“ میں فرماتے ہیں:-

ومن المجاز، هذا الادیم یصلح للنعل وفلان لا یصلح لصحبک (ج ۲، ص ۱۷)

”یہ چڑھ جوتی کے لائق ہے اور فلاں شخص تیری صحبت کے لائق نہیں ہے۔“
اسی طرح علامہ فیومیؒ ”المصباح المنیر“ میں لکھتے ہیں۔ وهو صالح

للولایۃ ای لہ اہلیۃ القیام بها (ص ۱۵۸) ”وہ شخص دلاہیت کے لائق ہے۔“
۲۔ یہ صالحیت کبھی تو پیدا نئی ہوتی ہے اور کبھی تربیت سے حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ امام راغبؒ ”مفردات القرآن“ میں فرماتے ہیں:-

واصلاح اللہ تعالیٰ الانسان یکون تارة بخلقہ ایاہ صالحا وتارة بازالۃ مافیہ

۹۸ صحیح بخاری مصری، جلد ۳، ص ۶۱

۹۹ مشکوٰۃ، ص ۵۳۳ بروایت بیہقی۔

من فساد بعد وجوده وتارة يكون بالحكم له بالصلاح (ص ۲۸۶)

”اللہ تعالیٰ کا کسی انسان کو صالح کرنا کبھی تو اس صورت میں ہوتا ہے کہ اسے صالح ہی پیدا کیا جاتا ہے اور کبھی اس طرح کہ اس کی ہستی کے بعد جو بگاڑ اس میں موجود ہو۔ اسے دور کر دیا جائے اور کبھی اس طرح کہ اس کو صالح (کے معزز لقب و خطاب سے) نامزد کیا جائے۔“

۳۔ پھر یہ صالحیت تین طرح کی ہے۔ صالحیت قلب، صالحیت زبان اور صالحیت جملہ دیگر اعضاء۔

قلب کی صالحیت کے متعلق جملہ اعتقادات حقہ ہیں۔ جن کی تعلیم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پاک ﷺ سے ثابت ہے اور دل و جان سے جملہ شعائر اللہ خانہ کعبہ اور اس کے متعلقات، مساجد، قرآن پاک اور کتب دینیہ، انبیاء اللہ، صحابہ کرام، اولیاء اللہ، مجتہدین عظام اور محدثین و فقہائے فہام کا ادب و احترام۔ اس کے خلاف ہر قسم کے شرکیہ، کفریہ اور الحادیہ اعتقادات و خیالات اور وساوس شیطانیہ ہیں۔

پس جن امور کا ماننا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پاک ﷺ سے واجب و ثابت ہے۔ ان کو دل میں جگہ دینا اور ان پر یقین کرنا اور جو ان کے خلاف ہیں یا ثابت نہیں، ان سے بیزار ہونا۔ یہ سب دل کے متعلق ہیں۔

زبان کے متعلق راست گفتاری اور جملہ اعتقادات حقہ کا اقرار ہے اور اس کے خلاف دروغ گوئی، بہتان طرازی، فحش کلامی اور کلمات شرکیہ و کفریہ و الحادیہ کا بولنا ہے۔

دیگر اعضاء کے متعلق سب اعمال صالحہ ہیں۔ جو قرآن و حدیث سے ثابت ہوں۔ فرائض، سنن اور مستحبات، مروت، احسان، معاملات کی صفائی، وغیرہ وغیرہ اور ان کے خلاف سب قسم کے محرمات و مکروہات ہیں اور سب سفلی کام جو مومن کو ترقی کمال سے روکیں یا اسے اس کے مقام کی بلندی سے گرا دیں۔ وہ سب اسی مد میں شامل ہیں اور جملہ مشبہات بھی بروئے حدیث اسی ضمن میں داخل ہیں۔

یہ سب تفصیل ایک ہی حدیث سے معلوم ہو سکتی ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری میں ہے کہ جناب رسالت مآب ﷺ نے فرمایا:-

الحلال بین و الحرام بین و بینہما مشتبہات لا یعلمہا کثیر من الناس فمن اتقى الشبهات استبرأ لعرضه و دینہ و من وقع فی الشبهات کراہ یرعى حول الحمى یوشک ان یواقعہ الاولن لکل ملک حمى الاولان حمى اللہ محارمہ الاولن فی الجسد مضغة اذا صلحت صلح الجسد کلہ و اذا فسدت فسد الجسد کلہ الا وہی القلب (کتاب الایمان، ج ۱، ص ۱۲)

”حلال بھی ظاہر و مقرر ہے اور حرام بھی واضح و مبین ہے اور ان دونوں کے درمیان بعض اشیاء مشتبہ ہیں۔ جن کو اکثر لوگ نہیں جانتے۔ پس جو شخص ان مشتبہ چیزوں سے بچتا رہا۔ اس نے عزت کو اور اپنے دین کو بچالیا اور پاک کر لیا۔ اور جو شخص (بے احتیاطی کر کے) ان مشتبہ امور میں پڑ گیا تو وہ مثل اس چرواہے کی ہے جو کسی رکھنے کے گرد ریوڑ چرائے تو قریب ہے کہ وہ اپنے ریوڑ کو اس رکھ میں بھی واقع کر دے۔ (لوگو!) خبردار رہو۔ ہر بادشاہ کی رکھ ہوتی ہے اور یہ بھی یاد رکھو کہ اللہ کی رکھ اس کی محرمات ہیں۔ خبردار رہو کہ جسم انسانی میں ایک ٹکڑا گوشت کا ہے کہ جس وقت وہ صالح ہو جائے یعنی سنور جائے اور درست ہو جائے تو تمام جسم (یعنی اعضائے کل) سنور جاتے ہیں اور جب وہ بگڑ جائے تو تمام جسم بگڑ جاتا ہے۔ خبردار ہو کہ وہ گوشت کا ٹکڑا دل ہے۔“

صالحیت کا یہ وہ مقام ہے کہ جب اس کا دل صاف ہو جائے اور اس کی زبان راست گفتاری کا ریکارڈ اور اس کے باقی اعضاء اعمال صالحہ کے مصدر بن جائیں اور ان میں اللہ تعالیٰ کے فرمان اور اس کے نبی برحق ﷺ کی روش و سیرت کے خلاف کوئی جنبش نہ رہے تو وہ دل نورانیہ کے نزول کا محل اور عنایات خصوصیہ کا مورد ہو جاتا ہے۔

صالحیت کا دوسرا مقام:- صالحیت کا دوسرا مقام، مقامات نبوت میں سے ہے اور یہ

نیلے رکھ اس چرگاہ یا درختوں کے ذخیرہ کو کہتے ہیں جہاں سے گھاس یا درخت کا کاٹا اور شکار کرنا رعیت کے لوگوں کو بحکم حکومت منع ہو۔

اس کا آخری و انتہائی مقام ہے۔ گویا یوں سمجھو کہ صالحیت ایک کٹی ہے جس کے بعض افراد بعض سے اولیٰ و افضل ہیں۔

حضرت ابراہیمؑ کا مرتبہ نبوت معلوم ہے۔ آپ جد انبیاءؑ ہیں، امام الرسل ہیں۔ قیامت کے دن سب سے پہلے آپ ہی کو خلعت پہنائی جائے گی۔ آپ کے متعلق حق جل و علا فرماتے ہیں:-

ولقد اصطفینہ فی الدنیا و انہ فی الآخرۃ لمن الصالحین ○ (بقرہ، پ ۱)
”اور البتہ جن لیا ہم نے اس کو دنیا میں اور بے شک وہ آخرت میں صالحین سے ہوگا۔“

حضرت ابراہیمؑ کے لیے الفاظ و انہ فی الآخرۃ لمن الصالحین ○ (سورہ نحل، پ ۱۳) اور سورہ عنکبوت، پ ۲۰ میں بھی وارد ہیں۔ ان مذکورہ آیات میں آپ کو اسی رتبہ صالحیت کے ملنے کی خبر ہے۔ جس کے لیے آپ نے دعا کی تھی:-
رب ھب لی حکمًا و الحقنی بالصالحین ○ (شعراء، پ ۱۹) ”خداوند! بخش مجھے معرفت اور ملا مجھے صالحین سے۔“

حضرت ابراہیمؑ کی یہ دعا آپ کے مرتبہ نبوت پر فائز ہونے کے بعد کی ہے۔ جیسا کہ اس مقام اور دیگر مقامات کے سلسلہ کلام سے واضح ہے۔ اسی طرح آپ نے اللہ تعالیٰ سے جو ایک صالح فرزند طلب کیا اور آپ کی وہ دعا حضرت اسماعیلؑ کی پیدائش کی صورت میں قبول ہوئی تو وہ صالحیت بھی اسی جنس سے ہو سکتی ہے۔ چنانچہ فرمایا:-
رب ھب لی من الصالحین ○ (صافات، پ ۲۳) ”خداوند! مجھے ایک فرزند عطا کر جو صالحین سے ہو۔“

اسی طرح حضرت یوسفؑ نے بھی منصب نبوت پر فائز ہونے کے بعد عالم برزخ میں اسی مرتبہ صالحیت والے انبیاء کرامؑ میں شامل ہونے کی دعا کی تھی:-
توفنی مسلمًا و الحقنی بالصالحین ○ (یوسف، پ ۱۳) ”خداوند! مجھے اسلام پر فوت کرنا اور مجھے صالحین سے ملانا۔“

اسی طرح حضرت یحییٰؑ کی نسبت حضرت زکریاؑ کو بشارت سنائی:-

فنادتہ الملئکۃ و هو قائم یصلیٰ فی المحراب ان اللہ یشرک بیحییٰ

مصدقاً بکلمۃ من اللہ و سیداً و حصوراً و نبیاً من الصالحین ○ (آل عمران پ ۳)

”ندا کی اسے فرشتوں نے اور وہ محراب میں نماز میں کھڑا تھا کہ اللہ تعالیٰ تجھے یحییٰ (بیٹے) کی خوش خبری سناتا ہے۔ جو اللہ کے کلمہ (حضرت عیسیٰ) کی تصدیق کرے گا۔ اور سردار اور عورت کی خواہش نہ رکھنے والا اور صالحین میں سے نبی ہوگا۔“

اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ صالحیت مقامات نبوت میں سے ایک بہت بلند مقام ہے۔

اسی طرح حدیث معراج میں رسالت مابینہ کی جو ملاقات بعض اکابر انبیاء کرام سے ہوئی۔ اس کی نسبت صحیح بخاری وغیرہ کتب حدیث میں مروی ہے کہ حضرت آدمؑ اور حضرت ابراہیمؑ نے آپ کو بالاخ الصالح والنبی الصالح کے الفاظ سے مرجبا کہا اور حضرات یحییٰ، عیسیٰ، یوسف، ادریس، ہارون اور موسیٰ علیہم السلام نے بالاخ الصالح والنبی الصالح سے مرجبا کہا تو اس میں بھی درجہ نبوت والی صالحیت ملحوظ ہے، نہ کہ عام درجہ ولایت والی، جس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔

الغرض اگر کسی نبی کی صفت میں لفظ صالح وارد ہو تو اس سے عام صالحیت ولایت سے اوپر مقام نبوت والی صالحیت مراد ہوتی ہے۔ چنانچہ سورہ نحل کی آیت وانہ فی الآخرۃ لمن الصالحین ○ کی تفسیر میں ”تفسیر رحمانی“ میں لکھا ہے۔ ارباب الولاية النبویۃ التی ہی افضل من نبوتہم یعنی حضرت ابراہیمؑ آخرت میں ولایت نبویہ والوں میں سے ہیں۔ جو ان کے مقام نبوت سے بھی اوپر کے رتبے کا نام ہے۔ اور اسی مقام کی نسبت حضرت شیخ اکبر قدس سرہ ”فصوص الحکم“ میں فرماتے ہیں:-

فاذا سمعت احدا من اهل اللہ يقول او ينقل اليك عنه انه قال الولاية اعلىٰ منه النبوة فليس يريد ذلک القائل الا ما ذکرته او يقول ان الرلی فوق النبی و الرسول فانه یعنی بذلک فی شخص واحد و هو ان الرسول، من حیث هو انه ولی اتم منه حیث هو نبی و رسول لان الولی التابع له اعلىٰ منه فان التابع لا یدرک المتبوع ابدا فیما هو تابع له فیہ (فصوص الحکم، شرح جالی اندی، ص

”پس جب تو کسی اہل اللہ کو سنے یا تیرے پاس اس کی بابت نقل کیا جائے کہ وہ یہ کہتا ہے کہ ولایت نبوت سے اعلیٰ (و افضل) ہے تو اس قائل کی مراد سوائے اس کے کچھ بھی نہیں۔ جو میں نے اوپر ذکر کی یا وہ یہ کہے کہ ولی نبی اور رسول سے فائق ہوتا ہے تو اس کی مراد ایک ہی شخص میں ان دونوں رتبوں کے ہونے کی ہے کہ کوئی رسول اس حیثیت سے کہ وہ خدا کا ولی دوست ہے، زیادہ اتم و اکمل ہے۔ اس حیثیت سے کہ وہ نبی اور رسول ہے۔ (معاذ اللہ) یہ مراد نہیں ہے کہ ولی جو تابع ہوتا ہے۔ وہ اس (رسول) سے اعلیٰ ہے کیوں کہ تابعدار اپنے متبوع کے درجے کو اس امر میں کہ وہ تابعدار رہے۔ کبھی نہیں پاسکتا۔“

تنبیہ:- آیت سورۃ النساء یعنی النبیین والصدیقین والشہداء والصلحین میں صالحین سے مراد عام درجہ ولایت والے صالحین مراد ہیں نہ کہ درجہ نبوت والے کیوں کہ یہاں پر انبیاء کرام کا ذکر بالتصریح الگ موجود ہے۔

نکتہ:- اب ہم ہر طرف سے سٹ سٹا کر اور سب بحثوں سے نمٹ نمٹا کر اصل مطلب کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ یعنی اصل آیت زیر تفسیر صراط الذین انعمت علیہم پر آتے ہیں کہ جس طرح ظاہری بیٹائی کے لیے آفتاب کی یا اس کے قائم مقام کی روشنی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح ایمانی و روحانی امور میں نبی برحق یا اس کے خلیفہ صادق کی ضرورت ہے۔ اسی لیے صراط الذین انعمت علیہم فرمایا ہے کہ نبی ﷺ آفتاب عالمتاب ہیں اور صدیق و شہید و صالحین جو آپ سے نور حاصل کرنے والے ہیں، آپ کے خلفاء ہیں۔ چنانچہ خاتم النبیین ﷺ کی نسبت فرمایا:-

یا ایہا النبی انا ارسلناک شاہداً و مبشراً و نذیراً ○ وداعیاً الی اللہ باذنه و سراجاً منیراً ○ (احزاب، پ ۲۲)

”اے بزرگ شان والے نبی! ہم نے تو تم کو (اپنی توحید کا) شاہد بنا کر اور بشیر اور نذیر کر کے اور ہمارے حکم سے ہماری طرف بلانے والا اور سراج منیر کر کے بھیجا ہے۔“

سراج کا لفظ جو اس آیت میں آنحضور ﷺ کی ذات اقدس کی نسبت فرمایا ہے۔

دوسری آیت میں یہی لفظ آفتاب عالمتاب کی نسبت وارد ہے:-

نبارک الذی جعل فی السماء بروجاً و جعل فیہا سراجاً و قمرًا
منیراً ○ (فرقان، پ ۱۹)

”بڑی برکت والا ہے وہ جس نے بنائے آسمان میں ستارے اور بنایا اس میں سورج اور چاند چمکتا۔“

وَبَنینَا فَوْقَکُمْ سَبْعَ شَدَادٍ ○ وَجَعَلْنَا سِرَاجاً وَهَاجاً ○ (نبا، پ ۳۰)

”اور بنائے ہم نے اوپر تمہارے سات (آسمان) محکم اور بنایا ہم نے سورج چمکتا۔“
اور سید المرسلین، خاتم النبیین اور رحمۃ للعالمین ﷺ کی پیروی سے آپ سے نور حاصل کرنے والے صلحائے امت کی نسبت فرمایا:-

اقمن شرح اللہ صدرہ للاسلام فهو علی نور من ربہ (زمر، پ ۲۳)
”بھلا جس کا سینہ اللہ نے اسلام کے لیے کھول دیا، تو وہ اپنے رب کی طرف سے نور پر ہے۔“

اسی طرح نبی اکرم ﷺ نے اپنی ایک دعا میں محدثین ملت کو اپنا خلیفہ کر کے فرمایا ہے:-

اللهم ارحم خلفائی الذین یاتون من بعدی الذین یروون احادیثی و سنتی و یعلمونها الناس (الجامع الصغیر للبیہقی، ص ۵۳)

”خداوند! میرے ان خلیفوں پر رحمت کرنا جو میرے بعد آئیں گے (اور) وہ میری احادیث (فرمائی ہوئی باتیں) اور میرا طریق عمل روایت کریں گے اور لوگوں کو ان کی تعلیم دیں گے۔“

نکتہ:- اللہ جل شانہ نے اپنے حبیب پاک ﷺ کو بوجہ آپ کی جامعیت کے دو کام تفویض فرمائے تھے۔ اول تبلیغ دین، دوم انتظام عالم۔ سو انتظام تو خلافت کبریٰ یعنی سیاست مملکت کے متعلق ہے۔ جو خلفائے راشدین کا کام ہے اور تبلیغ دین خلافت صغریٰ کے متعلق ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے گروہ محدثین کو پیدا کیا۔ جنہوں نے نبی برحق ﷺ کی سیرت کو نہایت محنت و کاوش سے اول اپنے سینے میں حفظ کیا اور پھر سننے (کتاب) میں ضبط کیا۔ (رحمہم اللہ اجمعین و جزاھم عنا جزاء حسنا)

مولانا حالی مرحوم اس گروہ حق پر وہ کی تعریف میں یوں گویا ہیں:-

گروہ ایک جو یا تھا علم نبیؐ کا
لگایا پتہ جس نے ہر مفتری کا
نہ چھوڑا کوئی رخنہ کذب خفی کا
کیا قافیہ تنگ ہر مدعی کا
کئے جرح و تعدیل کے وضع قانون
نہ چلنے دیا کوئی باطل کا افسوں

○ ☆ ○

اسی دھن میں آساں کیا ہر سفر کو
اسی شوق میں طے کیا بحر و بر کو
سنا خازن علم دیں جس بشر کو
لیا اس سے جا کر خبر اور اثر کو
پھر آپ اس کو پرکھا کسوٹی پہ رکھ کر
دیا اور کو خود مزہ اس کا چکھ کر

○ ☆ ○

کیا فاش راوی میں جو عیب پایا
مناقب کو چھانا مثالب کو بتایا
مشائخ میں جو جج نکلا بتایا
ائمہ میں جو داغ دیکھا بتایا
طلسم درع ہر مقدس کا توڑا
نہ ملا کو چھوڑا نہ صوفی کو چھوڑا

○ ☆ ○

رجال اور اسانید کے جو ہیں دفتر
گواہ ان کی آزادی کے ہیں یکسر
نہ تھا ان کا احساں یہ اک اہل دیں پر

وہ تھے اس میں ہر قوم و ملت کے رہبر
 لبرٹی میں جو آج اتفاق ہیں سب سے
 بتائیں کہ لبرل بنے ہیں وہ کب سے؟

اللهم اجعلنى من الذين استرحم لهم نبىك و صفيك

احب الصالحين و لست منهم
 لعل الله يرزقنى صلاحاً

و انا العبد الاثيم: محمد ابراہیم میرسیالکوٹی

غیر المغضوب علیہم ولا الضالین ○

”جو غیر مغضوب اور غیر ضالین ہیں“

ارتباط بما قبل :- چونکہ بعض لوگ اپنے الحاد و کجروی اور بدعت و گمراہی پر پردہ ڈالنے اور عوام کو اپنی طرف گرویدہ کرنے کے لیے اپنے اختراعی طریق کو طریق نبوت و طریق سلف صالحین قرار دے کر اپنا الو سیدھا کرتے اور گمراہی پھیلاتے ہیں۔ اس لیے ان گمراہ کن لوگوں کے طریق کو صراط مستقیم اور صراط منعمین سے جدا اور الگ ظاہر کرنے کے لیے صراط الذین انعمت علیہم کے بعد فرمایا۔ غیر المغضوب علیہم یعنی خداوند! ہم تجھ سے ان لوگوں کے طریق پر چلنے کی توفیق چاہتے ہیں۔ جن پر تو نے انعام کیا اور ان پر غضب نہیں ہوا۔ اور وہ راہ راست (صراط مستقیم) سے بھٹکے بھی نہیں۔

ترکیب نحوی :- غیر المغضوب علیہم بدل ہے۔ الذین انعمت علیہم سے یا اس کی صفت ہے۔ (کشاف) اور معلوم ہے کہ بدل و مبدل منہ اور صفت و موصوف کا مصداق ایک ہی ہوتا ہے۔ پس اس آیت کے صحیح معنی آیت سابقہ کو ملا کر یہ ہوئے کہ الہی! ہم کو ان لوگوں کی راہ پر چلا، جن پر تیرا فضل ہوا اور وہ غضب و ضلالت سے محفوظ و سلامت رہے۔ چنانچہ علامہ زعزریؒ ”تفسیر کشاف“ میں فرماتے ہیں :-

غیر المغضوب علیہم بدل من الذین انعمت علیہم علی معنی ان المنعم علیہم هم الذین سلموا من غضب اللہ و الضلال او صفة علی معنی جمعوا بین النعمة المطلقة و هی نعمة الایمان و بین السلامة من غضب اللہ و الضلال^{السلام} ○ (کشاف، ج ۱، ص ۵۵)

علامہ زعزریؒ کی اس ترکیب کو سید شریف جرجانیؒ، قاضی بیضاویؒ، خطیب شرنوبیؒ، علامہ نسفیؒ وغیرہم نے بھی تسلیم کیا ہے اور غیر کے مجرور ہونے کی صورت میں سوائے اس کے اور کچھ ہو بھی نہیں سکتا۔

”غیر المغضوب علیہم بدل ہے الذین انعمت علیہم سے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ منعم علیہم (انعام یافتہ) وہ ہیں جو اللہ کے غضب سے اور ضلالت (گمراہی) سے سلامت رہے۔ یا صفت ہے پھر یہ معنی ہوں گے کہ وہ وہ لوگ ہیں جو نعمت مطلقہ یعنی نعمت ایمان کے اور اللہ کے غضب سے اور ضلالت سے سلامت رہنے کے جامع ہیں۔“

نکتہ نمبر ۱:- مذکورہ بالا ترکیب کی رو سے اس آیت میں منعم علیہم کا وصف ثبوتی اور سلبی ہر دو جمع ہیں۔ یعنی انعمت علیہم میں وصف ثبوتی یعنی ثبوت نعمت ہے کہ ان پر خدا کا فضل ہو اور غیر المغضوب علیہم میں انعام کی ضد غضب اور ہدایت کی ضد ضلالت کا سلب (نفی) ہے۔ یعنی یہ کہ وہ غضب سے اور ضلالت سے سلامت رہے۔

حاصل مطلب:- سابقہ آیات کو ملا کر یہ ہوا کہ خداوند! ہم خاص تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور اپنی حاجات میں خاص تیری ہی طرف رجوع کرتے اور خاص تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔ ہم کو طریق استقامت پر چلنے اور اس پر قائم رہنے کی توفیق عطا فرما، جو ان لوگوں کا طریق ہے جن پر تو نے اپنا فضل کیا اور ان پر غضب نہیں ہوا اور وہ اس طریق سے بھگ کر کسی اور طرف کو نہیں گئے۔

تنبیہ نمبر ۱:- حدیث شریف جس میں المغضوب علیہم سے یہود اور الضالین سے نصاریٰ مراد بتائی گئی ہے۔ (ترمذی و مسند احمد) تو وہ مغضوب علیہم اور ضالین کی بابت ہے جو بالکل درست ہے۔ کیوں کہ یہود کی نسبت قرآن کریم میں اکثر مقامات پر لفظ غضب اور نصاریٰ کی نسبت لفظ ضلالت آیا ہے لیکن اس آیت میں غیر مغضوب اور غیر ضالین وارد ہے۔ جس سے یہ مراد ہے کہ وہ انعام یافتہ لوگ غیر یہود و غیر نصاریٰ ہیں۔ چنانچہ خطیب شربی ”تفسیر سراج منیر“ میں فرماتے ہیں:-

ونکۃ البذل افادۃ ان المہتدین لیسوا یہود اولاً نصاریٰ (جلد ۱، ص ۱۰)
 ”اور بدل ہونے کے نکتے میں فائدہ یہ ہے کہ جو ہدایت یافتہ ہیں۔ وہ یہود اور نصاریٰ نہیں ہیں۔“

تنبیہ نمبر ۲:- ولا الضالین میں لا بمعنی غیر ہے۔ چنانچہ عمرؓ وغیرہ بعض صحابہ کرامؓ سے

جلالین، کمالین، سراج منیر۔

اس جگہ لاکي بجائے غير بھی مروی ہے۔ حافظ ابن کثیر کہتے ہیں۔ یہ انہوں نے بطور تفسیر بتایا ہے۔ (نہ کہ بطور نزول قرآن)

نکتہ نمبر ۲:- انمت علیہم کے مقابلے میں غیر المغضوب علیہم کے ضمن میں مغضوب علیہم کا بھی ذکر ہے۔ جو حدیث شریف میں بتایا گیا ہے کہ اس سے مراد یہود ہیں۔ کیوں کہ قرآن پاک میں بیشتر مقامات پر غضب کا لفظ ان کے حق میں وارد ہے۔ مثلاً "فباؤا بغضب علی غضب (بقرة، پ ۱) اور من لعنه اللہ و غضب علیہ (مائده، پ ۶) اور معلوم ہے کہ انعام کی ضد غضب و انتقام ہے۔ اسی طرح احدنا کے مقابلے میں لا الضالین کے ضمن میں ضالین بھی مذکور ہے۔ جن سے حدیث شریف میں نصاریٰ مراد بتائے گئے ہیں۔ کیوں کہ قرآن مجید میں بہت سے مقامات پر ضلالت کا لفظ ان کے لیے آیا ہے۔ مثلاً "سورۃ مائدہ میں ذکر نصاریٰ کے ضمن میں فرمایا۔ قد ضلوا من قبل و اضلوا کثیراً و ضلوا عن سواء السبیل (پ ۶) اور معلوم ہے کہ ہدایت کی ضد ضلالت ہے۔

سبحان اللہ! کیسی لفظی و معنوی مناسبتیں ملحوظ رکھی گئی ہیں۔ کیوں نہ ہو، علیم کل کا کلام ہے۔

نکتہ:- انمت بصیغہ معروف ذکر کیا۔ اس کی وجہ صراط الذین انعمت علیہم کی ابتدائی بحث میں بیان ہو چکی ہے اور مغضوب علیہم میں اسم مفعول کا صیغہ استعمال کیا، جو فعل مجہول کے معنی میں ہوتا ہے۔ تاکہ ظاہر ہو کہ انسان پر غضب الہی اس کے اپنے افعال کا نتیجہ و ثمرہ ہے، جس کی بناء عدل و انصاف پر ہے کہ موافق عدل کے جزا ملی۔ چنانچہ فرمایا۔ جزا وفاقاً (نبا، پ ۳۰) جیسا کہ ملک یوم الدین کی تفسیر میں مفصل گزر چکا ہے۔ اور ضالین میں اسم فاعل کا صیغہ اختیار کیا اور مغضوب علیہم کی طرح منفلیں (باب افعال سے صیغہ اسم مفعول) نہیں کہا۔ تاکہ ثابت ہو کہ ضلالت انسان کا اپنا کام ہے۔ جس سے وہ گمراہ ہوتا ہے۔ خدائے عزوجل کا کام نہیں ہے۔ ہاں اسباب کا پیدا کرنا اللہ تعالیٰ کا کام ہے لیکن ان اسباب کو عمل میں لانا انسان کا اپنا کام ہے اور نکتہ رس

۱۰۳ ابن کثیر، جلد ۱، ص ۵۰، علی ہامش فتح البیان شیخ شینا السید النواب۔

اصحاب سمجھ سکتے ہیں کہ خلق و کسب ہر دو الگ الگ امر ہیں۔ خالق ہر شے کا اللہ تعالیٰ ہے۔ اللہ خالق کل مثنیٰ (زمر، پ ۲۴) لیکن فضل و کسب انسان کا کام ہے۔ مولانا روم صاحب نے مثنوی میں اس مضمون کو بہت تفصیل سے بیان کیا ہے اور گونا گون تمثیلات سے سمجھایا ہے۔

نکتہ و تنبیہ :- قرآن مجید میں جہاں کہیں یہ فعل باب افعال سے یعنی اضلال اور اس کے ہم معنی الفاظ اغواء وغیرہ کو اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت کیا ہے۔ وہاں پر ان کے دو معنی ہیں۔ اول یہ کہ کسی انسان کے گمراہ ہو جانے پر اللہ تبارک و تعالیٰ اس پر گمراہی کا فتویٰ عائد کرتا ہے۔ یعنی اسے گمراہ قرار دیتا ہے۔ یا یوں کہلے کہ اس پر گمراہی کا فرد قرار داد جرم لگاتا ہے اور علم تعریف میں باب افعال کا ایک خاصہ نسبت بماخذ بھی ہے۔ (نواور الاصول)

دوم یہ کہ ایسے مواقع پر اضلال وغیرہ الفاظ خذلان و امہال کے معنی میں ہوتے ہیں۔ یعنی خداوند تعالیٰ جو مالک ملک و ملکوت اور صاحب عظمت و جبروت ہے۔ ضدی گمراہوں کی نسبت اس کی سنت یہ ہے کہ آیات نفسی و آفاقی اور تبلیغ رسالت سے ان پر حجت پوری کرنے کے بعد ان کے کفر و عصیان پر قائم رہنے اور ضد و اصرار کرنے کی وجہ سے ان کو ان کی حالت پر چھوڑ دیتا ہے۔ اور ان سے اپنی توفیق و عنایت ہٹا لیتا ہے اور یہ درجہ سب سے سخت ہوتا ہے۔ اور اسی کا نام درجہ لعنت ہے۔ جو ایک گونہ سزا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت خصوصی سے محرومی ہو جاتی ہے۔ (اعاذ اللہ منھا)

سیدنا حضرت امام ابو حنیفہؒ ”فقہ اکبر“ میں فرماتے ہیں۔ اضلالہ خذلانہ یعنی اللہ تعالیٰ کے اضلال سے مراد اس کا ساتھ چھوڑ دینا ہے۔ دنیا میں بعض قصوروں پر صرف تنبیہ کر دی جاتی ہے۔ بعض پر تھوڑا سا جرمانہ کر دیا جاتا ہے، بعض پر اس جگہ سے تبدیل کر دیا جاتا ہے، بعض پر درجہ گھٹا دیا جاتا ہے، بعض پر ترقی روک دی جاتی ہے اور بعض کو یہ سزا ملتی ہے کہ موجودہ ملازمت سے تو برخاست اور آئندہ کے لیے ممنوع روزگار بلکہ بعض وقت اس کے ساتھ جرمانہ و قید بھی۔ ایسی سزا کسی بہت سنگین جرم پر ملتی ہے۔ یہی حال الہی سزاؤں کا ہے۔ سورہ بقرہ، پارہ اول میں آیت خنم اللہ علی قلوبہم میں یہی درجہ لعنت مراد ہے اور ہم اس آیت میں اللہ کی توفیق سے اس امر کو

بالتفصیل بیان کریں گے۔

اللهم وفقنی ان ابرز عجائب کتابک و اظهر غرائب کلامک

حقیقت غضب :- غضب ایک کیفیت ہے۔ جس کے سبب سے دل کا خون جوش کرتا ہے اور روح حیوانی مکروہ و ناملائم طبع امر کو دفع کرنے کے لیے خارج بدن کی طرف متوجہ ہو جاتی ہے۔ جس کی غایت انتقام ہے۔ اور ہم سابقاً "بسم اللہ کی تفسیر میں بالتفصیل بیان کر چکے ہیں کہ رحمت و غضب و غیرہما جو انفعالی کوائف ہیں۔ ان کا تصور ذات حق کے متعلق اس صورت میں جائز نہیں ہے، جس صورت میں کہ وہ انسانوں میں پائی جاتی ہیں۔ کیوں کہ ذات حق انفعالات سے پاک و برتر ہے۔ بلکہ ذات حق کے متعلق صرف ان کی غایت ہوتی ہے۔ مثلاً "رحمت کی غایت مرحوم پر نفضل و احسان ہے اور غضب کی انتقام و سزا ہے، وغیرہ وغیرہ۔

اسباب غضب :- قرآن حکیم میں کئی ایک امور پر لفظ غضب یا اس کا ہم معنی لفظ دارد ہے۔ جس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ امور اللہ رب العزت کے نزدیک موجبات غضب ہیں۔ (اعاذنا اللہ منھا)

اول، شرک :- چنانچہ فرمایا۔

ان الذين اتخذوا العجل سینا لهم غضب من ربهم و ذلة فی الحیوة الدنیا و کذا لک نجزی المفترین ○ (اعراف، پ ۹)

"یقیناً" جن لوگوں نے اس بچھڑے کو معبود بنا لیا۔ ان کو ضرور ضرور ان کے رب کا غضب حاصل ہوگا۔ نیز اس دنیوی زندگی میں ذلت ہوگی اور ہم ایسے افترا پردازوں کو اسی طرح کی جزا دیا کرتے ہیں۔"

دوم، کفر و ارتداد :- چنانچہ ارشاد ہے۔

ولکن من شرح بالكفر صدراً فعلیہم غضب من اللہ و لهم عذاب عظیم ○ (نحل، پ ۱۳)

"لیکن جس نے (اپنا) سینہ کفر کے لیے کھول دیا تو ان پر اللہ کا غضب ہوگا اور (عاقبت میں) ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔"

سوم، بے گناہ مومن کا قتل :- چنانچہ ارشاد فرمایا۔

ومن يقتل مؤمناً متعمداً فجزاءه جہنم خالداً فیہا و غضب اللہ علیہ و لعنہ و اعد لہ عذاباً عظیماً ○ (نساء، پ ۵)

”اور جو کوئی کسی مومن کو عمدہ قتل کرے گا تو اس کی جزا جہنم ہے۔ جس میں وہ ٹھہرا رہے گا اور اس پر اللہ کا غضب اور لعنت ہوگی اور (عاقبت میں) اس نے اس کے لیے عذاب عظیم تیار کر رکھا ہے۔“

چہارم، اللہ کے رسول کی مخالفت :- چنانچہ حضرت موسیٰ کی زبانی ذکر کیا کہ انہوں نے اپنی قوم سے کہا۔

ام اردتم ان یحل علیکم غضب من ربکم فاخلفتم موعدی (طہ، پ ۱۶)
”یا تم نے ارادہ کر لیا کہ تم پر تمہارے رب کا غضب نازل ہو۔ پس (اس لیے) تم نے میرے وعدہ کا خلاف کیا۔“

پنجم، حق ظاہر ہو جانے پر اللہ کے حکم کے سامنے حجت بازی کرنا :- چنانچہ ارشاد ہے۔ والذین یحاجون فی اللہ من بعد ما استجیب لہ حجۃہم داحضة عند ربہم و علیہم غضب و لہم عذاب شدید ○ (شوری، پ ۲۵)

”اور جو لوگ اللہ کے بارے میں حجت بازی کرتے ہیں۔ بعد اس کے کہ اس کی قبولیت قائم ہو چکی۔ ان کی حجت بازی ان کے رب کے نزدیک بالکل مردود ہے اور ان پر (اس کا) غضب ہے اور ان کے لیے (عاقبت میں) سخت عذاب (تیار) ہے۔“

ششم، اللہ کی نعمتوں پر شکر گزاری کی بجائے عصیان و طغیان کو اختیار کرنا :- چنانچہ فرمایا۔ کلوا من طیبات ما رزقنکم ولا تطفوا فیہ فیحل علیکم غضبی ○ (طہ، پ ۱۶)

”کھاؤ ستمری چیزوں سے جو تم کو اللہ نے دیں اور اس (رزق حلال) میں سرکشی نہ کرو۔ پس تم پر میرا غضب نازل ہو کر رہے گا۔“

حقیقت ضلالت

لغت میں ضلالت گم ہو جانے، حیران ہونے اور بھول جانے کو کہتے ہیں اور اس

کا اطلاق کئی طرح پر ہوتا ہے۔

غیوبت، حیرت، غفلت، نسیان، مغلوبیت (جذبہ حق یا حمایت میں) 'گم ہو جانا' کھویا جانا، بے راہ ہو جانا، دینی امور میں شیطان یا نفس کے ورغلانے سے اعتقاداً "یا عملاً" گمراہ ہو جانا۔ یہ لفظ حسب موقع و محل ان سب امور پر بولا جاتا ہے۔ اکثر ان میں سے قرآن شریف میں موجود ہیں۔

اس بھول جانے اور بے راہ چلنے کی صورتیں مختلف ہیں۔ بعض باریک دھلی ہیں کہ کمال عقل و ایمان سے سو جھتی ہیں اور بعض ظاہر و واضح ہیں اور بعض شدید ہوتی ہیں کہ پھر ان سے راہ پر آنا مشکل ہو جاتا ہے اور اس مقام پر پہنچ کر آخر کار دل پر ہر لگ جاتی ہے۔ اور بعض معمولی ہوتی ہیں کہ تھوڑا سا سمجھانے سے بھولا ہوا رستے پر آ سکتا ہے بشرطیکہ آئینہ قلب صاف ہو اور نیت صادق ہو۔ ورنہ دل کی کدورت اور نیت کے فساد سے واضح و معمولی غلطی بھی شدید ہو جاتی ہے۔ (اعاذنا اللہ منہا)

پھر یہ کہ بھول، غلط فہمی و سمو سے بھی سرزد ہو جاتی ہے اور عمداً "دارادۃ سے بھی۔ اعتقاد میں بھی اور طریق عمل میں بھی، دینی امور میں بھی اور دنیوی امور میں بھی، مجازی و معنوی طور پر بھی اور حسی و حقیقی صورت میں بھی۔

۱۲۔ اسی حسی طور پر رستہ بھول جانے کی جنس سے یہ واقعہ ہے کہ ایک دفعہ اپنے بچپن میں سرور کائنات ﷺ کہیں رستہ بھول گئے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے دست قدرت و حفاظت خصوصی سے آپ کی رہنمائی کر کے آپ کو آپ کے جد امجد حضرت عبدالمطلب کے پاس پہنچا دیا۔ (ابن ہشام وغیرہ) اس پر اللہ تبارک و تعالیٰ نے آپ کو منصب نبوت پر سرفراز کرنے کے بعد امتناناً "جتایا۔ ووجدک ضالاً" فہدیٰ ○ (والضحیٰ، پ ۳۰) ورنہ پیغمبران خدا پر مجازی و معنوی و دینی ضلالت عادت محال ہے۔ قبل نبوت بھی اور بعد نبوت بھی۔ مولانا روم صاحبؒ نے اس واقعہ کو بہت تفصیل سے بیان کیا ہے اور حسب عادت و مذاق خود اس میں باریک باتیں ذکر کی ہیں۔ (دفتر چارم) یا اس جگہ ضلال معنی بے خبری و نادانگی ہے کہ آنحضور ﷺ قبل نبوت ان امور و علوم سے ناواقف تھے جو اللہ تبارک و تعالیٰ نے حضور پاک ﷺ کو نبوت کے وقت اپنی وحی سے سکھائے۔ جیسا کہ فرمایا۔ وان کنت من قبلہ لمن الغفلین (یوسف، پ ۱۲) نیز فرمایا۔ ما کنت ندیری ما الکتاب ولا الایمان ولكن جعلناه نورا (شوری، پ ۲۵)

چونکہ دین کا تعلق اخلاق و امور آخرت سے ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ شریعت و طریقہ کے خلاف رستے پر چلنے کو بھی مجازاً "ضلالت و گمراہی" کہا جاتا ہے۔ چنانچہ علامہ زحشریؒ اساس البلاغہ میں فرماتے ہیں۔ ضل عن الطريق وعن القصد (و من المجاز) ضل فی الدین۔ "یہ دینی گمراہی دو قسم پر ہے، اعتقادی و عملی۔" اعتقادی یہ کہ جو عقائد اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پاک ﷺ سے ثابت ہیں۔ ان میں سے کسی کا انکار کرے یا ان کو اس طریق پر نہ مانے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پاک ﷺ کا ہدایت کردہ ہے۔ مثلاً "معرفت توحید الہی اور معرفت نبوت وغیرہ امور اعتقادیہ۔ چنانچہ فرمایا:۔

يا ايها الذين امنوا امنوا بالله ورسوله و الكتب الذي نزل على رسوله و الكتب الذي انزل من قبل و من يكفر بالله و ملائكته و كتبه و رسله و اليوم الآخر فقد ضل ضلالاً بعيداً" ○ (نساء، پ ۵)

"اے ایماندارو! ایمان رکھو اللہ پر اور اس کے (جملہ) پیغمبروں پر اور اس کی اس کتاب (قرآن مجید) پر جو اس نے اپنے رسول (محمد ﷺ) پر اتاری اور (ہر) اس کتاب جو اس نے اس سے پہلے اتاری اور جو کوئی کفر کرے گا اللہ سے اور اس کے فرشتوں سے اور اس کے رسولوں سے اور یوم آخرت (روز قیامت سے) تو وہ (بہت) دور کی گمراہی میں جا پڑا۔"

اعتقادی امور کی ضلالت کو دور کی گمراہی اس لیے کہا کہ جو شخص معتقدات ضروریہ میں گمراہ ہوا، وہ دین سے بہت دور جا پڑا۔ اعتقادات جڑ ہیں اور عملیات شاخیں۔ جڑ قائم نہ ہو تو شاخیں قائم نہیں رہ سکتیں اور عملی یہ کہ اللہ رب العزت کی مقرر کردہ اور پیغمبر ﷺ کی قائم شدہ سنت کے خلاف چلے۔ چنانچہ فرمایا:۔

و ما كان لمؤمن ولا مؤمنة اذا قضى الله ورسوله امراً ان يكون لهم الخيرة من امرهم و من يعص الله ورسوله فقد ضل ضلالاً مبيناً" ○ (احزاب، پ ۲۲)

"اور کسی مومن مرد اور عورت کو نہیں اختیار کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی امر کا حکم کرے تو ان کے لیے ان کے اس امر میں کوئی اختیار باقی رہے اور جو کوئی

اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا تو وہ صریح گمراہی میں جا پڑا۔“

اس آیت میں اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی کو صریح گمراہی کہا ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کی فرمانبرداری عین فرض واجب ہے۔ پس جو کوئی ان کی نافرمانی کرے اس کی گمراہی کے بین ہونے میں کیا پوشیدگی ہے۔

اسی معنی میں حدیث میں فرمایا۔ وکل بدعة ضلالة (مسلم، خطبہ جمعہ) یعنی ہر بدعت ضلالت ہے۔ اس لیے کہ وہ سنت رسول اللہ ﷺ کے سوا ہے اور اجازت و تقریر شرع کے بغیر اپنی طرف سے اختراع کر کے کوئی مسئلہ مقرر کرنا اور اسے دین و شرع جانا اور اس پر ثواب آخرت کا امیدوار ہونا اور اسے اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کا وسیلہ و ذریعہ گردانا بھی ایک گونہ مخالفت ہے۔ چنانچہ فرشتوں کی فرمانبرداری کی تعریف میں فرمایا۔ لا یعصون اللہ ما امرهم ویفعلون ما یؤمرون (تحریم، پ ۲۸) یعنی وہ اللہ تعالیٰ کے فرمائے ہوئے حکم سے تجاوز کر کے اس کی نافرمانی نہیں کرتے اور وہی کچھ کرتے ہیں جس کا ان کو حکم ہوتا ہے۔

تو جس امر پر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اکرم ﷺ کا امر نہیں ہے۔ اسے دین سمجھ کر اس پر عمل کرنا گمراہی ہے اور وہ مردود ہے۔ چنانچہ صحیحین میں ہے کہ آپ نے فرمایا۔ من احدث فی امرنا هذا مالیس منه فهو رد (مشکوٰۃ، ص ۱۹) ”جس نے ہمارے اس امر (دین) میں کوئی بات نئی نکالی تو اس کی وہ بات مردود ہے۔“ حاشیہ مشکوٰۃ میں اس حدیث پر لکھا ہے:-

اقول فی وصف الامر بهذا اشارة الی ان امر الاسلام کمل و اشتہر فمن رام الزیادة علیه حاول امر اغیر مرضی (حاشیہ، مشکوٰۃ، ص ۱۹)

”میں کہتا ہوں کہ امر کو جو اس حدیث میں لفظ هذا سے بیان کیا تو اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اسلام کامل، معلوم اور مشہور ہو چکا ہے۔ پس جو شخص اس میں کسی قسم کی زیادتی چاہتا ہے۔ وہ ناپسندیدہ کام کے گرد پھرتا ہے۔“

نکتہ نمبر ۱:- اوپر کے بیان سے واضح ہو گیا ہے کہ ضلالت کی کئی قسمیں ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح عالم اجسام میں صراط مستقیم (سیدھی لائن) ایک ہی ہوتی ہے اور ٹیڑھی لائنیں جو اس کے گرد ہوں، کئی ایک ہوتی ہیں۔ اسی طرح دین میں صراط مستقیم

صرف ایک ہی ہے اور جب اس سے ہٹنے کا نام ضلالت^۱ ہے تو ٹیڑھے رستے جو صراطِ مستقیم سے ہٹے ہوئے ہوں اور ان کا انجام ہلاکت و جہنم ہو، کئی ایک ہی ہوں گے۔

حدیث میں ہے کہ نبی مکرم ﷺ نے ایک خط کھینچا اور فرمایا۔ ”یہ اللہ کی راہ ہے۔“ پھر اس کے دائیں بائیں چند ایک خط کھینچے اور فرمایا کہ یہ (مختلف) راستے ہیں۔ ان میں سے ہر رستے پر شیطان (کھڑا) ہے۔ جو اس کی طرف بلاتا ہے۔ پھر آپؐ نے آیت پڑھی۔ وان هذا صراطی مستقیماً فاتبعوه یعنی یہ ہے میری سیدھی راہ، پس تم اسی کی پیروی کرو۔ (مشکوٰۃ، ص ۲۲) اس حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ شیطانی راستے کئی ایک ہیں۔

نکتہ نمبر ۲:- صراطِ مستقیم سے ہٹنے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک تفریط اور دوسری افراط۔ تفریط تفصیر یعنی کمی کرنے کو افراط زیادتی کرنے کو کہتے ہیں۔

حدیث شریف میں جو مغضوب علیہم سے یہود اور ضالین سے نصاریٰ مراد بتائی گئی ہے۔ (ترمذی وغیرہ) تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہود کے اکثر جرائم انبیاءؑ کی شان میں تنقیص و تفریط کی جنس سے تھے۔ چنانچہ یہ بات ان کے اس سلوک سے جو انہوں نے حضرات موسیٰ، عیسیٰ، واؤد، زکریا اور یحییٰ علیہم السلام سے کیے، بخوبی واضح ہے۔ اور یہ امر اللہ تعالیٰ کے نزدیک موجب غضب ہے کہ اس کے انبیاء کرامؑ کی تنقیص کی جائے یا ان کو ایذا پہنچائی جائے۔

چنانچہ صحیحین میں ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اس قوم پر اللہ تعالیٰ کا غضب نہایت سخت ہوگا۔ جنہوں نے اس کے نبی ﷺ سے ایسا سلوک کیا۔ اسمیں آپؐ کا اشارہ اپنے سامنے کے دانتوں کی طرف تھا، جو جنگِ احد میں شہید ہوئے تھے اور اسی طرح اس شخص پر بھی اللہ تعالیٰ کا غضب سخت ہوگا، جسے رسول اللہ ﷺ نے (اپنے ہاتھ سے) اللہ کی راہ (جہاد) میں قتل کیا ہو۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ جو سراسر رحمت ہیں، ان کے ہاتھ سے جو قتل ہوگا، وہ بڑا ہی شقی ہوگا۔

۵۰۱ چنانچہ مفرداتِ راغب میں ہے الضلال العلول عن الطريق المستقیم و یضادہ الہدایۃ یعنی ضلال سیدھے رستے سے ہٹ جانے کو کہتے ہیں اور اس کی ضد ہدایت ہے۔

پس یہود کے سواء بھی جو کوئی انبیاء اللہ کی تنقیص کرے یا ان کے سچے وارثوں خلفاء، اولیاء اور علماء کی تحقیر کرے۔ وہ بھی اللہ تعالیٰ کے غضب میں آ جاتا ہے۔ مولانا روم صاحب اسی معنی میں فرماتے ہیں۔

تا دل مرد خدا نامہ بدرو
پچ قوے را خدا رسوا نکرد

اور حدیث میں نصاریٰ کو ضال قرار دیا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا بڑا گناہ حضرت عیسیٰؑ کی محبت و تعظیم میں افراط و غلو ہے کہ ان کو حد پیغمبری سے بڑھا کر خدائی مرتبے پر پہنچا دیا اور یہ اعتقادات میں سخت درجے کی گمراہی ہے۔ چنانچہ نصاریٰ کی گمراہی کے ضمن میں فرمایا:-

قل يا اهل الكتب لا تغلوا في دينكم غير الحق ولا تتبعوا الهواء قوم قد ضلوا من قبل واضلوا كثيرا وضلوا عن سواء السبيل ○ (مائدہ، پ ۶)

”(اے پیغمبر! ان سے) کہو۔ اے اہل کتاب اپنے دین میں ناحق کا غلو (زیادتی) نہ کرو اور ان لوگوں کی خواہشوں کی پیروی نہ کرو۔ جو (تم سے) پہلے گمراہ ہو چکے اور انہوں نے بہت لوگوں کو بھی گمراہ کر دیا اور سیدھے راستے سے ہٹ گئے۔“

اسی احتیاط کو مد نظر رکھتے ہوئے کہ میری امت میری تعظیم عبودیت و رسالت سے زیادہ نہ بڑھا دے۔ حضور اکرم ﷺ نے اپنی امت مرحومہ کو اس گمراہی سے بچانے کیلئے تاکید فرمادیا۔ لا تطرونی کما اطرت النصارى ابن مریم فانما انا عبدہ فقولوا عبد اللہ ورسولہ (تحرید بخاری، ج ۲، ص ۴۴)

”مجھے حد سے نہ بڑھانا۔ جس طرح نصاریٰ نے عیسیٰؑ بن مریمؑ کو حد سے بڑھا دیا۔ میں تو اس (اللہ) کا بندہ ہوں۔ پس اللہ کا بندہ اور اس کا رسول کہو۔“

نصاریٰ کا یہ افراط تو اعتقادی ہے۔ عمل میں یہ افراط کی کہ انہوں نے رہبانیت کا اختراع کیا۔ گو انہوں نے ایسا محض اللہ کی رضا جوئی کے لیے کیا لیکن چونکہ اللہ کی فشاء کے خلاف تھا اور یہ دین میں ایک زیادتی ہے، اس لیے یہ بھی افراط ہے۔ چنانچہ جناب رسالت مآب ﷺ نے اپنی امت کو اس قسم کے افراط سے بھی منع فرمایا۔ چنانچہ حکم ہے:-

لا تشددوا علی انفسکم فیشد اللہ علیکم فان قوما شدوا علی انفسهم
فشدد اللہ علیهم فتلك بقایا هم فی الصوامع والديار رهبانية ابتدعوها ما
کتبناها علیهم رواه ابو داؤد (مکتوۃ)

”تم خود اپنی جانوں پر سختیوں کا بوجھ نہ ڈالو۔ پھر اللہ بھی تم پر سخت امور دارد
کرے گا۔ کیوں کہ (تم سے پہلے) ایک قوم (نصاری) نے اپنی جانوں پر (از خود) سختی ڈال
لی تھی۔ تو اللہ نے بھی ان پر سختی وارد کر دی۔ پس یہ (راہب لوگ) جو بعض گرجاؤں
میں اور بعض گھروں میں رہتے ہیں۔ انہی کے بقایا ہیں۔ (پھر آپؐ نے یہ آیت پڑھی) و
رهبانية ابتدعوها یعنی نصاری نے رهبانیت کو از خود ایجاد کر لیا۔ ہم نے ان پر مقرر
نہیں کی تھی۔“

اور سابقاً ”مزر چکا ہے کہ شریعت مطہرہ میں بدعت نکالنا اور اس پر عمل کرنا
ضلالت ہے اور اللہ تعالیٰ اس عمل کو قبول نہیں کرتا بلکہ رد کر دیتا ہے۔ کیوں کہ جس سکھ
پر مہر سرکاری نہ ہو۔ وہ رواج نہیں پاتا اور کوئی بھی واقف کار اسے قبول نہیں کرتا۔ اسی
طرح جس عقیدے اور جس عمل پر اللہ تعالیٰ یا اس کے امین شریعت یعنی رسول اللہ ﷺ
کی مہر نہ ہو، وہ عقیدہ و عمل قبول نہیں ہوتا۔ پس اس حکم نبویؐ یعنی فتویٰ ضلالت میں ہر
وہ فرد یا جماعت داخل ہے۔ جو رسول عربی ﷺ کے کمال و کمال دین میں کوئی امر از خود
اختراع کرے اور اسے دینی کام اور کار ثواب قرار دے کر اس پر عمل رکھے یا عمل
کرے۔ اعاذنا اللہ من المحدثات الاعتقادیة والعلمیة واقامنا علی السنة
النبویة

طریق اعتدال :- افراط و تفریط کے درمیان اعتدال کا درجہ ہوتا ہے۔ وہی درجہ
استقامت ہے۔ اس امر میں درجہ اعتدال و صراط مستقیم یہ ہے کہ نہ تو یہودیوں کی چال
پر انبیاء و صلحاء کی تنقیص و تحقیر کی جائے اور نہ نصاری کی روش پر ان کی تعظیم میں غلو کیا
جائے۔ بلکہ درجہ اعتدال پر قائم رہ کر ان کی اطاعت اور ان کے راستے کی پیروی کی
جائے اور ان سے دلی محبت و خلوص رکھا جائے اور سنت رسول ﷺ کو اسوہ حسنہ بنا کر
بدعات سے پرہیز کیا جائے۔ اسی باب میں بزرگوں نے کہا ہے کہ ”حفظ مراتب کئی
زندیقی“ یعنی اگر تو ہر ایک کے اصل مرتبہ کی حفاظت نہ کرے گا تو زندیق و بے دین ہو

جائے گا۔ (اعاذنا اللہ منہا)

تنبیہہ ضروری نمبر ۱:- بعض لوگوں کو یہ شبہ عارض ہوتا ہے کہ جب ہر بدعت گمراہی ہے تو اس زمانے میں کئی باتیں ایسی نئی ایجاد ہو گئی ہیں۔ جو جناب رسالت ماب ﷺ اور صحابہ کرامؓ کے وقت میں نہ تھیں تو ان کو کیوں استعمال کیا جاتا ہے؟۔

سو ان کو معلوم ہو کہ شریعت میں اس بدعت کو ضلالت کہا گیا ہے جو دینی امور میں ہو اور اس پر اجر و ثواب کے ترتب کا اعتقاد ہو۔ چنانچہ یہ بات حدیث مذکورہ صدر کے الفاظ فی الامرنا ہذا سے ظاہر ہے لیکن وہ دنیوی امور جن پر عذاب و ثواب کا ترتب نہیں ہے اور شریعت مطہرہ نے ان میں کسی قسم کا تصرف نہیں کیا اور زمانہ کے انقلاب و ترقی سے ان میں تغیر و تبدل اور موقونی و ایجاد وغیرہ امور ہوتے رہتے ہیں۔ وہ اس حد و حکم بدعت سے خارج ہیں۔ مثلاً "ریل اور وغانی جہازوں اور موٹر وغیرہ پر سوار ہونا اور ان کے ذریعے سفر کرنا، خصوصاً حج کا سفر کرنا۔ (فافہم ولا تغفل)

تنبیہہ نمبر ۲:- اسی طرح وہ امور جو صحابہ کرامؓ اور خیار تابعین نے قرآن کریم یا سنت رسول ﷺ سے استنباط کر کے فرمائے ہیں، اس سے خارج ہیں۔ چنانچہ مشکوٰۃ شریف کے حاشیہ میں حدیث مذکور من احدث فی امرنا ہذا پر لکھا ہے:-

والمعنی ان من احدث فی الاسلام رایا لم یکن له من الکتاب او السنة سند ظاہر او خفی، ملفوظ او مستنبط فهو مردود علیہ (حاشیہ مشکوٰۃ، ص ۱۹)

"معنی یہ ہیں کہ جس کسی نے اسلام میں کوئی ایسی بات اپنی رائے سے ایجاد کی۔

جس کی سند کتاب اللہ یا سنت رسول اللہ ﷺ سے نہیں ہے۔ نہ ظاہر، نہ خفی، نہ ملفوظ اور نہ مستنبط تو وہ اس کی وہ رائے اسی پر مردود ہے۔"

تنبیہہ نمبر ۳:- نصوص کتاب و سنت سے استنباط کرنا مجتہد کا کام ہے۔ نہ ہر کس و ناکس کا۔ "لکھے نہ پڑھے نام محمد فاضل" اور یہ قابلیت خدا داد ہوتی ہے، ادعائی نہیں ہے۔ اس زمانے کے بہت سے لوگ نصوص کو بالائے طاق رکھ کر ان کے برخلاف عقائد و اعمال نکالتے ہیں اور ان پر پردہ ڈالنے کے لیے قرآن و حدیث کی عبارتوں کو توڑ مروڑ کر اپنے مطلب کے سانچے میں ڈھالتے ہیں۔ وہ سب لوگ اور ان کے سب ایسے مسائل

قابل پرہیز ہیں۔ حدیث شریف میں اور صحائے امت کی وصایا میں ان سے پرہیز کی شدید تاکید ہے۔

پس اخیر پر میں عاجز بھی ان کی پیروی میں اپنے ناظرین کو یہی تاکید کرتا ہوں کہ وہ طریق سنت پر عمل کریں کہ وہی طریق مستقیم ہے جس کی دعا آپ سورہ فاتحہ میں مانگتے ہیں اور وہی صحابہ کرامؓ و تابعینؓ اور ائمہ مجتہدینؒ اور دیگر بزرگان دین کا طریق ہے۔ جس پر عمل کر کے انہوں نے بڑے بڑے مراتب و مدارج حاصل کیے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی ان کے ساتھ ملائے۔ (آمین)

اور نیز یہ کہ وہ ہر بدعت سے نہایت کراہت سے پرہیز کریں۔ کیوں کہ بغیر سرکارِ دو عالم ﷺ کی اطاعت و اتباع کے سب اعمال ضائع ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے فرمایا۔ یا ایہا الذین امنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول ولا تبطلوا اعمالکم ○ (محمد، پ ۲۶)

”اے لوگو! جو ایمان لائے ہو۔ فرمانبردار بنے رہو اللہ کے اور فرمانبردار بنے رہو اس کے رسول کے اور نہ ضائع کرو اپنے اعمال کو۔“

اب میں عاجز اس تفسیر کے مضمون کو اپنی پنجابی سی حرفی المعروف بہ نین نامہ عارفانہ کے ایک حرف ”غ“ پر ختم کرتا ہوں۔ جو محبوب رب العالمین، سید المرسلین، خاتم النبیین، رحمۃ للعالمین ﷺ کے عشق میں بحالت کمال انبساط و احتفاظ لکھی گئی تھی۔



غیر دے نال نہ جوڑ یاری، بعد نبی دے ہور رسول ناہیں
کیوں رسم محبوب دی چھوڑنا ایں، من حکم تے کریں عدول ناہیں
باہجوں نبی دے کون توں لہہ لیتا، پھر عقل تے ہو بھول ناہیں
ڈھیر عملّاں دے میر جے چاہ لاویں، باہجوں نبی دے مہر قبول ناہیں

تم التفسیر بحول اللہ وقوتہ وحسن توفیقہ والحمد لله الذی بعزّته
وجلالہ تتم الصلحت والصلوة والسلام علیٰ رسولہ و صفوة خلقہ

محمدؐ و آلہ و اصحابہ و ازواجہ اجمعین۔

نکتہ:- مغضوب اور ضال اوصاف بیان کیے ہیں، کسی خاص فرقہ کا نام نہیں لیا۔ یہ کمال متانت ہے۔

۲۸ رجب المرجب ۱۳۵۳ھ، ۷ نومبر ۱۹۳۳ء
خاکسار و گناہگار: محمد ابراہیم میرسیالکوٹی

الاجمال بعد التفصیل

تقریباً "ان چار سو صفحات میں صرف سات آیتوں کی تفسیر میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے۔ وہ اگرچہ ان کے کلام اللہ ہونے کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ بلکہ کچھ نسبت نہیں رکھتا کیوں کہ حق جل و علا خود فرماتا ہے:-

ولو ان ما فی الارض من شجرة اقلام و البحر یمدہ من بعدہ سبعة ابھر ما نفدت کلمت اللہ ان اللہ عزیز حکیم ○ (لقمان، پ ۲۱)

"اور اگر جتنے درخت ہیں زمین میں (سب کی) قلمیں بن جائیں اور سمندر سیاہی بن جائے۔ اس کے بعد سات سمندر اور چلائے جائیں تو نہ ختم ہوں اللہ کی باتیں۔ بے شک اللہ تعالیٰ بڑا زبردست اور (بڑی) حکمت والا ہے۔"

اور حدیث شریف میں ہے۔ لا یشبع منه العلماء ولا یخلق بکثرة الرد ولا ینقضی عجائبہ (الحديث) (مکھوۃ، ص ۱۷۸)

"اس (قرآن) سے علماء سیر نہیں ہوتے اور وہ اکثر تکرار (قرات و سماعت) سے پرانا نہیں ہوتا۔ یعنی اس سے بے رغبتی نہیں ہوتی اور اس کے عجائبات کی انتہا نہیں ہے۔"

اور امام رازی "تفسیر کبیر" میں فرماتے ہیں:-

کل ما ذکرنا فی هذا التفسیر من لطائف القرآن فهو قطرة من البحر۔
 "ہم نے اس تفسیر (تفسیر کبیر) میں قرآن شریف کے جو لطائف بیان کیے ہیں۔

ان کی وہ نسبت ہے جو قطرہ کو سمندر سے ہے۔"

لیکن اگر میرے مجزو و ضعف اور قلت علم و تصور فہم کو دیکھا جائے تو جو کچھ بھی بیان ہوا۔ وہ بھی بہت اور یہ بھی اس کا فضل عظیم ہے کہ مجھ عاجز کو اس کی توفیق بخشی۔ اس پر بھی میں وہ نہیں کہتا جو متبنی شاعر نے کہا ہے۔

و انی ان کنت الاحیر زمانة

لات بما لم تات الاوائل

کیوں کہ میں علمائے سابقین ہی کا خوشہ چین ہوں۔ اگر نقل ہے تو انہی سے ہے

اور اگر قسم ہے تو وہ محض اللہ کا احسان۔ ورنہ میں کیا اور میری بباط کیا؟۔ اس وسیع میدان میں بڑے بڑے سیاح رہ گئے اور اس دریائے ناپید اکنار میں بڑے بڑے شناور بہہ گئے اور کسی کو کنارے کا پتہ نہ لگا۔ ہو سکتا ہے کہ بعض اصحاب کئی سو صفحات کی تفصیل کو ذہن میں نہ رکھ سکیں۔ اس لیے مناسب جانتا ہوں کہ ان کے لیے آیات و کلمات فاتحہ کے ارتباط کو ملحوظ رکھتے ہوئے سادہ ترجمہ اور کسی قدر مختصری توضیح بھی کردوں۔ تاکہ وہ احباب اس کو حفظ کر کے دریا کو کوزے میں یعنی اپنے کاسہ سر میں رکھ لیں۔ (واللہ الموفق)

○ بسم اللہ الرحمن الرحیم

”شروع (جامع جلال و جمال اور صاحب ہر کمال) اللہ کے نام سے جو رحمت عامہ و خاصہ کا مالک ہے۔“

الحمد لله

(جو ذات الہی بابرکت ہو، وہ ضرور لائق حمد و ثناء ہے۔ سو) ہر حمد کے لائق (اسی) اللہ کی (ذات) ہے۔ کہ ذاتی طور پر لائق حمد ہونے کے علاوہ اس لیے بھی قابل تعریف و ثناء ہے کہ اس کی ربوبیت کا سایہ

○ رب العالمین

سارے عالمین پر ہے کہ وہ سارے جہانوں کا پروردگار ہے۔ پس فہوائے جس کا کھائیے، اسی کو گائیے۔ اس کے احسان تربیت کے شکر کیے میں اس کی حمد کرنی چاہیے اور یہ احسان ایجاود تربیت سب کچھ بتقاضائے رحمت ہے۔ کیوں کہ وہ

○ الرحمن الرحیم

رحمت عامہ و رحمت خاصہ کا مالک ہے۔ نہ تو اس پر کسی کا سابقہ ”کوئی حق ہے کہ اس کے عوض میں تربیت کرے اور نہ اسے آئندہ کسی سے کوئی غرض ہے کہ اس کی توقع پر پرورش کرے۔ ایسا لائق حمد، مہربان پروردگار عالمین خدا اپنی رحمت کی وجہ سے اپنے عاجز بندوں کے نیک اعمال راہگاہ نہیں گناتا، بلکہ ان پر جزا مترتب کر کے مزید احسان

کرتا ہے۔ چنانچہ اس امر کے لیے اس نے ایک خاص دن جزا و انصاف کے لیے مقرر کر رکھا ہے۔ جس میں سوائے اس کے کسی کا کچھ بھی حکم و اختیار نہیں ہوگا۔ سو وہی اس

○ مالک یوم الدین

روز جزا کا مالک (ہے) تو جب جزا کا مالک اور اس دن کا حاکم وہی ہے تو ہم ہمیں صرف اسی کی عبادت کرنی چاہیے اور اپنی ہر حاجت اسی کے سامنے پیش کرنی چاہیے۔ سوائے اللہ! جو تو ان سب صفات مذکورہ کا صاحب ہے۔

ایاک نعبد

ہم سب (حاضر و غائب سب سے منہ موڑ کر) صرف تیری ہی عبادت و پرستش کرتے ہیں۔

○ وایاک نستعین

اور (سب سے علاقے توڑ کر اپنی حاجات و ضروریات میں) صرف تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔

○ اھلنا الصراط المستقیم

(سو) تو ہمیں (اس توحید عبادت و توحید استغاثت کی) سیدھی راہ پر قائم رکھ اور اس پر چلنے کی توفیق عطا فرما۔

صراط الذین انعمت علیہم

وہ راہ جس پر تیرے انعام یافتہ (انبیاء و صدیق و شہداء اور صالحین) چلتے رہے۔

غیر المغضوب علیہم

جن پر تو ایسا راضی کہ ان پر کسی قسم کا غضب و غصہ نہیں کیا گیا۔

○ ولا الضالین

اور (تیری توفیق اس طرح ان کے شامل رہی کہ وہ اس سیدھی راہ سے مطلقاً) نہیں بھٹکے۔

○ آمین

خداوند! ہم نے جو کچھ تیری جناب پاک میں عرض کیا، اپنی مہربانی سے اسے قبول فرما، آمین۔“

نکتہ لطیفہ:- سابقاً ذکر ہو چکا ہے کہ سورہ فاتحہ کا ایک نام ام القرآن بھی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ماں کا وجود اولاد کے وجود سے پہلے ہوتا ہے۔ بلکہ وہ ساری اولاد کا مبداء یعنی جائے پیدائش ہوتی ہے اور اس کا شکم بالا جمال اس اولاد پر مشتمل ہوتا ہے جو اس سے پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح یہ سورت سارے قرآن کریم کے مقاصد مہمہ پر حاوی و مشتمل ہے یا یوں کہیے یہ سورت سارے قرآن کی مجمل فرست ہے۔

اس کے بعد اس نکتے کو سمجھے کہ عموماً ”فرست میں سلسلہ عبارت میں ارتباط کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ ہر سرخی و ہر عنوان الگ الگ معنوں پر مشتمل ہو کر ان کی عبارت میں آپس میں ارتباطی تعلق نہیں ہوتا۔ لیکن آپ اوپر کی اجمالی توضیح و ترجمہ سے سمجھ سکتے ہیں کہ سورہ فاتحہ کی ایک ایک آیت کیا ایک ایک لفظ مقدم متاخر کو آپس میں نہایت شدید و باریک تعلق و ارتباط ہے۔

اس سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ حضرت محمد ﷺ کا کلام نہیں ہے کیوں کہ آپ تو امی تھے اور کوئی امی اتنے وسیع و اہم مقاصد کو اتنی مختصر عبارت میں ایسی خوبی و حسن کے ساتھ بیان نہیں کر سکتا کہ اس میں ارتباط کلمات کی تار کہیں بھی نہ ٹوٹے۔ بلکہ یہ خالق جبار، عزیز حکیم کا کلام ہے۔ جس کا ہر کلمہ اور ان کا ربط اعجازی ہے۔ اسی اعجاز کا ذکر حضرت محمد مصطفیٰ، احمد مجتبیٰ ﷺ اس حدیث میں کرتے ہیں۔ بعثت بجوامع الکلم (مشکوٰۃ، ص ۵۰۳) یعنی مجھ کو اللہ تعالیٰ نے جامع کلمات دے کر بھیجا ہے کہ تھوڑے الفاظ میں بڑے بڑے اہم مطالب و مقاصد نہایت صفائی و سادگی سے مذکور ہوتے ہیں۔

الحمد للہ کہ اسی کی توفیق سے میں عاجز یہ اہم کام انجام کو پہنچا سکا۔ اس انشاء میں جو جو علائق و موانع مثل اشغال مہمہ و تفکرات محیرہ و امراض متواترہ کے عارض ہوتے رہے۔ ان پر نظر کرنے سے مجھے نہایت تشویش تھی کہ شاید میں یہ کام پورا نہ کر سکوں

گا۔ لیکن اس کا خاص فضل ہے کہ ایسے تثبت و پرانگی اور پریشانی و بے دلی کی حالت میں اس نے ایسے نکات سمجھائے اور ان کو احسن صورت میں واضح طور پر بیان کروا دیا۔ جس سے امید ہے کہ یہ کتاب اپنے اسم کے مطابق ”واضح البیان“ ثابت ہوگی۔

التماس مکرر:- میں نے اپنی طرف سے نہایت احتیاط سے اس کتاب کو لکھا ہے اور اپنی ذمہ داری کو خوب ملحوظ رکھا ہے۔ پھر بھی انسان ہوں۔ اگر اس میں کوئی خطا و غلطی ہو گئی تو وہ میری طرف سے ہوگی۔ ورنہ اللہ تعالیٰ کا کلام غلطی سے بالکل پاک ہے۔ اہل علم اس پر اطلاع پا کر مجھے اطلاع کریں۔ جیسا کہ شروع کتاب میں عرض کر چکا ہوں۔ لیکن اتنی گزارش کروں گا کہ مجھ اطلاع دینے سے پیشتر خود بھی کتب تفسیر یا حدیث یا لغت کا مطالعہ ضرور کر لیں۔ کیوں کہ مقام احتجاج میں، میں نے زیادہ تر انہی پر انحصار رکھا ہے۔ باقی سب کچھ شواہد و مویدات کی جنس سے ہے، جن میں مطابق مذاق مصنف اختلاف کا ہونا ضروری ہے اور ایسا اختلاف موجب فتنہ و فساد نہیں ہو سکتا۔ واللہ ولی الہدایہ و الیہ البدایہ و النہایہ

۲۹ رجب المرجب ۱۳۵۳ھ، نومبر ۱۹۳۴ء
خاکسار و گناہ گار: محمد ابراہیم میر سیالکوٹی

الجزء الثامن

وهو

نظام الكلام

فی اثبات

ختم النبوة والجهر بالتأمين

وقراءة الفاتحة خلف الامام

للعبء الحقیقیر! محمد ابراهیم میر السیالکوتی

خاتمہ

اس خاتمہ میں تین فصلیں ہیں۔ فصل اول، فصل دوم، فصل سوم۔

فصل اول:- اس امر میں کہ مرزائے قادیانی صاحب نے آیت صراط الذین انعمت علیہم سے جو یہ استدلال کیا ہے کہ سلسلہ نبوت حضرت محمد ﷺ کے بعد بھی جاری ہے۔ سو بالکل باطل اور خلاف نصوص قطعیہ ہے۔

فصل دوم:- سورہ فاتحہ کے بعد آمین کہنے کے متعلق۔

فصل سوم:- نماز میں سورہ فاتحہ کے حکم کے متعلق۔ (واللہ ولی التوفیق)

فصل اول

اس میں چند بحثیں ہیں:-

بحث اول:- اس امر میں کہ وجوہات اجرائے نبوت کی جنت سے نبوت حضرت محمد ﷺ پر ختم ہو گئی ہے۔

معلوم ہو کہ اللہ رب العزت کا ایک نام حکیم ہے۔ اس کا ہر کام حکمت سے ہے، پر جب تک اس کی حکمت کا تقاضا رہا۔ وہ نبی بھیجتا رہا اور جب اس کو ختم کیا تو یہ بھی بتقاضائے حکمت کیا۔ اس کی چند وجوہات ہیں۔

اول یہ کہ قرآن حکیم کے مطالعہ سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ایک نبی کے بعد دوسرے نبی کے ہونے کی ضرورت یوں ہوتی رہی کہ کئی قومیں شرک و کفر اور انکار و عناد کی وجہ سے ہلاک کر دی جاتی رہیں اور تکمیل شریعت کا موقع نہ آیا۔ کیوں کہ جب لوگ ایمان ہی نہیں لائے تو احکام شریعت کس کو سکھائے جائیں۔ پس ایک نبی کے بعد دوسرا نبی برپا ہوتا رہا۔ چنانچہ یہ بات قرآن شریف کے بہت سے مقامات سے واضح ہے۔ مثلاً "سورہ اعراف" پ ۸۔ سورہ یونس" پ ۱۱۔ سورہ ہود" پ ۱۲۔ سورہ مومنون" پ ۱۸ اور سورہ شعراء" پ ۱۹ وغیرہ۔

ان سب میں سے آپ اس وقت سورہ مومنون، پ ۱۸ کو سامنے رکھ لیں اور نمبر وار ہمارے بیانات کو دیکھتے جائیں۔

اس کے رکوع نمبر ۲ میں پہلے اللہ تعالیٰ نے حضرت نوحؑ کا ذکر کیا اور ان کی قوم کی ہلاکت کے ذکر کے بعد فرمایا۔ ثم انشانا من بعدہم قرناً اخرین ○ فارسلنا فیہم رسولا منہم (مومنون، پ ۱۸)

”پھر ہم نے ان کے بعد اس زمانے کے اور لوگ پیدا کیے۔ پس ان میں بھی ایک رسول انہیں میں سے بھیجا۔“

قرآن شریف کے دیگر مقامات پر مذکور ہے کہ یہ قوم علوتھی اور ان کے پیغمبر حضرت ہودؑ تھے۔ اس کے بعد اس قوم کی بھی ہلاکت اور ان کے بعد اور لوگوں کو پیدا کرنے کے متعلق فرمایا۔

فاخذتہم الصیحة بالحق فجعلنہم غشاء فبعدا للقوم الظلمین ○ ثم انشانا من بعدہم قروناً اخرین ○

”سچ پکڑ لیا ان کو (عذاب الہی کی) سخت آواز نے، پس کر دیا ہم نے ان کو ڈاکرکٹ، لعنت ہے ایسے ظالم لوگوں پر، پھر پیدا کیے ہم نے بعد ان کے زمانے دیگر۔“
اس کے بعد ہر ہلاک شدہ امت کی ميعاد و اجل کی نسبت فرمایا۔ ما تسبق من امة اجلها وما يستأخرون ○

”نہیں آگے ہوتی کوئی امت اپنی اجل کے اور نہ پیچھے ہوتی ہے۔“
یعنی ہر امت اس ميعاد و اجل سے جو عالم تقدیر میں اس کے لیے مقرر ہے۔ نہ آگے ہلاک ہوتی ہے اور نہ اس کے بعد قائم رہتی ہے کیوں کہ وہ ایک غیر مبدل امر ہے۔

اس کے بعد رسولوں کے لگاتار بھیجتے رہنے اور ان کی امتوں کی ہلاکت کے ذکر میں فرمایا۔ ثم ارسلنا رسلنا تنزلاً، كلما جاء امة رسولها كذبوه فاتبعنا بعضهم بعضاً وجعلنہم احادیث فبعدا للقوم لا يؤمنون ○

”پھر بھیجے ہم نے رسول اپنے لگاتار، جب کبھی کسی امت کے پاس اس کا کوئی رسول آیا تو انہوں نے اسے جھٹلادیا۔ پس ہم بھی ایک کو دوسرے کے پیچھے بھیجتے رہے

اور کر دیا ان کو کہانیاں، تو (خدا کی) پھٹکار ہے ان لوگوں پر جو ایمان نہیں لاتے۔“
قرآن مجید کے دوسرے مقامات پر مذکور ہے کہ یہ رسول حضرت صالحؑ، حضرت
لوطؑ اور حضرت شعیبؑ تھے۔ جو حضرت موسیٰؑ سے بہت پہلے ہوئے اور ان کی قومیں بھی
بہ سبب تکذیب کے ہلاک کر دی گئیں۔

اس کے بعد حضرت موسیٰؑ و ہارونؑ کا ذکر کیا اور فرمایا:-

ثم ارسلنا موسیٰ و اخاه هرون بايتنا و سلطان مبين الى فرعون و ملائنه
فاستكبروا و كانوا قوماً عالين فقالوا انؤمن لبشرين مثلنا و قومهما لنا
عابدون ○

”پھر بھیجا ہم نے موسیٰؑ کو اور اس کے بھائی ہارونؑ کو اپنے نشانات اور کھلی سند
دے کر، فرعون اور اس کے ارکان (دربار) کی طرف، پس انہوں نے تکبر کیا اور وہ (اس
وقت بوجہ حکومت کے) غالی (دماغ و مرتبہ) لوگ (بنے ہوئے) تھے۔ پس کہنے لگے کہ آیا
ہم ان دو آدمیوں پر ایمان لائیں جو ہماری طرح کے ہیں اور ان کی قوم ہماری غلام (و
ماتحت) ہے۔“

یعنی حکومت کے نشے میں آکر اور حضرات موسیٰؑ اور ہارونؑ کو اپنی غلام و ماتحت
قوم کے افراد جان کر ان کے تابعدار بننے کو موجب عار جانا اور ایمان نہ لائے۔

اس کے بعد ان کے انجام بد کا ذکر کیا اور فرمایا۔ فکذبوہما فکانوا من
المہلکین پس جھٹلایا انہوں نے ان دونوں کو، پس ہو گئے وہ بھی (پہلوں کی طرح)
منہدم ہلاک شدگان کے۔“

فرعونی کافر تو تمام ہلاک کر دیئے گئے لیکن بنی اسرائیل جو موسیٰؑ کی قوم تھی۔ وہ
ایمان لے آئی اور ان کی ہدایت کے لیے اللہ تعالیٰ نے کتاب توریت جو حامل شریعت
تھی، نازل کی۔ لیکن وہ صرف بنی اسرائیل کے لیے تھی، ساری دنیا کے لیے نہیں تھی۔
اس لیے اس میں عالمگیر و دائمی شریعت نہ تھی بلکہ ایک محدود زمانے کے لیے تھی۔ چنانچہ
فرمایا:-

و لقد اتینا موسیٰ الکتب فلا تکن فی مریۃ من لقائہ و جعلنہ ہدی لبنی
اسرائیل ○ (سجده، پ ۲۱)

”اور بلاشبہ دی تھی ہم نے موسیٰ کو کتاب، پس نہ ہو تو اس کے ملنے سے دھوکے میں اور بنایا تھا ہم نے اس کو (سبب) ہدایت واسطے بنی اسرائیل کے۔“
اور دوسرے موقع پر حضرت موسیٰ کی نسبت فرمایا:-

و لقد ارسلنا موسیٰ بآیتنا ان اخرج قومک من الظلمت الی النور (ابراہیم پ ۱۳)

”اور بلاشبہ بھیجا ہم نے موسیٰ کو ساتھ اپنے نشانوں کے کہ نکال اپنی قوم کو اندھیروں سے روشنی کی طرف۔“

اسی طرح قرآن حکیم میں متعدد مقامات میں مصرح ہے کہ حضرت موسیٰ صرف اپنی قوم بنی اسرائیل اور فرعون اور فرعونوں کی طرف بھیجے گئے تھے۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ بھی صرف بنی اسرائیل کے لیے۔ اسی طرح حضور پاک ﷺ سے پہلے سب انبیاء کرام اپنی اپنی قوم کی طرف مبعوث کیے گئے اور ان کی تبلیغ کا زمانہ اور میدان محدود رہا۔ صرف نبی پاک ﷺ ایک ہیں جو تمام دنیا کے لیے مبعوث ہوئے۔ نہ تو آپ کی تبلیغ کسی خاص قوم سے مخصوص ہے اور نہ آپ کا زمانہ تبلیغ کسی خاص عہد تک محدود ہے۔ چنانچہ یہ امر کئی احادیث و کئی آیات میں بال تصریح مذکور ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری و صحیح مسلم میں ہے کہ آپ نے فرمایا:-

----- و کان النبی یبعث الی قومہ خاصۃ وبعثت الی الناس عامۃ متفق علیہ (مشکوٰۃ ص ۵۰۳)

”----- اور (مجھ سے پیشتر) ہر نبی ایک خاص قوم کی طرف مبعوث ہوتا رہا اور میں تمام لوگوں کی طرف مبعوث ہوا ہوں۔“
اور قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:-

وما ارسلنک الا کافۃ للناس بشیرا و نذیرا و لکن اکثر الناس لا یعلمون
○ (سبا پ ۲۲)

”اور نہیں بھیجا ہم نے تجھ کو مگر واسطے تمام لوگوں کے بشارت سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر لیکن اکثر (اس کی حقیقت) نہیں سمجھتے۔“
قل یا ایہا الناس انی رسول اللہ الیکم جمیعاً (اعراف پ ۹)

”(اے پیغمبر! ان سے) کو اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول (بن کر آیا) ہوں۔“

نتیجہ:- چونکہ حضرت محمد ﷺ ”رحمۃ للعالمین“ ہیں اور رحمت کی شان ہے کہ لوگ عام عذاب سے امان میں رہیں اور ایمان لا کر اس رحمت سے فیض و برکت حاصل کریں۔ اس لیے اللہ علیم و حکیم نے آنحضور ﷺ کے جذبات کو لوگوں کی تکذیب پر اس طریق پر مضطرب نہیں ہونے دیا کہ آپؐ کبھی بھی عام لوگوں کی ہلاکت کے لیے بددعا کریں۔ چنانچہ صحیح مسلم میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا:-

----- لکل نبی دعوة مستجابة فتعجل کل نبی دعوتہ وانی اختبات

دعوتی شفاعۃ لا متی یوم القیمۃ الحدیث (صحیح مسلم، جلد ۱، ص ۱۱۳)

”ہر نبی کی ایک دعا (بحسب وعدۃ الہی یقینی طور پر) مستجاب تھی۔ تو ہر نبی نے اپنی (وہ موعود) دعا مانگ لینے میں جلدی کی اور بے شک میں نے اپنی دعا کو قیامت کے دن اپنی امت کی شفاعت کرنے کے لیے ریزرو (محفوظ) رکھ چھوڑا ہے۔“

اسی رحمت عامہ کا تقاضا ہے کہ جب اہل طائف نے آپؐ سے نہایت درجے کی بدسلوکی کی تو باوجود اس کے کہ فرشتہ موکل جبال نے آپؐ سے کہا کہ اجازت ہو تو ان کو اخشبین پہاڑوں کے درمیان پیس ڈالا جائے لیکن آپؐ نے نہایت رحمانہ انداز سے فرمایا:-

بل ارجوان ینخرج اللہ من اصلاہم من یعبد اللہ وحده لا یشرک بہ شیئاً۔
متفق علیہ (مشکوٰۃ، ص ۵۱۵)

”نہیں بلکہ میں امید رکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کی پشتوں سے ایسے فرزند پیدا کرے گا۔ جو صرف اکیلے اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں گے (اور) اس کے ساتھ کسی چیز کو بھی شریک نہیں گردانیں گے۔“

اللہ اللہ! کتنا حوصلہ اور کتنی دور کی نظر ہے۔

غرض ایک طرف تو اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے حبیب اکرم کو رحمتہ للعالمین ﷺ بنایا اور آپؐ کو حوصلہ بھی کمال و رجبے کا عنایت فرمایا اور دوسری طرف سعادت مندوں کے دل آپؐ کی طرف جذب کر دیئے اور ورایت الناس یدخلون فی دین

اللہ افواجاً ○ (نصر، پ ۳۰) کی بشارت سنا کر چند سالوں میں ملک عرب کو شرک و کفر اور فسق و فجور کی گندگی سے پاک صاف کر کے شان و یزکیہم ظاہر کر دی۔ اسی لیے آپ کے وقت میں متاصل (بیخ کن) عذاب نہ آیا اور آپ کو اپنے مومنین میں تعلیم شریعت کا پورا موقع مل گیا۔ (اللہم صل وسلم علی نبیک نبی الرحمة)

پس اس وجہ سے تو سرور کائنات ﷺ کے بعد کسی نبی کے پیدا ہونے کی ضرورت نہ رہی۔ چنانچہ اللہ رب العزت نے آپ کی اس دنیوی حیات طیبہ کے آخری سال میں حجتہ الوداع میں سوا لاکھ آدمیوں کی جمعیت میں آپ پر یہ آیت اتاری۔ الیوم اکملت لکم دینکم (مائدہ، پ ۶) ”آج (اس عہد محمدی میں) میں نے تمہارے لیے تمہارا دین کامل کر دیا۔“

اور ظاہر ہے کہ کوئی شے جب کمال کے درجے پر پہنچ جائے تو بعد ازاں اس کے لیے ترقی کا کوئی درجہ باقی نہیں رہتا۔ اسی لیے چودھویں رات کے چاند کو کہ اس رات کو چاند اپنی انتہائی ترقی پر ہوتا ہے، بدر کمال کہتے ہیں۔ انگریزی میں بھی فل مون (FULL MOON) اور ہندی میں پورن ہاشی کہتے ہیں۔ غرض ہر زبان میں اسے کمال کی صفت سے پکارتے ہیں۔ پس جب دین کمال ہو چکا اور اس میں کوئی کسر باقی نہ رہی تو اب کوئی نیا پیغمبر اس غرض کے لیے پیدا نہیں ہو سکتا۔

دوسری وجہ:- ایک نبی کے بعد دوسرا نبی پیدا ہوتے رہنے کی یہ ہے کہ سابقہ زمانوں میں دنیا کے مختلف علاقوں اور مختلف قوموں کے میل ملاپ اور ان کے باہمی تعلقات اور ایک ملک سے دوسرے ملک میں سفر کرنے کے وسائل اور ایک زبان سے دوسری زبان میں تبلیغ کے ذرائع ایسے نہ تھے۔ جیسے حضور پاک ﷺ کے عہد نبوت میں دیکھنے میں آتے ہیں۔ اس لیے اللہ تبارک و تعالیٰ کی حکمت نے یہ چاہا کہ دنیا کی ہر مستقل بولی والی امت میں ایک الگ رسول اسی قوم اور اسی زبان کا مبعوث کرے۔ چنانچہ فرمایا:-

☆ ولقد بعثنا فی کل امة رسولا ان اعبدوا اللہ واجتنبوا الطاغوت (نحل، پ ۱۳)

”اور بلاشبہ ہم نے مبعوث کیا ہر امت میں رسول کہ عبادت کرو اللہ کی اور پرہیز کرو طاغوت سے۔“

☆ انا ارسلناک بالحق بشیراً و نذیراً، و ان من امة الا خلافيها نذیر ○
(فاطر، پ ۲۲)

”(اے پیغمبر!) بے شک ہم نے بھیجا تجھ کو ساتھ حق کے بشیر اور نذیر بنا کر اور
نہیں ہوئی کوئی امت مگر گزرا اس میں ایک ڈرانے والا۔“

☆ و ما ارسلنا من رسول الا بلسان قومہ لیبین لهم (ابراہیم، پ ۱۳)
”اور نہیں بھیجا ہم نے کوئی رسول مگر اس کی قوم کی زبان میں تاکہ کھول کر بیان
کرے واسطے ان کے۔“

لیکن آنحضرت ﷺ کی نسبت اللہ تعالیٰ کی حکمت اس صورت میں جلوہ گر ہوئی
کہ ادھر آپ کو تمام زمین کی قوموں کے لیے رسول مبعوث فرمایا اور ادھر آپ کی تبلیغ
کے لیے ایسے اسباب کر دیئے کہ تمام دنیا کے ممالک کے باہمی تعلقات و ارتباطات جوڑ
دیئے۔ وسائل سفر اور ذرائع خط و کتابت آسان کر دیئے اور دنیا کو ایسی صورت میں کر دیا
کہ اگر ہم تمام براعظموں کو ملا کر ایک ملک قرار دیں اور ان کے کثیر التعداد ملکوں کو
اس ملک کے مختلف شہر قرار دیں تو بے جا نہ ہوگا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ آنحضور ﷺ کو
شاہی اقتدار بخش کر آپ کی زبان عربی کو اس سرعت سے دنیا پر پھیلا دیا کہ ایک صدی
کے اندر وہ نصف معلوم دنیا میں رائج ہو گئی اور یہ بات کسی سابقہ نبی کو عطا نہیں ہوئی۔
یہ حضور پاک ﷺ کے خواص خاصہ میں سے ہے اور یہ بشارت وعدہ ولیمکنن لهم
دينهم الذي ارتضى لهم (نور، پ ۱۸) کے ضمن میں سنادی گئی تھی۔ چنانچہ اسی عرصے
میں آپ کی تبلیغ دنیا کے ہر حصے میں جا پہنچی اور آپ کی یہ پیشین گوئی کہ دنیا میں کوئی گھر
اینٹ گارے کا یا اون پارچہ کا باقی نہ رہے گا کہ وہاں کلمہ اسلام نہ پہنچ پائے۔ چاہے کوئی
اسے عزت سے قبول کر کے عزت پائے اور چاہے ذلت سے اس کی فرمانبرداری
(حکومت) کو قبول کرے۔ (مکھوۃ) اسی معنی میں ہمارے شہر کے فخر ڈاکٹر سر محمد اقبال
صاحب نے کہا ہے۔

مغرب کی وادیوں میں گونجی ازاں ہماری
تھمتا نہ تھا کسی سے میل رواں ہمارا

نتیجہ:- پس اس ضرورت کے لیے بھی کہ دنیا کا کوئی گوشہ دین حق کی آواز سے خالی رہ

گیا ہے۔ کسی جدید نبی کی ضرورت نہیں۔

لطیفہ:- لطف یہ ہے کہ مرزا صاحب قادیانی بقول خود ہندوستان میں مبعوث ہوئے۔ جہاں اللہ تعالیٰ کے فضل سے سینکڑوں علمائے محمدیہ سنت نبویہ پر قائم ہو کر دین حق کے پہنچانے والے موجود ہیں اور وہ شریعت کے علم میں مرزا صاحب سے بدرجہا فائق ہیں اور جس میں مسلمانوں کی تعداد تمام دنیا کے ممالک سے زیادہ ہے۔

پھر لطف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدیم سنت کے برخلاف مرزا صاحب کو اس ملک کی زبان میں وحی نہیں ہوتی بلکہ عربی زبان میں اور اکثر اس میں قرآن شریف کی آیات ہوتی ہیں یا انہیں قدرے تغیر کر کے بنالیا جاتا ہے۔

پھر لطف یہ ہے کہ مرزا صاحب کی اس وحی کا بیشتر حصہ قرآن شریف کی نصوص کے خلاف ہوتا ہے۔ ایسے حالات میں مرزا صاحب کی نبوت بالکل بے معنی اور مضحکہ اطفال یا فریب جمال ہے اور بس۔

تیسری وجہ:- پہلے زمانوں میں سلسلہ نبوت کے جاری رکھنے کی یہ تھی کہ درازی زمانہ پر عام لوگوں کی غفلت و بے پرواہی اور مطلب پرست علماء و مشائخ کی خود غرضیوں کے سبب پچھلی آسمانی کتابیں اور آثار انبیاء متروک ہو کر محفوظ نہ رہتے رہے اور ان کی بجائے اقوال الرجال، رائے و قیاس باطل اور بے سند سنی سنائی باتوں کی پیروی رائج ہو جاتی رہی۔ جس کی وجہ سے تحریف لفظی و معنوی، وضع مسائل افتراء علی اللہ اور اختراع بدعات سب کچھ ہوتا رہا اور ایسی مختلف فرقہ بندیاں ہو جاتی رہیں اور امتیازی جماعتیں بن جاتی رہیں۔ کہ ہر فرقے کے نزدیک آسمانی کتاب کا نسخہ الگ قرار پا جاتا رہا اور دین حق اور احکام خداوندی اور سنن انبیاء کرامؑ کے معلوم کرنے کی کوئی صورت نہ رہتی رہی۔

یہ امور جو ہم نے مجملہ "ذکر کئے ہیں۔ یہود و نصاریٰ کے ذکر میں قرآن کریم میں بکثرت وارد ہیں اور صورت واقعی بھی یہی ہے اور ان کی کتابوں اور فرقوں کا حال ابھی تک ایسا ہی ہے۔ جب کتاب اللہ محرف ہو گئی، سنن انبیاء کا رواج جاتا رہا اور ان کے بجائے لوگوں کی تصانیف اور تاریخی کتابوں پر قناعت ہونے لگی تو بعد کی نسلیں انہی کو آسمانی کتابیں جاننے لگیں۔

ویدوں کا یہی حال ہے، توریت کی یہی صورت ہے، انجیل بھی اسی رنگ میں ہے۔ اس بات کی تصدیق کے لیے خود ان کتابوں کی اندرونی شادتوں کے ہوتے کسی بیرونی ثبوت کی ضرورت نہیں ہے۔

دیگر یہ کہ ہر قوم پر عروج و زوال کے دو دن آتے رہے ہیں۔ زوال حکومت کے وقت مخالف و غالب حکومت کی طرف سے عام قتل و غارت گری میں مذہبی علماء و کتب پر بالخصوص ہاتھ صاف ہوتا رہا ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے زمانے سے بہت پہلے بدھوں اور جینیوں کے عروج کے زمانوں میں تقریباً ”چھ سو سال تک ویدوں اور ویدوں کے جاننے والے پنڈتوں پر یہ آفت رہی کہ پنڈتوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر قتل کیا گیا اور وید جن جن کر نذر آتش کیے گئے۔

یہ برے دن یہودیوں پر بھی آئے کہ یہودی اہل قتل کر دیئے گئے اور توریت کے تمام نسخے جلا دیئے گئے۔ پھر یہ مصیبت عیسائیوں پر بھی آئی۔ چنانچہ اسلام سے پیشتر تمام عیسائی پادری تلاش کر کر کے تہ تیغ کر دیئے گئے اور انجیل کے کل نسخے جلا کر خاک سیاہ کر دیئے گئے۔

اب سوال یہ ہے کہ جب آسمانی کتابیں جلا دی گئیں اور ان کتابوں کے جاننے والے علماء قتل کر دیئے گئے اور اس آفت کا اثر کتنی کے چند سال نہیں بلکہ صدہا سال تک رہا۔ تو جو کتابیں ان واقعات کے صدہا سال بعد پرانی کتابوں کے نام سے ہمارے سامنے رکھی جائیں۔ ان کی بابت اس امر کی تصدیق کے لیے کہ یہ وہی کتابیں ہیں۔ جو اتنے سو سال قبل جلا دی گئی تھیں۔ ہمارے پاس کیا ضمانت ہے؟

دفعہ دخل:- شاید آپ جلدی میں کہہ انھیں کہ فتنہ تاتار اور سقوط بغداد کے وقت اسلامی علماء اور اسلامی کتب خانہ پر بھی تو یہی آفت آئی تو اب مسلمان کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ یہ قرآن شریف وہی ہے جو تاتاریوں نے بغداد کے کتب خانہ سمیت جلا دیا تھا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ جل جلالہ کے فضل سے اسلام پر اگلی قوموں کے سے برے دن نازل نہیں ہوئے۔ اس کی تفصیل یوں ہے کہ ہندوؤں کی تباہی کے وقت ہندو مذہب ہندوستان سے باہر رائج نہیں تھا۔ اسی طرح یہودیوں اور عیسائیوں کے زوال کے وقت توریت و انجیل کی اشاعت فلسطین اور اس کے قریب کے علاقوں سے باہر نہ

تھی۔ جو کچھ تھا وہ انہی علاقوں میں تھا۔ جن پر تباہی و بربادی آئی لیکن سقوط بغداد کے وقت قرآن مجید کی حکومت تمام معلوم دنیا کے طول و عرض میں قائم ہو چکی تھی اور اس کی اشاعت اسپین سے ہندوستان و چین تک پہنچ چکی تھی اور اس وقت کی متمدن و معلوم دنیا کے مشرق و مغرب کی یہی حدود تھیں۔ تو اگر عیسائیوں نے اسپین کے علماء اور ترکوں نے (اپنی جاہلیت کے زمانے میں) بغداد کے علماء قتل کر دیئے اور ان کے کتب خانے جلا دیئے تو اس سے تمام دنیا کے علماء تو قتل نہیں ہو گئے تھے اور تمام دنیا کے کتب خانے جل نہیں گئے تھے۔

وگیر یہ کہ اللہ رب العزت نے قرآن شریف کی حفاظت کا ذمہ خود لے رکھا ہے۔ چنانچہ فرمایا۔ انا نحن نزلنا الذکر وانا له لحفظون ○ (الحجر، پ ۱۳)
”بے شک یہ نصیحت نامہ ہم ہی نے اتارا ہے اور ہم خود ہی اس کے محافظ (و نگہبان) ہیں۔“

نیز فرمایا۔ وانه لکتاب عزیز لا یاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ
تنزیل من حکیم حمید ○ (م سجدہ، پ ۲۳)
”بے شک یہ کتاب نہایت زبردست ہے۔ اس میں باطل کا دخل نہیں۔ نہ اس موجودہ وقت میں اور نہ اس سے بعد“ (یہ) حکمت والے، ستائش والے (خدا) کی نازل کردہ ہے۔“

اور یہ ذمہ حفاظت روز اول سے ہے کہ قرآن شریف پہلے اپنے امی نبی اکرم ﷺ کے پاک سینے میں حفظ کروایا اور پھر آپ کے انوار سینہ کو منعکس کر کے آپ کے امی صحابہ کرامؓ کے سینوں میں پہنچایا۔ چنانچہ فرمایا۔ ان علینا جمعہ و قرآنہ ○ (التقد، پ ۲۹) ”(اے پیغمبر!) اس (قرآن) کو (تمہارے سینے) میں جمع کرنا اور (وقت پر صحیح طور پر) اس کا پڑھنا یعنی پڑھنے کی توفیق دینا ہمارا ذمہ ہے۔“

نیز امی قوم کی نسبت فرمایا۔ هو الذی بعث فی الامیین رسولاً منهم
یتلوا علیہم آیاتہ ویزکیہم وعلّمہم الکتب والحکمۃ وان کانوا من قبل لفی ضلل مبین ○ (جمہ، پ ۲۸)

”(پاک و بے عیب اللہ وہ ہے) جس نے امی قوم میں انہی میں کا ایک عظیم

الشان رسول بھیجا، جو ان پر اس کی آیات پڑھتا ہے اور ان کو ظاہر و باطن کی پلیدیوں سے پاک کرتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت (طریق عمل) بھی سکھاتا ہے۔ بے شک یہ لوگ اس سے پیشتر صریح گمراہی میں تھے۔“

صحابہ کرامؓ کے بعد اللہ رب العزت نے اس حفاظت کو اتنا عام اور ایسا محکم کر دیا کہ دنیا کی ساری قوموں کے رواج سے جدا اور ان کے دستور سے الگ ہر زمانہ میں ہر طبقہ کے مسلمانوں کے دلوں میں حفظ قرآن کا ایک ولولہ پیدا کر دیا کہ شاید مسلمانوں میں اس شوق کے برابر کوئی دوسرا علمی شوق کم ہو گا۔

امیر و غریب، بادشاہ و رعیت، تاجر و پیشہ ور، کاشت کار و دستکار، آقا و خدمت گار، مزدور و طالب علم، علماء و ناخواندہ، چھوٹے و بڑے، بیٹا و ناپیتا، اولیاء اللہ اور مجھ سے گناہ گار۔ غرض جس جس لحاظ سے بھی آپ مسلمانوں میں افراد انسانیہ کی تقسیمیں کرتے جائیں گے۔ ہر ہر قسم میں حفاظ قرآن حکیم ہر زمانہ میں اور ہر ملک میں بکثرت ملیں گے۔ اتنے کہ آپ شمار کرتے کرتے تھک جائیں گے اور ہم کہیں گے کہ اور گنو تو آپ اتنا کر گنتی چھوڑ دیں گے اور کہہ دیں گے بھائی ہم سے یہ ”خدائی فوج“ گنی نہیں جاتی۔ پھر ہم اس کے مناسب حال یہ آیت پڑھیں گے۔ ثم ارجع البصر کرتین ینقلب الیک البصر خاسئاً ۝ وہو حسیر ۝ (الملک، پ ۲۹)

قرآن حکیم کا حفظ تو مسلمانوں میں ایک نہایت سل بات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا۔ ولقد یسرنا القرآن للذکر فهل من مدکر ۝ (القر، پ ۲۷)

”بے شک ہم نے قرآن کریم کو یاد کے لیے بہت آسان کیا ہے تو کیا کوئی یاد کرنے والا ہے۔“

قرآن حکیم کے علاوہ بھی اللہ رب العزت نے مسلمانوں کے شوق حفظ اور قوت حافظہ میں وہ برکت و ہمت بخشی کہ اس کی نظیر دنیا کی کسی قوم میں نہیں پائی گئی۔ نہ زمانہ سابق میں اور نہ حال میں۔

وہ یہ کہ انہوں نے اپنے پیغمبر علیہ السلام کی سنت و سیرت کو محفوظ رکھنے کے

۱۰۶ بعض مفسرین نے اس آیت میں ذکر سے اسے زبانی یاد کرنا (حفظ کرنا) مراد بھی لیا ہے۔

لیے بھی اسی قوت حافظہ سے کام لیا۔ چنانچہ اللہ رب العزت نے اس امر کے پورا کرنے کے لیے گروہ محدثین کو پیدا کر دیا۔ ان کے دلوں میں شوق، ان کے ارادوں میں بلندی اور ان کی ہمتوں میں استقلال اور ان کی قوت حافظہ میں برکت بخشی کہ انہوں نے فقر و فاقہ کی مصیبت کو اور دشت و جبل کے سفروں کی صعوبت کو نہایت شوق و استقلال سے برداشت کر کے اپنے ہادی اکبر ﷺ کی روایات کو پہلے اپنے سینوں میں جمع کیا اور پھر من و عن جس طرح سنا تھا۔ ٹھیک اسی طرح بلا کم و کاست اور بغیر تغیر و تبدل کے کتابوں میں جمع کر کے اپنے بعد کی نسلوں کے لیے محفوظ کر دیا اور سرکارِ دو عالم ﷺ کی دعا کے مصداق ہو کر دنیا اور عاقبت کی سعادت حاصل کر لی۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:-

نضر اللہ عبداً سمع مقالتي فحفظها ووعاها واداءها (الحديث) (مشکوٰۃ، ص ۲۷)

”بارونق اور تروتازہ رکھے اللہ تعالیٰ (اپنے) اس بندے کا چہرہ، جس نے میرا کلام (ایمان و اعتقاد سے) سنا۔ پس اسے حفظ کر لیا اور خوب نگاہ رکھا اور پھر اسے ادا کیا۔ جس طرح کہ اسے سنا۔“

حفظ حدیث کا یہ دستور صدیوں تک قائم رہا۔ سقوط بغداد و سپین سے پہلے بھی اور پیچھے بھی۔ سقوط بغداد ساتویں صدی ہجری کے نصف کے قریب ہوا اور خاتمۃ الحفاظ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ ۸۵۲ھ میں فوت ہوئے۔ آپ نے ایک ضخیم کتاب بنام الدرر الکامنہ فی اعیان المائۃ الثمانہ صرف آٹھویں صدی کے علمائے اسلام کے حالات میں لکھی ہے۔ یہ کتاب بہ ترتیب حروفِ معجم ہے۔ اس کے خاتمہ پر مصنف نے لکھا ہے۔ فرغ منہ فی شہور ۸۳۰ھ (کشف الظنون) اس کتاب میں بہت سے حفاظ حدیث کا ذکر ہے۔ جو آٹھویں صدی میں ہوئے اور جو اس سے پیشتر ہوئے، ان کی گنتی خدا جانے۔ و ما یعلم جنود ربک الا هو (مدثر، پ ۲۹)

۷۔ دوسری روایت میں فیبلغہ کما سمعہ کے الفاظ بھی وارد ہیں، جن کا لحاظ کرتے ہوئے

ترجمے میں یہ الفاظ بڑھادیئے ہیں۔ (عن ابن مسعود، مشکوٰۃ، ص ۲۷)

نتیجہ:- پس جب قرآن حکیم بھی حرفاً "حفوظ ہے اور پیغمبر قرآن کا طریق عمل بلکہ آپ کے صحابہ کرام کے آثار بھی من و عن بلا کم و کاست مکتوب و مسطور ہیں تو اس امر کی ضرورت کہ خدا کی وحی اور اس کے پیغمبر کی سنت کو قائم کر کے از سر نو شریعت مطہرہ کو جاری کیا جائے، ہرگز نہ رہی۔ (والحمد للہ)

الغرض پہلے زمانوں میں سلسلہ نبوت کے جاری رہنے کی جس قدر ضرورتیں تھیں۔ وہ سرور کائنات ﷺ کی مبارک آمد پر سب پوری ہو چکی ہیں۔ اس لیے اللہ جل شانہ نے اپنے حبیب پاک ﷺ کو سارے کمالات کا صاحب و جامع بنا کر اس سلسلے کو آپ پر ختم کر دیا اور اجرائے نبوت پر مہر لگا دی۔ چنانچہ فرمایا:-

ماکان محمد اباً احد من رجالکم و لکن رسول اللہ و خاتم النبیین و کان اللہ بکل شیئی علیماً ○ (احزاب، پ ۲۲)

”محمد ﷺ تم میں سے کسی بالغ مرد کے باپ نہیں ہیں۔ ہاں اللہ کے رسول ہیں اور رسول بھی ایسے کہ خاتم النبیین ہیں اور اللہ تعالیٰ ہر شے (اور ہر ضرورت) سے خوب واقف ہے۔“

یعنی جانتا ہے کہ اب ان کے بعد نبوت جاری رکھنے کی ضرورت نہیں ہے اور نہ کوئی لائق نبوت پیدا کیا جائے گا۔

دوسری بحث:- ختم نبوت کی خاص و لیلوں کے بیان میں:-

سب سے پہلی دلیل آیت مذکورہ بالا ہے جو سرکار دو عالم ﷺ پر نبوت کے ختم ہو جانے میں نص قطعی ہے۔ اس کی توضیح سے پہلے اس کا شان نزول بھی جاننا چاہیے کہ اسے بھی ختم نبوت سے ایک گونہ تعلق ہے۔

شان نزول:- خاتم النبیین، رحمۃ للعالمین ﷺ نے سن ۵ھ میں اپنی پھوپھی کی بیٹی حضرت زینبؓ سے نکاح کیا۔ اس سے پہلے وہ حضرت زیدؓ کے نکاح میں تھیں۔ جو رحمت دو عالم ﷺ کا آزاد کردہ غلام اور متبنی تھا۔ حضرت زینبؓ اور حضرت زیدؓ میں موافقت نہ بن سکی تو حضرت زیدؓ نے ان کو طلاق دے دی۔

ملکی رسم کی رو سے متبنی کو صلیبی بیٹے کی طرح جانا جاتا تھا اور اس کی وجہ سے

اصلی وارثوں کے حقوق پر اثر پڑتا تھا اور مصنوعی رشتے کو قدرتی رشتے پر ترجیح دی جاتی تھی یا اسے اس کے برابر سمجھا جاتا تھا۔ لہذا اس کو منسوخ کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے رسول پاک ﷺ کو حکم دیا کہ آپ زینب سے نکاح کر لیں۔ چنانچہ رسول اکرم ﷺ نے نکاح کر لیا۔ مخالفین نے اعتراض کیا کہ آپ نے اپنے بیٹے (متبنی) کی مطلقہ سے نکاح کر لیا ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ محمد ﷺ تم میں سے کسی بالغ مرد کے باپ نہیں ہیں۔ ہاں اللہ کے رسول اور خاتم الانبیاء ہیں اور اللہ سب کچھ جانتا ہے۔ پس اس بناء پر اعتراض بالکل لایعنی ہے۔ ہاں آپ کو رسالت کا ایک ایسا منصب حاصل ہے جو اس رشتہ پداری سے بہت اونچا ہے لیکن اس کی وجہ سے امت کی عورتوں سے آپ کا نکاح منع نہیں ہو سکتا۔

اب سوال یہ ہے جواب تو اسی قدر کافی تھا۔ اس کے ساتھ مسئلہ ختم نبوت کی کیا ضرورت کہ اللہ رب العزت نے اسے بھی ذکر کر دیا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس نکاح میں سب سے بڑی رکاوٹ قوم کی طعن و عار تھی کہ یہ نکاح سالہا سال کی رسم کے خلاف تھا۔ دشمن تو دشمن رہے، معتقد بھی کہہ سکتے تھے کہ حضور پاک ﷺ کی پوزیشن کو معترضین کے اعتراضوں کا نشانہ بنانے کی کیا ضرورت ہے؟

سو اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا کہ خلاف شرع رسوم کی اصلاح کا یہی وقت ہے۔ تکمیل شریعت کا یہی عہد ہے۔ پچھلی شریعتوں کے بعض احکام کی منسوخی کا یہی زمانہ ہے۔ یہ شریعت آخری و ابدی ہے جو فتح و ترمیم کی گنجائش اور تحریف و تبدیل کے اندیشے سے محفوظ ہے۔ کیوں کہ یہ رسول خاتم النبیین ہے۔ اس کی اصلاح کو کسی اور وقت پر ڈالنا اس کی شان خاتمت کے خلاف ہے۔ لہذا اس اصلاح کا یہی زمانہ ہے اور یہ کام اللہ تعالیٰ کے علم میں پہلے ہی سے اسی طرح مقرر تھا۔ چنانچہ اس سے قبل فرمایا۔ وکان امر اللہ قدراً مقدوراً یعنی اسے نبی! یہ سارا معاملہ یعنی زید کا یہاں آکر فروخت ہونا اور تمہارا اس کو متبنی بنانا اور پھر زینب سے نکاح کرنا اور پھر اس کا اسے طلاق دے دینا اور پھر زینب کا تمہارے نکاح میں آنا سب تقدیری معاملے ہیں کہ اللہ جل شانہ نے ان کو اپنے علم ازل میں اسی طرح مقدر کیا تھا کہ یہ سب کچھ یوں یوں ہو گا اور یہ سب کچھ اسی رسم کی اصلاح کے لیے تھا۔

پھر فرمایا۔ وکان اللہ بکل شئی علیما یعنی اللہ تعالیٰ کو سب باتوں کا علم ہے۔ اس بات کا بھی کہ اس نبی کے بعد کوئی شخص قابل نبوت پیدا نہیں کیا جائے گا اور اس بات کا بھی کہ اگلے زمانوں میں کن مصلحتوں اور ضرورتوں کی بناء پر نبوت جاری رکھی گئی اور اس بات کا بھی کہ اب وہ ضرورتیں کلیہً رفع ہو گئی ہیں۔ لہذا نبوت بالکل بند کر دی گئی ہے یا ان الفاظ میں سمجھئے کہ اللہ رب العزت کا علم محیط کل ہے۔ زمانہ گذشتہ و حال کے موجودات اور زمانہ مستقبل میں موجود ہونے والی سب چیزوں اور امروں پر حاوی ہے تو اس احاطہ کلی میں یہ بات بھی داخل ہے کہ ختم نبوت کی کیا وجوہات ہیں اور یہ بھی کہ آگے کو کوئی قابل نبوت پیدا نہیں ہوگا۔ پس اس نے اپنی حکمت بالغہ اور علم کلی سے آگے کے لیے نبوت کا دروازہ بالکل بند کر دیا۔ (وجوہات بحث اول میں مذکور ہو چکی ہیں)

آیت بالا میں حق تعالیٰ نے بالکل کھلے الفاظ میں فرما دیا کہ محمد ﷺ خاتم الانبیاء ہیں۔ اب خاتم کے معنی کے لیے ذیل کی شادتیں ملاحظہ فرمائیں۔

۱۔ حضرت شاہ رفیع الدین صاحبؒ اس کا ترجمہ یوں کرتے ہیں:-

”نہیں ہے محمد ﷺ باپ کسی کا مرووں تمہارے میں سے و لیکن پیغمبر اللہ کا ہے اور ختم کرنے والا نبیوں کا اور ہے اللہ ہر چیز کا جاننے والا۔“

۲۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ اپنے ترجمہ قرآن میں اس آیت پر یہ حاشیہ ارقام فرماتے ہیں۔ یعنی بعد ازوے پیچ پیغمبر نباشد (ص ۵۶۶)

”تمام معقولی و معقولی اور ادبی و صوفیانہ تفاسیر میں اس آیت کے ذیل میں لکھا ہے کہ نبوت حضرت محمد ﷺ پر ختم ہو گئی اور آپؐ سلسلہ انبیاء کے آخری نبی اور فرد اکمل ہیں۔ اس میں کسی امام عالم سنت نے کبھی بھی اختلاف نہیں کیا۔“

۳۔ چنانچہ امام سیوطیؒ تفسیر اکلیل میں فرماتے ہیں۔ ”قوله و خاتم النبیین فیہ انه لا نبی بعدہ و انه من ادعی النبوة بعدہ قطع بکذبہ یعنی قول خداوندی و خاتم النبیین اس امر کی دلیل ہے کہ رسول اکرم ﷺ کے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا اور نیز اس امر کی دلیل ہے کہ جو شخص آپؐ کے بعد نبوت کا دعویٰ کرے، وہ قطعی طور پر جھوٹا ہے۔“

- ۴۔ تفسیر جامع البیان میں ہے ”وخاتم النبیین اخرهم“ ”یعنی آخری نبی“
- ۵۔ امام زعزریؒ جو لغت و علم فصاحت و بلاغت کے متبوع امام ہیں۔ تفسیر کشاف میں خاتم کے معنی آخری نبی کرتے ہیں۔ چنانچہ اس کے متعلق سوال و جواب کے طور پر فرماتے ہیں:-

”(فان قلت) کیف كان اخر الانبياء وعيسى ينزل في اخر الزمان (قلت) معنی کونہ اخر الانبياء انه لا ينبا احد بعده وعيسى ممن نبى قبله یعنی اگر تو کہے کہ آنحضرت ﷺ آخر الانبياء کس طرح ہو سکتے ہیں۔ حالانکہ حضرت عیسیٰؑ آخری زمانے میں نازل ہوں گے۔ تو میں اس کے جواب میں کہتا ہوں کہ آنحضور ﷺ کے آخر الانبياء ہونے کے یہ معنی ہیں کہ کوئی شخص آپؐ کے بعد نبی نہیں بنایا جائے گا اور حضرت عیسیٰؑ ان میں سے ہیں جو آپؐ سے پیشتر نبی بنائے جا چکے ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ علامہ زعزریؒ خاتم کے معنی آخری کرتے ہیں۔

اسی طرح باقی تفسیروں میں مثلاً ”تفسیر ابی العود“ ”تفسیر سراج منیر“ تفسیر فتح البیان، تفسیر بیضاوی، تفسیر مدارک اور تفسیر معالم۔ ان سب میں خاتم النبیین کے معنی اخرهم لکھے ہیں اور تفسیر فیضی میں لکھا ہے۔ امدھم لارسول وراہ۔ یعنی آپؐ آخری نبی ہیں اور آپؐ کے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔

نوٹ:- علامہ فیضی نے خاتم کے معنی امد کیے ہیں۔ اسی لیے کہ انہوں نے اپنی اس تفسیر سواطع الالہام میں التزام کیا ہے کہ اس میں نقطہ دار حرف کوئی نہیں لایا جائے گا اور امد اور آخر کے معنی ایک ہی ہیں۔

اسی طرح تفسیر ابن کثیر میں ہے۔ فہذہ الایۃ نص فی انہ لا نبی بعدہ یعنی یہ آیت اس بارے میں نص قطعی ہے کہ حضور پاک ﷺ کے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا اور تفسیر فتح البیان میں تحقیق لغوی کے طور پر محاورہ لکھا ہے۔ وخاتم الشئی اخرہ

اسی طرح کتب لغات القرآن یعنی وہ کتابیں جن میں قرآن شریف کے مفرد الفاظ کے معانی کتب لغت کی طرح حل کر کے لکھے ہیں۔ ان میں بھی اس کے معنی آخری اور تمام کنندہ لکھے ہیں۔ چنانچہ نزہۃ القلوب میں لکھا ہے۔ (خاتم النبیین) آخر

النبيين[ؑ] (جلد اول، ص ۲۴۷)

اسی طرح امام راغبؒ مفردات القرآن میں فرماتے ہیں۔ و خاتم النبیین لانہ ختم النبوة ای لمہا بمجینہ (ص ۱۴۲) یعنی رسول پاک ﷺ خاتم النبیین ہیں کہ آپؐ نے نبوت ختم کر دی۔ یعنی آپؐ نے آکر اسے پورا اور تمام کر دیا۔ یعنی آپؐ کے آنے سے نبوت ختم اور پوری ہو گئی کہ اب کسی دیگر نئے نبی کی کوئی ضرورت باقی نہ رہی۔

اسی طرح عام لغت کی کتابوں میں بھی خاتم کے معنی آخری لکھے ہیں۔

چنانچہ لسان العرب میں ہے۔ ختام القوم و خاتمہم اخرہم عن اللہیانی و محمد (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) خاتم الانبیاء (علیہ و علیہم السلام) ----- التہذیب و الخاتم (بکسر التاء) و الخاتم (بفتح التاء) من اسماء النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) و فی التنزیل العزیز۔ ماکان محمد اباحد من رجالکم و لکن رسول اللہ و خاتم النبیین ای اخرہم

یعنی ختام القوم اور خاتم القوم (بالکسر) اور خاتم القوم (بالفتح) ہر سہ کے معنی ہیں، قوم کا آخری شخص اور تہذیب میں ہے کہ محمد ﷺ انبیاء کے خاتم ہیں اور خاتم (بالکسر) اور خاتم (بالفتح) ہر دو نبی ﷺ کے نام ہیں اور قرآن شریف میں ہے۔ ماکان محمد اباحد من رجالکم الایفہ سو اس میں خاتم النبیین کے معنی ہیں آخری نبی۔

امام بغویؒ نے تفسیر معالم التنزیل میں اس آیت کے ذیل میں ایک مرفوع حدیث بھی نقل کی ہے، جو بخاری و مسلم کی روایت سے ہے۔ اس میں حضور پاک ﷺ نے اپنے پانچ اسماء (نام) بتائے ہیں۔ ایک ان میں سے عاقب ہے اور عاقب کی تفسیر اسی حدیث میں مذکور ہے۔

والعاقب الذی لانی نبی بعدہ یعنی عاقب وہ ہے جس کے بعد کوئی نبی نہیں۔ اور یہ تفسیر کسی راوی یا صحابی کی نہیں بلکہ خود رسول اکرم ﷺ کی اپنی زبان مبارک کی ہے۔ چنانچہ

۱۰۸ھ یہ کتاب تفسیر رحمانی مطبوعہ مصر ۱۳۹۵ھ کے حاشیہ پر چھپ چکی ہے۔ اس کے مؤلف

امام ابوبکر بن محمد عزیز بھستانی ہیں۔

حافظ ابن حجرؒ فتح الباری میں اس حدیث کے ضمن میں لکھتے ہیں:-

وقع فی رواية سفیان بن عیینة عند الترمذی وغیره بلفظ الذی لیس بعدی نبی (فتح الباری، مطبوعہ دہلی، ص ۳۱۳)

”امام ابو سفیان بن عیینہ کی روایت میں امام ترمذی وغیرہ کے نزدیک یہ الفاظ یوں ہیں۔ میں عاقب ہوں کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔“

اسی طرح مسند امام احمدؒ میں حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا۔ ان الرسالة والنبوة قد انقطعت فلا رسول بعدی ولا نبی۔ (مسند جلد ۱) ”رسالت اور نبوت منقطع ہو چکی ہے۔ پس میرے بعد کوئی رسول اور کوئی نبی نہیں ہوگا۔“

اسی طرح مشکوٰۃ شریف میں صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی روایت سے حدیث ہے۔ جس میں مذکور ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ قوم بنی اسرائیل کی سیاست (ملکی) ان کے انبیاء کے متعلق ہوتی تھی۔ ایک نبی فوت ہو جاتا تو اس کا خلیفہ بھی نبی ہوتا اور میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔ ہاں خلفاء ہوں گے اور وہ بہت ہوں گے۔ ”الحدیث“ (مشکوٰۃ، ص ۳۱۲)

اس کی توضیح یوں ہے کہ نبی اللہ کے متعلق دو باتیں ہوتی ہیں۔ تعلیم شریعت اور انتظام سیاست تو رسول کریم ﷺ نے بنی اسرائیل کا ذکر کر کے سمجھا دیا کہ ان میں تعلیم شریعت اور انتظام ملت ہر دو امر ان کے انبیاء کے متعلق ہوتے تھے۔ جب ایک فوت ہو جاتا تو اس کا خلیفہ بھی ان ہر دو کا جامع ہوتا۔ لیکن آپؐ نے اپنی بابت فرمایا کہ میرے بعد صرف خلافت بغیر نبوت کے ہوگی کیوں کہ میرے بعد کوئی بھی نبی ہونے والا نہیں۔ اسی لیے حضرات خلفائے راشدین اور ان کے بعد کے سب خلفاء صرف انتظام ملکی و ملی کے سپرد کار تھے۔ نہ ان میں سے کوئی واقعی نبی تھا اور نہ مدعی نبوت ہوا۔ اس کی تائید میں ذیل کی حدیث بھی ملاحظہ فرمائیے۔

صحیح بخاری شریف میں ہے کہ حضور کریم ﷺ غزوہ تبوک کے لیے نکلے تو

قاضی عیاضؒ نے بھی شفاء میں ان الفاظ کو بیغہ منکمل ذکر کیا ہے۔

حضرت علیؓ کو اپنے پیچھے خلیفہ بنایا۔ حضرت علیؓ نے (جماد میں جانے کے شوق کی وجہ سے) عرض کیا کہ آپؓ مجھے بچوں اور عورتوں میں چھوڑ کر جاتے ہیں۔ اس پر آپؓ نے حضرت علیؓ سے فرمایا۔ الا ترضیٰ ان تکون منی بمنزلہ ہرون من موسیٰ الا انه لیس نبی بعدی (بخاری، مصری جلد ۳، ص ۵۶)

”کیا تو راضی نہیں کہ تو مجھ سے وہ نسبت رکھے جو ہارونؑ کو موسیٰؑ سے تھی مگر یہ کہ میرے بعد نبی کوئی نہیں ہوگا۔“

اس کی توضیح یوں ہے کہ حضرت موسیٰؑ جب کوہ طور پر جانے لگے تو حضرت ہارونؑ کو قوم میں خلیفہ چھوڑ گئے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ہے:-

وقال موسیٰ لاحیہ ہرون اخلفنی فی قومی واصلح (اعراف، پ ۹)
”اور موسیٰؑ نے اپنے بھائی ہارونؑ سے کہا کہ خلیفہ بن میرا میرے پیچھے میری قوم میں اور ان کی اصلاح کرتا۔“

اسی طرح آنحضرت ﷺ جب سفر تہوک کو چلنے لگے تو اپنی غیر حاضری کی میعاد تک حضرت علیؓ کو اپنے پیچھے خلیفہ مقرر کر گئے لیکن چونکہ حضرت ہارونؑ نبی تھے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ ووهبنا له من رحمتنا اخاه هرون نبیاً ○ (مریم، پ ۱۶)
”ہم نے موسیٰؑ کو اپنی رحمت سے اس کا بھائی ہارونؑ نبی بنا کر بخشا۔“

اور چونکہ خاتم النبیین ﷺ کے بعد کوئی نبی ہونے والا نہیں تھا۔ اس لیے آپؓ نے اس خلافت کو حضرت ہارونؑ کی خلافت سے تشبیہ دیتے ہوئے دفع دغل مقدر کے طور پر فرمادیا کہ اے علیؓ! حضرت ہارونؑ کی طرح تو میرا خلیفہ تو ہو گا لیکن چونکہ میرے بعد نبی کوئی نہیں ہو سکے گا۔ اس لیے تیری خلافت بغیر نبوت کے ہوگی۔

ان ہر دو احادیث سے صاف ظاہر ہے کہ سرور کونین ﷺ کے بعد خلافت کا دروازہ تو کھلا ہے لیکن نبوت کا دروازہ بالکل مسدود ہے۔ آنحضور ﷺ کا بیان نہایت

ﷺ یہ خلافت دقتی و عارضی تھی، دائمی نہیں تھی۔ آنحضور ﷺ کی عادت تھی کہ غزوات اور دیگر سفروں کے وقت اپنے پیچھے شہر کے انتظام اور مسجد کی امامت کسی صحابی کے سپرد کر جاتے تھے۔

واضح و بلیغ ہوتا تھا۔ آپؐ نے ایک واضح مثال سے نہایت صاف طور پر سمجھا دیا کہ میں آخری نبی ہوں اور میرے بعد کسی شخص کے نبی بننے کی گنجائش باقی نہیں ہے۔

چنانچہ صحیح بخاری میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا۔ میری اور مجھ سے پہلے انبیاء کرامؑ کی مثال یہ ہے کہ کسی شخص نے ایک مکان بنایا ہو اور اسے نہایت خوب صورت و خوش وضع بنایا ہو۔ مگر ایک کونے میں ایک اینٹ کی جگہ (چھوڑ دی ہو) پس لوگ اس مکان کے گرد پھریں اور تعجب کریں اور کہیں کہ (یہاں پر) یہ اینٹ کیوں نہیں لگائی گئی۔ سرکارِ دو عالم ﷺ نے فرمایا کہ پس وہ (باقی رہی ہوئی) اینٹ میں ہوں اور میں خاتم النبیین ہوں۔ (صحیح بخاری، مصری، جلد ثانی ص ۱۷۳)

خصوصی نوٹ:- اس حدیث سے صاف ظاہر ہے کہ نبی اکرم ﷺ قصر نبوت کی آخری اینٹ ہیں۔ آپؐ کی تشریف آوری پر قصر نبوت مکمل ہو چکا ہے۔ اب کسی نئی اینٹ کی گنجائش باقی نہیں۔

دیگر یہ کہ امام بخاریؒ نے اس حدیث کو رسول پاک ﷺ کے حالات خصوصی میں ذکر کیا ہے اور اس پر باب یوں باندھا ہے۔ باب خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم اور علم حدیث کے واقف اصحاب جانتے ہیں کہ امام بخاری کے باب باندھنے کی بھی کیا قدر و منزلت ہے۔

حضور پاک ﷺ نے مسئلہ ختم نبوت کو بالکل صاف کر دیا ہے اور کسی پہلو سے بھی اس پر اندھیرا نہیں رہنے دیا۔ چنانچہ آپؐ نے اپنے بعد کے ہر مدعی نبوت کو دجال و کذاب کے نام سے یاد کیا ہے۔ چنانچہ جامع ترمذی میں حضرت ثوبانؓ کی روایت سے ہے کہ رسول پاک ﷺ نے یہ بھی فرمایا:-

----- ویکون فی امتی ثلثون کذلبون کلہم یزعم انہ نبی وانا خاتم النبیین لانہی بعدی، ہذا حدیث صحیح (ترمذی، جلد ۲، ص ۴۵)
”اور میری امت میں (قیامت سے پہلے پہلے) تیس کذاب ضرور ہوں گے۔ ہر

اللہ اس حدیث کی شرح میں حافظ ابن حجرؒ کہتے ہیں کہ اس حدیث میں دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ پر رسول ختم کر دیئے اور دین کے طریقے کامل کر دیئے۔ (فتح، جلد ۱۳، ص ۳۱۳)

ایک ان میں دعویٰ کرے گا کہ وہ نبی ہے۔ حالانکہ میں خاتم النبیین ہوں۔ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔“ امام ترمذیؒ کہتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے۔

تنبیہ نمبر ۱۔ یہ حدیث صحیح بخاری، صحیح مسلم اور جامع ترمذی میں حضرت ابو ہریرہؓ سے بھی مروی ہے اور اس میں ان مدعیان نبوت کے دو لقب دجال و کذاب بتائے گئے ہیں۔

دجال نہایت درجے کے فریبی اور طمع ساز کو اور کذاب نہایت درجے کے جھوٹے اور مکار کو کہتے ہیں۔ (فتی الارب، لسان العرب، المصباح المنیر)
کسی مکار اور فریبی کا مکاری اور فریب کاری پر واقف ہونا آسان کام نہیں ہے۔ اس لیے نبی پاک ﷺ نے ازراہ شفقت و صفائی بیان ان سب مدعیان نبوت کا ایک ایسا مشترک نشان بتا دیا۔ جس سے علم والے اور بے علم لکھے پڑھے اور ان پڑھ اور شری و دیہاتی سب طرح کے لوگ یکساں طور پر پہچان لیں۔ وہ نشان یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک یہ دعویٰ کرے گا کہ وہ نبی ہے۔ بس مجرد ان کا ایسا دعویٰ کرنا ہی ان کے دجال و کذاب ہونے کی دلیل ہے۔ چنانچہ اسی بات کو واضح کرنے کے لیے ساتھ ہی فرما دیا کہ میں خاتم النبیین ہوں، میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔

تذیل:- اس حدیث سے علاوہ اس امر کہ آنحضور ﷺ کے بعد نبوت کا دعویٰ کرنے والا دجال و کذاب ہے اور علاوہ اس کے کہ آنحضرتؐ ”خاتم النبیین“ ہیں۔ یہ امر بھی ثابت ہو گیا کہ خاتم النبیین کے معنی یہ ہیں کہ نبی پاک ﷺ کے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا اور خاتم الانبیاء اور آخر الانبیاء کے ایک ہی معنی ہیں۔ جیسا کہ صحیح مسلم کی حدیث ذیل میں بالتصریح وارد ہے۔

انی اخر الانبیاء ومسجدی اخر المساجد (مسلم) ۱۳۳

”میں آخر الانبیاء ہوں اور میری مسجد (مسجد نبویؐ) آخری مسجد ہے“

تنبیہ نمبر ۲:- سرور کونین ﷺ کی مسجد کے آخری ہونے کے یہ معنی ہیں کہ وہ ان

مساجد میں آخری مسجد ہے جو انبیاء اللہ نے تعمیر کیں۔ جیسا کہ حضرت آدمؑ، داؤدؑ، سلیمانؑ اور حضرت محمد ﷺ۔ پس آنحضرت ﷺ کی مسجد ان سب میں آخری ہوئی۔ چنانچہ یہ معنی دوسری حدیث میں صراحتہ ”مذکور ہیں کہ آپؐ نے فرمایا:-

انا خاتم الانبیاء و مسجیدی خاتم مساجد الانبیاء (کنز العمال، مطبوعہ حیدر آباد، جلد ۶، ص ۲۰۶، فضل الحرمین)

”میں خاتم الانبیاء ہوں اور میری مسجد انبیاء کی مساجد میں سے آخری مسجد ہے۔“

تنبیہ نمبر ۳:- ان ہر دو احادیث کے ملانے سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ خاتم کے معنی آخری ہیں۔

بحث سوم:- اس امر میں کہ بحث دوم میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے۔ اس کی ایک بات پر مرزا صاحب قادیانی آنجمانی مدعی نبوت کے بھی تصدیقی و مستحکم ہیں۔

سو معلوم ہو کہ مضمون بالا میں پہلی بات خاکسار (محمد ابراہیم میر سیالکوٹی) نے یہ بیان کیا ہے کہ خاتم النبیین والی آیت کے یہ معنی ہیں کہ جناب رسالت مآب ﷺ آخری نبی ہیں اور آپؐ نبیوں کے ختم کر دینے والے ہیں۔ سو اس کی بابت مرزا صاحب اپنی کتاب ازالہ اوہام میں اس آیت کا ترجمہ یوں کرتے ہیں:-

”یعنی محمد ﷺ تم میں سے کسی مرد کا باپ نہیں مگر وہ رسول اللہ ہے اور ختم کرنے والا نہیں گا۔“ نیز فرماتے ہیں:-

”جانتا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام نبوتوں اور رسالتوں کو قرآن مجید اور حضور پاک ﷺ پر ختم کر دیا ہے۔“ ﷺ

دوسری بات خاکسار نے بحوالہ مسند امام احمدؒ یہ بیان کیا ہے کہ رسالت اور نبوت نبی پاک ﷺ کے بعد منقطع ہو گئی ہے۔ اب کوئی نبی اور کوئی رسول نہیں ہوگا۔ سو اس کی بابت مرزا صاحب ازالہ اوہام کی عبارت مذکورہ صدر کے آگے سلسلہ ذکر میں

ﷺ ازالہ اوہام مطبوعہ لاہور۔ ص ۱۱۵۱۔

خط مورخہ ۱۷ اگست ۱۹۸۹ء مطبوعہ الحکم نمبر ۲۹، جلد ۳ و منقول از ٹریکٹ نمبر ۸، مصنف

مولوی محمد علی صاحب احمدی لاہوری بحریہ یکم مئی ۱۹۳۳ء۔

فرماتے ہیں:-

”ابھی ثابت ہو چکا ہے کہ اب وحی رسالت تا قیامت منقطع ہے۔“ (ص ۱۱۵۳، ازالہ مطبوعہ لاہور)

دیکھئے یہ وہی الفاظ ہیں جو حدیث مسند احمدؒ میں وارد ہیں۔ نیز مرزا صاحب اپنے آئینہ کمالات میں فرماتے ہیں:-

ماکان اللہ ان یرسل نبیا بعد نبینا خاتم النبیین وماکان ان یحدث سلسلۃ النبوة ثانیاً بعد انقطاعها (ص ۳۷۷)

”یہ ہرگز نہیں ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ہمارے نبی ﷺ خاتم النبیین کے بعد کسی کو بھی نبی بنا کر بھیجے اور نہ یہ ہوگا کہ سلسلہ نبوت کو منقطع ہو جانے کے بعد پھر دوبارہ جاری کرے۔“

تیسری بات جو میں نے بیان کی ہے کہ جناب رسالت مآب ﷺ نے عام طور پر بغیر تفریق تشریحی یا غیر تشریحی کے فرمایا کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔ اس کے متعلق بھی مرزا صاحب ایام الصلح (اردو) میں فرماتے ہیں:-

”حدیث لانی بعدی میں لافنی عام ہے۔ پس یہ کس قدر دلیری اور گستاخی ہے کہ خیال رکیکہ کی پیروی کر کے نصوص صریحہ قرآن کو عداً چھوڑ دیا جائے اور خاتم الانبیاء کے بعد ایک نبی کا آنا مان لیا جائے اور بعد اس کے جو وحی منقطع ہو چکی ہے پھر سلسلہ وہی نبوت کا جاری کر دیا جائے۔“ (ص ۱۳۶)

اسی طرح مرزا صاحب کی کتب کے دیگر حوالے بھی پیش کیے جاتے ہیں۔ جن میں صاف اقرار ہے کہ نبوت اور رسالت نبی پاک ﷺ پر ختم ہو گئی اور آپؐ اس سلسلے کے آخری نبی ہیں۔

چنانچہ کتاب حقیقۃ الوحی، ص ۱۴۱ میں مرقوم ہے:-

”اللہ تعالیٰ وہ ذات ہے جو رب العالمین اور رحمن اور رحیم ہے۔ جس نے زمین اور آسمان کو چھ دن میں بنایا اور آدمؑ کو پیدا کیا اور رسول بھیجے اور کتابیں بھیجیں اور سب کے آخر میں حضرت محمد مصطفیٰؐ احمد مجتبیٰ کو پیدا کیا۔ جو خاتم الانبیاء اور خیر الرسل تھے۔“ (ص ۱۴۱)

حصہ اول، ص ۲۱)

نیز ازالہ ادہام میں لوگوں کی طرف سے خود سوال کرتے ہیں اور خود جواب دیتے ہیں۔

سوال:- رسالہ فتح الاسلام میں نبوت کا دعویٰ کیا ہے۔

الجواب:- نبوت کا دعویٰ نہیں بلکہ محدثیت کا دعویٰ ہے۔ (ص ۱۷۴، مطبوعہ

قادیان بار سوم)

اسی طرح شیخ الکل حضرت مولانا سید نذیر حسین صاحب محدث دہلوی اور مولانا

ابو سعید محمد حسین صاحب دہلوی رحمہما اللہ کا ذکر نہایت بدتہذیبی سے کر کے لکھتے ہیں:-

”یہ سراسر افتراء ہے کہ ہماری طرف یہ بات منسوب کرتے ہیں کہ گویا ہمیں

”معجزات انبیاء“ سے انکار ہے یا ہم خود دعویٰ نبوت کرتے ہیں یا نعوذ باللہ حضرت سید

المرسلین محمد مصطفیٰ، احمد مجتبیٰ علیہ السلام کو خاتم الانبیاء نہیں سمجھتے یا ملائک سے انکاری یا حشر نشر

وغیرہ اصول عقائد اسلام سے منکر ہیں یا صوم و صلوة وغیرہ ارکان اسلام کو نظر استخفاف

سے دیکھتے ہیں یا غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ گواہ ہے کہ ہم ان سب باتوں کے

قائل ہیں اور ان عقائد اور ان اعمال کے منکر کو ملعون اور خسر الدنیا والاخرۃ یقین رکھتے

ہیں۔“

چوتھی بات میں نے یہ بیان کی ہے کہ سرور دو عالم علیہ السلام نے اپنے بعد کے

مدعیان نبوت کو دجال و کذاب فرمایا ہے۔ سو اس بارے میں بھی مرزا صاحب کی

تصریحات بیش از بیش ہیں۔ ان میں چند بطعہ نمونہ حسب ذیل ہیں:-

۱۔ ختم المرسلین کے بعد کسی دوسرے مدعی نبوت کو کاذب اور کافر جانتا ہوں۔

(اشتہار ۲۰ اکتوبر ۱۸۹۱ء)

۲۔ جو شخص ختم نبوت کا منکر ہو اسے بے دین اور دائرہ اسلام سے خارج سمجھتا

ہوں۔ (دہلی، تقریر ۲۳ اکتوبر)

۳۔ ہم بھی مدعی نبوت پر لعنت بھیجتے ہیں۔ (مجموعہ اشتہارات، ص ۲۲۴)

۴۔ مجھے کب جائز ہے کہ میں نبوت کا دعویٰ کر کے اسلام سے خارج ہو جاؤں۔

(حماتہ البشری، ترجمہ، ص ۷۹)

۵۔ ان لوگوں نے میرے قول کو نہیں سمجھا اور یہی کہا کہ یہ شخص نبوت کا مدعی ہے اور اللہ جانتا ہے کہ ان کا یہ قول صریح کذب ہے۔ (حمامہ، ترجمہ، ص ۸۱)

۶۔ کیا ایسا بد بخت مفتری جو خود رسالت اور نبوت کا دعویٰ کرتا ہے۔ قرآن مجید پر ایمان رکھ سکتا ہے۔ (انجام آقلم، ص ۲۷، منقول از ٹریکٹ نمبر ۸، مصنفہ مولوی محمد علی صاحب لاہوری، مجریہ کیم مئی ۱۹۳۳ء)

صاحبان! میں نے یہ بات بھی ذکر کی ہے کہ حضور پاک ﷺ نے فرمایا کہ میرے بعد نبوت بند ہے اور انتظام امت و سیاست کے لیے خلافت و امارت جاری ہے۔ سو مرزا صاحب بھی اسی طرح فرماتے ہیں:-

”بیعت کرنے کے لیے ان عقائد کا ہونا ضروری ہے کہ نبی پاک ﷺ کو رسول برحق اور قرآن شریف منجانب اللہ کتاب اور جامع الکتب ہے۔ کوئی نئی شریعت اب نہیں آسکتی اور نہ کوئی نیا رسول آسکتا ہے مگر ولایت اور امامت اور خلافت کی ہمیشہ راہیں کھلی ہیں اور جس قدر مہدی دنیا میں آئے یا آئیں گے۔ ان کا شمار خاص اللہ جل شانہ کو معلوم ہے۔ وحی رسالت ختم ہو گئی مگر ولایت و امامت و خلافت کبھی ختم نہیں ہوگی۔ (مکتوب مرزا صاحب، مندرجہ رسالہ تشحیذ الاذہان، جلد ۱، ص ۲۳)

مرزا صاحب کے ان سب حوالہ جات سے یہ امور ثابت ہیں:-

۱۔ نبوت و رسالت رسول پاک ﷺ پر ختم ہو گئی۔

۲۔ نبی پاک ﷺ کے بعد کوئی شخص نبی نہیں ہو سکتا۔

۳۔ ایسا مدعی نبوت کاذب، کافر، بے دین، دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ ملعون، خسر الدنیا والاخرۃ، بد بخت مفتری اور بے ایمان ہے۔

یہ مرزا صاحب کے اقوال ہیں اور ہم بھی اس پر صاد کرتے ہیں۔

اگر کہا جائے کہ یہ سب حوالہ جات مذکورہ بالا نومبر ۱۹۰۱ء سے پیشتر کے ہیں۔

اس وقت مرزا صاحب کو عمدہ رسالت نہیں ملا تھا۔ اس لیے یہ سب تحریریں منسوخ شدہ

کبھی چاہئیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ فتح عقائد میں نہیں ہوتا بلکہ احکام میں ہوتا ہے۔

اور کفر و اسلام میں فتح نہیں ہے۔ جو بات سابقہ کفر تھی، وہ بعد میں اسلام نہیں ہو سکتی

اور جو بات سابقہ اسلام تھی، وہ بعد میں کفر نہیں ہو سکتی۔ (قافلم)

بحث چہارم

رد شبہات میں

اس بحث کی تفصیل سے پتھر ایک اصولی بات اچھی طرح دلنشین کر لینی چاہیے۔ وہ یہ کہ منطقی لوگ کہتے ہیں۔ لا حرج فی التصور بتعلق بکل شئی " یعنی تصور میں رکاوٹ نہیں۔ ہر شے کے متعلق ہو سکتا ہے۔ اگر ایک شے کے متعلق ہو تو اس کی نفی کے متعلق بھی ہو سکتا ہے۔ یعنی اگر آپ ایک شے کو تصور میں لائیں تو اس کی نفی کے متعلق بھی تصور میں لا سکتے ہیں اور ذہن میں بٹھا سکتے ہیں۔ حالانکہ واقعاً اور حقیقتاً " ہر دو معا " صادق نہیں ہوتے۔ اگر ایک صادق ہے تو دوسرا ضرور کاذب ہو گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسانی دماغ غلط فہمی سے یا فساد نیت سے ایسے امور تراش سکتا ہے اور فرض کر سکتا ہے جو حق کے مشابہ ہوں۔ کیوں کہ سوائے ذات حق کے ہر کسی میں عقلاً " و فرضاً " نفی و اثبات کے ہر دو پہلو ممکن ہیں۔ کیوں کہ سب کسی کا وجود عارضی اور ممکن ہے۔ جس میں وجود و عدم ہر دو مساوی ہوتے ہیں۔ بلکہ منکرین تو اس غلط فہمی یا فساد نیت میں ایسے بڑھے ہوئے ہیں کہ وہ ذات حق کے وجود سے بھی انکار کر بیٹھے ہیں، جس سے انکار نہیں ہو سکتا۔ اور مشرکین غیر اللہ کی معبودیت کے قائل ہو گئے، جس کے اقرار کی کوئی صورت جائز نہیں۔ وجود باری کے نفسی و آفاقی دلائل بالکل روشن ہیں۔ غیر اللہ کی معبودیت کے باطل ہونے کے براہین واضح ہیں لیکن پھر بھی بعض شبہات کی بناء پر جو ان کو عارض ہو گئے ہیں یا عارض کر لیے گئے ہیں۔ ہر دو فریق (منکرین و مشرکین) غلط راستے پر جا رہے ہیں اور شبہ کو اسی لیے شبہ کہتے ہیں کہ وہ ظاہری صورت میں مشابہ بالحق ہوتا ہے نہ حقیقتاً "۔ جس طرح کہ پتیل اور سونا رنگ و صورت میں تقریباً " مشابہ ہوتے ہیں اور کوئی دھوکے باز کسی سادہ لوح انسان کو سونے کے نام پر پتیل دے دیتا ہے۔ اسی طرح کوئی مذہبی فریب کار سادہ لوح انسانوں کے سامنے ایسے امور پیش کر کے ان کو غلطی میں ڈال دیتا ہے جو شبہیہ بالحق ہوتے ہیں۔ یا وہ لوگ اپنی سادگی یا فساد نیت یا زلیغ قلبی کے باعث ان امور کو شبہیہ بالحق سمجھ کر بالکل حق تصور درست گردان لیتے

ہیں۔ لیکن جس طرح سونے کے دھوکے سے پتیل کے لینے والے کے خیال کے ماتحت پتیل حقیقتاً "سونا نہیں ہو جاتا۔ اسی طرح مذہبی فریب کار کی مکاری سے باطل کی حقیقت حق اور درست نہیں ہو جاتی۔ حق 'حق ہے' چاہے اس پر کتنے پردے پڑ جائیں اور باطل 'باطل ہے' چاہے اس پر کتنے رنگ چڑھ جائیں۔

یہی حال نبوت وغیرہ امور کے متعلق مرزائی دلائل کا ہے کہ ان کی حقیقت شبہات سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں ہے۔ کیوں کہ قرآن و حدیث کی تصریحات سے نہایت صفائی سے واضح ہو چکا ہے اور اس حقیقت پر کوئی پردہ نہیں رہ گیا کہ نبوت و رسالت آنحضور ﷺ پر ختم ہو چکی ہے اور کہ آپ کے بعد اب تک نہ تو کوئی جدید نبی برحق پیدا کیا گیا اور نہ آئندہ کیا جائے گا اور جس کسی نے ایسا دعویٰ کیا یا آئندہ کرے گا۔ وہ بموجب حدیث نبوی و جال و کذاب ہے۔ چنانچہ شیخ الاسلام حضرت امام ابن تیمیہؒ جو علمائے اسلام میں بلحاظ جامعیت علوم و فنون خصوصیت سے ممتاز ہیں۔ اپنی مایہ ناز کتاب "منہاج السنہ" میں فرماتے ہیں:-

ومن اثبت نبیاً بعد محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) فهو شبيه باتباع مسیلمة
الکذاب وامثاله من المتنبيين (منہاج، جلد ۳، ص ۱۷۴)

"اور جو کوئی بعد محمد ﷺ کے کسی کو نبی اعتقاد کرے تو وہ مسیلمہ کذاب اور اس کی مثل دیگر (جھوٹے) مدعیان نبوت کے تابعداروں کی طرح ہے۔"

اس قاعدہ مذکورہ کے ساتھ علم اصول کا بھی ایک قاعدہ لحاظ میں رہے کہ جو امر قرآن و حدیث میں منصوص و منطوق ہو اور اس پر اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کی تصریح کی مرگ چکی ہو۔ اس کے خلاف کوئی استنباط، کوئی قیاس، کوئی عام استدلال اور کوئی تشبیل شہادت درست نہیں۔ ورنہ دین کا سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا اور اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کی تصریحات کا کوئی فائدہ نہیں رہے گا اور ہر خود غرض و مطلب پرست، کجرو و کج فہم، مکار و فریب کار بقاعدہ مذکورہ بالا یعنی لا حرج فی التصور کسی نہ کسی طرح بات بنا کر (معاذ اللہ) قرآن و حدیث کی جملہ تصریحات کو بے کار کر سکے گا۔

معلوم ہو کہ قادیانی منکرین ختم نبوت نے عوام میں چند شبہ سے ڈال رکھے

ہیں:-

شبہ اول

سورہ فاتحہ کی آیت صراط الذین انعمت علیہم میں جن انعام یافتہ لوگوں کا ذکر ہے۔ ان کی تفصیل خود اللہ تعالیٰ نے سورہ النساء، پ ۵ میں بیان فرمادی ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:-

و من یطع اللہ و الرسول فاؤلئک مع الذین انعم اللہ علیہم من النبیین و الصدیقین و الشہداء و الصلحین و حسن اولئک رفیقاً" ○ (پ ۵)
 ”اور جو شخص فرمانبرداری کرے گا اللہ تعالیٰ کی اور اس رسول (محمد ﷺ) کی تو ان کو ان کا ساتھ نصیب ہوگا۔ جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام کیا ہے۔ یعنی انبیاء کا اور صدیقیوں کا اور شہیدوں کا اور صالحین کا اور یہ سب اچھے رفیق ہیں۔“

مرزائی کہتے ہیں کہ جب ہم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول محمد ﷺ کی اطاعت بھی کرتے ہیں اور صراط الذین انعمت علیہم سے دعا بھی کرتے ہیں اور ہم صدیقیت اور شہادت اور صالحیت کے مراتب تک ترقی بھی کر سکتے ہیں، تو آیت سورہ نساء میں ان سب کے ساتھ انبیاء کی رفاقت کا بھی ذکر ہے۔ تو اگر آنحضرت ﷺ کے بعد نبوت بالکل بند ہے اور کوئی شخص بھی نبی نہیں بن سکتا تو یہ دعا بالکل اکارت و ضائع جائے گی اور اطاعت بے ثمر رہے گی۔ پس لازم ہے کہ اس دعا کی قبولیت اور اس اطاعت کا ثمرہ عمدہ نبوت کی عطا کی صورت میں بھی ہو۔ اس کا جواب بچند وجہ ہے:-

اس کا جواب

وجہ اول:- یہ استنباط خلاف نص قرآنی اور خلاف احادیث صحیحہ صریحہ ہے۔ لہذا باطل ہے جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے۔

وجہ دوم:- (الف) آیت صراط الذین انعمت علیہم میں انعام یافتہ لوگوں کی راہ پر چلنے کی توفیق طلب کی جاتی ہے، نہ کہ نبی بننے کی درخواست پیش کی جاتی ہے۔ اگر کسی کی راہ پر چلنے کی دعا مانگے سے اس کا عمدہ بھی مل جاتا ہے۔ تو جہاں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ وان هذا صراطی مستقیماً فاتبعوه (پ ۸)

”تحقیق یہی ہے میرا سیدھا رستہ، پس تم اسی کی پیروی کرو۔“

اگر کوئی شخص اس کے مطابق اللہ تعالیٰ سے دعا مانگے کہ خداوند! مجھے اپنے رستے پر چلنے کی توفیق دے اور اس پر عمل بھی کرے تو کیا اسے اس دعا اور عمل کے ساتھ خدائی کا چارج بھی مل جائے گا؟۔ (استغفر اللہ)

صاحبان! عقل سے کام لیجئے۔ اتباع اور شے ہے اور عمدہ اور شے ہے۔

(ب) اور آیت سورہ نساء، پ ۵ میں انبیاء کی رفاقت بروز قیامت ملنے کا ذکر ہے، نہ کہ عمدہ نبوت ملنے کا۔ جیسا کہ اس آیت کے شان نزول سے بھی واضح ہے اور خود اس آیت میں بھی الفاظ مع اور رفیقاً صاف صاف موجود ہیں۔

(ج) اور صدیقیت، شہادت اور صالحیت کے مدارج مل سکنے کی وجہ یہ ہے کہ ان کا دروازہ کھلا ہے لیکن نبوت کا دروازہ آنحضرت ﷺ کے بعد بند ہے۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے فرمایا۔ والذین امنوا باللہ ورسولہ اولئک ہم الصدیقون والشهداء عند ربہم (حدید، پ ۲۷)

”اور جو لوگ ایمان لائے اللہ پر اور اس کے سب رسولوں پر، وہی صدیق و شہید ہیں نزدیک اپنے پروردگار کے۔“

اگر کسی کی معیت و رفاقت سے اس کا عمدہ مل جانا لازم آتا ہے تو قرآن شریف میں بہت سے مقامات پر اللہ تعالیٰ کی معیت کا بھی ذکر ہے کہ وہ تم سب کے ساتھ ہے۔ وہ محسنین کے ساتھ ہے، وہ صابرین کے ساتھ ہے وغیرہ وغیرہ تو کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ سب لوگوں کو یا محسنین و صابرین کو خدائی کا عمدہ اور چارج مل جاتا ہے۔ (توبہ استغفر اللہ)

تنبیہ :- اگر ہم نصوص قطعیہ یعنی آیت خاتم النبیین اور احادیث ختم رسالت کو نظر انداز کر کے مرزا صاحب اور مرزائی صاحبوں کی کھینچ تان کی استنباطی دلیلوں کو تسلیم کر لیں اور تیس دجالوں والی صحیح اور متفق علیہ حدیث کا بھی لحاظ نہ کریں اور بقول مرزا جی دعویٰ نبوت کو رسالت ﷺ کے بعد بھی جائز جان لیں۔ تو مرزا جی کے سواء دیگر مدعیان

۱۵ خلاصہ مستفاد از اعجاز المسیح تفسیر سورہ فاتحہ معنفہ مرزا صاحب قادریانی۔

نبوت کے لیے بھی رستہ کھلا رہے گا اور ان کی تکذیب و تردید کے لیے ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں ہوگی۔ کیوں کہ جب ہم (معاذ اللہ) ختم نبوت کے دلائل کو ایک دفعہ مرزا جی کے لیے بے کار و غیر مفید سمجھ چکے تو وہ اب دوسروں کے مقابلے میں بکار و مفید نہیں ہو جائیں گے۔ چنانچہ اسی خیال نے کئی ایک احمدیوں کو جرات و دلاوی کہ انہوں نے نبوت کا کھلا دعویٰ کر دیا۔ عبد اللہ تھاپوری، احمد نور کالمی، نبی بخش کانشیل، ماسٹر محمد سعید (ہردواز ضلع سیالکوٹ)، عبد اللطیف (از ضلع جالندھر) اور فضل احمد (از ضلع راولپنڈی) وغیرہم۔ غرض یہ سب مدعیان نبوت اور ان جیسے دیگر جو آئندہ پیدا ہوں گے۔ وہ سب انہی ہتھیاروں سے مسلح ہو کر آئے ہیں اور آئیں گے۔ جو مرزا جی نے خود اپنے اور ان کو بھی پہنائے۔ پس قادیانی حضرات مصدقین نبوت مرزا جی کا کوئی حق نہیں کہ ان ہتھیاروں سے مرزا جی کو سجادیکہ کر تو جبری اللہ فی حلال الانبیاء مان لیں۔ اور دوسروں کو جو اسی روپ میں اور انہی ہتھیاروں سے بچے ہوئے ہیں۔ کاذب و مفتری قرار دیں۔ تلک اذا قسمۃ ضیزی (یہ تو بے انصافی کی تقسیم ہے)

وجہ سوم:- نبوت کا حصول دعا و التجا سے نہیں بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کی دین ہے۔ وہ اپنے انتخاب سے جسے چاہتا ہے، نبی بناتا ہے۔ چنانچہ فرمایا۔ وما کنت ترجوان یلقی الیک الکتب الارحمة من ربک (القصص، پ ۲۰)

”اور (اے پیغمبر!) تجھے کچھ امید نہیں تھی کہ تیری طرف کتاب اتاری جائے گی۔ لیکن تیرے رب کی رحمت کی وجہ سے (اتری)۔“

اسی معنی میں کہا گیا ہے۔

خدا کے دین کا موسیٰ سے پوچھئے احوال
آگ لینے جائیں، پیغمبری مل جائے

شبہ دوم

قادیانی حضرات سادہ مسلمانوں کو دو سرا شبہ یہ ڈالتے ہیں کہ ختم کے معنی ہیں مر کرنا، نہ کہ انجام دینا۔ چنانچہ مزاح میں ہے۔ ختم، مہر کردن، پس خاتم النبیین سے مراد یہ ہے کہ حضور پاک ﷺ کے بعد جو کوئی بھی نبی پیدا ہوگا، وہ رسول پاک ﷺ کی

اتباع سے ہو گا۔ گویا کہ نبی پاک ﷺ نے اس کی نبوت پر مہر تصدیق لگا دی۔
اس کا جواب:-

یہ سراسر مغالطہ اور دھوکا ہے درنہ اس صورت میں تو یہ آیت اجرائے نبوت کی دلیل ہوگی، نہ کہ اختتام کی اور یہ اللہ تعالیٰ کی خشاء کے خلاف ہے۔ بلکہ کتاب اللہ کی تحریف معنوی ہے۔ یہودیوں کی بھی یہی چال تھی کہ وہ کتاب اللہ کے کلمات کو ان کے ان معنوں سے جن پر وہ چسپاں ہوتے، پھیر کر اور طرف لگا لیتے۔ چنانچہ فرمایا:-
☆ يحرفون الكلم عن مواضعه (مائدہ، پ ۶) ”بدلتے ہیں بات کو اس کے ٹھکانے سے۔“

☆ يحرفون الكلم من بعد مواضعه ○ (مائدہ، پ ۶) ”بے اسلوب کرتے ہیں بات کو اس کا ٹھکانا چھوڑ کر۔“

یہی حال قادیانی اور قادیانیوں کا ہے کہ آیات اللہ اور احادیث رسول اللہ ﷺ کو خلاف خشاءِ الہی اور خلاف مراد رسول اللہ ﷺ بے ٹھکانا کر کے اختتام کو اجزاء بنا لیتے ہیں۔ رسول پاک ﷺ جن پر قرآن مجید اترا، وہ تو اسی آیت کو پیش کر کے فرمائیں کہ میں آخری نبی ہوں، نبوت اور رسالت میرے بعد منقطع ہو گئی۔ میں قہر نبوت کی آخری اینٹ ہوں۔ میں عاقب ہوں اور میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔ میرے بعد نبی بننے والا دجال و کذاب ہے۔ جیسا کہ اوپر مفصل گزر چکا اور قادیانی صاحبان یہ کہیں کہ اس کے یہ معنی ہیں کہ آگے کو نبی پاک ﷺ کی مہر تصدیق سے نبی بنتے رہیں گے۔ گویا کہ نبوت کی نکسال کھل جائے گی۔ (توبہ استغفر اللہ)

آئیے! ہم آپ کو بتائیں کہ صراح میں کیا لکھا ہے اور کسی کے انجام اور اس پر مہر لگانے میں کیا مناسبت ہے۔ دیکھئے! جہاں صراح میں ختم کے معنی مہر کردن لکھے ہیں۔ وہاں یہ بھی لکھا ہے۔ ”تمام گردانیدن“ یہاں ختم اللہ لہ بالخیر و تمام خواندن قرآن را“ اختتام پائیاں برون، نقیض الافتتاح۔“

یعنی ختم کے معنی تمام کرنے کے بھی ہیں، چنانچہ محاورہ ہے۔ خدا اس کا خاتمہ بالخیر کرے۔ اور تمام قرآن مجید کو پورا (شروع سے آخر تک) پڑھ جانے کو بھی ختم کہتے ہیں۔ اور اختتام کے معنی ہیں کسی کام کا انجام دینا اور یہ نقیض ہے افتتاح کی۔ یعنی جس

طرح افتتاح کسی کام کے شروع کرنے کو کہتے ہیں۔ اس طرح اس کے انجام دینے کو اختتام کہتے ہیں۔

اور دیکھئے! صراح میں یہ بھی لکھا ہے۔ خاتمة الشئ اخره و محمد خاتم الانبياء بالفتح، صلوات اللہ علیہ و علیہم اجمعین
 ”اور مہر لگانے اور اختتام یعنی انجام دینے میں مناسبت یہ ہے کہ مہر انجام و اختتام پر لگائی جاتی ہے۔“

چنانچہ یہ بھی صراح ہی میں لکھا ہے۔ ختام گل و موم کہ بروئے مہر کنند، و قوله تعالیٰ ختامہ مک ای آخرہ۔

اور حضرت شاہ عبدالقادر صاحب اس آیت کا ترجمہ یوں کرتے ہیں:-
 ”اس کی مہر جمتی ہے مک (کستوری) پر۔“

اس تفصیل سے معلوم ہو گیا کہ مہر نبوت سے مراد اختتام نبوت ہے نہ کہ اجرائے نبوت۔ چنانچہ یہ معنی حضرت علیؑ والی حدیث بخاری سے واضح ہیں۔ جو سابقاً ”گزر چکی کہ آنحضور ﷺ نے سفر تبوک پر تشریف لے جاتے وقت ان کو فرمایا تھا:-
 الا ترضی ان نکون منی بمنزلة هارون عن موسى الا انه ليس نبي بعلي (صحیح بخاری)

”اے علیؑ! کیا تو راضی نہیں کہ تجھے مجھ سے وہ نسبت ہو جو ہارونؑ کو موسیٰؑ سے تھی۔ مگر یہ کہ میرے بعد کوئی نبی نہ ملے والا نہیں۔“
 اس حدیث سے صاف واضح ہے کہ آنحضرت ﷺ اپنے بعد نبوت کی بندش کی بابت فرما رہے ہیں نہ کہ جاری ہونے کی بابت۔

شبہ سوم

قادیانیوں کا یہ مغالطہ پہلے مغالطہ کی طرح بڑا بھاری ہے اور وہ اس میں بہت زور لگایا کرتے ہیں۔ وہ یہ کہ جب کسی شخص کو مثلاً ”خاتم الحفاظ“ خاتم الحمدین اور خاتم الشعراء کہا جاتا ہے تو اس سے مراد یہ نہیں ہوتی کہ دوسرا حافظ یا محدث یا شاعر اس کے بعد نہیں ہوا یا نہ ہوگا۔ بلکہ اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ جو شخص حفظ یا حدیث دانی یا شعر میں سب سے افضل ہے کیوں کہ لفظ خاتم بفتح التاج جمع کی طرف مضاف ہو تو

اس کے معنی افضل کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ وہ اس کی تائید میں ذیل کی تائیدیں پیش کرتے ہیں۔

۱۔ آنحضرت ﷺ نے اپنے چچا حضرت عباسؓ سے فرمایا:-

اطمن يا عم فانك خاتم المهاجرين في الهجرة كما انا خاتم النبيين في النبوة (کنز العمال، جلد ۶، ص ۱۷۸)

”اگر خاتم کے معنی آخری کیے جائیں تو کیا حضرت عباسؓ کے بعد کسی نے ہجرت نہیں کی؟“

۲۔ ابو تمام طائی مؤلف دیوان حماسہ کی وفات پر حسن بن وہب عربی شاعر نے مرثیہ لکھا۔ اس میں یہ شعر بھی ہے۔

فجع القريض بخاتم الشعراء
و غدير روضتها حبيب الطائي
تو کیا ابو تمام کے بعد کوئی شاعر نہیں ہوا؟

نیز قادیانی کہتے ہیں کہ خاتم انگوٹھی کو کہتے ہیں اور انگوٹھی زینت کے لیے ہوتی ہے۔ پس خاتم النبیین کے معنی یہ ہیں کہ حضور پاک ﷺ نبیوں کی زینت ہیں۔

اس شبہ کا جواب

یہ شبہ سراسر باطل اور بے بنیاد ہے۔ علاوہ اس کے کہ یہ احادیث صحیحہ اور ائمہ دین اور ائمہ لغت کی تصریحات کے خلاف ہے۔ اگر قادیانی خن ساز تھوڑی سی عقل سے بھی کام لیتے تو ان کو معلوم ہو جاتا کہ ان کی یہ توجیہ ان کو مفید طلب نہیں ہے بلکہ سراسر ان کے خلاف ہے۔ بلکہ ان پر اقبالی ڈگری ہے۔ لمحے لمحے پہلے ان کی عقلندی بتاتے ہیں پھر احادیث صحیحہ اور ائمہ دین اور ائمہ لغت کی تصریحات بتائیں گے۔ پھر ان کی پیش کردہ حدیث اور شعر کا جواب بتائیں گے۔ (واللہ الموفق)

(۱) اس حدیث اور شعر سے قادیانیوں پر اقبالی ڈگری یوں ہے کہ افضلیت کمال کا آخری درجہ ہوتا ہے۔ جب تک آپ اسے نہیں مانیں گے، افضلیت نہیں منوا سکیں گے۔ پس یہ توجیہ ہمیں مفید ہے اور آپ لوگوں کو مضر۔ (نافم)

تنبیہ:- خاتمت کا وجہ فضیلت ہونا دیگر امر ہے اور یہ بات کہ اس کے معنی و مفہوم

لغوی افضل ہے۔ دیگر امر ہے جو غلط ہے۔ چنانچہ صحیح مسلم میں ہے کہ نبی پاک ﷺ نے فرمایا:-

فصلت علی الانبیاء بست اعطیت بجوامع الکلم، ونصرت بالرعب، واحلت لی المغنم وجعلت لی الارض طهوراً، ومسجداً وارسلت الی الخلق كافة وختم بی النبیین (صحیح مسلم، کتاب المساجد، جلد اول، ص ۱۹۹)

”میں چھ چیزوں کی وجہ سے دیگر انبیاء کرامؑ پر فضیلت دیا گیا ہوں۔ (۱) مجھے جامع کلمات عطا ہوئے ہیں اور (۲) میں رعب سے مدد دیا گیا ہوں اور (۳) میرے لیے غنیمتیں حلال کی گئیں اور (۴) زمین کی خاک بوقت تیمم، وضو اور غسل کی جگہ پاکیزگی دینے والی بنائی گئی اور (۵) میں تمام خلقت کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں اور (۶) انبیاء کرامؑ میرے آنے سے ختم کیے گئے۔“

اس حدیث میں صریحاً مذکور ہے کہ ختم نبوت آنحضور ﷺ کی وجہ فضیلت ہے جس طرح کہ دیگر پانچ چیزیں بھی وجہ فضیلت ہیں۔ پس جس طرح دیگر امور جو اس حدیث میں مذکور ہیں۔ ان کے معنی لغوی افضلیت کے نہیں ہیں۔ اسی طرح ختم نبوت کے معنی بھی افضلیت کے نہیں ہیں۔ چنانچہ ہمارے اس بیان کی تائید حافظ ابن حجرؒ کے مندرجہ ذیل استنباط سے بھی ہو سکتی ہے، جو انہوں نے صحیح بخاری کے باب ”وخاتم النبیین“ کی مندرجہ حدیث نبوت کے ضمن میں لکھا ہے:-

وفی الحدیث ضرب الامثال للتقريب الافهام وفضل النبی صلی اللہ علیہ وسلم علی سائر النبیین وان اللہ ختم بہ المرسلین واکمل بہ شرائع الدین (فتح الباری، دہلوی، جزو ۱۳، ص ۳۱۳)

”اس حدیث میں افہام و تفہیم کے لیے ضرب الامثال کے بیان کرنے اور دیگر انبیاء کرامؑ پر آنحضور ﷺ کی فضیلت کی دلیل ہے اور نیز اس بات کی کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے آپؐ کی آمد پر مرسلوں کو ختم کر دیا اور آپؐ سے شریعت کے سب امور کامل کروائے۔“

سب سے بڑھ کر یہ کہ آنحضرت ﷺ ہی فرماتے ہیں۔ انا خاتم النبیین (صحیح بخاری، ص ۴۴۶) اور حضور پاک ﷺ ہی فرماتے ہیں۔ انی اخر الانبیاء (صحیح مسلم،

جلد اول، ص ۴۴۶) تو اس کے بعد کس کا سر پھرا ہے کہ وہ یہ کہے کہ خاتم کے معنی آخری نہیں ہیں۔

مزید بریں یہ کہ ائمہ لغت کی تصریحات جو سابقاً مذکور ہو چکی ہیں۔ ان کے علاوہ تصریحات ذیل بھی ملاحظہ فرمائیں اور پھر قادیانیوں کے علم و ایمان کی داد دیں۔

۱۔ فتی الارب میں زیر لفظ خاتم لکھا ہے۔ و آخر ہر چیز و پایان آں و آخر قوم۔ و

خاتم بالفتح مثله و محمد خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ و علیہم اجمعین (فتی، جلد اول، ص ۴۹۵) یعنی خاتم (بالکسر) کے معنی ہیں ہر چیز کا آخر اور اس کا انجام اور قوم کا آخری شخص اور خاتم بالفتح بھی اسی کی مثل ہے یعنی اسی کا ہم معنی ہے اور محمد ﷺ انبیاء کرام کے خاتم ہیں۔ (یعنی آخری نبی ہیں۔)

نیز اسی میں ہے خاتمة کصاحبة آخر چیزے و پایان آں، یعنی خاتمہ کے معنی ہیں ہر چیز کا آخر اور اس کا انجام۔

نیز اسی میں ہے ختم اثنی ختمہ کے معنی یہ ہیں کہ وہ اس کام کے آخر کو پہنچ گیا۔ یا یوں کہو کہ اس نے اسے تمام کر دیا یا یوں کہ اس نے اسے تمام پڑھ لیا۔ غرض اس کے سب محاورات میں آخر اور انجام کے معنی پائے جاتے ہیں۔

۲۔ علامہ فیومی لغوی ”المصباح المنیر“ میں فرماتے ہیں۔ ختمت القرآن حفظت خاتمتہ و ہی اخرہ والمعنی حفظتہ جمیعہ عن ظہر غیب (جلد ۱، ص ۷۶)

۳۔ علامہ زعحری ”اساس البلاغہ“ میں فرماتے ہیں۔ ختم القرآن و کل عمل اذا اتمہ و فرغ منہ و التحمید مفتتح القرآن و الاستعاذۃ مختتمہ (جلد اول، ص ۱۴۱) یعنی ختم قرآن اور ہر عمل کے ختم کرنے کے معنی ہیں۔ اسے پورا کر دینا اور اس سے فراغت حاصل کرنا اور قرآن شریف کا افتتاح یعنی شروع اللہ کی حمد سے ہے۔ یعنی سورۃ الحمد سے قرآن مجید شروع ہوتا ہے اور قرآن کا اختتام یعنی انجام استعاذہ پر ہے یعنی اس کے اخیر پر سورۃ قل اعوذ برب الناس ہے۔

۴۔ شیخ محمد طاہر اپنی مایہ ناز کتاب لغات حدیث مجمع بحار الانوار میں زیر لفظ ختم فرماتے ہیں۔ فنظرت الی خاتم النبوة بکسر تاء ای فاعل الختم وهو

الاتمام و بفتحها بمعنی الطابع ای شئی بدل علی انه لا نبی بعده (جلد اول ص ۳۲۹) یعنی حدیث میں جو یہ آیا ہے کہ ایک صحابی کہتا ہے کہ میں نے حضور پاک ﷺ کی مہربوت کی طرف دیکھا تو اس کا ماحصل یہ ہے کہ وہ نبی پاک ﷺ کے موہنوں کے درمیان ایسی چیز تھی جو اس بات پر دلالت کرتی تھی کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔ خواہ اس لفظ کو خاتم بیضہ اسم فاعل پڑھیں، خواہ بالفتح بمعنی طالع پڑھیں۔ کیوں کہ ختم کے معنی پورا اور تمام کرنے کے ہیں۔ اس کے علاوہ اسی مجمع البحار میں کئی ایک احادیث مذکور ہیں۔ جن میں خواتم اور خواتیم کا لفظ وارد ہے اور ان سب میں اس کے معنی ہیں۔ آخر شئی مثلاً حدیث استودع اللہ امانتک و خواتیم عملک ای لوآخرہ اور حدیث لوتیت جوامع الکلم و خواتمه ای القرآن ختمت به الكتب السماوية اور حدیث والقراءۃ بالخواتیم ای بالواخر السور اور حدیث ثم قرء العشر الايات الخواتم صفة لعشر وهی ان فی خلق السموات

اسی طرح ایک اور لفظ اسی مادہ ختم سے ختام ہے۔ جو قرآن و حدیث میں یوں وارد ہے۔ ختامہ مک (سورہ مطفقین پ ۳۰) اس کی نسبت مجمع البحار میں لکھا ہے۔ ختامہ مسک ہو طین یختم به ای آخرہ طعم المسک اور اسی میں بالخصوص خاتم اور خاتم کے متعلق لکھا ہے۔ والخاتم (بکسر التاء) والخاتم (بفتح التاء) من اسمائہ صلی اللہ علیہ وسلم ش بالفتح اسم ای آخرہم۔

ان تصریحات کے بعد کسی ایماندار کے لیے خاتم النبیین کے معنی آخر الانبیاء ماننے کے متعلق کسی قسم کے شک و تردد کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ کیوں کہ یہ معنی خود جناب رسالت مآب ﷺ کی زبان مبارک کے فرمائے ہوئے ہیں اور آپ کے بعد جملہ صلحاء امت کیا محدثین اور کیا لغویین اور کیا فقہاء اور کیا صوفیاء اور کیا متکلمین سب کے سب اس کے بھی معنی کرتے اور مانتے آئے اور سب کا ایمان بھی رہا کہ نبوت حضور پاک ﷺ پر ختم ہو گئی اور آپ اس سلسلہ کے آخری نبی ہیں۔ آپ کے بعد کوئی نیا نبی نہیں ہوگا۔ اگر کوئی شخص ایسا دعویٰ کرے تو وہ دجال اور کذاب ہے۔

(۳) اب حضرت عباسؓ کی ہجرت والی حدیث کا جواب سنئے کہ فتح مکہ سے پشتر مدینہ کی

طرف ہجرت فرض تھی۔ تاکہ تمام مسلمان مرکز اسلام یعنی مدینہ شریف میں جمع ہو کر قوت بھی پکڑ جائیں اور کفار کے مظالم سے بھی بچے رہیں۔ لیکن جب رمضان ۸ ہجری میں مکہ مکرمہ فتح ہو گیا تو اسلام غالب و قوی ہو گیا اور کفر کا زور ٹوٹ گیا۔ تو حضور اکرم ﷺ نے پہلا حکم یعنی فرضیت ہجرت منسوخ کر دیا اور فرما دیا۔ لا ہجرۃ بعد فتح مکہؐ (بخاری) یعنی فتح مکہ کے بعد ہجرت نہیں ہے۔ اور حضرت عباسؓ نے فتح مکہ سے قدرے ہی پیشتر ہجرت کی تھی۔ چنانچہ خاتمۃ الحفاظ ابن حجرؒ اصابہ میں حضرت عباسؓ کے ترجمہ میں فرماتے ہیں۔ ہاجر قبل الفتح بقلیل وشہد الفتح (مطبوعہ کلکتہ) جلد سوم، ص ۶۶۸) یعنی حضرت عباسؓ نے فتح مکہ سے چندے پیشتر ہجرت کی اور آپؐ فتح مکہ میں حاضر تھے۔

آپؐ کے ہجرت کرنے کے بعد کسی دیگر شخص کی ہجرت ثابت نہیں ہے۔ پس حضرت عباسؓ آخر مہاجر ہوئے۔ اس سے بھی ثابت ہوا کہ خاتم کے معنی آخری ہیں۔
تنبیہ:- رسول اکرم ﷺ نے حضرت عباسؓ کو جو خاتم المہاجرین فرمایا تو اس سے آپؐ کا مقصود حضرت عباسؓ کی دلدادہی اور تسلی خاطر ہے۔ کیوں کہ حضرت عباسؓ نے خیال کیا کہ مجھ سے سابقیت ہجرت فوت ہو گئی ہے۔ کیوں کہ وہ ہجرت کے بہت پیچھے ایمان لائے تھے۔ پس آنحضرت ﷺ نے ان کی تسلی فرمائی کہ چچا جان! سابقیت کے فوت ہونے کا غم نہ کریں۔ کیوں کہ جس طرح سابقیت وجہ فضیلت ہو سکتی ہے۔ اسی طرح خاتیت بھی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ میں خاتم الانبیاء ہوں اور آپؐ خاتم المہاجرین ہیں اور یہ بات آپؐ کے الفاظ اطمنن یا عم سے ظاہر ہے۔ یعنی چچا جان! آپؐ تسلی رکھیں۔

اور ابو تمام کے مرقیہ کے شعر میں جو اسے خاتم الشعراء کہا گیا ہے تو وہ شاعر کے ظن کی بناء پر ہے کہ اس کے نقطہ خیال میں ابو تمام اس کمال کا آخری شخص تھا۔ پس اگر

۱۱۶ اس کا قصہ یوں ہے کہ فتح مکہ پر حضرت جاشع بن مسعود سلی اپنے بھائی مجالد کو آنحضور ﷺ کی خدمت میں لایا کہ میرا یہ بھائی آپؐ کے دست مبارک پر ہجرت کی بیعت کرنا چاہتا ہے۔ اس پر آپؐ نے فرمایا فتح مکہ کے بعد ہجرت نہیں ہے لیکن میں اسلام پر اس کی بیعت لے لیتا ہوں۔ (بخاری، ج ۱۲، ص ۱۳۶)

کوئی دیگر شخص ابو تمام کے برابر بلکہ اس سے بڑھ کر بھی ثابت ہو جائے تو ہو سکتا ہے۔ کیوں کہ حسن بن وہب شاعر عالم الغیب نہیں تھا کہ اس کا قول غلط نہ نکلے۔ لیکن جناب والا! یہاں تو اللہ تعالیٰ جو عالم الغیب ہے۔ آنحضور ﷺ کی نسبت فرما رہا ہے کہ آپؐ خاتم النبیین ہیں اور خود آنحضرت ﷺ وہ ذات پاک ہیں۔ جن پر اللہ تعالیٰ بعض مغیبات کھولتا ہے۔ آپؐ اس کی تفسیر آخر الانبیاء سے کرتے ہیں تو آپؐ ان دونوں

(اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پاک ﷺ) میں سے کس کو حسن بن وہب جیسا گمان کر سکتے ہیں کہ اس کا علم ناقص و قاصر ہے اور اسے حسن بن وہب کی طرح غیب پر اطلاع نہیں ہے۔ توبہ کرو اور استغفار پڑھو۔ ایسے داعی تباہی شکوک و شبہات کی بناء پر اپنے ایمان کی بے بہا متاع کو ضائع نہ کرو اور دیگر لوگوں کے ایمانوں کو بھی خراب کرنے اور گمراہی میں ڈالنے کا بارگراں اپنے کمزور کندھوں پر نہ اٹھاؤ۔

اب ہم اس بیان کو کافی جان کر اس مضمون کو ختم کرتے ہیں۔ (والحمد للہ ملعم الحقائق)

فصل دوم

”سورہ فاتحہ کے بعد آمین پکارنے کا بیان“

صحیح اور حسن ہر دو طرح کی احادیث سے ثابت ہے کہ سید المرسلین، خاتم النبیین، رحمۃ للعالمین علیہ جہری نماز میں سورہ فاتحہ کے ختم پر بلند آواز سے آمین پکارتے تھے۔ (ابوداؤد، دار قطنی، ابن ماجہ، ترمذی وغیرہ)

لفظ آمین کا اصل اور اس کے معنی :- انگریزی لغت نویس اسے عبرانی الاصل کہتے ہیں اور اس کے معنی یہ لکھتے ہیں۔ (SO LET IT BE) یعنی یہ بات اسی طرح ہو۔

غرض لغت نویس بھی اس کے یہ معنی بتاتے ہیں۔ چنانچہ لسان العرب میں ہے۔ وقیل معنی ”امین“ كذلك یکون یعنی ایسا ہی ہو۔ اور یہ معنی بھی لکھتے ہیں۔ اللهم استجب یعنی خداوند! قبول فرما۔

قطع نظر اس سے یہ کہ لفظ اصل میں کس زبان کا ہے۔ عربی زبان میں اس کے ماضی و مضارع کی گردان اور تبویب اسی طرح ہوتی ہے۔ جس طرح دیگر عربی الاصل الفاظ کی ہوتی ہے۔ مثلاً ”امن یؤمن تآمنا“ ہو سکتا ہے کہ یہ لفظ عبرانی ہو اور عربوں نے اس میں تصرف کر کے اسے عربی سانچے میں ڈھال لیا ہو۔ کیوں کہ اس کا استعمال سوائے باب تفعیل کے اور صورت میں نہیں پایا گیا۔ اور عرب لوگ دوسری زبان کے الفاظ کو باب تفعیل میں لا کر اس پر عربی رنگ چڑھا لیتے ہیں۔ دیگر یہ کہ اس کا تلفظ آمین (بالمد) اور امین (بالقصر) ہر دو طرح پر مستعمل ہے۔ فعیل تو عربی الفاظ کا وزن ہے لیکن فاعیل (بالالف) کوئی وزن نہیں ہے۔ (المصباح المنیر) لہذا یہ لفظ عربی الاصل نہیں ہے۔ چنانچہ ذیل کے بیان سے بھی اس کی تائید ہو سکتی ہے۔

آمین کا رواج :- دعا کے موقع پر آمین کا دستور ملت ابراہیمی کی ہر سہ شاخوں میں برابر پایا جاتا ہے۔ یعنی یہودیوں میں بھی، عیسائیوں میں بھی اور مسلمانوں میں بھی۔

دہلیسٹر اور ٹال وغیرہ۔

کالے

سورہ یونس، پ ۱۱ میں وارد ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ نے فرعون اور فرعونوں کے حق میں بددعا کی تو اس پر اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا۔ قداجیبت دعوتکما یعنی تمہاری دعا قبول ہو چکی ہے۔ دعا کرنے کے وقت صرف حضرت موسیٰؑ کا ذکر ہے لیکن قبولیت کی بشارت کے اسے ہر دو (حضرت موسیٰؑ و ہارونؑ) کی طرف مضاف کیا ہے۔ کیوں کہ دعوتکما میں کما ضمیر مخاطب تشبیہ کی ہے۔ اس کی بابت تفسیر ”سراج منیر“ؒ میں لکھا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کا قول ہے کہ حضرت موسیٰؑ دعا مانگتے تھے اور حضرت ہارونؑ آمین پکارتے تھے۔ چونکہ آمین کہنے والا بھی شریک دعا ہوتا ہے اس لیے مقام بشارت میں دعا کو ہر دو کی طرف مضاف کیا۔

نیز اس کا حوالہ زبور نمبر ۴۱، آیت ۱۳ میں اور زبور نمبر ۱۰۶، آیت ۴۸ میں بھی ملتا ہے۔ جس سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ یہ لفظ عبرانی الاصل ہے۔ (واللہ اعلم) عیسائیوں میں بھی آمین کا رواج برابر پایا جاتا ہے اور وہ دعا مناجات کے وقت باظہار اخلاص آمین پکارتے ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ آمین کا رواج ملت ابراہیمی کی ہر سہ شاخوں (یسود، نصاریٰ اور مسلمانوں) میں برابر پایا جاتا ہے اور یہ عبارت گزار لوگوں میں قدیمی دستور ہے۔

سورہ فاتحہ اور آمین :- سورہ فاتحہ کا ابتدائی حصہ اسمائے الہیہ اور اس کی حمد و ثناء اور اس کی صفات جلال و جمال میں ہے۔ درمیانی حصہ یعنی ایاک نعبد، الایہ۔ میں اظہار عبودیت و احتیاج کا طریقہ بتایا گیا ہے۔ اور اخیر میں دعا و التجا کی تعلیم ہے۔ اسی دعا و التجا کی وجہ سے اس سورہ کا نام سورہ ”تعلیم المسئلہ“ والدعاء و المناجات بھی ہے۔ یعنی ایسی سورت جس میں اللہ تعالیٰ سے درخواست و سوال اور دعا کرنے اور اس سے جواز و نیاز کی باتیں کرنے کی تعلیم ہے۔ پس جب یہ سورت دعا، مناجات اور درخواست و عرض معروض کی بھی متضمن ہے تو اس کے خاتمہ پر آمین کا پکارنا نہایت موزوں و مناسب

ﷲ یہ توجیہ یعنی حضرت موسیٰؑ کا دعا کرنا اور حضرت ہارونؑ کا آمین پکارنا دیگر تفاسیر مثلاً خازن، ابن کثیر میں بھی مذکور ہے لیکن اس کی نسبت حضرت ابن عباسؓ کی طرف ”سراج منیر“ میں مذکور ہے۔ اس لیے متن میں اسی کا ذکر کیا گیا ہے۔

ہے۔ یوں سمجھئے کہ جو کچھ اس سورت کی قرات میں بالتفصیل درگاہ الہی میں عرض کی گئی ہے۔ آمین میں اسی کی درخواست بالا جمال کی گئی ہے اور اسی کی مناسبت تفصیل و اجمال کی وجہ سے حضرت موسیٰؑ کے ساتھ حضرت ہارونؑ نے آمین پکاری تھی۔ یعنی جو کچھ حضرت موسیٰؑ نے مفصلاً عرض کیا۔ وہی حضرت ہارونؑ نے بالا جمال طلب کیا اور یہی سر

اس حدیث میں بتایا گیا ہے کہ جب تم میں سے کوئی آمین کہتا ہے تو آسمان میں فرشتے بھی آمین کہتے ہیں۔ پس جس کی آمین کو ملائکہ کی آمین سے موافقت و مناسبت ہو گئی۔ اس کے جملہ گزشتہ گناہ بخشے گئے۔ (صحیحین)

ملائکہ کی طہارت و پاکیزگی اور ذکر و عبادت الہی ان کا مایہ حیات ہونا معلوم ہے اور بنی آدم کی کمزوری اور پریشانی خاطر بھی معلوم ہے۔ پس جب بنی آدم بھی خشوع و خضوع اور حضور قلب و توجہ الی اللہ اور ذوق و شوق عبادت اور اخلاص دلی حاصل کر سکیں اور فرشتوں کی جماعت ان کی دعا و آمین کے ساتھ آمین پکارے تو اس عبادت و قرات اور دعا و آمین کا جو مرتبہ بڑھ سکتا ہے، وہ اہل دل کے لیے محتاج بیان نہیں۔

اسرار و فضائل آمین:- بنی آدم کے ذکر و عبادت اور دعا و مناجات کی مجالس میں بوجہ روحانی مناسبت کے ملائکہ اللہ بھی شامل ہوتے ہیں۔ جیسا کہ حدیث شریف میں وارد ہے کہ سرور کائنات ﷺ نے فرمایا:-

ان للہ ملائکۃ یطوفون فی الطرق یلتمسون اہل الذکر (حسن حصین، ص ۱۳)
”اللہ تعالیٰ کے بعض فرشتے ہیں جو رستوں میں پھرتے رہتے ہیں (اور) اہل ذکر (خدا یاد لوگوں) کو تلاش کرتے رہتے ہیں۔“

اس مجلس ذکر و عبادت میں بنی آدم کا اخلاص و حضور قلب جس قدر زیادہ ہوگا۔ اسی قدر ملائکہ اللہ سے مناسبت زیادہ ہوگی اور عالم ناسوت اور عالم ملکوت کے یہ اخلاص بھرے کوائف روحانیہ عالم بالا میں صعود کر کے شرف قبولیت پانے کے لائق ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ سورہ فاطر میں فرمایا:-

الیہ یصعد الکلم الطیب والعمل الصالح یرفعہ (فاطر، پ ۲۲)
”اسی اللہ کی طرف چڑھتا ہے کلمہ طیب اور وہی (خدا) عمل صالح کو بلند کرتا

ہے۔ ”۱۱۹ھ

ایسے خلوص و اثابت کی حالت میں فرشتوں کی شمولیت میں جو دعا کی جائے۔ وہ قبولیت کے نہایت قریب ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اسی معنی کو نبی اکرم ﷺ نے اس حدیث میں سمجھایا ہے کہ اذا امن الامام فاعنوا فانه من وافق تامينه تامين الملائكة غفر له ما تقدم من ذنبه قال ابن شهاب كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول آمين (آمین و غیرہ)

”جب امام آمین کہے تو تم بھی آمین کہو۔ پس حقیقت یہ ہے کہ جس شخص کی آمین کو ملا کہ کی آمین کی موافقت و مناسبت ہو گئی تو اس کے جملہ گزشتہ گناہ بخشے گئے۔ امام زہریؒ جو اس حدیث کے راویوں میں سے ہیں۔ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ خود بھی آمین پکارتے تھے۔“

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ اپنی مایہ ناز و سرمایہ اعزاز کتاب ”حجتہ اللہ“ میں یہ حدیث نقل کر کے فرماتے ہیں۔ (اقول) الملائكة يحضرون الذكر رغبة منهم فيه و يؤمنون على ادعيتهم لاجل ما يترشح عليهم من الملا الاعلى و فيه اظهار التماسي بالامام واقامة لسنة الاقتداء (حجتہ اللہ، مطبوعہ مصر، جلد ثانی، ص ۸)

”(میں کہتا ہوں کہ) فرشتے ذکر الہی کے وقت اس میں رغبت رکھنے کی وجہ سے حاضر ہوتے ہیں اور عبادت گزاروں کی دعاؤں پر آمین کہتے ہیں۔ ان برکات کی وجہ سے جو ان پر ملاء اعلیٰ (ملائکہ مقربین و عالمین عرش) سے مترشح ہوتی ہیں اور اس میں امام

۱۱۹ھ یرفعہ کی ضمیر فاعلی اور مفعول کے لحاظ سے مفسرین نے اس آیت کے دو اور معنی بھی لکھے ہیں۔ (۱) اسی اللہ تعالیٰ کی طرف چڑھتا ہے کلمہ طیب اور وہ کلمہ طیب عمل صالح کو بلند کرتا ہے۔ یعنی کلمہ طیبہ جو لا الہ الا اللہ ہے۔ یعنی اللہ کی توحید کا اقرار و ایقان عمل صالح کے مقبول ہونے کا ذریعہ و سبب بنتا ہے ورنہ بغیر ایمان کے کوئی عمل بھی قبول نہیں ہوتا۔ (۲) اسی اللہ تعالیٰ کی طرف چڑھتا ہے ہر کلمہ طیب، جو بھی پاک کلمہ ہو اور عمل صالح اس کلمہ کو بلند کرتا ہے یعنی زبان سے کوئی پاک کلمہ کہنے کے ساتھ اگر عمل صالح بھی شامل ہو تو وہ زبان کے کلمات بھی قبول ہو جاتے ہیں ورنہ محض زبانی جمع خرچ بغیر عمل کے قبول نہیں ہوتا۔ (تفسیر معالم و غیرہ)

کی پیروی کا اظہار بھی ہے اور طریق اقتداء کی اقامت بھی ہے۔“

امام، مقتدی اور منفرد ہر ایک آئین کے:- اوپر کے بیان سے واضح ہو چکا ہے کہ حضور اکرم ﷺ خود بھی آئین پکارا کرتے تھے اور صحابہ کرامؓ کو بھی جو آپ کے مقتدی ہوتے تھے۔ آئین پکارنے کا حکم فرمایا کرتے تھے اور صحابہ کرامؓ اس حکم کو بجالایا کرتے تھے۔ ایسی سب احادیث کا خلاصہ مطلب حافظ ابن قیمؒ نے نہایت مختصر الفاظ میں یوں کیا ہے۔ فاذا فرغ من قراءة الفاتحة قال امين فان كان يجهر بالقراءة رفع بها صوته وقالها من خلفه (زاد المعاد، جلد ۱، ص ۵۳)

”پس جب آپ قرات فاتحہ سے فارغ ہوتے تو کہتے آئین۔ پس اگر اونچی قرات پڑھتے تو آئین بھی اونچی کہتے اور صحابہ کرامؓ بھی جو آپ کے پیچھے ہوتے، وہ بھی آئین کہتے۔“

اس بیان سے امام کا اور مقتدی کا آئین پکارنا اور فرشتوں کی حاضری اور فرشتوں کی موافقت اور امام کی پیروی اور اقتدار کا اظہار سب کچھ معلوم ہو گیا۔ اب صرف یہ باقی رہ گیا ہے کہ کیا اکیلا نمازی بھی فاتحہ کے بعد آئین کہے۔ سو اس کے لیے تھوڑی سی توجہ درکار ہے کہ جب آئین فاتحہ کے تابع ہے تو اکیلا بھی جب فاتحہ سے فارغ ہو، آئین کہے۔ حضرت امام شافعیؒ ”کتاب الام“ میں فرماتے ہیں:-

واحب قولها لكل من صلى رجل او امرأة او صبي في جماعة كان او غير جماعة (جلد اول، ص ۹۵) رحمہ اللہ

”اور میں (امام شافعیؒ) محبوب رکھتا ہوں۔ اس (آئین) کا کہنا، واسطے ہر شخص کے جو نماز پڑھے، مرد ہو، یا عورت ہو، یا لڑکا ہو، جماعت میں ہو یا غیر جماعت میں ہو۔“

شیخ عبدالحق حنفیؒ شرح ”سفر السعادت“ میں فرماتے ہیں:-

”آئین گفتن بعد قرات فاتحہ در نماز سنت است و فضل بسیار دارد، خواه منفرد باشد، خواه امام و خواه مقتدی، ہر چند امامش گوید“ (ص ۵۳)

فاکسار (میریا لکھوٹی) کہتا ہے کہ اس مسئلے کا اصل صحیح مسلم کی حدیث سے ماخوذ

۱۲۰ امام شوکانیؒ نے بھی ایسا ہی لکھا ہے۔ (دیکھئے نیل الاوطار، جلد ۱، ص ۱۱۶)

ہے۔ جس کے الفاظ یہ ہیں۔ اذا قال احدكم فى الصلوة امين (الحديث) چنانچہ امام نوویؒ اس کے ذیل میں فرماتے ہیں۔ وقد اجتمعت الامة على ان المنفرد يؤمن بـ"امنت محمدية" کا اس بات پر اجماع ہے کہ منفرد بھی آمین کے۔

اونچی قرأت کے وقت اونچی آواز سے اور آہستہ کے وقت آہستہ سے آمین کہے

جب معلوم ہو چکا کہ آمین سورہ فاتحہ کے تابع ہے۔ تو اس کا طریق ادا معلوم کرنا نہایت آسان ہے کہ اس کے ادا کرنے کی کیفیت بھی سورہ فاتحہ کی ادائیگی کے مطابق ہونی چاہیے۔ یعنی اگر سورہ فاتحہ اونچی پڑھی جائے تو آمین بھی اونچی اور اگر سورہ فاتحہ آہستہ پڑھی جائے تو آمین بھی آہستہ کہی جائے۔ جیسا کہ بسم اللہ کے بیان میں گزر چکا کہ بسم اللہ اونچی قرأت کے وقت اونچی پڑھی جائے اور خفیہ کے وقت خفیہ پڑھی جائے۔ فرق صرف یہ ہے کہ بسم اللہ جزو سورت ہے اور آمین جزو نہیں ہے بلکہ تفصیلی دعا کے خاتمہ پر اجمالی دعا ہے۔ تو جب تفصیلی دعا اونچی آواز سے مانگی ہے تو اب اجمالی دعا اونچی آواز سے کرنے میں کیا قباحت ہے۔ بلکہ یہ تو موافق و مناسب حال ہونے کی صورت میں نہایت ہی موزوں و معقول ہے۔ سرور دو عالم ﷺ کی سنت یہی ہے۔ جیسا کہ آئندہ بیان سے اللہ تعالیٰ کے فضل سے معلوم ہو جائے گا اور خوب یاد رکھئے اور دل میں گرہ دے کر یاد رکھئے کہ جناب رسالت ماب ﷺ کی ہر سنت، آپؐ کی ہر ادا، آپؐ کا ہر قول، آپؐ کا ہر فعل، آپؐ کی ہر حرکت اور آپؐ کا ہر سکون باحکمت، نہایت معقول اور مناسب وقت و موافق حال ہوتا تھا اور عقلاء کے نزدیک یہ سب امور حکمت میں داخل ہیں اور اللہ رب العزت نے آپؐ کو معلم حکمت بنا کر بھیجا ہے۔ چنانچہ فرمایا۔ و يعلمهم الكتاب و الحکمة (جمع، پ ۲۸) ”میرا نبی (محمد ﷺ) لوگوں کو کتاب الہی اور حکمت (مناسب طریق عمل) سکھاتا ہے۔“

لیجئے پہلے رسول عربی ﷺ کی سنت سے اس کا ثبوت دیکھئے پھر اس کی حکمت

مجھے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:-

اذا من الامام فامنو فانه من وافق تامينه تامين الملائكة غفر له ما تقدم من ذنبه قال ابن شهاب وكان رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول امين (موطا) امام مالک

”جب امام آمین کہے تو تم بھی آمین کہو۔ پس حقیقت یہ ہے کہ جس کی آمین کو فرشتوں کی آمین سے موافقت ہو گئی۔ اس کے پہلے گناہ بخش دیئے گئے۔ امام زہریؒ کہتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ خود بھی آمین کہا کرتے تھے۔“

اس حدیث کی صحت میں کسی محدث اور کسی امام کو اختلاف نہیں۔ دنیا جہان کے محدثین نے اسے قبول کیا۔

اول: اس لیے کہ یہ امام موطا مالکؒ کی روایت ہے اور موطا میں جو بھی مسند و مرفوع حدیث مکتوب ہے، وہ صحیح ہے۔

دوم: اس لیے کہ اسے امام بخاریؒ و مسلم نے بھی صحیحین میں امام مالکؒ کے واسطے سے ذکر کیا ہے۔

سوم: اس لیے کہ شیخین کے علاوہ دیگر ائمہ حدیث نے بھی اسے امام مالکؒ کے واسطے سے روایت کیا۔ مثلاً امام محمدؒ، امام شافعیؒ، امام ابو داؤدؒ، امام ترمذیؒ، امام نسائیؒ (من غیر زیادة ابن شہاب)، امام بیہقیؒ رحمہ اللہ اور بعض دیگر نے امام مالکؒ کی بجائے امام سفیان بن عیینہؒ کے واسطے سے روایت کیا اور وہ بھی علم حدیث میں امام مالکؒ کی طرح جلیل القدر امام ہیں۔ غرض دنیا جہان کے محدثین کا اس حدیث کی صحت پر اتفاق ہے۔

وجہ استدلال:- حافظ ابن حجرؒ ”شرح صحیح بخاریؒ“ میں فرماتے ہیں:-

وجه الدلالة من الحديث انه لو لم يكن التامين مسموعا للما موم لم يعلم به وقد علق تامينه بتامينه (فتح الباری، مطبوعہ دہلی، ج ۳، ص ۳۲۶)

”اس حدیث سے صورت استدلال کی یہ ہے کہ اگر مقتدی امام کی آمین نہ سنے تو اسے اس کا علم نہیں ہو سکتا۔ حالانکہ نبی اکرم ﷺ نے اس کی آمین کو اس کی آمین سے وابستہ کیا ہے۔“

امام بن قیّمؒ نے ”اعلام المؤمنین“ میں اس حدیث مذکور کے متعلق حضرت امام شافعیؒ کی نہایت مدلل تقریر نقل کی ہے۔ جس کا ترجمہ حسب ذیل ہے۔

”ریج کہتے ہیں کہ امام شافعیؒ سے کسی نے پوچھا کہ آیا امام ابوحنیفہؒ سے آمین پکارے۔ تو آپؒ نے فرمایا ہاں بلکہ جو لوگ امام کے پیچھے ہوں (مقتدی) بھی اپنی آوازیں (آمین کے ساتھ) بلند کریں۔ اس پر میں نے عرض کیا کہ اس کی کیا دلیل ہے؟۔ تو آپؒ نے فرمایا۔ انبانا مالک یعنی ہم کو امام مالکؒ نے خبر دی اور امام صاحبؒ نے حضرت ابو ہریرہؓ والی حدیث جس کی محنت پر سب کا اتفاق ہے، ذکر کی اور کہا کہ رسول اللہ ﷺ کے فرمان (واجب الاذعان) اذا من الامام فامنوا میں اس بات کی دلالت ہے کہ آپؐ نے امام کو امر کیا کہ وہ آمین بالجر ہے۔ کیوں کہ جو اس کے پیچھے ہیں وہ سوائے اس کے اس کے آمین کہنے کا وقت نہیں جان سکتے کہ وہ آمین سنا کر کہے۔ پھر یہ کہ ابن شہاب (راوی حدیث) نے صاف طور پر بیان بھی کر دیا کہ رسول اللہ ﷺ آمین کہا کرتے تھے۔ اس پر میں نے امام شافعیؒ سے عرض کیا کہ ہم تو امام کے آواز بلند کرنے کو پسند نہیں کرتے۔ تو آپؒ نے فرمایا کہ یہ بات (نا پسندیدگی) اس کے خلاف ہے۔ جو تمہارے استاد اور ہمارے استاد نے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا اور اگر ہمارے پاس اور ان کے پاس سوائے اس حدیث کے جو ہم نے (ابھی) امام مالکؒ سے نقل کی۔ دیگر کوئی بھی علم نہ ہو تو پھر بھی بجا ہے کہ اس بات پر استدلال کریں کہ رسول اللہ بالجر آمین کہتے تھے۔ اور نیز اس بات پر کہ آپؐ نے امام کو آمین کا حکم دیا کہ وہ بالجر کہے۔ کیوں کہ اہل علم ہمیشہ اس پر عامل رہے ہیں اور حضرت وائل بن حجرؒ (صحابی) نے بھی روایت کیا ہے کہ نبی مکرم ﷺ آواز بلند کر کے آمین پکارتے تھے اور اسے کھینچ کر پکارنے کی بھی روایت ہے اور حضرت ابو ہریرہؓ اپنے امام سے کہا کرتے تھے کہ (میرے صفوں کی درست کرنے کی حالت میں) مجھ سے پہلے پہلے آمین نہ کہہ دیا کرنا اور حضرت ابو ہریرہؓ اس وقت اس امام (مروان) کے مؤذن تھے۔ (امام شافعیؒ نے کہا)

نیز ہم کو مسلم بن خالد (ذخعی مکی) نے امام ابن جریج مکی سے انہوں نے حضرت عطاء (تابعی مکی) سے خبر دی کہ حضرت عطاءؒ نے کہا کہ میں حضرت عبداللہ بن زبیرؓ (مکی صحابی) اور ان کے بعد کے ائمہ کو اور ان کے پچھلے (مقتدی) لوگوں کو آمین کہتے سنا کرتا

تھا۔ حتیٰ کہ مسجد (حرم کعبہ) میں آوازیں (جمع ہو کر) بہت بلند ہو جاتی تھیں۔
حافظ ابن قیمؒ نے حضرت عطاءؒ سے یہ قول بھی نقل کیا کہ میں نے اس مسجد
(خانہ کعبہ) میں دو سو اصحاب رسول اللہ ﷺ کو پایا کہ جب امام غیر المغضوب علیہم ولا
الضالین کہتا تو میں ان کی آمین (بیک آواز پکارنے) کی لرز اور لرستا تھا۔ (اعلام
الموتعین، جلد ۲، ص ۴)

گو حدیث مذکور کی صحت میں کسی کو کلام نہیں اور وجہ استدلال جو حافظ ابن حجرؒ
اور امام شافعیؒ کے کلام سے بیان ہوئی۔ وہ بھی بالکل صاف ہے۔ اس میں کوئی پیچیدگی یا
کلف نہیں ہے۔ اور اس کے مطابق خود رسول پاک ﷺ کا عمل اور آپؐ کے پیچھے
سینکڑوں صحابہ کرامؓ کا بلند آواز سے آمین پکارنا ایک قبیح سنت اور جماعت صحابہ کرامؓ کے
پیروی یعنی اہل سنت والجماعت کے لیے کافی سے زیادہ موجب طہائنت ہے لیکن ہم اپنے
مدعا کو زیادہ واضح کرنے کے لیے اس کی تائید میں دیگر روایات بھی ذکر کرتے ہیں۔ (واللہ
الموفق)

سنن نسائی میں نعیم مجمرؒ سے روایت ہے کہ:-

عن نعیم المجمر قال صلیت وراء ابی ہریرۃ فقرء بسم اللہ الرحمن
الرحیم ثم قرء بام القرآن حتی اذا بلغ غیر المغضوب علیہم ولا الضالین

عطاء بن ابی رباح اوساط تابعین میں سے بڑے اور بلند مرتبہ کے امام ہیں۔ حضرت ابن
عباسؓ ان کی بغایت عزت کیا کرتے تھے۔ امام ابو حنیفہؒ روایت حدیث میں ان کے شاگرد
ہیں۔ ان کے حق میں آپؐ کی یہ گواہی ہے مارایت فیمن رایت افضل من عطاء (میزان
الاعتدال ترجمہ جابر جعفی) یعنی ”میں نے جتنے علماء دیکھے“ ان میں کسی کو عطا سے افضل نہیں
دیکھا۔“ بڑے بڑے جلیل القدر امام ان کے شاگرد ہیں۔ انہوں نے دو سو اصحاب رسول اللہ
ﷺ کو دیکھا ہے۔ ۱۱۳ھ میں مکہ شریف میں فوت ہوئے۔

نعیمؒ کا باپ مسجد نبویؐ کا خادم تھا۔ جو مسجد میں خوشبو دھکایا کرتا تھا۔ جس کی وجہ سے اس
کا نام مجمر پڑ گیا۔ اسی وصف سے بیٹے کا نام بھی مجمر مشہور ہو گیا اور نعیم خود بھی یہی
خدمت بجالاتا تھا۔ ثقات تابعین سے ہے۔ بیس عجیب برس تک حضرت ابو ہریرہؓ کی صحبت
میں رہا۔ (تہذیب التہذیب، ج ۱، ص ۴۶۵)

فقال امين فقال الناس امين و يقول كلما سجد الله اكبر و اذا قام من الجلوس في الاثنين قال الله اكبر و اذا سلم قال والذي نفسي بيده اني لا شبهكم صلوة برسول الله صلى الله عليه وسلم (نائي، ص ۱۵۱)

”میں نے حضرت ابو ہریرہؓ کے پیچھے نماز پڑھی تو انہوں نے پڑھی بسم اللہ الرحمن الرحیم پھر (باقی) سورہ فاتحہ پڑھی۔ حتیٰ کہ جس وقت غیر المغضوب علیہم ولا الضالین پر پہنچے تو کہا آمین۔ پس لوگوں (مقتدیوں) نے بھی کہا آمین۔ اور آپ جب بھی سجدے میں جاتے تو کہتے اللہ اکبر اور جب دوسری رکعت کے تشدد سے کھڑے ہوئے تو کہا اللہ اکبر اور جب سلام پھیری تو کہا قسم اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ میں نماز میں تم سب سے بڑھ کر رسول اللہ ﷺ کے مشابہ ہوں۔“

حضرت ابو ہریرہؓ سے ایک دوسری مرفوع روایت بھی ہے، وہ کہتے ہیں کہ:-

قال كان النبي صلى الله عليه وسلم اذا فرغ من قراءة القرآن رفع صوته و قال امين (تخفيض الحبير، جلد ۱، ص ۸۹)

”جب نبی پاک ﷺ سورہ فاتحہ کی قرات سے فارغ ہوتے تو اپنی آواز بلند کر کے کہتے، آمین۔“

حافظ ابن حجرؒ نے تخفیف ہی میں اس روایت کی اسناد کی نسبت لکھا ہے:-

قال الدارقطني اسنادہ حسن والحاكم صحيح على شرطهما والبيهقي حسن صحيح (ص ۸۹)

”امام دارقطنیؒ نے کہا۔ اس کی اسناد حسن ہے اور امام حاکمؒ نے کہا کہ بخاری و مسلم کی شرط پر صحیح ہے اور امام بیہقیؒ نے کہا کہ حسن صحیح ہے۔“

عن ام حصين انها صلت خلف رسول الله صلى الله عليه وسلم فلما قال ولا الضالين قال امين فسمعتة وهي في صف النساء (زيلعي، ص ۱۹۶)

”ام حصینؓ ایک صحابیہ خاتون ہے۔ اس نے حضرت محمد ﷺ کی اقتداء میں نماز پڑھی۔ جب آپؐ نے پڑھا ولا الضالین تو کہا آمین۔ پس اس نے (آپؐ کی آمین) سن لی۔

حالانکہ وہ عورتوں کی صف میں (مردوں کے بہت پیچھے کھڑی) تھی۔“

خاکسار کہتا ہے کہ حافظ زبیلیؒ حنفی نے بھی تخریج ہدایہ میں اس روایت کا ذکر کیا

ہے لیکن اس کی شرح حال کی نسبت سکوت کیا ہے۔ حالانکہ اس سے قبل کئی ایک احادیث جبر کے متعلق تنقیدی جرح بھی کر دی ہے۔

اسی طرح امام ترمذیؒ نے حضرت وائل بن حجر حمیریؒ سے روایت کیا ہے کہ:-

عن وائل بن حجرؒ قال سمعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم قرء غیر المغضوب علیہم ولا الضالین وقال امین و مدبھا صوتہ و فی الباب عن علیؑ و ابی ہریرۃ قال ابو عیسیٰ حدیث وائل بن حجر حدیث حسن و بہ یقول غیر واحد من اهل العلم من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم و التابعین و من بعدهم یرون ان یرفع الرجل صوتہ بالتامین ولا یخفیہا و بہ یقول الشافعیؒ و احمدؒ و اسحق (ترمذیؒ جلد ۱، ص ۳۴)

”انہوں نے کہا کہ میں نے نبی پاک ﷺ کو غیر المغضوب علیہم ولا الضالین پڑھنے سنا اور آپؐ نے کہا آمین اور آپؐ نے اس (آمین) سے اپنی آواز کو کھینچا اور اس باب (آمین بالجہر) میں حضرت علیؑ اور حضرت ابو ہریرہؓ سے بھی روایت ہے۔ ابو عیسیٰ (امام ترمذیؒ) کہتے ہیں کہ وائل بن حجر کی یہ روایت حسن ہے اور اسی کے مطابق کہتے ہیں۔ کئی ایک اہل علم اصحاب نبی ﷺ میں سے اور تابعین میں سے اور ان کے بعد کے علماء تبع تابعین و مجتہدین میں سے جن کا یہ مذہب ہے کہ آدمی آمین کے ساتھ اپنی آواز بلند کرے اور اسے مخفی نہ کرے اور اسی کے مطابق قول ہے امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کا بھی اور امام اسحقؒ کا بھی۔“

امام ترمذیؒ کی یہ روایت جو وائل بن حجرؒ سے ہے۔ بڑے معرکہ کی ہے۔ اس کا مفصل حال اور اس کے بعد امام ترمذیؒ نے جو کچھ کئی ایک صحابہ کرامؓ و تابعین و غیرہم کے مذہب کے متعلق لکھا ہے۔ اس کی تشریح معلوم ہو جانے سے مسئلہ آمین بالجہر کا صاف صاف فیصلہ ہو جاتا ہے اور کوئی الجھن باقی نہیں رہتی۔ چنانچہ ہم اس کی بابت چند باتیں کسی قدر وضاحت سے لکھتے ہیں:-

(۱) اس روایت میں یہ الفاظ ہیں۔ مدبھا صوتہ (کھینچی نبی ﷺ نے ساتھ آمین کے آواز اپنی) اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ آواز کو بلند کیا یعنی اونچی آواز سے کہا آمین۔ دوم یہ کہ آمین کے الف کو کھینچ کر یعنی مد سے پڑھا۔

چونکہ امام ابو داؤد اور امام دار قطنی رحمہ اللہ کی روایات میں مدبھا صوتہ کی بجائے رفع بھا صوتہ اور ابو داؤد کی ایک دوسری روایت میں الفاظ جہربھا وارد ہیں۔ بلکہ سنن دار قطنی میں حضرت وائل بن حجرؓ کے علاوہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ کی روایات میں بھی رفع بھا صوتہ ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ مدبھا صوتہ سے مراد پہلے معنی ہیں۔ یعنی بلند آواز سے آمین پکارنا مراد ہے۔ کیوں کہ ایک حدیث دوسری حدیث کی تائید و تصدیق اور تفسیر و توضیح کرتی ہے۔

۲۔ دوسری بات جو امام ترمذیؒ نے اس روایت میں کہی ہے۔ یہ ہے کہ یہ مضمون حضرت علیؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ سے بھی مروی ہے۔ سو حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت تو اوپر مذکور ہو چکی ہے۔ باقی رہی حضرت علیؓ کی روایت سوائے ”کنز العمال“ میں یوں نقل کیا ہے:-

عن علیؓ قال کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا قال ولا الضالین قال آمین یرفع بھا صوتہ وابن ماجہ وابن جریر و صححہ وابن شاہین (کنز العمال، جلد ۳، ص ۲۱۰)

”نبی پاک ﷺ جس وقت کہتے ولا الضالین تو کہتے آمین، بلند کرتے ساتھ اس (آمین) کے آواز اپنی۔ روایت کیا اسے ابن ماجہؒ نے اور ابن جریرؒ نے بھی اور اسے صحیح کہا اور ابن شاہین نے بھی۔ (اسے روایت کیا)“

سنن ابن ماجہ کے الفاظ یوں ہیں۔ عن ححبیہ بن عدی عن علیؓ قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا قال ولا الضالین قال آمین (ابن ماجہ، ص ۶۳)

”حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ سنائیں نے رسول اللہ ﷺ کو کہ جس وقت آپ ولا الضالین کہتے تو کہتے آمین۔“

ابن ماجہ کی اس روایت کے سب راوی ثقہ ہیں۔ صرف ححبیہ بن عدی میں

سنن ابی داؤد، جلد اول، ص ۱۳۶۔

سنن دار قطنی، جلد اول، ص ۱۲۷۔

اختلاف ہے۔ سو حافظ ذہبیؒ میزان میں اس کا فیصلہ یوں کرتے ہیں:-

قلت روى عنه الحكم و سلمة بن كهيل و ابو اسحق وهو صدوق ان شاء الله
قد قال فيه العجلي ثقة (جلد اول، ص ۱۸۹)

”(امام ذہبی کہتے ہیں-) میں کہتا ہوں جیہ سے حکم بن عتیہؒ اور سلمہ بن کھیلؒ اور ابو اسحق سیمعیؒ نے روایت کیا ہے۔ (جو ثقہ اور بڑے پائے کے راوی ہیں-) اور وہ یعنی جیہ مذکور بفضل خدا صدوق (بہت سچا آدمی) ہے اور امام عجمیؒ نے اس کی بابت کہا ہے کہ وہ ثقہ ہے۔

اسی طرح حافظ ابن حجرؒ نے ”تہذیب التہذیب“ میں فرمایا:-

وقال العجلي تابعي ثقة وذكره ابن حبان في الثقات (جلد ۲، ص ۲۱۷)

”امام عجمیؒ نے کہا وہ (جیہ) تابعی ہے اور معتبر ہے اور ابن حبان نے اسے ثقات میں شمار کیا ہے۔“

(۳) تیسری بات امام ترمذیؒ نے اس حدیث کے متعلق یہ لکھی ہے کہ یہ حدیث حسن اور حدیث حسن مقبول و قابل عمل ہوتی ہے۔

حضرت واکل کی یہ حدیث امام ترمذیؒ کے علاوہ امام احمدؒ، امام ابوداؤدؒ، امام دارقطنیؒ اور امام ابن حبانؒ نے بھی روایت کی ہے۔ امام دارقطنیؒ نے کہا کہ یہ حدیث صحیح ہے اور امام شوکانیؒ نے حافظ ابن حجرؒ سے نقل کیا کہ اس کی اسناد صحیح ہے۔ نیز کہا۔ وقد حسن الحديث الترمذی وقال ابن سید الناس ینبغی ان یکون صحیحاً

”امام ترمذیؒ نے اسے حسن کہا ہے اور امام ابن سید الناسؒ نے کہا۔ یہ حدیث اس لائق ہے کہ صحیح ہو۔ (جیسا کہ امام دارقطنیؒ اور حافظ ابن حجرؒ نے صحیح کہا ہے۔)“

اور امام بخاریؒ اور امام ابو زرعہؒ نے بھی امام سفیانؒ اور امام شعبہؒ کے اختلاف کے ضمن میں اس کو اصح کہا ہے۔ غرض یہ حدیث اتنے ائمہ حدیث نقادین کے نزدیک حسن صحیح قابل قبول و لائق عمل ہے اور اس کی نسبت کسی امام حدیث کو کلام نہیں۔ بلکہ اسے علمائے حنفیہؒ نے بھی قبول کیا ہے۔ چنانچہ ہم ان کے اقوال

آئندہ الگ طور پر نقل کریں گے۔ (واللہ الموفق)

(۳) چوتھی بات اس حدیث پر امام ترمذیؒ نے یہ فرمائی ہے کہ اس حدیث کے مطابق کئی ایک صحابہ کرامؓ، تابعینؒ، تبع تابعینؒ اور ائمہ مجتہدین کا یہی مذہب ہے کہ (امام کی جبری قرات کے وقت) آمین بھی بالجر کسی جائے۔

سو اس کی تشریح میں ہم بعض صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ وغیرہم کے اسمائے گرامی ذیل میں درج کرتے ہیں۔ جن سے آمین مختلف عنوانوں سے منقول ہے۔ کسی سے صریحاً اور کسی سے استنباطاً آمین بالجر ثابت ہے۔ کوئی ان میں سے اصالتاً مقام احتجاج میں قائم ہے اور کوئی تائیداً، غرض مسئلہ آمین بالجر کے ثبوت میں اب کوئی تردد باقی نہیں رہ سکتا۔

صحابہ کرامؓ:- حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت بلالؓ، حضرت معاذ بن جبلؓ، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ، حضرت انس بن مالکؓ، حضرت سلمان فارسیؓ، حضرت سرہ بن جندبؓ، حضرت ابو موسیٰؓ، حضرت وائل بن حجرؓ، حضرت ابو زہیر نمیریؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت ام حصین صحابیہؓ اور حضرت حبیب بن سلمہؓ (رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین)

یہ وہ اسماء ہیں جو تعیناً و تفصیلاً معلوم ہو سکے ہیں۔ ان کے علاوہ جن کا ذکر اجمالاً وارد ہے۔ وہ بہت زیادہ ہیں۔ چنانچہ حضرت عطاء تابعیؒ کی روایت سے اوپر گزر چکا ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے اسی مسجد یعنی بیت اللہ میں دو سو اصحاب رسول اللہ ﷺ کو پایا۔ جو امام کے پیچھے بلند آواز سے آمین پکارتے تھے اور مسجد میں ان کی متفقہ آواز سے ایک لہر پیدا ہو جاتی تھی۔ (ص ۳۹۵) اور خاکسار میر سیالکوٹی، نہایت وثوق سے بلا خوف و تردید کہنے کو تیار ہے کہ آپ اسفار حدیث کی ورق گردانی کر کے تسلی کر لیں کہ کسی ایک صحابی سے بھی سند صحیح منقول نہیں کہ اس نے جبری قرات کے وقت حضور پاک ﷺ سے خفیہ آمین نقل کی ہو یا خود کسی ہو۔ اگر کوئی ایسی روایت آپ کو معلوم ہو تو اس کی سند کی پڑتال سے آپ کو واضح ہو جائے گا کہ وہ صحیح نہیں ہے۔ (واللہ الماوی)

اسمائے تابعین:- تابعینؒ میں سے بھی ایک کثیر گروہ آمین بالجر کا قائل اور اس پر

عالم رہا ہے، جن میں سے بعض کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں:-

عطاء بن ابی رباح مکی، ابن شہاب زہری مدنی، ابن جریج رومی مکی، ابو مصعب مرقائی (دمشقی)، قییم عمر، عکرمہ وغیرہم رحمہم اللہ اور جملہ وہ تابعین جنہوں نے مذکورہ بالا صحابہ کرام سے احادیث آئین بالہر روایت کیں، ان پر مزید ہیں۔

ائمہ مجتہدین:- امام شافعی، امام احمد، امام اسحق، امام اوزاعی، امام عبد اللہ بن مبارک، امام سفیان ثوری، امام عبد الرحمن ممدی، امام داؤد طائی اور امام ابو زرعہ رازی رحمہم اللہ۔

ائمہ محدثین:- امام بخاری، امام مسلم، امام ترمذی، امام دار قطنی، امام ابو داؤد، امام نسائی، امام ابن ماجہ، امام داری اور امام بیہقی وغیرہم رحمہم اللہ۔

علماء و شراح حدیث:- امام ابن قییم، امام نووی، حافظ ابن حجر، حضرت شاہ ولی اللہ، امام شوکانی، شیخ عبدالحق دہلوی حنفی، شیخ ابن العمام حنفی، مولیٰ عبدالحی صاحب لکھنؤی حنفی، مولوی سراج احمد صاحب سرہندی حنفی اور حضرت پیر عبدالقادر جیلانی رحمہم اللہ۔

حدیث دان حنفی علماء، جنہوں نے احادیث جہر کو قبول کیا

حنفی علماء علی لحاظ سے دو طرح پر ہوئے ہیں۔ ایک وہ جنہوں نے اپنے مذہب کے متون و شروح اور اقوال ائمہ کو خوب ضبط کیا لیکن ماہر حدیث نہ تھے۔ دوسرے وہ جنہوں نے اپنے مذہب کی تصریحات کے علاوہ علم حدیث میں بھی کمال حاصل کیا۔^{۱۲۹} دوسری قسم کے علماء نے اکثر فروعی و اختلافی مسائل میں طریق محدثین کو تسلیم کر لیا یا وہ اس کی طرف مائل ہو گئے اور جمود تقلید نے ان کو اتباع حدیث سے نہ روکا۔ کیوں کہ حدیث صحیح کے واضح ہو جانے کے بعد کسی مومن کے لیے مخالفت کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب ”حجتہ اللہ“ میں فرماتے ہیں:-

فان بلغنا حدیث من الرسول المعصوم الذی فرض اللہ علینا طاعته بسند

۱۲۹۔ یہ تقسیم ہم نے از خود نہیں کی بلکہ مولانا عبدالحی صاحب حنفی لکھنؤی اور ملا علی قاری صاحب حنفی کی تصریحات سے لی ہے فافہم۔

صالح يدل علی خلاف منہبہ و ترکنا حدیثہ و اتبعنا ذالک التخمین فمن
اظلم منا وما عذرنا یوم یقوم الناس لرب العالمین (حجۃ اللہ مصری، جلد اول،
ص ۱۵۵)

”اگر ہم رسول معصوم کی حدیث جس کی اطاعت اللہ تعالیٰ نے ہم پر فرض کر
دی ہے۔ صحیح سند کے ساتھ پہنچ جائے جو خلاف مذہب ہو۔ اگر ہم اس حدیث رسول
ﷺ کو چھوڑ دیں اور ظنی قول کی پیروی کریں تو ہم سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا۔ اور
قیامت کو جس دن اللہ رب العالمین کے سامنے سب حاضر ہوں گے۔ ہمارا کیا عذر ہوگا۔“
شاہ صاحبؒ کا یہ قول قرآن حکیم کی آیت کا مفہوم ہے۔ چنانچہ فرمایا:-

وما کان لمؤمن ولا مؤمنة اذا قضی اللہ ورسولہ امرًا ان یکون لہم الخیرۃ
من امرہم ومن یعص اللہ ورسولہ فقد ضلّ ضلّالاً مبیناً ○ (احزاب، پ
۲۲)

”اور کسی ایماندار مرد اور کسی ایماندار عورت کو حق نہیں پہنچتا کہ جب اللہ
تعالیٰ اور اس کا رسول ﷺ کوئی معاملہ طے کر دیں تو ان کے لیے اس امر میں کسی قسم کا
اختیار باقی رہے اور جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کرے گا تو وہ صریح
گمراہی میں پڑ چکا۔“

چنانچہ ہم ان باکمال حنفی علماء کے اقوال درج کرتے ہیں، جو جامع حدیث و فقہ
ہوئے ہیں اور انہوں نے حدیث آئین بالہر کو تسلیم کیا ہے۔

۱۔ شیخ ابن ہمامؒ:- شارح ہدایہ حنفی علماء میں خاص قابلیت کے بزرگ ہوئے ہیں،
جن پر حنفی علماء کو بجا فخر ہے۔ آپ شرح ہدایہ میں روایات جہود افتخائے آئین کا ذکر کر کے
فرماتے ہیں:-

ولو کان الی فی ہذہ لشی لرفعت بان رواۃ الخفض یراد بہا عدم القرع
الغیف وروایۃ الجہر بمعنی قولہا فی زبر الصوت وذیلہ يدل علی ما فی ابن
ماجہ کان علیہ الصلوۃ والسلام اذا تلی غیر المغضوب علیہم ولا الضالین
قال امین حتی یسمع من فی الصف الاول فیر تج بہا المسجد (فتح القدیر،
نو کثوری، جلد ۱، ص ۱۱۷)

”اگر یہ معاملہ میرے سپرد ہو تو میں اس اختلاف کو یوں رفع کروں گا کہ آہستہ کی روایت کے معنی زیادہ زور کی (چیخ والی) آواز سے نہ کہنا ہے اور جردالی والی روایت کے معنی ہیں درمیانی آواز سے پکارنا اور اس کی دلیل وہ روایت ہے جو سنن ابن ماجہ میں ہے کہ حضور اکرم ﷺ جب غیر المغضوب علیہم ولا الفالین پڑھتے تھے تو آپ کہتے ’تھے آئین۔ حتیٰ کہ وہ لوگ جو پہلی صف میں ہوتے تھے‘ سن لیتے تھے۔ پس (مقتدیوں کی متفقہ آواز کی) آئین سے مسجد (نبویؐ) لرز جاتی تھی۔“

۲۔ ابن ترکمان حنفیؒ:۔ یہ بھی حنفیہ میں مشہور اور قابل فخر حدیث دان عالم ہیں۔ ”جواہر النقی“ میں جو آپ نے امام بیہقی محدثؒ کی کتاب ”سنن کبریٰ“ کے جواب میں اور مذہب حنفی کی تائید میں لکھی ہے۔ اس کے باب آئین بالبر میں لکھتے ہیں:-

والصواب ان الخبرین بالجہربہا و المخافۃ صحیحان و عمل بکل من فعلیہ جماعۃ من العلماء و ان کنت مختاراً خفض الصوت بہا اذ کان اکثر الصحابة و التابعین علی ذالک (جلد ۱، ص ۱۳۲)

”درست یہ ہے کہ دونوں روایتیں یعنی آئین بالبر کی اور آئین بالافخا کی صحیح ہیں اور رسول اکرم ﷺ کے دونوں فعلوں (جبر اور اخفاء) پر علماء کی ایک ایک جماعت نے عمل کیا ہے۔ اگرچہ میرا اپنا مختار مذہب آواز کو پست کرنا ہے کیوں کہ اکثر صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ اسی طریق پر تھے۔“

علامہ عینیؒ:۔ اسی طرح علامہ عینیؒ جو حنفی مذہب کی حمایت میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑتے۔ شرح صحیح بخاری میں فرماتے ہیں:-

۳۔ علامہ ممدوح کا یہ کہنا کہ اکثر صحابہؓ و تابعینؒ اسی طریق پر تھے۔ ان کا اپنا خیال ہے جو واقعہ کے لحاظ سے درست نہیں۔ کیوں کہ صحابہ کرامؓ سے تو آہستہ کی کوئی روایت صحیح سند سے ثابت نہیں۔ ہاں بعض تابعین و مجتہدین آہستہ کہنے کے قائل ہیں لیکن ان کو اکثر کہنا درست نہیں۔ اکثر تابعین و مجتہدین جبری کے قائل ہیں۔ خیر کچھ ہمارا مقصود حوالہ سے یہ ہے کہ علامہ ابن ترکمانی حنفی ہو کر بھی آئین بالبر کی روایت کو صحیح مانتے ہیں۔ پس اس زمانہ کے حنفیوں کو اس سے چڑ کرامت میں اختلاف نہیں ڈالنا چاہیے۔

و يمكن ان يكون كلا الاسنادين صحيحا" و قد قال بعض العلماء و الصواب ان الخبرين بالجهر بها و بالمخافة صحيحان و عمل بكل منهما جماعة من العلماء (یعنی شرح بخاری، جلد ۳، ص ۱۱۱)

”اور ممکن ہے کہ ہر دو اسناد (امام سفیان کی بھی اور امام شعبہ کی بھی) صحیح ہو اور بعض علماء نے تو کہہ دیا ہے کہ درست یہ ہے کہ دونوں روایتیں یعنی آئین بالجر کی اور آئین بالا خفاء کی صحیح ہیں اور آنحضرت ﷺ کے ہر دو فعل (جر اور اخفاء) پر علماء کی ایک جماعت نے عمل کیا ہے۔“

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ:- اسی طرح ہندوستان میں علم حدیث کو فارسی زبان میں ترجمہ کر کے اس ملک میں علم حدیث کی اشاعت کرنے میں غالباً پہلے شخص ہیں اور حنفی مذہب کی تائید میں نہایت کوشش کرتے ہیں۔ ”شرح سفر السعادت“ میں ہر دو قسم کی روایات ذکر کر کے اور علامہ ابن ہمامؒ کی تطبیق بالا بھی نقل کر کے اپنا فیصلہ یوں دیتے ہیں:-

”و ظاہر حمل بر فعل ہر دو صورت است تارة قارة“ (ص ۵۴)
یعنی ظاہر معنی ہر دو صورت (جر اور اخفاء) کے فعل کے ہیں۔ کبھی اس طرح اور کبھی اس طرح۔“

اسی طرح آپ اپنی مشہور کتاب ”مدارج النبوة“ میں فرماتے ہیں:-
”و در آخر فاتحہ آمین می گفت، در نماز جہری بجہر و در سری بخفیہ و مقتدیان بموافقت آمین گفتند و در جہر بتائین در نماز جہری احادیث واقع شدہ“ (جلد اول، ص ۴۰۱)

یعنی آنحضور ﷺ سورہ فاتحہ کے اختتام پر آمین کہتے تھے۔ جہری نماز میں جہری آواز سے اور سری نماز میں خفیہ نماز سے اور مقتدی (صحابہ کرامؓ) بھی آپؐ کی موافقت میں آمین کہتے تھے اور جہری نماز میں آمین بالجر کے متعلق کئی ایک احادیث وارد ہیں۔ اس کے بعد ہر دو طرح کی روایات کا ذکر کیا ہے اور علامہ ابن ہمامؒ کا قول ”شرح سفر السعادت“ کی طرح نقل کیا ہے۔

مولانا سراج احمد سرہندی حنفیؒ۔۔ اسی طرح ”شرح ترمذی“ میں مذاہب ائمہ نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:-

”واحدیث در جانب جریشتر و صحیح تر آمدہ است۔“ (جلد اول، ص ۲۷۲) یعنی آئین بالہر کی احادیث تعداد میں بھی زیادہ ہیں اور صحت میں بھی صحیح ہیں۔

مولانا عبدالحی لکھنویؒ۔۔ اسی طرح اس زمانہ کے حنفیہ کے قابل فخر حدیث دان علماء میں سے مولانا عبدالحی لکھنویؒ ہیں۔ آپ شرح دقایہ کے حاشیہ ”عمدة الرعایہ“ میں فرماتے ہیں:-

قد ثبت الجهر عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باسنانید متعددة یقوی بعضها بعضها فی سنن ابن ماجہ والنسائی و ابی داؤد و جامع الترمذی و صحیح ابن حبان و کتاب الام للشافعی و غیرہا عن جمع من اصحابہ بروایات ابن حبان فی کتاب الثقات وغیرہ (عمدة الرعایہ حاشیہ شرح دقایہ، جلد اول نمبر ۹، حاشیہ، ص ۱۶۷)

”بے شک آئین بالہر رسول اللہ ﷺ سے کئی ایک سندوں کے ساتھ ثابت ہو چکی ہے۔ جو ایک دوسری کو قوت دیتی ہیں۔ جو سنن ماجہ، نسائی، ابوداؤد، جامع ترمذی، صحیح ابن حبان اور امام شافعی کی کتاب الام وغیرہ میں صحابہ کرامؓ کی ایک جماعت سے ابن حبان کی کتاب الثقات وغیرہ کی روایات سے مروی ہیں۔“

اسی طرح آپ التعلیق المجد علی موطا الامام محمدؐ میں ہر دو طرف کے دلائل بیان کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:-

والانصاف ان الجهر قوی من حیث الدلیل (تعلیق، حاشیہ ۹، ص ۱۰۵)

”انصاف یہ ہے کہ آئین بالہر دلیل کی رو سے قوی ہے۔“

حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کے مجموعہ فتاویٰ، حصہ دوم میں ص ۷۱

۱۲۸ھ مولانا سراج احمد صاحب نے اس شرح کو ترجمہ صحیح مسلم کے بعد بتاریخ ۱۵ ذی الحجہ ۱۲۱۹ ہجری شروع کیا اور تاریخ ۱۶ ذی الحجہ ۱۲۲۲ھ ختم کر دیا۔ اتنی ضخیم کتاب کا ترجمہ اور شرح اتنی قلیل مدت میں اللہ تعالیٰ کی خاص تائید و توفیق ہے۔

ص ۷۵ تک کوئی چالیس سے زائد حنفی علماء کے دستخط درج ہیں۔ جو مختلف مذاق اور مختلف بلاد کے بزرگ ہیں، جنہوں نے آئین بالہر کی حدیث کو تسلیم کر کے فتویٰ دیا ہے کہ اس سے نماز میں کوئی حرج واقع نہیں ہوتا۔ ان علماء کے فتوؤں کے ضروری انتخابات حسب ذیل ہیں:-

- ۱۔ اگر خود حنفی بھی آئین بالہر کے تو اس کی نماز فاسد نہیں ہوتی۔ (ص ۷۲)
 - ۲۔ حق یہ ہے کہ جبر و انخفاء دونوں فعل مسنون ہیں۔ ائمہ حنفیہ کو جواز جہر میں خلاف نہیں ہے۔ (ص ۷۲)
 - ۳۔ مولانا بحر العلوم ارکان اربعہ میں لکھتے ہیں کہ در باب آہستہ گفتن آئین وارد نہ شدہ مگر حدیثیہ ضعیف۔ (ص ۷۳)
 - ۴۔ چونکہ آئین بالہر پر تعامل صحابہ کبارؓ رہا ہے اس لیے آئین بالہر کہنے والوں پر سب و شتم کرنا درپردہ صحابہ کرامؓ پر معترض ہوتا ہے۔ (ص ۷۳)
 - ۵۔ جو شخص اہلحدیث ہو اور شریک جماعت احناف ہو۔ اس کا آئین بالہر کہنا مفسد نماز احناف ہرگز نہیں۔ (ص ۷۳)
 - ۶۔ آئین بالہر سے نماز فاسد نہیں ہوتی اور نہ مکروہ ہوتی ہے۔ (ص ۷۳)
 - ۷۔ غلط بیان کرتا ہے جو کہتا ہے کہ آئین بالہر سے دوسرے کی نماز فاسد ہوتی ہے یا مکروہ۔ (ص ۷۳)
- ان حوالہ جات سے صاف ظاہر ہے کہ ان حضرات نے باوجود حنفی ہونے کے آئین بالہر کی حدیث کو تسلیم کیا ہے۔ انہی نے اسے بالا خفاء کے برابر کہا اور کسی نے اس سے بڑھ کر۔ اس کا سبب یہی ہے کہ علم حدیث کے متون کے مطالعہ اور احوال حدیث کی پڑتال سے ان پر واضح ہو گیا کہ آئین بالہر سے انکار نہیں ہو سکتا۔
- التماس:- لہذا میں عاجز (میرسیا لکونی) برادران احناف کی خدمت میں یادب التماس کرتا ہوں کہ وہ اپنے اتنے بزرگوں کے خلاف چل کر جو آپ کے نزدیک علم حدیث کے ماہر تھے۔ آئین بالہر سے چڑ کر امت مرحومہ کے اختلاف کو نہ بڑھائیں۔ یہ زمانہ خانہ جنگی کا نہیں ہے۔ اللہ رب العزت ہمیں سمجھ دے اور طریق اعتدال پر چلائے۔ (آئین)
- درحم اللہ عبداً "قال امین"

بعض صوفیائے کرام جو آمین بالہر کے قائل تھے

حضرات اولیاء اللہ کے اقوال ذکر کرنے سے پیشتر مناسب بلکہ ضروری ہے کہ ہم یہ بھی بتادیں کہ مسائل فرعیہ میں ان مردانِ خدا کا مسلک کسی خاص مجتہد کے طریق کی تقلید و پابندی نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ سب کی تقلید سے آزاد ہو کر اصل چشمہ شریعت یعنی آنحضور ﷺ کے مشرب صافی سے سیرابی حاصل کرنے والے ہوتے ہیں۔ چنانچہ امام عبد الوہاب شعرانیؒ اپنی کتاب ”میزان کبریٰ“ میں متعدد مقامات پر فرماتے ہیں کہ ولی کامل اسی چشمہ ہدایت سے علم حاصل کرتا ہے، جس سے مجتہدین نے حاصل کیا اور اس سے سوائے رسول اللہ ﷺ کے تمام علماء کی تقلید چھوٹ جاتی ہے اور اگر کسی ولی کی نسبت یہ منقول ہو کہ وہ مثلاً ”شافعی تھا یا حنفی تھا تو یہ نسبت قبل اس کے ہوتی ہے کہ وہ مقام کمال پر پہنچے۔ (جلد ۱، ص ۱۹) پھر ص ۲۰ پر یہی ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ:-

وقد قلت مرة لسیدی علی الخواص رضی اللہ عنہ کیف صح تقلید سیدی الشیخ عبدالقادر الجیلانیؒ للامام احمد بن حنبلؒ و سیدی محمد الحنفی الشاذلیؒ للامام ابی حنیفہؒ مع اشتہادہم بالقطبۃ الکبریٰ و صاحب هذا المقام لا یکون مقلدا الا للشارع وحده فقال رضی اللہ عنہ قد یکون ذالک منہما قبل بلوغہما الی مقام الکمال ثم لما بلغا الیہ استصحب الناس ذالک اللقب فی حقہما مع خروجہما عن التقلید (میزان شعرانی، جلد ۱، ص ۲۰)

”میں نے ایک دفعہ اپنے سردار (پیر و مرشد) علی خواصؒ سے عرض کیا کہ حضرت سید عبدالقادر جیلانیؒ کو امام احمد بن حنبلؒ کی اور میرے سردار محمد شاذلی حنفیؒ کو امام ابو حنیفہؒ کی تقلید کس طرح درست ہوئی، باوجودیکہ یہ دونوں صاحب قطبیت کبریٰ میں مشہور ہیں اور اس مقام کا صاحب سوائے شارع (پیغمبرؐ) کے کسی کا مقلد نہیں ہوتا۔ تو آپ نے فرمایا کہ یہ نسبت (مقلدیت) ان صاحبوں کے مقام کمال پر پہنچنے کے قبل تھی۔ پھر جب وہ مقام کمال پر پہنچ گئے تو لوگوں نے یہ لقب (مقلد) ان کے ساتھ ہی رکھا۔ حالانکہ وہ دونوں (سید عبدالقادر جیلانیؒ) اور شیخ محمد شاذلیؒ تقلید سے نکل چکے تھے۔“

اسی طرح حضرت سید عبدالقادر جیلانیؒ ”غنیۃ الطالبین“ میں فرماتے ہیں:-
محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

فالمريد من كانت فيه هذه الجملة واتصف بهذه الصفة فهو ابدا مقبل على الله عز وجل و طاعته مول عن غيره و اجابته يسمع من ربه عز وجل فيعمل بما في الكتب و السنة و يصم عما سوى ذلك و يبصر بنور الله عز وجل (غنية ص ۹۷۵، مترجم فارسی)

”اللہ کی ذات کا چاہنے والا وہ ہے جس میں یہ مذکورہ بالا امور سب پائے جائیں اور وہ اس صفت سے موصوف ہو جائے۔ پس اس کا منہ ہمیشہ خدائے عزوجل کی طرف اور اس کی اطاعت کی طرف رہتا ہے اور وہ اس کے غیر اور اس کی اطاعت سے منہ پھیر لیتا ہے۔ اپنے رب عزوجل سے سنتا ہے۔ پس وہ اس کے مطابق عمل کرتا ہے جو اللہ کی کتاب (قرآن مجید) اور اس کے رسول ﷺ کی سنت میں وارد ہوتا ہے اور اس کے سوا سب سے برہ ہو جاتا ہے اور وہ خدائے عزوجل کے نور سے دیکھتا ہے۔“

حضرات صوفیائے کرام اور اولیائے عظام کا یہ مسلک محتاج طوالت نہیں ہے۔ ہر شخص جو مکتوبات امام ربانیؒ اور مکتوبات حضرت مرزا جانجناں شہیدؒ اور مثنوی مولانا رومؒ وغیرہ کتب قوم پر نظر رکھتا ہو۔ اسے جانتا اور سمجھتا ہے۔ اس تمہید کے بعد بعض اولیاء اللہ کے اقوال و بارہ آئین بالبحر ملاحظہ فرمائیے۔

امام غزالیؒ

آپ اپنی مشہور کتاب ”احیاء العلوم“ میں عنوان قرات میں فرماتے ہیں:-
و یقول آمین فی آخر الفاتحة و یمدبہا مدا یعنی سورہ فاتحہ کے اخیر پر آمین کہے اور اسے خوب کھینچ کر ادا کرے۔ پھر اس کے بعد جہری قرات کے ضمن میں فرماتے ہیں۔ ویجہر بالتامین یعنی جہری قرات میں آمین بھی بالہر کہے۔
اسی طرح علامہ عینی حنفیؒ ”شرح صحیح بخاری“ میں امام غزالیؒ کے حوالے سے فرماتے ہیں۔ وفی الخلاصة للغزالی ومن سنن الصلوۃ ان یجہر بالتامین فی الجہری (جلد ۳ ص ۱۱۰)

”امام غزالیؒ کی کتاب ”خلاصہ“ میں مرقوم ہے کہ نماز کی سنتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جہری نماز میں آمین بھی بالہر کہے۔“

امام شعرانیؒ

عارف ربانی امام شعرانیؒ ”میزان کبریٰ“ میں امام شافعیؒ وغیرہ کے بالجر آمین کہنے کی وجہ عارفانہ میں فرماتے ہیں:-

ووجه الثانی ان الجهر بامین فیہ اظهار التضرع والحاجة الی قبول الدعاء بالهدایة الی الصراط المستقیم (جلد اول، ص ۱۳۰)

”دوسرے کی وجہ یہ ہے کہ آمین بالجر میں اس دعائے ہدایت کی قبولیت کی حاجت اور گزر گزرنے کا اظہار ہے۔ جو آیت احداث الصراط المستقیم میں مانگی گئی ہے۔“

اور اس سے پیشتر امام ابو حنیفہؒ کے مذہب اخفاء آمین کی وجہ کے ضمن میں بھی فرماتے ہیں۔ فلا یس بالجهر بها یعنی آمین بالجر کہنے میں کوئی برائی یا خطرہ نہیں ہے۔

سید عبدالقادر جیلانیؒ

حضرت سید عبدالقادر جیلانیؒ قدس سرہ ”غنیۃ الطالبین“ میں فرماتے ہیں۔
والجهر بالقراءة آمین والاسرار بهما (غنیہ، مترجم فارسی، ص ۱۱) یعنی (جہری نماز میں) قرات اور آمین (ہردو) بالجر کہنا اور (سری نماز میں ہردو کا) آہستہ کہنا۔ (حیثیات نماز میں سے ہے)

آمین بالجر کہنے کی حکمت

ہم نے سابقاً وعدہ کیا تھا کہ پہلے آپ آمین بالجر کا فعل رسول اکرم سے ﷺ

۱۲۹ امام شعرانیؒ نے اس کتاب میں آئمہ مجتہدین کے اختلافی مسائل کی عارفانہ وجوہات بیان کی ہیں اور لکھا ہے کہ آئمہ مجتہدین کے اقوال بے اصل اور بے وجہ نہیں ہو سکتے، بلکہ ہر ایک کی ایک وجہ ہے۔ جس کا ادراک اہل ذوق و اہل قلب کو حاصل ہوتا ہے۔ پس کسی مجتہد سے بھی بدظن نہیں ہونا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے اس عاجز کو آئمہ دین کے ساتھ حسن تادب بخشا ہے۔

ہونا سمجھ لیں۔ پھر ہم اللہ تعالیٰ کے فضل سے اس کی حکمت بیان کریں گے۔ کیوں کہ حضور اکرم ﷺ کا کوئی قول و فعل اور آپؐ کی کوئی حرکت و سکون حکمت سے خالی نہیں۔
۱۔ سو معلوم ہو کہ حضور قلب اور عبادت میں حظ و سرور ایک وجدانی امر ہے۔ جسے وہی شخص جان سکتا ہے جس پر وہ کیفیت طاری ہو اور یہ کیفیت صرف اسی کو حاصل ہوتی ہے۔ جو اس کی تحصیل میں حضور قلب اور خلوص دل سے رغبت اور ریاضت و مشق کرتا ہے اور جو اس میں رغبت و ریاضت نہ کرے۔ بلکہ دل میں اس سے نفرت رکھے تو وہ اس حقیقت کو نہیں پاسکتا اور وہ ان فیوض و برکات سے متمتع نہیں ہو سکتا۔ جن سے راغبین عالمین بہرہ اندوز ہوتے ہیں۔ قدر اس باوہ ندانی بخدا تا پخششی

۲۔ نبی اکرم ﷺ نے اس امر پر ہمیشگی کی ہے کہ آپؐ فجر، مغرب اور عشاء کی نمازوں میں قرات بالجر پڑھتے تھے اور ظہر و عصر میں خفیہ۔ اس کی حکمت یہ ہے کہ قدرتی طور پر سورج کی تمازت سے آواز میں دلکشی کم ہو جاتی ہے۔ اور طبیعت میں اشغال کی وجہ سے انتشار اور گھروں، بازاروں اور راستوں میں آوازوں کی کثرت اور شور و غوغا کی زیادتی سے لذت میں کمی آ جاتی ہے۔

پس ان اوقات میں قرات آہستہ پڑھ کر باطنی توجہ و خلوص سے اس نقصان کی تلافی کی گئی۔ ہاں جمعہ و عیدین اور کسوف و خسوف اور استقاء کی نمازوں میں مجمع عام میں حاضرین کی کثرت ہوتی ہے۔ اسی کثرت اجتماع کی وجہ سے ان سب نمازوں میں خطبہ مقرر کیا گیا ہے اور اسی کثرت اجتماع کی وجہ سے ان میں قرات بھی جبری رکھی گئی ہے۔

لیکن سورج ڈوبنے سے سورج چڑھنے تک قدرتی طور پر آواز میں دلکشی اور حسن بڑھ جاتا ہے۔ اسی لیے گانے کی مجلسیں عموماً رات کے وقت منعقد کی جاتی ہیں۔ پس صبح، مغرب اور عشاء کی نمازوں میں قرات بالجر مقرر کی کہ جہارت

۳۔ ہر چند کہ شریعت مطہرہ میں گانا بجانا مطلقاً حرام ہے کیوں کہ ان میں حظ نفس ہے جو منافی حظ روح ہے لیکن یہاں صرف وجدانیات و حیات اور طبعی تاثرات و فکلی تاثرات کا ذکر ہے۔ عام اس سے کہ وہ حرام ہیں یا حلال، فنفکر ولا تعجل۔ ہاں شریعت مطہرہ نے

سے خود قاری یا امام کے علاوہ سامعین کے قلوب پر بھی اثر پڑے اور ہم اس اثر کو قرات جبری کے وقت واقعہ میں اپنے وجدان میں محسوس بھی کرتے ہیں۔ (وللہ الحمد)

۳۔ جب یہ معلوم ہو چکا کہ صبح، مغرب اور عشاء کی نمازوں میں قرات جبری ہے اور یہی سہانے اور خوش آئند واقعات ہیں۔ خصوصاً ”صبح کا وقت کہ وہ نہایت ہی اطمینان خاطر اور فراغت کا ہوتا ہے۔ اس میں جہارت قرات کے علاوہ طوالت قرات بھی مسنون ہے اور یہ بھی معلوم ہو چکا کہ جہارت آواز حضور قلب اور خلوص دل کے پیدا کرنے یا بدھانے میں معاون ہے۔ خاص کر اس صورت میں کہ سید المرسلین ﷺ نے قرآن مجید بحسن صوت (خوش آوازی سے) پڑھنے کا حکم دیا۔ (بخاری شریف) اور اللہ تعالیٰ نے بھی ترتیل سے پڑھنا فرمایا ہے۔ (سورہ مزمل) تو اب اس بات کے سمجھنے میں کچھ بھی دقت نہیں کہ سورہ فاتحہ بلند آواز سے برعایت حسن صوت و ترتیل پڑھ کر وجدانی کوائف اور قلبی تاثرات سے متمتع ہوتے ہوئے آمین بلند آواز سے کیوں نہ کہی جائے جو خاتمۃ الدعاء ہے۔ (مستفاد از ابی داؤد) اور سامعین یعنی مقتدی جو اس کیفیت حظ قلبی میں امام کے شریک حال ہیں۔ جب وہ بھی اپنے امام کی اقتداء میں خلوص دل سے گزرگڑا کر بلند آواز سے اللہ جل شانہ کی جناب میں آمین کہہ کر بالا جمال اپنی التجائیں پیش کریں۔ تو ان کی اجتماعی آواز سے جذبات پر عجب اثر پڑتا ہے۔ دل کوائف سے معمور ہو جاتا ہے اور سینہ جوش سے بھر جاتا ہے۔

پس ایسے باخلوص و متاثر جذبات سے متفحہ آوازوں سے کہی ہوئی آمین ملا کہ کی آمین سے موافقت کرتی ہوئی باعث غفران و موجب رضائے الہی ہو جاتی ہے۔ اسی معنی کو نبی پاک ﷺ نے ان الفاظ میں سمجھایا ہے۔

ذکر اللہ میں، جس میں حظ روح ہے۔ حسن صوت کی معاونت گانے کی حد سے ادھر تک پسند کی ہے اور چونکہ ملائی میں حظ نفس ہے اس لیے ان کو حرام کرتے ہوئے ان کے معاونین گانے بجانے سے بھی منع فرمایا۔ فسبحان اللہ اطہر شریعتہ

اذا من الامام فامنوا فانه من وافق تامينه تامين الملائكة غفر له ما تقدم من ذنبه (بخاری و مسلم)

”جب امام آمین کہے تو تم بھی آمین کو۔ کیوں کہ حقیقت یہ ہے کہ جس کی آمین کو ملا کہ کی آمین سے موافقت و مناسبت ہو گئی تو اس کے جملہ گزشتہ گناہ بخشے گئے۔“

اسی لیے رسول پاک ﷺ جری قرأت کے وقت سورہ فاتحہ کے اختتام پر بکمال احتیاط و حضور قلب بلند آواز سے آمین پکارتے تھے اور آپ کے ساتھ صحابہ کرامؓ بھی اسی کیفیت سے متکیف ہو کر بلند آواز سے آمین پکارتے تھے۔ بلکہ بعض اوقات انہی خلوص بھرے جذبات کی وجہ سے حضور ﷺ مکرر و سر کرر باواز بلند آمین پکارتے تھے کہ بعض اوقات انبساط و احتیاط کی ایسی حالت ہوتی ہے کہ ایک دفعہ کے کہنے سے جذبات میں سکون و اطمینان نہیں ہوتا تو جوش بھرے کلمات کو دو دفعہ بلکہ تین تین دفعہ دہرایا جاتا ہے۔ (حسن حصین و مجمع الزوائد)

اللهم اننا نسئلك حضور القلب و حلاوة الذكر و ادامة الفكر و غفران الذنوب بدم و الحمد لله

فصل سوم

نماز میں سورۃ فاتحہ کے حکم کے بیان میں

سب سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ نماز کی حقیقت اور صورت کیا ہے؟۔ اس کے بعد یہ کہ نماز اور سورۃ فاتحہ میں کیا مناسبت ہے؟۔ پھر واضح طور پر معلوم ہو جائے گا کہ سورۃ فاتحہ کو نماز کا رکن و جزو ضروری مقرر کرنا سراسر باحکمت ہے۔

سو معلوم ہو کہ نماز کی حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے خالق و پروردگار اللہ جل جلالہ کی عظمت و کبریائی کے سامنے اقرار عبودیت و اظہار عجز و نیاز ہے۔ اور وہ سورۃ مرکب ہے۔ چند سنجیدہ و عاجزانہ اور با ترتیب و با ادب حرکات بدن سے، جو خدائے واحد کی تعظیم اور انسانی عجز و انکساری کے نشانات ہیں۔ مثلاً ”قیام“ رکوع اور سجود وغیرہ اور چند پاک کلمات و اذکار سے جو اللہ جل شانہ کی عظمت و کبریائی، اس کے نام کی برکت اور اس کی حمد و ثناء اور تسبیح و تقدیس اور اپنی عبودیت کے اقرار اور اس کی درگاہ کی نیاز مندی اور اس کی جناب میں دعا و التجار پر مشتمل ہیں۔ مثلاً ”تکبیرات و تسبیحات اور قرات سورۃ فاتحہ جو بسم اللہ سے ولا الضالین تک یعنی شروع سے آخر تک سب امور مذکورہ پر مشتمل ہے۔ یعنی بسم اللہ میں اللہ رب العزت کے پاک نام کا تہرک مطلوب ہے۔ پھر الحمد سے الدین تک اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء، اس کے احسانوں کا اقرار و اعتراف اور اس کی مالکیت و جبروت اور عظمت و سطوت کا بیان ہے۔ پھر ایاک نعبد سے نستعین تک اپنی عبودیت کا اقرار اور اس کی درگاہ کی نیاز مندی کا اظہار ہے۔ پھر احدثا سے ولا الضالین تک دعا و التجار ہے۔

اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ نماز کے افعال اور سورۃ فاتحہ کی آیات میں کمال مناسبت ہے اور یہ بھی کہ جس طرح قیام و رکوع اور سجود فعلی نماز ہیں۔ اسی طرح سورۃ فاتحہ قولی نماز ہے۔ اسی لیے حدیث قدسی میں اس کا نام الصلوۃ (صحیح مسلم، ج ۱، ص ۱۷۰) رکھا گیا ہے کہ یہ سراسر نماز ہے یا نماز کا اہم رکن ہے اور کسی ایک اہم رکن پر خواہ وہ فعلی ہے، خواہ وہ قولی، کل نماز کا اطلاق قرآن و حدیث میں بہت جگہ وارد ہے۔

مثلاً ”صحیح مسلم میں ہے۔ من قام رمضان ایمانا“ و احتساباً“ غفرلہ ما تقدم من ذنبہ (مشکوٰۃ، ص ۱۰۶) یعنی جس شخص نے قیام کیا رمضان میں، اللہ تعالیٰ کا حکم جان کر اور ثواب کی نیت کے ساتھ، اس کے تمام گناہ بخشتے گئے۔

اس جگہ قیام رمضان سے مراد نماز تراویح ہے اور اس حدیث میں نماز کو قیام سے تعبیر کیا ہے۔ اس لیے کہ قیام نماز کا ایک فعلی رکن ہے۔ اسی طرح رکوع، سجود کے الفاظ بھی نماز کے لیے قرآن و حدیث میں بہت جگہ وارد ہیں۔ اسی طرح قرات قرآن کو بھی صلوٰۃ کی جگہ استعمال کیا ہے۔ چنانچہ فرمایا۔ اقم الصلوٰۃ لدلوک الشمس الی غسق الیل و قرآن الفجر، ان قرآن الفجر کان مشہوداً ○ (بنی اسرائیل، پ ۱۵)

”اے نبی! قائم رکھ ہر نماز (جو) دن ڈھلے سے رات کے اندھیرے تک (ہے) خصوصاً فجر کی نماز، کیوں کہ فجر کی نماز (فرشتوں کی) حاضری کی نماز ہے۔“
سید معین الدین صاحب ”اپنی مایہ ناز“ تفسیر جامع البیان“ میں قرآن الفجر کی تفسیر میں فرماتے ہیں:-

قرآن الفجر صلوٰۃ الصبح سمیت قرانا کما سمیت الصلوٰۃ رکوعاً و سجوداً تسمیۃ الشئ باسم رکنہ و جزئہ عطف علی الصلوٰۃ (جامع البیان فاروقی، ص ۲۳۹)

”قرآن فجر سے مراد نماز فجر ہے اور نماز کا نام قرآن اسی طرح رکھا گیا۔ جس طرح اس کا نام رکوع اور سجود رکھا گیا۔ یعنی کسی شے کے رکن اور جز پر اس شے کا نام رکھ دینا اور یہ عطف ہے الصلوٰۃ پر۔“

اس سے صاف ظاہر ہے کہ صلوٰۃ الفجر کو قرآن الفجر اسی لیے کہا گیا ہے کہ قرات قرآن بھی نماز کا ایک اہم رکن ہے۔

اب اس بات کو سمجھنا کچھ بھی مشکل نہیں رہا کہ جب نماز کی صورت افعال اور اقوال کا مجموعہ ہے تو جن اقوال میں سے قرات قرآن جو اسی ذات حق کا کلام ہے۔ جس کی صفت ثناء مقصود ہے اور جس کے سامنے عجز و نیاز کے آداب بجالانے مطلوب ہیں۔ رکن نماز ہونے میں سب سے زیادہ حقدار ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:-

ان هذه الصلوة لا يصلح فيها شئ من كلام الناس انما هي التسبيح و التكبير و قرة القرآن۔ (الحديث) رواه مسلم (مكتوة، ص ۸۲)
 ”نماز میں لوگوں کی کوئی بات بھی جائز نہیں۔ وہ تو صرف تسبیح و تکبیر اور قرأت قرآن ہے۔ (اور بس)“

جو کچھ بیان ہوا مطلق قرأت کی فرضیت و رکنیت کے متعلق تھا۔ اس میں کسی امام و مجتہد امت کو اختلاف نہیں۔ بلکہ سب کا اجتماعی قول ہے کہ قرأت قرآن منمذہب فرائض نماز کے ہے۔ چنانچہ حنفی مذہب کی معتبر اور چوٹی کی کتاب ”ہدایہ“ میں ہے۔ فرائض الصلوة ستہ پھر تیسرے نمبر پر لکھا ہے۔ والقرأة لقوله تعالى فاقراءوا ما تيسر من القرآن۔

ہاں قرآن حکیم میں سے سورہ فاتحہ کے معین ہونے میں اختلاف ہے۔ امام شافعیؒ اور جمہور محدثینؒ اسے معین رکن قرار دیتے ہیں اور اس کے بعد باقی قرآن مجید کے کسی جز کی قرأت بلا تعین کا اختیار دیتے ہیں اور حضرت امام ابو حنیفہؒ بغیر تعین کے مطلق قرأت قرآن کو فرض کہتے ہیں۔ خواہ کوئی سورہ فاتحہ پڑھے، خواہ کسی اور جگہ سے پڑھے، خواہ ایک آیت پڑھے، خواہ زیادہ پڑھے اور علی التعین سورہ فاتحہ کی قرأت کو واجب جانتے ہیں۔ جس کے ترک سے سجدہ سہو لازم آتا ہے اور نماز ناقص رہتی ہے۔

سو ہم تحقیق مسئلہ کے لیے پہلے ایک مقدمہ شناخت رکنیت کے متعلق ذکر کرتے ہیں۔ پھر امام شافعیؒ اور جمہور محدثینؒ کے دلائل فرضیت و تعین فاتحہ کے دلائل بیان کریں گے۔ پھر اس کے بعد حضرات حنفیہ کے دلائل وجوب یا عذرات عدم رکنیت مع ان کے جوابات کے بیان کریں گے۔ (واللہ الموفق)

مقدمہ در شناخت ارکان نماز

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہ نے اپنی مایہ ناز کتاب ”حجتہ اللہ“ میں ایک باب ان امور کے بیان میں باندھا ہے جو نماز میں ضروری ہیں۔ ہم اس کا خلاصہ

”نبی کریم ﷺ نے چاہا کہ (اپنی) امت (مرومہ) کے لیے دو حدیں مقرر کر

١٣٢٢ قال الحافظ في تخریج الهدایة متفق علیه

٤٣٣. مشکوة، ص ٤٣ -

۳۲ مکوۃ، اس میں نماز کو قیام سے یاد کیا ہے اس لیے کہ قیام نماز کا ایک رکن ہے۔

۳۵۔ اس میں رکوع سے مراد نماز ہے یعنی دو رکعت نماز پڑھے۔ نماز کی بجائے رکوع کا لفظ

اس لیے فرمایا کہ رکوع بھی نماز کا ایک اہم رکن ہے۔

۳۶۔ اس میں بھی نماز کو لفظ رکوع سے تعبیر کیا ہے۔

السجود^{۱۲۷} (ق، پ ۲۶) یعنی سجدہ نماز کے بعد اللہ کی تسبیح و تحمید کیا کرو۔ اور مثل فرمان خداوندی و قرآن الفجر کے (بنی اسرائیل، پ ۱۵) یعنی (اے نبی!) قائم کر نماز فجر (بھی) اور مثل قول الہی و قومو للہ قننتین^{۱۲۸} کے (بقرہ، پ ۲) یعنی قیام کرو یعنی نماز پڑھو واسطے اللہ کے عاجزی کرتے ہوئے۔ اور کسی امر کو ایسے طور پر ذکر کرنا جس سے یہ سمجھا جائے کہ اس کے بغیر چارہ نہیں۔ مثل قول حضور کریم ﷺ کے تحریمہا التکبیر و تحلیلہا التسلیم^{۱۲۹} یعنی نماز میں تکبیر (اللہ اکبر) سے داخل ہوں اور سلام (السلام علیکم ورحمۃ اللہ) کہہ کر خارج ہوں۔ اور مثل فرمان حضور پاک ﷺ کے کہ فی کل رکعتین التحیۃ (مسلم عن عائشہ کنوز الحقائق، ص ۶۸) یعنی ہر دو رکعت میں التحیات یعنی تشہد ہے اور مثل فرمان نبی پاک ﷺ کے دوبارہ تشہد کے جب تو یہ سب کچھ کر کے توتیری نماز پوری ہو چکی۔ (صحیح بخاری)

حاصل کلام یہ کہ نماز جو آنحضور ﷺ سے بطور تواتر ثابت ہے اور امت مرحومہ نے آپ سے (نسلاً بعد نسل) بطریق تواتر حاصل کی۔ یہ ہے کہ (پہلے) طہارت (صغریٰ و کبریٰ یعنی استنجاء، وضو اور غسل کرے) اور (حد ضروری تک) ستر عورت کرتے اور قیام کرے۔ اور قبلہ شریف کی طرف منہ کرے اور حضور قلب سے اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو اور خاص اسی (کی رضا) کے لیے عمل کو خالص کرے اور زبان سے اللہ اکبر پکارے اور سورۃ فاتحہ پڑھے اور اس کے ساتھ قرآن مجید کی کوئی سورت بھی ضم کرے۔ مگر فرضوں کی تیسری اور چوتھی رکعت میں (کہ ان میں سورت ضم کرنی ضروری نہیں) پھر رکوع کرے اور اتنا ٹیڑھا ہو کہ ہاتھوں کی انگلیوں کے سرے

۱۲۷۔ تفسیر جامع البیان میں اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے۔ اعتقاد الصلوۃ، یعنی اے نبی! نماز کے بعد تسبیحات پڑھا کرو۔ اس آیت میں نماز کا ذکر لفظ سجود سے کیا ہے اس لیے کہ سجدہ بھی نماز کا ایک اہم رکن ہے۔

۱۲۸۔ اس میں نماز کو قیام کے لفظ سے ذکر کیا ہے اس لیے کہ قیام بھی نماز کا ایک اہم رکن ہے۔

۱۲۹۔ یعنی تکبیر تحریمہ اور سلام ہر دو نماز فرائض نماز کے ہیں۔
یعنی زیر ناف سے گھٹنوں تک۔

گھٹنوں پر رکھ سکے۔ (پھر ٹھہرا رہے) حتیٰ کہ قومہ میں اطمینان پائے۔ پھر سات اعضاء یعنی دونوں ہاتھوں اور دونوں پاؤں اور دونوں گھٹنوں اور چہرے کے بل سجدہ کرے۔ پھر (سجدے سے) سر اٹھائے اور (جلسہ کرے) حتیٰ کہ جلسہ میں برابر ہو کر بیٹھ جائے۔ پھر اسی طرح دوسری بار سجدہ کرے۔ پس یہ ایک رکعت ہوئی۔ پھر ہر دو رکعتوں پر قعدہ کرے اور تشہد پڑھے^{۱۱۲} پس اگر نماز کے اختتام پر ہو تو آنحضرت ﷺ پر درود شریف پڑھے اور جو دعا اسے محبوب و پسند ہو، وہ دعا پڑھے۔ اور ان ملائکہ اور مسلمانوں پر سلام کہے جو اس کے آس پاس ہیں۔ پس یہ ہے سرکارِ دو عالم ﷺ کی وہ نماز جس کی بابت (ہرگز) ثابت نہیں ہوا کہ آپؐ نے فرضوں میں عداً بغیر عذر کے ان (امور مذکورہ) میں سے کچھ بھی ترک کیا ہو۔ اور (یہی ہے نماز) صحابہ کرامؓ کی اور تابعینؒ اور ان کے بعد کے ائمہ مسلمین کی اور یہی ہے جس کا نام مسلمانوں نے نسلاً بعد نسل وراثت میں یہ پایا کہ وہ (اسلامی) نماز ہے اور وہ ضروریاتِ ملت میں سے ہے۔“

خاکسار میر سیالکوٹی کہتا ہے کہ ہر وہ شخص جسے اللہ رب العزت نے احادیثِ نبویہؐ کے مطالعہ کی نعمت بخشی ہے اور نبی اکرم ﷺ کے جملہ کوائفِ عبادت اس کی نظر میں ہیں۔ وہ اس امر میں لمحہ بھر بھی تردد نہیں کر سکتا کہ حضرت شاہ صاحبؒ نے نہایت شستہ اور مختصر الفاظ میں حضور ﷺ کی نماز کے ضروری امور کا فوٹو کھینچ دیا ہے اور مجتہدین کے اصطلاحی اختلافات (فرائض و واجبات) کو ایسے لطیف پیرائے میں اور ایسے جامع الفاظ میں سمجھا دیا ہے کہ اگر اصطلاحوں کی تعریفات کی الجھنوں میں نہ پھنستے ہوئے صحابہ کرامؓ کی طرح اتباعِ سنت کو لازم گردان لیں اور اسی کو شعار و دثار (ظاہر و باطن) بنالیں۔ تو نماز کے متعلق مسلمانوں میں عملی طور پر کوئی اختلاف باقی نہیں رہ سکتا۔^{۱۱۳} پھر حالِ حضرت

۱۱۲۔ سوائے وتر نماز کے

۱۱۳۔ یعنی ہم ان امور مذکورہ بالا کو اس نیت اور تقید سے ادا کریں کہ آنحضور ﷺ نے ان پر داماً الزام کیا ہے، خواہ ان کے ضروری ہونے کو الفاظ سے فرمایا، خواہ اپنے داعیِ عمل سے سمجھایا۔ ہم بھی ان کو ادا کریں اور فرض و واجب کے اصطلاحی فرقوں میں پڑ کر جھگڑے کھڑے نہ کریں اور اپنی نمازوں کو خلافِ سنت ادا کر کے ناقص و بے کار نہ کریں کیوں کہ فرض و واجب کا اصطلاحی فرق زمانہ نبویؐ میں نہ تھا۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے

شاہ صاحبؒ اصولی طور پر قرات فاتحہ کو نماز کا اہم رکن شمار کرتے ہیں۔ اس کے بعد ہم اس کی رکنیت کے مفصل دلائل بھی بیان کرتے ہیں۔ (واللہ الموفق)

رکنیت فاتحہ کے مفصل دلائل

امام شافعیؒ ”کتاب الام“ میں فرماتے ہیں کہ:-

و سن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان یقرء القاری فی الصلوۃ بام القرآن و دل علی انها فرض علی المصلی اذا کان یحسن یقرء ہا -----
 اخبرنا سفیان بن عیینہ عن الزہری عن محمود بن ربیع عن عبادہ بن الصامت ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لا صلوۃ لمن لم یقرء بفاتحہ الكتاب (جلد ۱، ص ۹۳)

”رسول اللہ ﷺ نے اپنے عمل سے مقرر کر دیا کہ قاری نماز میں سورۃ فاتحہ پڑھے اور تلا دیا کہ سورۃ فاتحہ کا پڑھنا نمازی پر فرض ہے۔ جب کہ وہ سورۃ فاتحہ کو بخوبی پڑھ سکتا ہو۔ ہم کو امام سفیانؒ نے امام زہریؒ سے انہوں نے محمود بن ربیعؒ سے انہوں نے عبادہ بن صامتؒ صحابی سے روایت کر کے خبر دی۔ کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اس شخص کی نماز نہیں ہوتی جو (اس میں) سورۃ فاتحہ نہیں پڑھتا۔“

حضرت عبادہؒ کی اس حدیث کی صحت میں کسی امام، مجتہد، محدث، اور کسی ققیہ کو کلام نہیں۔ کیوں کہ اس کے سب راوی جلیل القدر ہیں۔ تین تو نہایت ذی شان امام ہیں۔ یعنی امام شافعیؒ، امام سفیان بن عیینہؒ اور امام ابن شہاب زہریؒ۔ اور دو حضور اکرم ﷺ کی زیارت کے شرف یافتہ ہیں۔ یعنی محمود بن ربیعؒ اور عبادہ بن صامتؒ۔ محمود بن ربیعؒ، حضرت عبادہ بن صامتؒ صحابی کے واداد تھے۔ رسول اکرم ﷺ نے ازراہ شفقت ان کے چہرے پر اپنے دہن مبارک کی کلی کے چھینٹے مارے تھے۔ اس وقت ان کی عمر پانچ سال کی تھی اور حضرت عبادہؒ سابقین و اولین انصاریوں میں سے ہیں اور فقہائے کسی نے پوچھا تھا کہ نماز وتر فرض ہے یا کیا؟ تو آپ نے جواب میں فرمایا کہ آنحضور ﷺ

نے وتر پڑھے اور تمام مسلمین بھی پڑھتے ہیں۔ (اوکا قال)

۱۴۳۳ھ صحیح بخاری کتاب العلم۔

صحابہ کرامؓ میں سے تھے۔ بلکہ ان بارہ نقباء میں سے ہیں جن کو نبی اکرم ﷺ نے قبل ہجرت اہل مدینہ میں اشاعت و تبلیغ اسلام کے لیے مقرر کیا تھا۔ جنگ بدر و جنگ احد، بیعت عقبہ و بیعت رضوان میں شامل تھے۔ ۱۳۳ھ

حضرت عبادہؓ کی اس حدیث کو امام شافعیؒ کے علاوہ امام احمدؒ، امام بخاریؒ، امام مسلمؒ، امام ابو داؤدؒ، امام ترمذیؒ، امام نسائیؒ، امام ابن ماجہؒ، امام دارمیؒ اور امام دارقطنیؒ وغیرہم نے اپنی اپنی کتاب میں اسی سلسلہ اسناد یعنی سفیان عن الزہری عن محمود عن عبادہ سے روایت کیا ہے اور ہر محدث و ہر قیہ و مجتہد نے وجوب فاتحہ کے متعلق اس حدیث سے استدلال کیا ہے۔ ۱۳۵ھ امام شافعیؒ ”کتاب الام“ میں ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں۔ وان حدیث عبادہؓ وابی ہریرہؓ یدلان علی فرض ام القرآن (جلد ۱، ص ۸۹)

”اور یہ کہ تحقیق عبادہؓ اور ابو ہریرہؓ کی حدیثیں سورہ فاتحہ کی فرضیت پر دلالت کرتی ہیں۔“

امام بخاریؒ نے بھی اس حدیث سے امام و مقتدی ہر دو پر قرأت فرض ^{کلی} ہونے پر استدلال کیا ہے۔ چنانچہ عنوان باب یوں باندھتے ہیں۔ باب وجوب القراءة للامام والمأموم اور علامہ یعنی حنفیؒ ”شرح صحیح بخاریؒ“ میں زیر عنوان ذکر مایستنبط منه یعنی ان امور کے ذکر میں جو اس حدیث سے مستنبط ہوتے ہیں۔ فرماتے ہیں:-

استدل بهذا الحديث عبدالله بن المبارك والأوزاعي ومالك والشافعي وأحمد وإسحق وأبو ثور ودلؤد علی وجوب قراءة الفاتحة خلف الإمام في جميع الصلوات (عمدة القاری، جلد ۲، ص ۶۳)

”اس حدیث سے امام عبد اللہ بن مبارکؒ، امام اوزاعیؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ،

۱۳۳ھ اصالبہ جلد سوم، ص ۲۶۳ نیز کتاب القراءة للیستی، ص ۴۸۔

۱۳۵ھ اگرچہ بعض نے واجب معنی فرض کہا ہے اور بعض نے واجب اصطلاحی مراد رکھا ہے

جیسا کہ آئندہ تفصیلاً معلوم ہو جائے گا۔ (ان شاء اللہ)

۱۳۶ھ حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث قسمت الصلوۃ آگے آئے گی۔

۱۳۷ھ محدثین کے نزدیک فرض اور واجب کا ایک ہی حکم ہے۔ واجب کا درجہ فرض سے کم

جاننا حضرات حنفیہ کی اصطلاح ہے۔ (فانہم)

امام احمدؒ، امام اسحقؒ، امام ابو ثورؒ اور امام داؤدؒ نے سب نمازوں میں قرات فاتحہ خلف الامام کے فرض ہونے پر استدلال کیا ہے۔

پھر اس کے چند سطور بعد حافظ ابن حزمؒ قرطبی کا قول ان کی کتاب ”محل“ سے نقل کرتے ہیں۔ قال ابن حزم فی المحلی وقرائة القرآن فرض فی کل رکعة من کل صلوٰة اماما کان او ما موماً والفرض والتطوع سواء والرجال والنساء سواء (یعنی، جلد سوم، ص ۶۳)

”امام ابن حزمؒ نے محل میں کہا کہ سورۃ فاتحہ کی قرات ہر نماز کی ہر رکعت میں فرض ہے۔ خواہ کوئی امام ہو یا مقتدی ہو اور فرض و نفل اور مرد و عورتیں اس میں سب برابر ہیں۔“

صورت استدلال یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بغیر تخصیص و استثناء کے عام حکم دیا ہے کہ جو شخص بغیر قرات سورۃ فاتحہ کے نماز پڑھتا ہے۔ اس کی نماز نہیں ہوتی۔ یعنی وہ شخص نماز سے عمدہ بر آ نہیں ہوتا بلکہ اس کے ذمے باقی رہتی ہے۔ خواہ وہ نمازی امام ہے، خواہ مقتدی اور خواہ منفرد (اکیلا)، خواہ مرد ہے، خواہ عورت اور خواہ وہ نماز سفر کی ہے یا حضر کی اور خواہ وہ نماز فرض ہے، خواہ نفل اور خواہ وہ نماز اونچی قرات والی ہے، خواہ آہستہ والی، سب میں ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ پڑھنی فرض ہے۔ اس کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔ کیوں کہ رسول اللہ ﷺ سے یہ حدیث نہایت شاندار صحت سے ثابت ہو چکی ہے۔ کہ آپؐ نے فرمایا۔ لا صلوٰة لمن لم یقرء بفاتحة الكتاب (بخاری و مسلم وغیرہما) یعنی نہیں ہوتی نماز اس شخص کی جو نہ پڑھے سورۃ فاتحہ۔ اور آپؐ کے دوامی عمل سے بلا اختلاف احدے و لاکل متواترہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ آپؐ نے کسی حالت میں بھی سورۃ فاتحہ کی قرات ترک نہیں کی۔ نہ امام ہوتے ہوئے، نہ اکیلے میں، نہ سفر میں، نہ حضر میں، نہ فرضوں میں اور نہ نفلوں میں۔ چنانچہ یہ عموم استدلال حافظ ابن حزمؒ کے کلام سے اوپر گزر چکا ہے۔ اور علامہ یعنی حنفیؒ اس حدیث کی شرح میں امام شافعیؒ وغیرہ محدثین کی وجہ استدلال کے متعلق لکھتے ہیں:-

ثم وجه استدلال الشافعی ومن معه بهذا الحديث وهو انه نفى جنس الصلوٰة عن الجواز الا بقراءة فاتحة الكتاب (جلد ۳، ص ۶۵)

”امام شافعیؒ اور ان کے ساتھ کے (محدثین) لوگوں کی وجہ استدلال یہ ہے کہ حضور ﷺ نے سورہ فاتحہ کے پڑھے بغیر جنس صلوٰۃ کے جواز کی نفی کی ہے۔“

امام بخاریؒ نے بھی باب کی سرخی عام ہی مقرر کی ہے۔ چنانچہ ان کے الفاظ یہ ہیں۔ باب وجوب القراءة للامام والمأموم في الصلوة كلها في الحضر والسفر وما يجهر فيهما وما يخافت (بخاری مصری، جلد ۱، ص ۹۰)

پھر اس عنوان کے ضمن میں یہ حدیث حضرت عبادہؓ والی بھی درج کی ہے۔ اسی طرح امام بیہقیؒ نے بھی کتاب ”القراءة خلف الامام“ میں باب یوں باندھا ہے۔ باب الدلیل علی ان لا صلوة الا بفاتحة الكتاب یجمع الامام والمأموم والمنفرد یعنی یہ باب ہے اس بات کی دلیل کا کہ حدیث لا صلوة الا بفاتحة الكتاب امام مقتدی اور اکیلے سب کو شامل ہے۔ پھر اس کے ذیل میں یہی حدیث حضرت عبادہؓ والی ذکر کی ہے۔

غرض تمام محدثین بالاتفاق اس حدیث کو ہر نماز اور ہر نمازی پر شامل کہتے ہیں:-

دوسری دلیل تعیین یا رکنیت فاتحہ کی یہ حدیث ہے۔ جو حضرت ابو ہریرہؓ سے صحیح مسلم اور صحیح امام مالکؒ میں مروی ہے کہ:-

عن ابی ہریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال من صلی صلوٰۃ لم یقرء فیہا بام القرآن فہی خداج ثلاثا غیر تمام فقیل لا بی ہریرۃ انا نکون وراء

۱۴۸ علامہ عینیؒ نے کہا کہ ترتیب الباب میں فاتحہ کا ذکر نہیں ہے۔ تاکہ یہ حدیث (عبادہؓ

والی) اس پر دلالت کر سکے۔ عنوان باب میں تو صرف (مطلق) قرات کا ذکر ہے اور مطلق قرات فاتحہ اور غیر فاتحہ سے اعم ہے۔ علمائے حدیث نے اس کے کئی ایک جوابات دیئے ہیں۔

خاکسار بھی ایک عرض کرتا ہے کہ سورہ فاتحہ قرآن شریف کی جزء ہے بلکہ القرآن العظیم ہے جیسا کہ آئندہ ذکر ہوگا۔ (ان شاء اللہ) تو لفظ قرات اس پر بھی شامل ہے۔ پس عنوان باب

اور حدیث الباب میں نہ منافات ہے نہ مغایرت۔ لہذا امام بخاری کا باب کے ضمن میں اس

حدیث کو لانا بالکل درست اور موزوں ہے۔ باقی رہا یہ کہ حضرت سعدؓ کی شکایت والی روایت

اور حضرت ابو ہریرہؓ والی روایت متعلق کسی اسلوٰۃ میں عام قرات کا ذکر ہے اور فاتحہ کا ذکر

نہیں ہے تو اس کے جواب کا یہ موقع نہیں ہے۔

الامام فقال اقرباها في نفسك فاني سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول قال الله تعالى قسمت الصلوة بيني وبين عبدى نصفين ولعبدى ما سال فاذا قال العبد الحمد لله رب العالمين الى آخر الحديث (مسلم، جلد اول، ص ۱۷۰)

”نبی ﷺ نے فرمایا جس کسی نے ایسی نماز پڑھی۔ جس میں اس نے سورۃ فاتحہ نہیں پڑھی تو وہ نماز ناقص الخلقۃ (ساقط شدہ بچہ) ہے، ناقص ----- ہے، ناقص ----- ہے، غیر تمام ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے کہا گیا کہ ہم کبھی امام کے پیچھے ہوتے ہیں۔ (تو کیا اس حالت میں بھی سورۃ فاتحہ پڑھا کریں؟) اس پر آپؐ نے کہا (ہاں) اسے اپنے جی (منہ) میں (آہستہ) پڑھ لیا کرو۔ کیوں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا تھا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میں نے نماز کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان نصفاً نصفی بانٹ لیا ہے اور میرا بندہ جو کچھ بھی مانگے، اسے وہ سب دوں گا۔ پس جب بندہ کہتا ہے الحمد للہ رب العالمین تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے نے میری حمد بیان کی۔“

اس حدیث میں دو مقام فرضیت و رکیت فاتحہ کے ہیں۔

اول یہ کہ رسول اکرم ﷺ نے اس نماز کو جس میں سورۃ فاتحہ نہ پڑھی جائے، ناقص پیدائش کہا ہے۔ یعنی وہ ناقص الخلقۃ یا اسقاط شدہ بچے کی طرح ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس فصل کے مقدمہ میں گزر چکا ہے کہ نماز چند پاک کلمات اور چند باادب حرکات سے مرکب ہے اور ان پاک کلمات میں سے ایک سورۃ فاتحہ ہے۔ جسے سب افعال نماز سے کمال مناسبت بھی ہے اور ظاہر ہے کہ جو چیز چند ضروری اجزاء سے مرکب ہو، اس کا کوئی ضروری جزو ضائع ہو جائے تو وہ چیز ناقص^{۱۲۹} و بے کار ہو جاتی ہے اور ردی کر کے پھینک دی جاتی ہے۔ پس جب سورۃ فاتحہ جو ضروری ہے۔ نہ پڑھی گئی تو وہ نماز قبولیت کے درجے سے گر گئی اور ناقص الخلقۃ یا اسقاط شدہ بچے کی مثل ہو گئی تو کسی کام کی نہ رہی۔ (اعاز اللہ منہ)

۱۲۹۔ حضرات حنفیہ لفظ ناقص سے جو سارا پکڑ کر فرضیت فاتحہ کو تسلیم نہیں کرتے۔ اس کا جواب آئندہ الگ سرخی کے ماتحت دیا جائے گا۔

امام زرخشریؒ ”اساس البلاغۃ“ میں زیر مادہ خدج محاورہ اخدج صلاتہ کے معنی لکھتے ہیں۔ نقص بعض ارکانها (ص ۱۳۲) یعنی اس نے نماز کے بعض ارکان کم کر دیے۔

نکتہ:- حدیث مذکور کا مفاد تو یہ ہے کہ ایسی نماز جس میں سورۃ فاتحہ نہ پڑھی جائے۔ نقصان والی ہے یا کہ وہ ناقص الخلقۃ یا اسقاط شدہ بچے کی مثل ہے۔ لیکن الفاظ حدیث میں یوں نہیں فرمایا بلکہ یوں فرمایا ہے۔ فہی خداج یعنی وہ سراسر نقصان ہے۔ یا یہ کہ وہ ناقص الخلقۃ یا اسقاط شدہ بچہ ہے۔ اس طرز بیان میں مبالغہ ہے۔ جس کا فائدہ یہ ہے کہ رسول پاک ﷺ کو ایسی نماز ہرگز ہرگز پسند نہیں۔ اسی لیے تین دفعہ دہرا کر فرمایا ہے۔ ہی خداج ہی خداج ہی خداج اور پھر چوتھی بار فرمایا۔ غیر تمام یعنی ناتمام ہے۔ اس سے صاف معلوم ہو سکتا ہے کہ جس نماز کو حضور پاک ﷺ ایسی ناپسندیدگی سے ناقص و ناتمام فرمائیں۔ وہ اللہ رب العزت کی درگاہ میں قبولیت کے قابل کب ہو سکتی ہے۔ چنانچہ ایک اور حدیث کے یہ الفاظ ہیں:-

لا تجزئی صلوة لا یقرء الرجل فیہا بفاتحة الكتاب هذا اسناد صحیح (دار قطنی، ص ۱۲۲)

”وہ نماز کفایت نہیں کرتی۔ جس میں آدمی سورۃ فاتحہ نہ پڑھے۔“

اس سے معلوم ہوا کہ قرات سورۃ فاتحہ نماز کا ایک ضروری رکن ہے۔

دوم یہ کہ اس حدیث میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد پاک ہے کہ سورۃ فاتحہ نماز ہے کیوں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا فرمان ہے۔ قسمت الصلوة اور پھر اس کے بعد سورۃ فاتحہ کی آیات گن گن کرتا دیا ہے کہ اس سے مراد سورۃ فاتحہ ہے۔

اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ قرات سورۃ فاتحہ نماز کا ایک اہم رکن ہے۔ جیسا کہ ہم مقدمہ میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی عبارت سے بتا آئے ہیں کہ جس امر کا نام ہی نماز رکھ دیا گیا ہے۔ وہ اس کا اہم رکن ہے۔ چنانچہ حدیث میں وارد ہے۔ الحج عرفۃ یعنی حج عرفہ ہے۔ اس لیے کہ وقوف عرفات حج کا اہم رکن ہے بلکہ اصل حج یہی ہے۔

۱۵۰۔ نمایہ ابن اثیر۔ لغت مفردات حدیث نبویؐ۔

کیوں کہ بغیر عرفات پر جانے کے مجرد سعی صفا و مروہ اور طواف خانہ کعبہ کا نام عمرہ ہے نہ کہ حج۔

امام نوویؒ اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں:-

قال العلماء المراد بالصلوة هنا الفاتحة سميت بذلك بانها لا تصح الا بها كقوله صلى الله عليه وسلم الحج عرفة ففيه دليل على وجوبها بعينها في الصلوة (جلد ۱، ص ۱۷۰)

”علمائے (حدیث) نے کہا ہے کہ اس جگہ صلوٰۃ سے سورۃ فاتحہ مراد ہے۔ اس (سورت) کا یہ نام (نماز) اس لیے رکھا گیا کہ وہ (نماز) اس کے بغیر صحیح نہیں ہوتی۔ مثل نبی پاک ﷺ کے اس فرمانا کے کہ حج عرفہ ہے۔ پس اس حدیث میں اس (سورت) کے علی التعیین نماز میں فرض ہونے کی دلیل ہے۔“

اسی طرح امام بیہقیؒ ”کتاب القراءۃ“ میں اسی حدیث کے متعلق فرماتے ہیں:-

وفی ذلک دلالة علی كونها ركنا فیها حتی سماها باسمها ولم یفرق فیها بین الامام والمأموم والمنفرد حمل الحدیث وهو اعرف بما روی حمل وجوب قراتها علی الجميع وامر المأموم بقراتها سرا (ص ۱۵-۱۶)

”اس حدیث میں اس (سورت) کے رکن نماز ہونے کی دلیل ہے۔ حتیٰ کہ اس کا نام اس کے نام پر رکھا ہے اور اس میں امام اور مقتدی اور منفرد (اکیلے) میں فرق نہیں بتایا۔ اور جس نے اس حدیث کو روایت کیا۔ (یعنی حضرت ابو ہریرہؓ) اور وہ اپنی روایت کے معنی (دوسروں کی نسبت) زیادہ اچھے پہچاننے والے ہیں۔ انہوں نے اس سورت کی قرات کو سب پر فرض قرار دیا ہے اور مقتدی کو بھی آہستہ طور پر پڑھنے کا حکم دیا ہے۔“

امام نوویؒ اور امام بیہقیؒ کا یہ استدلال ایسا صاف ہے کہ اس کی مزید تشریح و توضیح کی ضرورت نہیں ہے۔

تیسری دلیل:- رکنیت فاتحہ کی یہ حدیث ہے جو مؤطا امام مالکؒ وغیرہ میں ہے کہ:-

ان رسول الله صلى الله عليه وسلم نادى ابي بن كعب وهو يصلى فلما فرغ من صلاته لحقه فوضع رسول الله صلى الله عليه وسلم يده على يده وهو يريد ان يخرج من باب المسجد فقال انى لارجوان لا تخرج من المسجد

حتیٰ تعلم سورة ما انزل فی التوراة ولا فی الانجیل ولا فی القرآن مثلها قال
فی فجعلت ابطنی فی المشی رجاء ذالک ثم قلت یا رسول اللہ السورة التي
وعدتنی قال کیف تقرأ اذا افتحت الصلوة قال فقرات الحمد لله رب
العالمین حتی اتیت علی اخرها فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی
هذه السورة وهی السبع المثانی والقرآن العظیم الذی اعطیت (موطا' امام
الک)

”رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابیؓ کو آواز دی اور وہ نماز پڑھ رہے تھے۔ پس
جب وہ نماز سے فارغ ہوئے تو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ پس آپؐ
نے اپنا ہاتھ مبارک ان کے ہاتھ پر رکھا۔ در انحال کہ آپؐ دروازہ مسجد سے باہر گزرنا
چاہتے تھے۔ پس آپؐ نے فرمایا کہ (اے ابیؓ!) مجھے امید ہے کہ تو مسجد سے نکلنے سے پیشتر
ایک ایسی سورت سیکھ لے گا۔ جس کی حُش نہ تو توریت میں (سورت) نازل ہوئی نہ
انجیل میں اور نہ قرآن میں۔ حضرت ابیؓ کہتے ہیں کہ میں اس امر کی امید پر آہستہ آہستہ
چلنے لگا۔ پھر آپؐ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ وہ سورت (سکھائیے) جس کا آئیناب
ﷺ نے وعدہ کیا تھا۔ (اس پر) آپؐ نے فرمایا۔ جس وقت تو نماز شروع کرتا ہے تو کس
طرح قرات کرتا ہے۔ میں نے (سورت) الحمد لله رب العالمین تا آخر پڑھ سنائی تو رسول
اللہ ﷺ نے فرمایا۔ بس یہی وہ سورت ہے اور یہی سبع مثانی اور القرآن العظیم ہے جو
مجھے عطا ہوئی۔“

یہ حدیث موطا امام مالکؒ کی مسند روایت ہے۔ جس کی صحت میں اختلاف نہیں
ہو سکتا۔ اور اس واقعے کو امام مالکؒ کے علاوہ امام ترمذیؒ، امام نسائیؒ، امام احمدؒ، امام ابن
خزیمہؒ اور امام بیہقیؒ نے بھی حضرت ابو ہریرہؓ کی وساطت سے روایت کیا ہے کہ حضرت
ابی بن کعبؓ کا واقعہ یوں یوں ہے اور ایسا ہی ایک واقعہ حضرت ابوسعید بن معلیؓ کا بھی
ہے۔ جسے امام بخاریؒ نے صحیح بخاری میں روایت کیا ہے۔ غرض حضرت ابیؓ والے قصے کو
کثیر التعداد محدثین نے صحیح سندوں سے روایت کیا ہے۔ لہذا اس کی صحت میں شک نہیں
ہو سکتا۔

وجہ استدلال یہ ہے کہ امام بیہقیؒ نے ”کتاب القرات“ میں اس حدیث کو

بسند خود ذکر کر کے لکھا ہے:-

و حين قال المصطفى صلى الله عليه وسلم لابی بن كعب كيف تقرأ فی صلوتک فاجابه بام القرآن ولم يفصل بین ان یکون اماما او ماموماً او منفرداً دل علی ان لا فرق بینهم فی وجوب قراءتها علی من احسنها منهم فی صلوته و دل علی انه کان مستفیضاً شائعاً فیما بینهم یعنی القراءة بالفاتحة حتی احواله المصطفى صلى الله عليه وسلم فیما اراد ان يعلمه من السورة علی ما یقرء فی صلوته او اجابه ابی بها دون غیرها من القرآن مع استحباب قراءة غیرها منها والله اعلم (کتاب القرة بیہقی، ص ۳۴)

”جب محمد مصطفیٰ ﷺ نے حضرت ابیؓ سے کہا کہ تو نماز میں کس طرح قرات کرتا ہے تو انہوں نے جواب میں سورہ فاتحہ پڑھ کر سنائی اور امام یا مقتدی یا منفرد (اکیلے) کی تفصیل بیان نہیں کی تو اس بات نے صاف دلالت کر دی کہ ان (امام، مقتدی اور منفرد) میں سے نماز میں سورہ فاتحہ کی قرات کے فرض ہونے کے متعلق کوئی فرق نہیں ہے۔ پھر اس پر بھی دلالت کر دی کہ صحابہ کرامؓ میں قرات فاتحہ عام طور پر مشہور و شائع تھی۔ نبی مکرم ﷺ نے اس صحابی کو ایک سورت بتانے کا جو ارادہ کیا تو اس کا نشان اسی طرح بتایا کہ وہ سورت (مراد) ہے جو تو اپنی نماز میں پڑھا کرتا ہے اور حضرت ابیؓ نے بھی (بغیر تامل و استفسار کے) جواب میں وہی سورت سوائے کسی دیگر سورت کے پڑھ سنائی۔ باوجود اس کے کہ (بعد فاتحہ کے) کسی اور سورت کی قرات بھی مستحب ہے۔“

امام بیہقیؒ کا یہ استدلال بالکل صاف ہے کہ حضور اکرم ﷺ حضرت ابیؓ سے کسی تصریح یا تعیین کے پوچھتے ہیں۔ کیف تقرأ اذا افتتحت الصلوة یعنی تو نماز شروع کرتا ہے تو قرات کس طرح کرتا ہے اور حضرت ابیؓ بھی بغیر کسی استفسار کے سورہ فاتحہ پڑھ سنا تے ہیں۔ اور نبی اکرم ﷺ اس پر اظہار فرماتے ہیں کہ بس تم سے اسی سورت کی فضیلت بتانے کا وعدہ تھا۔ تو اس سے صاف سمجھا جاسکتا ہے کہ جب وہی حضور اکرم ﷺ نے بغیر تعیین کے سوال کیا اور حضرت ابیؓ نے بغیر استفسار کے رسول پاک ﷺ کی مراد سمجھ کر جواب دیا اور حضور پاک ﷺ نے اس جواب کی تصدیق کی۔ تو ظاہر ہے کہ نبی پاک ﷺ اور صحابہ کرامؓ کے نزدیک نماز میں سورہ فاتحہ کی قرات ضرور

تھی اور ایسی مشہور و شائع تھی کہ بغیر توضیح و تعیین کے ذہن میں یہی آتی تھی ﷺ اللہ رب العزت امام بیہقیؒ پر اس لطیف استدلال کی جزاء میں لاکھوں رحمتیں نازل فرمائے۔ (آمین)

اس حدیث سے دوسری وجہ استدلال یہ ہے کہ اسے اللہ تعالیٰ نے سبع مثنائی اور القرآن العظیم کہا ہے۔ یہ ہر دو بھی سورہ فاتحہ کے نام ہیں۔ جیسا کہ سابقاً مذکور ہو چکا ہے۔ بیشتر اس کے کہ ہم ان اسماء کے دجہ کی وضاحت کریں۔ ضروری ہے کہ ان کی ترکیب نحوی بھی بیان کر دیں۔ کیوں کہ اول تو اس وجہ استدلال کا مدار اسی پر ہے۔ دوم اس لیے یہ ترکیب بذات خود ایک نکتہ ہے اور یہ ”تفسیر واضح البیان“ سورہ فاتحہ کے خاص اور باقی قرآن شریف کے عام نکات ہی کے بیان کرنے کے لیے لکھی گئی ہے۔ (واللہ الموفق)

خدائے عزوجل حضور پاک ﷺ کو اتنا ”واحسانا“ فرماتا ہے کہ:-

ولقد اتینک سبعاً من المثنائی والقرآن العظیم ○ (الحجر، پ ۱۳)

”(اے پیغمبر!) بے شک ہم نے تم کو سات آیتیں ایسی دی ہیں جو مثنائی ہیں اور القرآن العظیم بھی ہیں۔“

بموجب حدیث موطا زیر بحث اور مطابق حدیث صحیح بخاری کے اس جگہ ^{۱۵۲} سبع

۱۵۱ فن بلاغت کا قاعدہ ہے کہ جو بات مشکلم یا مخاطب یا سائل و مسئول ہر دو کے ذہن میں مقرر و معین ہو، بیان میں اس کی تعیین و تصریح کی نسبت اشارہ و کنایہ ابلغ ہوتا ہے۔ ایسے ہی مواقع کی نسبت علمائے بلاغت کہتے ہیں۔ الکناية ابلغ من الصراحة یعنی (موقع مناسب پر) کنایہ صراحت سے زیادہ ابلغ ہوتا ہے۔

۱۵۲ اس کے سوا سبع مثنائی کی تعیین میں جس قدر اقوال ہیں، وہ آنحضرت ﷺ تک

مرفوع نہیں ہیں۔ چنانچہ علامہ زرقلیؒ شرح موطا میں فرماتے ہیں ورحح ابن جریر القول الاول لصحة الخبر فيه عن رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم فلا معلل عنه وقال ابن عبدالبير وهو الصحيح والاثبت عن ابن عباسؓ وقد روى الطبرانی باسناد حسن عن ابن عباسؓ انه قرء فاتحة الكتاب ثم قال ولقد اتيناك سبعاً من المثنائی فقال هي فاتحة

الكتاب و باسنادين حسنين عن عمرؓ ثم عن عليؓ السبع المثنائی فانحة الكتاب زاد عن محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

سے مراد سورہ فاتحہ ہے۔ جس کی بالاتفاق سات آیتیں ہیں اور من الثانی میں من بیانیہ ہے اور اس پر القرآن العظیم کا عطف من باب عطف الصفة علی الصفة ہے اور اسی ترکیب کے مطابق ہم نے آیت کا ترجمہ کیا ہے۔ چنانچہ علامہ محمد طاہر یحییٰ "مجمع البحار" میں لکھتے ہیں۔ والقرآن العظیم عطف صفة علی صفة (جلد اول، ص ۱۶۵) اسی طرح علامہ عینی حنفی "شرح صحیح بخاری" میں اس حدیث کی شرح میں امام کرمانی "شارح بخاری" کا قول یوں نقل کرتے ہیں:-

وقال الكرمانی المشهور بین النحاة ان هذه الواو للجمع بین الوصفین فمعنی ولقد اتینک سبعة من المثانی و القرآن العظیم ای ما یقال له السبع المثانی والقرآن العظیم وما یوصف بهما (یعنی، جلد ۸، ص ۲۵۹)

عمر بن ثنی فی کل رکعة ومن طریق ابی جعفر الرازی عن الربیع بن انس عن ابی العالیة السبع المثانی الفاتحة قلت للربیع انهم یقولون انها السبع الطول فال لقد انزلت هذه الایة وما انزل من الطول شیء۔

یعنی امام ابن جریر نے پہلے قول یعنی سورہ فاتحہ کی تعیین والے قول کو ترجیح دی ہے کیوں کہ اس کے متعلق آنحضور ﷺ سے صحیح حدیث ثابت ہو چکی ہے۔ پس اس سے پرے ہٹنے کی کوئی صورت نہیں ہے اور حافظ ابن عبد البر مغربی نے کہا کہ حضرت ابن عباسؓ سے یہی قول صحیح اور اثبت ہے کیوں کہ امام طبرانی نے حضرت ابن عباسؓ سے باسناد حسن روایت کیا کہ آپ نے سورہ فاتحہ پڑھی پھر قرآن شریف کی یہ آیت ولقد اتینک سبعة من المثانی پڑھ کر فرمایا کہ یہ سورہ فاتحہ ہے اور حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ سے بھی باسناد جید منقول ہے کہ سبع مثانی سورہ فاتحہ ہے اور حضرت عمرؓ کی روایت میں یہ بھی ہے کہ (اس کا نام مثانی اس لیے ہے کہ) یہ ہر رکعت میں دہرائی جاتی ہے اور ابو جعفر رازی کے طریق سے ربیع بن انسؓ سے انہوں نے ابو العالیہ سے روایت کیا کہ سبع مثانی فاتحہ ہے۔ (ابو جعفر کہتے ہیں) کہ میں نے ربیع سے کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ سبع مثانی سے مراد سات لمبی سورتیں تو ربیع نے جواب دیا کہ یہ آیت ولقد اتینک سبعة من المثانی اس وقت اتری تھی۔ جب سات لمبی سورتوں میں سے کوئی بھی نہیں اتری تھی۔ یعنی اس آیت کا نزول ان سورتوں کے نزول سے پہلے ہے تو اس سے وہ مراد کیسے ہو سکتی ہیں؟

”کرمائی“ نے کہا کہ یہ بات نحویوں میں مشہور ہے کہ یہ واؤ دو وصفوں کو جمع کرنے کے لیے ہے۔ پس آیت ولقد اتینک سبعاً سے مراد وہ سات آیتیں ہیں۔ جن کو سبع مثانی اور القرآن العظیم کہا جاتا ہے اور وہ ان دونوں وصفوں سے موصوف ہیں۔“

غرضیکہ یہ سورہ فاتحہ کے بالخصوص دو اوصاف یا نام ہیں۔ اول مثانی اس لیے کہ اسے نماز کی ہر رکعت میں دہرایا جاتا ہے۔ دوم القرآن العظیم اس لیے کہ یہ سورت ثواب اور عظمت میں سارے قرآن پاک کے برابر ہے۔ اس لیے کہ یہ سورت سارے قرآن شریف کا خلاصہ ہے۔ یا یوں سمجھو کہ سارا قرآن مجید اس کی تفصیل و شرح ہے۔ جیسا کہ آپ اس ”تفسیر واضح البیان“ کے مطالعہ سے معلوم کر سکتے ہیں۔ اسی طرح نبی پاک ﷺ نے سورہ اخلاص کی نسبت فرمایا۔ انها لتعدل ثلث القرآن یعنی یہ سورت قرآن حکیم کے ثلث (۱/۳) حصے کے برابر ہے کیوں کہ قرآن حکیم کے تین اہم مقاصد ہیں۔ توحید، نبوت اور معاد اور سورہ اخلاص میں صرف توحید کا بیان ہے۔ جو تین میں سے ایک ہے۔

پس وجہ استدلال بالکل صاف ہے کہ جب اللہ رب العزت نے اس کی صفت ہی یہ فرمائی کہ یہ ہر رکعت میں دہرائی جاتی ہے تو خدائے ذوالجلال کے نزدیک نماز میں اس کا تقرر ثابت ہو گیا اور اس کے تقرر کی حکمت اس کے دوسرے وصف القرآن العظیم سے ظاہر ہوتی ہے۔ کہ چونکہ یہ جملہ مضامین و اصول قرآن حکیم پر شامل ہے اور اس کی قرات آسان ہے تو خدا تعالیٰ نے اس کے مقرر کرنے سے یہ چاہا کہ نمازیان امت محمدیہ ہر رکعت میں بلا کلفت حکماً سارے قرآن مجید کے ختم کا ثواب لے سکیں۔ اسی لیے آپ ﷺ نے فرمایا کہ:-

عن عبادة بن الصامت ان النبي صلى الله عليه وسلم قال ام القرآن عوض من غيرها وليس غيرها منها بعوض (دار تفتی، جلد ۱، ص ۱۲۲)

”سورہ فاتحہ اپنے غیر کا عوض ہو سکتی ہے۔ یعنی یہ اس کی بجائے قائم ہو سکتی ہے اور اس کا غیر اس کا عوض نہیں ہو سکتا۔“

دار تفتی کی اس حدیث کو امام بیہقی نے بھی کتاب القرات میں اپنے استاد حافظ

ابو عبد اللہ کے واسطے سے امام دار قطنیؒ کے سلسلہ اسناد کے ساتھ روایت کیا ہے اور اس کے اخیر پر کہا ہے۔ قال ابو عبد اللہ رواہ کلہم ثقہ (ص ۹) یعنی حافظ ابو عبد اللہ نے کہا کہ اس کا ہر ایک راوی ثقہ و معتبر ہے۔

حاصل کلام یہ کہ دلائل مذکورہ بالا اور دیگر دلائل سے جو ان شاء اللہ تعالیٰ ابھی آئندہ بیان ہوں گے۔ واضح ہے کہ سورہ فاتحہ کی قرات نماز کا ایک اہم رکن ہے کیوں کہ سورہ فاتحہ قوی نماز ہے۔ خواہ امام ہو، خواہ منفرد، خواہ مقتدی سب پر فرض ہے۔ امام اور منفرد ہو کر تو سب پڑھتے ہیں لیکن مقتدی ہونے کی حالت میں بعض کا یہ مذہب ہے کہ مقتدی کے لیے امام کی قرات کفایت کرتی ہے۔ اس کی تفصیل تو ان شاء اللہ تعالیٰ آئندہ آئے گی لیکن پھر دست اتنا ضرور یاد رکھ لیجئے کہ جب سورہ فاتحہ کی قرات رکن نماز ہے تو ارکان میں امام کی نیابت کام نہ آسکنے کی وجہ سے قرات فاتحہ میں بھی امام کی قرات کفایت نہ کرے گی۔ ورنہ رکوع و سجود میں بھی نیابت جائز ہوگی اور اس کا کوئی بھی قائل نہیں۔ چنانچہ امام بخاریؒ ”جز القراءۃ“ میں ارقام فرماتے ہیں:-

وقیل لہ اتفق اهل العلم وانتم لا یحتمل الامام فرضا عن القوم ثم قلتم القراءۃ فريضة و یحتمل الامام هذا الفرض عن القوم فیما جہر الامام ولم یجہر ولا یحتمل الامام شیئا من السنن نحو الشاء والتسبیح والتحمید فجعلتم الفرض اھون من التطوع (ص ۹ - ۱۰)

”اور اسے (قراءۃ الامام لہ قراءۃ کے قائل کو) یہ بھی کہا جائے گا کہ سب اہل علم اور تم بھی اس بات پر متفق ہو کہ امام مقتدیوں کے فرض کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ پھر تمہارا یہ قول بھی ہے کہ (مطلق) قرات فرض ہے۔ اور امام قوم سے اس فرض کو اٹھا لیتا ہے۔ اس نماز میں بھی جس میں وہ قرات بالجر پڑھے۔ اور اس میں بھی جس میں بالجر نہ پڑھے لیکن امام کسی سنت کو مثل ثناء (سبحنک اللہم) اور تسبیح و تحمید کے نہیں اٹھاتا۔ سو تم نے (اس میں) فرض کو نفل سے ہلکا کر دیا۔ (جو درست نہیں)“

قرات فاتحہ خلف الامام کے خاص دلائل

اوپر جو کچھ بیان ہوا۔ وہ قرات فاتحہ کے رکن نماز ہونے کے متعلق تھا۔ جب یہ

حال ہے تو قرأت فاتحہ مقتدی پر بھی فرض ہے۔ کیوں کہ فرائض کی ادائیگی امام، مقتدی اور منفرد سب پر لازم ہے۔

دیگر یہ کہ جب جناب رسالت مآب ﷺ نے عام طور پر فرمادیا۔ لا صلوة لمن لم یقرء بفاتحة الكتاب یعنی اس شخص کی نماز نہیں ہوتی۔ جو (نماز میں) سورۃ فاتحہ نہیں پڑھتا۔ تو عموم کلمہ من میں امام، مقتدی اور منفرد سب آگئے۔ اگرچہ اس دلیل کے بعد کسی خصوصی دلیل کی ضرورت باقی نہیں رہتی لیکن بعض اشخاص کسی خاص دلیل سے بھی تسلی چاہتے ہیں اور وہ ہمارے پاس اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے موجود ہے۔ اس لیے ہم اس کے الگ عنوان قائم کر کے بھی ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ (واللہ الموفق)

پہلی حدیث

امام بیہقیؒ نے ”کتاب القراءة“ میں باسناد خود بغیر واسطہ محمد بن اسحاقؒ کے حضرت عبادہؒ سے روایت کیا کہ عن عبادہ بن الصامتؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا صلوة لمن لم یقرء بفاتحة الكتاب خلف الامام (ص ۴۷)
”رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اس شخص کی نماز نہیں ہوگی۔ جس نے امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ نہیں پڑھی۔“

حضرت عبادہؒ کی اس روایت میں اس روایت کی نسبت جو سابقاً اثبات رکبت میں بخاری و مسلم کی روایات سے گزر چکی ہے۔ الفاظ خلف الامام زیادہ ہیں۔ امام بیہقیؒ اس زیادت کی نسبت لکھتے ہیں:-

قال ابو الطیب قلت لمحمد بن سلیمان خلف الامام قال خلف الامام و هذا اسناد صحيح و الزيادة فيه كالزيادة التي في حديث مكحول وغيره فهي عن عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ صحيحة مشهورة من لوجه كثيرة و عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ من اکابر اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم و فقهاء ہم (ص ۴۷)

۱۵۳ھ ہر دو اس روایت کے راویوں میں سے ہیں۔ ابوالیب شاکرد ہیں اور محمد بن سلیمان کے استاد ہیں۔

”ابو الیلب نے کہا میں نے (اپنے استاد) محمد بن سلیمانؒ سے (استفساراً) کہا خلف الامام؟۔ تو انہوں نے کہا (ہاں!) خلف الامام۔ یہ اسناد صحیح ہے اور اس میں جو زیادت (خلف الامام) کی ہے۔ وہ مکمل وغیرہ راویان کی حدیث کی زیادت کی طرح ہے۔ پس یہ (زیادت) حضرت عبادہؓ سے (بساند) صحیح (ثابت ہے) جو کئی ایک وجوہات سے مشہور ہے اور (خود) حضرت عبادہؓ اکابر اصحاب رسول اللہ ﷺ سے ہیں اور صحابہ کرامؓ کے فقہاء (مجتہدین) میں سے ہیں۔“

دوسری حدیث

امام بیہقیؒ نے ”کتاب القراءة“ میں بغیر واسطہ محمد بن اسحاقؒ کے بساند خود روایت کیا کہ عن عبادہ بن الصامتؓ قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم يقول لا صلوة لمن لم يقرء بفاتحة الكتاب امام ابو غیر امام (ص ۴۱)
”حضرت عبادہ بن صامتؓ نے کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ نہیں ہوتی نماز اس شخص کی جو نہ پڑھے سورۃ فاتحہ امام ہو یا غیر امام۔ (مقتدی و منفرد)“

تیسری حدیث

امام سیوطیؒ ”جامع صغیر“ میں معجم طبرانی سے نقل کرتے ہیں اور اسے حسن کہتے ہیں۔ من صلی خلف امام فلیقرء بفاتحة الكتاب (طب) عن عبادہ (ح)
(جامع صغیر مطبوعہ مصر، جلد ۲، ص ۱۳۹)
”جو شخص نماز پڑھے پیچھے امام کے، پس چاہیے کہ پڑھے وہ سورۃ فاتحہ۔“
علامہ بیہقیؒ نے ”مجمع الزوائد“ میں اس حدیث کی نسبت کہا۔ رجالہ موثقون یعنی اس کے سب راوی ثقہ ہیں۔

تنبیہ:- ان ہر سہ روایات سے واضح ہو سکتا ہے کہ حدیث فاتحہ محدثین نے حضرت عبادہؓ سے مختلف عنوانوں سے روایت کی ہے اور اس کے سب طریق روایت صحیح ہیں۔ کسی روایت میں تو اختصار ہے اور کسی میں تفصیل۔ بخاری و مسلم کی روایت جو اثبات رکبت فاتحہ کے ضمن میں گزر چکی ہے۔ اس میں اختصار ہے کیوں کہ مقتدی، امام اور

منفرد سب کا فاتحہ پڑھنا لفظ ”من“ کے عموم کے ماتحت ہے اور عام غیر مخصوص البعض علمائے حنفیہ کے نزدیک اپنے افراد پر مثل خاص کے بطور قطعیت شامل ہوتا ہے کیوں کہ اس کا عموم شمولی ہوتا ہے۔ نہ کہ بدلی اور اس کی تخصیص حنفیہ کے نزدیک خبر واحد اور قیاس سے نہیں ہو سکتی۔ یہ وہ باتیں ہیں جو حنفی علمائے اصول کے نزدیک مسلم ہیں اور جہاں عموم اشخاص یا افراد پایا جائے گا۔ وہاں لازماً عموم احوال بھی پایا جائے گا۔

چنانچہ امام تاج الدین سبکی ”جمع الجوامع“ میں فرماتے ہیں:-

وعموم الاشخاص يستلزم عموم الاحوال والازمنة والبقاع (جلد ۲، ص ۲۷۴)

”اور عموم اشخاص لازم پکڑتا ہے حالات، زمانوں اور مقامات کے عموم کو بھی۔“

اور امام جلال الدین علیؒ شرح میں اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں۔ لانه لا غنى للاشخاص عنها یعنی اشخاص ان مذکورہ امور سے غنی و بے پرواہ نہیں ہو سکتے۔

پس جب آنحضور ﷺ نے عام طور پر فرما دیا۔ من لم یقرء تو اس کے ضمن میں ہر فرد نمازی اور ان کے سب حالات (امامت، اقتداء اور افراد) بھی آ گئے۔ پس صحیح بخاری و مسلم والی روایت میں جو امور کلمہ ”من“ کے ضمن میں داخل ہیں۔ ان میں سے بعض امام بیہقیؒ اور امام طبرانیؒ کی روایات میں صراحةً مذکور ہیں۔ پس نہ تو ان میں مخالفت ہے اور نہ شذوذ کا عذر ہو سکتا ہے بلکہ اختصار و تفصیل کی بات ہے اور بس۔

چوتھی حدیث

اس حدیث سے قرأت سورۃ فاتحہ خلف الامام کا نزاع بالکل ختم ہو جاتا ہے اور کسی طالب حق قبیح دلیل کے لیے کوئی غرض باقی نہیں رہتا۔ کیوں کہ اس میں اوچھی

۱۵۸ اگر روایت من کان له امام فقر لغة وغیرہ کو اس کا مخصوص بتایا جائے تو درست نہ ہو گا جیسا کہ ان شاء اللہ آئندہ اس کے موقع پر مفصل ذکر ہو گا۔

قرات ہی کے وقت میں نبی پاک ﷺ نے خاص اپنے پیچھے سورۃ فاتحہ پڑھنے کا حکم کیا ہے اور ممانعت اس کے سوا باقی قرات سے کی ہے۔ چنانچہ امام نسائی اپنی سنن میں باب قرۃ ام القرآن خلف الامام فیما جہر بہ الامام میں باسناد خود حضرت عبادہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ:-

عن عبادۃ بن الصامتؓ قال صلی بنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعض الصلوۃ التی یجہر فیہا بالقرۃ فقال لا یقرءن احد منکم اذا جہرت بالقرۃ الابام القرآن (مطبوعہ نظامی، ص ۱۵۳)

”پڑھائی ہم کو رسول اللہ ﷺ نے بعض وہ نماز جس میں قرات اونچی پڑھی جاتی ہے۔ یعنی فجر کی تو آپؐ نے (نماز سے فارغ ہو کر) فرمایا کہ جب میں اونچی قرات کروں تو تم میں سے کوئی بھی سوائے سورۃ فاتحہ کے کچھ نہ پڑھا کرے۔“

امام نسائی کی اس روایت کے سب راوی ثقہ ہیں اور اس کا سلسلہ اسناد بالکل متصل ہے۔

اس حدیث کو امام دارقطنیؒ نے بھی اس سلسلے سے باسناد خود مطولاً ”روایت کیا ہے اور اس کی اسناد کو حسن اور اس کے سب راویوں کو ثقہ کہا ہے۔ چنانچہ نافع بن محمود سے روایت کر کے لکھتے ہیں:-

انہ سمع عبادۃ بن الصامت یقرء بام القرآن و ابو نعیم یجہر بالقرۃ فقلت رایتک صنعت فی صلوۃک شیئا قال وما ذاک قال سمعتک تقرء بام القرآن و ابو نعیم یجہر بالقرۃ قال نعم صلی بنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعض الصلوات التی یجہر فیہا بالقرۃ انصرف قال منکم من احد یقرء شیئا اذا جہرت بالقرۃ قلنا نعم یا رسول اللہ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وانا اقول مالی انازع القرآن فلا یقرءن احد منکم شیئا من القرآن اذا جہرت بالقرۃ الابام القرآن ہذا اسناد حسن و رجالہ ثقات کلہم (دارقطنی، جلد ۱، ص ۱۲۱)

”نافع بن محمود نے کہا کہ میں نے عبادہ بن صامتؓ کو در آنحال کہ ابو نعیم اونچی قرات کر رہا تھا۔ سورۃ فاتحہ پڑھتے سنا۔ (جب نماز سے فارغ ہوئے تو) میں نے کہا۔ میں

نے آپ کو نماز میں کچھ پڑھتے دیکھا ہے۔ آپ نے کہا وہ کیا؟ میں نے کہا آپ کو سورۃ فاتحہ پڑھتے سنا اور آنحال کہ ابو نعیم اونچی قرأت کر رہا تھا۔ آپ نے فرمایا ہاں۔ (ایسا عدا) کیا ہے کیوں کہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ نے ہم کو بعض وہ نماز پڑھائی جس میں اونچی قرأت کی جاتی ہے۔ تو جب آپ فارغ ہوئے تو فرمایا کیا تم سے کوئی اس وقت جب میں اونچی قرأت کر رہا تھا۔ قرآن سے کچھ پڑھتا تھا۔ ہم نے عرض کیا ہاں یا رسول اللہ ﷺ۔ پس رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں دل میں یہی تو کہہ رہا تھا کہ کیا بات ہے کہ میرے ساتھ قرآن میں منازعت ہوتی ہے۔ پس جب میں اونچی قرأت کروں تو تم میں سے کوئی بھی سورۃ فاتحہ کے سوا کچھ بھی نہ پڑھا کرے۔ (امام دار قطنیؒ کہتے ہیں) اس کی اسناد حسن ہے اور اس کے سب راوی ثقہ (اور معتبر) ہیں۔“

امام دار قطنیؒ کے علاوہ اس حدیث کو امام بیہقیؒ نے بھی باسناد خود نافع ہی کی روایت سے اس سے بھی مفصل ذکر کیا ہے۔

عن نافع ----- عن عبادة بن الصامت و كان على ايليا فابطا عبادة عن صلوة الصبح و كان لول من ان بيت المقدس فجت مع عبادة حتى صفنا مع الناس و ابو نعيم يجهر بالقراءة فقراء عبادة بام القرآن حتى ختمها وفي رواية الحافظ حتى فهمتها منه فلما انصرف قلت سمعتك تقرأ بام القرآن قال نعم صلى بنا رسول الله صلى الله عليه وسلم بعض الصلوة التي يجهر فيها بالقراءة فقال لا يقرء ن احد منكم اذا جهرت بالقراءة الا بام القرآن (كتاب القراءة، ص ۴۲)

”نافع، عباده بن صامتؒ کا ذکر کر کے کہتے ہیں کہ جس زمانے میں حضرت عباده والی ایلیا (بیت المقدس) تھے۔ (ایک دن) آپ کو صبح کی نماز میں دیر لگ گئی۔ پس ابو نعیم نے جماعت کرائی اور ابو نعیم وہ شخص ہے جس نے بیت المقدس میں سب سے پہلے اذان دی۔ پس میں حضرت عبادهؒ کے ساتھ آیا اور ہم دونوں صف میں لوگوں کے ساتھ شامل ہو گئے۔ ابو نعیم اس وقت اونچی قرأت کر رہے تھے۔ پس حضرت عبادهؒ سورۃ فاتحہ پڑھنے لگے۔ حتیٰ کہ اسے ختم کیا اور حافظ ابو عبد اللہ کی روایت میں یوں ہے، حتیٰ کہ میں نے سمجھ لیا کہ آپ فاتحہ پڑھ رہے ہیں۔ پس جب نماز سے فارغ ہوئے تو میں نے

کہا۔ میں نے آپ کو سورہ فاتحہ پڑھتے سنا ہے تو انہوں نے فرمایا۔ ہاں (ایک دن) ہمیں رسول اللہ ﷺ نے بعض وہ نماز پڑھائی۔ جس میں اونچی قرات کی جاتی ہے۔ پس آپ نے فرمایا۔ جب میں اونچی قرات کروں تو تم میں سے کوئی بھی سوائے سورہ فاتحہ کے (کچھ بھی) نہ پڑھا کرے۔“

ان کے علاوہ اسے امام ابو داؤد نے بھی ہاسناد خودیوں روایت کیا ہے:-

قال نافع ابطا عبادة عن صلوة الصبح فاقام ابو نعيم المؤذن الصلوة فصلى ابو نعيم بالناس واقبل عبادة وانا معه حتى صففنا خلف ابى نعيم و ابو نعيم يجهر بالقراءة فجعل عبادة يقرء بام القرآن فلما انصرف قلت لعبادة سمعتك تقرء بام القرآن و ابو نعيم يجهر قال اجل و ابو نعيم يجهر قال اجل؛ صلى بنا رسول الله صلى الله عليه وسلم بعض الصلوات التي يجهر فيها القراءة قال فالتبست عليه القراءة فلما انصرف اقبل علينا بوجهه فقال هل تقرون اذا جهرت بالقراءة فقال بعضنا انا نصنع ذالك قال فلا- وانا اقول مالى ينازعنى القرآن- فلا تقروا بشيئ من القرآن اذا جهرت الا بام القرآن (سنن ابى داؤد مع عون المعبود، جلد اول، ص ۳۰۴)

”نافع نے کہا کہ (ایک دن) حضرت عبادهؓ کو صبح کی نماز میں دیر ہو گئی تو (آپ کی بجائے) ابو نعیم مؤذن نماز پڑھانے کھڑے ہوئے۔ (بعد ازاں) حضرت عبادهؓ بھی آگئے اور میں آپ کے ساتھ تھا۔ حتیٰ کہ ابو نعیم کے پیچھے صف میں شامل ہو گئے اور ابو نعیم اونچی قرات کر رہا تھا۔ پس حضرت عبادهؓ سورہ فاتحہ پڑھنے لگے۔ پس جب نماز سے فارغ ہوئے تو میں نے حضرت عبادهؓ سے کہا۔ میں نے آپ کو سورہ فاتحہ پڑھتے سنا ہے۔ حالانکہ ابو نعیم قرات بالجر کر رہا تھا۔ تو آپ نے کہا۔ ہاں ہم کو (ایک دن) رسول اللہ ﷺ نے بعض وہ نماز پڑھائی۔ جس میں قرات اونچی کی جاتی ہے۔ پس آپ کو قرات میں التباس پڑ گیا تو جب آپ نماز سے فارغ ہوئے اور ہماری طرف اپنا چہرہ مبارک کر کے فرمانے لگے کہ کیا تم جب میں اونچی قرات کرتا ہوں، کچھ پڑھتے ہو۔ ہم میں سے بعض نے عرض کیا۔ ہاں حضور ﷺ ہم ایسا کیا کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا پس نہیں۔ میں تو کہتا تھا کہ کیا بات ہے کہ مجھ سے قرآن میں منازعت ہوتی ہے۔ پس جس وقت میں اونچی قرات کروں تو تم

قرآن میں سے سوائے سورۃ فاتحہ کے کچھ بھی نہ پڑھا کرو۔“

امام بیہقیؒ نے بھی اپنے سلسلہ اسناد کو امام داؤد کی اس روایت کے سلسلہ اسناد سے ملاتے ہوئے اس روایت کی تخریج کی ہے اور اخیر پر کہا ہے۔ وہذا اسناد صحیح و رواۃ ثقات یعنی یہ اسناد صحیح ہے اور اس کے سب راوی ثقہ ہیں۔ چنانچہ ان کے الفاظ یہ ہیں:-

عن نافع بن محمود بن الربیع الانصاری قال کنت اغدوا الی المسجد مع عبادة بن الصامت فابطا عبادة ذات یوم قال فجئنا و ابو نعیم یصلی بالناس الصبح قال فصففنا خلفه فسمعت عبادة یقرء بفاتحة الكتاب فلما انصرف ابو نعیم قلت یا ابا الولید رایتک تقرء مع الامام ولا ادری تعمده ام سهوت قال لم انسه ولكن تعمده صلی بنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعض الصلوات التی یجهر فیها بالقراءة قال فالتبست علیہ القراءة فلما انصرف قال هل تقرء ون معی قلنا نعم قال لا تفعلوا الا بام القرآن فانه لا صلوة لمن یقرء بها وهذا اسناد صحیح و رواۃ ثقات وقد اخرجہ ابو داؤد السجستانی رحمہ اللہ فی کتاب السنن بعد حدیث محمد بن اسحق بن یسار (کتاب القراءة، ص ۴۲ - ۴۳)

”نافع بن محمود انصاریؒ نے کہا کہ میں صبح کو حضرت عبادہ بن صامتؓ کے ساتھ مسجد میں آیا کرتا تھا۔ ایک روز حضرت عبادہؓ کو دیر ہو گئی۔ جب ہم آئے تو ابو نعیم لوگوں کو صبح کی نماز پڑھا رہے تھے۔ پس ہم اس کے پیچھے صف میں شامل ہو گئے۔ پس میں نے حضرت عبادہؓ کو سورۃ فاتحہ پڑھتے سنا۔ جب ابو نعیم نماز سے فارغ ہو تو میں نے (حضرت عبادہؓ سے کہا) یا ابا الولید! میں نے آپ کو امام کے ساتھ پڑھتے دیکھا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ آپ نے ایسا عموماً کیا یا آپ کو سہو ہو گیا۔ آپ نے فرمایا۔ مجھے سہو نہیں ہوا بلکہ میں نے عموماً کیا ہے۔ (کیوں کہ ایک دن) ہم کو رسول اللہ ﷺ نے بعض وہ نماز پڑھائی جس میں قرات بالجہر کی جاتی ہے۔ پس آپ کو قرات میں التباس ہو گیا۔ جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا کہ کیا تم میرے ساتھ کچھ پڑھتے ہو۔ ہم نے کہا ہاں حضور ﷺ۔ آپ نے فرمایا سوائے سورۃ فاتحہ کے کچھ نہ پڑھا کرو۔ کیوں کہ جو شخص اسے نہیں پڑھتا۔ اس

کی نماز نہیں ہوتی۔ یہ اسناد صحیح ہے اور اس کے سب راوی ثقہ ہیں اور اسے امام ابو داؤدؒ نے بھی اپنی کتاب السنن میں محمد بن اسحق کی حدیث کے بعد روایت کیا ہے۔

اُس ساری تفصیل سے صاف صاف معلوم ہو گیا کہ اس روایت کے سب سلسلوں کے راوی معتبر ہیں اور بڑے بڑے نقاد محدثین نے اس کی تصحیح کی ہے۔ لہذا اس کی سند میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا۔ باقی رہا اس کا متن سو اس میں بھی امر مشترک میں سب متفق ہیں۔ کسی روایت میں کوئی امر بالا اختصار ہے اور کسی میں بالتفصیل۔ اسی طرح کسی روایت میں کسی امر کو زائد جان کر حذف کر دیا گیا ہے اور کسی میں اس کی تصریح کر دی گئی ہے۔ غرض مخالفت کسی میں نہیں۔ ان سب روایات کو ملا کر پورا مضمون مع تشریح ضروری کے یوں ہے کہ:-

”حضرت عبادہ بن صامتؓ صحابی والی بیت المقدس تھے اور حسب قاعدہ نماز کے امام بھی یہی تھے۔ ابو نعیم مسجد کے مؤذن تھے۔ اتفاق سے ایک روز صبح کی نماز میں حضرت عبادہؓ کو دیر ہو گئی۔ تو ابو نعیم مؤذن امام بنے۔ حضرت عبادہؓ آئے تو حسب مسئلہ پیچھے کھڑے ہو گئے۔ نافع ان کا نواسہ تھا۔ وہ ہمیشہ آپ کے ساتھ ہی آیا کرتا تھا۔ آج بھی حسب معمول ان کے ساتھ آیا اور صف میں ان کے پاس ہی کھڑا ہوا۔ حضرت عبادہؓ جو پیچھے آئے تو فاتحہ ایسی پڑھنی شروع کی کہ ان کے نواسے نافع نے جو ان کے ساتھ ہی کھڑا تھا، سمجھ لیا کہ وہ سورہ فاتحہ پڑھ رہے ہیں۔ نماز سے فارغ ہو کر نافع نے حضرت عبادہؓ سے بطور مسئلہ دریافت کیا تو حضرت عبادہؓ نے رسول اللہ ﷺ کے وقت کا ایک واقعہ سنایا کہ یوں واقعہ ہوا تو اس پر حضور اکرم ﷺ نے فرمایا تھا کہ جب میں اونچی قرأت کروں تو سوائے سورہ فاتحہ کے کچھ بھی نہ پڑھا کرو۔ کیوں کہ اس کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔“

تنبیہ:- ذیل میں ہم حضرت عبادہؓ کی اس حدیث کے متعلق چند فوائد لکھتے ہیں:-

فائدہ نمبر ۱:- حضرت عبادہؓ کی اس روایت کے جتنے سلسلے اوپر مذکور ہوئے۔ ان میں محمد بن اسحق راوی نہیں ہے۔ جن کے متعلق حضرات حنفیہ کو کچھ عذر ہے بلکہ ان کی بجائے امام مکحول شامی سے زید بن واقد شامیؒ راوی ہیں اور زید بن واقد شامیؒ کو حضرت امام احمدؒ

۱۵۵ حضرات حنفیہ کا وہ عذر مع اس کا جواب آئندہ مذکور ہوگا۔ (ان شاء اللہ)

امام دارقطنیؒ، امام یحییٰ بن معینؒ، امام عبد الرحمن بن ابراہیم دحیم وغیرہم کبار محدثین نے بالاتفاق ثقہ کہا ہے۔ (تہذیب التہذیب)

فائدہ نمبر ۲:- زید بن واقد کے علاوہ امام کھول سے یزید بن یزید بن جابر دمشقیؒ، علاء بن حارث دمشقیؒ، نعمان بن منذر اور عبد الرحمن بن علاء دمشقیؒ بھی روایت کرتے ہیں۔ یہ سب راوی بقرع ائمہ محدثین ثقہ ہیں۔ پس جب امام کھول سے ایک جماعت ثقہ کی وہی روایت کرتی ہے جو محمد بن اسحق کرتے ہیں تو اگر بالفرض محمد بن اسحاق تباحث نہ ہوں تو اتنے ثقات کی متابعت کے بعد ان کی روایت کی صحت میں کوئی خدشہ باقی نہیں رہ سکتا۔ چہ جائیکہ وہ خود تھا بھی ثقہ ہوں، قائل احتجاج ہوں اور بقول بعض ائمہ حدیث امیر المؤمنین فی الحدیث ہوں۔ چنانچہ امام بیہقیؒ اپنے شیخ الشیخ حافظ ابو احمد بن عدیؒ کا قول یوں نقل کرتے ہیں:-

قال قد فتشت احادیث محمد بن اسحق الكثير فلم اجد في احاديثه ما يتهيا ان يقطع عليه بالضعف ولم يتخلف عن الرواية عنه الثقات والائمة وقد تابع محمد بن اسحق بن يسار على هذه الرواية عن مكحول غيره من ثقات الشاميين (كتاب القراءة، ص ۴۰)

”میں نے محمد بن اسحاق کی بہت سی احادیث کی تفتیش کی۔ پس میں نے اس کی احادیث میں کوئی ایسی بات نہیں پائی، جس سے اس کے قطعاً ”ضعیف ہونے کے حکم پر جرات ہو سکتی ہو۔“ وغیرہ کہ ثقہ راوی اور ائمہ حدیث اس سے روایت لینے سے نہیں ہٹے۔ (پس اس کی روایت کا اعتبار کیوں نہ کیا جائے) اور تحقیق اس روایت پر کھول سے محمد بن اسحاق کے سوا دیگر ثقات اہل شام نے اس کی متابعت بھی کی ہے۔“

اس کے بعد علی الترتیب علاء بن حارث عن کھولؒ، عبد اللہ بن عمرو بن حارثؒ، عن محمود الربیعؒ، زید بن واقد دمشقیؒ، یزید بن جابر دمشقیؒ، نعمان بن منذر دمشقیؒ، عبد اللہ

۱۵۶ محدثین کی اصطلاح میں متابعت یہ ہے کہ کسی راوی کے اکیلے ہونے کے خیال سے دیکھا جائے کہ آیا اس میں کوئی اور راوی بھی اس کے موافق روایت کرتا ہے۔ پس اگر پایا جائے تو پہلے راوی کی روایت کی تقویت ہو جاتی ہے۔ (مستفاد از شرح نخبہ)

بن علاء دمشقؒ کی متابعت مکمل اسناد کے ساتھ ذکر کی ہیں۔ (ص ۴۰ سے ص ۴۶ تک) یہ سب راوی شامی ہیں اور انہی کو امام بیہقیؒ اوپر کی عبارت میں ثقات الثامین کہہ رہے تھے۔

فائدہ نمبر ۳ :- مکحول خود ائمہ شام سے ہیں اور ان کے سب مذکورہ بالا شاگرد شامی ہیں۔ نافع جو مکحول کے شیخ حدیث ہیں۔ ان سے مکحول کے ساتھ حرام بن حکیم بھی اس حدیث کو روایت کرتے ہیں۔ یہ بھی شامی ہیں اور ثقہ ہیں۔

پھر مکحول جس طرح نافع سے روایت کرتے ہیں۔ اس طرح اس کے باپ محمود صحابی سے بھی روایت کرتے ہیں۔ پھر محمود سے نافع اور مکحول کے علاوہ رجاء بن حیوہؒ بھی روایت کرتے ہیں۔ (کتاب القراءة، ص ۴۶) اور رجاء بن حیوہؒ بڑے پایہ کے ائمہ شام سے ہیں۔

اس تفصیل سے ظاہر ہو گیا کہ یہ حدیث نافعؒ سے اور اس کے باپ محمودؒ سے بڑے بڑے ثقہ راویوں اور اماموں کے واسطے سے مروی ہے اور یہ بھی کہ علاقہ شام میں اس حدیث کی کافی شہرت اور عام قبولیت تھی اور حالات صحابہ کرامؓ پر نظر رکھنے والے پر روشن ہے کہ آنحضرت ﷺ کے بعد فتوحات خلافت راشدہ کے وقت جو صحابی جس علاقے میں جا کر رہا۔ اس کی روایات بیشتر اسی علاقے میں مشہور ہوئیں۔ اس کے بعد محدثین نے دور دراز سفر کی صعوبتیں برواشت کر کے ہر علاقے کی مرویات کو اپنے سینے میں جمع کر کے سفینہ (کاغذ) پر نقل کیا۔ فجزاھم اللہ عنا خیر الجزاء چنانچہ امام بیہقیؒ اس حدیث قرأت ”فاتحہ خلف الامام“ کی نسبت جو حضرت عبادہؒ سے مروی ہے۔ فرماتے ہیں :-

فہذا حدیث سمعہ مکحول الشامی وهو احدائمة اهل الشام من محمود بن الربیع و نافع بن محمود کلاهما عن عبادۃ و سمعہ حرام بن حکیم من نافع بن محمود عن عبادۃ و سمعہ رجاء بن حیوۃ وهو احدائمة اهل الشام من محمود بن الربیع عن عبادۃ (کتاب القراءة، ص ۴۶)

”پس یہ وہ حدیث ہے جسے مکحول شامی نے محمود بن ربیعؒ اور نافعؒ سے سنا اور وہ (مکحول) اہل شام کے ائمہ سے ہے۔ اور یہ دونوں حضرت عبادہؒ سے روایت کرتے ہیں۔

نیز اسے نافع بن محمود سے حرام بن حکیم نے سنا اور نافع نے حضرت عبادہؓ سے روایت کی۔ نیز اسے رجا بن حیوہؓ نے کہ وہ بھی اہل شام کے ائمہ سے ہے۔ محمود بن ربیع سے سنا اور انہوں نے عبادہؓ سے روایت کی۔“

پھر اس کے چند سطور بعد فرماتے ہیں:-

وفی کل ذالک دلالة علی انتشار هذا الحديث عن عبادة بن الصامت عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم مسنداً ثم من فتواه به موقوفاً (ص ۷۷)

”اس سارے بیان میں اس بات کی دلیل ہے کہ یہ حدیث حضرت عبادہؓ سے عام طور پر مشہور ہو چکی تھی اور وہ اس کو نبی پاک ﷺ سے مسنداً بھی روایت کرتے تھے اور اس کے مطابق ان کے فتویٰ سے موقوفاً بھی مروی ہے۔“

فائدہ نمبر ۴:- یہ حدیث یعنی ایک دفعہ حضور پاک ﷺ پر فجر کی نماز میں قرات بھاری ہو جانے اور آپؐ کا یہ فرمان کہ تم جبری قرات کے وقت سوائے سورہ فاتحہ کے اور کچھ بھی نہ پڑھا کرو۔ حضرت عبادہؓ کے علاوہ دیگر بعض صحابہ کرامؓ سے بھی مروی ہے۔ مثلاً حضرت انسؓ، حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت ابو امامہؓ سے۔ یہ سب روایات امام بیہقیؒ نے کتاب القرات میں باسناد ذکر کی ہیں۔ بنظر اختصار مضمون ہم ان کو نقل نہیں کر سکتے۔ (واللہ العادی)

امام محمد بن اسحاقؒ کی روایت

اگرچہ اوپر کے مفصل بیان کے بعد ہمیں محمد بن اسحاقؒ کی روایت ذکر کرنے کی حاجت نہیں رہی تھی۔ لیکن قرات فاتحہ خلف الامام کے مسئلہ میں الہجدیث کی طرف سے یہ روایت پیش ہوتی رہتی ہے اور خفی بزرگ اس میں کلام کرتے ہیں۔ اس لیے مناسب ہے کہ علمی تحقیقات کو پورا کرنے کے لیے ہم اس روایت کو بھی بیان کر کے اس کے متعلقہ شبہات کو بھی دور کر دیں۔ (واللہ الموفق)

محمد بن اسحاقؒ کی روایت سنن وار قطنیؒ میں یوں ہے:-

وحدثنا اسمعيل هو ابن علي عن محمد بن اسحق عن مكحول عن محمود بن الربيع الانصاري وكان يسكن ايليا عن عبادة بن الصامت قال

صلی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الصبح فثقلت علیہ القراءة فلما انصرف قال انی لاراکم تقرأون من وراء امامکم قال قلنا اجل واللہ یا رسول اللہ هنا اقال فلا تفعلوا الا بام القرآن فانه لا صلوة لمن لم یقرأ بها هنا اسناد حسن (دار تفتی، جلد ۱، ص ۱۲۰)

”حدیث بیان کی ہم سے اسماعیل بن علیہ نے، اس نے محمد بن اسحاق سے، اس نے مکحول سے اس نے محمود بن ربیع انصاری سے اور وہ ایلیا (بیت المقدس) میں سکونت رکھتا تھا۔ اس نے حضرت عبادہ سے، انہوں نے کہا کہ (ایک دن) رسول اللہ ﷺ نے صبح کی نماز پڑھائی تو آپ پر قرأت بھاری ہو گئی۔ پس جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو آپ نے فرمایا۔ میں دیکھتا ہوں کہ تم اپنے امام کے پیچھے قرأت کرتے ہو۔ حضرت عبادہ نے کہا ہم نے عرض کیا کہ ہاں قسم بخدا یا رسول اللہ ﷺ ہم ایسا کرتے ہیں۔ (اس پر) آپ نے فرمایا پس نہ پڑھا کرو سوائے ام القرآن کے، کیوں کہ اس شخص کی نماز نہیں ہوتی جو اسے نہیں پڑھتا۔ (امام دار تفتی کہتے ہیں) یہ اسناد حسن ہے۔“

اس روایت کو امام دار تفتی کے علاوہ بہت سے دیگر محدثین نے بھی روایت کیا ہے۔ چنانچہ امام ترمذی نے اسے روایت کرنے کے بعد امام دار تفتی کی طرح اسے حسن کہا ہے۔ نیز امام ابو داؤد نے بھی اسے اپنی سنن میں روایت کیا۔ حافظ ابن حجر نے اس کے متعلق تلخیص میں کہا۔ و صححہ ابو داؤد یعنی امام ابو داؤد نے اسے صحیح کہا۔ نیز اسے امام احمد نے اپنی مسند میں اور امام بخاری نے جزء القراءة میں روایت کیا۔

سوال و جواب:- ان سب روایات میں محمد بن اسحاق عن مکحول ہے۔ حضرات حنفیہ کہتے ہیں کہ محمد بن اسحاق مدلس ہے اور مدلس راوی صیغہ عن سے روایت کرے تو اس کی روایت حجت نہیں ہو سکتی۔ (شرح نخبہ وغیرہ)

اس کا جواب یہ ہے کہ امام احمد اور امام دار تفتی کی دیگر روایات میں قال

۵۴۱ تقریب میں ہے امام المغازی صدوق مدلس۔

۵۴۲ بعض راوی بسا اوقات اپنے اصلی شیخ کو چھوڑ کر اوپر کے استاد کا نام لفظ عن سے ذکر کر

دیتے ہیں۔ ایسے راوی کو مدلس کہتے ہیں۔

محمد بن اسحق حدثنی مکحول بھی وارد ہے۔ اور مسلم ہے کہ جب صاحب تدلیس راوی حدثنی وغیرہ صنفے استعمال کرے جس سے سماع کی تصریح ہو جاتی ہے۔ تو نفع تدلیس کا جاتا رہتا ہے۔ (شرح نخبہ وغیرہ)

چنانچہ امام بیہقیؒ کی روایت یوں ہے۔ و اخبرنا ابو یکر بن الحارث الفقیہ انبانا علی بن عمر الحافظ ثنا ابن صاعد ثنا عبید اللہ بن سعد ثنا عمی ثنا ابی عن اسحق قال حدثنی مکحول بهذا وهذا اسناد صحیح ذکر فیہ سماع محمد بن اسحق من مکحول (کتاب القراءة ص ۳۷) غرض محمد بن اسحاقؒ کی یہ روایت ہمہ وجہ قابل احتجاج ہے، جن کا خلاصہ یہ ہے:-

- ۱۔ محمد بن اسحاق بذات خود ثقہ ہیں۔ (خلاصہ وغیرہ) ۱۵۹
- ۲۔ وہ مکحول سے بےینہ تحدیث روایت کرتے ہیں۔ پس نفع تدلیس کا جاتا رہا۔
- ۳۔ اس کی متابعت زید بن واقد وغیرہ ثقات راویوں نے کی ہے پس وہ مقرونہ رہا۔ ۱۶۰
- ۴۔ اسی قصے کے متعلق عبادہؒ کی شواہد دیگر صحابہ کرامؓ کی روایات بھی ہیں۔ جو امام بیہقیؒ نے بالتفصیل و بانساق خود کتاب القراءة میں ذکر کی ہیں مثلاً حضرت انسؓ، حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت ابو قتادہؓ، حضرت ابو امامہؓ اور حافظ ابن حجرؒ نے بھی تلخیص میں بعض کا ذکر کیا ہے اور محمد بن ابی عاصمؒ عن رجل من اصحاب النبی ﷺ والی روایت کی نسبت کہا ہے۔ اسنادہ حسن یعنی اس کی اسناد حسن ہے۔

قرات سورۃ فاتحہ اور حضرات خفیہؒ

۱۵۹۔ خلاصہ میں ہے عن ابن شہابؒ لایزال بالمدينة علم جم ما کان فیہا ابن اسحاقؒ وقال احمد حسن الحديث وقال البخاری رایت علی بن عبد اللہ (ابن المدینی) یحتج۔ نیز شیخ ابن ہمام حنفی امام شعبہؒ کے قول سے لکھتے ہیں هو امیر المؤمنین فی الحديث (فتح القدیر، جلد ۱، ص ۹۰)

۱۶۰۔ کتاب القراءة للبیہقیؒ ص ۴۰ سے ص ۴۶ تک۔

۱۶۱۔ کتاب القراءة للبیہقیؒ ص ۴۸ سے ص ۵۳ تک۔

۱۶۲۔ تلخیص جلد اول، ص ۴۷۔

سابقاً جو کچھ بیان ہوا، وہ جمہور محدثین کا مذہب تھا۔ آپ اس کو پھر دیکھیں کہ اس میں سوائے تتبع نصوص کے اور کچھ نہیں ہے اور اتباع شریعت میں صحابہ کرامؓ کا طریق یہی تھا۔ لیکن حضرات حنفیہ کا طریق استدلال ان سے قدرے مختلف ہے۔ کیوں کہ یہ حضرات پہلے قواعد بتاتے ہیں پھر ان کے مطابق نصوص پر نظر ڈالتے ہیں۔ اگر قاعدے اور نص میں مطابقت ہو گئی تو ہو المراد ورنہ قاعدے کو بحال رکھتے ہوئے نص کی تاویل کر دی۔ (خواہ قرآنی ہو خواہ حدیثی) یا اس میں کوئی شرط یا قید بڑھا دی جیسے یہی صورت رکنیت فاتحہ کے متعلق ہے کہ ایک قاعدے کی پابندی کی وجہ سے ان کو حدیث لا صلوة لمن لم یقرء بفاتحة الكتاب کے زور کو کمزور کرنا پڑا اور اس کی قرات کو فرض سے اتار کر واجب کرنا پڑا۔ چنانچہ اصول شاشی میں بحث عام غیر مخصوص البعض میں مرقوم ہے:-

وبمثلہ نقول فی قوله تعالیٰ فاقراءوا ما تیسر من القرآن عام فی جمیع ما تیسر من القرآن ومن ضرورتہ عدم توقف الجواز علی قراءۃ الفاتحۃ وجاء فی الخبر انه لا صلوة الا بفاتحة الكتاب فعملنا بهما علی وجه لا یتغیر بہ حکم الكتاب بان نحمل الخبر علی نفی الکمال حتی یکون مطلق القراءۃ فرضا بحکم الكتاب وقراءۃ الفاتحۃ واجبة بحکم الخبر (اصول شاشی بجائی، ص ۵)

”اور اسی طرح ہم کہتے ہیں کہ فاقراءوا ما تیسر من القرآن عام ہے۔ سب میں جو قرآن سے میرا آئیکے اور اس سے لازم آتا ہے کہ نماز کا جواز سورہ فاتحہ کی قرات پر موقوف نہیں ہے اور حدیث میں وارو ہے کہ فاتحہ کے سوا نماز نہیں ہوتی۔ پس ہم (حنفیوں) نے ان ہردو (آیت اور حدیث) پر ایسے طریق پر عمل کیا کہ اس سے قرآن کا حکم متغیر نہیں ہوتا، جس کی صورت یہ ہے کہ حدیث کو نفی کمال پر محمول کریں۔ تاکہ مطلق قرات تو قرآن کے حکم سے فرض ہو اور قرات فاتحہ بحکم حدیث واجب ہو۔“

۱۶۳ صلواتا انور شاہ صاحب دیوبندی کے رسالہ فصل الخطاب کی بناء اور تعمیر سب کچھ اسی مسلک پر ہے۔

اور اس کی شرح فضول الحواشی میں لکھا ہے:-

فاذا تقابلا عملنا بهما على وجه لا يتغير به حكم الكتاب بان يحمل الخبر على نفى الكمال و يجعل معناه لا صلوة كاملة الا بفاتحة الكتاب فيجوز الصلوة بمطلق القراءة لكن يتمكن فيها نقصان بترك الواجب وفيه تقرير فرضية القراءة كما هو موجب الكتاب و ايجاب الفاتحة عملا بالخبر (فضول، ص ۳۲ - ۳۳)

”پس جب دونوں (آیت اور حدیث) ایک دوسرے کے بالقابل ہو گئیں۔ تو ہم نے ایسی وجہ پر عمل کیا کہ اس سے قرآن کا حکم متغیر نہ ہو۔ بدیں صورت کہ حدیث نفی کمال پر محمول کی جائے اور اس کے معنی یہ کئے جائیں کہ نماز بغیر فاتحہ کے کامل نہیں ہوتی۔ پس نماز مطلق قرات سے جائز تو ہو جائے گی لیکن واجب کے ترک کرنے سے نقصان ضرور رہے گا اور اس میں فرضیت قرات کا مقرر کرنا بھی ہے جو بحکم قرآن ہے اور حدیث پر عمل کر کے فاتحہ کو واجب جاننا بھی ہے۔“

اسی کے قریب علامہ یعنی ”شرح بخاری میں فرماتے ہیں:-

و استدلال اصحابنا بقوله تعالى (فاقرءوا ما تيسر من القرآن) امر الله تعالى بقراءة ما تيسر من القرآن مطلقا و تقييده بالفاتحة زيادة على مطلق النص وذا لا يجوز لانه نسخ فيكون ادنى ما ينطلق عليه القرآن فرضا لكونه مامورا به (یعنی، جلد ۳، ص ۶۵)

”ہمارے اصحاب (حنفی) نے قول خداوندی فاقراءوا ما تيسر من القرآن سے استدلال کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مطلقاً جو کچھ قرآن پاک میں سے میسر آئے۔ اس کے پڑھنے کا حکم کیا ہے اور اسے فاتحہ سے مقید کرنا مطلق نص پر زیادتی ہے جو جائز نہیں کیوں کہ یہ نسخ ہے۔ پس کم از کم جس پر قرآن مجید کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ فرض ہو گا کیوں کہ اسی کا حکم ہے۔“

اسی طرح دوسرے علمائے حنفیہ کی بھی تصریحات ہیں، جن کو ہم بخوف طوالت نقل نہیں کر سکتے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ حضرات حنفیہ کے استدلال کا اصل مدار آیت فاقراءوا ما تيسر من القرآن کا عموم ہے اور دیگر کوئی دلیل جو اس کے عموم کو

توڑے موثر نہیں ہو سکتی۔

تنبیہ :- علمائے حنفیہ کو اس آیت سے مطلق قرات کی فرضیت پر استدلال کرنے میں قرات خلف الامام کے متعلق ایک سخت مشکل پیش آگئی ہے۔ جو آج تک علمی طور پر ان کے بڑے سے بڑے امام الاصول سے بھی حل نہیں ہو سکی۔ وہ یہ کہ حضرات حنفیہ کے نزدیک مقتدی سے قرات قطعاً ساقط ہو جاتی ہے بلکہ بعض نے تو اسے ناجائز و حرام بھی لکھ دیا ہے۔ حالانکہ جب مطلق قرات فرض ہے تو وہ بحالت اقتداء بھی فرض ہے کیوں کہ فرائض بحالت اقتداء بھی ساقط نہیں ہوتے اور دلیل ان کی عام طور پر آیت و اذا قرى القرآن فاستمعوا له وانصتوا (اعراف، پ ۹) ہے۔ یعنی جب قرآن پڑھا جائے تو اسے غور سے سنو اور چپ رہو۔ ان کے نزدیک اس آیت سے جبری نماز میں مقتدی کے لیے قرات منع ہے۔ خواہ وہ سورۃ فاتحہ ہو یا کسی اور مقام سے ہو۔ پس مشکل یہ آن پڑی کہ تعیین فاتحہ سے انکار کے وقت تو انہوں نے اپنے مذہب کے مطابق آیت فاقراءوا ما تيسر من القرآن سے استناد کر لیا اور حدیث لا صلوة لمن لم يقرء بفاتحة الكتاب کو وجوب فاتحہ کے لیے کہہ دیا۔ لیکن اس کے ساتھ ان کا مذہب مقتدی کو قرات سے مطلقاً منع کرنا ہے تو اس مقام پر عموم آیت کو نظر انداز کر دیا ہے۔ حالانکہ جس طرح یہ آیت نصاب قرات کے لیے عام ہے۔ اسی طرح نماز کی حالت کے لیے بھی عام ہے اور اس امر کا علمائے حنفیہ کو اقرار ہے، جیسا کہ ذیل میں ان کی تصریحات سے واضح ہو جائے گا۔ جب مقتدی کو بھی قرآنی آیت ہی کی رو سے منع کیا تو ایک اور مشکل پیدا ہو گئی کہ ایک آیت کی رو سے مقتدی پر قرات فرض ثابت ہوتی ہے۔ لیکن دوسری کی رو سے منع ہے تو اب (معاذ اللہ) آیات قرآنیہ میں تعارض ہو گیا۔ اور ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ علمائے حنفیہ کا ان ہر دو آیات کے متعلق یہی خیال ہے کہ ان دونوں میں تعارض ہے۔ اس لیے ان کے نزدیک یہ دونوں آیتیں ساقط ہو جاتی ہیں۔ یعنی نہ اپنے مضمون میں یہ مفید اور نہ وہ کارگر۔ دونوں اثبات حکم سے سکت۔ چنانچہ حنفی اصول کی مشہور و متداول کتاب ”نور الانوار“ میں ہے :-

مثالہ قوله فاقراءوا ما تيسر من القرآن مع قوله تعالى واذا قرى القرآن فاستمعوا له وانصتوا فان الاول بعمومه يوجب القراءة على المقتدى والثاني

بخصوصہ ینفیه وقد ورد فی الصلوۃ جمیعاً فتساقط فیصار الی حدیث
بعده (نور الانوار، مطبوعہ لکھنؤ، ص ۱۹۳)

”اس کی مثال آیت فاقروا ما تیسر من القرآن مع قول خداوندی و
اذا قرأ القرآن فاستمعوا له وانصتوا کے ہے کہ پہلی آیت اپنے عموم سے مقتدی پر
بھی قرأت کو واجب کرتی ہے اور دوسری آیت اپنے خصوص سے اس کی نفی کرتی ہے۔
حالانکہ دونوں آیتیں نماز کے متعلق ہیں۔ پس ہر دو ساقط ہو گئیں اور اس کے بعد حدیث
کی طرف جانا پڑا۔“

اسی طرح ”کشف الاسرار شرح اصول بزدوی“ اور ”تلوٰح شرح توضیح“ میں دو
آیتوں میں تعارض کی صورت میں حدیث کی طرف رجوع کرنے کی مثال میں انہی دو

علامہ تعارض یہ ہے کہ دو قسادی القوۃ دلیلیں ایک دوسری کے سامنے آڑے آجائیں اور
ایک دوسری کے حکم کو نہ چلنے دے۔ چنانچہ توضیح میں ہے وہی ورود دلیلین یقتضی احد
هما عدم ما یقتضیہ الآخر اور یہ امر نہ تو دو آیتوں میں ہو سکتا ہے نہ دو صحیح حدیثوں
میں اور نہ آیت اور حدیث صحیح میں، باوجود اس کے حنفی کتب اصول میں اس کی تصریح کی گئی
ہے۔ سو اس کی وجہ ان بزرگوں نے خود بیان کر دی ہے کہ وہ تعارض حقیقی نہیں ہوتا
کیوں کہ کلام اللہ اور کلام رسول ﷺ میں تعارض نہیں ہو سکتا بلکہ وہ ظاہر نظر میں ہوتا ہے
یا تو ہماری غلط فہمی سے ہم کو نظر آتا ہے یا تائخ و منسوخ کی تاریخ معلوم نہ ہونے کی وجہ
سے۔ بہر حال ہمارا مقصود یہ ہے کہ حنفی علماء ان ہر دو آیتوں کو متعارض جانتے ہیں اور کسی
نے بھی اس تعارض کو صحیح طور پر دفع نہیں کیا۔ شیخ ابن ہمامؒ نے فتح القدیر میں کہا ہے کہ
حدیث من کان لہ امام فقراۃ الآمام لہ قراۃ آیت فاقروا ما تیسر من القرآن کی تخصیص
ہے لیکن یہ جواب اصول حنفیہ کے رو سے درست نہیں۔ کیوں کہ اول تو اس حدیث کا قول
رسول اللہ ﷺ سے ہونا ثابت نہیں۔ جیسا کہ امام بخاریؒ نے جزء القراۃ میں فرمایا ہے۔ دوم
یہ کہ حنفیہ کے نزدیک آیت کی تخصیص حدیث متواتر یا مشہور سے ہو سکتی ہے لیکن اخبار احاد
سے نہیں ہو سکتی اور یہ روایت اخبار احاد سے ہے۔ ہمارے زمانہ کے فخر احناف حضرت
مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ جن کی قدر ہمارے دل میں بہت ہے۔ انہوں نے سبیل

آیتوں کو پیش کیا ہے۔

ان حوالہ جات سے ہمارے دو مقصد بالکل واضح ہیں۔ اول جو اصل مقصد ہے کہ حضرات حنفیہ نے اس آیت فاقروا ما تیسر من القرآن کو آیت واذقرو القرآن سے متعارض جان کر ساقط کر دیا ہے۔

دوم بات یہ کہ حضرات حنفیہ نے ان دونوں آیتوں کے تعارض کو اٹھایا نہیں بلکہ یکے بعد دیگرے نقل کرتے چلے آئے ہیں اور حقیقت یہی ہے کہ جب وہ دائرہ تقلید سے نہ نکلیں اور حدیث لا صلوة لمن لم یقرء بفاتحة الكتاب کے مطابق سورہ فاتحہ کو رکن نماز معین نہ کریں اور امام کے پیچھے بھی اس کے پڑھنے کے قائل نہ ہوں۔ یہ مشکل حل نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ ان شاء اللہ تعالیٰ آئندہ معلوم ہو جائے گا۔
دوسرا جواب

اس کے بعد یہ بھی گزارش ہے کہ علما نے تفسیر کے اس آیت فاقروا ما تیسر من القرآن میں دو قول ہیں۔ اول یہ کہ اس جگہ قرات سے مراد صلوة (نماز) ہے۔ کیوں کہ قرات قرآن نماز کا ایک رکن ہے۔ چنانچہ اس کی تفصیل اس فصل کے

الرشاد اور ہدایت المعتدی میں فرمایا ہے کہ آیت فاقروا ما تیسر من القرآن میں فرضیت صلوة تہجد طویل منسوخ ہو کر قدر ما تیسر کی فرضیت باقی رہی تھی بعد اس کے جب نماز پنجگانہ فرض ہوئی تو اس وقت بھی قرات امام و مقتدی سب پر فرض رہی۔ پھر ایک مدت کے بعد آیت واذقرو القرآن فاستمعوا له وانصتوا سے قرات مقتدی منسوخ ہوئی۔ (ص ۵) حضرت مولانا صاحب مرحوم نے کوشش تو بہت کی کہ اپنے اسلاف سے تعارض کے قائل ہونے کے بوجھ کو ہلکا کر دیں۔ اگرچہ ان کی قرارداد کے خلاف چل کر ہی ہو لیکن اس کے ثبوت میں جتنی روایتیں لکھیں یا تو وہ ضعیف ہیں یا مرسل و منقطع ہیں۔ پس ایسی روایات معارک محدثین میں پیش نہیں ہو سکتیں۔ غالباً اسی وجہ سے اسلاف حنفیہ نے جو علم میں مولانا مرحوم سے برتر تھے ان روایات کی طرف توجہ نہیں کی اور ان کو تعارض کا قائل ہونا پڑا۔ بہر حال یہ ایک مشکل ہے جو حضرات حنفیہ سے آج تک حل نہیں ہو سکی لیکن محدثین کے مسلک پر اللہ کے فضل سے نہ آیتوں میں تعارض ہوتا ہے نہ آیت اور حدیث میں تخالف۔

مقدمہ میں اور اس سے پیشتر بھی ہو چکی ہے۔ اس بناء پر اس کے یہ معنی ہوں گے کہ نماز تہجد کے وقت جتنی رکعات ملحوظ درازی یا کوتاہی شب یا بحالت صحت یا مرض یا بوقت سفر یا حضر تم کو میسر آسکیں۔ اتنی رکعات پڑھ لیا کرو۔ تم پر خاص تعداد کی تحدید نہیں ہے۔ ان معنی کی رو سے حضرات حنفیہ کا یہ عذر کہ اس آیت میں مطلق قرات کا حکم ہے اور وہی فرض ہے۔ اور حدیث لا صلوة لمن لم یقرء بفاتحة الكتاب اپنے اقتضائے فرضیت سے اتر کر وجوب کی مقتضی ہے، درست نہ رہا۔ چنانچہ امام خطیب شربنیؒ ”تفسیر سراج منیر“ میں اس قول کی بناء پر لکھتے ہیں:-

و اذا كان ذالك على قيام لا في قدر القراءة فلا دليل فيه على ان الفاتحة لا تتعين في الصلوة بل هي متعينة في كل ركعة لخبر الصحيحين لا صلوة لمن لم يقرء بفاتحة الكتاب ولخبر لا تجزئي صلاة لا يقرء فيها بفاتحة الكتاب رواه ابنا خزيمه و حبان في صحيحيهما و لفعله صلى الله عليه وسلم كما في صحيح مسلم مع خبر البخاري صلوا كما رايتموني اصرى (جلد ۳، ص ۳۲۸)

”اور جب یہ حکم قدر قرات کے متعلق نہیں ہے۔ بلکہ قیام کے متعلق ہے تو اس میں اس امر پر کوئی دلیل نہیں ہے کہ خاتمہ نماز میں معین رکن نہیں ہے۔ بلکہ وہ تو ہر رکعت میں متعین رکن ہے۔ بدلیل حدیث لا صلوة لا یقرء فیہا بفاتحة الكتاب کے، جسے امام ابن خزیمہؒ اور ابن حبانؒ نے اپنی اپنی صحیح میں (بسنند صحیح) روایت کیا۔ نیز بدلیل نبی ﷺ کے فعل کے جس طرح کہ صحیح مسلم اور صحیح بخاریؒ کی حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا نماز پڑھو جس طرح تم نے مجھ کو نماز پڑھتے دیکھا ہے۔ (اور آنحضرت ﷺ نماز میں دامنًا سورۃ فاتحہ پڑھا کرتے تھے)“

اس حدیث کی یہ تفسیر محض محدثین و شوافع ہی نے نہیں کی بلکہ حضرات حنفیہ میں سے بھی جو مفسر ہوئے۔ انہوں نے بھی اسے بلا انکار لکھا ہے۔ چنانچہ علامہ ابوالسعودؒ جو حنفی مفسرین میں خصوصیت سے نکتہ رس ہوئے ہیں۔ لکھتے ہیں:-

فاقرء و اما تیسر من القرآن فصلوا ما تیسر لکم من صلوة اللیل عبر عن الصلوة بالقرآۃ کما عبر عنها بسائر ارکانها (ابو السعود بر حاشیہ تفسیر کبیر، جلد ۸،

(ص ۳۸۵)

”فاقرء واما تيسر من القرآن کے معنی یہ ہیں کہ رات کی نماز (تہجد) میں سے جو کچھ تم کو میسر آ سکے، پڑھا کرو۔ اس آیت میں نماز کو قرات سے تعبیر کیا ہے۔ جس طرح کہ اسے اس کے دوسرے ارکان (رکوع و سجود) سے تعبیر کیا ہے۔“

اسی طرح علامہ زعزریؒ جو فن بلاغت کے امام ہیں اور فروع میں حنفی المذہب ہیں۔ اپنی مایہ ناز تفسیر کشاف میں اس آیت کے ذیل میں فرماتے ہیں:-

و عبر عن الصلوة بالقرأة لانها بعض اركانها كما عبر عنها بالقيام والركوع والسجود يريد فصلوا ما تيسر عليكم ولم يتعذر من صلوة الليل (کشاف، مطبوعہ مصر، جلد ۲، ص ۵۰۱)

”اور نماز کو قرات سے اس لیے تعبیر کیا کہ قرات اس کا ایک رکن ہے، جس طرح کہ (بعض جگہ) اسے قیام، رکوع اور سجود سے تعبیر کیا ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ رات کی نماز میں سے جو کچھ تم کو میسر آئے اور تم کو اس میں عذر نہ ہو، پڑھا کرو۔“

اسی طرح علامہ آلوسیؒ جو متاخرین حنفیہ میں بڑے پائے کے مفسر ہیں۔ وہ بھی اسی کے مطابق لکھتے ہیں۔ اور صاحب کنز الدقائق علامہ نسفیؒ جو مشہور حنفی فقیہ ہیں۔ اپنی مشہور تفسیر مدارک میں اسے نقل کرتے ہیں۔

اسی طرح دیگر تفاسیر جو علمائے محدثین یا علمائے شافعیہ کی ہیں۔ ان میں بھی یہ تعبیر بلا انکار لکھی ہے کہ علماء نے اس آیت میں قرات سے مراد نماز بھی لی ہے۔ مثلاً” تفسیر کبیر، ابن کثیر، سراج منیر، فتح البیان، بیضاوی، خازن، رحمانی اور معالم التنزیل ان سب تفاسیر میں یہ قول لکھا ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں دوسرا قول یہ ہے کہ اس میں قرات قرآن کا حکم ہے۔ عام ابن سے کہ نماز ہو یا خارج از نماز بطور تلاوت و دراست ہو۔ چنانچہ ”تفسیر سراج منیر“ میں ہے:-

والقول الثاني ان المراد بقوله تعالى فاقراء واما تيسر من القرآن دراسته و تحصيل حفظه و ان لا يعرض للنسيان سواء كان في صلوة او غيرها (جلد ۴، ص ۳۲۸)

”اور دوسرا قول یہ ہے کہ فاقراء واما تیسرے سے مراد اس کی تلاوت و درست اور اس کے حفظ کو حاصل کرنا ہے تاکہ اس پر نسیان کا عارضہ نہ ہو جائے۔ برابر ہے کہ یہ تلاوت نماز میں ہو یا نماز کے سوا (خارجاً بطور منزل) ہو۔“

اسی طرح ”تفسیر کبیر“ میں لکھا ہے۔ والغرض منہ دراستہ للقرآن لیحصل الامن من النسیان یعنی اس سے مراد تلاوت و درست قرآن ہے تاکہ نسیان قرآن سے بے خوفی ہو جائے۔

یہ دوسرا قول بھی محدثین اور شوافع کی تفاسیر کے علاوہ حنفی علماء کی تفاسیر میں بھی مرقوم ہے۔ مثلاً ”تفسیر مدارک اور تفسیر کشاف جن کی عبارتیں ہم بخوف طوالت نقل نہیں کر سکتے۔

پس اگر خارج از صلوٰۃ تلاوت و درست مراد لی جائے تو قطعاً اس میں نماز میں قرات کے فرض ہونے کی دلیل نہ ہوگی۔ کیوں کہ حنفی مذہب میں بھی قرآن شریف کی تلاوت خارج از صلوٰۃ فرض نہیں ہے۔ چنانچہ علامہ نسفی حنفی نے اسی آیت میں اس قول ثانی کی رو سے فاقراء و اسے قرات قرآن مراد لینے کی صورت میں کہا ہے:-
(فاقراء و) فی الصلوٰۃ والامر للوجوب او فی غیرہا والامر للندب (جلد ۲ ص ۳۲۵)

”(پس قرات کرو) نماز میں اس کی رو سے صیغہ امر وجوب کے لیے ہوگا۔ یا غیر نماز میں اس کی رو سے صیغہ امر استحباب کے لیے ہوگا۔“
اور اگر نماز کے اندر قرآن شریف پڑھنے کا حکم قرار دیا جائے تو اس سے ماعدا فاتحہ کے مراد ہوگی۔ یعنی وہ قرات جو سورہ فاتحہ کی قرات کے بعد پڑھی جاتی ہے اور یہ صورت روایۃ اور فقاہیہ ہر دو طرح سے درست ہے۔ روایت ”تو اس طرح کہ کہ امام بیہقی نے بائنا خود امام دارقطنی کے واسطے سے روایت کیا کہ قیس بن حازم نے کہا کہ:-

عن قیس بن حازم قال صلیت خلف ابن عباسؓ بالبصرة فقرأ فی اول رکعة بالحمد و آية من البقرة ثم قام فی الثانية فقرأ الحمد لله والایة الثانية من البقرة ثم رکع فلما انصرف اقبل علينا فقال ان الله تعالى يقول فاقراء و

ما تيسر منه‘ قال على الدار قطنى رحمه الله هذا اسناد حسن و فيه حجة لمن يقول ان معنى قوله فاقراء واما تيسر منه ان ذالك انما هو بعد قراءة فاتحة الكتاب والله اعلم (كتاب القراءة‘ ص ۱۵۳ - ۱۵۴)

”میں نے بصرہ میں حضرت ابن عباسؓ کے پیچھے نماز پڑھی تو آپ نے پہلی رکعت میں سورۃ الحمد پڑھی اور سورۃ بقرہ کی ایک آیت پڑھی۔ پھر (جب) دوسری میں کھڑے ہوئے تو سورۃ الحمد پڑھی اور سورۃ بقرہ کی دوسری آیت پڑھ کر رکوع کیا۔ پس جب نماز سے فارغ ہوئے تو ہماری طرف چہرہ کر کے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فاقراء واما تيسر منه امام دار قطنیؒ نے کہا کہ یہ اسناد حسن ہے اور اس میں اس شخص کی دلیل ہے جو یہ کہتا ہے کہ فاقراء واما تيسر منه کے معنی یہ ہیں کہ یہ حکم سورۃ فاتحہ کے بعد کی قرات کے متعلق ہے (واللہ اعلم)“

قیس بن حازم کی اس روایت کو امام بغویؒ نے تفسیر معالم میں اور امام خطیب نے تفسیر سراج منیر میں اور حضرت سید نواب صاحب نے فتح البیان میں نقل کیا ہے اور جیسا کہ امام بیہقیؒ نے امام دار قطنیؒ سے اس کی تحمین نقل کی ہے۔ اسی طرح حضرت سید نواب صاحب نے بھی امام دار قطنیؒ اور امام بیہقیؒ سے اس کی تحمین نقل کی ہے۔

غرض حضرت ابن عباسؓ سے باسناد ثابت ہے کہ وہ اس آیت سے قرات بعد فاتحہ مراد لیتے ہیں۔ پس جب یہی مراد ہوئی تو حدیث لا صلوة لمن لم یقرء بفاتحة الكتاب پر اس کا کچھ بھی اثر نہ پڑا کیوں کہ اس میں فاتحہ کے بعد کی قرات کا حکم ہے اور یہی درست ہے۔

اگر کہا جائے کہ اس صورت میں بھی تو بعد فاتحہ والی قرات کا حکم مقتدیؒ، امام اور اکیلے سب کے لیے رہے گا۔ پھر آپ (المحدث) مقتدیؒ کو جر کے وقت بعد فاتحہ کی قرات سے کیوں منع کرتے ہیں۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ امر حدیث صحیح میں آچکا ہے اور وہ حدیث متعدد صحابیوں سے، متعدد طرق سے مروی ہے اور شہرت کی اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ اس سے بالاتفاق آیت قرآن کی تخصیص ہو سکتی ہے۔ پس مقتدیؒ کے لیے بحکم حدیث صرف فاتحہ کا حکم ہو گا اور جہری قرات کے وقت اسے ماعدہ فاتحہ سے ممانعت ہوگی اور حدیث ہی کے رو سے سری میں ماعدہ فاتحہ میں اس کا اختیار ہے۔ چاہے پڑھے،

چاہے نہ پڑھے لیکن فاتحہ کسی صورت میں بھی ترک نہیں ہو سکتی کیوں کہ وہ رکن نماز ہے۔ یہ مذہب بالکل صاف ہے اور اس میں سب احادیث صحیحہ اور آیات متعلقہ جمع ہو جاتی ہیں اور کوئی دقت دو آیتوں یا دو حدیثوں، یا آیت و حدیث صحیح میں تعارض و تخالف کی باقی نہیں رہتی۔ (وللہ الحمد)

مفسرین کے دوسرے قول کا فقہت کی رو سے بھی درست ہونا یوں ہے کہ سورہ مزمل کا یہ رکوع نماز تہجد میں تخفیف کے لیے اترتا ہے اور تخفیف دو طرح پر ہو سکتی ہے۔ اول تعداد رکعات میں دوم مقدار قرات میں۔ سو قول اول کی رو سے تعداد رکعات میں تخفیف ہے۔ یعنی جس صورت میں کہ قرات سے حقیقتاً قرات قرآن اور وہ بھی نماز کے اندر مراد ہو۔ اور ظاہر ہے کہ قرات کی درازی اور چھوٹائی ماعدہ فاتحہ میں ہو سکتی ہے۔ جس کی مقدار ایک آیت سے لے کر سارے قرآن تک ہے۔ سورہ فاتحہ تو پہلے ہی چھوٹی سی سورت ہے۔ اس کا پڑھنا کسی پر دو بھر نہیں ہے۔ کوئی سفر میں ہو یا حضر میں، بیمار ہو یا تندرست، تھوڑے وقت پر اٹھے یا زیادہ پر سب کے لیے آسان ہے۔ اور پھر یہ کہ عظمت اور ثواب میں سارے قرآن کے برابر بھی ہے۔ جیسا کہ سابقہ آیت ولقد اتیناک سبعا من المثنی والقرآن العظیم (الحجر، پ ۱۲) اور حدیث صحیح بخاری سے واضح ہو چکا ہے اور یہی حکمت نماز میں اس کے معین کرنے کی ہے کہ یہ سب پر آسان بھی ہے اور عظمت و ثواب میں سب سورتوں سے بڑھ کر بھی ہے اور اسے دیگر فعلی ارکان نماز سے کامل مناسبت بھی ہے اور اسی کامل مناسبت کی وجہ سے خود اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس کا نام الصلوۃ بھی رکھا ہے۔ جیسا کہ حدیث قدسی میں گزر چکا ہے اور معلوم ہے کہ تخفیف کی وجوہات اسی آیت میں اللہ رب العزت نے خود فرمادی ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے:-

ان ربک یعلم انک تقوم ادنی من ثلثی الیل و نصفہ و ثلثہ و طائفة من الذین معک واللہ یقدر الیل و النهار علم ان لن تحصوه فتاب علیکم فاقراء و اما تیسر من القرآن علم ان سیکون منکم مرضی و اخرون یضربون فی الارض یتغون من فضل اللہ و اخرون یقاتلون فی سبیل اللہ فاقراء و اما تیسر منه (الزل، پ ۲۹)

”(اے پیغمبر!) بے شک تمہارا رب جانتا ہے کہ تم (نماز تہجد کے لیے) رات کی دو تہائی کے قریب یا اس کا نصف یا اس کا ثلث حصہ لے کر اٹھتے ہو اور تمہارے اصحاب کی ایک جماعت بھی (اسی طرح اٹھتی ہے) اور رات اور دن کی ساعات کا اندازہ تو بس اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔ اسے خوب معلوم ہے کہ تم ایک مقرر اندازے کی نگہداشت نہیں کر سکو گے۔ پس اس نے تم پر مہربانی کر دی ہے تو اب تم نماز یا قرآن پاک میں سے جس قدر آسانی سے پڑھ سکو، پڑھ لیا کرو۔ اسے یہ بھی معلوم ہے کہ (کبھی) تم میں سے کوئی بیمار ہو جایا کریں گے اور (بعض) دیگر اللہ کے فضل (روزی) کی تلاش میں زمین میں سفر کیا کریں گے اور (بعض) دیگر اللہ کی راہ میں لڑائی کو نکلا کریں گے۔ پس تم اس (نماز یا قرآن) میں سے جتنا تم سے باسانی ہو سکے، پڑھ لیا کرو۔“

اور اسی سہولت و جامعیت اور عظمت و مناسبت کی وجہ سے حدیث مسیٰ الصلوٰۃ میں بھی مائیسر معک من القرآن^ص سے مراد یہی سورۃ فاتحہ ہے۔ جیسا کہ ان شاء اللہ تعالیٰ آئندہ مفصل ذکر ہو گا۔

امام بیہقی ”کتاب القراءۃ“ میں روایات مسیٰ الصلوٰۃ میں مائیسر سے سورۃ فاتحہ مراد ہونا اور حضرت ابن عباسؓ کے نزدیک آیت فاقروا ما تیسر من القرآن میں فاتحہ کے بعد کی قرات کا حکم مراد ہونا ذکر کر کے فرماتے ہیں:-

ثم قراءة الفاتحة اولی السور والایات بوقوع مائیسر علیہا السہو لہا علی الالسن و ابتداء المتعلمین بتعلمہا و استفتاح المصلین صلوتہم بقرائتہا حتی لا یکاد یوجد مصل یقرء فی کل رکعة من ضلوتہ غیر الفاتحة فان اربادان یقرء غیرہا بدلبہا (ص ۶)

”پھر یہ کہ سورۃ فاتحہ کی قرات مائیسر کا مصداق ہونے میں سب سورتوں اور آیتوں سے اولی (اور اقدم) ہے۔ کیوں کہ وہ زبانوں پر سہل ہے اور سب سیکھنے والے ابتداً اسی کو سیکھتے ہیں۔ اور سب نمازی اپنی نمازوں کا شروع اسی سے کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ کوئی نمازی ایسا نہیں ملے گا۔ جو اپنی نماز کی ہر رکعت میں سوائے سورۃ فاتحہ کے اور

۶۵ اس معنی کی رو سے ”من“ تبعیضیہ ہے کہ یعنی قرآن میں سے وہ سورت پڑھا کر جو

مائیسر بہت آسان ہے۔ معک یعنی وہ تجھے ایسی یاد ہے کہ گویا تیرے ساتھ ہی رہتی ہے۔

کچھ (ضروری طور پر) پڑھتا ہو اور اگر اس کے علاوہ کچھ اور بھی پڑھنا چاہے تو پہلے اس کو یعنی فاتحہ کو ضرور پڑھ لے گا۔“

الغرض آیت فاقراء واما تيسر میں اگر قرات سے مراد ”قرات القرآن فی الصلوة“ مراد لی جائے تو اس سے مراد فاتحہ کے بعد کی قرات ہے۔ کیوں کہ اسی آیت میں جو جو وجوہات و عذرات پیش نظر رکھ کر یہ حکم دیا گیا ہے۔ وہ سب سورۃ فاتحہ پر نہیں بلکہ ماعدہ فاتحہ ہی پر منطبق ہو سکتے ہیں۔ جیسا کہ آیت کے سیاق کلام سے ظاہر ہے۔ ان سب امروں کو ہم نہایت مختصر عبارت میں بھی بیان کر دیتے ہیں تاکہ اگر کوئی حفظ کرنا چاہے تو اسے آسانی ہو۔

قلت المراد من قوله تعالى ما تيسر من القرآن اما قراءة نفس الفاتحة نظرا الى روايتي ابى داؤد والبيهقي من حديثي ابى هريرة ورفاعة بن رافع واما ما بعد الفاتحة نظرا الى سوق الكلام و تفسير ابن عباس و مراعاة لحال المعنورين من المرضى والمسافرين والمجاهدين المذكورين في نفس الآية و عدم ضبط ساعات التنبه من النوم كما يشير اليه قوله تعالى والله يقدر الليل والنهار علم ان لن تحصوه فتاب عليكم فاقراء واما تيسر من القرآن و تطبيقا بين الآية والاحاديث الصحيحة الثابتة المتواترة او المستفيضة الواردة في ايجاب قراءة الفاتحة في الصلوة و جمعا بين الادلة و اعتبارا بمداومة النبي صلى الله عليه وسلم بقراتها طول عمره و عدم تركها

”میں کہتا ہوں کہ قول خداوندی ”ما تيسر من القرآن“ سے مراد یا تو خاص سورۃ فاتحہ کی قرات ہے۔ امام ابو داؤد اور امام بیہقی کی ان ہر دو آیات پر نظر رکھتے ہوئے جو حضرت ابو ہریرہ اور حضرت رفاعہ بن رافع سے مروی ہیں اور یا سورۃ فاتحہ کے بعد کی قرات مراد ہے۔ سیاق کلام اور حضرت ابن عباس کی تفسیر پر نظر رکھتے ہوئے یا برعایت حال معذورین یعنی بیماروں، مسافروں اور مجاہدوں کے جو اسی آیت میں مذکور ہیں اور بوجہ نیند سے جاگنے کی ساعات کے اختیار انسانی میں نہ ہونے کے جیسا کہ قول الہی ”يقدر الليل والنهار علم ان لن تحصوه فتاب عليكم فاقراء واما تيسر من القرآن“

اس کی طرف اشارہ کرتا ہے اور واسطے تطبیق دینے کے درمیان اس آیت اور ان صحیح و ثابت، احادیث متواترہ یا مستفیضہ کے جو نماز میں سورہ فاتحہ کی قرات کے واجب ہونے میں وارد ہوئی ہیں اور تمام دلائل کو جمع کرنے کے لیے اور اس امر کے اعتبار کے لیے کہ آنحضرت ﷺ نے تمام عمر اس کی قرات پر بیٹھنے کی ہے اور اسے کبھی بھی (عذرًا) ترک نہیں کیا۔“

حضرات حنفیہ کی دوسری دلیل

قرات فاتحہ کے رکن نماز نہ ہونے پر حنفیہ کی دوسری دلیل یہ ہے کہ مسیٰ الصلوٰۃ کو آنحضور ﷺ نے فرمایا تھا۔ ثم اقرء ما تيسر معك من القرآن (بخاری وغیرہ) اور ابو داؤد کی ایک روایت میں ویقرء بما شاء من القرآن بھی آیا ہے۔ یعنی قرآن میں سے جہاں سے چاہے پڑھے۔

اب ظاہر ہے کہ ان احادیث میں عام اختیار دیا گیا ہے اور کوئی خاص مقام فاتحہ وغیرہ مقرر نہیں کیا گیا۔

اس کا جواب

یہ ہے کہ مسیٰ الصلوٰۃ کا قصہ دو صحابہ کرامؓ سے مروی ہے۔ ابو ہریرہؓ اور رفاعہ بن رافعؓ سے۔ ان ہر دو کے جمیع طرق کو جمع کیا جائے تو قرات کے متعلق حضور ﷺ کا فرمان ان الفاظ میں ملتا ہے:-

- ۱- اقرء ما تيسر معك من القرآن (خ، م، د، ت من حدیث ابی ہریرہؓ)
- ۲- یقرء بما شاء من القرآن (د، من حدیث رفاعہ)
- ۳- ثم اقرء (بیہقی عن رفاعہ فی کتاب القراءۃ)
- ۴- ثم اقرء بام القرآن و بما شاء الله ان تقرأ (الشافعی فی الام و ابو داؤد)

۱۶۶ امام ترمذیؒ نے فی الباب میں عمار بن یاسرؓ کا بھی نام لیا ہے لیکن ہم کو ان کی روایت کے الفاظ نہیں ملے۔

(عن رفاعۃ)

۵۔ قرأت بام القرآن ثم قرأت بما معک من القرآن (یہتی من حدیث ابی ہریرۃ)

۶۔ فان کان معک قرآن فاقراء به والا فاحمد اللہ عزوجل وکبره وهللہ (ش' ت' د' عن رفاعۃ)

۷۔ یحمد اللہ ویمجده ویکبره ویقرء ما تیسر من القرآن مما علمہ اللہ واخذ له فیہ (نسائی وابوداؤد، معناه عن رفاعۃ)

ان سب روایتوں کو جمع کرنے سے واضح ہو گیا کہ قرأت کے متعلق نبی پاک ﷺ نے تین حکم فرمائے ہیں:-

اول سورۃ فاتحہ، دوم زائد از فاتحہ، سوم جسے فاتحہ یاد نہ ہو وہ کسی اور مقام سے پڑھ لے اور اگر دیگر مقام سے بھی یاد نہیں تو تحمید (الحمد للہ) اور تکبیر (اللہ اکبر) اور تحلیل (لا اللہ الا اللہ) پڑھے۔ ۱۶۷

ان سب روایات اور دیگر احادیث متعلقہ کو ملحوظ رکھ کر امام نوویؒ نے نہایت جچی تلی بات لکھی ہے:-

۱۶۷۔ آنحضور ﷺ کی تعلیم قولی یا فعلی حسب موقع بقدر حاجت ہوتی تھی اس لیے کسی مسئلہ کے اثبات کے لیے سب احادیث قولیہ و فعلیہ کو جو اس کے متعلق ہوں، دیکھ کر حکم لگانا پڑتا ہے۔ نماز کے متعلق سب سے جامع حدیث یہی سیئ السلوۃ ہے، باوجود اس کے کئی ضروری امور اس میں بھی مذکور نہیں ہیں اس لیے اس جامع حدیث کے لیے بھی دیگر احادیث متعلقہ پر نظر رکھنی پڑتی ہے۔ اسی وجہ سے ہم نے اول فاتحہ، فاتحہ یاد نہ ہو تو قرآن کا کوئی دیگر مقام، وہ بھی یاد نہ ہو تو تحمید وغیرہ کلمات طیبہ کی ترتیب اس حدیث کو زیر نظر رکھ کر لکھی ہے جو امام دارقطنیؒ نے حضرت عبادہؓ سے روایت کی کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا ام القرآن عوض من غیرھا ولیس غیرھا منها بعوض (ج اول، ص ۱۲۲) یعنی سورۃ فاتحہ اپنے غیر کا عوض ہو سکتی ہے لیکن اس کا غیر اس کا عوض نہیں ہو سکتا۔ یعنی فاتحہ یاد ہو تو یہی مقرر ہے۔ اس کے عوض کوئی دوسرا مقام نہ پڑھے۔ ہاں اس کے ساتھ پڑھ لے۔ البتہ فاتحہ یاد نہ ہو تو کوئی دوسرا مقام پڑھ لے، اگر وہ بھی یاد نہ ہو تو تحمید وغیرہ پڑھے۔

و اما حدیث اقرء ما تیسر فمحمول علی الفاتحة فانها میسرۃ او علی ما زاد علی الفاتحة بعدها او علی من عجز عن الفاتحة (نووی علی صحیح مسلم، جلد ۱، ص ۱۷۰)

”لیکن حدیث اقرء ما تیسر کی سو وہ محمول ہے فاتحہ پر کیوں کہ وہ آسان ہے یا فاتحہ کے بعد کی قرات پر یا اس شخص کے لیے جو فاتحہ کے پڑھنے سے عاجز ہو۔“

اسی طرح حافظ ابن حجرؒ نے کہا کہ امام بخاریؒ نے حضرت عبادہؓ کی حدیث مذکورہ یعنی لا صلوة لمن لم یقرء بفاتحة الكتاب کے بعد یہ حدیث مسینی الصلوۃ جو بیان کی تو اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ امام بخاریؒ نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ سورۃ فاتحہ اس شخص پر لازم ہے جو اسے بخوبی پڑھ سکے۔ لیکن جو بخوبی نہ پڑھ سکتا ہو۔ وہ جہاں سے چاہے قرات کر لے اور حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث میں مطلق قرات کا جو ذکر ہے سو مقید بالفاتحہ ہے۔ جیسا کہ حدیث عبادہؓ میں وارد ہے۔ پھر حافظ صاحبؒ نے اسی قول کے قریب امام خطابیؒ سے بھی نقل کیا ہے۔ ۱۷۸ھ

حضرات حنفیہ کا ایک الزامی جواب

حضرات حنفیہ الہمدیث کو الزاماً کہتے ہیں کہ اگر تم قرات فاتحہ کو فرض جانتے ہو تو بعض احادیث میں فاتحہ سے زائد کا پڑھنا جو آیا ہے۔ اسے فرض کیوں نہیں جانتے۔ مثلاً ”صحیح مسلم و سنن ابی داؤد وغیرہما کتب حدیث میں الفاظ فصاعداً“ اور مازاد وغیرہ

۱۷۸ھ امام شافعیؒ نے کتاب الام میں باب من لا یحسن القراءة و اقل فرض الصلوۃ (ج ۱، ص ۸۸) کے ذیل میں حدیث رافعہ ذکر کر کے اس کی تشریح میں متعدد بار ذکر کیا ہے کہ یہ حکم اس شخص کے لیے ہے جو سورۃ فاتحہ یا مطلقاً ”قرآن شریف میں سے بخوبی پڑھ سکتا ہے اور جو ایسا نہ کر سکے اس کے لیے تمہید وغیرہ اذکار کافی ہیں۔ اسی طرح آپ باب القراءة بعد التعوذ میں فرماتے ہیں و دل علی انها فرض علی المصلی اذا کان یحسن یقرؤها (ج ۱، ص ۹۳) اور اس بات کی دلیل ہے کہ سورۃ فاتحہ نمازی پر فرض ہے جب کہ وہ اسے بخوبی پڑھ سکتا ہو۔ اس کے بعد فرضیت فاتحہ میں حضرت عبادہؓ والی حدیث ذکر کی ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ وغیرہ اصحاب سے مروی ہیں اور حدیث مسیٰ جس کا بیان اوپر ہو چکا ہے۔ اس میں بھی رسول پاک ﷺ نے یہی فرمایا ہے۔ ثم اقرء بام القرآن وبما شاء اللہ ان تقرء

اس کا جواب

کئی طرق پر ہے۔ اول یہ کہ جب حضرت امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک مطلق قرات بلا تعیین کسی خاص مقام کے فرض ہے اور اس کی مقدار کم از کم ایک آیت ہے۔ جس پر قرآن کا اطلاق ہو سکتا ہے تو چونکہ فاتحہ جزو قرآن ہے اور اس کی سات آیات ہیں۔ تو اگر صرف سورۃ فاتحہ ہی پڑھی جائے تو عمدہ فرضیت تو بخوبی پورا ہو جاتا ہے۔ پھر فصاعداً اور مازاد کی زیادت کے کیا معنی ہوئے؟۔ اگر آپ (حضرات حنفیہ) یہ کہیں کہ زیادت واجب ہے نہ کہ فرض تو اس صورت میں بھی حکم فاتحہ اور فصاعداً میں درجات کا تفاوت لازم آیا اور یہ آپ کے نزدیک درست نہیں، کیوں کہ آپ الہدیث کو یہ الزام دیتے ہیں کہ تم فاتحہ کو فرض جانتے ہو تو مازاد کو جو اس کے ساتھ ہی ہے، فرض کیوں نہیں جانتے؟۔ پس جو الزام الہدیث پر ہے، وہ آپ پر بھی ہے۔ (فافہم)

نیز ہر چند کہ مطلق قرات حضرات حنفیہ کے نزدیک فرض ہے اور تعیین فاتحہ کے مقابلہ میں اسی بات کا جھگڑا ہے۔ لیکن آج ہم ایک عجیب بات ذکر کرتے ہیں کہ ظہر عصر اور عشاء (چار رکعات والی) نمازوں کی پچھلی دونوں رکعتوں میں اور مغرب کی تیسری رکعت میں حضرات حنفیہ کے نزدیک اس مطلق قرات میں بھی رخصت ہے۔ یعنی پہلی دو رکعتوں میں تو قرات فرض جان کر پڑھتے ہیں، لیکن پچھلی رکعتوں میں اختیار دیتے ہیں۔ چاہے کوئی فاتحہ پڑھے، چاہے تسبیح پڑھے اور چاہے بغیر ذکر خدا کے چپ چاپ کھڑا رہے اور رکوع میں چلا جائے۔ چنانچہ وقایہ اور اس کی شرح میں ہے۔ ویقرء فیما بعد الا ولیس الفاتحة فقط وہی افضل وان سبح او سکت جاز (وقایہ لکھنؤی، جلد ۱، ص ۱۷۰) یعنی پہلی دو رکعات کے بعد صرف سورۃ فاتحہ پڑھے اور یہ افضل ہے اور اگر تسبیح ہی پڑھے یا چپ رہے تو بھی جائز ہے۔ پس جس صورت میں حضرات حنفیہ مطلق قرات جو فرض ہے عمداً چھوڑ سکتے ہیں تو الہدیث پر مازاد کے متعلق کیا اعتراض کر سکتے

ہیں اور اب لیجئے۔

تحقیقی جواب

یہ ہے کہ اہلحدیث اللہ تعالیٰ کے فضل سے حدیث رسول ﷺ کی اتباع میں سب سے آگے ہیں۔ یہی بات تو ان کا طرہ امتیاز ہے۔ حدیث کی اتباع یہ نہ کریں گے تو اور کون کرے گا؟۔ سو معلوم ہو کہ اہلحدیث جو کچھ کرتے اور جو کچھ کہتے ہیں۔ سب حدیث رسول اللہ ﷺ کی بناء پر کرتے اور کہتے ہیں۔ اپنی رائے محض سے نہ کچھ کہتے ہیں نہ اس پر عمل کرتے ہیں۔ چونکہ رسول اللہ ﷺ نے بعض رکعات میں سورہ فاتحہ کے بعد ضم سورت کیا ہے اور بعض میں نہیں کیا لیکن فاتحہ کبھی ترک نہیں کی اس لیے محدثین فاتحہ کے سوا دوسری قرات کی فرضیت کے قائل نہیں ہیں اور یہی بات مابعد فاتحہ کے فرض یا واجب نہ ہونے کی دلیل ہے۔ کیوں کہ آنحضور ﷺ فرائض و واجبات کو چھوڑ نہیں سکتے اور یہی ہر دو میں فرق کرنے والی ہے۔ چنانچہ صحیح مسلم میں حضرت ابو قتادہؓ سے روایت ہے کہ جناب رسالت مآب ﷺ ظہر اور عصر کی پہلی دو رکعتوں میں سورہ فاتحہ اور کوئی سورت پڑھتے تھے اور کبھی کبھی ہم کو کوئی آیت سناتے بھی تھے اور پچھلی دو رکعتوں میں (صرف) سورہ فاتحہ پڑھتے تھے۔ (المحدث) ۱۷۲

۱۷۹۔ اس حدیث کو امام مسلم کے علاوہ امام بخاریؒ، امام ابوداؤدؒ، امام نسائیؒ اور امام ابن ماجہؒ نے بھی روایت کیا۔

۱۸۰۔ یعنی بعض اوقات کوئی آیت ہم کو سنائی دیتی تھی، ذوق و شوق کی حالت میں آہستہ قرات میں بھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے کہ کوئی آیت یا اس کا کوئی حصہ بلا عمد ایسی آواز سے منہ سے نکل جاتا ہے کہ دوسرا آدمی اسے سن لیتا ہے۔ اسے جزء القراءۃ میں امام بخاریؒ نے بھی روایت کیا۔

۱۸۱۔ اس حدیث کو امام بخاریؒ نے بھی جزء القراءۃ میں حضرت جابر بن عبد اللہؓ سے بھی روایت کیا۔ (ص ۶۱) نیز امام بیہقیؒ نے کتاب القراءۃ (ص ۱۱۲) میں جابر بن عبد اللہؓ سے روایت کیا ہے۔

۱۸۲۔ ہدایہ متن ہدایہ میں ہے و یقرء فی الركعتین الاخرین بفاتحة الكتاب وحدها۔

دیگر یہ کہ زیادت فصحاء وغیرہ کی تحقیق میں دو امر ہیں۔ اول اس کی صحت کے متعلق، دوم اس کے معنی اور حکم کے متعلق سو امر اول کے متعلق عرض ہے کہ اجلہ محدثین و حفاظ حدیث نے اس زیادت کو تسلیم نہیں کیا۔ چنانچہ حافظ ابن حجرؒ ”تلخیص“ میں فرماتے ہیں:-

یعنی پچھلی دو رکعتوں میں صرف سورۃ فاتحہ ہی پڑھے۔ ہدایہ میں اس کی دلیل میں یہی حضرت عبادۃؒ والی روایت ہی لکھی ہے، لیکن اس کے بعد رعایت مذہب سے کہہ دیا ہے ہذا بیان الفضل یعنی صاحب ہدایہ کا یہ قول کہ اخیر کی دونوں رکعتوں میں صرف سورۃ فاتحہ پڑھے۔ اس بات کے اظہار کے لیے ہے کہ اس کی قرات افضل ہے، کوئی فرض واجب نہیں ہے، حیرانی ہے کہ صاحب ہدایہ کو حدیث بھی مل گئی۔ وہ صحیح بھی ہے اس کے خلاف آنحضرت ﷺ سے کچھ بھی ثابت نہیں، پھر بھی اس میں افضل کا ضمیر لگا کر اس کے ترک کر دینے کو سہل جانا اس عہد تقلید کو پورا کرنا ہے۔ جو از خود اپنے اوپر لازم کر لیا ہے۔ صاحب ہدایہ نے اپنے امامؒ کے قول کو دیکھا کہ وہ اس میں اختیار دیتے ہیں لیکن آنحضور ﷺ کے حکم کے لاصلوٰۃ اور دائمی عمل کو نہ دیکھا کہ آپ نے فاتحہ کسی رکعت میں بھی کبھی بھی ترک نہیں کی اور کم از کم اس امر کو بھی نہ دیکھا کہ مطلق قرات تو حضرت امامؒ کے نزدیک بھی فرض ہے۔ پچھلی دو رکعتوں میں اس کی تخفیف کس طرح ہو سکتی ہے؟۔ اور نہ اس کا خیال کیا کہ حدیث لا صلوٰۃ لمن لم یقرء بفاتحة الكتاب میں مقتدی کو مستثنیٰ کرتے ہوئے ہم تسلیم کر چکے ہیں کہ یہ حکم امام اور منفر سے مخصوص ہے۔ تو اس کے خلاف اب امام اور منفر یا صرف منفر کو بھی چپ چاپ کھڑا رہ سکتے کی اجازت دنا حدیث لا صلوٰۃ کو بالکل بے وزن کر دینے کے برابر ہو جائے گا اور اس بارے میں جو بھی آثار موقوفہ ان کے سد راہ ہوئے ہیں۔ اول تو وہ مرفوع کا مقابلہ نہیں کر سکتے نیز وہ ضعیف و منقطع الاسناد ہیں اور نہ اس کو زیر نظر رکھا کہ تصحیح تلیل وغیرہ سورۃ فاتحہ کے عوض تو اس صورت میں پڑھ سکتے ہیں۔ جب فاتحہ یاد نہ ہو لیکن جب دو پہلی رکعات میں فاتحہ پڑھ لی ہے تو اب یاد نہ ہونے کا عذر جاتا رہا۔ لہذا اب تصحیح وغیرہ فاتحہ کا عوض نہ ہو سکے گی۔ جیسا کہ سابقہ حدیث دار قطنی سے گزر چکا ہے اور نہ اس بات کا لحاظ کیا کہ دو رکعتوں کے قیام میں بغیر قرات کے چپ چاپ کھڑا رہنے سے کیا عبادت ہوگی اور دربار خداوندی میں ایسی خلگ حاضری سے کیا حاصل

حدیث عبادۃ بن الصامتؓ لا صلوة لمن لم یقرء فیہا فاتحة الكتاب متفق علیہ وفی روایۃ مسلم و ابی داؤد و ابن حبان بزیدۃ فصاعدا قال ابن حبان تفرد بہا معمرؑ عن الزہری و اعلاہا البخاری فی جزء القراءة (تلخیص، جلد ۱، ص ۸۷)

ہوگا؟۔ حالانکہ حنفیہ کے نزدیک محض سکوت یعنی چپ کوئی مسنون طریق عبادت نہیں ہے۔
(فصل الخطاب مصنف مولانا انور شاہ صاحب مرحوم دیوبندی، ص ۹۸)

دیگر یہ کہ حنفیہ کے نزدیک اوائے جمعہ کی شرائط میں سے خطبہ بھی ہے چنانچہ اسی ہدایہ متن ہدایہ میں ہے ومنہا الخطبة یعنی شرائط اوائے جمعہ میں سے ایک شرط خطبہ بھی ہے۔ اس کے بعد ہدایہ میں اس کی دلیل میں کہا ہے لان النبی صلی اللہ علیہ وسلم ما صلاہا بلون الخطبة فی عمرہ کیوں کہ نبی ﷺ نے ساری عمر کبھی بھی بغیر خطبہ کے جمعہ نہیں پڑھا۔ کفایہ شرح ہدایہ میں اس کے ذیل میں لکھا ہے ولو جاز ذالک لترك مرة تعلیما للجواز یعنی اگر ترک خطبہ جائز ہوتا تو آپ (کم از کم) ایک دفعہ تو تعلیم جواز کے لیے اسے ترک کر دیتے۔ اسی طرح مولانا عبدالحی صاحب مرحوم حاشیہ ہدایہ بین السطور میں عنایہ شرح ہدایہ سے نقل کر کے لکھتے ہیں فلو لم یکن واجبا لتركه مرة تعلیما للجواز یعنی اگر خطبہ واجب نہ ہوتا تو آپ (کم از کم) ایک دفعہ تو تعلیم جواز کے لیے اسے ترک کر دیتے۔ اسی طرح مولانا صاحب مرحوم نے عمدة الرایہ حاشیہ شرح وقایہ میں بھی لکھا ہے۔ ان حوالہ جات سے معلوم ہو گیا کہ کسی عمل پر آنحضور ﷺ کا دوام کرنا حنفیہ کے نزدیک اس عمل کے شرط اور فرض واجب ہونے کی دلیل ہے۔ بس اسی بناء پر ہم بھی کہتے ہیں کہ آنحضور ﷺ نے ساری عمر کوئی بھی رکعت بغیر فاتحہ کے نہیں پڑھی۔ پس یہ بھی فرائض و ارکان نماز میں سے ہے۔ لطف یہ ہے کہ مولانا عبدالحی صاحب مرحوم لکھنؤی نے ہدایہ کے حاشیہ بین السطور میں لکھا ہے کہ اس (عدم ترک خطبہ) کو امام بیہقیؒ نے ذکر کیا ہے۔ یہ عاجز کہتا ہے کہ امام بیہقیؒ نے کتاب القراءة میں اس امر کو بھی ذکر کیا ہے کہ حضور پاک ﷺ نے سورۃ فاتحہ ساری عمر کبھی بھی نہیں چھوڑی۔ پس اسے بھی فرض و رکن نماز تسلیم کیا جانا چاہئے۔ خذ ہذا فانہ لطیف جدا

حضرت عبادہؓ کی حدیث لا صلوة متفق علیہ ہے اور مسلم، ابو داؤد اور ابن حبان کی ایک روایت میں فصاعداً زائد ہے کہا ابن حبان نے مفرد ہوا ہے معمر ساتھ زیادت کے زہری سے روایت کرنے میں اور امام بخاریؒ نے بھی اس زیادت کو جز القراۃ میں معلول کہا ہے۔

وعامة الثقات لم يتابع معمر افي قوله فصاعداً مع انه قد اثبت فاتحة الكتاب (جزء القراۃ، ص ۴)

”عام ثقہ راویوں نے معمر کی اس کے قول فصاعداً میں متابعت نہیں کی۔ باوجود اس کے اس نے بھی فاتحہ کو ثابت ہی کیا ہے۔“

اسی طرح امام بیہقیؒ نے ”کتاب القراۃ“ میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت کے مختلف الفاظ فما زاد اور ولو بفاتحة الكتاب اور محض الابفاتحة کو باسناد ذکر کرنے کے بعد فرمایا:۔

اجمع سفیان بن سعید الثوری و یحییٰ بن سعید القطان و هما امامان حافظان علی روایۃ باللفظ الذی ہو مذکور فی خبرهما فالحکم لروایتہما (ص ۱۵)

”امام سفیان ثوریؒ اور یحییٰ بن سعید قطانؒ نے اس روایت کے الفاظ پر اجماع کیا ہے۔ جو ان کی روایت میں مذکور ہیں یعنی بغیر زیادت فصاعداً کے اور یہ دونوں (حدیث) کے امام اور حافظ ہیں۔ پس فیصلہ انہی دونوں کی روایت پر ہے۔“

امردوم یعنی زیادت فصاعداً کے معنی اور حکم کے متعلق یہ عرض ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ سے جو کہ خود بھی سورہ فاتحہ کی فرضیت اور قرات خلف الامام کے قائل ہیں۔ صحیح مسلم میں منقول ہے کہ کسی شخص نے حضرت ابو ہریرہؓ سے کہا کہ ان لم ازد علی ام القرآن؟ یعنی اگر میں سورہ فاتحہ سے اور کچھ زیادہ قرات نہ کروں تو؟ اس پر آپؓ نے فرمایا ان زدت علیہا فهو خیر وان انتهیت الیہا اجزت عنک یعنی اگر تو اس پر کچھ زیادہ کرے تو اچھا ہے لیکن اگر اس پر قرات کو ختم کر دے تو تجھے کافی ہے۔^{۱۴۳}

حضرت ابو ہریرہؓ کی یہ روایت صحیح بخاری میں بھی ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں۔ ان لم

نزد علی ام القرآن اجزات وان ددت فهو خیر

حافظ ابن حجرؒ نے ”فتح الباری“ میں زیر بحث زیادت فصحاء حضرت ابو ہریرہؓ کے اس قول کی تائید میں ایک مرفوع روایت ابن خزیمہؒ سے نقل کی ہے کہ:-
 ولا بن خزیمہ من حدیث ابن عباسؓ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قام
 فصلی رکعتین لم یقرء فیہما الا بفاتحة الكتاب (فتح الباری، مطبوعہ دہلی،
 ج ۳، ص ۲۱۵)

”حضرت ابن عباسؓ نے کہا کہ نبی کریم ﷺ کھڑے ہوئے، پس پڑھیں آپ نے دور کھین، نہ قرأت کی ان میں سوائے سورۃ فاتحہ کے۔“
 ان روایات سے معلوم ہو گیا کہ بقدر فرض تو صرف سورۃ فاتحہ ہی ہے اور اس سے زائد جتنا ہو سکے بہتر ہے اور یہی فصحاء کے معنی درست ہیں۔ زائد از فاتحہ درجہ وجوب میں نہیں ہے ورنہ رسول اکرم ﷺ محض فاتحہ پر اکتفا نہ کرتے۔ چنانچہ حضرت ابو ہریرہؓ کے قول من قرء بام الكتاب فقد اجزأت عنه ومن زاد فهو افضل کے ذیل میں امام نووی فرماتے ہیں:-

فیہ دلیل لوجوب الفاتحة وانہ لا یجزی غیرہا وفیہ استحباب السورة
 بعدہا و ہذا مجمع علیہ فی الصبح والجمعة والاولیین من کل الصلوات
 وهو سنة عند جمیع العلماء (شرح مسلم، جلد ۱، ص ۱۷۱)
 ”اس میں فاتحہ کے واجب ہونے کی دلیل ہے نیز اس کی کہ اس کے سوا دیگر کافی نہیں اور اس میں اس کے بعد کسی دیگر سورت کے مستحب ہونے کی دلیل ہے اور اس بات پر صبح، جمعہ اور ہر نماز کی پہلی دو رکعتوں میں پڑھنے پر اجماع ہے اور وہ تمام علمائے (سنت) کے نزدیک سنت ہے۔“

اسی طرح حافظ ابن حجرؒ شرح بخاری میں حضرت ابو ہریرہؓ کے مذکورہ صدر قول کے ذیل میں فرماتے ہیں۔ وفی ہذا الحدیث ان من لم یقرء الفاتحة لم تصح صلاتہ وهو شاهد لحدیث عبادة المتقدم وفیہ استحباب سورة او الايات مع الفاتحة وهو قول الجمهور فی الصبح والجمعة والاولیین من غیرہما

۱۷۷ اس حدیث کو امام بیہقیؒ نے بھی کتاب القراءة، ص ۸ پر ہاشاد خود روایت کیا ہے۔

(فتح، ج ۳، ص ۲۲۰)

”اور اس حدیث میں اس امر کی دلیل ہے کہ جس نے سورۃ فاتحہ نہ پڑھی تو اس کی نماز صحیح نہ ہوئی۔ اور یہ حدیث حضرت عبادہؓ کی گذشتہ حدیث کی شاہد ہے اور اس میں اس کی بھی دلیل ہے کہ فاتحہ کے ساتھ چند آیات یا کوئی ساری سورت پڑھنی مستحب ہے اور یہ قول ہے جمہور کا صبح، جمعہ اور دیگر نمازوں کی پہلی دو رکعتوں میں۔“

انہی آثار مرفوعہ و موقوفہ کی رو سے اور وجوب فاتحہ کے سب دلائل کو مد نظر رکھ کر امام بخاریؒ نے فرمایا۔ وقولہ فصاعداً غیر معروف ما اردتہ حرفاً و اکثر من ذالک الا ان یکون کقولہ (صلی اللہ علیہ وسلم) لا یقطع الید الا فی ربع دینار فصاعداً فقد یقطع الید فی دینار وفی اکثر من دینار (ج ۲، القراءة، ص ۴)

”اور معمر کا قول فصاعداً غیر معروف ہے۔ اس کے صرف یہی معنی صحیح ہو سکتے ہیں کہ یہ مثل اس قول رسول ﷺ کے ہیں کہ ہاتھ نہ کاٹا جائے مگر (کم از کم) چوتھائی دینار میں پس اس سے زیادہ۔ کیوں کہ ہاتھ پورے دینار اور اس سے زیادہ پر بھی کاٹا جاتا ہے۔“

حضرات حنفیہ کی تیسری دلیل

حضرات حنفیہ کی طرف سے مقتدی کو امام کے پیچھے بالخصوص جہری نماز میں قرات اور فاتحہ سے منع کرنے کی دلیل اکثر و اذاقری القرآن فاستمعوا لہ وانصتوا (اعراف، پ ۹) پیش ہوتی رہتی ہے۔ اگرچہ اس کا الزامی جواب سابقاً گزر چکا ہے کہ حنفی علمائے اصول اس آیت کو آیت ما تیسر من القرآن کے معارض ٹھہرا کر اسے ساقط اور مدعا سے ساکت قرار دے چکے ہیں۔ اس لیے ان کے پیرو اس آیت سے منع فاتحہ کی دلیل نہیں پڑھ سکتے۔ لیکن چونکہ باوجود اس کے بھی حنفی علماء اور عوام اکثر اسے

۵۷ مولانا انور شاہ صاحب مرحوم دیوبندی نے فصل الخطاب میں امام بخاریؒ کے ان معانی کا جو جواب دیا ہے، وہ پراز کلمات ہے۔ اس میں مولانا مرحوم نے حضور پاک ﷺ کے دستور العمل اور تصریحات علمائے محدثین کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔

پیش کرتے رہتے ہیں۔ اس لیے ہم نے مناسب جانا کہ مستقل عنوان سے بھی ظاہر کر دیا جائے کہ اس آیت کو منع قرات مقتدی سے کوئی بھی تعلق نہیں ہے۔ (وللہ الموفق)
مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی اپنے رسالہ ”ہدایۃ المعتدی“ میں فرماتے ہیں:-

”بعد اس کے جب نماز پنج گانہ فرض ہوئی تو اس وقت بھی قرات امام و مقتدی سب پر فرض رہی پھر ایک مدت بعد آیت اذا قرى القرآن فاستمعوا له وانصتوا سے قرات مقتدی منسوخ ہوئی۔ چنانچہ بیہقی وغیرہ نے لکھا ہے کہ عن محمد بن کعب القرظی قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا قرء فی الصلوۃ اجابہ من وراءہ اذا قال بسم اللہ الرحمن الرحیم قالوا مثل ذالک حتی تنقضى الفاتحة والسورة فلبث ماشاء اللہ ان یلبث ثم نزلت و اذا قرى القرآن فاستمعوا له و انصتوا (ص ۵)

جواب

اس کا جواب کئی وجوہ سے ہے۔

اول: یہ کہ محمد بن کعبؒ تاجی ہیں اور بغیر واسطہ کسی صحابی کے روایت کرتے ہیں۔ اس لیے یہ روایت متصل الاسناد نہ ہونے کی وجہ سے قابل احتجاج نہیں ہے۔

دوم: یہ کہ اس روایت سے بسم اللہ کا جزو سورۃ فاتحہ ہونا ثابت ہے اور حنفیہ کے نزدیک بسم اللہ جزو سورۃ فاتحہ نہیں ہے۔ اسی لیے وہ چھٹی آیت انعمت علیہم پر ختم کر کے سات آیتیں پوری کرتے ہیں۔ نیز اس روایت بسم اللہ کا جبر پڑھنا ثابت ہوتا ہے اور یہ بھی حنفیہ کا عقار مذہب نہیں ہے۔ چنانچہ دونوں مسئلوں کے متعلق علامہ نسفیؒ ”کنز الدقائق“ میں فرماتے ہیں:-

و سمي سرا“ فی کل رکعة وهی اية من القرآن انزلت للفصل بین السورتین لیست من الفاتحة ولا من کل سورة (کنز بجائی، ص ۲۳)

”اور ہر رکعت میں بسم اللہ آہستہ پڑھے اور وہ آیت تو قرآن شریف کی ہے دو سورتوں میں فاصلہ کے لیے اتری (لیکن) فاتحہ کی جزو نہیں ہے اور نہ دیگر ہر سورت کی (جزو ہے)“

پس اگر یہ روایت حضرات حنفیہ کے نزدیک قابل استناد ہے تو ہر دو صورتوں میں بسم اللہ کے متعلق حنفیوں کا مذہب اس کے خلاف کیوں ہے؟

سوم: یہ کہ نسخ کے لیے ہر دو کی تاریخ معلوم ہونی ضروری ہے کہ منسوخ پہلے اتری ہو اور نسخ پیچھے اور یہ بات ہرگز ثابت نہیں کہ آیت اذاقری القرآن آیت فاقراءوا ماتیسر کے بعد نازل ہوئی۔ بلکہ برخلاف اس کے یہ بات ثابت شدہ ہے کہ احادیث مثبتہ قرات فاتحہ خلف الامام آیت واذاقری القرآن کے بعد فرمائی گئی تھیں۔ کیوں کہ سورہ اعراف جس میں آیت واذاقری القرآن وارد ہے، مکی ہے اور احادیث فاتحہ مدنی ہیں۔ کیوں کہ حضرت عبادہ بن ثابت جو راوی حدیث ہیں، وہ مدنی ہیں۔ نیز حضرت ابو ہریرہؓ جو وہ بھی قرات خلف الامام کی حدیث کے راوی ہیں۔ سال خیر میں ۷ ہجری میں مشرف باسلام ہوئے۔

چہارم یہ کہ اس آیت کی شان نزول کے متعلق مختلف اقوال ہیں۔ کوئی خطبہ کے متعلق بتاتا ہے۔ کوئی نماز میں رسول اللہ ﷺ کے پیچھے کلام کرنے کی بابت، کوئی رسول پاک ﷺ کے ساتھ ساتھ پڑھتے جانے کی بابت اور یہ سب اقوال روایت ”و درایتہ“ مخدوش ہیں۔ لطف یہ کہ حضرت ابو ہریرہؓ جن سے اس کی شان نزول نماز میں کلام کرنے کی ممانعت کی روایت منقول ہے اور امام زہریؒ اور مجاہد جن سے آنحضرت ﷺ کے ساتھ ساتھ قرات کرنے کی ممانعت کی روایت منقول ہے۔ یہ ہر سہ بزرگ فاتحہ خلف الامام کے قائل اور اس کے عامل تھے۔ (کتاب القراءۃ، بیہقی) پھر کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ یہ آیت قرات خلف الامام کی ممانعت میں نازل ہوئی۔

پنجم یہ کہ حنفیہ کا مذہب ہے کہ خطبہ جمعہ میں سب سامعین خاموشی سے خطبہ سنیں اور کتب فقہ میں دلیل میں یہی آیت پیش کی گئی ہے لیکن اس کے ساتھ ان علماء نے (اللہ تعالیٰ ان پر رحمت نازل کرے) یہ بھی لکھ دیا ہے کہ اگر خطیب درود شریف کی آیت یعنی یا ایہا الذین امنوا صلوا علیہ وسلموا تسلیما پڑھے تو سامعین اس

وقت آہستہ طور پر اپنی زبان سے درود شریف پڑھ لیں۔ چنانچہ ”شرح وقایہ“ میں ہے۔
 الا اذا قرء قوله تعالى صلوا عليه فيصلی سر^۱ (فصل فی القراءۃ) مگر جب خطیب
 قول خداوندی صلوا علیہ پڑھے تو (سامع) آہستہ سے درود شریف پڑھ لے۔ اسی
 طرح کفایہ شرح ہدایہ میں ہے۔ فیصلی السامع فی نفسہ ای یصلی بلسانہ
 خفییہ (کفایہ، جلد اول، ص ۶۳) یعنی صاحب ہدایہ کی عبارت فیصلی السامع فی
 نفسہ کے معنی یہ ہیں کہ سامع اپنی زبان سے آہستہ آواز سے درود شریف پڑھ لے۔
 ان حوالہ جات سے دو امر معلوم ہو گئے۔ اول یہ کہ حکم شرع کی تعمیل میں آہستہ آہستہ
 پڑھ لینا خفیہ کے نزدیک مغل استماع و انصات نہیں ہے۔ دوم یہ کہ اس عام حکم استماع و
 انصات کے وقت اگر کوئی خاص حکم قرات یا وظیفہ کا ہو تو اس خاص حکم پر عمل کر لینا جائز
 ہے اور وہ اس عام حکم استماع و انصات کے خلاف نہیں ہوگا۔

اس بناء پر ہم بھی کہتے ہیں کہ اگر تسلیم بھی کر لیا جائے کہ اس آیت کے عموم
 میں نماز میں قرات کے وقت استماع و انصات کا حکم بھی شامل ہے تو قرات فاتحہ خلف الام
 کا خاص حکم جو صحیح احادیث سے ثابت ہے۔ (جیسا کہ سابقہ ”گزر چکا“) اس کا امام کے
 سکات کے وقت پڑھ لینا مغل استماع و انصات نہیں ہو سکتا۔ بلکہ جیسا کہ بقول صاحب فتح
 القدیر خطبہ کی حالت میں آیت درود شریف کی تعمیل میں درود شریف پڑھ لینے سے
 دونوں فضیلتیں (استماع خطبہ اور آیت درود شریف کی تعمیل) کا حصول ہو جاتا ہے۔

اسی طرح امام کے پیچھے اس کے سکات یا اوقاف آیات کے وقت قرات فاتحہ
 کے خاص حکم اور استماع قرات امام کے حکم کی تعمیل سے ہر دو کی فضیلت حاصل ہو جاتی
 ہے۔ چنانچہ مولانا عبدالحی صاحب مرحوم نے شرح وقایہ کے حاشیہ عمدۃ الرعایہ میں اسی
 عبارت مذکورہ بالا کے حاشیہ نمبر ۲ میں لکھتے لکھتے یہاں تک لکھ دیا ہے:-
 والحق انه لا مانع من جواز کل ما منعوہ حالۃ سکات الامام اذالم یخل بالا

۱۔ مولانا صاحب نے جو فرمایا کل ما منعوہ سو متن کتاب میں ان تین اموں سے منع کیا

ہے۔ مقتدی کا قرات کرنا، امام آیت ترغیب و ترہیب پڑھے تو مقتدی کا دعا کرنا، خطیب جب

خطبہ دے یا درود شریف پڑھے تو سامع کا درود شریف پڑھنا۔ ان سب کے مطلق مولانا

ممنوع فرماتے ہیں کہ سکات امام کے وقت سورۃ فاتحہ اور آیت ترغیب و ترہیب کے وقت

ستماع من دون التقیید بوقت دون وقت کما اوضحناه فی السعایة (جلد اول، ص ۱۷۵)

”اور حق یہ ہے کہ جن امروں سے فقہاء نے منع کیا ہے۔ امام کے سلکات کے وقت ان کے جواز سے کوئی مانع نہیں ہے جب کہ استماع میں خلل نہ ڈالے بغیر کسی خاص وقت کی قید کے۔ جیسا کہ ہم نے سعایہ میں بالوضاحت بیان کر دیا ہے۔“

تحقیقی جواب اور آیت کی صحیح تفسیر

اس آیت کے جواب میں جو کچھ اوپر گزر چکا۔ وہ سب حضرات علمائے حنفیہ کی تصریحات سے الزامی جواب میں کہا گیا ہے۔ اب اس آیت کا تحقیقی جواب اور اس کی صحیح تفسیر معلوم کیجئے کہ اس آیت کو سورۃ فاتحہ کی قرات سے نفیاً یا اثباتاً کچھ بھی تعلق نہیں ہے اور نہ اس کا خطاب مومنوں سے ہے۔ جس نے اس کا خطاب مومنوں سے سمجھا اس نے سلسلہ عبارت اور سیاق مضمون پر نظر نہیں کی۔ کیوں کہ یہ آیت ان منکروں کے جواب میں اتری جو محبوب خدا ﷺ سے صداقت نبوت کے لیے کوئی خاص معجزہ طلب کرتے تھے۔ چنانچہ سلسلہ کلام یوں ہے:-

وَاذٰلَمْ تَاْتَهُمْ بَايَةٌ قَالُوْا لَوْلَا جِئْتِنَاهُمْۙ قُلْ اِنَّمَا اتَّبَعْتُ مَا يُوْحٰى اِلٰى مِنْ رَبِّىْ هٰذَا بَصَائِرُ مِنْ رَبِّكُمْ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُوْنَ ۝ وَاِذَا قُرِىَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَانصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝ (اعراف، پ ۹)

”(اے پیغمبر!) جب تم ان کے پاس کوئی (سفارشی) معجزہ نہیں لاتے تو کہتے ہیں

دعا کرنا اور آنحضور ﷺ کے نام پاک کے ذکر پر درود شریف کا پڑھ لیتا منع نہیں ہے بشرطیکہ استماع میں غل نہ پڑے۔ پس مولانا مرحوم کے قول کے مطابق ہم بھی کہتے ہیں کہ کم از کم یہ تسلیم کر لیا گیا ہے اور اس سے چارہ بھی نہیں ہے کہ جب امام اونچی قرات کرتا ہو تو اس کے سلکات کے وقت یا اوقاف آیات کے وقت مقتدی کا سورۃ فاتحہ پڑھ لیتا منع نہیں ہے۔ کیوں کہ اس کی نسبت صحیح احادیث میں خاص حکم آچکا ہے اور خاص حکم عام حکم پر مقدم ہوتا ہے۔ یہ امر بسبیل تنزل لکھا گیا ہے۔ (نافم) مولانا مرحوم کی دیگر تصریحات متعلق قرات خلف الامام ان شاء اللہ تعالیٰ الگ عنوان کے ماتحت لکھی جائیں گی۔

تو از خود کیوں نہیں لاتا۔ (اے پیغمبر!) تم (ان سے) کہو کہ میں تو صرف اسی کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف میرے رب کی طرف سے وحی کیا جاتا ہے۔ یہ (قرآن) تمہارے رب کی طرف سے (خزانہ) بصیرت ہے اور مومنوں کے لیے سراسر ہدایت و رحمت ہے اور جب قرآن پڑھا جایا کرے تو اسے غور سے سنا کر اور چپ رہا کرو تاکہ (مومنوں کی طرح) تم پر (بھی) رحمت ہو جائے یعنی تم بھی ایمان لے آؤ۔“

دیکھئے! اس میں سورۃ فاتحہ وغیرہا کی قرات کا نہ صراحتہ ”ذکر ہے نہ کنایہ“ اور نہ یہ اس کا کوئی موقع ہے بلکہ بات صرف اتنی ہے کہ کفار نے محمد رسول اللہ ﷺ سے خاص اقتراحی معجزات طلب کیے۔ یعنی خاص خاص امراز خود اصرار کر کے مقرر کیے اور ان کی نسبت کہا کہ آپ اگر رسول برحق ہیں تو یہ امور اللہ تعالیٰ سے پورے کرا دیجئے۔ اس پر اللہ رب العزت نے جواب دیا کہ اے پیغمبر! ان سے کہو کہ میں اللہ تعالیٰ پر اصرار نہیں کر سکتا۔ میں تو اس کی وحی کا پیرو ہوں۔ اور اگر تم میری صداقت نبوت کا نشان طلب کرتے ہو تو یہ قرآن مجید اس مقصد کے لیے کافی ہے۔ کیونکہ یہ اہل بصیرت (اہل کشف و شہود) کو تو عین الیقین کے رتبے پر پہنچاتا ہے کیوں کہ یہ بصائر ہے اور اہل استدلال کو علم الیقین کا کمال حاصل کرتا ہے۔ کیوں کہ یہ واضح ہدایت ہے اور اہل سعادت کو حق الیقین کا مرتبہ دلاتا ہے کیوں کہ یہ رحمت ہے لیکن ان مراتب کے لیے ایمان شرط ہے۔ اس لیے یہ صرف ایمان داروں کو حاصل ہوتے ہیں۔ سو تم بھی ایمان لے آؤ۔ جس کی صورت یہ ہے کہ جب قرآن پڑھا جائے تو تم ضد و تعصب چھوڑ کر اسے غور سے سنو اور شور غوغا جس کے تم نے منصوبے گانٹھ رکھے ہیں، ترک کر کے خاموشی اختیار کرو تاکہ (تم کو بھی ایمان نصیب ہو اور) تم پر (اللہ کی) رحمت ہو جائے۔

دیکھئے! کیسی صاف اور سیدھی بات ہے۔ جسے نظر انداز کر کے کچھ اور مطلب بنالیا گیا ہے اور قرات فاتحہ کو اس میں خواہ مخواہ داخل کر لیا گیا ہے۔

تنبیہ :- اگرچہ مضمون بہت طویل ہو جائے گا اور تفسیر کا حجم آگے ہی اندازہ مجوزہ سے اوپر جا رہا ہے لیکن اگر میں عاجز اس وقت اپنی طبع کی روانی کو روکوں۔ اور اس آیت کے متعلق جو لطائف و معارف خدائے قدوس نے اس عاجز پر کھولے ہیں اور وہ میرے سینے میں اپنے ظہور کے لیے موجیں مار رہے ہیں۔ ان کو بند رکھوں تو علاوہ اپنی طبیعت کو بے

قرار کرنے کے لیے قارئین کو علمی فوائد سے محروم رکھوں گا۔ اس لیے میں عاجز غلبہ حال سے مجبور ہو کر اللہ کی توفیق سے ان معارف کو بیان کرتا ہوں۔ کیوں کہ یہ تفسیر ”واضح البیان“ قرآن حکیم کے اعجازی کمالات کے اظہار کے لیے لکھی جا رہی ہے۔ نہ کہ تجارتی کاروبار کے لیے۔ (واللہ الموفق)

فائدہ نمبر ۱:- قرآن حکیم کے متعدد مقامات میں مذکور ہے کہ کفار رسول پاک ﷺ سے سفارشی معجزے طلب کرتے تھے اور یہ بھی بیشتر مقامات پر مصرح ہے کہ قرآن کریم کلام الہی ہے جس کا معارضہ جن و انس وغیرہ مخلوقات سے ناممکن ہے اور یہی معجزہ کی حقیقت ہے کہ مخلوق اس کے معارضے سے عاجز آ جائے۔ پس اگر کفار کے سفارشی معجزے کی طلب پر اللہ تعالیٰ نے نبی پاک ﷺ کی تصدیق نبوت کے لیے قرآن مجید کو پیش کیا ہے۔ تو بالکل با اصول اور حقیقت واقعی کے لحاظ سے کیا ہے۔ اس کی ایک مثال تو یہی سورہ اعراف کی آیت ہے۔ دوسری آگے فائدہ نمبر ۲ میں پڑھے۔

فائدہ نمبر ۲:- اللہ رب العزت نے سورہ عنکبوت میں فرمایا:-

و قالوا لو لا انزل علیہ آیات من ربہ قل انما الایات عند اللہ و انما انا نذیر مبین ○ اولم یکفہم انا انزلنا علیک الکتاب یتلى علیہم ان فی ذالک لرحمة و ذکر لقوم یؤمنون ○ (عنکبوت، پ ۲۱)

”منکر کہتے ہیں کہ اس (رسولؐ) پر اس کے رب کی طرف سے (ہمارے مطلوبہ) معجزات کیوں نہیں اتارے جاتے۔ (اے پیغمبرؐ!) تم کو معجزات تو صرف اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہیں۔ (اس پر میرا زور نہیں) اور میں تو ایک نذیر مبین ہوں کیا (یہ کوئی دیگر معجزہ مانگتے ہیں) اور یہ ان کو کافی نہیں کہ ہم نے تم پر کتاب (قرآن پاک) اتاری جو ان کو پڑھ پڑھ کر سنائی جاتی ہے۔ بے شک اس میں مومنوں کے لیے رحمت اور نصیحت ہے۔“

اس مقام کو سورہ اعراف کی آیت سے ملا کر دیکھئے کہ دونوں جگہ ایک ہی سوال ہے اور ایک ہی جواب ہے۔ (فنعم الوفاق وحبذا الانطباق)

فائدہ نمبر ۳:- سورہ عنکبوت کی آیت میں ایک مزید علمی نکتہ ہے جو اس جواب کا اصولی مدار ہے کہ یہاں پر فرمایا۔ اولم یکفہم جس کا ماحصل یہ ہے کہ اگر یہ لوگ پیغمبر

خدا ﷻ کی تصدیق نبوت کے لیے معجزہ طلب کرتے ہیں تو قرآن مجید اس امر کے لیے کافی ہے اور دلیل کافی کے ہوتے ہوئے فریق مقابل کسی دوسری دلیل کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔ اس کی توضیح یوں ہے کہ دعویٰ پر دلیل قائم کرنا اور اس کا ثبوت پیش کرنا مدعی کا کام ہے۔ پس جس دلیل کو وہ پیش کرتا ہے۔ اس پر نظر کرنی چاہیے کہ وہ اس کے دعویٰ کو ثابت کرتی ہے یا نہیں۔ اگر کرتی ہے تو اسے قبول کر لیتا چاہیے۔ ورنہ اس پر نقض یا منع یا معارضہ پیش کیا جائے اور فن مناظرہ کی رو سے سائل یعنی فریق ثانی کے یہی تین حق ہیں ^۱ اس کا کوئی حق نہیں کہ مدعی کی پیش کردہ دلیل پر باقاعدہ بحث کئے بغیر خود مقرر کردہ دوسری دلیل کا مطالبہ کرے۔ اسے تخت کستے ہیں جو جائز نہیں۔ چنانچہ امام المتکلمین، فخر المناظرین امام فخر الدین رازی آیت سورۃ اعراف کی تفسیر کے ذیل میں فرماتے ہیں:-

ثم بين ان عدم الاتيان بتلك المعجزات التي اقترحوها لا يقدح في الغرض لان ظهور القرآن على وفق دعواه معجزة بالغة باهرة فاذا ظهرت هذه المعجزة الواحدة كانت كافية في تصحيح النبوة فكان طلب الزيادة من باب التعنت ^۲ (جلد ۳، ص ۳۵۰)

”پھر یہ بیان کیا کہ سفارشی معجزات کا نہ لانا اصل غرض میں خلل نہیں ڈالتا۔ کیوں کہ نبی مکرم ﷺ کے دعویٰ کے موافق قرآن کا ظہور کامل اور ظاہر و باہر معجزہ ہے۔ پس جب یہ ایک ہی معجزہ ظاہر ہو گیا تو وہ تصحیح نبوت محمدیہؐ میں کافی ہے۔ پس اس پر کسی زائد معجزہ کا طلب کرنا از قسم تخت ہے۔“

اگر ایسا کرنا یعنی دلیل کافی کو بغیر بحث کے تسلیم نہ کرتے ہوئے کوئی دلیل طلب کرنا جائز ہو تو سائل ہر دلیل پر یہی کہتا جائے گا کہ اور دلیل لاؤ یا جو میں کہتا ہوں، وہ پورا کر دو۔ اس سے تو کوئی بھی مقصد ثابت نہیں ہو سکے گا۔ اس لیے اللہ رب العزت نے

^۱ دیکھئے رشیدیہ مطبوعہ لکھنؤ از ص ۲۷ تا ص ۲۹۔

^۲ امام رازیؒ کی یہ عبارت امام خطیب شربنیؒ نے بھی اپنی تفسیر الرراج المنیر میں نقل کی ہے۔

بالکل با اصول جواب دیا کہ قرآن حکیم اثبات دعا کے لیے کافی ہے اور اس پر زیادہ کا مطالبہ کرنا ہٹ دھرمی اور تسلیم حق سے سرکھٹانا ہے۔ جس سے اعراض مناسب ہے۔

فائدہ نمبر ۴:- آیت سورہ اعراف میں قرآن مجید کو بصرًا کہا گیا ہے۔ اب ہم بتاتے ہیں کہ بصرًا کا لفظ قرآن شریف میں حسی اور فعلی معجزات پر بھی بولا گیا ہے۔ چنانچہ موسیٰؑ اپنے معجزات کی نسبت فرعون کو خطاب کر کے فرماتے ہیں:-

قال لقد علمت ما انزل هؤلاء الا رب السموات والارض بصائر (بنی اسرائیل، پ ۱۵)

”(حضرت موسیٰؑ نے) کہا (اے فرعون!) بے شک تو جان چکا ہے کہ ان معجزات کو صرف زمین و آسمان کے پروردگار نے بصرًا کر کے نازل کیا ہے۔“

پس جس طرح حضرت موسیٰؑ کے معجزات ید بیضاء اور عصا وغیرہ کو بصرًا کہا گیا ہے کہ ان سے حضرت موسیٰؑ کی صداقت نبوت بطور مشاہدہ نظر آ جاتی ہے۔ اسی طرح قرآن پاک کو بھی بصرًا کہا گیا ہے کہ یہ بھی صداقت نبوت محمدیہؐ کے دیکھنے کے لیے بصیرت و نور پیدا کرتا ہے کہ اہل بصیرت انسان رتبہ عین الیقین پر ہو کر صداقت محمدیہؐ کو عیاں دیکھ لیتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ موسیٰؑ کے معجزات حسی اور فعلی ہیں کہ ان سے مادی چیزوں میں انقلاب ہو گیا۔ جو وہیں ختم ہو گیا اور قرآن حکیم علمی معجزہ ہے۔ جو ہمیشہ قائم رہے گا اور ظاہر ہے کہ دائمی اور علمی کا رتبہ حسی اور وقتی سے بہت بلند ہے۔

فائدہ نمبر ۵:- آیت سورہ اعراف میں جو زیر بحث ہے۔ قرآن حکیم کا مومنوں کے لیے ہدایت و رحمت ہونا جملہ اسمیہ سے ذکر کیا۔ جو تحقق و ثبوت کے لیے ہوتا ہے یعنی یہ

ثابت شدہ حقیقت ہے کہ قرآن شریف مومنوں کے لیے ہدایت و رحمت ہے لیکن اس سے آگے کفار کو لعلکم ترحمون سے رحمت کی صرف امید دلائی ہے۔ یعنی اگر تم قرآن مجید کو توجہ سے سنو اور اس کی قرات کے وقت شور و غوغا نہ کرو۔ جس کا منصوبہ تم نے گانٹھ رکھا ہے تو تم سے امید رکھی جاسکتی ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی رحمت یعنی ایمان میں داخل ہو جاؤ گے۔ اس سے صاف معلوم ہو سکتا ہے کہ فاستمعوا اور انصتوا کا خطاب کفار سے ہے نہ کہ مومنوں سے۔

فائدہ نمبر ۶ :- زیر بحث آیت سورہ اعراف میں فاستمعوا اور انصتوا دو حکم فرمائے۔ اس کی یہ وجہ ہے کہ نبی پاک ﷺ جب تبلیغ کے لیے مجمع عام میں قرآن حکیم پڑھتے تو خود قرآن مجید کی زبان کی پاکیزگی اور اس کے اسلوب بیان کی لطافت اور صادق الحال نبی اللہ کے پاک دل کے پاک جذبات میں ڈوبا ہوا انداز قرات اور خود نبی اکرم ﷺ کی حسن صوت یعنی خوش آوازی کہ قدرت نے آپ کو یہ نعمت بھی بدرجہ اتم عطا کی تھی اور سب کے بعد یہ کہ آپ کی بے لوث و بے طمع دعوت الی الحق یہ سب مؤثرات جمع ہو کر کفار کے دل میں ایک کشش پیدا کرتے لیکن جن کے سر پر شقاوت ازلی سوار تھی اور خباثت باطنی کی وجہ سے جن کے دلوں پر مہر لگ چکی تھی۔ انہوں نے آپس میں منصوبہ گانٹھا کہ جب نبی مکرم ﷺ قرآن پڑھیں تو تم اسے ہرگز نہ سنو۔ بلکہ اس اثناء میں شور و غوغا مچاؤ۔ تالیاں اور سیٹھیاں بجانے لگ جاؤ اور بے ہودہ باتیں اور آوازیں شروع کر دو تاکہ تم اپنے مقصد میں کہ آپ کی قرات کے اثر رہے۔ غالب و کامیاب ہو جاؤ۔ چنانچہ اللہ رب العزت نے سورہ حم فصلت میں ان کے اس مشورے کا ذکر کیا ہے :-

وقال الذين كفروا لا تسمعوا لهذا القرآن والغوا فيه لعلكم تغلبون ○ (م
سجدہ ۲۳)

”اور کہا کفار نے کہ نہ سنا اس قرآن پاک کو اور اس میں بے ہودہ باتیں اور حرکتیں کرو تاکہ تم غالب آ جاؤ۔“
اس آیت میں کفار کی تین باتیں ذکر کی ہیں :-

اول : لا تسمعوا لهذا القرآن یعنی اس قرآن کو (جو تمہارے دین بت پرستی کے خلاف ہے) نہ سنا۔

دوم : والغوا فيه یعنی اس کی قرات کے وقت لغو باتیں اور بے ہودہ حرکتیں کرو۔
سوم : لعلکم تغلبون یعنی تاکہ تم (اس تدبیر سے) غالب آ جاؤ۔ کیوں کہ نبی اکرم ﷺ

۷۹؎ والغوا فيه کے مفہوم میں وہ سب باتیں داخل ہیں جو ہم نے اوپر کی تقریر میں بیان کی ہیں اور مفسرین نے ان سب کو اس آیت کے ذیل میں لکھا ہے۔

شور و غوغا اور بے ہودہ کلام اور حرکات سے تنگ آکر قرأت قرآن چھوڑ دیں گے اور تمہارا مقصود پورا ہو جائے گا کہ آپ کی قرأت بے اثر ہو گئی۔

اللہ رب العزت نے زیر بحث آیت سورہ اعراف میں ان کی ایک ایک بات کا جواب دیا ہے۔ ہم ان سب کو آپ کے سامنے رکھ دیتے ہیں۔ آپ خود انصاف فرمائیں کہ آیت و اذا قرى القرآن سے قرآن کو نازل کرنے والے اللہ تعالیٰ کا کیا مقصود ہے:-

مقولہ کفار در سورت حم سجدہ

(۱) لا تسمعوا لهذا القرآن

(ترجمہ) نہ سنو تم اس قرآن کو

(۲) والغوا فيه

(ترجمہ) اور شور کرو بیچ اس کے

(۳) لعلکم تغلبون

(ترجمہ) تاکہ تم غالب آ جاؤ

جواب از جانب خدائے جبار در سورہ اعراف

(۱) و اذا قرى القرآن فاستمعوا له

(ترجمہ) اور جب قرآن پاک پڑھا جائے تو غور سے سنو اس کو

(۲) وانصتوا

(ترجمہ) اور خاموش رہو

(۳) لعلکم ترحمون

(ترجمہ) تاکہ تم رحمت میں آ جاؤ

اس تقابل سے بغیر کسی قسم کے تکلف اور کھینچ تان کے صاف صاف واضح ہو جاتا ہے کہ کفار مکہ نے آنحضور ﷺ کی تبلیغ کو بے اثر کرنے کے لیے جو بھی تجویزیں پاس کی تھیں۔ اللہ رب العزت نے سورہ اعراف کی آیت میں ایک ایک کر کے علی الترتیب

ان سب کا جواب دیا ہے۔ پس آیت سورہ اعراف یعنی واذقاری القرآن میں سورہ فاتحہ وغیرہ کا مطلقاً ذکر نہیں اور نہ اس کا خطاب مسلمانوں سے ہے۔ اور نہ اس میں خطبہ جمعہ یا عیدین کے متعلق کوئی حکم ہے۔ کیوں کہ جمعہ اور عیدین مدینہ طیبہ میں بعد ہجرت کے قائم ہوئیں اور سورہ اعراف ہجرت سے پیشتر مکہ شریف میں اتر چکی تھیں اور خطبہ جمعہ اور عیدین کے استماع اور خاموشی کا حکم احادیث میں وارد ہے نہ کہ قرآن شریف میں اور وہ بھی اس وقت جب وہ مدینہ شریف میں بعد ہجرت کے قائم کی گئیں۔ (واللہ الہادی)

تنبیہ:- مولانا انور شاہ مرحوم دیوبندی نے فصل الخطاب ص ۴۲-۲۳ میں واذقاری القرآن فاستمعوا له وانصتوا میں صیغہ امر کے متعلق علم نحو اور علم اصول کی لمبی بحث لکھی ہے اور خوب لکھی ہے۔ لیکن ایک آنچ کی کسر رہ جانے کی وجہ سے مقصود پورا نہیں ہو سکا، کیوں کہ سب سے پہلے یہ دیکھنا ضروری تھا کہ اس امر (فاستمعوا له وانصتوا) میں مخاطب کون ہے؟ پس نظم قرآنی سے یعنی سیاق عبادت سے جو بھی اس کا مخاطب قرار پاتا۔ اس پر قواعد نحویہ و اصولیہ کا لشکر چڑھاتے تو زور بر محل لگتا اور کوشش ٹھکانے لگتی۔ لیکن یہ تو حسب تحریر گذشتہ مبرہن ہو چکا ہے کہ فاستمعوا کے مخاطب کفار مکہ ہیں تو سب سعی لاحاصل گئی۔ والعصمة للہ پھر اگر آپ کلمہ اذا کے عموم اور قری فعل مجہول کی بناء پر مقتدی کو بھی شامل کریں گے۔ تو زیادہ سے زیادہ اسے دلالت النص کے درجے پر لاسکیں گے لیکن اس کے مقابلے میں حضرت عبادۃ والی حدیث خلف الامام مقتدی پر بھی فاتحہ کو بعبارة النص ثابت کر رہی ہے کیوں کہ عبارة النص سب پر مقدم ہوتی ہے۔ کما تقرر فی الاصول پس واذقاری القرآن کا عموم مخصوص ابعض ہوگا اور قرات فاتحہ بوجہ خاص دلیل سے ثابت ہونے کے اس کے حکم سے مستثنی رہے گی اور اس کا حکم ماعد فاتحہ تک رہے گا۔ جس سے ہمیں انکار نہیں درنہ

۱۸۰ حضرات حنفیہ نے جن مسائل میں اس حکم فاستمعوا کو نظر انداز کر دیا ہے، ان میں سے بعض کا بیان تو سابقاً ہو چکا ہے اور بعض دیگر عنوان ”امام بخاری“ اور آیت فاستمعوا کے ضمن میں ملاحظہ فرمائیے۔

آنحضرت ﷺ کی تصریحات (معاذ اللہ) بالکل بے وزن ہو جائیں گی اور عمومی استنباط کی کھینچ تان کے مقابلے میں کوئی بھی نص محفوظ نہ رہے گی۔ نیز قرآن و حدیث میں تطابق مشکل ہو جائے گا اور آپ کے علمائے اصول کی تقسیمات لصوص اور ان کے مراتب سب بے کار پڑے رہیں گے۔ (واللہ المہادی)

نیز یہ کہ مولانا ممدوح نے حدیث عبادۃ کی تشریح میں تسلیم کیا ہے کہ امام کے پیچھے الحمد کا پڑھ لینا مباح ہے تو حسب آپ کی تصریحات کے جب صیغہ امر وجوب کے لیے ہوا اور کلمہ اذا عام غیر مخصوص البعض ہوا تو یہ عام مفید قطعیت ہوا۔ پس جس حکم کا وجوب دلیل قطعی سے ثابت ہو۔ اس کی خلاف ورزی مباح کیسے ہوگی؟۔ (قائم ولا تعجل)

امام بخاریؒ اور آیت فاستمعوا

امام بخاریؒ قرأت فاتحہ خلف الامام کے سخت حامی ہیں۔ آپ نے ایک خاص رسالہ جزء القرة خاص اسی باب میں لکھا ہے۔ جس میں احادیث مرفوعہ و موقوفہ سے اس مسئلے کو پورے طور پر ثابت کر دیا ہے اور جن دلائل سے حضرات خفیہ منع قرأت خلف الامام کی دلیل پکڑتے ہیں۔ ان سب کو ذکر کر کے ان کے جوابات بھی دیئے ہیں۔ چنانچہ اس میں آیت واذا قرى القرآن کے جواب میں الزاماؒ فرماتے ہیں:-

واحتج بعض هؤلاء فقال لا يقرء خلف الامام لقول الله تعالى فاستمعوا له وانصتوا فقليل له فيثني على الله والامام يقرء قال نعم قيل له لم جعلت عليه الشاء والثناء عندك تطوع يثم الصلوة بغيره والقرأة فى الاصل واجب اسقطت الواجب بحال الامام بقول الله تعالى فاستمعوا وامرته ان لا يسمع عند الشاء ولم تسقط عنه الشاء وجعلت الفريضة لهون حالا من التطوع وزعمت انه اذا جاء والامام فى الفجر فانه يصلى ركعتين لا يستمع ولا ينصت لقرأة الامام وهذا خلاف ما قاله النبى صلى الله عليه وسلم قال اذا اقيمت الصلوة فلا صلوة الا المكتوبة (ص ٤)

”ان (خفیہ) میں سے بعض نے یہ دلیل پکڑی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قول فاستمعوا

وانصتوا سے امام کے پیچھے قرات نہ کی جائے۔ پس اسے کہا گیا امام کی قرات کے وقت سبحانک اللہ بھی پڑھے (یا نہیں؟) تو اس نے کہا ہاں (پڑھے) اسے کہا گیا کہ ثناء تو نے اس (مقتدی) پر مقرر کیا اور تیرے نزدیک ثناء نفل ہے۔ جس کے بغیر نماز پوری ہو جاتی ہے اور قرات (بہر حال) اصل میں تو فرض ہے۔ تو تو نے امام کی موجودگی میں اللہ تعالیٰ کے قول فاستمعوا سے فرض کو تو ساقط کر دیا لیکن ثناء کو اس (مقتدی) سے ساقط نہ کیا، بلکہ اسے حکم کیا کہ ثناء کے وقت (قرآن) نہ سنے تو تو نے فرض کو نفل سے ہلکا کر دیا۔ نیز تیرا قول ہے کہ جب کوئی شخص آئے اور امام فجر (کی نماز) میں ہو تو وہ دو رکعت (سنت فجر) پڑھ لے اور امام کی قرات نہ سنے اور خاموش نہ رہے اور یہ اجازت خلاف ہے اس کے جو فرمایا نبی کریم ﷺ نے کہ جس وقت نماز قائم کر دی جائے تو سوائے فرض نماز کے کوئی نماز نہیں ہوتی۔

توضیح:- امام بخاریؒ کا بیان بالکل صاف ہے کہ آپ (حضرات خفیہ) آیت واذا قری القرآن کی تعمیل میں مقتدی کو مطلق قرات اور فاتحہ پڑھنے سے تو منع کرتے ہیں۔ حالانکہ مطلق قرات کی فرضیت آپ کے نزدیک بھی مسلم ہے اور قرات فاتحہ احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ حضور انور ﷺ نے مقتدیوں کو خطاب کر کے فرمایا۔ فلا تفعلوا الابام القرآن لیکن آپ صاحبان امام کی قرات کے وقت مقتدی کو سبحانک اللہ پڑھنے سے منع نہیں کرتے بلکہ اس کی ترغیب و اجازت دیتے ہیں۔ حالانکہ اس کی تاکید نہ قرآن میں، نہ حدیث میں، نہ عموماً اور نہ خصوصاً اور نہ آپ کے نزدیک اس کا پڑھنا فرض یا واجب، بلکہ مستحب و نفل ہے تو یہ تفاوت حکم کیوں ہے؟ اگر ازا کے عموم میں مقتدی شامل ہے اور فاستمعوا کے امر سے مقتدی کو فاتحہ جو قرآن کا جزو ہے، پڑھنا منع ہے۔ تو سبحانک اللہ جو غیر قرآن ہے، اس کی اجازت کیوں ہے^{۱۸۱} اور اگر غیر

^{۱۸۱} منیۃ المصلیٰ میں ہے اور جب پائے امام کو در آنحالیکہ وہ اوپنی قرات پڑھتا ہے تو (قرات) سنے اور چپ رہے اور کہا بعض نے کہ امام کے سکات کے وقت ایک ایک کلمہ کر کے سبحانک اللہ پڑھ لے اور فقیر ابو جعفرؒ سے روایت ہے کہ جس وقت امام کو فاتحہ میں پالے تو بالاتفاق ثناء (سبحانک اللہ) پڑھ لے۔ اسے ذخیرہ میں ذکر کیا ہے لیکن جمعہ اور

قرآن کی اجازت ہے تو خاص قرآن کے پڑھنے کی کیوں ممانعت ہے؟۔ اسی طرح ادراک فریضہ کے ضمن میں آپ (حضرات حنفیہ) کا قول ہے کہ اگر کوئی شخص ایسے حال میں آئے کہ امام نماز فجر پڑھ رہا ہے اور اس نے فجر کی سنتیں نہ پڑھی ہوں تو وہ سنتیں پڑھ کر جماعت میں شامل ہوئے اس میں بھی استماع قرآن کا حکم نظر انداز کر دیا گیا ہے اور آپ

عیدین میں جس وقت امام سے دور ہو تو اس میں متاخرین نے اختلاف کیا ہے اور اگر (امام کو) رکوع میں پائے تو غور کرے، اگر اس کا غلبہ ظن ہو کہ ثناء پڑھ کر امام کے ساتھ کسی قدر حصہ رکوع میں شامل ہو جائے گا تو ثناء پڑھ لے ورنہ رکوع میں چلا جائے اور امام کی متابعت کرے۔ (انہی مترجما)

تنبیہ ضروری! یہ مسئلہ حدیث کے خلاف ہے اور محض رائے سے جوڑا ہوا ہے۔ قبیح سنت اس پر عمل نہ کرے کیوں کہ حدیث کی رو سے امام کی جبری قرات کے وقت فاتحہ کے سوا اور کچھ پڑھنا منع ہے۔

۱۸۲۔ ہدایہ متن ہدایہ میں ہے ومن انہی الی الامام فی صلوة الفجر وهو لم یصل رکعتی الفجر ان خشی ان تفوته رکعة ویدرک الاخری یصلی رکعتی الفجر عند باب المسجد ثم یدخل۔ یعنی جو شخص فجر کی نماز میں امام تک پہنچے در آنحال کہ اس شخص نے فجر کی سنتیں ابھی نہیں پڑھیں تو اگر اسے ظن ہو کہ ایک رکعت فوت ہو جائے گی اور دوسری مل جائے تو مسجد کے دروازے کے پاس فجر کی دو سنتیں پڑھ لے، پھر داخل ہو۔ کفایہ شرح ہدایہ میں اس عبارت کی شرح میں لکھا ہے وحکی عن الفقیہ ابی جعفرانہ علی قول ابی یوسف وابی حنیفۃ یصلی رکعتی الفجران رجا وجلان القعدة ایضا لان ادراک التشهد عنہما کادراک کله یعنی فقہ ابو جعفر سے روایت ہے کہ امام ابو جعفرؒ اور امام ابو یوسفؒ کے اقوال کے مطابق اگر قعدہ اخیرہ کے مل جانے کی بھی امید ہو تو بھی (جماعت میں نہ شامل ہوتے ہوئے) فجر کی سنتیں پڑھ لے کیوں کہ قعدہ پالینا ان دونوں کے نزدیک ساری نماز پالینے کی طرح ہے۔

تنبیہ ضروری! ان دونوں حاشیوں میں فقہ حنفیہ کے دونوں مسئلے صحیح حدیث کے خلاف ہیں۔ قبیح سنت کو ان پر عمل نہیں کرنا چاہیے۔

الگ نماز پڑھنے کی اجازت دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ بھی نبی پاک ﷺ کے فرمان واجب الاذعان کے سخت خلاف ہے۔ کیوں کہ آپ نے فرمایا کہ جب جماعت قائم ہو جائے تو سوائے فرض نماز کے جس کی اقامت کسی گئی ہے اور جس کی جماعت کھڑی ہو چکی ہے، کوئی نماز نہیں ہوتی۔

جزء القراءۃ میں امام بخاریؒ نے یہ بھی سمجھایا ہے کہ امام سے اگر قرات میں کسی قسم کی غلطی ہو جائے تو بالاتفاق بموجب روایات مرفوعہ صحیحہ کے مقتدی کا امام کو لقمہ دینا درست ہے۔ پس اگر مطلقاً بلا تخصیص استماع قرات واجب ہے تو یہ لقمہ دینا کس طرح جائز ہوا؟۔ یعنی جس طرح امور مذکورہ بالا اس حکم استماع سے خاص دلیل کی وجہ سے مستثنیٰ سمجھے گئے ہیں۔ اسی طرح سورۃ فاتحہ کی قرات بھی بنا بر روایات صحیحہ اس حکم سے مستثنیٰ ہے۔ چنانچہ امام بخاریؒ کا ارشاد یہ ہے:-

قال البخاری واحتج سليمان بن حرب بحديث ابی فی القراءۃ ولم ير ابن عمر بالفتح علی الامام باسا" (جزء القراءۃ)

"سليمان بن حرب نے دلیل پکڑی ہے۔ ابی کی حدیث سے جو قرات کے متعلق ہے اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے امام کو بتلانے میں مضائقہ نہیں سمجھا۔"

اس کے بعد امام بخاریؒ نے قرات میں امام کو بتلانے کے متعلق کئی ایک مرفوع روایت ذکر کی ہیں اور ایک محدث کی شان میں ہے کہ ہر مسئلہ کو قرآن و حدیث سے ثابت کرے نہ کہ محض خیال اور رائے سے یا خود ساختہ قواعد و اصول سے بنائے۔ (واللہ العادی)

حضرات حنفیہؒ کی چوتھی دلیل

قرات خلف الامام کے انکار میں حضرات حنفیہؒ کی چوتھی دلیل جس پر ان کے اصحاب اصول و فروع سب متفق ہیں اور اسے پورے وثوق سے بیان کرتے ہیں۔ یہ حدیث ہے جو صاحب ہدایہ نے بیان کی ہے:- لنا قوله عليه السلام من كان له امام

فقراء الامام له قرأة^{۱۸۳} (ہدایہ کفنی، فصل القراءۃ، جلد ۱، ص ۱۰۸)
 ”ہماری دلیل حضور علیہ السلام کا یہ فرمان ہے کہ جس کسی کا امام ہے تو امام کی
 قرات اس کی قرات ہے۔“

امام زیلعی حنفیؒ نے اس کی تخریج میں کہا ہے۔ قلت روی من حدیث
 جابر بن عبد اللہ ومن حدیث ابن عمرؓ ومن حدیث الخدریؓ ومن حدیث
 ابی ہریرۃ ومن حدیث ابن عباسؓ (جلد ۱، ص ۲۳۰)
 اس کے بعد ہر ایک کی رفع اور وقف اور صحت و ضعف کے متعلق مفصل بحث
 کی ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس کے جتنے طرق مرفوع ہیں، وہ سب ضعیف ہیں اور جو
 سنداً صالح ہیں۔ وہ سب موقوف ہیں۔ حتیٰ کہ امام بیہقیؒ سے حافظ ابو موسیٰ رازی حنفیؒ کا
 قول ذیل نقل کیا ہے۔ (اور اس پر کچھ بھی کلام نہیں کیا۔) کہ امام بیہقیؒ نے کتاب
 المعرفة میں یہ بھی کہا ہے کہ:-

قال (البيهقي) اخبرنا ابو عبد الله الحافظ قال سمعت سلمة بن محمد
 الفقيه يقول سالت ابا موسى الرازي الحافظ عن حديث من كان له امام
 فقراء الامام قرأة فقال لم يصح عن النبي صلى الله عليه وسلم فيه شيء انما
 اعتمد مشائخنا فيه على الروايات عن علي و ابن مسعود وغيرهما من
 الصحابة قال ابو عبد الله الحافظ اعجبني هذا لما سمعته فان ابا موسى احفظ
 من راينا من اصحاب الراي على اديم الارض^{۱۸۴} (زیلعی، جلد ۱، ص ۲۳۰)

”ہمیں حافظ ابو عبد اللہ نے خبر دی کہ میں نے سلمہ بن محمد بن قتیہ کو یہ کہتے سنا
 کہ میں نے حافظ ابو موسیٰ رازی کو حدیث من کان له امام (الخ) کی بابت پوچھا تو
 انہوں نے کہا کہ اس مضمون کے متعلق نبی کریم ﷺ سے کچھ بھی صحیح ثابت نہیں ہوا۔“

^{۱۸۳} صاحب نور الانوار، صاحب گنج اور شارح اصول بزدودی نے آیت فاقروا ما نيسر
 من القرآن اور آیت واذقرونی القرآن فاستمعوا کو متعارض قرار دے کر ہر دو آیات کی
 قرات اور عدم قرات کی دلالت سے ساقط کر کے اسی حدیث من کان له امام کی طرف رجوع
 کیا ہے۔

^{۱۸۴} اس روایت کو امام بیہقیؒ نے کتاب القراءۃ، ص ۱۵۱ میں بھی ذکر کیا ہے۔

اس میں ہمارے مشائخ (حنفیہ) نے ان روایات پر اعتماد کیا ہے جو حضرت علیؓ اور ابن مسعودؓ وغیرہ صحابہ کرامؓ سے منقول ہیں۔ حافظ ابو عبد اللہ نے کہا کہ مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی۔ کیوں کہ اہل رائے (حنفیہ) میں سے ہم نے طبقہ زمین پر جس کو بھی دیکھا، حافظ ابو موسیٰ ان سب سے بڑا حافظ ہے۔“

”تنبیہ ضروری۔“ امام بیہقیؒ نے ”کتاب القراءة“ میں اس حدیث کے جمیع طرق اور اس کے ہر پہلو پر نہایت مفصل اور سیر کن بحث کی ہے اور بڑے بڑے ائمہ و حفاظ حدیث کے اتفاق سے فیصلہ یہی دیا ہے کہ اس حدیث کی رفع یعنی نبی مکرم ﷺ کی طرف نسبت صحیح نہیں ہے بلکہ یہ روایت موقوف ہے۔ تفصیلی نقل موجب طوالت ہے۔

حضرت امام ابو حنیفہؒ اور حدیث من کان لہ امام (الخ)

ہاں ایک امر کو ہم بلا نقل کئے نہیں رہ سکتے ورنہ ہماری ساری تحریر تشنہ تحقیق رہ جائے گی۔ وہ یہ کہ اس حدیث کی روایت رفع کے راویوں میں سے حضرت امام ابو حنیفہؒ بھی ہیں۔ امام دارقطنیؒ نے اپنی سنن میں جو اس کا جواب یا ہے۔ اس میں حضرت امام صاحبؒ کی ذات گرامیؒ زیر بحث آگئی ہے، جس سے بعض احتاف مثلاً ”علامہ عینیؒ، شیخ

۱۸۵۔ اس عاجز کے اکثر ہم عصر اہل حدیث اور حنفی علماء کو بخوبی معلوم ہے کہ اس عاجز کو سیدنا حضرت امام ابو حنیفہؒ سے کس قدر عقیدت ہے۔ تاریخ اہل حدیث (معنفہ عاجز) جو اخبار اہل حدیث امر تر میں عرصہ تک مسلسل چھتی رہی ہے۔ اس میں دشمن ذکر فرقہ مرجعہ حضرت امام صاحبؒ سے کس زور سے مدافعت کی ہے اور آپ کے مناقب کس شان سے بیان کئے ہیں۔ آپ کا ادب و وقار اس عاجز کو اشارہ غیبی سے بتایا گیا ہے۔ اسی ادب کو ملحوظ رکھتے ہوئے میں نے اس روایت زیر بحث کو دلخراش طریق پر ذکر کرنا ترک کر کے امام بیہقیؒ کے طریق پر بیان کرنا پسند کیا ہے اور اگر مجبوری مجھے وہ طریق بھی بیان کرنا پڑے، جس میں حضرت امام صاحبؒ کی شخصیت زیر بحث آجاتی ہے تو اللہ کے فضل سے اسے بھی ایسی طرز سے نبھاؤں کہ محدثین عظام کے اقوال کو عدل کے ترازو پر رکھتے ہوئے اور ان کے صحیح حامل بتاتے ہوئے دامن ادب ہاتھ سے نہ چھوٹے۔

ابن ہمامؒ اور مولانا عبدالحی لکھنوی مرحوم کو سنت طیش آگیا اور انہوں نے امام دار قطنیؒ کے حق میں بعض نالامہ الفاظ لکھ دیئے اور بعض ایسے اعتراضات بھی لکھ دیئے جو ان کی شان علمی سے بعید ہیں۔ (عفا اللہ عنا وعنہم) لیکن جو طریق امام بیہقیؒ نے (اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے۔) امام ابو حنیفہؒ والی روایات کی تحقیق میں اختیار کیا ہے۔ اس میں امام صاحب ممدوح کی شخصیت زیر بحث نہیں آتی اور بات صاف ہو جاتی ہے۔ امام بیہقیؒ ہر دور روایات کو مفصل ذکر کرنے کے بعد بطور فیصلہ فرماتے ہیں:-

هذا هو الصحيح عن الليث بن سعد عن يعقوب و كذا لك رواه خلف بن ايوب عن ابي يوسف عن ابي حنيفة و الحکم بن ايوب عن زفر عن ابي حنيفة عن موسى بن ابي عائشة عن عبد الله بن شداد عن ابي الوليد عن جابر عن النبي صلى الله عليه وسلم مختصرا في قراءة الامام له قراءة وفي رواية الليث بن سعد هو احد الائمة عن يعقوب ابي يوسف دليل على ان قصة سبوح اسم ربك الاعلى انما رواها ابو حنيفة عن موسى بن ابي عائشة

۱۸۶ مثلاً "مولانا عبدالحی حاشیہ موطا امام محمدؒ میں علامہ عینی کے حوالے سے لکھتے ہیں ومن این له تضعیف ابي حنيفة وهو مستحق التضعیف و قد روی فی مسنده اجابيث سقيمة و معلولة و منكرة و موضوعة (ص ۹۸، حاشیہ ۵) مولانا عبدالحی مرحوم، علامہ عینی کے ترجمہ میں اپنی کتاب الدرر البہیہ میں لکھتے ہیں ولو لم یکن فیہ رائحة التعصب المنهبي لكان اجدود واجود اگر کسی مصنف کے ضعیف ہونے کی یہ وجہ درست ہے کہ اس کی تصنیف میں ضعیف و معلول اور منکر و موضوع ہر قسم کی احادیث پائی جاتی ہیں تو پھر بہت کم محدثین ثقہ ثابت ہوں گے۔ یہ معیار علامہ عینیؒ اور مولانا عبدالحی صاحبؒ کی شان علمی کے خلاف ہے۔ سنن ابن ماجہ میں مذکورہ بالا اقسام کی احادیث پائی جاتی ہیں۔ باوجود اس کے وہ صحاح ستہ میں شمار ہوتی ہیں اور اس کے مصنف کو ثقہ کبیر، متفق علیہ، متجرب، نہ معرفت و حفظ (خلاصہ) اور تنقید حدیث میں امام دار قطنیؒ کا پایہ تو ابن ماجہؒ سے بہت بلند ہے۔ کیوں کہ امام دار قطنیؒ تو امام بخاریؒ، امام احمدؒ اور امام عبد الرحمن بن ممدیؒ کی طرح ائمہ عارفین علت حدیث میں سے ہیں۔ (شرح نخبہ، ص ۴۲)

عن عبد اللہ بن شداد عن جابرؓ و ليس فيها ان قرأه له قراءة و هي القصة التي رواها عمران بن حصينؓ و نحن نذكرها ان شاء الله و اما القصة التي فيها فان قراته له قراءة فان ابا حنيفة ائما رواها عن موسى بن ابي عائشة عن عبد الله بن شداد عن ابي الوليد عن جابر وهو رجل مجهول كما قال الدارقطني رحمه الله ولا تقوم به حجة ومن روى هذا الحديث عن ابي بكر الحارثي عن الدارقطني واسقط من اسناده ابا الوليدؒ لو رواه عن الحاكم ابي عبد الله عن ابي علي الحافظ واسقط من اسناده ابن شداد لو هم ان ابا الوليد كنية ابن شداد فانه لم يسلك سبيل الصدق في رواية الحديث (كتاب القراءة ص ۱۰۳)

”امام یث کی روایت جو امام ابو یوسفؒ سے ہے“ وہی صحیح ہے اور اسی طرح اسے خلف بن ایوب نے امام ابو یوسفؒ سے، انہوں نے امام ابو حنیفہؒ سے روایت کیا۔ نیز حکم بن ایوب نے امام زفرؒ سے، انہوں نے امام ابو حنیفہؒ سے، انہوں نے موسیٰ بن ابی عائشہؒ سے، انہوں نے عبد اللہ بن شدادؒ سے، انہوں نے ابو الولیدؒ سے، انہوں نے حضرت جابرؓ سے، انہوں نے نبی کریم ﷺ سے قرأه الامام له قرأه کے متعلق مختصراً روایت کیا اور امام یث جو وہ بھی اماموں میں سے ایک امام ہیں۔ ان کی جو روایت امام ابو یوسفؒ سے ہے۔ اس میں اس امر کی دلیل ہے کہ سورۃ سبح اسم ربک کا قصہ امام ابو حنیفہؒ نے موسیٰ ابن ابی عائشہؒ سے، انہوں نے عبد اللہ بن شدادؒ سے، انہوں نے حضرت جابرؓ

۱۸۷ کسی راوی نے اس روایت سے ابو الولید کو جو سابقہ کیا یا تو خطا سے کیا یا عمداً ایسا کیا گیا۔ عمداً کیا تو خیانت ہے اور اگر خطا سے کیا ہے تو اس کی یہ وجہ ہے کہ عبد اللہ بن شداد کی کثیت بھی ابو الولید ہے۔ جب عبد اللہ بن شداد کا ذکر آگیا تو اس نے سمجھا کہ جب یہی ابو الولید ہے تو دوسری دفعہ اس کے ذکر کی کیا ضرورت ہے؟۔ حالانکہ معاملہ یوں نہیں ہے بلکہ اسی طرح ہے جس طرح امام بیہقیؒ نے ذکر کیا۔ کیوں کہ عبد اللہ بن شداد کی بے واسطہ روایت حضرت جابرؓ سے پائی نہیں جاتی۔ اسماء الرجال کی کتب کے مطالعہ سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ان ہر دو کے تراجم میں ان کی استاد ی شاگرد ی کا تعلق کسی کتاب میں مذکور نہیں ہے۔ (دیکھئے تذکرۃ الحفاظ، خلاصہ تہذیب و تہذیب اور اصحاب)

سے روایت کیا تو اس میں ان قرآنہ لہ قرآۃ کے الفاظ نہیں ہیں اور وہ وہی قصہ ہے جسے عمران بن حصین صحابی نے روایت کیا اور ہم اسے ان شاء اللہ ذکر کریں گے۔ لیکن وہ قصہ جس میں الفاظ فان قرآنہ لہ قرآۃ وارد ہیں۔ اسے امام ابو حنیفہؒ نے موسیٰ بن ابی عائشہ سے، انہوں نے عبد اللہ بن شداد سے، انہوں نے ابو الولید سے، انہوں نے حضرت جابرؓ سے روایت کیا اور وہ (ابو الولید) مجہول شخص ہے۔ جیسا کہ امام دار قطنیؒ نے کہا اور اس کی روایت سے حجت قائم نہیں ہو سکتی اور جس شخص نے یہ حدیث ابو بکر حارثی سے بواسطہ امام دار قطنیؒ روایت کی اور اس کی اسناد سے ابو الولید (مذکور) کو گرا دیا۔ یا امام حاکم سے بواسطہ حافظ ابو علی روایت کیا اور اس کی اسناد سے ابن شداد کو ساقط کر دیا۔ اور یہ وہم ڈالنا چاہا کہ ابو الولید، ابن شداد کی کثیت ہے تو وہ روایت حدیث میں صدق و راستی کا رستہ نہیں چلا۔“

اسی طرح خاتمہ الحفاظ حافظ ابن حجرؒ نے تلخیص میں فرمایا:-

حدیث من کان له امام فقرة الامام له قرة مشهور من حدیث جابر وله طرق
عن جماعة من الصحابة وكلها معلولة (جلد ۱، ص ۸۷)

”حدیث من کان له امام حضرت جابرؓ کی روایت سے زیادہ مشہور ہے۔ اور صحابہ کرامؓ کی ایک جماعت سے اس کے کئی طریق ہیں اور وہ سب معلول ہیں۔“

اسی طرح امام بخاریؒ نے ”جز القراءۃ میں فرمایا:-

هنا خبر لم يثبت عند اهل العلم من اهل الحجاز و اهل العراق و غيرهم لا

۱۸۸ حافظ زبلی خفیؒ نے تخریج ہدایہ میں اور امام بیہقیؒ نے کتاب القرات میں ان سب کا ذکر کر کے ان کی متین بیان کر دی ہیں اور علامہ گنجیؒ نے شرح بخاری میں ان علتوں کی وجہ سے اس حدیث کو ضعیف تسلیم کر لیا ہے لیکن یہ عذر کیا ہے کہ اس کے اور طریق بھی ہیں جو صحیح ہیں۔ پھر موطا امام محمدؒ والی روایت ذکر کی ہے اور اس طرف نظر نہیں کی کہ عبد اللہ بن شداد جو حضرت جابرؓ سے روایت کرتا ہے۔ اس کی روایت حضرت جابر سے ثابت بھی ہے یا نہیں؟۔ اگر ثابت ہے تو شہادات سے ثابت کریں ورنہ اس کے مرسل ہونے میں کیا شک ہے؟۔ امام دار قطنیؒ، امام بیہقیؒ اور امام بخاریؒ وغیرہم، آئمہ حدیث کی بات سمجھاتے ہیں۔

رسالہ و انقطاعہ رواہ ابن شداد عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم (ص ۸)
 ”یہ ایک ایسی حدیث ہے جو حجاز (مکہ و مدینہ) اور عراق کے علماء (حدیث) وغیرہ کے نزدیک بوجہ اس کے مرسل ہونے اور منقطع ہونے کے ثابت نہیں ہوئی۔ کیوں کہ اسے ابن شداد نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے۔ (اور وہ صحابی نہیں ہے۔)“

الغرض یہ مفروع عنہ اور ثابت شدہ حقیقت ہے کہ ائمہ حدیث اس بات پر متفق ہیں کہ یہ روایت رفعاً و وصلاً ”آغضور ﷺ سے ثابت نہیں ہے۔ علامہ عینی، شیخ ابن ہمام اور مولانا عبدالحی صاحب نے اس کے متعلق جس قدر زور آزمائی کی ہے، وہ سب لا حاصل ہے۔ ان بزرگوں نے (اللہ تعالیٰ ان پر رحمت کرے) ایک بھی حافظ حدیث کی شہادت سے اس کا وصل و رفع ثابت نہیں کیا۔ حمایت مذہبی میں بات کی کھینچ تان اور بات ہے اور اثبات مسئلہ اور بات ہے۔ پس ان احادیث کے مقابلے میں جو بالخصوص اثبات فاتحہ خلف الامام کے بارے میں صحیح سندوں سے آنحضرت ﷺ سے ثابت شدہ ہیں اور بعد نبی کریم ﷺ کے بھی بڑے بڑے جلیل القدر اور مجتہد صحابہ کرام کا ان پر عمل رہا۔ اور وہ امام کے پیچھے الحمد شریف برابر پڑھتے رہے۔ یہ حدیث منع فاتحہ خلف الامام کے بارے میں ہرگز قائم نہیں ہو سکتی۔ اور اگر بالفرض اس کا کچھ اعتبار کیا بھی جائے تو احادیث مثبتہ قرأت فاتحہ خلف الامام کو مقدم کر کے اس کا حکم مابعد فاتحہ کی قرأت پر لگایا جائے گا اور قرأت فاتحہ اس سے مستثنیٰ رہے گی کیوں کہ احادیث مثبتہ قرأت فاتحہ جو بالکل صحیح اور مرفوع ہیں۔ ان کو ساقط الاعتبار نہیں کر سکتے۔ چنانچہ امام بخاری ”جز القراءۃ“ میں فرماتے ہیں۔

ولو ثبت الخبر ان كلاهما لكان هذا مستثنى من الاول لقوله لا يقران الا بام القرآن وقوله من كان له امام فقراءة الامام له قراءة جملة وقوله لا بام القرآن مستثنى من الجملة كقول النبی صلی اللہ علیہ وسلم جعلت لی الارض مسجد او طهور اثم قال فی احادیث اخر الا المقبرة والحمام وما استثناء من الارض خارج من الجملة وكذلك فاتحة الكتاب خارج من قوله من كان له امام فقراءة الامام قراءة مع انقطاعه (ص ۸)

”اگر دونوں حدیثیں ثابت بھی ہوں تو یہ حدیث یعنی اثبات قرأت فاتحہ والی

حدیث پہلی یعنی (کفایت قرات امام والی) حدیث سے مستثنی ہوگی۔ بدلیل قول نبی کریم ﷺ کے ہرگز نہ پڑھے سوائے سورۃ ام القرآن کے۔ کیوں کہ آپ کا قول (بالفرض) من کان له امام عام حکم ہے اور آپ کا قول الابام القرآن اس سے مستثنی ہے۔ جیسا کہ آپ نے فرمایا۔ بنائی گئی میرے لیے تمام زمین مسجد اور وضو کی چیز۔ پھر دوسری احادیث میں آپ نے فرمایا سوائے قبرستان اور حمام کے۔ تو جس جس جگہ کو آپ نے زمین سے مستثنی کیا ہے۔ وہ اس عام حکم سے خارج ہے۔ اسی طرح سورۃ فاتحہ کا حکم آپ کے عام حکم من کان له امام سے خارج ہے۔ باوجود اس کے کہ وہ منقطع بھی ہے۔“

تنبیہ ضروری:- جن روایتوں میں کفایت قرات امام یا منع قرات مقتدی کا ذکر ہے۔ ان کے متعلق ہمارے ناظرین ہماری ان باتوں کو گرہ باندھ کر یاد کر لیں کہ یا تو وہ مرفوع نہیں موقوف ہیں، یا صحیح نہیں ضعیف ہیں، یا موصول نہیں منقطع ہیں، یا ان میں بعد فاتحہ کا حکم ہے۔ جیسے واذقروء فانصنوا میں اگرچہ یہ زیادت غیر محفوظ ہے۔ یا امام کے پیچھے اونچی آواز سے پڑھنے سے ممانعت ہے۔ نہ کہ اصل قرات سے جیسے مالی انازع القرآن والی حدیث میں۔ کیوں کہ لا تفعلوا الابام القرآن سورۃ فاتحہ کی قرات کو مستثنی کرتی ہے اور حسب تفصیل گذشتہ یہ حدیث صحیح اور ثابت شدہ ہے۔ پس صبح کی نماز میں جب آپ اونچی قرات کرتے تھے۔ آپ نے اسے مستثنی رکھا تو دیگر نمازوں میں جو جہری ہیں یا سری ہیں۔ یہ کیوں منع ہونے لگی؟۔ اس طریق سے سب احادیث جمع ہو جاتی ہیں اور مسئلہ بالکل صاف ہو جاتا ہے۔

دیگر یہ کہ کسی حدیث کی بھی دلالت منع فاتحہ پر ایسی واضح نہیں ہے۔ جیسی کہ اثبات فاتحہ والی حدیث کی ہے۔ پس طوالت مضمون سے بچنے کے لیے ہم دلائل حضرات حنفیہ کے مضمون کو اسی ایک تنبیہ ضروری پر ختم کر دیتے ہیں۔ کیوں کہ اس میں ہر قسم کی دلیل کا بالا جمال والا اختصار جواب آگیا ہے۔ (واللہ الموفق والہادی)

حضرت امام ابو حنیفہؒ اور بعض محققین حنفیہؒ

اگرچہ بیان سابق میں اصل مسئلہ بالکل صاف ہو چکا ہے کہ سورۃ فاتحہ رکن نماز

ہے اور رکن کسی صورت میں بھی عملاً "بلاعذر ترک نہیں کیا جاسکتا۔ اور یہ بھی کہ سورۃ فاتحہ کی قرات امام کے پیچھے بھی اسی طرح واجب ہے۔ جس طرح امام ہوتے ہوئے اور اکیلے پڑھتے ہوئے فرض ہے۔ خواہ امام سری نماز پڑھے خواہ جہری لیکن باوجود اس کے ہمارے حنفی بھائی بوجہ حضرت امام صاحبؒ کے مقلد ہونے کے عذر کرتے ہیں کہ جب ہمارے امام صاحب اس کے قائل نہیں تو ہم کیسے پڑھیں؟۔ سو ان کی تسلی کے لیے ہم اس امر کو بھی خاص عنوان کے تحت بیان کرتے ہیں۔ (واللہ الموفق) "اولا" معلوم ہو کہ تقلید غیر منصوص احکام میں ہوتی ہے اور وہ بھی اس شرط سے کہ اپنے میں استدلال کی اہلیت نہ ہو لیکن جب نص شرعی موجود ہو یا آدمی خود اہل نظر و اہل علم ہو تو اس پر دلیل کی اتباع واجب ہے۔ چنانچہ شامی "شرح در مختار" میں فرماتے ہیں:-

اذا صح الحديث وكان على خلاف المذهب عمل بالحديث ويكون ذلك منهبه ولا يخرج مقلده من كونه حنفيا بالعمل به فقد صح عنه انه قال اذا

۱۸۹ جیسا کہ حضرات دیوبند میں سے بعض فضلاء کی نسبت ہمارا حسن ظن ہے کہ وہ بالغ النظر اہل علم تھے، لیکن پھر بھی انہوں نے نصوص صریحہ و واضحہ الدلالہ کے مقابلہ میں تقلید نہیں چھوڑی۔ یہی محل نزاع ہے۔ احادیث صحیحہ منقوی و منقح ہو چکی ہیں۔ ان کے متعلق کوئی بھی پہلو پردہ خفا میں نہیں ہے نہ ان پر کچھ زیادت ہو سکتی ہے۔ پس اگر وہ واقعی بالغ النظر علماء ہیں اور عام و خاص، تاریخ و منسوخ، مطلق و مقید اور صحیح و سقیم وغیرہ امور کو پہچان سکتے ہیں اور اپنے امام صاحبؒ کی تائید میں دلائل بیان کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں تو دلیل کو سمجھ کر پیروی کرنے کا نام تقلید کیوں ہے اور وہ مقلد کیسے ہوئے اور اگر وہ دلائل و نصوص کے سمجھنے اور پرکھنے کی اہلیت نہیں رکھتے تو بے ادبی معاف ہم نہیں کہتے۔ حافظ ابن قیمؒ، حافظ ابن عبد البرؒ سے نقل کر کے لکھتے ہیں قال ابو عمرؒ وغیرہ من العلماء اجمع الناس على ان المقلد ليس معلوداً من اهل العلم وان العلم معرفة الحق ببليبه (اعلام الموعنين، ج ۱، ص ۴) یعنی علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ مقلد کا زمرہ علماء میں شمار نہیں۔ کیوں کہ علم نام ہے حق کو دلیل سے پہچاننے کا۔ اہی تو ہم کو علم حقیقی، معرفت حق اور اتباع سنت کی توفیق عنایت فرما۔ (آمین)

صح الحديث فهو منهبي وقد حكى ذلك ابن عبد البر عن ابى حنيفة وغيره من الائمة ونقله ايضا الامام الشعراني عن الائمة الاربعة ولا يخفى ان ذلك لمن كان اهلا للنظر فى النصوص و معرفة محكمها من منسوخها فاذا نظر اهل المذهب فى الدليل وعملوا به صح نسبته الى المذهب لكونه صادرا بانن صاحب المذهب (جلد ۱، ص ۷۰)

”جب حدیث صحیح ثابت ہو جائے اور وہ اپنے (تقلیدی) مذہب کے خلاف ہو تو حدیث ہی پر عمل کرے۔ اور وہی اس (امام کا) مذہب ہو گا اور اس حدیث پر عمل کرنے سے اس امام کا مقلد خفی ہونے سے خارج نہیں ہو جائے گا۔ کیوں کہ یہ بات با تحقیق آپ سے صحیح طور پر ثابت ہو چکی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ جب حدیث صحیح ثابت ہو جائے تو میرا مذہب وہی ہے اور یہ بات حافظ ابن عبد البر مغربی نے بھی امام ابو حنیفہ وغیرہ ائمہ سے نقل کی ہے۔ نیز امام شعرانی نے بھی ائمہ اربعہ سے نقل کیا اور محضی نہ رہے کہ یہ بات اس شخص کے لیے ہے جسے نصوص میں نظر ہو اور محکم و منسوخ کی معرفت رکھتا ہو۔ پس جب اہل مذہب دلیل میں نظر کریں اور اس دلیل پر عمل کریں تو اس کی نسبت اس مذہب کی طرف صحیح ہے کیوں کہ وہ نظریا عمل صاحب مذہب کے اذن سے ہے۔“

اسی طرح حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی عقد الجید میں تقلید کی دو قسمیں واجب اور حرام بتا کر ہر ایک کی تفصیل بتاتے ہیں۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ جو شخص قرآن و حدیث سے ناواقف ہو وہ کسی عالم سے پوچھ کر عمل کرے۔ پھر اس کے نشان کی بابت حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں:-

وامارة هذا التقليد ان يكون عمله بقول المجتهد كالشروط بكونه موافقا للسنة فلا يزال متفحصا عن السنة بقدر الامكان فمتى ظهر حديث يخالف قوله هذا اخذ بالحديث واليه اشار الائمة (مترجم مطبوعہ لاہور، ص ۸۳)

”اور اس تقلید کا نشان یہ ہے کہ اس عمل مجتہد کے قول پر سنت کے موافق ہونے کی شرط سے مشروط ہونے کی طرح ہو۔ پس وہ مقلد ہمیشہ بقدر امکان خود سنت کی تلاش میں لگا رہے۔ پس جب اسے اپنی حدیث جو اس قول کے خلاف ہو، مل جائے تو

اس حدیث کو اختیار کر لے اور اسی طرف اماموں نے اشارہ کیا ہے۔
اور دوسری قسم جو حرام ہے۔ اس کی نسبت فرماتے ہیں:-

فان بلغه حدیث واستیقن بصحته لم يقبله لكون ذمته مشغولة بالتقليد
فهذا اعتقاد فاسد و قول كاسد ليس له شاهد من النقل والعقل وما كان احد
من القرون السابقة يفعل ذالك (ص ۸۵)

”پس اگر اس (مقلد) کو حدیث مل جائے اور اسے اس کی صحت کا یقین بھی ہو
جائے۔ اس پر بھی اسے قبول نہ کرے۔ اس وجہ سے کہ اس کا ذمہ تقلید سے مشغول ہے
تو یہ اعتقاد فاسد ہے۔ اور غیر رائج (کھوٹا) قول ہے۔ نقل قرآن و حدیث و اجماع اور
قیاس (شرعی) میں سے اس کا کوئی بھی شاہد نہیں ہے۔ اور قرون سابقہ مشہور ہمارے خیر میں
اس پر کوئی بھی عمل نہیں کرتا تھا۔“

اسی طرح مولانا عبدالحی مرحوم تعلیق مجدد، ص ۱۰ میں مقلدین و غیر مقلدین ہر دو
فریق کی افراط تفریط کی شکایت کر کے فرماتے ہیں:-

وانا ابرء الى الله من هؤلاء وهؤلاء ضل احدهما بالتقليد الجامد و ثانيهما
بالظن الفاسد والوهم الكاسد يتنازعون فيما لا ينفعهم بل يضرهم^{۱۹۰} (ص ۱۰)

^{۱۹۰} لہ اور یہی مسلک اس عاجز گنہگار کا ہے کہ باوجود اس کے کہ میں کسی خاص امام کا مقلد نہیں
ہوں۔ بلکہ اللہ کے فضل سے قرآن و حدیث کے چشمہ صافی سے براہ راست سیراب ہونے
والا ہوں۔ پھر بھی ائمہ مجتہدین اور دیگر فقہاء و محدثین کے اقوال کو نہایت عزت سے دیکھنا
ہوں اور جہاں تک میری نظر ہے۔ ان کے ماخذ تلاش کرتا ہوں اور ان کے محال کو سمجھتا
ہوں۔ کیوں کہ ان کی نیتیں نیک تھیں، ان کے علم پختہ تھے اور ان کے جذبات نفسانیت کی
آلودگی سے پاک تھے۔ احب الصالحین و لست منهم لعل اللہ یرزقنی صلاحاً ہاں وہ
معصوم بھی نہ تھے کہ ان سے خطا نہ ہو یا ان کی اصلاح کے لیے وحی اترے جو ایک پیغمبر برحق
سے مخصوص ہے۔ البتہ جو شخص ان کی شان میں گستاخی کرے اس کی نسبت حق الیقین کے
طور پر سمجھتا ہوں کہ اس پر فیضان الہی کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ جب ان مقبولان بارگاہ الہی
کے قول کا ماخذ صحیح مل جاتا ہے اور ان کے قول کی توجیہ جو قرآن و حدیث کے خلاف نہ ہو

”اور میں اللہ کی طرف بریت و بے زاری ظاہر کرتا ہوں۔ ان (جامد مقلدوں سے) بھی اور ان (بے ادب غیر مقلدوں سے) بھی ایک ان میں سے تقلید جامد کے سبب گمراہ ہوا۔ اور دوسرا فاسد ظن اور کھوٹے وہم سے، وہ ایسی باتوں میں تنازع کرتے ہیں جو ان کو نفع نہیں دیتیں۔ بلکہ ضرر دیتی ہیں۔“

اس کے بعد معلوم ہو کہ حضرت امام ابو حنیفہؒ کا آخری مذہب جس پر ان کا عمل بھی شاہد ہے کہ وہ قرأت فاتحہ خلف الامام کو مانتے ہیں۔ اسی لیے بہت سے محققین حنیفہ بھی اس کے قائل ہوئے ہیں۔ چنانچہ مولانا عبدالحی صاحب ”حاشیہ امام الکلام“ میں امام شعرانی کا قول نقل کرتے ہیں:-

لابی حنیفة و محمد قولان احدهما عدم وجوبها علی الماموم بل ولا تسن و هذا قولهما القديم وادخله محمد فی تصانیفه القديمة وانتشرت النسخ الی الاطراف و ثانيهما استحسانها علی سبیل الاحتیاط وعدم کراهتها عند المخافة للحديث المرفوع لا تفعلوا الا بام القرآن وفی رواية لا تقرؤا بشئ اذا جهرت الا بام القرآن وقال عطاء كانوا یرون علی الماموم القراءة فیما یجهر فیہ الامام و فیما یسر فرجعا من قولهما الاول الی الثاني احتیاطا (غیث الغمام، ص ۱۵۶)

”امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ کے دو قول ہیں۔ ایک مقتدی پر عدم وجوب بلکہ عدم مسنون ہونے کا اور یہ ان دونوں کا قدیم قول ہے اور امام محمدؒ نے اسے ہی اپنی قدیم تصانیف میں درج کیا اور وہی نسخے اطراف میں منتشر ہو گئے اور دوسرا مستحسن ہونا فاتحہ کا بر سبیل احتیاط اور نہ مکروہ ہونا اس کا وقت آہستہ نماز کے بدلیل حدیث مرفوع لا صلوة الا بام القرآن کے۔ روایت کیا ہے کہ اور کچھ نہ پڑھا کرو۔ جب میں اونچی قرأت کروں مگر سورۃ فاتحہ اور کما امام عطاءؒ نے (سلف صالحین) مقتدی پر قرأت جائز جانتے تھے۔ امام

سمجھ میں آ جاتی ہے تو اسے نور علی نور اور قلب کا سرور سمجھ کر کیسہ دل میں رکھ لیتا ہوں۔ ورنہ ان صالحین کو معذور جان کر خالص قرآن و حدیث پر عمل کرتا ہوں۔ یا اللہ! گواہ رہنا کہ میرا یہی اعتقاد و عمل ہے تو مجھے اسی پر زندہ رکھ اور اسی پر مار اور اسی پر میرا حشر کر۔

(آمین)

اوپنی قرأت کرے یا آہستہ پس ان دونوں (امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ) نے احتیاطاً اپنے پہلے قول سے دوسرے کی طرف رجوع کیا۔“

اور جو ہرہ نیزہ شرح ”مختصر قدوری“ میں ہے۔ و عن محمد انه قال استحسّن له قراءة الفاتحة في صلاة المخافة (جلد ۱، ص ۵۷) یعنی امام محمدؒ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا میں مقتدی کے لیے سری نمازوں میں قرأت فاتحہ مستحسن جانتا ہوں۔ اسی طرح ہدایہ میں ہے۔ ویستحسن علی سبیل الاحتیاط فیما یروی عن محمدؒ یعنی بموجب اس روایت کے جو امام محمدؒ سے کی جاتی ہے۔ بر سبیل احتیاط (قرأت فاتحہ خلف الامام) مستحسن ہے۔

مولانا عبدالحی صاحب مرحوم تعلیق مجدد میں فرماتے ہیں:-

وقد ذکر صاحب الهدایة و جامع المضمّرات وغیرهما ایضاً ان علی قول محمد یستحسن قراءة ام القران خلف الامام علی سبیل الاحتیاط لکن قال ابن الهمام الاصح ان قول محمد کقولهما فان عباراته فی کتبه مصرحة فی التجا فی عن خلافه والحق انه وان کان ضعيفاً رواية لکنه قوی دراية (حاشیہ ۹، ص ۹۶)

”اور تحقیق صاحب ہدایہ اور صاحب جامع مضمّرات وغیرہ نے بھی ذکر کیا ہے کہ ازراہ احتیاط امام محمدؒ کے قول کے مطابق امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ کا پڑھ لینا مستحسن ہے لیکن ابن ہمامؒ نے کہا ہے کہ اصح یہ ہے کہ امام محمدؒ کا قول مثل ان دونوں (امام ابو حنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ) کے قول کے ہے۔ کیوں کہ امام محمدؒ کی کتابوں میں ان کے خلاف سے دور رہنے کی مصرح عبارتیں موجود ہیں اور حق یہ ہے کہ اگرچہ امام محمدؒ کی یہ روایت روایت ”ضعیف ہے لیکن دراہہ“ (نقائش) قوی ہے۔“

اسی طرح مولانا عبدالحی مرحوم، حضرت امام صاحبؒ اور امام محمدؒ ہر دو کے متعلق ”عمدة الرعاية“ میں فرماتے ہیں:-

وروی عن محمد انه استحسّن قراءة الفاتحة للمؤتم في السرية وروی مثله عن ابی حنیفہؒ صرح به فی الهدایة و المجتبى شرح مختصر القلوری و غیرهما و هذا هو مختار کثیر من مشائخنا و علی هذا فلا یستنکر

استحسانها فی الجهریۃ ایضاً" اثناء سکنات الامام بشرط ان لا یخل بالاسماع (ضمن حاشیہ ۱۳، جلد اول، ص ۱۷۳)

"امام محمدؒ سے روایت کیا گیا ہے کہ آپ نے سری نمازوں میں مقتدی کے لیے قرات فاتحہ کو مستحسن جانا ہے اور اسی طرح امام ابو حنیفہؒ سے بھی مروی ہے۔ اس کی تصریحات ہدایہ میں اور مجتبیٰ شرح مختصر قدوری وغیرہ کتابوں میں ہیں اور ہمارے بہت سے مشائخ (حنفیہ) کا مختار مذہب یہی ہے اور اس بناء پر اس کے استحسان سے جبری نمازوں میں بھی انکار نہیں ہو سکتا۔ امام کے سکنات کے وقت بشرطیکہ اسماع میں خل نہ ہو۔"

ان حوالہ جات سے واضح ہو گیا کہ کتب فقہ میں حضرت امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ سے سری نمازوں میں قرات فاتحہ خلف الامام کے جواز کے اقوال موجود ہیں۔ مولانا عبدالحی صاحب مرحومؒ دلائل پر نظر کرتے ہوئے اس سے آگے بڑھ کر کہتے ہیں کہ جبری نمازوں میں سکنات امام کے وقت الحمد پڑھ لینی درست ہے۔ بشرطیکہ خل اسماع نہ ہو۔ اس کے بعد مولانا عبدالحی صاحب مرحومؒ سے پمشر کے صاحب حمایت حنفی کی نقل بتلاتے ہیں کہ وہ بھی اپنے بعض علمائے حنفیہ کی نسبت تسلیم کرتے ہیں وہ ازراہ احتیاط سب نمازوں میں سورۃ فاتحہ پڑھنے کو مستحسن جانتے ہیں۔ علامہ عینی مذہب حنفی کے مشہور حامی شرح بخاری میں لکھتے ہیں کہ اگر ہم حضرت ابو ہریرہؓ کے قول اقرء بھافی نفسک کو حقیقی قرات پر محمول تسلیم کر بھی لیں تو ہم اس کے وجوب کو تسلیم نہیں کر سکتے اور مستحسن ہونا تو ہمارے بعض اصحاب نے کہا ہے۔ چنانچہ ان کے الفاظ یہ ہیں:-

و لئن سلمنا ان المراد و هو القراءة حقيقة فلا نسلم انه يدل على الوجوب على ان بعض اصحابنا استحسنا ذلك على سبيل الاحتياط في جميع الصلوات و منهم من استحسناها في غير الجهرية (عمدة القاری) زیر شرح حدیث عبادہ (ص ۶۹)

"اور اگر ہم تسلیم بھی کر لیں کہ ابو ہریرہؓ کے قول میں حقیقی قرات مراد ہے تو ہم اسے تسلیم نہیں کر سکتے کہ وجوب پر بھی دلالت کرتا ہے۔ علاوہ بریں یہ کہ ہمارے بعض اصحاب (حنفیہ) نے سب نمازوں میں ازراہ احتیاط اسے مستحسن جانا ہے اور بعض نے غیر جبری نمازوں میں مستحسن جانا ہے۔"

اسی طرح ملا جیون صاحبؒ استاد حضرت اورنگ زیب عالمگیرؒ اپنی تفسیر احمدی میں فرماتے ہیں:-

فان رايت الطائفة الصوفية والمشائخين الحنفية تراهم يستحسنون قراءة الفاتحة للمؤتم كما استحسنه محمدؐ احتياطا فيما روى عنه

”پس اگر تو طائفہ صوفیہؒ اور مشائخ حنفیہ کی طرف نظر کرے تو تو ان کو دیکھے گا کہ وہ مقتدی کے لیے قرات فاتحہ کو مستحسن جانتے ہیں۔ جس طرح کہ امام محمدؒ نے اسے احتیاطاً“ مستحسن جانا ہے بموجب اس روایت کے جو ان سے کی گئی۔“

یہ حوالہ جات محض اس لیے ذکر کیے گئے ہیں کہ حضرت امام صاحبؒ اور امام محمدؒ اور ان کے بعد کے بہت سے حنفی بزرگ قرات فاتحہ خلف الامام کے قائل ہیں۔ اس کے بعد ہم مولانا عبدالحی صاحب مرحوم کی بعض تصریحات دربارہ موازنہ دلائل فریقین ذکر کرتے ہیں۔ مولانا ممدوح شیخ ابن ہمام کی طویل تقریر کے جواب میں فرماتے ہیں:-

وفيه نظر وهو انه لم يرد في حديث مرفوع صحيح النهي عن قراءة الفاتحة خلف الامام وكل ما ذكره مرفوعا فيه اما لا اصل له واما لا يصح كحديث من قرء خلف الامام ملئ فوه نارا۱ اخرج ابن حبان في كتاب الضعفاء و اتهم به مامون بن احمد احد الكذابين ذكره ابن حجرؒ في تخریج احادیث الهداية و كحديث من قرء خلف الامام ففي فيه جمرة ذكره صاحب النهاية وغيره مرفوعا“ ولا اصل له (تعلیق مجددؒ بضمن حاشیہ ۱ ص ۱۰۱)

”اور شیخ ابن ہمام کی اس تقریر میں نظر ہے اور وہ یہ کہ قرات فاتحہ خلف الامام کی ممانعت کے متعلق کوئی حدیث مرفوعہ صحیح ثابت نہیں ہوئی اور اس حوالے سے جو کچھ انہوں نے از قسم مرفوع ذکر کیا ہے یا تو وہ بالکل بے اصل ہے یا صحیح نہیں ہے۔ مثل اس حدیث کے کہ جو شخص امام کے پیچھے پڑھے اس کے منہ میں آگ بھری جائے۔ اس روایت کو امام ابن حبانؒ نے کتاب الضعفاء میں نکالا اور مامون بن احمد کو جو جھوٹوں میں سے ایک ہے۔ اس سے منتم کیا ہے۔ اسے حافظ ابن حجرؒ نے تخریج ہدایہ میں ذکر کیا ہے اور مثل اس حدیث کے کہ جو کوئی امام کے پیچھے پڑھے تو اس کے منہ میں انگار ڈالا جائے۔ اسے صاحب نہایہ نے مرفوعاً ذکر کیا ہے لیکن اس کا کوئی اصل نہیں۔“

پھر اس کے بعد اسی طرح بعض روایات جو حنفی علماء منع قرات فاتحہ کے متعلق بیان کیا کرتے ہیں۔ ان پر تفصیلی بحث کر کے اور ان کو ضعیف یا ساکت عن الدعا ثابت کرنے کے بعد فرماتے ہیں:-

فظہرانہ لا یوجد معارض لاحادیث تجویز القراۃ خلف الامام مرفوعاً (تعلیق، بضمن حاشیہ ۱، ص ۱۰۱)

”(اس تفصیل سے) ظاہر ہو گیا کہ جو احادیث قرات خلف الامام کو جائز بتاتی ہیں۔ ان کے معارض کوئی مرفوع روایت ثابت نہیں ہوئی۔“

ان حوالہ جات کے متعلق ہم اپنے حنفی بھائیوں سے چند گزارشیں کرنا چاہتے ہیں۔ اول یہ کہ آپ کو معلوم ہو گیا کہ حضرت امام صاحب ”صحیح حدیث“ پر عمل کرنا اپنا مذہب ظاہر کرتے ہیں۔ گویا کہ وہ صاف صاف اقرار کرتے ہیں کہ میں اہل حدیث ہوں پس آپ بھی انہی کے قول پر عمل کرتے ہوئے حدیث صحیح کی پیروی کریں تو آپ ان سے منحرف نہیں کہلا سکیں گے۔ دوم یہ کہ حضرت امام صاحب ”اور دیگر علمائے حنفیہ کا قرات فاتحہ خلف الامام کو مستحسن جاننا معلوم ہو چکا ہے۔ پس ان کے معتقدوں کو بھی کم از کم اسے مستحسن جان کر پڑھ لینا چاہیے اور پڑھنے والوں سے جھگڑنا نہیں چاہیے۔ کیوں کہ اصل قرات میں تو سب متفق ہو گئے۔ اب آگے فرض واجب اور مستحب کا درجہ دیگر امر ہے۔

سوم یہ کہ اگر مذہب محدثین دلیل کی رو سے قوی اور عمل کی رو سے احوط نہ ہوتا تو یہ حنفی حضرات جو صاحب علم و تقویٰ ہوئے ہیں۔ مذہب محدثین کی پیروی نہ کرتے۔ (واللہ ولی الرائے)

حضرات صوفیاء قائلین قرات خلف الامام

اکثر صوفیائے کرام کا مذہب بھی قرات خلف الامام کا تھا۔ چنانچہ ملا جیون صاحب کی عبارت سے ابھی گزر چکا ہے۔ اس کے علاوہ حضرت سید عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ ”غنیۃ الطالبین“ میں ارکان الصلوۃ کی تفصیل میں فرماتے ہیں۔ وقرۃ الفاتحۃ (ص ۱۰) یعنی فاتحہ کا پڑھنا بھی ایک رکن نماز ہے۔ اسی طرح آپ دوسرے مقام پر

فرماتے ہیں۔ فان قراءتها فريضة وهى ركن تبطل الصلوة بتركها (غنیہ مترجم فارسی، ص ۸۵۳)

”کیوں کہ سورۃ فاتحہ کی قرات فرض ہے اور وہ ایک رکن ہے۔ اس کے ترک سے نماز باطل ہو جاتی ہے۔“

اسی طرح حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی ایک عبارت تو ”حجتہ اللہ“ میں سے پیچھے گزر چکی ہے۔ دوسری عبارت یہ ہے کہ آپ مصنفی شرح مؤطا میں تعیین رکن کے ضمن میں تتبع نصوص و اشارت شرع کی مثال میں فرماتے ہیں:-
مثال آن لا صلوة لمن لم يقرء بفاتحة الكتاب (ص ۲۰)

اسی طرح جناب مرزا مظہر جانجناں دہلویؒ، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ اور امام غزالیؒ اور شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے والد شاہ عبدالرحیم صاحبؒ جو اولیاء اللہ میں سے تھے۔ یہ سب اصحاب فاتحہ خلف الامام پڑھا کرتے تھے۔

چنانچہ مولانا عبدالحیؒ ”غیث النعمان“ میں فرماتے ہیں۔ ”اور یہی مختار ہے صاحب حجتہ اللہ (شاہ ولی اللہؒ) اور ان کے والد ماجد کا۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے ”انفاس العارفین“ میں اپنے والد ماجد شاہ عبدالرحیمؒ کی بابت کہا کہ وہ اکثر فروعی مسائل میں مذہب حنفی کے موافق عمل کرتے تھے۔ مگر بعض مسائل میں جب کہ آپ کو حدیث نبویؐ یا وجدان (ولایت) کی رو سے کسی دوسرے مذہب کی ترجیح معلوم ہو جاتی ہے (تو اسی پر عمل کرتے) منجملہ ان کے قرات فاتحہ ہے۔ حالت اقتداء میں اور نماز جنازہ میں۔ (انتہی مترجم، ص ۱۵۶)

تم والحمد للہ

مسئلہ اوراک رکوع

بعض اشخاص کو ٹھوکر لگتی ہے کہ جب رکوع میں ملنے سے رکعت شمار ہو جاتی ہے تو سورہ فاتحہ کی قرأت فرض واجب کہاں رہی؟۔

سو اس کا جواب یہ ہے کہ بے شک ایک گروہ علماء کا اس کا قائل ہے لیکن تحقیق کرنے پر بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ یہ مسئلہ بالکل بے ثبوت ہے۔ اس کی توضیح یوں ہے کہ شرعی حکم کا ثبوت چار طرح پر ہوتا ہے یا قرآن شریف کی صریح آیت سے یا حدیث صحیح صریح سے یا اجماع مجتہدین سے یا آخر کار ان اصول ثلاثہ کے نصوص پر قیاس صحیح سے:-

اصول الشرع ثلاثة الكتاب والسنة و اجماع الامة والاصل الرابع القياس المستنبط من هذه الاصول (حاشی، ص ۲)

”ولا کل شرع تین ہیں۔ قرآن و سنت اور اجماع امت اور چوتھی دلیل قیاس ہے۔ جو انہی تین دلائل سے مستنبط ہو۔“

پس اوراک رکوع سے اوراک رکعت کے قائل سے پوچھا جائے کہ آپ کا استدلال ان چاروں میں سے کس دلیل سے ہے۔ کتاب اللہ یا سنت رسول اللہ ﷺ سے یا اجماع سے یا قیاس صحیح سے۔

ظاہر ہے کہ قرآن شریف میں اس امر کے لیے کوئی آیت واضح الدلالہ نہیں ہے۔ اور آیت ولرکوعوامع الراکعین (پ ۱) سے استدلال کرنا تکلف محض ہے۔

۱۹۱ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ نے منہاج السنہ میں شیعوں کے جواب کے ضمن میں کہا ہے:- وقد قيل تلك ليبين انهم يصلون جماعة لان المصلي في الجماعة انما يكون منركا للركعة بادرأك ركوعها بخلاف الذي لم يدرك السجود فانه قد فاتته الركعة واما القيام فلا يشترط فيد الادراك (ج ۴، ص ۵) سو معلوم ہو کہ اول تو شیخ الاسلامؒ نے اسے بے ضعف یعنی بے قیام (فصل مجہول) ذکر کیا ہے۔ دوم یہ کہ کسی رکن کا نام لے کر ساری نماز مراد ہونا تو قرآن و حدیث میں متعارف ہے لیکن ایک رکن کے پالنے سے

کیوں کہ منطوق آیت باجماعت نماز پڑھنے میں ہے۔ یعنی یہودیوں کو حکم ہوتا ہے کہ (کفر نہ کر بلکہ تم اسلام میں داخل ہو کر) مسلمان نمازیوں کے ساتھ شامل ہو کر نماز پڑھو۔ اس میں رکوع میں ملنے سے رکعت کامل کا حاصل ہو جانا مذکور نہیں اور نہ اس امر کو اس سے کچھ تعلق ہے۔ خطاب یہود کو ہو رہا ہے اور مسئلہ رکوع میں مل کر رکعت پالینے کا نکل رہا ہے، اس چہ؟

ملا جیون حنفیؒ تفسیر احمدیہ میں اس آیت کے ذیل میں فرماتے ہیں۔ اعلم ان هذا خطاب لاهل الكتاب پھر کئی سطور بعد فرماتے ہیں۔ و حاصل الخطاب امرهم باتباع المسلمين بآداء صلوة المسلمين یعنی حاصل خطاب کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو مسلمانوں کی نماز ادا کر کے مسلمانوں کی پیروی کا حکم دیا ہے۔

اسی طرح تفسیر معالم میں ہے۔ اسی صلوا مع المصلین محمد صلی اللہ علیہ وسلم و اصحابہ و ذکر بلفظ الركوع لان الركوع ركن من اركان الصلوة۔

”نمازیوں یعنی محمد ﷺ اور آپ کے صحابہ کرامؓ کے ساتھ مل کر نماز پڑھو اور

بادوجود فوئیدگی کسی دیگر رکن کے رکعت کا معدود ہو جانا اس کی تفسیر سنت میں نہیں پائی جاتی۔ متدل صاحب کو کھٹکتا تھا کہ مدرک رکوع سے صرف فاتحہ ہی ترک نہیں ہوئی بلکہ اس سے قیام بھی چھوٹ گیا ہے اس لیے اس نے نہایت ہوشیاری سے پیش دستی کر کے کہہ دیا کہ قیام کا ادراک شرط نہیں۔ کیوں صاحب! قیام کا ادراک شرط کیوں نہیں کیا وہ رکن نماز نہیں ہے؟ پھر آپ اسے نظر انداز کیوں کرتے ہیں؟ یہ تو متفق ملیا مسئلہ ہے کہ فرض کے فوت ہونے سے نماز باطل ہو جاتی ہے اور اعادہ واجب ہوتا ہے۔ چنانچہ حنفی مذہب کے بڑے زور کے حامی علامہ عینیؒ شرح بخاری میں ضمن شرح حدیث مسنی الصلوة فرماتے ہیں۔ الثامن فيه الاعادة على من يخل بشئ من الاركان (یعنی ج ۳، ص ۷۵) یعنی اس حدیث سے آٹھواں استنباط یہ ہے کہ جس شخص سے کوئی رکن چھوٹ جائے۔ اس پر نماز کالوٹانا واجب ہوتا ہے۔ (جیسا کہ آپؐ نے اس مسنی الصلوة کو بار بار نماز دہرانے کا حکم کیا پس چونکہ قیام فرض ہے اور رکوع میں ملنے والے سے فاتحہ کے علاوہ قیام بھی چھوٹ گیا ہے تو اب اس کی یہ رکعت شمار نہ ہوگی۔

نماز کو لفظ رکوع سے اس لیے ذکر کیا کہ رکوع ارکان نماز میں سے ہے۔“

اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ اس کا ترجمہ یوں کرتے ہیں۔ ”و نماز گذارید بانماز گذارندگان“ اور تفسیر رحمانی میں لکھا ہے۔ ای صلوٰۃ بالجماعة یعنی نماز باجماعت پڑھا کرو۔ تفسیر اکلیل میں ہے۔ قال الرازیؒ یفید اثبات فرض الركوع فی الصلوة (اکلیل بر حاشیہ تفسیر جامع البیان)

”امام رازی نے کہا یہ آیت نماز میں رکوع کے فرض ہونے کا ثبوت دیتی ہے۔“ اسی طرح دیگر تفاسیر میں بھی ہے جن کے حوالہ جات نقل کرنا موجب طوالت ہے۔

غرض اس تفصیل سے یہ ہے کہ جب جملہ مفسرین اس آیت میں لفظ رکوع کا استعمال نماز کے لیے لکھتے ہیں تو اس میں ادراک رکوع سے ادراک رکعت کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہے کہ اس مسئلہ پر اجماع بھی نہیں ہے کیوں کہ ایک جماعت صحابہ کرامؓ و تابعین اور ائمہ مجتہدین کی اس کی قائل نہیں۔ چنانچہ امام بیہقیؒ ”کتاب القرات“ میں فرماتے ہیں:-

ولا یدخل علی قوله اذا ادرك امامه راكعا فان عنده لا یصیر باذراکه مدرکا للركعة حتی یدركه القیام ویاتی بالقراءة ورواہ عن ابی ہریرۃ لا یجزیہ حتی یدرك الامام قائما وفی روایۃ اخری عن ابی ہریرۃ اذا ادركت القوم رکوعا لم تعد بتلك الركعة قال البخاری وقال ابو سعید وعائشة لا یرکع احدکم حتی یقرء بام القرآن قال البخاری وقال ابو قتادہ وانسؓ وابو ہریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا اتیم الصلوة فما ادركتم فصلوا وما فاتکم فاتموا فمن فاتہ فرض القراءة والقیام فعليه اتمامہ کما امر النبی صلی اللہ علیہ وسلم (کتاب القرات، ص ۱۵۷)

”اور آپ کے قول اذا ادرك امامه راكعا پر یہ بات وارد نہیں ہوتی کیوں کہ آپ کے نزدیک رکوع کے پالینے سے رکعت کا پالینے والا نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ قیام بھی نہ پائے اور قرات فاتحہ بھی نہ کرے اور روایت کیا اسے ابو ہریرۃ سے کہ مسبوق کی نماز کفایت نہیں کرتی۔ حتیٰ کہ امام کو قیام میں نہ پائے اور دوسری روایت میں ہے کہ حضرت ابو ہریرۃؓ نے کہا کہ جب تو قوم کو رکوع میں پائے تو اس رکعت کو شمار نہ کرنا۔ کہا

امام بخاریؒ نے کہ حضرت ابو سعیدؓ اور حضرت عائشہؓ نے کہا کہ تم میں سے کوئی رکوع نہ کرے حتیٰ کہ سورہ فاتحہ نہ پڑھ لے۔ کہا امام بخاریؒ نے کہ حضرت ابو قتادہؓ، حضرت انسؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا کہ جب تم نماز کو آؤ تو جو کچھ پاؤ، اسے پڑھو اور جو رہ جائے اسے (پیچھے) پورا کرلو۔ پس جس شخص سے دو فرائض یعنی قرات اور قیام فوت ہو گئے۔ اس پر نماز کا پورا کرنا لازم ہے۔ جس طرح کہ نبی کریم ﷺ نے حکم کیا۔

حافظ ابن حجرؒ نے حدیث ما درکنتم فصلوا کے ذیل میں کہا کہ اس سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ جس نے امام کو رکوع میں پایا۔ اس کی وہ رکعت شمار نہیں ہوگی۔ کیوں کہ مافات کے پورا کرنے کا حکم ہے اور (مبوق سے) قیام اور قرات فوت ہو گئے ہیں۔ اور یہی قول ہے ابو ہریرہؓ کا اور ایک جماعت کا بلکہ امام بخاریؒ نے قرات خلف الامام میں ہر اس (امام) سے جو وجوب قرات خلف الامام کا قائل ہے۔ یہی حکایت کیا ہے پس (اعتداد رکعت پر) اجماع ثابت نہ ہوا۔

اب دیکھئے کہ قیاس سے معلوم ہوتا ہے کہ اور اک رکوع سے رکعت ہو جاتی ہے یا نہیں۔ سو اس کی توضیح اس طرح ہے کہ قیام اور قرات بالاتفاق ارکان نماز سے ہیں۔ مدرک رکوع سے یہ دونوں فوت ہو گئے ہیں۔ دو رکن فوت ہو جانے سے رکعت کس طرح ہو جائے گی۔ علاوہ اس کے یہ کہ نبی پاک ﷺ کا فرمان ہے کہ جو کچھ تم کو مل جائے امام کے ساتھ پڑھ لو اور جو کچھ نہ ملے اسے بعد میں پورا کرلو۔ قیام و قرات دو فرض جو فوت ہو گئے ہیں۔ ان کو امام کے سلام پھیرنے کے بعد خود تما پورا کرنا پڑے گا۔ یہی مطلب امام بخاریؒ کی عبارت مذکورہ بالا کا ہے۔ اور اگر آپ کہیں کہ ہمارے نزدیک مقتدی پر قرات فرض نہیں ہے تو اس کے جواب میں ہم کہیں گے کہ یہ نہیں تو قیام تو فرض ہے۔ وہ کس طرح ساقط ہو گیا اور خفیہ کا مذہب ہے کہ فعل ارکان میں امام متحمل نہیں ہو سکتا اور اگر آپ کہیں کہ نیت اور تکبیر تحریمہ قیام ہی کی صورت میں ہوتی ہے۔

۱۹۲۔ جن خاتمہ کے طور پر میں نے مناسب جانا کہ اس کتاب کا اختتام اپنے استاد و ہادی حضرت مولانا ابو عبد اللہ، عبید اللہ غلام حسن صاحب سیالکوٹی کے رسالہ القول فی الفسح سے انتخاب کر کے بیان کروں کیوں کہ مجھ عاجز پر اللہ تعالیٰ کی ظاہری و باطنی اور علی و قلبی سب

پس وہ بھی حاصل ہو گیا۔ تو ہم کہیں گے کہ یہ قیام اضطرار کا ہے نہ کہ عبادت کا۔ کیوں کہ اللہ جل جلالہ نے انسان کو پیدا ہی سیدھی قامت پر کیا ہے اور مطلوب قیام عبادت ہے۔ چنانچہ فرمایا۔ و قوموا للہ قانتین (پ ۲) ”اور کھڑے ہو تم اللہ کے سامنے باادب ہو کر“ اور مجھ خاموشی سے کھڑا ہونا بھی عبادت نہیں۔ اس لیے قیام میں سورۃ الحمد تعلیم کی گئی کہ یہ اللہ جل شانہ کی تعریف اور خلوص عبادت و خلوص دعا پر مشتمل ہے۔ پس رکوع میں شامل ہو کر ملنے کی صورت میں یہ قیام عبادت میں امام کے ساتھ نہیں ملا۔ پس اس کے عوض اضطراری قیام عبادت میں شمار نہیں ہوگا۔ ان اللہ ہو الغنی الحمید چنانچہ امام بیہقی ”کتاب القراءۃ“ میں فرماتے ہیں:-

ولان القيام يسقط عنه بادرآك الركوع والقدر الشئ ياتی به من القيام و للتكبير ليس هو بالقيام الذی هو محل القراءۃ (ص ۵۸)

”اور اس لیے بھی کہ رکوع سے ملنے کی حالت میں مقتدی سے قیام رہ جاتا ہے اور وہ مقدار قیام جس میں وہ تکبیر تحریمہ کہتا ہے۔ وہ قیام نہیں ہے جو (بحکم شرع) محل قرات ہے۔ (کیوں کہ وہ تو تکبیر تحریمہ کے بعد ہے)“ (فافہم)

حاصل کلام یہ کہ ادراک رکوع سے ادراک رکعت قیاس پر بھی صحیح نہیں اترتا۔ بلکہ قیاس اس کے خلاف ہے۔ اب باقی رہ گئی حدیث شریف، سو اس کا بیان اس طرح ہے کہ اس کے متعلق دو روایتیں ہیں۔ پہلی یہ ہے جو حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے:-

عن ابی ہریرۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال من ادرك ركعة من الصلوة فقد ادرکھا قبل ان یقیم الامام صلیہ

”کہ رسول ﷺ نے فرمایا جس نے پائی ایک رکعت نماز کی تو اس نے پایا اس (نماز) کو پیشتر اس سے کہ قائم کرے امام پشت اپنی۔“

حضرات حنفیہ کہتے ہیں کہ اس حدیث میں رکعت سے مراد رکوع ہے اور اس

طرح کی جو بھی عنائیں ہیں، ان میں زیادہ حصہ انہی کے فیض و برکت کا ہے۔ رب اغفر لی

ولوالتی ولاساتذتی واجعلہم فی الندی الاعلی وانزلہم المقعد المقرب عندک یوم

القیمۃ

میں صاف صاف مذکور ہے کہ اگر کوئی امام کے سیدھے کھڑا ہونے سے پہلے پہلے رکوع میں شامل ہو جائے تو اس کی رکعت ہو جاتی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس روایت میں زیادت قبل ان یقیم الامام صلبہ یحییٰ بن حمید کی روایت سے ہے اور یحییٰ بن حمید یہ حدیث قرہ بن عبد الرحمن بن جویکھل سے روایت کرتے ہیں اور یہ دونوں استاد شاگرد ناقابل اعتبار ہیں۔ یحییٰ کی بابت تو امام بخاریؒ نے کہا۔ مجہول لا یعتمد علیہ یعنی یہ شخص مجہول ہے۔ اس کی حدیث کا اعتبار نہیں۔ (جز القراءۃ) اور امام دارقطنیؒ اسے ضعیف کہتے ہیں۔ (میزان الاعتدال) اور وہ قرۃ بھی سخت ضعیف ہے۔ امام احمدؒ اسے منکر الحدیث جلد کہتے ہیں۔ نیز امام نسائیؒ اسے ضعیف الحدیث کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب)

غرض جب اس حدیث کے دو راوی اوپر نیچے ضعیف ہیں تو یہ روایت سورۃ فاتحہ کی فرضیت ثابت کرنے والی احادیث صحیحہ متواترہ و مشہورہ کی تخصیص نہیں کر سکتی۔ بڑے بڑے جلیل القدر حفاظ حدیث نے اس کے الفاظ جو روایت کیے وہ صرف اتنے ہی ہیں من ادرك ركعة من الصلوة فقد ادرك الصلوة چنانچہ امام بخاریؒ اسی قدر الفاظ کی نسبت فرماتے ہیں:-

وهو خبر مستفيض عند اهل العلم بالحجاز وغيرها وقوله قبل ان يقيم الامام صلبه لا معنى له ولا وجه لزيادته (جز القراءۃ، ص ۴۶)

یعنی یہ حدیث (صرف اتنے ہی الفاظ کے ساتھ) علاقہ حجاز (مکہ شریف و مدینہ طیبہ) وغیرہ کے اہل علم کے نزدیک (عام طور پر) مستفیض (و مشہور) ہے۔ اور یحییٰ کے قول ان یقیم الامام صلبہ کے کچھ بھی معنی نہیں اور اس کی زیادت کی کوئی بھی وجہ نہیں ہے۔ پس اس روایت میں جو جملہ محل استدلال ہے۔ جب وہی ثابت نہیں تو اس سے استدلال درست نہ رہا۔ اور جتنے الفاظ صحیح ثابت ہیں۔ ان سے رکوع میں ملنے سے رکعت کے شمار ہو سکنے کی کوئی دلیل نہیں۔ کیوں کہ اس کے تین معنی ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ استاذنا حضرت مولانا ابو عبد اللہ عبید اللہ غلام حسن صاحب سیالکوٹیؒ اپنی مایہ ناز کتاب القول الفصیح فی وجوب الفاتحۃ علی الماموم فی المذہب الصحیح میں فرماتے ہیں:-

ومعناه حينئذ على ما صرح به النووي في المنهاج يحتمل ثلاثة وجوه
احدها: من سقط عنه الفرض لمانع شرعي فبعد ارتفاع المانع ان ادرك
زمانا يسع لاداء ركعة فقد ادرك صلوة ذالك الوقت يعني لزمه قضائها و
ثانيها: من ادرك ركعة من الصلوة مع الامام فقد ادرك فضل الصلوة مع
الجماعة و ثالثها: من ادرك ركعة من الصلوة في وقتها فقد ادرك تلك
الصلوة يعني يتمها اداء لا قضاء انتهى بحاصله (ص ٥١)

”اب اس حديث کے ثابت شدہ الفاظ کے معنی بموجب تصریح امام نوویؒ کے
تین وجہ پر ہو سکتے ہیں۔ اول: یہ کہ جس شخص سے کوئی فرض بسبب مانع شرعی کے ساقط
ہو گیا۔ پس بعد دور ہو جانے اس مانع کے اگر اس نے ایک رکعت کے ادا کرنے کا بھی
وقت پالیا ہے تو اس نے اس وقت کی نماز پالی۔ یعنی اس کو قضا کرنا اس نماز کا لازم ہے۔
دوم: یہ کہ جس نے امام کے ساتھ نماز کی ایک رکعت پالی۔ بے شک اس نے نماز با
جماعت کی فضیلت پالی۔ سوم: یہ کہ جس نے وقت نماز میں ایک رکعت کا وقت بھی پالیا۔
بے شک اس نے وہ نماز پالی۔ یعنی وہ شخص اپنی نماز اداء پوری کرے نہ قضاء۔“

بوجوب تصریح امام نوویؒ کے اس حدیث کے معنی انہی تین وجوہ پر ہو سکتے
ہیں۔ دیگر کوئی وجہ نہیں ہو سکتی اور ظاہر ہے کہ ان تین وجوہ پر مسئلہ زیر بحث یعنی
ادراک رکوع سے ادراک رکعت ثابت نہیں ہو سکتا۔

یہ عاجز میری اگلوٹی کہتا ہے کہ امام نوویؒ نے تیسرے معنی جو لکھے ہیں۔ اس کی
تائید حدیث مرفوعہ میں موجود ہے۔ جو حضرت ابو ہریرہؓ رسول اللہ ﷺ سے بیان کرتے
ہیں۔ اور صحیح بخاریؒ ہی میں حدیث ابوبکرؓ سے پیشتر مکتوب ہے:-

عن ابی ہریرۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال من ادرك الصبح
ركعة قبل ان تطلع الشمس فقد ادرك الصبح ومن ادرك ركعة من العصر
قبل ان تغرب الشمس فقد ادرك العصر (صحیح بخاری)

”رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص نے صبح کی ایک رکعت سورج طلوع
ہونے سے پیشتر پالی تو اس نے صبح کی نماز پالی اور جس نے عصر کی ایک رکعت سورج
غروب ہونے سے پیشتر پالی تو اس نے عصر کی نماز پالی۔“

پس بقاعدہ ”تصنیف رامصنف نکوندیاں“ جب خود حبیب خدا ﷺ سے اس حدیث کے معنی ثابت ہو گئے۔ تو اب کسی بھی امتی کو حق نہیں پہنچتا کہ محبوب خدا ﷺ کی تصریحات کے خلاف اس سے کوئی مسئلہ استنباط کر سکے۔ دیگر یہ کہ کلام شارع علیہ السلام میں رکعت کا لفظ قیام، رکوع اور سجود اور ان کے درمیانی امور کے مجموعہ پر بولا گیا ہے۔ پس یہ اس کی حقیقت شرعی ہوئی۔ اور اہل اصول میں بالاتفاق مسلم ہے کہ حقیقت شرعی حقیقت لغوی پر مقدم ہوتی ہے۔ پس اس حدیث میں رکعت کے معنی رکوع لینا اور پھر صلوٰۃ کے معنی رکعت لینا اس مفہوم کے خلاف ہے، جو عرف شرع میں متعارف ہے۔ اور اک رکعت کے ثبوت میں دوسری روایت یہ پیش کی جاتی ہے:-

عن ابی بکرؓ انه دخل المسجد و النبی صلی الہ علیہ وسلم راکع فرکع قبل ان یصل الی الصف فذکر ذالک للنبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال زادک اللہ حرصاً ولا تعد رواہ البخاری فی الصحیح

”حضرت ابو بکرؓ سے روایت ہے کہ وہ داخل ہوا مسجد میں در آنحال کہ نبی کریم ﷺ رکوع میں تھے۔ پس رکوع کیا اس نے قبل صف میں پہنچنے کے پھر یہ بات نبی پاک ﷺ کے پاس ذکر کی تو آپؐ نے فرمایا اللہ تعالیٰ تیرا شوق زیادہ کرے پھر ایسا نہ کرنا۔“

صورت استدلال:- یہ ہے کہ حضرت ابو بکرؓ صحابیؓ صف میں پہنچنے سے پہلے رکوع کی حالت میں ہو کر اور اسی حالت میں چل کر صف میں ملے تو اس کی یہی وجہ ہو سکتی ہے کہ اس نے رکوع میں ملنے سے رکعت کے پالینے کے خیال سے ایسا کیا اور پھر جب آنحضرت ﷺ کو یہ قصہ معلوم ہوا تو آپؐ نے اس امر سے تو منع کیا کہ ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا لیکن رکعت دہرانے کا حکم نہیں کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ آنحضور ﷺ نے اس کی نماز کو کامل سمجھا۔ پس اور اک رکوع سے رکعت کا شمار ہونا ثابت ہو گیا۔

اس کا جواب

حضرت الاستاذ قدس سرہ کے رسالہ ”القول الفصیح“ سے استفادہ کر کے اسے

۱۹۳۳ء یہ ابو بکرؓ صحابی، حضرت ابو بکر صدیقؓ خلیفہ اول کے سوا ایک دوسرے صحابی ہیں۔

اپنے الفاظ میں مع کسی قدر اضافہ و توضیح کے لکھتا ہوں۔ (واللہ الموفق)
 ”حضرت ابو بکرؓ والی حدیث بے شبہ صحیح ہے لیکن امر مطلوب پر اس کی دلالت

غیر مسلم ہے۔ اول اس لیے کہ حضرت ابو بکرؓ سے ہرگز ثابت نہیں کہ انہوں نے رکوع کے پالینے سے رکعت کے پالینے کا قائل ہوتے ہوئے ایسا کیا۔ نہ اس حدیث میں اور نہ کسی دیگر روایت میں۔ پس اس کی تجویز ایک خیالی امر ہے۔ جو میدان دلائل میں مفید نہیں۔ دوم اس لیے کہ کسی قوی یا ضعیف روایت میں مذکور نہیں کہ حضرت ابو بکرؓ نے اس رکعت کو شمار کرتے ہوئے اس کے عوض حضور اکرم ﷺ کی سلام کے بعد دوسری رکعت نہ پڑھی۔ سلسلہ روایات وہ رکعت پڑھنے یا نہ پڑھنے ہر دو امر سے بالکل خاموش ہے۔ پس متدل کا استدلال درست نہیں کیوں کہ عدم مثبت حکم نہیں ہو سکتا۔ جب حضرت ابو بکرؓ کا پڑھنا یا نہ پڑھنا کچھ بھی مذکور نہیں تو کس طرح کہا جاسکتا ہے کہ رسول پاک ﷺ کا سکوت اس بات کی دلیل ہے کہ مدرک رکوع مدرک رکعت ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ آپ کا سکوت محض مثبت حکم نہیں بلکہ تقریر کے یہ معنی ہیں کہ کوئی کام آپ کے سامنے کیا جائے اور آپ اسے برقرار رکھتے ہوئے اس سے منع نہ فرمائیں۔“

چنانچہ ”نور الانوار“ میں ہے۔ السنۃ تطلق علی قول الرسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فقط و سکوتہ (مطبوعہ یوسفی، ص ۱۷۵)

”سنت کا لفظ رسول اللہ ﷺ کے قول اور آپ کے سکوت پر بولا جاتا ہے۔“

اور لفظ سکوت پر مولانا عبدالحلیم صاحب لکھنؤی والد ماجد جناب مولانا عبدالحی صاحب لکھتے ہیں۔ ”قولہ و سکوتہ ای عند امر یعاینہ یعنی ایسے امر پر آپ کا سکوت کرنا کہ آپ کے سامنے کیا جائے اور آپ اسے برقرار رکھتے ہوئے اس سے منع نہ فرمائیں۔“

”ارشاد الفحول“ میں بہت مفصل لکھا ہے۔ البحث السابع التقریر و صورته ان

۱۹۲ھ اور مولانا عبدالحیؒ نے غیث الغمام، ص ۵۲ میں جو روایت جزء القراءة سے نقل کی ہے وہ عبد اللہ خزازی کی روایت سے ہے جو مکر الحدیث ہے۔ خصوصاً جب کہ وہ یونس سے روایت کرے۔ (تہذیب التہذیب) یہاں وہ یونس سے روایت کرتا ہے ورنہ امام بخاریؒ اس کا انکار نہ کرتے۔

يسكت النبى صلى الله عليه وسلم عن انكار قول قيل بين يديه او فى عصره و علم به او سكت عن فعل فعل بين يديه او فى عصره و علم به فان ذالك يدل على الجواز (ارشاد، مطبوع مصر، ص ۳۹)

”ساتویں بحث تقریر میں ہے اور اس کی صورت یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ ایسے قول پر انکار کرنے سے خاموش رہیں، جو آپ کے سامنے یا آپ کے عصر میں کہا جائے اور آپ کو معلوم ہو جائے یا ایسے فعل پر خاموش رہیں جو آپ کے سامنے یا آپ کے عصر میں کیا جائے اور آپ کو معلوم ہو جائے۔ پس یہ اس (قول یا فعل) کے جواز کی دلیل ہے۔“

پس جب کسی روایت میں یہ مذکور ہی نہیں کہ ابو بکرؓ نے وہ رکعت دوبارہ پڑھی یا نہیں پڑھی تو حضور پاک ﷺ کا سکوت کس امر پر سمجھا جائے۔ فافہم ولا تکن من القاصرین۔

پس متدل کا استدلال تعریف تقریر کی حد سے باہر ہونے کی وجہ سے درست نہ رہا۔

اگر کہا جائے کہ اگر نہ پڑھنا مذکور نہیں تو پڑھنا بھی تو مذکور نہیں۔ پھر آپ شمار نہ ہو سکنے کو کہاں سے لیتے ہیں تو اس کے جواب میں ہم عرض کرتے ہیں کہ عدم شمار کی دلیل یہ حدیث نہیں ہے کیوں کہ یہ حدیث دونوں پہلوؤں کے اثبات سے ساکت سے ہے۔ ہماری دلیل دیگر احادیث صحیحہ مستفیضہ ہیں۔ جو قیام اور قرات فاتحہ کی فرضیت ثابت کرتی ہیں۔ ان کو سامنے رکھ کر رحمت و دو عالم ﷺ کے فرمان و مافاتکم فاتموا (بخاری) کی رو سے کہتے ہیں کہ رکوع میں ملنے والے سے قیام اور قرات فاتحہ یا کم از کم قیام اور مطلق قرات یا اس سے بھی کم قیام جو آپ کے نزدیک بھی فرض ہے، ترک ہو گیا ہے۔ پس اس پر قیام و قرات فاتحہ یا قیام و مطلق قرات یا محض قیام (جس طرح پر بھی آپ مان سکیں) کو پورا کرنے کے لیے دوسری رکعت پڑھنی لازم ہوگی۔ یہ بات چالیس سیر اور سولہ آنے پوری ہے۔ اس میں کوئی بیچ یا تکلف نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

اس روایت کے بعد جو بھی روایت مرفوع اس بارے میں ہے، وہ ضعیف ہے

اور جو بھی اقوال صحابہ کرامؓ ہیں۔ ان میں سے بھی اکثر بے اصل و غیر ثابت ہیں۔ اور اگر کوئی جرح سے خالی تسلیم بھی کر لیا جائے تو وہ موقوف ہونے کی وجہ سے ان مرفوع احادیث کے مقابلے میں قائم نہیں ہو سکتا۔ جو قیام اور قرأت فاتحہ کی فرضیت کو ثابت کر رہی ہیں۔ امام شوکانیؒ نے حدیث ابو بکرؓ کا جواب حافظ ابن حزمؒ سے یوں نقل کیا ہے:-

”اس میں ان کی کوئی دلیل نہیں کیوں کہ اس میں اس رکعت کے کافی ہونے کا ذکر نہیں ہے۔ بدلیل حدیث ما ابو بکرؓ فصلوا و ما فاتکم فاتموا رکعت کے شمار کے لیے اور اک قیام و قرأت سے چارہ نہیں۔ کسی رکعت یا رکن یا ذکر مفروض کے فوت ہو جانے میں کوئی فرق نہیں۔ کیوں کہ ہر ایک ان میں سے فرض ہے جس کے بغیر نماز پوری نہیں ہوتی۔ اس (مبوق) کو حکم ہے کہ جو کچھ امام اس سے پہلے ادا کر چکا ہے۔ اسے وہ قضا کر کے پورا کرے۔ پس ان میں سے کسی امر کی تخصیص بغیر نص (شرعی) کے جائز نہیں۔ جس کے موجود ہونے کی کوئی راہ نہیں اور بعض نے اس (اعتداد رکعت) پر اجماع کا دعویٰ کیا ہے اور وہ اس میں غلط گو ہے کیوں کہ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ وہ اس رکعت کو شمار نہیں کرتے۔ جب تک کہ سورہ فاتحہ پڑھی نہ جائے اور اسی امر پر زید بن وہبؒ کا فیصلہ بھی مروی ہے۔“ (انتہی مترجم) نیل الاوطار جلد ۲ ص (۱۱۳)

تم والحمد للہ

۱۹۵ زید بن وہب مخضرم ہیں۔ آنحضور ﷺ کی حیات طیبہ میں ایمان لائے۔ زیارت کے لیے وطن سے چلے، لیکن ابھی رستے ہی میں تھے کہ آنحضرت ﷺ کی وفات ہو گئی۔

نماز جنازہ اور سورہ فاتحہ

حضرات حنفیہ کے نزدیک نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ یا قرآن حکیم کے کسی دیگر مقام سے قرات کی نیت سے پڑھنا درست نہیں۔ ہاں! اگر ثناء یا دعا کی نیت سے سورہ فاتحہ پڑھ لے تو درست ہے۔ چنانچہ ”فتح القدیر شرح ہدایہ“ میں ہے:-

قالوا لا یقرء الفاتحة الا ان یقرأها بحیة الثناء ولم تثبت القراءة عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم وفی مؤطا مالک عن نافع ان ابن عمر کان لا یقرء فی الصلوة علی الجنازة (مطبوعہ نو کثور، جلد اول، ص ۲۸۲)

(فتاویٰ نے) کہا ہے۔ نہ پڑھے فاتحہ مگر ثناء کی نیت سے پڑھے، تو پڑھے اور نہیں ثابت ہوئی قرات نبی کریم ﷺ سے۔ ”اور نافع سے روایت ہے کہ عبد اللہ بن عمرؓ نماز جنازہ میں قرات نہیں کیا کرتے تھے۔“

برخلاف اس کے امام شافعیؒ دوسری نمازوں کی طرح نماز جنازہ میں بھی سورہ فاتحہ کی قرات کو فرض جانتے ہیں۔ آپ نے ”کتاب الام“ میں اس مسئلے پر سیرکن بحث کی ہے اور احادیث مرفوعہ و موقوفہ سے ثابت کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے کئی جنازوں پر سورہ فاتحہ پڑھی ہے اور آپ کے بعد صحابہ کرامؓ بھی پڑھتے رہے اور شہادت دیتے رہے کہ نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ کا پڑھنا طریق مسنون ہے۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں:-

۱- عن جابر بن عبد اللہ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کبر علی المیت اربعاً و قرء بام القرآن بعد التکبیر الاولی۔

”جابر بن عبد اللہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک میت پر چار تکبیریں کیں اور تکبیر اولی کے بعد سورہ فاتحہ پڑھی۔“

۲- عن طلحة بن عبد اللہ بن عوف قال صلیت خلف ابن عباس علی

یعنی نہ امام پڑھے، نہ مقتدی، سبحان اللہ! یہ کیسی نماز ہے، جس میں قرات ہی ندارد ہے۔

۱۹۷۰۔ امام شافعیؒ نے یہ احادیث مع اسناد ذکر کی ہیں اور بعض جگہ ان پر کچھ تشریحی و استدلالی

نوٹ و ریمارک بھی لکھے ہیں۔ ہم نے، قصد اختصار ان سب کو حذف کر کے نقل کیا ہے۔

جنازة فقرء فيها بفاتحة الكتب فلما سلم سالتہ عن ذالک فقال سنة و حق۔

”علہ بن عبد اللہؒ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت ابن عباسؓ کے پیچھے نماز پڑھی تو آپ نے اس میں سورۃ فاتحہ پڑھی۔ جب سلام پھیر لیا تو میں نے آپؓ سے اس کی بابت پوچھا۔ آپؓ نے فرمایا سنت ہے اور حق ہے۔“

۳۔ عن سعید بن ابی سعید المقبری قال سمعت ابن عباسؓ یجهر بفاتحة الكتاب علی جنازة وقال انما فعلت لتعلموا انها سنة

”سعید بن ابو سعید مقبریؒ کہتے ہیں کہ میں نے ابن عباسؓ کو جنازہ پر سورۃ فاتحہ بالجر پڑھتے سنا۔ (فراغت پر) آپؓ نے فرمایا کہ میں نے ایسا اس لیے کیا کہ تم جان لو کہ یہ (قرات فاتحہ آنحضرت ﷺ) کی سنت ہے۔“

۴۔ عن رجل من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان السنة فی الصلوة علی الجنازة ان یکبر الامام ثم یقرء بفاتحة الكتاب بعد التکبیرة الاولى سرا فی نفسه ثم یصلی علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم ویخلص الدعاء للمیت فی التکبیرات لا یقرء فی شیئی منهن ثم یسلم سرا فی نفسه

”آنحضور ﷺ کے ایک صحابیؓ سے روایت ہے کہ جنازہ پر سنت (طریق) یوں ہے کہ (پہلے) امام تکبیر (اولی) کہے۔ پھر بعد تکبیر اولی کے اپنے جی میں آہستہ سورۃ فاتحہ پڑھے۔ پھر آنحضرت ﷺ پر درود پڑھے اور (باقی) تکبیرات میں میت کے لیے، اخلاص سے دعا کرے۔ ان میں کسی میں بھی قرات نہ پڑھے۔ پھر اپنے جی میں آہستہ سلام پھیر دے۔“

۵۔ عن ابی امامة قال السنة ان یقرء علی الجنازة بفاتحة الكتاب (کتاب الام، جلد اول، ص ۲۴۰ - ۲۴۱)

”حضرت ابو امامہؓ (صحابی) سے روایت ہے، سنت یہ ہے کہ نماز جنازہ پر سورۃ فاتحہ پڑھے۔“

ان روایات کے نقل کرنے کے بعد امام شافعیؒ فرماتے ہیں:-

واصحاب النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لا یقولون بالسنة والحق الالسنه
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان شاء اللہ (ص ۲۳۱)
”اور بفضل خدا نبی ﷺ کے اصحاب (لفظ) سنت اور لفظ حق نہیں بولتے۔ مگر
رسول اللہ ﷺ کی سنت پر۔“

اس کے بعد امام شافعیؒ بعض صحابہ کرامؓ کے فعل سے قرأت فاتحہ کا ثبوت دیتے

ہیں:-

(۱) عن عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما انه کان یقرء بام
القرآن بعد التکبیر الاولی علی الجنائزۃ وبلغنا ذلک عن ابی بکر الصدیقؓ
وسهل بن حنیفؓ وغیرہما من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
(ص ۲۳۰)

”حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاصؓ سے روایت ہے کہ وہ جنازہ پر تکبیر اولیٰ کے
بعد سورۃ فاتحہ پڑھتے تھے اور یہی بات ہم کو حضرت ابو بکر صدیقؓ اور حضرت سهل بن
حنیفؓ (صحابی) وغیرہما اصحاب رسول اللہ ﷺ سے پہنچی ہے۔“
احادیث مذکورہ بالا کے جواب میں کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ ان میں بظاہر امام کا
سورۃ فاتحہ پڑھنا ثابت ہوتا ہے، مقتدی کا نہیں، تو اس وہم کو دور کرنے کے لیے امام
شافعیؒ فرماتے ہیں:-

والناس یقتلون باما مهم یصنعون ما یصنع (ص ۲۳۰) یعنی ”لوگ اپنے امام
کے مقتدی ہوتے ہیں وہ بھی وہی کچھ کریں جو ان کا امام کرتا ہے۔“

یعنی سورۃ فاتحہ کا حکم جس طرح دوسری نمازوں میں امام و مقتدی ہر دو کے لیے
ہے۔ اسی طرح نماز جنازہ میں بھی امام و مقتدی ہر دو پر ہے اور حضرت امام ابو حنیفہؒ نے
نماز جنازہ میں جو قرأت فاتحہ سے انکار کیا ہے، اس کی طرف اشارہ کر کے کہتے ہیں وقال
بعض الناس لا یقرء فی الصلوۃ علی الجنائزۃ یعنی بعض لوگوں کا قول ہے کہ نماز
جنازہ میں قرأت نہ کرے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں۔ انا صلینا علی الجنائزۃ وعلما
کیف سنۃ الصلوۃ فیہا لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فاذا وجدنا
لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سنۃ اتباعناھا۔ یعنی ہم نے جنازہ پر نماز

پڑھی اور جان لیا کہ اس میں رسول اللہ ﷺ کا طریق مسنون کس طرح ہے؟۔ پس جب ہم نے رسول اللہ ﷺ کی سنت کو پالیا تو ہم نے اس کی پیروی کر لی۔ یعنی یہی تو رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کا رسول و پیغمبر جاننے کے معنی ہیں۔ پھر اس میں کلام کیا۔ اس کے بعد حضرت امام ابو حنیفہؒ کی طرف اشارہ کر کے ان کی طرف سے عذر کرتے ہیں۔ الا ان یکون رجل لم تبلغه السنة فیہا یعنی ہم ان کی طرف سے سوائے اس کے کیا کہہ سکتے ہیں کہ ان کو اس بارے میں طریق سنت کی کیفیت نہیں پہنچی، یعنی وہ معذور ہیں لیکن جب اوروں کو مل گئی ہے تو ان کو اس پر عمل کرنا چاہیے۔ سبحان اللہ! کیا خوب لکھا ہے کہ دامن ادب نہیں چھوٹا اور طریق سنت سے بھی انحراف نہیں ہوا۔ خداوند! تو ان سب بزرگان دین پر صد ہار رحمتیں بھیج۔ (آمین)

تنبیہ :- امام شافعیؒ کے حوالہ جات میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت جو ہم نے نمبر ۲ پر لکھی ہے، وہ صحیح بخاری میں بھی ہے۔ حافظ ابن حجرؒ نے اس کی شرح میں امام نسائی کے حوالے سے لکھا ہے :-

فقراء بفاتحة الكتاب و سورة و جهر حتى اسمعنا فلما فرغ اخذت بيده فسالته فقال سنة و حق۔ (ملفوظ دہلی، ج ۵، ص ۶۹۰)

”پس آپ نے فاتحہ اور ایک دوسری سورت باہر پڑھی۔ حتیٰ کہ ہم کو سنائی۔ پس جب فارغ ہوئے تو میں نے آپ کا ہاتھ پکڑ کر پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ سنت ہے اور حق ہے۔“

حیرانی ہے کہ شیخ ابن ہمام حضرات حنفیہؒ میں فن حدیث میں بالغ النظر بزرگ ہیں۔ پھر قرات فاتحہ کی احادیث کا کتاب الام، صحیح بخاری اور سنن نسائی میں ہوتے ہوئے انہوں نے کس طرح لکھ دیا کہ لم تثبت القراءة عن النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یعنی نماز جنازہ میں آنحضور ﷺ سے قرات ثابت نہیں ہے۔ (سبحان اللہ لا تسبی) اور حضرت شیخ صاحب نے موطا امام مالک کے حوالے سے حضرت ابن عمرؓ کی جو روایت لکھی ہے کہ وہ نماز جنازہ میں قرات نہیں پڑھتے تھے، اس کے جواب میں شاہ ولی اللہ صاحب موسیٰ حاشیہ موطا میں فرماتے ہیں۔ تعقب بحديث الشيخين من السنة قراءة الفاتحة فی صلوة الجنائزۃ یعنی ابن عمرؓ کی روایت پر حدیث صحیحین سے

تعاقب کیا گیا ہے جو یہ ہے کہ نماز جنازہ میں قرات سورۃ فاتحہ طریق مسنون ہے اور صحابی من السنۃ کا لفظ کئے تو وہ حدیث مرفوع کبھی جاتی ہے۔

گزارش :- اس کے بعد ہم حضرات حنفیہ کی خدمت میں باادب التماس کرتے ہیں کہ آپ حضرت امام ابو حنیفہؒ کے ذریں قول اذا صح الحدیث فهو منہبی کو کبھی نہ بھولا کریں۔ جہاں پر حدیث صحیح مل جائے، اس پر بے کھکا عمل کر لیا کریں۔ بہ نیت ثناء و دعا تو آپ کے سب بزرگ مانتے ہیں، ان کے علاوہ آپ کے بعض بزرگوں نے اسے تحقیق کی رو سے بھی تسلیم کیا ہے کہ بہ نیت قرات درست ہے۔ اس میں کوئی کراہت نہیں۔ چنانچہ حضرت مولانا عبدالحی صاحبؒ نے اس امر میں ایک خاص رسالہ تصنیف کیا ہے، جو ان کے رسالہ امام الکلام فیما يتعلق بالقراءة خلف الامام کا آخری جزو بعنوان خاتمہ ہے، آپ اس میں فرماتے ہیں :-

والمرجح فی ذالک هو القراءة علی وجه الاستحباب او السنية لثبوت ذالک بالاخبار المتواردة (ص ۲۳۳)

”اور اس بارے میں قرات کو ترجیح دی ہے بروجہ استحباب یا سنیت، بوجہ ثابت ہونے اس کے ان احادیث سے جو اس بارے میں وارد ہیں۔“

اور بعض حضرات احتاف نے جو اسے مکروہ لکھا ہے اور بعض نے بہ نیت ثناء یا دعا، نہ بہ نیت قرات لکھا ہے، اس کے جواب میں فرماتے ہیں :-

والقول بالکراهة مطلقاً، او بالکراهة بنية القراءة لا بنية الثناء لا يدل علیہ دلیل باحد الوجوه الدالة (ص ۲۳۳)

”اور جو قول مطلقاً ”مکروہ ہونے“ بہ نیت قرات نہ بہ نیت ثناء مکروہ ہونے کا ہے۔ اس پر ولائکل (شرعیہ) کی وجوہ (اربعہ) میں سے کوئی دلیل دلالت نہیں کرتی۔“

حضرت مولانا محمود نے اپنے تک ہی بس نہیں کی بلکہ اپنے سے پہلے کے ایک مسلم حنفی بزرگ کا حوالہ بھی دیتے ہیں کہ :-

وقد صنف الشرنبلالی فی هذه المسئلة رسالة سماها بالنظم المستطاب لحکم القراءة فی صلوة الجنائزۃ بام الكتاب و حقق فیہ ان القراءة اولی من ترک القراءة ولا دلیل علی الکراهة (ص ۲۳۷)

”امام شرنبلالی“ (حنفی) نے اس مسئلے میں ایک (خاص) رسالہ تصنیف کیا ہے اور اس کا نام المنظم المستطاب حکم القراءة فی صلوة الجنازة بام الکتاب رکھا ہے اور اس میں تحقیق کیا ہے۔ قرات کا پڑھنا نہ پڑھنے سے اولیٰ ہے اور مکروہ ہونے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔“

اسی طرح قاضی ثناء اللہ صاحب حنفی پانی پتی قدس سرہ مالا بدمنہ میں فرماتے ہیں۔ نزد امام اعظمؒ سورۃ فاتحہ خواندن در نماز جنازہ مشروع نیست و اکثر علماء بر آئند کہ فاتحہ ہم بخواند (ص ۸۲) خیر اس حوالے میں تو اختلاف آئمہ کے اشارے سے سمجھا گئے ہیں، اپنے جنازے کی بابت جو وصیت کی ہے، اس میں فرماتے ہیں۔ ”و نماز جنازہ بجماعت کثیر و امام صالح مثل حافظ محمد علی یا حکیم سکھوایا حافظ پیر محمد بجا آرند و بعد تکبیر اولیٰ سورۃ فاتحہ ہم بخواند۔“

و لیکن ہذا آخر الکتاب بعون الملک الوہاب و صلی اللہ علی رسولہ محمد الناطق بالحق والصواب۔

حضرات! اس تفسیر کے مقدمہ عربی میں اور دیباچہ اردو میں آپ مطالعہ فرما چکے ہیں کہ بنا بر اختلاف طوائف علمائے مفسرین کے مذاق مختلف ہوئے ہیں۔ محدثین نے اپنے فن کی رو سے اس کی تفسیر بیان کی یعنی آیات قرآنیہ کے ذیل میں ان کے مناسب و متعلق احادیث نبویہ ذکر کیں، کیوں کہ آنحضور ﷺ جس طرح امین وحی ہیں۔ اس طرح شارح و مبین قرآن بھی ہیں چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا و انزلنا الیک الذکر لتبین للناس ما نزل الیہم (ص، پ ۱۳) یعنی (اے پیغمبر) ہم نے خاص تمہاری طرف یہ ذکر (قرآن مجید) اس لیے نازل کیا کہ تاکہ تم لوگوں کے لیے وہ سب کچھ کھول کر بیان کرو، جو ان کی طرف اتارا گیا۔ یعنی اس ذکر میں جو احکام ان کو کئے گئے، وہ سب ان کو کھول کر سمجھا دو۔ اسی طرح فقہاء نے اس سے مسائل فقہیہ مستنبط کئے کیوں کہ قرآن شریعت محمدیؐ کا سب سے پہلا ماخذ ہے۔

اسی طرح محکمین نے معقول و معقول میں تطبیق دے کر اور طہرین و مکہرین کے جوابات دے کر قرآن کی مدافعت کی اور جہاد باللسان و القلم کا ذمہ پورا کیا اور حضرات صوفیاءؒ نے تہذیب نفس، اخلاص نیت، تبتل الی اللہ، ایثار آخرت، کثرت ذکر، دوام فکر و

مراقبہ اور بہر حال اس بات کا وہ بیان لگائے رکھنا کہ میں اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضر ہوں تاکہ کوئی قول یا فعل سنت رسول اللہ ﷺ کے منافی سرزد نہ ہو جائے۔ ان امور کے بیان میں انہوں نے وہ حصہ لیا کہ دوسرے نہ لے سکتے تھے اور اہل ادب و معانی نے قرآن حکیم کی زبان کے متعلق کہ وہ نہایت میٹھی اور شستہ ہے اور درجہ اعجاز پر فصیح و بلیغ ہے۔ اس کے کلمات کی عذوبت و جامعیت اور اس کے جملوں کی ترکیب کے لطائف بیان کر کے اس کا بشری طاقت سے بالاتر ہونا ظاہر کیا اور تفسیر قرآن مجید کے یہی پانچ اصولی طریقے ہیں۔

ہر چند کہ مجھ عاجز کو کسی فن میں بھی کمال حاصل نہیں ہے لیکن علمائے سابقین کی دریوزہ گری کر کے اور کچھ اللہ تبارک و تعالیٰ کے فیض سے بہرہ پا کر میں نے کوشش کی ہے کہ اس تفسیر میں ان پانچوں طریقوں کو جمع کر دوں۔ تاکہ ہر مذاق والا شائق اپنے اپنے ذائقہ کے مناسب فائدہ حاصل کر کے۔ پس آپ کو اس میں جو کچھ اپنے ذوق طبع کے علاوہ ملے، اس سے بدول ہو کر کتاب کو پھینک نہ دیں بلکہ اپنے مناسب طبع امور سے بہرہ ور ہو کر باقی کو دوسرے صاحب ذوق کے لیے چھوڑ دیں۔

والعصمة لله تقدس وتعالى

شکر و دعا بدرگاہ خدا

الحمد لله ثم الحمد لله کہ یہ تفسیر واضح البیان اس وقت رات کے پونے تین بجے شب جمعہ مبارک درمیان ۴، ۵ ماہ رجب ۱۳۵۴ھ مطابق شب درمیان ۳، ۴ ماہ اکتوبر ۱۹۳۵ء کو بوقت سحر اختتام کو پہنچ گئی۔

اللهم احسن عاقبتنا فی الامور کلها واجرننا من خزی الدنیا و عذاب الاخرۃ

خداوند! میں کس دل اور کس زبان سے تیرا شکر کروں کہ باوجود بھوم، ہوم و غوم، تو اتر امراض و احزان، کثرت اشغال و اسفار، وفور نکاسل و تانی اور عموم تسویف و تعویق، جو اکثر میرے شامل حال رہتے ہیں، تو نے محض اپنے فضل و کرم سے مجھ نا توان کو توفیق بخشی اور ہمت دی کہ میں اس تفسیر کو انجام دے سکے۔ خصوصاً اس نعمت کا شکریہ کسی طرح بھی ادا نہیں کر سکتا جو تو نے فہم قرآن اور علم اسرار شریعت کے متعلق عطا کی۔

خداوند! تو جانتا ہے اور میں اقرار کرتا ہوں کہ میں نے اس تفسیر کے لکھنے سے پہلے بھی بے شمار گناہ کئے اور اس کی تصنیف کے عرصے میں بھی میرے گناہوں کی کوئی حد نہیں رہی۔ سوائے میرے ستار و غفار خدا! جس طرح تو نے میرے گناہوں سے صرف نظر کرتے ہوئے محض اپنی مہربانی سے مجھ پر اپنی ظاہری و باطنی اور عمومی و خصوصی عنایات کی بارش جاری رکھی^{۱۹۸} اگر تو آئندہ بھی میرے ماضی، حال اور استقبال کے گناہوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی عنایات کا سلسلہ جاری رکھے اور سارے قرآن مجید کی تفسیر کے اتمام کی توفیق عطا کر دے اور اس کی طبع کے اسباب مہیا کر دے، تو گو میں اس احسان کے لائق نہیں ہوں لیکن تیری شان قدوسیت سے تو بید نہیں۔ (بھجوا اللہ تعالیٰ۔ سورۃ فاتحہ کے

۱۹۸ کما قال الشاعر

کذا لک یحسن فیہ ما بقی

کما احسن اللہ فیہ ما مضی

علاوہ باقی قرآن مجید کی تفسیر ”تبصیر الرحمن“ کے نام سے موجود اور مطبوع ہے، جس کا ہر عنوان حضرت مولانا ابراہیم میرسیالکوٹی رحمہ اللہ کی قرآنی محبت و شغف کا آئینہ دار ہے۔ (ب۔ ج) حرمین پس تو اپنی شان کریمی کے لائق مجھ پر کرم کر اور میری جملہ خطیات و تفصیلات صغیرہ و کبیرہ، ظاہری و باطنی، دانستہ و نادانستہ سے درگزر فرما اور میرے اس حقیر کام کو قبول فرما۔ شاہا! برکرم من منکر، برکرم خویش منکر، تیرے بندے تو بہت ہیں اور سب تیرے بندے ہی ہیں لیکن تو جانتا ہے کہ تیرے سوا تو کوئی دوسرا مالک نہیں ہے۔ بس مجھے اتنی ہی خوشی اور فخر کافی ہے کہ تو میرا مالک ہے۔

اللہم جنتک بما انا اہلہ فعا ملنی بما انت اہلہ و صل وسلم علی صفوة بریتک الذی اکرم منی بتبث ذیلہ و علی آلہ واصحاب الذین اتبعوہ فی صعب محیاہم و سہلہ

KitaboSunnat.com



1996ء سے مرکزی جمعیت اہل حدیث کی مطبوعات

تحریک اہلحدیث - افکار و خدمات

بشیر انصاری ایم۔ اے

خدمات اہلحدیث نمبر (اردو)

ادارہ ہفت روزہ اہلحدیث، لاہور

شرح البیان فی تفسیر القرآن (اردو)

امام العصر مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی

اسلام اور سیاست (انگریزی)

جناب پروفیسر ماجد صاحب

نظم جماعت اور اس کے آداب (اردو)

جناب میاں محمد جیل ایم۔ اے

سیرت ابراہیم علیہ السلام (اردو)

جناب میاں محمد جیل ایم۔ اے

حج اور اس کے مسائل (اردو)

مفتی المسعودیہ الشیخ عبدالعزیز بن باز حفظہ اللہ

پاک فہرستیں اہل حدیث کی علمی، دینی اور سیاسی خدمات کا ایک جائزہ

قاضی محمد عیسیٰ قرہ زہری

سوالہ عظیم اور اہلحدیث (اردو)

رانا محمد شفیق خاں پسروری

گر بلا جو واقعہ (سندی)

شہید اسلام حامد احسان الہی ظہیر

عالمس کا حکم مشکل کشا (سندی)

مولانا سید بلال الدین شاہ راشدی

اللہ وعدہ لا شریک لہ (سندی)

الشیخ جیل زید، ترجمہ: عبدالغفار جو شید